

ہزاروں مسائل شیعہ کا
بیش بہا عنوانہ

فتاویٰ اجملیہ

پرواز الفتواء حضرت علامہ مفتی شاہ
نورالحق سید اجمیل قادری رضوی علیہ رحمۃ



مَنْ يَرْكَدِ اللَّهَ رَبَّهُ يَحْيَا وَيَقُومُ فِي الدِّينِ
 الشَّرِيعَةِ مَنْ يَرْكَدِ اللَّهَ رَبَّهُ يَحْيَا وَيَقُومُ فِي الدِّينِ

ہزاروں فتاویٰ پر مشتمل مسائل شرعیہ کا ایسا مجموعہ ہے جس کا ہر مسلمان کو پڑھنا چاہیے۔

اجمل الفتاویٰ

المعروف بہ

فتاویٰ اجملیہ

جلد دوم

مؤلف: مفتی محمد امجد علی صاحب دہلوی
 تفسیر: علامہ مفتی محمد امجد علی صاحب دہلوی

شیر برادرز

۴۔ اردو بازار۔ زبیدہ سنٹر لاہور

فہرست مسائل جلد دوم

- ۴۔ ناپاک کنوئیں کا پانی مختلف اوقات میں نکالا گیا تو کنواں پاک ہو گیا یا نہیں؟
- ۵۔ مائے مستعمل کی پھینٹیں کنوئیں میں گر جائیں تو پانی کا کیا حکم ہے۔
- ۵۔ استعمالی جو تا کنوئیں گر جائے تو کیا کریں۔
- ۶۔ ناپاک پانی کو پاک کرنے کا طریقہ۔
- ۷۔ آبی جانور کے نوٹھے کا حکم۔
- ۸۔ بیٹھے ہوئے نیند آ جائے تو وضو ٹوٹے گا یا نہیں؟

کتاب الصلوٰۃ

- ۱۰۔ نماز عصر کے اول وقت کے بارے میں حنفی دلائل اور مخالفین کا جواب۔
- ۱۱۔ بلقا اور لندن کے تعلق سے سوال کا جواب۔
- ۱۲۔ تنہویت یعنی صلوٰۃ پکارنے کا ثبوت۔
- ۲۲۔ اذان خطبہ کہاں ہونی چاہئے،۔
- ۲۳۔ اذان و اقامت کے جواب کا کیا حکم ہے۔
- ۲۵۔ نمازی کے آگے سے گزرنا کیسا ہے؟ اور نماز میں کوئی خرابی آتی ہے یا نہیں؟
- ۲۶۔ امام کو غلط لقمہ دینے کا حکم؟،۔
- ۲۶۔ تراویح میں قرأت قرآن پر اور امامت پر اجرت کا کیا حکم ہے؟،۔
- ۲۷۔ چہار رکعتی نماز پانچ رکعت پڑھی اور چوتھی پر قعدہ نہ کیا تو کیا حکم ہے۔
- ۲۹۔ جماعت میں بچے کہاں کھڑے ہوں؟،۔

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

نام کتاب	۰۰۰۰۰۰	اجمل الفتاویٰ المعروف بہ فتاویٰ اجملیہ (جلد دوم)
مصنف	۰۰۰۰۰۰	اجمل العلماء حضرت علامہ مفتی الشاہ محمد اجمل صاحب سنبھلی
تبیض و ترتیب	۰۰۰۰۰۰	محمد حنیف خاں رضوی بریلوی صدر المدرسین جامعہ نور بریلی شریف
محرک	۰۰۰۰۰۰	حضرت علامہ مولانا محمد منشاء تائبش قصوری (صدر ادارہ ریاض المصنفین پاکستان)
مؤید	۰۰۰۰۰۰	مولانا صاحبزادہ سید و جاہت رسول قادری (چیرمین ادارہ تحقیقات رضا انٹرنیشنل کراچی)
پروف ریڈنگ	۰۰۰۰۰۰	محمد عبدالسلام رضوی - محمد حنیف خاں رضوی
کمپوزنگ	۰۰۰۰۰۰	محمد غلام مجتبیٰ بہاری - محمد زاہد علی بریلوی - محمد منیف رضا خاں بریلوی
	۰۰۰۰۰۰	زین العابدین بہاری - محمد عقیف رضا خاں بریلوی
سن اشاعت	۰۰۰۰۰۰	فروری ۲۰۰۵ء
تعداد	۰۰۰۰۰۰	۵۰۰
ناشر	۰۰۰۰۰۰	شبیر برادرز اردو بازار لاہور
مطبع	۰۰۰۰۰۰	اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز لاہور
قیمت	۰۰۰۰۰۰	فی جلد 250 روپے (مکمل سیٹ 1000 روپے 4 جلد)

ملنے کے پتے

ادارہ تحقیقات رضا انٹرنیشنل رضا چوک ریگل (صدر) کراچی

ادارہ پیغام القرآن زبیدہ سنٹر 40 اردو بازار لاہور

مکتبہ اشرفیہ مرید کے (ضلع شیخوپورہ)	مکتبہ غوثیہ ہول سیل پرانی سبزی منڈی کراچی
احمد بک کارپوریشن کمپنی چوک راولپنڈی	ضیاء القرآن پبلی کیشنز اردو بازار کراچی
مکتبہ ضیائیہ بوہڑ بازار راولپنڈی	مکتبہ رضویہ آرام باغ روڈ کراچی
مکتبہ قادریہ عطاریہ موتی بازار راولپنڈی	مکتبہ رحیمیہ گوالی لین اردو بازار کراچی

- جس کو نماز جمعہ میں قعدہ اخیرہ مل گیا تو اس نے فضل جماعت پالیا اور اس کا جمعہ بھی ادا ہو گیا۔۔۔۔۔ ۳۳۶
- بعد سنن و نوافل امام کا آواز دعا مانگنا جائز ہے اس کی اصل حدیث شریف سے ثابت ہے۔۔۔۔۔ ۳۳۸
- بعض علاقوں کا یہ طریقہ بعد اذان جمعہ تحیۃ الوضو پڑھنا، پھر ہلکی آواز سے سورۃ کہف پڑھنا اور دوسروں کا سننا اس کے بعد دعا فاتحہ پڑھنا پھر سنت جہر سے پڑھنا کوئی حرج نہیں،۔۔۔۔۔ ۳۳۹
- نمازوں کے بعد مصافحہ کرنا مصافحہ مسنونہ کے تحت داخل ہو کر بلاشبہ جائز ہے۔۔۔۔۔ ۳۴۰
- مزارات اولیا کو بوسہ دینا جائز ہے لیکن اولیٰ یہ ہے کہ عوام کے سامنے نہ دے،۔۔۔۔۔ ۳۴۱
- علماء ضلحا کی دست بوسی وقد مبوسیٰ اور اشیائے معظمہ و آٹا صالحین کو بوسہ دینا جائز ہی نہیں حسن و محمود ہے۔۔۔۔۔ ۳۴۱
- خطبہ کا کچھ حصہ اردو میں پڑھنا مکروہ خلاف سنت متوارثہ ہے لیکن اگر کسی خاص مقام پر ایسا نہ کرنے سے فتنہ برپا ہوگا تو رفع فتنہ کے لئے اردو میں پڑھا جاسکتا ہے۔۔۔۔۔ ۳۴۳
- جس گاؤں میں مسجد نہ ہو ضرور اس میں مسجد بنائی جائے لیکن جمعہ قائم کرنا درست نہیں،۔۔۔۔۔ ۳۴۴
- عورتوں پر جمعہ و عیدین واجب نہیں ان کا ان نمازوں کے لئے جماعت قائم کرنا غلط و باطل ہے۔۔۔۔۔ ۳۴۵
- نماز میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ممنوع و ناجائز ہے۔۔۔۔۔ ۳۴۵

باب العیدین

- لوگوں نے امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھی اور امام کے ساتھ سلام پھیر دیا ان کی نماز عید ادا نہ ہوگی۔۔۔۔۔ ۳۴۷
- نماز عید سے فراغت کے بعد امام فوراً خطبہ پڑھے اور دعا بعد خطبہ کرے۔ نماز و خطبہ کے درمیان دعا پڑھنا ثابت نہیں۔۔۔۔۔ ۳۴۸
- صاع کے وزن کی تحقیق۔۔۔۔۔ ۳۴۹

باب النوافل

- سنن موگدہ کے علاوہ تمام سنتوں، مستحبات اور نفلوں کی چار رکعتوں میں قعدہ اولیٰ میں التحیات کے بعد درود شریف اور دعا بھی پڑھی جائے اور تیسری رکعت کو ثنا اور اعوذ باللہ سے شروع کیا جائے۔۔۔۔۔ ۳۵۳
- کیا بچوں کو نوافل کا حکم بھی دیا جائیگا جیسے قبل عصر چار رکعت۔ اور ترک پر مارا جائیگا۔۔۔۔۔ ۳۵۴
- اگر نماز فجر قضا ہو جائے تو زوال سے پہلے تک قضاے فرض کی متابعت میں سنت کی قضا بھی پڑھیں لیکن صرف سنت قضا ہو جائے تو باجماع طلوع آفتاب کے بعد اس کو پڑھیں اسکے مخالف ایک حدیث کا جواب۔۔۔۔۔ ۳۵۵
- صلاۃ اوابین کی چھ رکعت ایک سلام سے پڑھی جائیں۔ فرض مغرب کے بدو و سنتیں پڑھی جاتی ہیں وہ بھی اس میں شامل ہیں۔۔۔۔۔ ۳۵۶
- نماز تراویح سنت موگدہ جماعت کے ساتھ ایک شب میں ایک مرتبہ پڑھی جاسکتی ہے دوسری بار پڑھیں گے تو وہ نوافل ہو گئے اور نفل کی جماعت مکروہ ہے۔۔۔۔۔ ۳۵۶
- دیوبندیوں کا ایک فریب اور اس کا جواب۔۔۔۔۔ ۳۵۸
- عشا میں سنت و وتر کے درمیان دو نفل اور دیگر نمازوں کے بعد نوافل کا ثبوت۔۔۔۔۔ ۳۵۹
- مسجد میں داخلہ کے فوراً بعد تحیۃ المسجد دیگر نوافل پڑھیں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد پڑھنا خلاف اولیٰ ہے ۳۶۱

باب التہجد ۳۶۲

- تہجد کی نماز کب پڑھی جائے،۔۔۔۔۔ ۳۶۲

باب قضاء الفوائت

- جماعت سے پہلے صاحب ترتیب قضا پڑھے خواہ جماعت چھوٹ جائے۔۔۔۔۔ ۳۶۳

باب المساجد

- جیات انبیاء شہداء کی حیات سے اکمل ہے، ۵۰۱۔
 حیات انبیاء کا مسئلہ متفق علیہ ہے، ۵۰۳۔
 جزائی کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی، ۵۰۹۔

باب تلقین میت

- تلقین بعد دفن جائز ہے، ۵۱۲۔
 دیوبندیوں نے بھی اس کو جائز لکھا ہے، ۵۱۴۔
 تلقین کو منع کرنا معتزلہ کا مذہب ہے، ۵۱۶۔
 میت کے دفن کے بعد فقہا اذان کو مسنون کہتے ہیں، ۵۲۲۔
 دفن کے بعد قبر پر کچھ دیر ٹھہرنا مستحب ہے، ۵۲۵۔
 قبر میں سوالات کے وقت کیا حضور خود تشریف لاتے ہیں، ۵۲۷۔

باب حرمتہ قبور

- مسلمان مردہ کو ایذا دینا زندہ کے مانند ہے، ۵۳۲۔
 قبروں پر مکان بنانا یا کھیتی کرنا سخت قبیح فعل ہے، ۵۳۳۔
 قبر پر پختہ اینٹ یا لکڑی کا پٹا و بغرض استحکام جائز ہے، ۵۳۴۔
 قبر پر چلنا اور بیٹھنا ممنوع ہے، ۵۳۵۔
 قبر کے تختے گل جائیں تو ان کو بدلنا ممنوع ہے، ۵۳۶۔
 اونچی قبر کو برابر کرنے کا حکم جو حدیث میں آیا اس کا کیا مطلب ہے، ۵۳۷۔

باب صدقات میت

- میت کے لئے بعد دفن خیرات مستحب ہے، ۵۴۰۔

- صدقہ و خیرات میں علماء کو بھی شریک کرنا جائز ہے، ۵۴۳۔
 اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا کیا مطلب ہے، ۵۴۵۔
 صدقہ نفل غنی بھی لے سکتا ہے، ۵۴۶۔
 ترکہ میں نابالغ بھی شریک ہیں تو ان کے حصہ سے خیرات نہیں کی جائے گی، ۵۴۹۔
 سوم میں کلمہ شریف اور تلاوت باعث اجر ہے مردہ کو اس کا ثواب پہنچتا ہے، ۵۵۰۔
 قبر پر قرآن کریم اجرت پر پڑھوانا جائز نہیں، ۵۵۴۔
 حضور کی میلاد پاک کا ذکر باعث برکت اور خود حضور کے فعل سے ثابت ہے، ۵۵۶۔
 مجلس میلاد کی بعض قیودات مستحسن ہیں، ۵۵۷۔
 قل ھو اللہ پڑھ کر قبر میں ڈھیلے رکھنا جائز ہے، ۵۵۹۔
 میت کی طرف سے اسقاط فرض و واجب کا طریقہ، ۵۶۰۔
 وہابیہ مشہور مسائل کا بھی انکار کرتے ہیں، ۵۶۱۔
 دس آیات اور ۳۶ تفاسیر سے ثابت کہ غیر عامل کو عامل کے عمل خیر کا ثواب ملتا ہے اس موضوع پر ۲۰ احادیث، ۵۷۲۔
 فاتحہ کا طریقہ، ۵۸۴۔
 میت کی طرف سے صدقہ مستحب ہے، ۵۸۶۔
 ایصال ثواب اہلسنت کا اجماعی مسئلہ ہے، ۵۹۱۔
 مطلق درود و سلام واجب ہے، ۵۹۴۔
 درود و سلام کی فضیلت، ۵۹۶۔
 بلند آواز سے ذکر جائز ہے جب کہ کسی نماز وغیرہ میں خلل واقع نہ ہو، ۶۰۱۔
 زیارت قبور کی ترغیب احادیث میں مذکور ہے، ۶۰۴۔

- رویت کا ثبوت نہ ہونے پر نماز عید ہرگز نہ پڑھی جائے، ۶۷۵
ریڈیو کی خبر ثبوت رویت میں بالکل غیر معتبر ہے۔ ۶۷۸

رسالہ اجملہ المقال

۶۸۲

- اس رسالہ میں امام احمد رضا قدس سرہ کے رسائل سے استفادہ، ۶۸۳
ثبوت رویت ہلال سے متعلق پانچ تفصیلی مقدمات، ۶۸۶
شہادت علی الرویۃ، ۶۹۸
شہادت علی القضاء، ۷۰۱
استفاضہ، ۷۰۳
شہادت فاسق، ۷۰۵
شہادت مستور، ۷۰۵
شہادت کافر و مرتد، ۷۰۶
شہادت نساء، ۷۰۸
شہادت علی الشہادت، ۷۰۸
شہادت علی القضاء، ۷۰۹
شہادت علی کتاب القاضی، ۷۱۰
حکایت، ۷۱۱
افواہ، ۷۱۲
اخباری خبر، ۷۱۳
خطوط و لفافے، ۷۱۴
ٹیلی گرام، ۷۱۵

- ٹیلی فون، ۷۱۶
ریڈیو، ۷۱۸
وائس لیس۔ ۷۲۱ لاؤڈ اسپیکر، ۷۲۲
ٹیلی ویژن، ۷۲۳
جنتریاں، ۷۲۶
قیاسات، ۷۲۷
اختراعات، ۷۲۸

باب مسائل الصوم

- منہ بھرتے آنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا، ۷۳۱
انگلشن سے روزہ ٹوٹنے کا حکم، ۷۳۲

کتاب الحج

رسالہ فوٹو کا جواز در حق عازمان حجاز۔۔۔۔۔ ۷۳۹

- فرض حج کے لئے فوٹو کھینچنا جائز ہے۔ ۷۳۹
چند مقدمات سے اس مسئلہ کی وضاحت، ۷۴۰
حج فرض کے لئے بغیر ماں باپ کی اجازت کے بھی جانا ضروری، ۷۴۹
حکومت حجاز کے جابرانہ ٹیکس کا حکم، ۷۵۰

﴿۱۴﴾

باب المیاء

(۲۱۵)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک کنواں ناپاک ہو گیا ہے۔ اگر اس کنویں سے پانی پاک کر نیکی نیت سے نہ نکالا جائے مگر پانی برابر بھرتے رہیں۔ مثلاً پانی نکالنے کی تین سو ڈول مقدار ہے اگر اس ناپاک کنویں سے اس قدر پانی نکل گیا ہو تو کنواں پاک ہو جائے گا یا نہیں؟ یا چوبہاگل سرگیا اور پانی بھرنے والے برابر بھرتے رہیں اگر کل پانی کی مقدار پر پانی بھر لیا گیا ہو۔ یا اس سے زیادہ تو پانی پاک ہو گا یا نہیں؟

الجواب

اللہم ہدایۃ الحق والصواب

کنویں کے جس وقت ناپاک ہونے کا حکم کیا گیا اس میں جس قدر اس وقت پانی تھا ناپاک قرار پایا، پھر اس نجاست کو نکال کر اس کل مقدار پانی کا کنوں سے بیک وقت نکالنا ضروری نہیں، بلکہ اگر مختلف وقتوں یا چند مدتوں میں وہ پانی کنویں سے نکالا گیا یہاں تک کہ وہ کل مقدار متفرق اوقات کو جمع کر کے نکالی گئی تو وہ کنواں بلاشبہ پاک ہو گیا۔

قاضی خاں میں ہے: بیر وجب فیہا نزع اربعین دلواف نزع یوما عشرین ویوما عشرین جازولا یشرط النزع متوالیا۔ (قاضی خان ص ۷) واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۸۱ھ

(۲۱۶)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ وضو کے استعمال کی پانی کی چھٹیں اگر کنوئیں میں واقع ہو جائیں تو کنواں مذکور پاک ہے یا نہیں؟ اگر ناپاک ہے تو کتنے ڈول نکالے جائیں، اسکا جواب بحوالہ کتب فقہی عطا کیا جائے،

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

کنوئیں میں جب ماء مستعمل کی چھٹیوں واقع ہو جائیں تو وہ کنواں پاک ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: الماء المستعمل اذا وقع في البئر لا يفسده الا اذا غلب وهو

(عالمگیری)

الصحيح۔

یہ ظاہر ہے کہ چند چھٹیوں کنوئیں کے پانی پر غالب نہیں آسکتیں۔ لہذا کنوئیں میں ماء مستعمل کی

چند چھٹیوں کے گر جانے سے کنواں ناپاک نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مسئلہ

(۲۱۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

کنوئیں میں استعمالی جوتا گر جائے اور اس پر نجاست کا لگنا یقینی نہیں تو کنواں مذکور پاک ہے یا

نہیں؟ اس کا جواب بحوالہ کتب فقہ عطا فرمایا جائے، بینواتو جروا۔

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

جب استعمالی جوتا کنوئیں میں گر جائے اور اس پر نجاست کا یقین نہ ہو تو محض تسکین قلب کیلئے

احتیاطاً بیس ڈول نکالے جائیں۔

شامی میں ہے: فينزح ادنى ما ورد به الشرع وذلك عشرون دلوا احتياطا كذا قال

في الفتاوى العالمگیریه: لو وقعت الشاة وخرجت منه ينزح عشرون دلوا لتسكين القلب لا

للتطهير حتى لو لم ينزح وتوضا حاز كذا في فتاوى قاضی خان۔

کتبہ: مقتضی بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنہ ۱۲۸۱ھ

(۲۱۸)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

اگر ایک مٹکا یا گھڑ پانی ناپاک ہو جائے تو شریعت نے اس کے پاک کرنے کے کیا طریقہ لکھے

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

جب ایک مٹکا یا ایک لوٹا یا پیالا بھر پانی ناپاک ہو جائے اور اس کے رنگ یا بو یا ذائقہ کسی

ایک میں کچھ تغیر نہ ہو تو اس کے پاک کرنے کا ایک نہایت سہل اور آسان طریقہ یہ ہے۔ کہ اس میں پاک

پانی اس قدر پہنچائیں کہ وہ کناروں سے اہل کر خوب بہہ جائے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: حوض صغير متنحس ماؤه فدخل الماء الطاهر فيه من

جانب وسال ماء الحوض من جانب آخر كان الفقيه ابو جعفر يقول لما سال ماء

الحوض من الجانب الآخر يحكم بطهارة الحوض وهو اختيار الصدر الشهيد وفي النوازل

وبه نأخذ كذا في التاتارخانيہ

(عالمگیری قیومی ص ۹)

منیہ اور اس کی شرح کبیری غنیۃ میں ہے: فان دخل الماء من جانب حوض صغير كان

قد تنحس ماؤه وخرج من جانب قال ابو بکر بن سعید الاعمش لا يطهر ما لم يخرج مثل

ما كان فيه ثلث مرات فيكون ذلك غسالة كالقصعة۔ وقال غيره لا يطهر ما لم يخرج

مثل ما كان فيه مرة واحدة۔ وقال ابو جعفر الہندوانی يطهر بمجرد الدخول من جانب

والخروج من جانب وان لم يخرج مثل ما كان في الحوض وهو ای قول ابو جعفر اختیار

الصدر الشهيد حسام الدین لانہ حينئذ يصير جاريا والجازی لا يتنجس ما لم يتغير

بالنجاسة والكلام في غير المتغير (کبیری ص ۹۹) واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲۱۹)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان شرع عظام دامت برکاتہم النوری اس مسئلہ میں

بہار شریعت جلد چار صفحہ ۵۷ میں ہے کہ پانی کے رہنے والے جانور کا جو ٹھانا پاک ہے خواہ ان کی

پیدائش پانی میں ہو یا نہیں۔

یہ مسئلہ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر جانور پانی کے رہنے والے ہیں تو ان کا جو ٹھانا پاک کیوں ہے؟۔ اس

کی وجہ کیا ہے؟۔

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

سائل کو یا اس مسئلہ کو دیکھنے میں دھوکہ ہو گیا ہے۔ یا کتاب ہی میں غلط چھپ گیا ہے۔ باوجودیکہ بہار شریعت جلد دوم صفحہ ۵۷ میں ہے: مسئلہ پانی کے رہنے والے جانور کا جوٹھا پاک ہے خواہ اسکی پیدائش پانی میں ہو یا نہیں۔ اور یہی حکم تصریحات کتب فقہ کے موافق ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل



باب الوضو

(۲۲۰)

مسئلہ

جناب مفتی جی صاحب ہادی دین و جامع علوم ظاہری و منبع فیوض باطنی بعد مسنون السلام علیکم کے واضح ہو کہ آپ برائے مہربانی مسائل ذیل کے جواب باقاعدہ مہر کے تحریر فرمادی جائے گا عین مہربانی ہوگی۔ بندہ کومنون و مشکور فرمایگا (نوٹ) خط صاف ہوتا کہ پڑھنے میں مشکوک نہ ہو۔
جمعہ کی نماز کو خطبہ سے پہلے جس طرح آدمی جمع ہوتے ہیں اس وقت ایک شخص کو نیند آئی اور وہ نیند میں بیٹھا ہوا جھٹکا کھا گیا، گرا نہیں، اور نہ کسی چیز کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، جیسے دیوار وغیرہ، تو اس کا وضو ساقط ہوا یا نہیں؟ اور اگر وہ شخص گر گیا تو وضو ساقط ہوا یا نہیں؟ حل کر دیجئے گا۔

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

با وضو شخص کو جب بیٹھے ہوئے نیند آ جائے اور بغیر کسی چیز کے سہارے کے بیٹھا تھا تو اگر وہ نیند میں زمین پر گر گیا تو اس کا وضو ساقط ہو گیا اور اگر اس کو فقط نیند کا جھٹکا ہی لگا اور گرنے نہ پایا تو وضو ساقط نہ ہوگا۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

﴿۱۶﴾

اوقات الصلوٰۃ

(۲۲۱)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و شرع متین اس مسئلہ میں کہ
مخالفین نماز عصر کا وقت ہونے کا ایک مثل سایہ ہونا بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ حدیث سے
ثابت ہے۔ اس کے بارے میں جو حدیث شریف و فقہ حنفی کا معتبر فیصلہ ہو مطلع فرمائیں۔

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

مخالفین جب نماز عصر کا اول وقت سایہ کے ایک مثل کے بعد بتاتے ہیں تو انہیں ماننا پڑے گا کہ
وقت عصر ظہر کے وقت ختم ہونے کے بعد شروع ہوتا ہے کہ مسلم شریف کی حدیث میں بھی یہ ہے کہ
اول وقت الظهر اذا زالت الشمس و كان ظل الرجل كطول له ما لم يحضر
العصر۔ یعنی ظہر کا اول وقت جب سے سورج کا زوال ہو یہاں تک کہ آدمی کا سایہ اس کے طول کی مثل
ہو جائے جب تک کہ عصر کا وقت نہ آئے۔

اور اوقات نماز کی اصل بنیادی حدیث امامت جبریل والی حدیث میں ہے۔ دوسرے دن کی
نماز ظہر ایک مثل کے بعد پڑھنا مذکور ہے۔ چنانچہ اس میں یہ ہے: و صلى الى الظهر حين كان
الظل مثله۔

یعنی حضور نے فرمایا کہ جبریل نے ظہر کی نماز اس وقت پڑھائی جب سایہ ایک مثل ہو گیا تھا۔
تو اب مخالفین یہ بتائیں کہ جب ایک مثل کے بعد عصر شروع ہو جاتا ہے تو حضرت جبریل نے یہ
ظہر وقت عصر میں پڑھائی۔ تو ادا ہوئی یا قضا ہوئی؟ تو ظہر کا آخر وقت کس چیز سے معلوم ہوا۔ اور معلوم
ہوا کہ ادا ہوئی تو ثابت ہو گیا کہ ایک مثل کے بعد ظہر کا وقت ہے۔ عصر کا وقت دو مثل پر شروع ہوتا ہے اور
دو مثل کی مثبت چند احادیث ہیں۔ صرف ایک حدیث پیش کرتا ہوں۔

حضرت امام احمد امام مالک سے بسند خود راوی کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت رافع

سے فرمایا:

انا انخبرک و صل الظهر اذا کان ظلك مثلك والعصر اذا کان ظلك مثلیک
والحدیث -

یعنی میں تجھ کو خبر دیتا ہوں کہ ظہر جب کہ تیرا سایہ ایک مثل ہو جائے پڑھ اور عصر جب تیرا سایہ دو مثل ہو جائے۔ مذہب حنفی کی یہ ایک دلیل ہے۔ مختصر جواب روانہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔
کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۲۲۲ھ

مسئلہ

(۲۲۲)

حدیث شریف میں سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورج اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوتا ہے، یا عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو طلوع کا حکم فرماتا ہے۔ تو مشرق سے طلوع کرتا ہے۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے، بلکہ حقیقت ہے، کہ بلغار اور لندن میں عشا کا وقت ہی نہیں ہوتا ہے۔ شفق ڈوبتے ہی فجر طلوع کرتی ہے، اس کے متعلق قرآن وحدیث میں کہیں ہو تو بتایا جائے۔ جب ایسا ہے کہ سورج غروب ہوتے ہی طلوع کرنے لگتا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سورج ڈوبتا ہی نہیں ہے۔ اور بعض لوگ یوں بھی کہتے ہیں کہ کسی مقام پر چھ مہینے دن رہتا ہے اور چھ مہینے رات رہتی ہے۔ جب ایسا ہوگا تب ہی تو کہا جاتا ہے، ان مقامات پر طلوع وغروب کے متعلق شرع کا کیا حکم ہے؟۔ مقام کے لحاظ سے نماز کا حکم کیا جاتا تو مناسب تھا کہ جہاں جتنے وقت ہوں اتنے وقت کی نماز فرض ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے کہ بعض مقام ایسے ہیں کہ عشا کا وقت ہی نہیں ہوتا۔ بعض مقام ایسے ہیں کہ چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات رہتی ہے۔ جب چھ مہینے کا رات دن ہو تو وہاں کتنی نمازیں فرض ہونی چاہیں۔ اس کا ذکر قرآن وحدیث میں کہیں نہ کہیں اشارۃً کنانیہ ہوگا تو ضرور۔ واضح ثبوت سے جواب دیا جائے۔

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

قرآن وحدیث سے ہر چیز کا تفصیلی ثبوت ضروری ہو تو بہت سے احکام شرع کا محض اسی نظریہ کی بنا پر انکار کر دیا جائے گا۔ اور یہی گمراہی اور لامذہبی کا اصل دروازہ ہے۔ یہاں قابل غور امر یہ ہے کہ قرآن کریم اور حدیث میں اکثر اجمالی احکام اور اصول بیان کئے گئے ہیں۔ جن کی تفصیل کے لئے ہم

ائمہ ومجتہدین کے محتاج ہیں۔ چنانچہ جیسے واقعات و حوادث ظہور میں آتے ہیں مجتہدین اسکا تفصیلی حکم قرآن وحدیث ہی سے مستنبط کر کے بیان فرمادیتے ہیں کہ اس تفصیل تک ہم عوام کے ذہن کی رساد نہیں ہوتی۔ جیسے کون نہیں جانتا ہے کہ قرآن وحدیث سے وضو کے چار فرائض ثابت ہیں۔ لیکن جس شخص کے ہاتھ کہنیوں تک کاٹ دئے جائیں اس کے حق میں وضو میں صرف تین فرائض ہی ہوئے کہ ایک فرض ہاتھ کا دھونا اس کے لئے ساقط ہو گیا۔ یا قرآن وحدیث سے دن رات میں پانچ نمازیں ہر مسلمان پر فرض ہیں لیکن حیض والی عورت جب حیض سے وقت عصر میں پاک ہو تو اس پر اس دن رات میں صرف تین نمازیں عصر، مغرب، عشا فرض ہوئیں۔

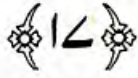
اور دو نمازیں فجر، ظہر فرض ہی نہیں ہوئیں۔ تو ایسے حوادث کا قرآن وحدیث سے واضح طور پر تفصیلی ثبوت کا مطالبہ وہی کیا کرتا جو گمراہ و بیدین ہے۔ یا بالکل جاہل و نادان واقف ہے۔ لہذا ایسے حوادث کے سوالات یوں کئے جاتے ہیں کہ ایسے مقطوع الید کے لئے وضو میں ہاتھ دھونے کے فریضے کے ساقط ہو جانے کی شرع نے کیا وجہ بیان فرمائی ہے۔ تو اس کا صاف جواب یہ ہے کہ ایسے مقطوع الید کے جب چوتھے فرض کا فعل یعنی ہاتھ ہی نہیں ہے تو چوتھا فرض یعنی ہاتھوں کا دھونا اس سے ساقط ہو گیا اور اس کے حق میں قرآن وحدیث کے بیان کئے ہوئے تین فرائض ہی وضو میں ثابت ہوئے۔ اسی طرح اس حیض والی عورت پر اس دن رات میں دو نمازوں فجر و ظہر کے فریضوں کے ساقط ہو جانے کی شرع نے کیا وجہ بیان فرمائی ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان دو اوقات میں وہ عورت حیض سے پاک نہیں تھی، تو شرط نماز ہی اس کے حق میں نہیں پائی گئی، تو اس عورت پر سے ان دو وقتوں فجر و ظہر کا فریضہ ساقط ہو گیا۔ تو اس کے حق میں قرآن وحدیث ہی کے بیان سے اس دن رات میں صرف تین نمازیں عصر، مغرب، عشا ہی فرض ثابت ہوئے۔

یہی حال بلغار اور لندن کے مسلمانوں کا ہے کہ وجوب نماز کے لئے وقت شرط اور سبب ہے تو جب وقت عشا ہی انکو نہ مل سکا تو ان پر فرض وقت یعنی نماز عشا واجب ہی نہیں ہوئی۔ لہذا قرآن وحدیث ہی کے طرف سے ان کے سروں سے فرض عشا کا فریضہ ساقط ہو گیا۔ تو چالیس راتوں میں بلغار اور لندن والوں پر قرآن وحدیث ہی سے صرف چار نمازیں فجر، ظہر، عصر اور مغرب فرض ہوئیں اگرچہ انہیں عشا وتر کی قضا بھی پڑھ لینی چاہیے۔

اب باقی رہا یہ امر کہ ان مقامات پر طلوع وغروب کا کیا حکم ہے۔ تو یہ ظاہر ہے کہ طلوع وغروب تو

ان مقامات کے طلوع و غروب کے بعد فرض وقت نماز مغرب ان پر فرض ہے، اور طلوع سے قبل فرض وقت نماز فجر ان پر واجب ہے۔ تو اس سے صاف طور پر معلوم ہو گیا کہ شریعت نے ان مقامات کے طلوع و غروب پر حکم مرتب کیا۔ تو اب یہ نتیجہ نکالنا غلط ہو گیا کہ ان مقامات میں سورج ڈوبتا ہی نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بھی غلط معلوم ہوتا ہے کہ بعض مقامات جن میں چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات رہتی ہے۔ اگر ایسے مقامات ہوتے تو فقہا کرام بلغار اور لندن کی طرح انکا ذکر کرتے اور وہاں کے احکام بیان کرتے۔ لیکن میری نظر سے کتب فقہ میں انکا ذکر نہیں گزرا۔ حدیث شریف کا مضمون حق ہے ان مقامات کا حال مضمون حدیث کے خلاف نہیں کہ آفتاب کا طلوع و غروب سب حکم الہی سے ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: اعمتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنجل



باب الاذان

(۲۲۳-۲۲۴-۲۲۵)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ اس زمانہ میں جو یہ نئی بات رائج ہو گئی ہے کہ علاوہ مغرب کے باقی چار نمازوں کیلئے اور جمعہ کے وقت میں بھی اذان اور تکبیر کے درمیان آواز بلند صلوٰۃ پکاری جاتی ہے۔ دریافت طلب یہ امور ہیں۔
(۱) آیا اس اعلان کا ثبوت فقہ حنفی کی کسی معتبر کتاب میں ہے یا نہیں؟
(۲) اس اعلان کیلئے صلاۃ کے الفاظ کس زمانہ میں رائج ہوئے، اس کا بھی کسی فقہ کی معتبر کتاب میں ذکر ہے یا نہیں؟

(۳) الصلاۃ والسلام علیک یا رسول اللہ۔ اور اس کے مثل الفاظ ہیں۔ ان کلمات میں ایک تو لفظ۔ یا۔ ہے جو ندائے قریب کے لئے ہے اور جس سے قریب کے شخص کو پکارا جاتا ہے۔ دوسرا لفظ۔ ک۔ ہے جو خطاب کے لئے ہے اور اس سے شخص حاضر کے لئے خطاب کیا جاتا ہے۔ تیسری چیز یہ ہے کہ لفظ۔ یا۔ اور۔ ک۔ سے زندہ شخص کے ساتھ خطاب کیا جاتا ہے نہ کہ مردہ سے۔ تو کیا باوجود ان امور کے یہ الفاظ صلاۃ جائز ہیں یا نہیں؟ اگر جائز ہیں تو اسکا پورا ثبوت پیش کیا جائے۔ بیوا تو جروا۔

استفتی مولوی محمد اشفاق صاحب

بمقام محلہ مراٹھی ٹولہ متصل مسجد اونٹ والاں بریلی شریف۔

۱۱ محرم الحرام ۱۳۶۲۔

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

(۱) اذان و تکبیر کے درمیان جس اعلان کے متعلق سوال ہے وہ بلا شک جائز ہے، اس کا جواز بکثرت کتب و فقہ میں موجود ہے، بلکہ فقہائے متاخرین نے اس کو مستحسن قرار دیا ہے اور اسکا نام تحویب رکھا ہے۔

چنانچہ نور الایضاح اور اس کی شرح مراقی الفلاح میں ہے:

(وینوب) بعد الاذان فی جمیع الاوقات لظہور التوانی فی الامور الدینیۃ فی الاصح و تثویب کل بلدۃ بحسب ما تعارفہ اہلہ۔ (طحاوی مصری ص ۱۱۴)

اور صحیح مذہب میں تمام وقتوں میں اذان کے بعد تثویب کہے، کیونکہ دینی باتوں میں سستی ظاہر ہے، اور ہر شہر کی تثویب وہ ہے جو اس کے رہنے والے سمجھیں۔

طحاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

(قوله ینوب) هو لغة مطلق العود الى الاعلام بعد الاعلام وشرعا هو العود الى الاعلام المخصوص (وقوله بعد الاذان) الاذان على الاصح لا بعد الاقامة كما هو اختيار علماء الكوفة۔ (قوله فی جمیع الاوقات) استحسنة المتأخرون وقد روى احمد فی السنن و البزار وغيرهما باسناد حسن موقوفا على ابن مسعود ما راہ المسلمون حسنا فهو عند الله حسن۔ (طحاوی مصری ص ۱۱۴)

تثویب لغت میں پہلے اعلان کے بعد دوسرے اعلان کی طرف مطلق لوٹنے کو کہتے ہیں اور شریعت میں وہ مخصوص اعلان کی طرف لوٹنا مراد ہوتا ہے۔ صحیح ترمذی میں تثویب اذان کے بعد ہے نہ کہ تکبیر کے بعد جیسا کہ یہ علماء کوفہ کا مختار قول ہے۔

تثویب کو اذان کے بعد تمام اوقات میں متاخرین نے مستحسن جانا، اور استحسان کا ثبوت اس حدیث سے ثابت ہے جسے امام احمد نے مسند میں اور بزار وغیرہ نے بسند حسن حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوفاروایت کیا کہ جسے مسلمان اچھا جائیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔

کنز الدقائق اور اس کی شرح عینی میں ہے:

(وینوب) من التثویب وهو العود الى الاعلام بعد الاعلام وانما اطلقه تنبیها علی ما استحسنة المتأخرون من التثویب فی کل الصلوات لظہور التوانی فی الامور الدینیۃ۔

(عینی مصری ص ۱۲۷ ج ۱)

تثویب پہلے اعلان کے بعد دوسرے اعلان کی طرف لوٹنے کا نام ہے۔ صاحب کنز نے اسے مطلق بیان کرنے میں اس بات پر تنبیہ کی کہ متاخرین نے اس تثویب کو تمام نمازوں میں مستحسن جانا۔ اس لئے کہ دینی امور میں سستی ظاہر ہو چکی ہے۔

جوہرہ نیرہ شرح مختصر قدوری میں ہے:

المتأخرون استحسنوه فی الصلوات کلها لظہور التوانی فی الامور الدینیۃ وصفته فی کل بلد علی ما یتعارفونہ۔ (ص ۲۵ جوہرہ)

متاخرین نے سب نمازوں میں تثویب کو مستحسن جانا کہ امور دینیہ میں سستی ظاہر ہے اور تثویب کے الفاظ ہر شہر کیلئے وہ ہیں جنہیں وہاں کے رہنے والے سمجھیں۔

تنویر البصار و در مختار میں ہے:

(وینوب) بین الاذان والاقامة فی الكل للكل بما تعارفوه۔

(رد المحتار مصری ص ۲۶۲ ج ۱)

اذان اور تکبیر کے درمیان تمام اوقات نماز میں سب لوگوں کے لئے اس لفظ سے تثویب کہیں جسے لوگ جانتے ہوں۔

علامہ شامی رد المحتار میں عنایہ سے ناقل ہیں:

احداث المتأخرون التثویب بین الاذان والاقامة علی حسب ما تعارفوه فی جمیع الصلوات سوی المغرب۔ (رد المحتار ص ۲۷۲ ج ۱)

متاخرین نے سوائے مغرب کے تمام نمازوں میں اذان و تکبیر کے مابین ہر اس لفظ کے ساتھ جسے لوگ سمجھتے ہوں تثویب کہنا ایجاد کیا ہے۔

خود مانعین کے پیشوا مولوی خرم علی صاحب نے غایۃ الاوطار ترجمہ در مختار میں صاف طور پر اقرار کیا:

تثویب یعنی اعلام بعد الاذان کا طریقہ یہ ہے کہ بعد اذان بقدر بیس آیت پڑھنے کے ٹھہر جائے پھر بلاوے اس طرح کہ ”الصلوة الصلوٰۃ“ یا کہے: چلو نماز تیار ہے، یا جس طرح کارواج ہو۔ پھر اس کے بعد بیس آیت کا توقف کرے پھر اقامت کہے۔ کذا فی البحر۔

(غایۃ الاوطار (ص ۱۸۱ کشوری)

بخیاں اقتصار یہ چند عبارات پیش کی گئیں ہیں۔ ورنہ تثویب کے جواز کی تصریح قدیہ، ملقط، ہدایہ، بحر الرائق، فتاویٰ قاضی خاں، نہر، تجتبی، درر، غرر، نہایہ، خزائن، حسن الحاضرہ، القول البدیع وغیرہ کتب فقہ میں ہے۔

بالجملہ ان عبارات سے ظاہر ہو گیا کہ تہییب یعنی اعلان بعد الاذان نہ فقط جائز بلکہ مستحسن ہے اور نیز یہ بھی روشن ہو گیا کہ فقہائے کرام نے اس تہییب کے لئے کوئی خاص الفاظ مقرر نہیں فرمائے ہیں بلکہ اسے عرف و رواج پر چھوڑ دیا ہے اور یہ اجازت دی ہے کہ ہر جگہ جن الفاظ سے لوگ تہییب کو سمجھتے ہوں وہی الفاظ مقرر کر لئے جائیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) جب یہ ثابت ہو گیا کہ تہییب کیلئے کوئی الفاظ خاص مقرر نہیں بلکہ اختیار ہے کہ اسے جن الفاظ میں چاہیں ادا کر سکتے ہیں تو لفظ ”صلاۃ وسلام“ کہنے کا جواز خود ان ہی عبارت سے ثابت ہو گیا۔ لیکن سائل کے اطمینان خاطر کیلئے فقہ کی معتمد و مستند اور مشہور کتاب درمختار کا حوالہ پیش کیا جاتا ہے۔

التسلیم بعد الاذان حدث فی ربيع الآخر سنة سبعمئة و احدى و ثمانین فی عشاء لیلۃ الاثنين ثم یوم الجمعة ثم بعد عشر سنین حدث فی الكل الا المغرب ثم فیہا مرتین۔ وهو بدعة حسنة۔ (رد المحتار مصری ص ۲۷۳ ج ۱)

اس عبارت کا ترجمہ خود مانعین صلاۃ کے پیشوا مولوی خرم علی صاحب نے غایۃ الاوطار میں یہ کیا ہے:

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر سلام کہنا پیدا ہوا ربیع الآخر (۸۱ھ) میں عشا کی نماز میں دو شنبہ کی رات۔ پھر جمعہ کے دن۔ پھر دس برس کے بعد پیدا ہوا سب نمازوں میں سوائے مغرب کے پھر مغرب میں بھی دوبار سلام کہنا ہو گیا اور یہ امر بدعت حسنہ ہے۔ (غایۃ الاوطار ص ۱۸۱ ج ۱)

علامہ شامی رد المحتار میں فرماتے ہیں:

قوله سنة ۷۸۱ - كذا فی النهر عن المحاضرة للسيوطی ثم نقل عن القول البدیع للسخاوی انه فی سنة ۷۹۱ وان ابتداءه كان فی ایام السلطان الناصر صلاح الدین بامرہ (رد المحتار مصری ص ۲۷۳ ج ۱)

یہی مولوی صاحب اس کا ترجمہ غایۃ الاوطار میں کرتے ہیں:

یہ فائدہ شارح نے جلال الدین سیوطی شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے حسن المحاضرہ سے نقل کیا۔ اور سخاوی کی قول بدیع میں ہے کہ اس کی ابتداء حدود سلطان صلاح الدین بن مظفر بن ایوب کے حکم سے ہوئی ۷۹۱ھ میں۔

طحطاوی نے کہا کہ مغرب کا سلام ہمارے وقت میں رائج نہیں اور نہ سیوطی کی اس عبارت

میں ہے جو بحر الرائق میں منقول ہے انتہی۔ بدعت حسنہ وہ ہے جو قواعد شریعت کے مخالف نہ ہو۔

(غایۃ الاوطار ص ۱۸۱ ج ۱)

ان عبارات اور ترجمہ سے ظاہر ہو گیا کہ حضور اکرم ﷺ پر آواز بلند اذان اور تکبیر کے درمیان میں صلاۃ وسلام آواز بلند کہنا چودہویں صدی کے کسی عالم کا ایجاد کردہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کی ابتدا ۸۱ھ میں ہوئی اور سلطان صلاح الدین بن مظفر کے حکم سے اس کو شروع کیا گیا اور اس کے بعد ہر زمانہ اور ہر صدی میں اس کا رواج فقہائے کرام و علمائے عظام نے باقی رکھا اور اس پر انکار نہیں فرمایا۔ بلکہ ان حضرات نے اپنی اپنی تصنیف میں ذکر فرمایا کہ اس صلاۃ کو بدعت حسنہ قرار دیا اور مستحسن و مستحب ہونیکا حکم دیا جو ان عبارات میں مذکور ہے۔ لہذا اب اس سے زیادہ روشن ثبوت اور صاف تصریح اور کیا ہو سکتی ہے۔ انصاف پسند طبعیتوں کے لئے یہ بات بہت کافی ہے کہ جو فعل تخمیناً چھ سو سال سے رائج ہے اور فقہاء و علمائے امت کا معمول بہا ہے، آج کسی نام نہاد مولوی صورت کا بلا کسی دلیل و ثبوت کے اسے ناجائز و بدعت قرار دینا کتنی بڑی دلیری و جرات ہے اور چھ صدی کے فقہاء و علماء و مشائخ بلکہ تمام مسلمین کو بدعتی و گمراہ ٹھہرانا ہے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔ اور چھ صدی کے مسلمین تو بدعتی و گمراہ ہو نہیں سکتے کہ اسی مسئلہ کے ثبوت میں طحاوی کی عبارت گزری: ما راہ المسلمون حسنا فهو عند الله حسن۔ یعنی جس چیز کو مسلمان اچھا جانیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔ تو جب چھ صدی کے مسلمانوں نے اس صلوٰۃ کو اچھا جانا تو بلاشبہ یہ فعل اچھا ہے۔ اب آج جس شخص نے اس صلاۃ کو چھ صدی کے فقہاء و علماء کی تصریحات کے خلاف محض اپنی رائے سے بدعت و ناجائز قرار دیا اور جائز کہنے والے تمام علماء و فقہاء کو بدعتی و گمراہ ٹھہرایا تو وہ خود بدعتی و گمراہ بیدین و ضال ہے۔ مولیٰ تعالیٰ ایسے منکروں کو قبول حق کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۳) بحمد اللہ صلوٰۃ کا ثبوت تو جواب نمبر (۲) میں گذر چکا، تو اب صلاۃ تو قابل بحث نہیں رہی، اب باقی رہا سائل کا یہ قول کہ ”یا رسول اللہ“ میں لفظ ”یا“ ندائے قریب کیلئے ہے جس سے قریب کے شخص کو پکارا جاتا ہے۔ تو اول سائل کی یہ بات ہی بالکل غلط ہے کہ لفظ ”یا“ صرف ندائے قریب کے لئے آتا ہے۔ سائل اگر ذی علم ہوتا تو کبھی ایسی بات نہ کہتا۔ نحو کی کتابوں میں یہ تصریح موجود ہے کہ لفظ ”یا“ ندائے قریب و بعید دونوں کیلئے مستعمل ہوتا ہے۔

(اولا) شرح جامی میں ہے۔ ”یا اعمہا استعمالا لانہا تستعمل لنداء القریب والبعید۔

’یا‘ باعتبار استعمال کے عام ہے کہ وہ ندائے قریب و بعید دونوں کے لئے مستعمل ہے۔ تو اب لفظ ’یا‘ کو ندائے قریب کے لئے خاص کر دینا کیسی سخت غلطی ہے۔

(ثانیاً) حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہم سے بعید کب ہیں بلکہ وہ ہم سے اتنے زیادہ قریب ہیں کہ ہماری جانوں کو ہم سے وہ قرب حاصل نہیں۔ اس مضمون پر بکثرت ثبوت پیش کیے جاسکتے ہیں لیکن بخوف طوالت صرف ایک ہی حوالہ پر اکتفا کیا جاتا ہے جس کے بعد مانعین کو جائے سخن و مجال و مزدن باقی نہ رہے۔

مانعین کے پیشوا مولوی قاسم نانوتوی بانی مدرسہ دیوبند اپنی کتاب تحذیر الناس میں لکھتے ہیں:

النبي اولى بالمؤمنين من انفسهم ، كوعده لحاظ صله من انفسهم کے دیکھتے ہوئے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنی امت کے ساتھ وہ قرب حاصل ہے کہ ان کی جانوں کو بھی ان کے ساتھ حاصل نہیں۔ کیونکہ اولی بمعنی اقرب ہے۔

(تحذیر الناس مطبوعہ خیر خواہ سرکار پریس سہارن پور)

لہذا جب حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اتنے قریب تر ہیں تو اب سائل کو لفظ ’یا‘ کے استعمال کرنے میں کیا عذر باقی رہ گیا۔

سائل کی دوسری بات یہ ہے کہ ’ک‘ حاضر مخاطب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تو اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ خود نماز میں السلام عليك ايها النبي پڑھا جاتا ہے۔ اس میں صلوٰۃ و سلام بھیجنا بھی ہے اور ک۔ خطاب بھی ہے اور۔ ايها النبي۔ سے قبل لفظ ’یا‘ بھی ہے جو لفظ محذوف اور معنی مراد ہے۔

لہذا اگر یہ چیزیں ناجائز ہوتیں تو ان الفاظ کو تشہد سے علیحدہ کر دیا جاتا، مگر ساڑھے تیرہ سو برس سے آج تک کسی نے اس کا ف خطاب اور یا ندا پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ فقہاء و علمائے خطاب و ندا کے صحت معنی کی تائید فرمائی اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو حاضر جان کر مصلیٰ کو خطاب و ندا کرنے کا حکم دیا۔

حضرت عارف صدائی قطب ربانی سیدی عبدالوہاب شعرانی نے میزان الشریعہ میں فرمایا:

انما امر الشارع المصلی بالصلوٰۃ والسلام علی رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم فی التشهد لينبه الغافلين فی جلوسهم بين یدی الله عز وجل علی شهود نبیہم فی تلك الحضرة فانه لا يفارق حضرة الله تعالى ابدا في مخاطبو نه بالسلام مشافهة۔

(میزان الشریعہ مصری ج ۱ ص ۱۵۴)

شارع نے نمازی کو تشہد میں نبی ﷺ پر درود و سلام عرض کرنے کا حکم اس لئے دیا کہ جو لوگ اللہ عز وجل کے دربار میں غفلت کے ساتھ بیٹھتے ہیں انھیں آگاہ فرمادیں کہ اس حاضری میں اپنے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھیں، اس لئے کہ حضور کبھی اللہ تعالیٰ کے دربار سے جدا نہیں ہوتے تو بالمشافہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر سلام عرض کرے اور آپ سے خطاب کرے؛

خاتم المحدثین حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعة اللمعات ترجمہ مشکوٰۃ شریف میں فرماتے ہیں:

نیز آنحضرت ہمیشہ نصب العین مومنان و قرۃ العین عابدان است در جمیع احوال و اوقات خصوصا در حالت عبادت و آخر آں کہ وجود نورانیت و انکشاف دریں محل بیشتر و قوی تر است و بعضے عرفا گفتہ اند کہ ایں خطاب بجہت سریاں حقیقت محمدیہ است در ذرات موجودات و افراد ممکنات پس آں حضرت در ذوات مصلیاں موجود و حاضر است، پس مصلیٰ باید کہ ازیں معنی آگاہ باشد تا بانوار قرب و اسرار معرفت متور و فائض گردد۔ (اشعة اللمعات ص ۴۰۱ کشوری)

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہمیشہ ایمانداروں کے پیش نظر اور عبادت کرنے والوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں تمام احوال و اوقات میں خاص کر عبادت کی حالت میں اور اس کے اخیر میں کہ نورانیت و انکشاف زیادہ قوی تر ہوتا ہے۔ بعض عرفاء نے فرمایا ہے ایہا النبی کا خطاب اس جہت سے ہے کہ حقیقت محمدیہ موجودات کے ذروں اور ممکنات کے افراد میں بہرہ بہت کئے ہوئے ہے، تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نمازیوں کی ذاتوں میں موجود اور حاضر ہیں، نمازی کو چاہئے کہ اس سے باخبر رہے اور اس شہود سے غافل نہ ہوتا کہ انوار قرب و اسرار معرفت کے ساتھ متور و فائض ہو؛

حاصل کلام یہ ہے کہ جب نماز جیسی عبادت مخصوصہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام بھیجنا ندا و خطاب کرنا جائز و داخل عبادت ہے تو یہ صلوٰۃ جو اذان و تکبیر کے درمیان کہی جاتی ہے اس میں خطاب و ندا کس طرح ناجائز و بدعت ہو سکتا ہے۔ اب جو کوئی اس کو ناجائز کہے تو وہ ان کلمات کو تشہد سے نکال دے اور ساری امت کو گمراہ قرار دیکر خود گمراہ و بیدین بنے۔

۔۔۔ سائل کی تیسری بات یہ ہے کہ لفظ۔ یا اور ک۔ خطاب سے زندہ کو خطاب کیا جاتا ہے نہ مردہ سے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم زندہ ہیں بحیات دنیوی جسمانی جو خود حدیث شریف

سے ثابت ہے۔

علامہ قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں بیہقی سے بروایت حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ حدیث نقل فرمائی:

ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قال: الانبياء احياء في قبورهم يصلون۔

(مواہب لدنیہ مصری ج ۲ ص ۳۸۹)

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انبیائے کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نماز پڑھتے ہیں۔

تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو زندہ نہ جاننا اور مردہ سمجھنا حدیث شریف کے مخالف ہے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔ نیز حرف خطاب اور یا ندا سے مردہ کو بھی خطاب کیا جاتا ہے۔ زیارت قبور کی دعاؤں میں بکثرت حرف خطاب و یا ندا وارد ہے۔

ترمذی شریف میں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ

مرالنبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بقبور بالمدينة فاقبل علیہم بوجہہ فقال السلام علیکم یا اہل القبور فغفر اللہ لنا ولکم۔ (الحديث)

حضور نبی کریم ﷺ مدینہ شریف کے قبرستان میں گزرے تو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ السلام علیکم یا اہل القبور یعنی تم پر سلامتی ہواے قبر والو، اللہ ہماری اور تمہاری مغفرت فرمائے۔

تو اگر حرف خطاب اور یا ندا مردہ کے لئے ناجائز ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کبھی خود استعمال نہ فرماتے۔ لہذا ظاہر ہو گیا کہ سائل کی یہ تمام باتیں قرآن وحدیث اور تصریحات مذہب کے خلاف ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ منکر کو قبول حق کی توفیق دے؛

حاصل جواب یہ ہے کہ اذان و تکبیر کے درمیان میں صلوٰۃ کہنا جائز بلکہ مستحسن ہے اور الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ۔ یا اس کے مثل ایسے کلمات جن میں حرف خطاب و حرف ندا ہوں بالکل صحیح و درست ہیں اور شریعت کے موافق ہیں واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: مقتضی بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمیل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمیل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۸۱ھ

مسئلہ

(۲۲۶-۲۲۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ
(۱) جمعہ میں خطبہ سے پہلے اذان ثانی مسجد سے باہر ہونا سنت ہے یا مسجد کے اندر؟
(۲) اذان کہنے کے بعد جماعت کھڑے ہونے کے وقت صلوٰۃ کہنا کیا ہے؟

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

(۱) جمعہ میں اذان کا مسجد کے باہر ہونا سنت ہے۔ ابو داؤد شریف میں ہے جس کے سائب بن یزید رضی اللہ عنہ راوی ہیں:

قال كان يؤذن بين يدي رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم اذا جلس على المنبر يوم الجمعة على باب المسجد و ابى بكر وعمر فلما كان في خلافة عثمان و كثر الناس امر عثمان يوم الجمعة بالاذان الثالث فاذن به على الزوراء فثبت الامر على ذلك۔ (ابو داؤد مجتبیٰ ج ۱ ص ۱۶۳)

اس حدیث کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بروز جمعہ منبر پر تشریف فرما ہوتے تو دروازہ مسجد پر حضور کے سامنے اذان دی جاتی تھی اور اسی طرح خلافت اول اور دوم میں ہوتا رہا۔ پھر جب خلافت سوم ہوئی اور لوگ زیادہ ہو گئے تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پہلی اذان کا اور اضافہ کیا تو یہ اذان مقام زوراء (جو بازار میں ایک گھر تھا اس کی چھت) پر کہی جاتی پھر عمل اسی طرح ہوتا رہا۔

اس حدیث سے دو باتیں ثابت ہوئیں۔ ایک بات یہ ہے کہ جمعہ کی اذان اول کا تو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ پاک اور خلافت اول و دوم میں وجود ہی نہ تھا۔ اس کا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اضافہ فرمایا ہے اور یہ اذان بازار کے ایک گھر زوراء کی چھت پر ہوتی تھی۔ تو یہ اذان مسجد سے کچھ فاصلہ پر ہوتی تھی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ خطبہ والی اذان دوم زمانہ اقدس سے برابر خطبہ سے پہلے دروازہ مسجد پر منبر کے مقابل ہوتی رہی۔ کسی خلافت میں اس کے اندر کسی طرح کا کوئی تغیر نہیں ہوا اور ظاہر ہے کہ دروازہ مسجد خارج مسجد ہوتا ہے تو اس اذان کا بھی مسجد سے باہر ہونا سنت قرار ملا۔ اسی

بنابر فقہاء نے مسجد کے اندر اذان کہنا ممنوع ٹھہرایا۔

فتاویٰ قاضی خاں اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

و ینبغی ان یؤذن علی المنارۃ او خارج المسجد و لا یؤذن فی المسجد کذا

فی فتاویٰ قاضی خاں۔ (عالمگیری مجیدی ص ۲۹)

یعنی منارہ یا خارج مسجد میں اذان کہنا مستحب ہے اور مسجد میں اذان نہ کہی جائے۔

اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ اذان مسجد میں کہنا ممنوع ہے اور حکم تمام اذانوں کو عام ہے تو جمعہ کی یہ اذان دوم بھی اسی حکم میں داخل ہے۔ پھر جو اس کو اس میں داخل نہ مانے اور اس کو مسجد میں بلا کراہت جائز جانے وہ دلیل خصوص اپنے دعویٰ پر قائم کرے۔ اب رہا رواج کو دلیل ٹھہرانا تو ایسا رواج حجت شرعی نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) اذان کے کچھ دیر بعد دوسرے اعلان کو تثنیہ کہتے ہیں۔ فقہاء کرام نے اس تثنیہ کو جائز قرار دیا جس کی تصریح اکثر کتب فقہ میں موجود ہے۔ لیکن اس کے لئے کوئی خاص الفاظ مقرر نہیں۔ بلکہ اس کو ہر مقام کے عرف پر موقوف کیا گیا ہے۔ اور تثنیہ میں صلاۃ و سلام کے الفاظ ۸۱ھ میں جاری ہوئے۔ فقہاء نے انہیں بہتر و مستحسن قرار دیا ہے۔

فقہ کی مشہور کتاب درمختار میں ہے:

التسلیم بعد الاذان حدث فی ربيع الاخر سنة سبع مائة و احدى و ثمانین فی عشاء ليلة الاثنين ثم یوم الجمعة ثم بعد عشر سنین حدث فی الكل : المغرب ثم فیها مرتین و هو بدعة حسنة۔ (رد المحتار مصری ج ۱ ص ۲۷۳)

یعنی اذان کے بعد صلوٰۃ و سلام کی بنا ربیع الاخر ۱۷۱ھ کی شب و شنبہ کی نماز میں شروع ہوئی۔ پھر جمعہ کے دن میں۔ پھر دس سال بعد سوائے مغرب کے سب نمازوں میں شروع ہوا۔ پھر مغرب میں بھی دوبار۔ تو یہ صلوٰۃ و سلام بدعت حسنہ یعنی امر مستحسن ہے۔ لہذا اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ اذان کے بعد جماعت کے کھڑے ہونے سے کچھ دیر پہلے صلوٰۃ و سلام کہنا نہ فقط جائز بلکہ مستحسن ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۲۲۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ کے بارے میں کہ اذان کے کلمات کا جواب دینا کیسا ہے؟۔ موزن کے حی علی الصلوٰۃ، حی علی الفلاح۔ الصلوٰۃ خیر من النوم کے عوض کیا کہنا چاہئے؟۔ اور تکبیر کے کلمات کا جواب دینا بھی چاہئے؟۔ اگر جواب دیا جائے تب قد قامت الصلوٰۃ کے جواب میں کیا کہنا چاہئے؟۔ ہاں اذان کے بعد دعا پڑھنے سے پہلے درود شریف پڑھنا بھی آیا ضروری ہے یا اختیاری یا کیسا ہے؟۔

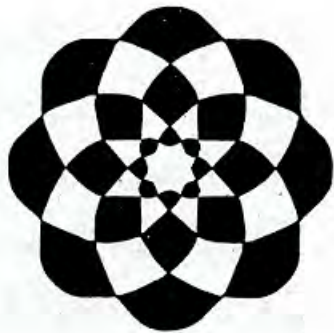
ج۔ م۔ اشرفی ۲۵ اکتوبر

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

اذان کے کلمات کا جواب مستحب بلکہ سنت ہے اور حی علی الصلوٰۃ و حی علی الفلاح کے جواب میں لاحول ولا قوۃ الا باللہ کہنا چاہئے۔ تکبیر کے کلمات کا جواب دینا مسنون نہیں۔ دے سکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل





باب ارکان الصلوٰۃ

(۲۲۹)

مسئلہ

جناب مفتی جی صاحب ہادی دین و جامع علوم ظاہری و منبع فیوض باطنی بعد مسنون السلام علیکم کے واضح ہو کہ آپ برائے مہربانی مسائل ذیل کے جواب باقاعدہ مہر کے تحریر فرمادیے جائیں عین مہربانی ہوگی۔ بندہ کومنون و مشکور فرمایگا (نوٹ) خط صاف ہوتا کہ پڑھنے میں مشکوک نہ ہو۔

اگر نمازی کے نماز پڑھنے میں کوئی دوسرا شخص آگے ہو کے گزر جائے تو وہ گنہگار ہوا یا نہیں اور نماز نماز پڑھنے والے کی باطل ہوئی یا نہیں؟ اگر قصد اگزر جائے تو اور سہواً گزر جائے ہر طرح کی تفصیل کر دیجئے گا۔

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

نمازی کے سامنے سے سہواً گزرنے والے تو گنہگار ہی نہیں۔ ہاں قصد اگزر نے والا سخت گنہگار ہے بہر صورت اس سے نماز کی نماز باطل نہیں ہوئی۔

کتبہ: المختصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،

العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنجل

(۲۳۰)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مسائل ذیل میں

امام نے نماز پڑھائی مقتدی نے اپنے غلط خیال سے یا بھول سے لقمہ دیا لیکن امام نے اپنے صحیح خیال کے مطابق مقتدی کا لقمہ رد کرتے ہوئے نماز ختم کی۔ تو اس لقمہ دینے سے مقتدی کی نماز میں نقص ہوا یا نہیں؟ اگر نقص ہو تو نماز کے اعادہ کی ضرورت ہے یا نہیں؟۔ بینو اتوجروا۔

مستفتی، مولوی محمد عبداللہ خان گنبد تالاب محلہ اون ضلع ایوب محل

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

اپنے امام کو بوقت حاجت لقمہ دینے سے مقتدی کی نماز میں کوئی نقص نہیں آتا اگرچہ لقمہ دینے میں اس سے سہواً غلطی ہوگئی ہو اس کو نماز کے اعادے کی بھی حاجت نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المختصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،

العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنجل

۱۵ اشوال ۱۳۷۷ھ

(۲۳۱-۲۳۲-۲۳۳)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین ان تین مسئلوں میں

(۱) رمضان المبارک میں قرآن کریم کی اجرت دیکر سننا کیسا ہے؟۔

(۲) زید کہتا ہے کہ نماز پڑھانے کی اجرت نہیں لینی چاہئے اگرچہ امام کا ذریعہ معاش یہی ہو تو

امام کو کیا کرنا چاہئے؟۔

(۳) اگر حافظ درکار ہو تو جانے آنے کا خرچ و دیگر خرچ طے کر سکتا ہے یا نہیں؟۔

حسن پور دوم

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

(۱) رمضان المبارک میں قرآن کریم کا اجرت دیکر سننا ممنوع ہے۔ اس کے جواز کے لئے وقت

کی اجرت مقرر کی جائے اور اس وقت میں قرآن شریف پڑھوایا جاسکتا ہے تو یہ اجرت قرآن کریم کی نہیں

بلکہ وقت کی ہوئی فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) نماز پڑھانے کی اجرت دینا اور لینا بلاشبہ جائز ہے۔ ہدایہ وغیرہ کتب فقہ میں یہ مسئلہ موجود

ہے اور متاخرین فقہاء نے امامت کی اجرت کے جواز کا فتویٰ دیا ہے فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) جو حافظ دور کار بننے والا ہو وہ اپنے جانے اور آنے کے اخراجات یقیناً طے کر سکتا ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

كتبه: المعتمد بزيل سيد كل نبى ومرسل، الفقير الى الله عز وجل،
العبد محمد اجمال غفر له الاول، ناظم المدرسة اجمال العلوم في بلدة سنجل

مسئله

(٢٣٣)

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الذى ارشدنا الى الملة الحنفية والصلوة والسلام على خير الانبياء
سيدنا محمد النبى الامى وعلى آله وصحبه اجمعين
لو فرغ الامام من الصلوة وتذكر ان ما صلاه خمسة ركعات فى ذوات الاربع
وتشهد فى القعدة الاولى وسها عن القعدة الاخيرة فهل يفسد صلاته ويجب عليه اعادة
الصلوة ام لا؟

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

الحمد لله الذى اوضح علينا الملة البيضاء وسهل لنا طريقنا بالارشاد والاهتداء
وجعل لنشرها رجالا بالافتاء واوجب على طائفتها الاستفتاء - والصلوة والسلام على
صاحب الجود والعطاء، ماحى الذنوب والخطاء، سيد الاولياء، نبى الانبياء، سيدنا محمد
الذى هو باعث تخليق الكون بلامتراء، وعلى آله الذين هم كالسفينة على وجه الماء
، وعلى اصحابه الذين هم كالنجوم على افق السماء، وعلى جميع الاصفياء والأتقياء، وعلى
سائر الفقهاء، وعلى من معهم الى يوم الجزاء -

اما بعد فاجيب عن السؤال ان سها عن القعدة الاخيرة فى ذوات الاربع وزاد
الركعة الخامسة بطل فرضه وتحول فرضه نفلا وعليه اعادة الفرض كذا فى الدر المختار
والغنية والطحاوى ورد المختار وغيرها - والله تعالى اعلم بالصواب -

كتبه: المعتمد بزيل سيد كل نبى ومرسل، الفقير الى الله عز وجل،
العبد محمد اجمال غفر له الاول، ناظم المدرسة اجمال العلوم في بلدة سنجل

مسئله

(٢٣٥)

هل للمصلى ان يفرج بين قدميه اكثر من اربع اصابع وكم من مقدار يكون بين
القدمين؟

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

يسن فى القيام تفريج القدمين قدر اربع اصابع اليد لانه اقرب الى الخشوع هكذا
فى الطحاوى وروى عن ابى نصر الدبوسى انه كان فعله كذا فى الكبرى صرح به
العلامة الشامى فى رد المحتار والله تعالى اعلم بالصواب -

كتبه: المعتمد بزيل سيد كل نبى ومرسل، الفقير الى الله عز وجل،
العبد محمد اجمال غفر له الاول، ناظم المدرسة اجمال العلوم في بلدة سنجل

مسئله

(٢٣٦)

لو رفع المصلى رجله فى السجود بعد الطمانية فهل تفسد به الصلوة ام لا؟

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

رفع الرجلين فى السجود بعد الطمانية غير مفسد للصلوة لانه وضع اصابعهما على
الارض قدر تسبيحة واستقر كل عضو فى محله بقدر الفرض والمفروض من الركن ادى
ما يطلق عليه اسم الفرض فيحصل بهذا القدر فرضية السجود ووجوبه لكنه مكروه لان
التسبيح فيه سنة لقوله عليه السلام اذا سجد احدكم فليقل سبحان ربى الا على ثلاث
مرات وذلك ادناه فتركه او نقصه مكروه كما هو مصرح فى كتب الفقه: والله اعلم
بالصواب -

كتبه: المعتمد بزيل سيد كل نبى ومرسل، الفقير الى الله عز وجل،

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

(۱) لا يجب عليه التشهد بعد فراغ امامه لان المسبوق متفرق بعد سلام الامام فلا يبقى عليه متابعة الامام فيقضى ما فات من صلواته والله تعالى اعلم بالصواب -

(۲) يستأنف الصلوٰۃ لترك الواجب ولا يجبر النقصان بسجدة السهو والله تعالى

اعلم -

(۳) نعم يجب عليه استئناف الصلوٰۃ لترك الواجب وهو تعقيب التشهد للقيام بلا

فاصل حتى لو سكت يلزمه السهو صرح به في رد المحتار والله تعالى اعلم بالصواب -

کتبہ: ۱۔ معتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہجل

مسئلہ

(۲۴۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع ان مسائل میں کہ
بیٹھ کر نماز پڑھنے میں ایڑی کو رکوع میں سرین سے علیحدہ کرنا چاہیے یا نہیں؟

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

رکوع میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کی حالت میں جھکنے کی انتہا تصریحات کتب فقہ سے اس قدر ثابت

ہے:

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

فان رکع جالساً ينبغى ان تحاذى جبهته ركبتين ليحصل الركوع ولعل مراده

انحناء الظهر عملاً بالحقيقة لا انه يبالغ فيه حتى يكون قريباً من السجود له -

(طحطاوی مصری ص ۱۳۳ ج ۱)

اگر بیٹھ کر رکوع کیا تو لائق یہ ہے کہ اپنی پیشانی کو اپنے دونوں گھٹنوں کے مقابل کرے تاکہ رکوع حاصل ہو۔ اس سے مراد پشت کا جھکانا ہے حقیقت پر عمل کرتے ہوئے نہ یہ بات کہ رکوع میں اتنا مبالغہ کر

ے کہ سجدہ کے قریب ہو جائے۔

علامہ ابن عابدین بر جندی سے رد المحتار میں ناقل ہیں:

لو كان يصلي قاعدا ينبغي ان يحاذي جبهته قدام ركبتيه فيحصل الركوع اذ قلت ولعله محمول على تمام الركوع والا فقد علمت حصوله با صل طأة الرأس اي مع انحناء الظهر -
(رد المحتار مصری ص ۳۱۳ ج ۱)

اگر بیٹھ کر رکوع کیا تو لائق یہ ہے کہ اپنی پیشانی کو اپنے دونوں گھٹنوں کے مقابل کرے تاکہ رکوع حاصل ہو۔ میں کہتا ہوں شاید کہ اسے تمام رکوع پر حمل کیا جائے ورنہ تو نے جان لیا کہ رکوع کا حصول پشت کے جھکانے اور سر کے نیچے کرنے سے ہو جاتا ہے۔

میری نظر میں ایڑی کو سرین سے جدا کر نیکی کوئی تصریح نہیں ہے۔ لیکن ان عبارات پر غور کرنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بیٹھنے کی حالت میں رکوع کی فرضیت تو صرف پشت کے جھکا دینے سے ادا ہو جائیگی اور اس جھکنے کی انتہا یہ ہے کہ پیشانی کو گھٹنوں کے مقابل کر دیا جائے اور یہ تقابل سرین کو ایڑی سے جدا کئے ہوئے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ تو پھر سرین کو ایڑی سے علیحدہ کر نیکی کوئی ضرورت داعی ہے۔ نیز اگر سرین کو ایڑی سے جدا کر کے پیشانی کو گھٹنے کے مقابل کیا جاتا ہے تو اقرب من السجود ہو جاتا ہے اور اس کی ممانعت عبارت طحطاوی سے گزری۔ اور سرین کو ایڑی سے بغیر جدا کئے ہوئے جب پیشانی کو گھٹنوں کے مقابل کیا جاتا ہے تو ہیئت سجدہ سے بالکل امتیاز ہو جاتا ہے اور رکوع سجدہ کا امتیاز شرعاً مطلوب ہے۔

طحطاوی میں ہے: وجعل ايماؤه للسجود اخفض من ايماؤه للركوع تمیزاً بينهما -
تو مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرین کو ایڑی سے جدا نہ کیا جائے۔ معہذا اس میں کسی حکم شرعی کی مخالفت بھی لازم نہیں آتی ہے تو بلا کسی تصریح کے کس طرح سرین کو ایڑی سے جدا کرنے کا حکم دیا جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب -

کتبہ: ۱۔ معتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہجل

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

(۱) لا يجب عليه التشهد بعد فراغ امامه لان المسبوق متفرق بعد سلام الامام فلا يبقى عليه متابعة الامام فيقضي ما فات من صلوته والله تعالى اعلم بالصواب۔

(۲) يستأنف الصلوٰۃ لترك الواجب ولا يجبر النقصان بسجدة السهو والله تعالى

اعلم۔

(۳) نعم يجب عليه استئناف الصلوٰۃ لترك الواجب وهو تعقيب التشهد للقيام بلا

فاصل حتى لو سكت يلزمه السهو صرح به في رد المحتار والله تعالى اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتبر بذي لیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۰۳ھ

مسئلہ

(۲۴۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع ان مسائل میں کہ
بیٹھ کر نماز پڑھنے میں ایڑی کو رکوع میں سرین سے علیحدہ کرنا چاہیے یا نہیں؟۔

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

رکوع میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کی حالت میں جھکنے کی انتہا تصریحات کتب فقہ سے اس قدر ثابت

ہے:

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

فان رکع جالساً ينبغي ان تحاذي جبهته ركبتين ليحصل الركوع ولعل مراده

انحناء الظهر عملاً بالحقيقة لا انه يبالغ فيه حتى يكون قريباً من السجود له۔

(طحطاوی مصری ص ۱۳۳ ج ۱)

اگر بیٹھ کر رکوع کیا تو لائق یہ ہے کہ اپنی پیشانی کو اپنے دونوں گھٹنوں کے مقابل کرے تاکہ رکوع حاصل ہو۔ اس سے مراد پشت کا جھکانا ہے حقیقت پر عمل کرتے ہوئے نہ یہ بات کہ رکوع میں اتنا مبالغہ کر

ے کہ سجدہ کے قریب ہو جائے۔

علامہ ابن عابدین بر جندی سے رد المحتار میں ناقل ہیں:

لو كان يصلي قاعد ينبغي ان يحاذي جبهته قدام ركبتيه فيحصل الركوع اهـ۔
قلت ولعله محمول على تمام الركوع والا فقد علمت حصوله باصل طأ طأة الرأس اي مع انحناء الظهر۔
(رد المحتار مصری ص ۳۱۳ ج ۱)

اگر بیٹھ کر رکوع کیا تو لائق یہ ہے کہ اپنی پیشانی کو اپنے دونوں گھٹنوں کے مقابل کرے تاکہ رکوع حاصل ہو۔ میں کہتا ہوں شاید کہ اسے تمام رکوع پر حمل کیا جائے ورنہ تو نے جان لیا کہ رکوع کا حصول پشت کے جھکانے اور سر کے نیچے کرنے سے ہو جاتا ہے۔

میری نظر میں ایڑی کو سرین سے جدا کر نیکی کوئی تصریح نہیں ہے۔ لیکن ان عبارات پر غور کرنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بیٹھنے کی حالت میں رکوع کی فرضیت تو صرف پشت کے جھکا دینے سے ادا ہو جائیگی اور اس جھکنے کی انتہا یہ ہے کہ پیشانی کو گھٹنوں کے مقابل کر دیا جائے اور یہ تقابل سرین کو ایڑی سے جدا کئے ہوئے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ تو پھر سرین کو ایڑی سے علیحدہ کر نیکی کوئی ضرورت داعی ہے۔ نیز اگر سرین کو ایڑی سے جدا کر کے پیشانی کو گھٹنے کے مقابل کیا جاتا ہے تو اقرب من السجود ہو جاتا ہے اور اس کی ممانعت عبارت طحطاوی سے گزری۔ اور سرین کو ایڑی سے بغیر جدا کئے ہوئے جب پیشانی کو گھٹنوں کے مقابل کیا جاتا ہے تو ہیبت سجدہ سے بالکل امتیاز ہو جاتا ہے اور رکوع تجود کا امتیاز شرعاً مطلوب ہے۔

طحطاوی میں ہے: وجعل ايماؤه للسجود اخفض من ايماؤه للركوع تميزاً بينهما۔
تو مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرین کو ایڑی سے جدا نہ کیا جائے۔ معہذا اس میں کسی حکم شرعی کی مخالفت بھی لازم نہیں آتی ہے تو بلا کسی تصریح کے کس طرح سرین کو ایڑی سے جدا کرنے کا حکم دیا جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتبر بذي لیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۰۳ھ

مسئلہ

(۲۴۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
امام مغرب کی پہلی دو رکعات میں سے ایک میں بعد سورۃ فاتحہ کے سورۃ فیل ”طیراً ابابیل“ تک
پڑھا اور اس کے بعد رکوع کر لیا تو یہ نماز صحیح ادا ہوگئی یا اس میں کوئی نقصان باقی رہ گیا؟۔ بینو اتو جروا

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

سورۃ فاتحہ کے بعد تین چھوٹی آیتوں یا ایک ایسی آیت جو تین چھوٹی آیات کے برابر ہو اس
قدر قرآن کا پڑھنا صحت نماز کے لئے کافی ہے۔ فقہ کی مشور کتاب در مختار میں ہے:

وضم سورة الكوثر او ما قام مقامها وهو ثلث آيات قصار نحو ثم نظر، ثم عبس
وبسر، ثم ادبر واستكبر۔ وكذا لو كانت آيات او الايتان تعدل ثلث قصار۔

شامی میں ہے: وان قرأ ثلث آيات قصار او كانت الآيات او الايتان تعدل ثلث
آيات قصار خرج عن حد الكبراهة المذكورة یعنی كراهة التحريم

اور صورت مسئلہ میں جب امام نے سورۃ فیل کو ”طیراً ابابیل“ تک پڑھ لیا ہے تو تین آیتیں
پوری ہو گئیں۔ تو نماز کے صحیح ادا ہونے میں کوئی شک ہی باقی نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: ا. معتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،

العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنجل

۲۶ ر شوال المکرم ۱۳۷۰ھ

مسئلہ

(۲۴۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
نماز پڑھتے وقت خیال کس طرف ہونا چاہئے اور نگاہ کس مقام پر ہونا چاہئے اور آنکھیں بند کر
کے نماز پڑھنا چاہئے یا نہیں؟ اور اگر چاہئے تو بھی کس طریقے سے اور آنکھیں کھول کر پڑھنے سے کیا
تصور کریں؟۔ صاف صاف تحریر کیجئے۔ بینو اتو جروا۔

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

نماز میں آنکھیں کھلی ہوئی رکھی جائیں۔ اور نگاہ قیام میں سجدہ کی جگہ کی طرف۔ اور رکوع میں
قدم کی پشت کی طرف۔ اور سجدہ میں ناک کی طرف اور قاعدہ میں گود کی طرف۔ اور پہلے سلام میں داہنے
کندھے کی طرف اور دوسرے سلام میں بائیں کندھے کی طرف رکھے۔ اور آنکھوں کو بند رکھنا مکروہ ہے۔
مگر جب آنکھیں کھلی ہوئی رکھنے میں خیالات منتشر ہوتے ہوں اور خشوع نہ ہوتا ہو تو انہیں بند رکھ سکتا ہے
بلکہ ایسے شخص کے لئے اولیٰ یہ ہے کہ انہیں بند ہی رکھے۔ ہذا کلمہ فی رد المحتار

اب باقی رہا خیال تو اس کی پوری توجہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رہے۔ اور ارکان نماز ادا کرنے میں
حضور ﷺ کے افعال کی مطابقت کا پورا خیال رکھے اور قرأت و تشهد اور درود شریف میں حضور ﷺ کی
جانب توجہ کرے کہ وہ درگاہ میں واسطہ ہیں۔ اور حضور کی طرف خیال کا لے جانا اللہ تعالیٰ کی طرف خیال
لے جانے کے منافی نہیں ہے۔ جیسے حضور کی اطاعت اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا ذکر قرآن کریم میں ہے
:”ومن يطع الرسول فقد اطاع الله“

حدیث قدسی میں ہے:

”جعلت ذكرا من ذكري فمن ذكرك ذكرني“ نقله القاضي في شفاؤه۔ واللہ

تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: ا. معتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،

العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنجل

(۲۴۶)

مسئلہ

یہاں اصل میں استفتاء اور جواب نہیں بلکہ صرف جواب الجواب ہی لکھا ہے۔
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے دیوبندیوں سے چلتی ریل میں نماز پڑھنے
کے بارے میں سوال کیا تو جواب میں مولوی مظفر حسین مظاہری نے صرف
’تنا لکھ دیا کہ اس میں اختلاف ہے، اور اسی طرح کی لایعنی چیزیں تھیں جن کی جانب
اس فتویٰ میں اشارہ ہے اور ساتھ ہی ان کا رد بھی۔

جواب الجواب:

الحمد لله وكفى - والصلوة على من اصططفى - ان مفتیان سہارنپور کے جواب کو دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ ان کو نہ فقہ سے کوئی علاقہ نہ احکام رسم المفتی سے کچھ واسطہ - اور ان میں نہ مسئلہ سمجھنے کی لیاقت نہ سوال کے جواب دینے کی صلاحیت - ہر اردو خواں جانتا ہے کہ سائل یہ دریافت کر رہا ہے کہ چلتی ریل گاڑی میں فرض نماز ادا ہوگی یا نہیں - مجیب اس کے جواب میں لکھتا کہ فرض نماز ادا ہو جائے گی یا ادا نہ ہوگی - یعنی کسی ایک صورت پر حکم قطعی دیتا - اور اس پر کوئی حوالہ کتاب نقل کر دیتا - لیکن وہ اپنی قابلیت کا اس طرح اظہار کرتا ہے -

اس مسئلہ پر جب ریل جاری ہوئی تھی علماء میں اختلاف تھا کہ اس میں نماز جائز ہے یا نہیں -
اولاً: اس عبارت میں ریل میں نماز پڑھنے کا اگر یہ مطلب ہے کہ ٹھہری ہوئی ریل میں تو اس کے لئے یہ کہنا جھوٹ اور غلط ہے - کہ اس مسئلہ پر علماء میں اختلاف تھا - اس کے آگے مجیب خود یہ اقرار کرتا ہے -

اگر ریل گاڑی ٹھہری ہوئی ہے تب تو بالاتفاق سب کے نزدیک نماز درست ہے -
تو مجیب کی کون سی بات صحیح ہے اور کونسی باطل -

ثانیاً: اگر ریل میں نماز پڑھنے کا یہ مطلب ہے کہ چلتی ریل میں نماز پڑھنے پر علماء کا اختلاف تھا تو اس میں دریافت طلب امر یہ ہے کہ علماء سے علمائے اہل سنت و ہابیہ کے مابین کا اختلاف مراد ہے؟ - یا صرف علمائے اہلسنت کے مابین کا اختلاف ہے؟ - یا فقط علمائے وہابیہ کے مابین کا اختلاف؟ -
ثالثاً: اگر صرف علمائے اہلسنت کے مابین کا اختلاف مراد ہے تو مجیب اس کا ثبوت پیش کرے اور یہ بتائے کہ علمائے اہلسنت کا اس میں کیا اختلاف ہے اور اس اختلاف کو کس نے لکھا اور کس کتاب میں کہاں لکھا ہے؟ - اور اگر صرف علمائے وہابیہ کے مابین کا اختلاف مراد ہے تو ان میں کیا اختلاف ہے؟ - اور موافقین کے کیا کیا اسماء ہیں؟ - اور مخالفین کے کیا نام ہیں؟

رابعاً: اگر علمائے اہلسنت و علمائے وہابیہ کے مابین کا اختلاف مراد ہے تو چلتی ریل میں جواز فرائض و واجبات کے مخالف علمائے اہلسنت ہی قرار پاتے ہیں کہ مجیب کا یہ قول ہمارے مشائخ کی تحقیق یہ ہے الخ - اس کی کافی دلیل ہے یا نہیں -
پھر مجیب صاحب تحریر فرماتے ہیں:

اگر ریل گاڑی ٹھہری ہوئی ہے تب تو بالاتفاق سب کے نزدیک نماز درست ہے -

اولاً: سائل اس صورت کا سوال ہی نہیں کر رہا ہے تو مجیب کا جواب میں یہ لکھنا سوال از آسمان و جواب از ریسمان جیسا جواب ہے -

ثانیاً: اگر اس عبارت میں الفاظ (بالاتفاق سب کے نزدیک) سے صرف علمائے وہابیہ ہی مراد لیے جاتے ہیں تو پھر آگے کے یہ الفاظ - ہمارے مشائخ - آخر کس لئے ہیں -

ثالثاً: اور اگر اس میں صرف علمائے اہل سنت کا اتفاق مراد لیا جاتا ہے تو علمائے وہابیہ کا مسلک اس کے خلاف ثابت ہوا جاتا ہے -

رابعاً: جب ٹھہری ہوئی ریل میں نماز جائز ہے تو وہ اسی بنا پر تو ہے کہ وہ مثل سر پر موضوع علی الارض ہے - لہذا ٹھہری ہوئی گاڑی میں نماز پڑھنا گویا زمین پر ہی نماز پڑھنے کے حکم میں ہوا - تو یہ تعلیل صرف ٹھہری ہوئی گاڑی کی ہوئی یا نہیں؟ - پھر مجیب اس کے بعد لکھتا ہے -

البتہ چلتی ریل میں نماز پڑھنے میں اختلاف ہے بعض علماء ایسی صورت میں نماز جائز نہیں کہتے -
اولاً: ان بعض علماء سے اگر صرف علمائے اہلسنت مراد ہیں تو وہ بعض علمائے اہلسنت کون کون ہیں جو ایسی صورت میں فرائض و واجبات کو جائز نہیں کہتے ہوں؟ - ورنہ اس کو یوں لکھنا تھا کہ کل علمائے اہلسنت ایسی صورت میں نماز جائز نہیں کہتے - تو کل کو بعض کہنا مغالطہ نہیں تو اور کیا ہے -
ثانیاً: اور اگر بعض علماء سے بعض علمائے وہابیہ مراد ہیں تو وہ بعض آیا مشائخ وہابیہ میں داخل ہیں یا نہیں -

ثالثاً: اگر وہ بعض مشائخ وہابیہ سے نہیں تو ان کا یہ قول باقرار مجیب غیر محقق اور مرجوح قرار پایا نہیں؟ -

رابعاً: قول مرجوح کا فتویٰ میں پیش کرنا بحکم رسم المفتی جہالت ہے یا نہیں؟ -

خامساً: اور اگر وہ بعض مشائخ وہابیہ میں داخل ہیں تو پھر مجیب کا یہ لکھنا

ہمارے مشائخ کی تحقیق یہ ہی ہے کہ نماز دونوں صورتوں میں درست ہے - جھوٹ اور غلط ہوا یا نہیں - پھر مجیب اس کے بعد لکھتا ہے:

ہمارے مشائخ کی تحقیق یہ ہی ہے کہ نماز دونوں صورتوں میں جائز ہے -

اولاً: اس عبارت میں ہمارے مشائخ سے نہ فقہائے کرام و مصنفین کتب مشہورہ مراد ہو سکتے ہیں

اس لئے کہ ان کے زمانہ سابقہ میں ریل جاری نہ ہوئی تھی تو وہ اس کی تحقیق ہی کیوں فرماتے۔ اور نہ ان مشائخ سے علمائے اہلسنت مراد ہو سکتے ہیں کہ علمائے اہلسنت جب دیوبندیوں کو گمراہ و بے دین کہتے ہیں اور دیوبندی انہیں اہل بدعت و شرک لکھتے ہیں۔ تو دیوبندی ان علمائے اہلسنت کو اپنا مشائخ کس طرح قرار دے سکتے ہیں۔ لہذا اب ان مشائخ سے اکابر دیوبندی مراد ہوتے ہیں۔ تو یہ ثابت ہو گیا کہ تمام دیوبندیوں کا یہی مسلک ہے کہ اگر فرائض و واجبات چلتی ہوئی اور ٹھہری ہوئی گاڑی کی دونوں صورتوں میں نماز درست ہے۔ مجیب نے اس کو پردہ اجمال میں کیوں ذکر کیا۔

ثانیاً: جب سوال میں یہ اشارہ تھا کہ یہ مسئلہ بریلوی حضرات نے طلب کیا ہے تو مجیب پر لازم تھا کہ اپنے ان مشائخ کی تحقیق کو نقل کرتا۔ اور مخالفین کے سامنے اپنے مشائخ کے دلائل کو پیش کرتا۔ پھر یہ مجیب اپنے اس دعویٰ یہ دلیل قائم کرتا ہے۔

کیوں کہ اگر ریل مثل سریر موضوع علی الارض ہے تو ظاہر ہے کہ نماز درست ہی ہے۔

اولاً: مجیب کا دعویٰ تو یہ ہے کہ چلتی ہوئی ریل میں نماز درست ہے اور دلیل یہ ہے کہ جو تخت زمین پر ایک جگہ رکھا ہوا ہے اس پر نماز درست ہے۔ تو اس دلیل سے دعویٰ کس طرح ثابت ہوا؟

ثانیاً: اگر مجیب یہ کہتا ہے کہ چلتی ہوئی ریل اس چلتے ہوئے تخت کی مثل ہے جس کو رسی سے باندھ کر کھینچا جا رہا ہے تو ممانعت بھی پائی جاتی۔ اور دلیل دعویٰ کو ثابت کر دیتی۔ لیکن مجیب کو یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ جس تخت کو رسی سے باندھ کر کھینچا جائے اور برابر جگہ بدلتی رہے جب بھی اس چلتے ہوئے تخت پر نماز فرض و واجب درست ہے۔

ثالثاً: مجیب کا یہ استدلال ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کہے زمین پر چلتے ہوئے نماز پڑھنا درست ہے۔ کیونکہ زمین پر بھی پڑھنا درست ہے۔ تو بتائیے کہ یہ استدلال صحیح ہے یا نہیں؟

رابعاً: رد المحتار میں ہے۔ ”اختلاف المكان مبطل العذر“ تو نمازی کے لئے اتحاد مکان شرط ہوا یا نہیں۔ اور چلتی ریل میں اختلاف مکان ہوتا ہے یا نہیں۔

خامساً: رد المحتار میں ہے۔ ”اتحاد المكان واستقبال القبلة شرط فی صلاة غیر النافلة عند الامکان لا یسقط الابعذر۔ اسی میں ہے۔“ فالتحویل مفسد اذا کان قدراً داء رکن ولو کان فی مکانہ“ اور چلتی ہوئی ریل میں کبھی فرض نماز میں قبلہ سے انحراف ہو جاتا ہے تو یہ انحراف مفسد نماز ہے یا نہیں؟ اور مجیب اپنی اس دلیل کی تائید میں در مختار کی یہ عبارت پیش کرتا ہے۔ وان لم

یکن طرف العجلة علی الدابة جاز لو واقفة لتعلیلہم انها کالسریر۔

اولاً: مجیب نے نقل عبارت میں اتنی غلطی کی کہ ”بانہا کالسریر“ کے بجائے ”انہا کالسریر“ لکھا۔ یعنی باء جارہ کو چھوڑ کر عبارت کو بے ربط کر دیا۔

ثانیاً: مجیب نے عبارت نقل کر دی لیکن کاش اگر اس عبارت کو سمجھ بھی لیا ہوتا تو ایسی شرمناک غلطی نہ ہوتی۔ مگر بہت ممکن ہے کہ غیر زبان کی عربی عبارت ہے۔ مجیب کی سمجھ میں نہ آئی ہو تو اسکی تفہیم کے لئے پہلے میں اردو میں ترجمہ لکھ دوں اور وہ بھی مجیب ہی کے پیشوا مولوی احسن نانوتوی کا ترجمہ۔

چنانچہ غایۃ الاوطار ترجمہ در مختار میں اس کا ترجمہ یہ ہے۔

اور اگر گاڑی کا سر نیل وغیرہ پر نہ ہو تو نماز اس میں جائز ہے اگر وہ کھڑی ہو چلتی نہ ہو بہ سبب علت بیان کرنے فقہاء کے کہ زمین پر کھڑی ہوئی گاڑی مثل تخت کے ہے۔

(غایۃ الاوطار کشوری ص ۳۲۳ ج ۱)

کہیے مجیب صاحب اب یہ اردو ترجمہ دیکھ کر تو آپ کی سمجھ میں بھی آ گیا ہو گا کہ یہ عبارت در مختار کھڑی گاڑی کے لئے ہے نہ کہ چلتی گاڑی کے لئے۔ اب آپ خود ہی بتائیں کہ اس عبارت کو اپنے دعوے کے ثبوت میں نقل کرنا جہالت نہیں تو اور کیا ہے۔

ثالثاً: اس عبارت سے ثابت ہوا کہ فقہاء کرام نے تو زمین پر کھڑی ہوئی گاڑی کو مثل تخت قرار دیا ہے اور مجیب نے اس کے مقابلہ میں چلتی ریل گاڑی کو مثل تخت ٹھہرا کر اپنے مجتہد ہونے کا اعلان کیا ہے۔

رابعاً: اس عبارت میں ”جاز لو واقفة“ کی جب تصریح موجود ہے تو چلتی ریل گاڑی میں جواز صلوٰۃ کا حکم اس عبارت کے کون سے لفظ سے ثابت ہو رہا ہے۔

خامساً: فقہائے کرام نے جس گاڑی کو مثل تخت کے قرار دیا ہے تو وہ اسی بنا پر تو ہے کہ تخت چار پایوں پر زمین پر قائم ہے اسی طرح گاڑی بھی چار پہیوں پر زمین پر قائم ہے۔ اب باقی رہا گاڑی کا چلنا اس کی تخت سے مماثلت کس بنا پر ہے۔ پھر اس عبارت کے بعد مجیب نے شامی کی یہ عبارت پیش کی۔

قوله لو واقفة کذا قیدہ فی شرح المنیۃ ولم ارہ لغيرہ یعنی اذا كانت العجلة علی الارض ولم یکن شیء منها علی الدابة وانما بها حبل مثلاً تجرہا الدابة تصح الصلوٰۃ علیہا لانہ حیثئذ کالسریر الموضوع علی الارض ومقتضى هذا التعلیل انها لو كانت سائرة فی هذه الحالة لا تصح الصلوٰۃ علیہا بلا عذر وفیہ تأمل لان جرہا بالحبل وہی علی الارض

لا یخرج به عن کونها علی الارض ویفیدہ عبارة التتار خانیة - شامی -

اقول: اولاً: مجیب سے نقل عبارت میں دو غلطیاں ہوئیں۔ ایک تو ”تجرها الدابة“ کے بعد لفظ ”به“ کو چھوڑ گیا۔ دوسرے اسی سطر میں ”لانه“ لکھ دیا ہے۔ تو مجیب نے یہ غلطیاں قصداً کیں ہیں یا سہواً؟

ثانیاً: چار پہیے والی گاڑی کو اگر کھینچا جائے تو اس میں شک نہیں کہ وہ زمین ہی پر رہی لیکن جب وہ چل رہی ہے تو اس سے اختلاف مکان برابر ہوتا چلا جا رہا ہے اور اتحاد مکان شرائط نماز سے ہے۔ شامی میں مجیب کی پیش کردہ عبارت کے بعد ہی اسی بحث میں ہے۔

اتحاد المكان واستقبال القبلة شرط فی صلاة غیر النافلة عند الامکان لا یسقط الا بعد رفلوا مکنه ایقافها مستقبل فعل۔

تو چلتی ہوئی ریل میں شرط صلاة یعنی اتحاد مکان کا فوت ہونا فرائض و واجبات کو مجیب کی پیش کردہ عبارت سے کس طرح جائز و درست کر دیگا۔

ثالثاً: اسی طرح چلتی ریل میں دوسری شرط صلاة استقبال قبلہ کا بدل جانا انہیں کس بنا پر درست صحیح کر دیگا۔

رابعاً: علامہ شامی نے عدم قیدی بنا پر ایک احتمال کا استفادہ کیا لیکن اس کو قائل کہہ کر اس پر جزم نہ فرمایا تو جواز کے لئے حکم قطعی کس طرح حاصل ہوا۔

خامساً: علامہ شامی نے عبارت مذکورہ جواب کے چند سطر بعد فرمایا: ”قلت بقی لو امکنه الا یقاف دون الاستقبال فلا کلام فی لزومه“ تو یہ عبارت چلتی ریل میں واجب و فرض نماز کی صحت ثابت کرتی ہے یا عدم صحت۔

سادساً: علامہ شامی کا آخر بحث میں یہ فرمانا۔ والظاهر ان الاول اولی لان الضرورة تنقلد بقدرها فتامل اسکا کیا مطلب ہے۔ اور یہ چلتی ریل میں نماز کے مجوزین کے لئے مفید ہے یا مانعین کے لئے۔ پھر مجیب اپنا فتویٰ اس عبارت پر ختم کرتے ہیں۔

اور اگر مثل عجلہ محمولہ علی الدابة مانی جائے تو تب بھی بوجہ عذر کے چلتی ریل میں اتر نہیں سکتا اسی میں نماز پڑھنا درست ہے۔ اما الصلاة علی العجلة ان كانت طرف العجلة علی الدابة وهی تسیر ولا تسیر فتجوز فی حالة العذر الخ شامی واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ مظفر حسین مظاہری دارالافتاء مدرسہ مظاہر علوم۔ سہارن پور

الجواب صحیح سعید احمد غفرلہ مفتی مظاہر العلوم ۱۱-۲۲-۳۷ھ

اولاً: شامی میں یہ عبارت بلفظ کہاں ہے ہاں درمختار کی یہ عبارت ہو سکتی ہے۔

ثانیاً: اور اگر یہ درمختار ہی کی عبارت ہے تو اس میں ایک غلطی یہ ہے کہ ”ان كانت“ کے بجائے ”ان كان“ ہے اور دوسری غلطی یہ ہے کہ ”لا تسیر“ کے بعد ”فتجوز فی حالة العذر کو لکھ دیا اور درمیان میں ”فهی صلاة علی الدابة“ کو مجیب نے کیوں چھوڑ دیا۔ تو یہ نقل عبارت میں تحریف ہے یا نہیں۔

ثالثاً: ریل گاڑی کی بعض بوگی چار پہیوں پر اور بعض آٹھ پہیوں پرز میں پر قائم ہے اسی بنا پر وہ مثل سریر موضوع علی الارض کے حکم میں ہے تو وہ مثل عجلہ محمولہ علی الدابة کس طرح ہو سکتی ہے۔

رابعاً: عجلہ محمولہ علی الدابة وہ گاڑی ہے جو خود زمین پر قائم ہو۔ اگر اس میں دو پہیے ہوں تو اس کا جوا وغیرہ جانور پر ہو۔ تو ریل کی بوگی کو اس کی مثل کس نے مانا ہے۔ غالباً مجیب کے مشائخ ہی اس کے ماننے والے ہوں گے۔

خامساً: جب ریل عقلاً و نقلاً کسی طرح عجلہ محمولہ علی الدابة کے مثل نہیں ہو سکتی تو اس شق کے ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہے اور مجیب کے مسلک کو اس سے کیا قوت پہنچتی ہے۔

سادساً: جس جانور کا ٹھیرنا ممکن ہو اور وہ چل رہا ہے تو بوجہ اس کے چلنے کے عذر کے کیا اس پر نماز واجب و فرض درست ہے۔ تو اس عبارت کا کیا جواب ہے۔ و اذا كانت تسیر لا تجوز الصلوٰۃ علیہا اذا قدر علی ایقافها۔ (شامی)

سابعاً: جو حکم جانور پر نماز کا ہے وہی عجلہ محمولہ علی الارض کا ہے اور جب بقول مجیب ریل گاڑی عجلہ محمولہ علی الدابة کے مثل ہے تو ٹھہری ہوئی ریل گاڑی پر بھی بلا اترے ہوئے بغیر عذر کے واجب و فرض نماز درست نہ ہوگی تو مجیب نے خود اپنے آپ کو جھٹلادیا۔

ثامناً: جب ریل گاڑی ہر نماز کے وقت میں کسی اسٹیشن پر ضرور ٹھہرتی ہے اور معین وقت پر پہنچ جاتی ہے اور کم از کم اتنی دیر ٹھہرتی ہے کہ مسافر چھوٹی سورتوں سے ٹھہری گاڑی میں فرض کی دو رکعتیں پڑھ سکتا ہے اور گاڑی سے اترنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ لہذا مجیب یہ بتائے کہ عذر شرعی کون کون ہے۔

تاسعاً: جب ریل گاڑی کو مثل عجلہ محمولہ علی الدابة کے مانا جائے تو چلتی ہوئی اور ٹھہری ہوئی دونوں کا الگ حکم ہوگا کہ نماز حالت عذر میں درست ہوگی اور بلا عذر درست نہ ہوگی تو ٹھہری ہوئی ریل

میں بھی نماز بلا عذر درست نہ ہوئی اور مجیب نے ابتدائے فتویٰ میں لکھا: اگر ریل گاڑی ٹھہری ہوئی ہے تب تو باتفاق سب کے نزدیک نماز درست ہے۔ تو مجیب کا کونسا حکم حق و صحیح اور کونسا غلط و باطل۔

عاشراً: مولوی احسن نانوتوی لکھتے ہیں۔ اگر وقت باقی رہنے تک توقف کرے اور ریل کے ٹھہرنے پر نماز پڑھے تو یہ صورت احتیاط کی ہے۔ اب مجیب بتائے کہ یہ اس کے مشائخ سے ہیں یا نہیں اور ان کا یہ حکم کیسا ہے؟

بالجملہ اس فتویٰ سہارنپور پر اس وقت اپنی عدیم الفرستی اور لڑکے کی شدید علالت کے باوجود ایک سرسری نظر کر کے تقریباً و تخمیناً پچاس مطالبات پیش کر دئے ہیں۔ اگر مفتی سہارنپور کو اپنے علم و قابلیت کا کچھ زعم بھی ہو اور اپنے فتوے کی صحت کا ادنیٰ خیال بھی ہو اور اپنی غلطیوں کا ذرہ بھر احساس بھی ہو تو ان میرے مطالبات کے معقول اور مدلل جواب دیں تو پھر انشاء اللہ تعالیٰ اس مسئلہ پر کافی اباحت پیش کر دی جائیں گی اور اگر ان مفتی صاحب نے میرے مطالبات کے جوابات ہی نہ دئے۔ یاد دئے تو بغیر مدلل اور نامعقول جوابات دئے تو ان کی غلطی اور عجز کا اعتراف خود ان کے فعل سے ظاہر ہو جائے گا۔ مولیٰ تعالیٰ انہیں قبول حق کی توفیق عطا فرمائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۲۲ محرر الحرام ۱۳۷۵ھ

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۲۲۷-۲۲۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

(۱) مکبر تکبیر کس جگہ کھڑے ہو کر پڑھے امام کے بالکل پیچھے یا داہنے بائیں کھڑے ہو کر تکبیر کہے کیا حکم شرع ہے؟

(۲) تکبیر ہوتے وقت امام کا مصلے پر ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر امام مصلے پر نہ ہو اور مکبر تکبیر پڑھے تو کیا حکم شرعی ہے؟ مینواتو جروا۔

المستفتی اعجاز احمد پبلی بھیتی عنہ ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۷۵ھ

الجواب

اللہم ہدایۃ الحق والصواب

(۱) مکبر کو بہتر یہ ہے کہ امام کے پیچھے کھڑے ہو کر تکبیر کہے اور اگر وہاں موقع نہ ہو تو امام کے داہنی طرف تکبیر کہنی چاہئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) بوقت تکبیر امام کا مصلے پر ہونا ضروری نہیں ہے یہاں تک کہ اگر امام بعد تکبیر کے آیا تو اس تکبیر کو دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں۔

طحاوی میں ہے: لو حضر الامام بعد ما بساعة لا یعیدھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب
۵ ربیع الآخر ۱۳۷۵ھ

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۲۲۹)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

ایک شخص پنج وقتہ فرض نماز کے بعد باواز بلند کلمہ طیبہ کہتا ہے تین بار باواز بلند کلمہ طیبہ ادا کرتا ہے۔ چند اشخاص اس کے اس عمل سے اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کلمہ طیبہ بلند آواز سے کہنا کسی جگہ نہیں آیا۔ صرف دل میں کہنا چاہئے اور اگر کسی جگہ آیا ہے تو ہمیں بتلادیا جائے تاکہ ہم بھی پڑھیں۔ اس پر کافی اختلاف ہے از روئے شریعت مطہرہ کیا حکم ہے واضح طور پر سپرد جواب سے روشناس کرائیں نیز معتبر کتب، احادیث سے حوالہ جات بھی نقل فرما کر مہر تصدیق ثبت فرمائیں ممنون و مشکور ہوں گا عین نوازش ہوگی۔

(نوٹ) جواب جلد از جلد ارسال فرما کر مشکور فرمائیں کیونکہ یہ وجہ اختلاف شدت سے زور پکڑ رہا ہے زیادہ حدادب۔ اگر میرے پتہ پر جواب ارسال فرمائیں تو قبلہ جناب منشی خلیل احمد صاحب بلاری ارسال فرمادیا جائے وہاں سے حاصل کر لیا جائے گا۔

نیاز مند عاقل حسین نائب مدرس مدرسہ کھٹھی قصبہ بلاری ضلع مراد آباد یوپی

الجواب

اللہم ہدایۃ الحق والصواب

پنج وقتہ فرض نمازوں کے بعد باواز بلند نمازیوں کا ذکر کرنا حدیث شریف سے ثابت ہے۔

صحیح مسلم شریف میں حضرت ابو معبد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

ان ابن عباس اخبرہ ان رفع الصوت بالذکر حين ينصرف الناس من المكتوبة كان على عهد النبي صلى الله تعالى عليه وسلم وقال كنت اعلم اذا انصرفوا بتلك اذا سمعته۔
(مسلم شریف ج ۱ ص ۲۱۷)

کہ انہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ لوگوں کا فرض سے فراغت کے وقت ذکر باواز بلند کرنا نبی علیہ السلام کے زمانہ میں بھی تھا۔ اور فرمایا میں ذکر سے ان کے نماز ختم کر لینے کو جان لیتا جب ذکر کی آواز سن لیتا۔

اور طحاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

و يستفاد من الحديث الاخير جواز رفع الصوت بالذکر والتكبير عقيب المكتوبة بل من السلف من قال باستحبابه و حزم به ابن حزم من المتأخرين۔
اور اخیر حدیث سے فرض نمازوں کے بعد ذکر اور تکبیر باواز بلند کہنے کا جائز ہونا ثابت ہوا۔ بلکہ بعض سلف سے اس کا مستحب ہونا مروی ہے اور متأخرین میں سے حضرت علامہ ابن حزم نے اسی پر حزم کیا ہے۔

اس حدیث شریف اور عبارت فقہ سے ثابت ہو گیا کہ فرض نمازوں کے بعد باواز بلند ذکر کرنا نہ فقط جائز بلکہ سلف کے نزدیک مستحب ہے بلکہ عمل صحابہ کرام کی بنا پر سنت ہے۔ اور کون نہیں جانتا کہ کلمہ طیبہ افضل الذکر ہے۔ لہذا کلمہ طیبہ کا بھی فرض نمازوں کے بعد باواز بلند کہنا اسی حدیث شریف اور عبارت فقہ سے ثابت ہو گیا۔ تو جواب اس کو منع کرے وہ حدیث کا منکر حکم فقہ کا مخالف۔ سنت صحابہ کا دشمن ہے۔ مولیٰ تعالیٰ ایسے شخص کو ہدایت دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۳۰ جمادی الاول ۱۳۷۳ھ

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۲۵۰)

مسئلہ

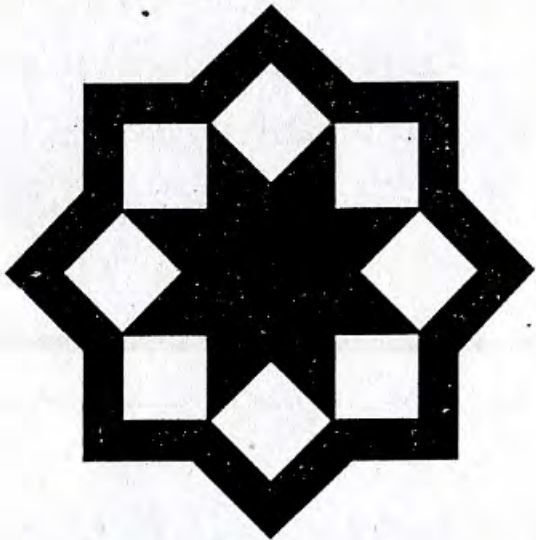
کیا فرماتے ہیں علمائے کرام ومفتیان شرع عظام دامت برکاتہم مسئلہ ذیل کی بابت

نماز میں سیدھے پاؤں کا اٹکھٹا اپنی جگہ قائم رہے، رکوع سجدہ وغیرہ میں بالکل نہ ہٹے۔ کیا یہ شرعا حکم ہے۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ سمجھ لیا جائے کہ سیدھے پاؤں کے اٹکھٹے میں کیل ٹھونک دی گئی ہے اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتا۔ کیا یہ صحیح ہے؟

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

نماز میں ہر دو پاؤں کے اٹکھٹوں اور انگلیوں کو زمین پر نوک سے لے کر جڑ تک لگا رہنا ضروری ہے۔ قعدہ میں بایاں پاؤں جسے بچھا لیا جاتا ہے تو یہ حالت تو مستثنیٰ ہے لیکن صرف سیدھے پاؤں کے اٹکھٹے کے زمین پر قائم رہنے کی خصوصیت یہ عوام میں مشہور ہے۔ جس کی کوئی سند نظر سے نہیں گزری۔
واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ **کتبہ:** الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول





باب القرات

مسئلہ

(۲۵۱)

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ

جس طرح الحمد پڑھنے والے لوگ امام کے پیچھے اپنے دلائل صریح صاف صاف حضور ﷺ کی احادیث کے الفاظ سناتے ہیں اور معتبر معتبر احادیث کی کتابوں کے حوالے مستند علماء کے یہاں سے دیتے ہیں جن سے یقین کامل ہو جاتا ہے کہ الحمد پڑھنا مقتدی کو ضرور چاہئے، مثلاً یہ حدیث پیش کرتے ہیں:

قال رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم: لا صلوة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب

خلف الامام - رواه البيهقي في كتاب القرات صفحه ۴۷ وقال هذا اسناد صحيح -

ترجمہ: یعنی فرمایا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے: کہ نہیں نماز ہوئی اس شخص کی جس نے امام کے پیچھے سورہ الحمد نہیں پڑھی۔ روایت کیا اس حدیث کو امام بیہقی نے کتاب القرات میں اور کہا اسناد اس کی صحیح ہے۔ لہذا مذہب حنفیہ میں جو مقتدی کو الحمد پڑھنے کی ممانعت ہے یہ کس قاعدہ اور دلیل کی رو سے ہے؟ امید کہ جواب کافی وافی ہونا چاہئے ورنہ لوگوں کے کہنے سے اور بتانے سے چند آدمی اس طرف متوجہ ہوئے جاتے ہیں۔ بینوا تو جروا۔

الجواب

الحمد لله رب العلمين - والصلاة والسلام على افضل المرسلين وعلى اله

واصحابه اجمعين

ہندوستان میں امام کے پیچھے بھی الحمد پڑھنے والے بالعموم غیر مقلد ہیں، انھیں احادیث شریفہ سے استدلال کرنے کی کیا لیاقت۔ ائمہ دین جن کے سینے علوم کے بحر موج تھے انہوں نے کیسی کیسی عرق ریزیاں کیں اور مختیس اٹھائیں تب اس مرتبہ کو پہنچے کہ آیات کریمہ اور احادیث سے استنباط احکام کر سکیں۔ ان بے خردان زمانہ کو تو ہنوز غالب اور داغ کے ارد و کلام سمجھنے کا سلیقہ نہیں، وہ معدن علوم تک کیونکر رسائی

کر سکتے ہیں۔ قرأت خلف الامام ہی کا مسئلہ سمجھئے اس میں جس قدر احادیث وارد ہیں اور جو حکم قرآنی ہے سب پر نظر رکھ کر فیصلہ کرنا آج تک نہ کسی غیر مقلد کو میسر آسکا، نہ آسکے الی یوم القیامۃ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ مجبوراً وہی کرتے ہیں کہ جو حدیث ان کے سامنے پیش کر دی جائے تو اس کے ماننے ہی میں طرح طرح کے حیلہ حوالے نکالیں خواہ وہ مسلم و بخاری کی حدیث کیوں نہ ہو۔ اور اپنے آپ بیہقی کی روایت لے آئیں اور اس کو معتبر جانیں۔ مجھے یہاں بیہقی پر جرح مد نظر نہیں ہے بلکہ ان کی خود مطلبی و نفسانیت کا ایک نمونہ پیش کرنا ہے کہ جو شخص اپنے مطلب کے موافق سمجھ کر کسی حدیث کو بیہقی سے اخذ کرتا ہے اور بیہقی کی کتاب کو حدیث کی معتبر کتاب مانتا ہے اس کے مخالف مدعی کوئی حدیث کسی دوسری کتاب کی پیش کر دی جائے تو اس میں کلام کرنے لگتا ہے، کس قدر نفسانیت ہے۔ العیاذ باللہ من شرور انفسنا۔

بیہقی کی یہی روایت جس سے استفتاء میں استناد کیا ہے غیر مقلدین جو روایت میں مفہوم مخالف کے قائل ہیں، کیا سمجھ کر پیش کر سکتے ہیں۔ فصحاء کے کلام میں زیادت افادت سے خالی نہیں ہوتی۔ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے تمام عالم کے فصحاء کو کیا نسبت۔ اب بتائے کہ جس حدیث کو یہ اپنے اپنے مدعی کے لئے دلیل صریح صاف بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ اس میں کیا اتنے ہی الفاظ اس مطلب کے لئے کافی نہ تھے کہ ”لا صلوة لمن لم یقرأ بفاتحة الكتاب“ کیا اس سے متدل کے نزدیک فرضیت قرأت فاتحہ مستفاد نہیں ہوتی تھی۔ اگر نہیں ہوتی تھی تو کیا لفظ خلف الامام افادہ فرضیت کرتا ہے؟ یہ شاید کوئی مسلوب الحواس کہے تو کہے کوئی عقل و ہوش رکھنے والا نہ کہہ سکے گا۔ اگر کہیں کہ ”لا صلوة لمن لم یقرأ بفاتحة الكتاب“ سے فرضیت قرأت فاتحہ ہوتی تھی تو پھر خلف الامام کس فائدہ کے لئے آیا۔ آیا یہ مطلب ہے کہ امام کے پیچھے پڑھنے والے کی نماز تو بغیر فاتحہ پڑھے نہ ہوگی مگر خود امام کی اور منفردوں کی نمازیں بغیر فاتحہ کے ہی ہو جاتی ہیں۔ حدیث نقل کر دینا تو آسان تھا مگر ذرا اسے سمجھ کر بھی دکھائیے۔ یا یہ بات ہے کہ حدیث سمجھے یا نہ سمجھے مسائل دین میں دخل دینا اور ائمہ کی مخالفت کرنا روا ہو گیا۔ پھر یہ بتائیں کہ ”لا صلوة لمن لم یقرأ بفاتحة الكتاب“ کا مطلب کیا ہے۔ آیا یہ کہ جس نماز میں امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھی صرف وہی نماز ناجائز ہے، جب تو یہ بتائیں کہ ”لا کیسا ہے، اور کس چیز کی نفی کرتا ہے۔ اور دلیل خصوص کیا ہے؟ یا مطلب یہ ہے کہ جس نے کبھی امام کے پیچھے فاتحہ ترک کی اس کی عمر بھر کی کوئی نماز ہی صحیح نہ رہی، سب باطل ہو گئیں، عمل ہی جط ہوئے۔ اگر ایسا کہیں تو کیا ان سے پہلے دنیا میں اور کوئی اس کا قائل ہوا ہے اور جن صحابہ نے امام کے پیچھے قرأت نہ کی ان کی عمر بھر کی نمازیں کیا ہوئیں؟ اور کیا

چھلی نمازیں جو تمام شرائط و آداب کے ساتھ ادا کی گئی تھیں، ان کی صحت موقوف بھی؟ یا ترک فاتحہ خلف الامام کفر موجب جط عمل ہے؟ ہر بات دلیل معتبر سے کہیں۔ یہ اور بتاتے چلئے کہ ”لا صلوة“ میں نفی حقیقت کی ہے یا صفت کی یا فضیلت کی۔

بر تقدیر اول ثبوت فرضیت خبر واحد محتمل المراد سے لازم ”فاللازم باطل فالملزوم مثله“ اور یہی مذہب ہے غیر مقلدین کا جیسا کہ الفاظ مندرجہ استفتاء سے ظاہر ہے۔ اور الحمد پڑھنا مقتدی کو ضرور چاہئے بلا پڑھے نماز نہیں ہوتی۔

بر تقدیر ثانی فرضیت خلف الامام کس کے گھر سے آئیگی؟ پھر یہ بھی بتائیں کہ فرضیت قرأت خلف الامام میں یہ حدیث مطلق ہے یا مقید، عام ہے یا خاص، اگر خاص یا مقید ہے تو دلیل تقید و تخصیص کیا ہے؟ نیز یہ کہ اس حدیث کی صحت محض بیہقی کی تصحیح سے بطور تقلید شخصی کافی ہے یا اس کی تحقیق کا اور کوئی ذریعہ ہے؟ تو کیا؟

دریافت کرنے کی باتیں تو اور بھی بہت تھیں مگر ائمہ کی تقلید سے بھاگنے والوں کی قلعی انھیں دوچار باتوں میں کھل جائے گی اور پتہ چل جائے گا۔ کہ کلام رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سمجھنے کے لئے ائمہ دین کی تقلید ضروری ہے۔ ورنہ وہ حدیث جس کو غیر مقلد صاف صریح کہتا ہے عمر بھر کی عرق ریزی میں بھی نہ سمجھا سکے گا جب تک کہ ائمہ دین کی تقلید نہ کرے، یا مقلدین سے در یوزہ گری نہ کرے۔ ان سب سے گذر کر میں یہ کہتا ہوں کہ جب قرآن پاک میں رب العزہ عزوجل تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

ایات۔ فاذا قرى القرآن فاستمعوا له وانصتوا۔

یعنی جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو سنو اور ساکت رہو۔ خاص مسئلہ قرأت خلف الامام میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اور نہ بھی ہوتی تو اس کا عموم حجت ہے۔ یا کسی صاف صریح آیت کو آپ حدیث سے منسوخ کرنا چاہتے ہیں؟ کیا تمہارے نزدیک آیت حدیث سے منسوخ ہو سکتی ہے اور حدیث بھی خبر واحد، وہ بھی ایسی جس کا مطلب غیر مقلدین کو سمجھنا دشوار۔ اب سنئے اس آیت سے قرأت کے وقت سکوت کا وجوب صاف ثابت ہے۔ پہلے تو میں آپ کو اسی بیہقی سے سنواؤں کہ یہ آیت کس معاملہ میں نازل ہوئی ہے۔

امام بیہقی امام احمد سے نقل کرتے ہیں ”قال اجمع الناس على ان هذه الآية في الصلوة“ یعنی امام احمد رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ آیت نماز کے باب

میں ہے۔

پھر انھیں بیہقی کی روایت سنئے:

حدیث۔ عن مجاهد قال: كان عليه الصلاة والسلام يقرأ في الصلوة فسمع قراءة فتى فنزل واذا قرى القرآن فاستمعوا له وانصتوا۔ (جلد ۲ صفحہ ۱۵۵)

مجاہد سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نماز میں قرأت فرماتے تھے تو ایک جوان انصاری کا پڑھنا سنا تو نازل ہوئی یہ آیت۔

واذا قرى القرآن فاستمعوا له وانصتوا۔

ملاحظہ ہو کہ قرآن پاک کی آیت قرأت خلف الامام کے روکنے کے لئے نازل ہو رہی ہے۔

ابن مردویہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں ”عن معاوية بن قرة قال: سألت بعض اشياخنا من اصحاب رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم قال المسروق: احسبه قال عبد الله بن مغفل قلت له كل من سمع القرآن وجب عليه الاستماع والانصات قال: انما نزلت هذه الآية واذا قرى القرآن فاستمعوا له وانصتوا في القرآن خلف الامام“

یعنی معاویہ ابن قرہ نے کہا: میں نے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں سے اپنے بعض بزرگوں سے دریافت کیا راوی کہتا ہے: مجھے خیال ہے کہ معاویہ نے عبد اللہ ابن مغفل کا نام لیا۔ ان سے دریافت کیا کہ ہر کوئی جو قرآن سنے اس پر سننا اور خاموش رہنا واجب ہے۔ فرمایا: یہ آیت نازل ہی ہوئی ہے قرأت خلف الامام میں۔

امام ابوالبرکات عبد اللہ بن محمود نفی اپنی تفسیر مدارک التنزیل میں فرماتے ہیں:

”جمهور الصحابة رضی اللہ عنہم علی انه فی استماع الموتم“ یعنی جمہور صحابہ اس پر ہیں کہ یہ آیت مقتدی کے قرأت سننے اور خاموش رہنے کے لئے نازل ہوئی۔

ابن مردویہ اور بیہقی نے روایت کیا ”عن ابن عباس صلی النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فقرأ خلفه قوم فخلطوا عليه فنزلت هذه الآية“

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی، قوم نے آپ کے پیچھے قرأت کی۔ اس سے آپ پر قرأت میں خلط واقع ہوا، تو یہ آیت نازل ہوئی۔

عبد اللہ بن حمید اور ابوراسخ اور بیہقی ابوالعالیہ سے روایت کرتے ہیں ”ان النبی صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم کان اذا صلی باصحابہ فقرأ من اصحابہ فنزلت " یعنی حضور نے جب اپنے اصحاب کو نماز پڑھائی اور قرأت کی تو آپ کے اصحاب نے بھی قرأت کی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

الحمد للہ عاقل منصف کے لئے مسئلہ تو فیصل ہو گیا کہ جب قرأت خلف الامام کی ممانعت میں آیت نازل ہوئی اور آیت نے مقتدی پر خاموش رہنا واجب کیا اور اس پر جمہور صحابہ نے اجماع فرمایا تو اب مقتدی کے لئے قرأت ثابت کرنے کی ہر کوشش بے کار ہے۔ کہ حدیث خبر واحد حکم قرآنی کو ہرگز نہ منسوخ کر سکے گی۔ مقتدی کا امام کے پیچھے خاموش رہنا آیت سے ثابت ہو گیا تو اس سے بڑھ کر اور کوئی دلیل ہوگی جس سے غیر مقلدوں کی تسکین ہو سکے۔ ضرورت تو نہیں ہے کہ مسئلہ میں تطویل کی جائے مگر چند تائیدات صاف صریح احادیث سے پیش کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہدایت فرمائے۔

موطا امام محمد رحمۃ اللہ علیہ میں ہے "اخبرنا مالک وحدثنا وهب بن كيسان انه سمع جابر بن عبد الله يقول: من صلى ركعة لم يقرأ فيها بام القرآن لم يصل الا وراء الام (صفحہ ۷۵)

وهب بن كيسان حدیث بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے جابر بن عبد اللہ سے سنا فرماتے تھے: کہ جس شخص نے ایک رکعت پڑھی اس میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی تو اس نے نماز ہی نہ پڑھی مگر امام کے پیچھے۔ مشکوٰۃ شریف میں بروایت مسلم لائے ہیں:

عن ابی ہریرہ وقتادة قال: قال رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم: واذا قرأ فانصتوا " یعنی ابو ہریرہ وقتادہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: کہ جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

حضرت شیخ محقق اس کی شرح میں فرماتے ہیں "هذا دليل على مذهب ابی حنيفة في منع قراءة الفاتحة عليه سواء كانت الصلوة جهرية او سرية" یعنی یہ حدیث دلیل ہے مذہب ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت سے منع کرنے اور اس پر فاتحہ کی قرأت کے واجب نہ ہونے میں۔

ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، احمد، بزار، ابن عدی وغیرہ محدثین روایت کرتے ہیں "عن ابی ہریرہ قال قال رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم انما جعل الامام ليؤتم به فاذا اكبر فكبر واذا قرأ فانصتوا"

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے تو وہ جب تکبیر کہے تو تم تکبیر کہو اور جب قرأت کرے تم خاموش رہو۔

مرقات المفاتیح میں اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں "یعنی الائتمام فی القراءة" یعنی اقتدا اور امام کی پیروی قرأت میں خاموش رہنے سے ہو سکتی ہے، نہ کہ پڑھنے میں۔ موطا امام محمد رحمۃ اللہ علیہ میں ہے:

عن جابر بن عبد الله قال قال رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم من صلى خلف امام فان قراء الامام له قراءة۔

جابر بن عبد اللہ سے مروی ہے کہ فرمایا حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے: جس شخص نے امام کے پیچھے نماز پڑھی تو بیشک امام کا قرأت کرنا اس کا قرأت کرنا ہے۔

وفيه ايضا عن وائل قال: سئل عبد الله ابن مسعود عن القراءة خلف الامام قال: انصت فان في الصلوة شغلا سيكفيك ذلك الامام۔

ابو وائل سے مروی ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن مسعود سے قرأت خلف الامام کا مسئلہ پوچھا گیا فرمایا: خاموش رہو (یعنی امام کے پیچھے قرأت نہ کر) بیشک نماز میں ایک شغل ہے امام کا قرأت کرنا تیرے لئے کافی وافی ہے۔

ايضاً: حديث: ان عبد الله ابن مسعود كان لا يقرأ خلف الامام في ما يجهر فيه وفيما يخافت فيه في الاولين ولا في الاخرين۔

یعنی عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ امام کے پیچھے قرأت نہیں کرتے تھے جہری نماز میں نہ سری نماز میں، نہ پہلی دو رکعتوں میں نہ پچھلی دو رکعتوں میں۔

طحاوی نے بروایت علقمہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا: قال ليت الذي يقرأ خلف الامام ملئى فوه ترابا۔ یعنی جو شخص امام کے پیچھے قرأت کرے کاش کے اس کا منہ خاک سے بھر دیا جاتا۔

حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: قال ليت في فم الذي يقرأ خلف الامام حجر۔ یعنی کاش کے امام کے پیچھے پڑھنے والے

زید ابن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

انه قال من قرأ خلف الامام فلا صلوة له۔

اس قدر احادیث و آثار اور قرآن پاک کی آیت دیکھنے کے بعد کسی منصف کو ذرا بھی تردد نہیں ہو سکتا اور کیونکر ہو سکتا ہے کہ اس سے صاف اور زیادہ صریح اور انتہائی واضح باوجود اجمال کے اور مسئلہ کا کیا انکشاف ہوگا، شریعت میں جو دلائل اصول تسلیم کر لئے گئے ہیں ان سے بالصراحت ثابت ہو گیا۔ اگر میں اس مطلب میں بسط کروں تو اس کے علاوہ بہت سی احادیث پیش کر سکتا ہوں مگر اس وقت اسی قدر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ معاندین کو ہدایت فرمائے ”والله يهدي من يشاء الى صراط مستقيم۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المقتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمیل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمیل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۲۸۵ھ

مسئلہ

(۲۵۲)

از مراد آباد محلہ گنج

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

حرف ”ض“ معجمہ مشابہ دال ہے یا ”ظ“ کے۔ اور جس وقت اس کے مخرج اور جمیع صفات کے ساتھ ادا کیا جائے تو اس کی آواز کسی حرف کے مشابہ ہوگی یا نہیں؟ اگر کسی سے مشابہ ہو تو کس حرف کے مشابہ ہوگی؟ اور جو شخص اس کو صحیح صحیح ادا کر سکتا ہے تو اس کو عوام جہال کے کہنے سے غلط کسی حرف سے بدل کر پڑھنا درست ہے یا نہیں؟۔ دریں صورت عمداً غلط پڑھنے والا خاطی فی الدین اور محرف فی القرآن کہلائے گا یا نہیں؟ نیز ایسے شخص کی اقتدا کرنا درست ہے یا نہیں؟ سوال کی ہر صورت کو مفصل کتب فقہیہ و تجوید کے تحت فرمایا جاوے۔ بینوا تو جو را۔

الجواب

نحمدہ ونستعينه ونتوكل عليه ونصلی ونسلم علی حبیبہ و افضل رسولہ سید الانبياء و علی الہ واصحابہ اجمعين۔

اس زمانہ میں ایک شرمزدہ قلیلہ اور فرقہ متفرقہ ہے کہ فساد کی راہیں چلتا اور مسلمانوں میں تفرقہ اندازی کی بنیادیں ڈالتا رہتا ہے۔ دن رات ایسے ہی تراش خراش اس کا پیشہ و شیوہ ہے۔ یہ فرقہ وہابیہ کے

نام سے پکارا جاتا ہے اور اس کو نئی بات نکالنے میں مزہ آتا ہے۔ یہ فرقہ ”ض“ کو ”ظ“ پڑھتا اور اسی پر اصرار کرتا ہے۔ باوجودیکہ ایسے شخص کی امامت ناجائز اور قصداً ”ض“ کو ”ظ“ پڑھنا کفر ہے۔ محیط برہانی میں ہے ”سئل الامام الفضلی عن یقرأ الظاء المعجمة مکان الضاد المعجمة او علی العکس فقال لا تجوز امامتہ ولو تعمد یکفر“۔ (شرح فقہ اکبر مصری ص ۱۵۳)

یعنی امام فضلی رحمۃ اللہ علیہ سے اس شخص کا حکم دریافت کیا گیا جو ”ض“ کی جگہ ”ظ“ یا ”ظ“ کی جگہ ”ض“ پڑھتا ہے۔ فرمایا: اس کی امامت جائز نہیں۔ اور اگر قصداً کیا تو کافر ہو جائے گا۔

منح الروض الازہر میں ہے ”کون تعمدہ کفراً لا کلام فیہ“ اس کے اس قصد کا کفر ہونا محل کلام نہیں۔

عالمگیری میں ”ض“ کے عمداً ”ز“ پڑھنے کو کفر لکھا ہے ”سئل عن یقرأ الزاء مقام الضاد وقرأ اصحاب الجنة مقام اصحاب النار قال لا تجوز امامتہ ولو تعمد یکفر“

(فتاویٰ عالمگیری۔ ج ۲ ص ۲۸۵)

یعنی اس شخص کا حکم پوچھا گیا جو ”ض“ کی جگہ ”ز“ پڑھے اور ”اصحاب الجنة“ کی جگہ ”اصحاب النار“ فرمایا اس کی امامت جائز نہیں اور قصداً کیا تو کافر ہو جائے گا۔

لہذا وہ فرقہ جو ”ض“ کو قصداً ”ظ“ پڑھتا ہے ان عبارات میں اپنا حکم تلاش کر لے اور خدا سے ڈرے۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ”ض“ کا مخرج ”احد الحافتين“ کا اتصال ایک جانب کے اضراس سے ہے۔ اور ”ظا“ کا ثناء علیا۔

چنانچہ جزریہ میں ہے

والضاد من حافته اذ ولیا الاضراس من اليسر او يمناها

(منح فکریہ شرح جزریہ ص ۱۲)

وفیه ایضاً والظاء والذال ولیا للعلیا

تو معلوم ہوا کہ ”ظا“ کا مخرج جدا ہے اور ”ض“ کا جدا۔ پھر ”ض“ مستطیلہ ہے اور ”ظ“ مستطیلہ نہیں۔ باوجود اس کے فرق نہ کرنا جہل ہے۔

جزریہ میں ہے

والضاد باستطالة ومخرج ☆ میز من الظاء وکلها تجی

(شرح جزری ہندی مطبع مجیدی صفحہ ۳۹)

اس شعر کی شرح یوں کرتے ہیں۔ اور ضاد معجمہ کو ساتھ صفت استطالت کے مخرج یعنی ضاد و استطالت کی صفت میں اور مخرج میں اکیلا ہے۔ اس صفت اور اس مخرج کا کوئی حرف نہیں تو اس ضاد کو ہمیشہ تمیز یعنی فرق کر اور جدا کر ضاء معجمہ سے تاکہ مشابہ ظا کے نہ ہو جائے۔

بالجملہ اشتباہ صوت کی بحث اس کو مفید نہیں کہ اس کا ایک حیلہ ہے جس سے عوام جہال کو دھوکہ دینا چاہتا ہے۔ سامعہ کا ادراک اور چیز اور حرف کا کسی انداز پر ادا ہونا اور بات۔ حائے حلی ہائے ہوز سے مشتبہ الصوت ہے مگر عوام کا سامعہ اس میں فرق ظاہر پاتا ہے تو اشتباہ صوت کا حیلہ کر کے الحمد للہ کی جگہ الحمد للہ پڑھنا تحریف قرآن ہے۔ ایسے ہی غیر المغضوب کو غیر المغضوب پڑھنا اللہ تعالیٰ ہدایت نصیب فرمائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل۔

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہجل

(۲۵۳-۲۵۴-۲۵۵-۲۵۶)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسائل ذیل میں کہ

(۱) سورہ ہود میں ”مجربہا“ امالہ کے ساتھ پڑھنا یعنی یائے مجہول پڑھنا صحیح اور موافق سنت ہے اور اس کلمہ کو یائے معروف پڑھنا صحیح اور سنت ہے یا نہیں؟ حنفیہ کی قرأت کے موافق جواب طلب ہے۔

(۲) تجوید کا سیکھنا واجب ہے یا نہیں؟

(۳) کلمہ مذکورہ ”مجربہا“ کو امالہ کیساتھ پڑھنے والے پر اعتراض کرنا اور اس کلمہ کی ہنسی اڑانا

شریعت مقدسہ میں کیسا ہے؟

(۴) یائے مجہول عربی میں کسی موقع پر آتی ہے یا نہیں؟ فقط السائل عبدالغفار

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

(۱) واقعی کلمہ ”مجربہا“ کو امالہ کے ساتھ پڑھنا ہماری قرأت ہے۔

(۲) تجوید کا سیکھنا ضروری اور لازمی ہے۔ چنانچہ علامہ محمد جزری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

والاخذ بالتجوید حتم لازم من لم یجود القرآن آثم

یعنی تجوید کا سیکھنا ایسی حتمی و لازمی چیز ہے کہ جس نے تجوید نہیں سیکھی وہ گنہگار ہے۔

(۳) کلمہ مذکورہ کو امالہ کے ساتھ پڑھنے والے کی ہنسی اڑانا قرآن کریم کے ساتھ ایک نوع کی

گستاخی ہے۔

(۴) یائے مجہول کی اصطلاح عجیبی ہے اور اہل عرب کے محاورہ میں یائے مجہول بحیثیت اس

اصطلاح کے مستعمل نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہجل

(۲۵۷)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین کہ

کیا حکم ہے شریعت مطہرہ کا اس مسئلہ میں کہ بجائے تسبیح رکوع مشہور ”سبحان ربی العظیم“

کے ”سبحان ربی الکریم“ پڑھا جائے۔ کہ عوام الناس مخرج ”ظا“ کا صحیح تلفظ نہیں کر سکتے اور بجائے

”ظاء“ کے ”زا“ ادا ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ”زا“ کی ادائیگی سے معنی ”عزیم“ کے

دشمن کے بن جاتے ہیں اور اس کے ثبوت کے لئے شامی پیش کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایسی صورت

میں ”ربی الکریم“ پڑھنا اولیٰ ہے؟ یا۔ ”ربی العظیم“۔ دوسری بات یہ کہ وہ اشخاص قرآن مجید کی

تلاوت میں جہاں لفظ ”عظیم“ آتا ہے کیا کریں۔ آیا وہاں بھی ”کریم“ ہی پڑھ لیا کریں۔ یا۔ ”عظیم“ ہی

پڑھیں۔ بیان فرما کر عند اللہ ثواب کے حق دار ہوں۔

المستفتی ذکات حسین محلہ دیپا سرائے سنہجل

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

سنت یہی ہے کہ رکوع میں ”سبحان ربی العظیم“ کہا جائے او ”عظیم“ میں ”ظا“ کو مخرج

سے ادا کیا جائے۔ لیکن چونکہ عوام الناس ”ظا“ کو صحیح طور پر ادا کرنے سے قاصر ہیں اور وہ اپنی اسی لاعلمی

میں بجائے ”ظا“ کے ”زا“ معجمہ ادا کرتے ہیں۔ تو وہ کلمہ بجائے ”عظیم“ کے ”عزیم“ ہو جاتا ہے اور

یہ حضرت حق سبحانہ تعالیٰ کی شان میں سخت گستاخی کا کلمہ بن جاتا ہے اگرچہ بلا قصد ہی سہی۔ لہذا ایسے عوام

کے لئے ”ظا“ کا صحیح طور مخرج سے ادا کرنا ضروری ہے ورنہ ان کے لئے رکوع میں بجائے ”سبحان ربی العظیم“ کے ”سبحان ربی الکریم“ کہنا یقیناً اولیٰ ہے۔

چنانچہ شامی جلد اول میں ہے:

السنة في تسبيح الركوع سبحان ربی العظیم الا ان كان لا يحسن الظاء فيبدل به الکریم لتلايجرى على لسانه العزيم فتفسد به الصلوة كذا في شرح درر البحار فليحفظ فان العامة عنه غافلون حيث ياتون بدل الظاء بزاء المعجمة۔

یعنی رکوع کی تسبیح میں ”سبحان ربی العظیم“ کہنا سنت ہے مگر جب ”ظا“ اچھی طریقہ سے ادا نہ کر سکے تو اس کی جگہ لفظ ”کریم“ بدلے تاکہ اس کی زبان پر ”عزیم“ جاری نہ ہو کہ اسکے ساتھ نماز فاسد ہو جائے گی ایسے ہی شرح درر البحار میں ہے۔

لہذا اس کو یاد کرو کہ آدمی اس سے غافل ہیں کہ وہ ”ظا“ کی جگہ ”زا“ ادا کرتے ہیں۔ لہذا اس عبارت سے موکل طور پر ”عزیم“ یا ”زاء“ پڑھنے کی ممانعت ثابت ہوئی۔ اور وجہ ممانعت یہ ہے کہ ”عزیم“ کے معنی قاموس میں ”العزيم العدو الشديد“ کے ہیں۔ یعنی سخت دشمن۔ اور ”سبحان ربی العظیم“ کے یہ معنی ہیں کہ۔ پاک ہے میرا رب جو عظمت والا ہے۔ اور ”سبحان ربی العزیم“ کے یہ معنی ہو گئے کہ۔ پاک ہے میرا رب جو سخت دشمن ہے۔ (العیاذ باللہ منہ)

لہذا اس تغیر معنی کی وجہ سے علمائے کرام نے اس کی ممانعت فرما کر فساد نماز کا حکم دیا۔ اسی لئے کبیری نے تغیر معنی کی یوں تصریح کی ہے:

والقاعدة عند المتقدمين ان ماغير تغيرا يكون اعتقاده كفر يفسد۔
چند سطر بعد فرماتے ہیں:

والمعتبر في عدم الفساد تغير المعنى كثيراً۔

یعنی فساد اور عدم فساد نماز کا حکم معنی کے متغیر ہونے اور نہ ہونے پر ہے۔ اب رہا باقی قرآن پاک کے مقامات میں تبدیل کرنا اس کے لئے شریعت سے کوئی سند ثابت نہیں ہوئی۔ مگر ایسے مقامات و دیگر تغیر معنی کے کلمات کے لئے علم تجوید سیکھنے کو علماء کرام نے فرض قرار دیا ہے۔ لہذا اگر کہیں ایسی ہی تغیر معنی کی قرآن پاک میں غلطی ہو جائے تو وہ اس کی خطا ہے کہ اس نے اس قدر تجوید نہیں سیکھی۔ ہاں قرآن پاک کے علاوہ دیگر ادعیہ میں بجائے ”عظیم“ کے اگر ”کریم“ کہے تو اس میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا۔

کتبہ: لمقتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۸۱ھ

مسئلہ (۲۵۸-۲۵۹-۲۶۰-۲۶۱-۲۶۲-۲۶۳-۲۶۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسائل ذیل میں کہ

(۱) کہ لحن کس کو کہتے ہیں اور اس کی کتنی قسمیں ہیں۔

(۲) ضاد، ظا، ز، ذال، تا، سین، صاد، دال۔ ان حرفوں کا کیا مخرج ہے۔

(۳) لفظ ”ضاد“ مثل ”ظاء“ کے پڑھا جائے گا۔ یا۔ ”دال“ کے مثل۔

(۴) اگر کوئی شخص اندر نماز کے ”سبحان ربی العظیم“ کی ”ظاء“ کی جگہ ”زا“ پڑھتے ہیں۔

یا ”سبحان ربی الاعلیٰ“ کے جگہ ”سبحان ربی الالیٰ“ پڑھے۔ یا سورہ فاتحہ میں ”واياك“ کی جگہ

وياك“ پڑھے۔ یا اسی سورہ میں ”المغضوب“ کی ”ضاد“ کی جگہ ”ظاء“ یا ”دال“ مخم پڑھے۔ یا۔

الضالين“ کے ”ضاد“ کی جگہ ”ظاء“ یا ”دال“ مخم پڑھے۔ یا ”والصيف“ کی جگہ ”سین“ پڑھے

یا ”فانزول“ کی جگہ ”ذال“ پڑھے۔ یا ”نصر الله“ کے ”صاد“ کی جگہ ”سین“ پڑھے۔ یا ”حطب“ کی جگہ

”ت“ پڑھے۔ یا ”یکذب“ کی ”ذال“ کی جگہ ”زا“ پڑھے۔ تو ایسے شخص کے پیچھے کسی صورت میں بھی

نماز ہو جاتی ہے یا کہ نہیں؟ یا ایسی صورت میں اس کیلئے شخص کی بھی نماز ہو جاتی ہے یا کہ نہیں؟۔

(۵) ”لا الی اللہ تحشرون“ سورہ آل عمران میں۔ ”ولا اوضعوا“ سورہ توبہ میں۔ اور ”لا

اذبحنه“ سورہ نحل میں۔ ”لا الی الحجیم“ سورہ الصافات میں۔ ”لانتهم“ سورہ حشر میں۔ اگر کوئی شخص

اندر نماز کے ”لا“ کو ساتھ الف کے ملائے تو نماز ہو جائے گی یا نہیں؟۔

(۶) اگر کوئی شخص درمیان سورہ سے پڑھنا شروع کرے او ”راعوذ“ کو اللہ کے کسی صفتی نام سے

وصل کر دے تو اس حالت میں پڑھنے والا گنہگار ہو گا یا نہیں؟۔

(۷) مجبوری نماز غیر مجبوری کے پیچھے ہو جاتی ہے یا کہ نہیں؟۔ فقط

السائل عبدالحق

نوٹ۔ تمام سوالات کے جوابات کتب تجوید و کتب فقہ معہ حوالہ کتاب معہ عبارت کے حنفیہ کی

قرأت کے موافق مطلوب ہیں۔

الجواب

الحمد لله الذي نزل علينا القرآن فهو يهدي الى سبيل الرشاد - فافضل العبادۃ قرآته ترتيبا بغير تغيير المراد - وميز الحروف بمخارجها وصفاتها واصواتها مع السداد فادعاء وحدة الصوت باطل في الظاء والضاد - ومن تعمد بالتبديل حرفا من حروفه فله بئس المهاد والصلوة والسلام على فردا لافراد مصلح البلاد دافع الفساد واهب المراد سيدنا ومولانا محمد افضل العباد وعلى آله واصحابه الاوتاد وعلى من تبعهم الى يوم التناد -

اما بعد

اس زمانہ پر آشوب میں احکام مذہبی سے مسلمانوں کی بے توجہی نہایت ہی قابل افسوس ہے۔ عوام تو عوام بلکہ اہل علم کی بھی یہ حالت زار ہے کہ ان کو تجوید کا سیکھنا، حروف کا مخارج سے ادا کرنا، صفات کا اس وقت لحاظ رکھنا، مشتبہ الاصوات میں میں تمیز کر دینا، ایسا غیر ضروری کام ہو گیا ہے جس کی طرف بعد تنبیہ بھی ان کی توجہ منعطف نہیں ہوتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاید ان کے نزدیک تبدیل حرف سے معنی میں فساد ہی نہیں آتا۔ تعجب ہے کہ باوجود اس زبوں حالت کے امام بننے کا بھی شوق۔ اپنی نماز تو فاسد ہوتی ہی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مقتدیوں کے حال پر بھی یہ کرم کریم ہے کہ ان کی نماز بھی برباد کی جاتی ہے۔ اب ان سے زیادہ قابل افسوس وہ لوگ ہیں جو چند قواعد تجوید دیکھ کر قاری بن گئے ہیں اور دیدہ و دانستہ ”ضاد“ کو ”ظا“ پڑھتے ہیں اور مشتبہ الصوت کی آڑ لے کر قرآن عظیم میں تحریف کرتے ہیں۔ لہذا ان چند سطور میں ان سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں، اگرچہ مسائل زلۃ القاری کے مختلف فیہ ہیں، مقتدیین اور متاخرین دونوں میں بہت اختلافات ہیں اور باوجود ان اختلافات کے مجھ جیسے کم علم کا قلم اٹھانا نہایت دشوار ہے لیکن محض تو کلام علی اللہ تعالیٰ ثم علی رسولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہ چند جملے لکھتا ہوں، اگرچہ مسائل فقہیہ کے سمجھنے کے لئے لیاقت علمی درکار ہے مگر حتی الامکان عالم فہم کرنے کی کوشش بلیغ کرونگا۔

اقول وباللہ التوفیق۔ جوابات سے قبل ان چند مقدمات کا سمجھنا بہت ضروری ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ یہ مقدمات نہ فقط ان مسائل بلکہ بہت سے مسائل زلۃ القاری کو کافی ہوں گے۔

مقدمہ اول: ان جوابات میں جو احکام بیان کئے جائیں گے وہ تمام مقتدیین کے قواعد پر مبنی ہوں گے۔ اقوال متاخرین میں اول تو اختلافات بہت زیادہ ہیں معہذا وہ باعتبار قواعد کے غیر منضبط ہیں،

علاوہ بریں اقوال متقدمین میں احتیاط زیادہ ہے۔

چنانچہ ابراہیم حلبی غنیہ میں قواعد متقدمین کو کہنے کر فرماتے ہیں:

هذا ملخص قاعدة المتقدمين وهو الذي صححه المحققون من اهل الفتاوى كقاضى خاں وغيره وفرعوا عليه الفروع فافهم ترشد -

پھر یہی علامہ اسی میں دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

فالاولى الاخذ فيه بقول المتقدمين لانضباط قواعدهم وكون قولهم احوط واكثر الفروع المذكورة فى كتب الفتاوى منزلة عليه -

مقدمہ دوم: قرات کی تمام غلطیوں کے احکام کی بنا بلکہ سارے مسائل زلۃ القاری کی جان اور اصل الاصول معنی کا تغیر ہے کہ اسی تغیر معنی کی وجہ سے نماز کے فساد کا حکم دیا جاتا ہے۔

چنانچہ غنیہ میں ہے: والقاعدة عند المتقدمين ان ماغير تغييرا يكون اعتقاده كفرا يفسد - چند سطر بعد فرماتے ہیں: فالمعتبر فى عدم الفساد عند عدم تغيير المعنى كثيرا -

اسی طرح عامہ کتب فقہ میں ہے۔ اے عزیز قرآن کریم اللہ تبارک وتعالیٰ نے جیسا نازل فرمایا ہے ویسا ہی ہم کو ادا کرنا چاہئے اور اگر اس کے حرف بدل گئے تو کہیں بے معنی مہمل الفاظ بن جائیں گے، کہیں معنی زیادہ متغیر ہو جائیں گے، کہیں معنی ایسے بگڑ جائیں گے جس کا اعتقاد کفر ہو۔ لہذا اس تغیر کے بعد وہ خدا کا کلام کس طرح باقی رہ سکتا ہے بلکہ حرف کی آواز بدلنے کی وجہ سے بھی بعض جگہ بجائے حمد کے حضرت حق - خانہ کی شان میں گستاخی کا کلمہ بن جائے گا۔ العیاذ باللہ تعالیٰ

اب باقی رہا یہ عذر کہ ہمارا قصد تو تعریف و حمد ہی کا ہے۔ لہذا یہ نہایت خام خیال ہے، اگر کوئی شخص کسی کی تعریف کا قصد کرے لیکن الفاظ ایسے کہے جن میں اس کی کھلی ہوئی برائی اور مذمت ہو تو کیا کوئی ایسا عاقل ہے کہ اس کے ان گستاخانہ الفاظ کو چھوڑ کر اس کا قصد دریافت کرتا پھرے گا۔ لہذا پھر شان رب تبارک وتعالیٰ میں ایسے گستاخانہ الفاظ اگرچہ بلا قصد ہی سہی کس طرح گوارا کئے جاسکتے ہیں۔ دیکھئے میں قرآن کریم ہی سے اس کا حکم سنا دوں۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی یہ عادت تھی کہ وہ سرکار رسالت میں لفظ ”راعنا“ کہا کرتے تھے یعنی حضور ہماری جانب نظر فرمائیے۔ یا ہماری رعایت کیجئے۔ یہود نے جب اس کلمہ کو سنا انہوں نے اسی کلمہ میں گستاخی کے معنی قصد کر کے سرکار رسالت علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں اس کو بولنا

شروع کیا۔ لہذا یہ آیت نازل ہوئی۔

یا ایہا الذین آمنوا لاتقولوا راعنا وقولوا انظرنا۔

یعنی اے ایمان والو! تم لفظ ”راعنا“ مت کہا کرو بلکہ اس کے بجائے لفظ ”انظرنا“ کہا کرو۔
اب غور کیجئے کہ صحابہ کرام کا گستاخی کے معنی کا قصد تو کس طرح متصور بلکہ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ گستاخی کے معنی آجائے ممکن نہیں تھے مگر باوجود اس بات کے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان میں ایسے موہم الفاظ بولنے سے ممانعت فرمادی۔ لہذا شان حق جل جلالہ تو بہت ہی ارفع و اعلیٰ ہے۔ نیز حدیث قدسی میں ہے:

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قال تعالیٰ: یوذینی ابن آدم یسب الدھر وانا الدھر بیدی الامر اقلب اللیل والنھار متفق علیہ (مشکوٰۃ شریف)

یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی، حضور شافع یوم النشور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بنی آدم مجھ کو ایذا دیتا ہے کہ وہ زمانہ کو گالی دیتا ہے باوجودیکہ زمانے کا پیدا کرنے والا میں ہوں، امر میرے قبضہ قدرت میں ہے میں ہی رات اور دن کو پلٹتا ہوں۔

غنیہ میں ہے: ولو ادخل المد فی الف لفظۃ اللہ کما یدخل فی قوله تعالیٰ اذن لکم وشبھہ تفسد صلوٰتہ ان حصل فی اثنائھا عند اکثر المشائخ ولا یصیر شارعابہ فی ابتدائھا ویکفر لو تعمدا لانه استفہام ومقتضاه الشک فی کبریائہ تعالیٰ وقال محمد بن مقاتل ان کان لایمیز بینھما ای بین المد وعدمہ لاتفسد صلاتہ والاستفہام یحتمل ان یکون للتقریر لکن الاول اصح لان مثل هذا الجھل لایصلح عذرا۔

منیہ میں ہے: وان قال اللہ اکبار لایصیر شارعا وان قال فی خلال الصلاۃ تفسد صلوٰتہ لانه اسم الشیطان۔

خلاصہ ان دونوں عبارتوں کا یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے اللہ اکبر تکبیر میں لفظ اللہ کے الف کو مد کے ساتھ بڑھا کے اللہ اکبار کہا۔ اگر نماز کی درمیانی تکبیروں میں کہا تو اکثر مشائخ کے نزدیک اس کی نماز فاسد ہو جائے گی اور یہی اصح قول ہے۔ اور اگر ابتدائے نماز میں اللہ اکبر کہا تو اس سے نماز کا شروع کرنا صحیح نہیں ہے۔ اور اگر معنی پر مطلع ہونے کے بعد بالقصد کہا تو کافر ہو جائے گا۔ اس لئے کہ اللہ اکبر کے یہ

معنی ہوئے (کیا اللہ بہت بڑا ہے) تو اس سے اللہ عز وجل کی کبریائی میں شک واقع ہو گیا اور اس جیسا جہل عذر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اسی طرح اللہ اکبار کا حکم ہے کہ اول میں کہنے سے نماز کا شروع صحیح نہیں اور درمیان میں کہنے سے نماز فاسد کہ اکبار شیطان کے ناموں سے ایک نام ہے۔

الحاصل اس آیت اور حدیث اور قول فقہ سے نہایت روشن طور پر ثابت ہو گیا کہ گستاخی کے الفاظ میں عدم قصد کا حیلہ اور اپنی نادانی کا اقرار کمزور عذر ہے پھر یہ غلطی بھی ہو تو حالت نماز میں جس میں بندہ کو اپنے مولا تبارک و تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہو اور سارے حجابات اٹھکر اس کو حضوری کی عزت سے نوازا جائے اور یہ بندہ اس وقت ایسی گستاخی کے کلمات اپنی زبان سے نکالے، اگر یہ ان کا قصد نہ رکھتا ہو اور پھر ایک دو مرتبہ نہیں بلکہ بیسوں مرتبہ مثلاً رکوع میں اس نے پانچ بار تسبیح کہی اور عظیم کی ”خا“ اس سے ادا نہیں ہوئی اور اسکی بجائے ”عزیم“ ز۔ا۔ سے کہا جس کے معنی سخت دشمن کے ہیں تو اس نے چار رکعت میں بیس مرتبہ اللہ تعالیٰ کو اپنا دشمن کہہ کر پکارا۔

خلاصہ یہ ہے کہ کیا ایسی نماز تمہارے کچھ کام آ سکتی ہے اور کیا باوجود اتنی تجوید سیکھنے کی قدرت کے تمہاری یہ غلط خوانی کچھ عذر بن سکتی ہے۔ نماز وہ چیز ہے جس کے بارے میں سرکار مدینہ سید الانبیاء محبوب کبریا حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اذا نعس احدکم وهو یصلی فلیرقد حتی یذهب عنه النوم فان احدکم اذا صلی وهو ناعس لایدری لعلہ یذهب یتستغفر فیسب نفسه۔ بخاری وغیرہ

یعنی جب تم میں سے کسی کو غنودگی آئے تو سو رہے یہاں تک کہ نیند چلی جائے کہ غنودگی میں پڑھے گا تو کیا معلوم شاید اپنے لئے دعائے مغفرت کرنے چلے اور بجائے دعا کے بددعا نکلے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ غنودگی کی حالت میں نماز سے اس لئے منع کیا گیا کہ شاید وہ بجائے دعا کے بددعا کرنے لگے باوجودیکہ اس کا قصد بددعا کا ہرگز نہ ہوگا۔ اب کہاں ہیں وہ لوگ جو یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہمارا تو اس کا قصد نہیں تھا۔ وہ اپنے عذر کو اس ترازو میں لا کر تو لیں اور غور کریں کہ جب غنودگی میں اتنی احتیاط کی تعلیم دی جا رہی ہے اور ہم تو جاگتے ہوئے ہوش میں ایسے قبیح الفاظ کہہ رہے ہیں اور پھر ایک دو مرتبہ نہیں بلکہ مکرر بار بار کہتے ہی رہتے ہیں۔ لہذا قصد نہ ہونے کا عذر کہاں تک بچا سکے گا۔
الحاصل نماز مسلمانوں کے لئے ایک بڑی دولت ہے اس میں نہایت احتیاط کی ضرورت ہے۔
غنیہ میں مسائل زلۃ القاری کے اختتام پر لکھتے ہیں:

والاحتیاط اولیٰ سیمافی امر الصلوٰۃ التی هی اول ما یحاسب العبد علیہا۔

یعنی احتیاط ہر حال میں اولیٰ ہے خاص کر حالت نماز میں کہ یہ نماز وہ چیز ہے کہ سب سے پہلے بندہ کا حساب اسی سے شروع ہوگا۔

مقدمہ سوم: قرآن کریم کے حروف کا مخارج سے صحیح طور پر نکالنا، ہر حرف کو دوسرے سے ممتاز کرنا، ہر ایک کی آواز کو دوسرے کی آواز سے پہچانا، ہر مسلمان کے لئے فرض عین ہے، بلکہ بعض اقوال کی بنا پر وقفوں اور حرکاتوں کا لحاظ بھی ضروری ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ورتل القرآن ترتیلاً۔ یعنی قرآن خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔ تفسیر خازن میں ہے:

الترتیل هو التوقف والترسل والتمهل والافهام وتبيين القراءة حرفاً اثره فی اثر بعض بالمد والاشباع والتحقیق و (ترتیل) تاکید فی الامر به لانه لا بد للقاری منه۔ تفسیر مدارک میں اسی آیت کے تحت میں فرماتے ہیں:

اقرأ علی قواعدہ بتبيين الحروف وحفظ الوقوف واشباع الحركات (ترتیل) هو تاکید لا یجاب الامر به وانه لا بد منه للقاری۔

تفسیر احمدی میں اسی آیت کے تحت میں فرماتے ہیں:

امرهم بترتیل القرآن و اوجبه علیهم وهو علی ما نقل عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ رعاية الوقوف و اداء المخارج۔

خلاصہ مضمون ان تفسیروں کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر ترتیل واجب کی اور ترتیل سے مراد قرآن کریم کا ٹھہر ٹھہر کر اور آہستہ دیر کر کے اور سمجھا کر پڑھنا اور ہر حرف کو دوسرے سے ممتاز کرنا، مد اور اشباع حرکات کا ظاہر کرنا، وقفوں کی حفاظت کرنا کہ قاری کو ان سے چارہ کار نہیں۔ اسی طرح تفسیر بیضاوی اور حسینی وغیرہ میں ہے۔ اس آیت اور تفسیروں سے تجوید کا سیکھنا ضروری اور لازمی ثابت ہوا۔

علامہ جزری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنی مختصر نظم جزریہ میں فرماتے ہیں۔

یعنی تجوید سیکھنا واجب ہے اور جو تجوید کے ساتھ قرآن نہ پڑھے وہ گنہگار ہے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو تجوید کے ساتھ اتارا اور اسی طرح اس سے ہمارے پاس پہنچا۔ اور نیز وہ تجوید تلاوت کا زیور اور قرأت کی زینت ہے۔ اور وہ تجوید حروف کو ان کی صفت لازمہ کے حق دینے کا نام ہے۔ اور ہر

حرف کو اس کی اصل کی طرف پھیرنے اور اس کی نظیر میں اس کے مثل تلفظ کرنے کا نام ہے۔ قاری بلا تکلف اور بغیر دشواری کے پڑھنے میں کمال درجہ کی پاکیزگی پیدا کرے۔

اعلیٰ حضرت امام اہلسنت مجدد دین و ملت فاضل بریلوی قدس سرہ اپنی کتاب ”الجام الصاد“ میں اتقان سے نقل ہیں:

من المهمات تحوید القرآن وهو اعطاء الحروف حقوقها ورد الحروف الیٰ مخرجہ واصله ولا شک ان الامة کما هم متعبدون بفہم معانی القرآن واقامة حدودہ هم متعبدون بتصحیح الفاظہ واقامة حروفہ علی الصفة الملتقاة من ائمة القراءة المتصلة بالحضرة النبویة۔

یعنی قرآن کا تجوید سے پڑھنا ضروریات سے ہے اور تجوید حروف کو ان کے حقوق دینے اور ہر حرف کو اس کے مخرج اور اصل کی طرف پھیرنے کا نام ہے اور بلا شک جس طرح امت کے لئے قرآن کے معنی سمجھنے اور اسکے حدود قائم کرنے داخل عبادت ہیں اسی طرح قرآن کے الفاظ کی تصحیح اور حروف کے صفات کا قائم کرنا بھی ہے، جس طرح ان کو ان ائمہ قرأت نے ظاہر کیا جن کی سند سرکار رسالت تک پہنچتی ہے۔

نیز اسی میں فرماتے ہیں:

لہذا ائمہ دین تصریح فرماتے ہیں کہ آدمی سے کوئی حرف غلط ادا ہوتا ہو تو اس کی تصحیح و تعلم میں اس پر انتہائی کوشش واجب۔ اگر کوشش میں قصور کرے گا معذور نہ ہوگا، نماز کھوئے گا۔ بلکہ جمہور علماء نے اس سعی کی کوئی حد مقدر نہیں کی اور حکم دیا کہ عمر بھر شبانہ روز ہمیشہ جہد کئے جائے، کہیں اس کے ترک میں معذور نہ رکھیں گے۔ یہی قول امام ابراہیم بن یوسف، امام حسین بن مطیع کا ہے۔ محیط میں اسی کو مختار للفتویٰ فرمایا۔ خانیہ و خلاصہ و فتح القدیر و مراقی الفلاح و فتاویٰ الحج و جامع الرموز و درمختار وغیرہ میں اس پر جزم فرمایا۔ علامہ ابن شحنہ نے اسی کو محرر بتایا۔ علامہ ابراہیم حلبی نے غنیہ میں اسی کو معتمد فرمایا اگرچہ امام برہان محمود نے ذخیرہ میں بصورت عجز خلقی اسے مشکل بتایا۔ امام ابن امیر الحاج نے اسی پر تعویل کی اور عذر عارض ناقابل زوال بڑھایا۔ علامہ طحاوی نے حاشیہ مراقی الفلاح میں اسی طرف میل کیا اور اسے مقتضائے کلام اکثر ائمہ اعلام قرار دیا۔ اور یہی فتاویٰ امام فقیہ ابواللیث و خزانہ الاکمل وغیرہ کا مفاد۔

کما بینا کل ذلك فی فتاوانا حققناه انه كأنه هو المراد۔ انتہی

اب اتنی تصریحات کے ہوتے ہوئے مزید تفصیل کی ضرورت تو نہیں معلوم ہوتی مگر ممکن ہے کہ بعض شریعہ جہتیں ابھی اس میں کچھ کلام کریں۔ لہذا میں انہیں کے پیشواؤں کے کلام پیش کر دوں۔

مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی فتاویٰ رشیدیہ حصہ دوم کے ص ۶۸ میں کہتے ہیں:

مسئلہ ۹۔ علم تجوید فرض عین ہے یا کفایہ اور کہاں تک مستحب ہے؟۔

الجواب:- علم تجوید جس سے کہ صحیح حروف کی ہو جائے کہ جس سے معانی قرآن شریف کے نہ بگڑیں یہ فرض عین ہے مگر عاجز معذور ہے اور اس سے زیادہ علم قرأت و تجوید فرض کفایہ ہے۔

اور مولوی اشرف علی تھانوی فتاویٰ امدادیہ جلد اول کے ص ۱۱۱ میں لکھتے ہیں:

اور تجوید کی مقدار واجب صرف تصحیح حروف اور رعایت وقوف ہے اس طرح کہ تغیر مراد نہ ہو جاوے باقی مستحسن۔

اس وقت مجھے ان دونوں فتوؤں پر تنقیدی نظر کر کے ان کی کمزوریاں دکھانی منظور نہیں ہیں بلکہ صرف اپنے مدعا کا اثبات مقصود ہے لہذا اب کسی منصف ہی کو نہیں بلکہ کسی ہٹ دھرم کو بھی مجال سخن باقی نہیں رہی۔

مقدمہ چہارم: قرآن کریم میں غلطی ہونے کی چار صورتیں ہیں۔ عمد۔ خطا۔ عجز۔ عذر۔
قسم اول: قصد ایک حرف کو دوسرے حرف سے یا ایک کلمہ کو دوسرے کلمہ سے بدلنا۔ یا حروف میں تقدیم و تاخیر یا زیادتی و کمی کرنا۔ یا کلمات اور جملوں میں تغیر کرنا۔ یا اعراب وغیرہ میں کچھ تغیر کرنا جس سے معنی میں تغیر ہو جائے۔ اس کو عمد کہتے ہیں۔ لہذا قرآن کریم میں عمد ایسا کرنا حرام ہے اور اس سے یقیناً نماز فاسد ہو جائے گی۔

چنانچہ شامی میں ہے: ان تعمد ذلك تفسد۔

طحاوی میں ہے: اما في العمد فتفسد به مطلقا بالاتفاق۔

اور اگر نعوذ باللہ کوئی ہٹ دھرم ازراہ عناد قرآنی حرف کی جگہ کوئی دوسرا حرف قصد ابدلے اور پھر اس پر اس قدر اڑے کہ اپنے اس بدلے ہوئے حرف کو ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتری ہوئی وحی ٹھہرائے تو اس پر حکم کفر ہے۔

چنانچہ غنیہ میں قاضی خاں سے ناقل ہیں:

قال قاضي خان ومقاله المتأخرون أوسع ومقاله المتقدمون أحوط لانه لو تعمد

يكون كفرا لا يكون من القرآن قال ابن الهمام فيكون متكلما بكلام الناس الكفار وهو مفسد كما لو تكلم بكلام الناس ساھيا مالم يس بكفر فكيف وهو كفر۔

شرح فقہ اکبر میں محیط سے ناقل ہیں:

سئل الامام الفضلي ممن يقرأ الظاء المعجمة مكان الضاد المعجمة او يقرأ

اصحاب الجنة مكان اصحاب النار او بالعكس فقال لا تجوز امامته ولو تعمد يكفر قلت اما كون تعمده كفرا فلا كلام فيه۔

شرح فقہ اکبر والی عبارت کا ترجمہ یہ ہے کہ امام فضلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے اس شخص کے متعلق دریافت کیا گیا جو ”ضاد معجمہ“ کی جگہ ”ظاء معجمہ“ پڑھتا ہے۔ یا ”اصحاب النار“ کی جگہ ”اصحاب الجنة“ یا اس کا خلاف پڑھتا ہے تو جواب دیا کہ اس کی امامت جائز نہیں اور اگر قصد اے کہ تو کافر ہو جائے گا۔

علامہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں: کہ اس کے قصد پڑھنے کے کفر ہونے میں کوئی کلام ہی نہیں۔ لہذا جو لوگ ”ضاد“ کو قصد ”ظاء“ پڑھتے ہیں وہ اپنا حکم ان عبارتوں میں تلاش کر کے تائب ہوں۔

قسم دوم: باوجود صحیح ادا کرنے کی قدرت کے زبان کی لغزش سے بلا قصد ان میں سے کوئی غلطی خطا ہوگئی اور معنی صحیح رہے تو نماز فاسد نہیں ہوگی اور اگر اس کے معنی متغیر ہو گئے اور بنا بر اصل امام یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے یہ بدلا ہوا کلمہ قرآن کریم میں بھی کہیں نہیں ہے تو باجماع متقدمین اس کی نماز باطل اور جب یہ امام ہو تو سارے مقتدیوں کی نمازیں فاسد۔

چنانچہ غنیہ میں ہے:

وان لم يكن التغيير كذلك (ای مایکون اعتقاده كفرا) فان الاصل فيه ای في الذلل

والخطاء انه ان لم يكن مثله ای مثل ذلك اللفظ في القرآن والمعنى ای والحال في ان

معنى ذلك اللفظ بعيد من معنى لفظ القرآن متغير معنى لفظ القرآن به تغیرا فاحشا قويا

بحيث لا مناسبة بين المعنيين اصلا تفسد صلاته ایضا كما اذا قرأ هذا الغبار مكان قوله هذا

الغراب وكذا ان لم يكن مثله في القرآن ولا معنى له حتى يحكم عليه بالبعد من المعنى

القرآنی او بعدمه كما اذا قرأ يوم تبلى السرايل باللام في آخره مكان الراء في السراير وان

كان مثله في القرآن والمعنى اى معنى اللفظ الذى قرأه بعيد من معنى اللفظ المراد ولم يكن معنى اللفظ المراد متغيرا باللفظ المقر وتغيرا فاحشا تفسد ايضا عند ابى حنيفة ومحمد رحمة الله تعالى عليهما وهو الاحوط -

اسی کے دوسرے مقام پر ہے:

واذا تأملت فيما ذكرنا من اول الفصل الى آخره علمت انه اذا خطأ بما يتغير تغيرا يلزم من اعتقاده كفر تفسد صلواته مطلقا وان لم يكن التغير كذلك فان في هيئات الحروف من الاعراب والتشديد والتخفيف والمد والقصر لا تفسد الا ان يكون التغير فاحشا وكذا اذا كان في نفس الحروف فان بقيت الكلمة سببه لامعنى لها اولها معنى بعيد جدا عن المراد تفسد والا فلا، سواء كان في حرف او اكثر وسواء كان في القرآن او لا عندهما وعند ابى يوسف رحمة الله تعالى عليه لا تفسد اذا كانت الكلمة المغيرة في القرآن -

طحاوی میں ہے:

فالاصل فيها عند الامام ومحمد رحمهما الله تعالى تغير المعنى تغيراً فاحشاً وعدمه للفساد عدمه مطلقاً سواء كان اللفظ موجوداً في القرآن ولم يكن وعند ابى يوسف رحمه الله تعالى عليه ان كان اللفظ نظيره موجوداً في القرآن لا تفسد مطلقاً تغير المعنى تغيراً فاحشاً اولاً وان لم يكن موجوداً في القرآن تفسد مطلقاً ولا يعتبر الاعراب اصلاً ومحل الاختلاف في الخطا والنسيان -

لہذا اگر بحالت خطا معنی متغیر ہو گئے تو بنا بر مذہب مفتی بہ کے نماز فاسد ہو جائے گی۔

قسم سوم: باوجود صلاحیت تصحیح حروف و رعایت وقوف کے زبان پر غلطی کا بلا قصد جاری ہو جانا اور مشاغل دنیوی کے انہماک میں صحیح تلفظ کے سیکھنے سے قاصر رہ جانے کی وجہ سے اس غلط تلفظ کو ہی اپنے خیال میں صحیح سمجھنا مفہوم عجز کا ہے۔

لہذا ایسے عاجز پر جتنی تجوید مقدمہ سوم میں گذری سیکھنا واجب ہے کہ جس سے تغیر مراد نہ ہونے پائے مگر اس کی اپنی نماز درست ہے اور یہ عاجز امامت صحیح خوانوں کی نہیں کر سکتا۔ ہاں اپنے جیسے کی امامت کر سکتا ہے۔ اور اگر اس نے تجوید ہی نہیں سیکھی یا کچھ سیکھی اور پھر چھوڑ دی یہاں تک کہ وجوب کا

مطالبہ اس کے ذمہ پر باقی رہا تو خود اس کی نماز کی صحت بھی محل کلام ہے۔
غنیہ میں ہے:

كان القاضى الامام الشهيد المحسن يقول الاحسن فيه اى فى الجواب فى هذه الابدال المذكور ان يقول المفتى ان جرى ذلك على لسانه ولم يكن مميزاً بين بعض هذه الحروف وبعض و كان فى زعمه انه ادى الكلمة على وجهها لا تفسد صلواته وكذا اى مثل ما ذكر فى فتاوى الحجة انه يفتى فى حق الفقهاء باعادة الصلوة بالجواز كقول محمد بن سلمة اختياراً للاحتياط فى موضعه والرخصة فى موضعها -

اسی میں محیط سے ناقل ہیں:

وما جرى على السنة النساء والارقاء من الخطاء الكثير من اول الصلوة الى آخرها كالشيطان والالمين واياك نابد واياك نستئين السرات انا مت فعلى جواب الفتاوى والحسامية ماداموا فى التصحيح والتعليم والاصلاح بالليل والنهار ولا يطاوعهم لسانهم جازت صلواتهم كسائر الشروط اذا عجز عنها من الوضوء وتطهير الثوب والقيام والقرأة والركوع والسجود والقعود والتوجه اذا حصل العجز عنها جازت صلواته فكذا هنا اما اذا تركوا التصحيح والجهد فسدت صلواتهم كما اذا تركوا سائر الشروط وانما جوزت صلواتهم لعجزهم عن الاصلاح فصار تلك الالفاظ لغتهم ولسانهم فكانهم قرأوا القرآن بلغتهم -

اسی میں قاضی خاں سے ناقل ہیں:

وان كان الرجل ممن لا يحسن بعض الحروف ينبغي ان يجتهد ولا يعذر فى ذلك فان كان لا ينطق لسانه ان لم يجد آية ليس فيها تلك الحروف تجوز صلواته ولا يؤم غيره -
شامی میں خزانة الاكمل سے ناقل ہیں:

ان جرى على لسانه (اى حرفاً مكان حرف) اولاً يعرف التميز لا تفسد وهو المختار حليه وفى البرازية وهو اعدل الاقويل وهو المختار -

اس میں تاتارخانیہ سے ناقل ہیں:

اذا لم يكن بين الحرفين اتحاد المخرج ولا قرينة الا ان فيه بلوى العامة كالذال

مكان الضاد او الزائ المحض مكان الذال والظاء مكان الضاد لاتفسد عند بعض المشائخ۔

علامہ شامی فرماتے ہیں:

فينبغي على هذا عدم الفساد في ابدال الثاء سينا والقاف همزة كما هو عوام زماننا فانهم لا يميزون بينهما ويصعب عليهم جدا كالدال مع الزائ ولا سيما على قول القاضي ابي عاصم وقول الصفار۔

اسی طرح عالمگیری وحلیہ وفتح القدیر وغیرہا کتب میں ہے۔ لہذا بنا بر مذہب مفتی بہ کے عاجز کی خود اپنی نماز درست اور مقدار وجوب تجوید سیکھنا واجب اور بحالت عدم سعی خود اس کے ذمہ سے فریضہ کا سقوط موہومی بلکہ بنا بر قول بعض فقہائے کرام کے اس پر باقی۔

قسم چہارم: تصحیح حروف کی خلقتہ زبان میں بالکلیہ صلاحیت ہی نہ ہونا عذر سے تعبیر ہے۔ لہذا ایسے معذور کی خود اپنی نماز صحیح ہے لیکن وہ امامت نہیں کر سکتا ہے اور بقول بعض فقہاء کے اس پر بھی تصحیح حروف کی کوشش ضروری یہ حتی الامکان کسی صحیح خواں کی اقتدا کرے بجوری تنہا نماز پڑھے۔

منیہ میں ہے: لو قرأ اللغ لب (العالمین باللام) مكان رب لاتفسد۔

غنیۃ میں ہے:

الحاصل ان التغ يجب عليه الجهد دائما و صلوتهم جائزة ماداموا على الجهد لكنهم بمنزلة الاميين في حق من يصحح الحروف الذي عجزوا عنه لا يجوز اقتداؤه بهم ولا يجوز صلوتهم اذا تركوا الاقتداء به مع قدرتهم وانما يجوز صلوتهم مع قراءة تلك الحروف اذا لم يقدرُوا على قراءة ما يجوز به الصلوة مما ليس فيه تلك الحروف واما لو قدرُوا مع هذا اقراء تلك الحروف فصلوتهم فاسدة ايضا لان جواز صلوتهم مع التلفظ بتلك الحروف ضروري فينعدم بانعدام الضرورة هذا هو الذي عليه الاعتماد۔

اسی میں ملقط سے ناقل ہیں:

لو قرأ في الصلوة الحمد لله بالهاء مكان الحاء أو قرأ كل هو الله احد بالكاف مكان القاف والحال انه لا يقدر على غيره كما في الاثراك ونحوهم تجوز صلوته ولا تفسد وكذا لو قال الحمد لله بالحاء المعجمة۔

اسی میں محیط سے ناقل ہیں:

والمختار للفتوى في جنس هذه المسائل انه ان كان يجتهد أثناء الليل واطراف النهار في التصحيح ولا يقدر عليه فصلوته جائزة۔

در مختار و تنویر الابصار میں ہے:

ولا (يصح اقتداء) غير اللغ به اي باللغ على الاصح كما في البحر عن المحتبي وحرر الحلبي وابن الشحنة انه بعد بذل جهده دائما حتما كالامى فلا يؤم الامثله ولا تصح صلوته لذا امكنه الاقتداء بمن يحسنه او ترك جهده او وجد قدر الفرض مما لا لغ فيه هذا هو الصحيح المختار في حكم اللغ۔

الحاصل چونکہ ان مقدمات سے جوابات کو زیادہ تعلق تھا اس لئے وہ قدرے تفصیل سے تحریر کئے گئے۔ جوابات کا ہر پہلو انہیں مقدمات پر مبنی ہوگا۔ لہذا اب ہر سوال کا جواب باختصار دیا جاتا ہے۔ واللہ الموفق للامام۔

جواب سوال اول: لحن اور اس کی دونوں قسمیں جلی و خفی اپنے مقام پر نہایت شرح ہیں یہاں تک کہ علمائے قرأت بے تجوید کو بھی لحن کہہ دیتے ہیں۔

چنانچہ اتقان شریف میں ہے: وقد عد العلماء القراءة بغير تجويد لحنا۔

لیکن اس کے احکام شرعیہ کا اظہار بہت ضروری ہے۔ لہذا تصریحات فقہاء میں مجھے لحن کی تین قسمیں ثابت ہوئیں۔

قسم اول: لحن بمعنی تغنی یعنی جس میں حروف و کلمات متغیر ہو جائیں۔

چنانچہ شامی در مختار کے قول۔ تغنی بغیر کلماتہ کے تحت میں فرماتے ہیں:

ای بزيادة حركة او حرف او مد او غیرها فی الاوائل والاواخر۔

یعنی تغنی جو کلمات کو متغیر کر دیتی ہے وہ کلمات کے اول یا آخر میں حرکت یا حرف یا مد وغیرہ کی زیادتی سے حاصل ہوتی ہے۔

لہذا یہ لحن حرام ہے اور اگر معنی میں تغیر کر دے تو اس سے نماز فاسد ہو جائے گی۔

چنانچہ غنیۃ میں ہے:

اما اللحن المغیر فحرام بلا خلاف۔

در مختار میں اذان کے لحن کے متعلق فرماتے ہیں:

واللحن فيه ای تغنی بغیر کلماته فانه لا يحل فعله و سماعه كالغنى بالقرآن۔

احسن الفتاویٰ و فتاویٰ بزاز یہ میں ہے: ان اللحن حرام بلا خلاف۔

لہذا ایسا لحن باتفاق حرام ہے۔

قسم دوم: وہ لحن جس میں حروف تو متغیر نہ ہوں لیکن اعراب میں خطا واقع ہو جائے جیسا کہ۔

طحاوی میں ہے: والخطاء فی الاعراب یقال له لحن۔

یعنی خطائی الاعراب کو بھی لحن کہا جاتا ہے۔

لہذا یہ لحن مکروہ ہے اور اگر معنی بگڑ جائیں تو نماز فاسد ہو جائے گی۔

چنانچہ غنیہ میں ہے: ویکره الترجیح والتلحین بقراءة القرآن عند عامة المشائخ لانه

تشبه بفعل الفسقة هذا اذا كان لا یغیر الحروف۔

نور الایضاح و مراقی الفلاح میں ہے:

ویکره التلحین و التطریب و الخطاء فی الاعراب۔

در مختار میں مفسدات صلوٰۃ کے بیان میں ہے:

منها القراءة بالالحن ان غیر المعنی والا لا۔

قسم سوم: لحن بمعنی تحسین صوت جس میں قسم اول و دوم کی کوئی خرابی نہ ہو۔ لہذا یہ لحن نماز و غیر نماز

دونوں میں مستحب و مطلوب ہے۔

مراقی الفلاح میں ہے: اما تحسین الصوت بدونه فهو مطلوب۔

شامی میں ہے:

ان القراءة بالالحن اذا لم تغیر الکلمة عن وضعها ولم يحصل بها تطویل الحروف

حتى لا یغیر الحرف حرفین بل مجرد تحسین الصوت و تزین القراءة لا یضر بل یتستحب

عندنا فی الصلوٰۃ و خارجها کذا فی التتار خانیه۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

جواب سوال دوم: زبان کی دہنی یا بائیں کروٹ جب بالائی دائروں سے متصل ہو وہ مخرج

ضاد ہے، اب چاہے دہنی جانب سے اس کو نکالا جائے یا بائیں طرف سے۔

چنانچہ جزری میں ہے:

والضاد من حافظه اذ ولیا لا ضراس من ایسر او یمنها

لہذا زبان کا اگلے دانتوں سے لگنا۔ یا فقط زبان کی نوک سے کام لینا۔ یا زبان کا تالو کی جانب نہ

اٹھنا۔ یا اعتماد ضعیف ہو جانا۔ یا مخرج لام کے قریب تک استطالت کا نہ ہونا۔ یہ ہر ایک ضاد کو مخرج سے

ادا ہونے کے موانع ہیں۔ ”ظا معجمہ“ کا مخرج ثنایا علیا اس طرح ہیں کہ جب زبان کی نوک ثنایا علیا کے

کنارے سے متصل ہو جائے۔ ذ معجمہ اور ص مہملہ اور ص مہملہ یہ تینوں زبان کے کنارے اور ثنایا سفلی کی

جڑ کے مابین سے نکلتے ہیں یہی ان کا مخرج ہے۔ ت فوقانیہ اور ط مہملہ اور د مہملہ یہ تینوں زبان کے کنارے

اور ثنایا علیا کی جڑ کے مابین سے نکلتے ہیں یہی ان کا مخرج ہے۔

جزری میں ہے:

والطاء والذال وقامته ومن۔ علیا الثنایا والصفیر مستکن منه ومن فوق الثنایا

السفلی۔ والطاء والذال و ثا للعلیا۔ من طرفیہا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

جواب سوال سوم: ”ضاد معجمہ“ اور ”ذ معجمہ“ اور ”دال مہملہ“ کے مخرج تو جواب دوم میں گذر

چکے کہ ان میں سے ہر ایک کا مخرج جدا گانہ ہے۔ لہذا پہلا فرق تو ان میں من حیث الخارج ہوا۔ پھر ”ضاد

معجمہ“ مجہورہ۔ رخوہ۔ مستعلیہ۔ مطبقہ۔ مصمۃ۔ مستطیلہ۔ اور ”ظا معجمہ“ مجہورہ۔ رخوہ۔ مستعلیہ۔ مطبقہ۔

مصمۃ۔ اور ”دال مہملہ“ مجہورہ۔ شدیدہ۔ مستقلہ۔ منفتحہ۔ مصمۃ۔ قلقلہ ہے۔ لہذا ”ضاد معجمہ“ کو ”ظا

معجمہ“ سے صرف ایک صفت استطالت کا فرق ہے کہ ”ضاد معجمہ“ مستطیلہ ہے۔ اور ”ظا معجمہ“ مستطیلہ

نہیں۔ اور ”ضاد معجمہ“ کو ”دال مہملہ“ سے چند صفات کا فرق ہے کہ ”ضاد معجمہ“ رخوہ ہے اور ”دال مہملہ

“ اس کی ضد شدیدہ۔ اور ”ضاد معجمہ“ مستعلیہ ہے۔ اور ”دال مہملہ“ اس کی ضد مستقلہ۔ اور ”ضاد معجمہ“

مطبقہ ہے اور ”دال مہملہ“ اس کی ضد منفتحہ۔ اور ”ضاد معجمہ“ مستطیلہ ہے اور ”دال مہملہ“ اس کی ضد

قصیرہ۔ اور ”دال مہملہ“ قلقلہ ہے اور ”ضاد معجمہ“ غیر قلقلہ۔

بالجملہ یہ تینوں حروف متباہ متغائرہ من حیث الخارج والصفات ہوئے۔ اب تلاوت قرآن کریم

میں ایک کو دوسرے سے قصد ابدلنا حرام اور گناہ عظیم و تحریف قرآن کریم ہے۔ اب باقی رہی مشتبه الصوت

کی بحث۔ لہذا اشتباہ صوت کے اسباب یا تو ایک کا دوسرے حرف کے ساتھ مخرج میں اتحاد یا قرب ہوگا

۔ یا مشارکت فی الصفات۔ یا قصور زبان۔

قسم اول: یعنی اتحاد مخرج یا قرب کی وجہ سے مشتبه ہونا۔ لہذا اس اشتباہ کو زائل کرنے والی چند

چیزیں ہیں۔ ہر حرف کا تغایر و تباین وضعی بلکہ ہر ایک کی صحت طبعی امتیاز شہادت کے لئے بہت کافی ہے۔ معہذا صفات عامہ یا خاصہ کا فرق بلکہ ایک کی ادائیگی کی مخصوص کیفیات مشتبہ الاصوات میں ایسا بین فرق پیدا کر دے گی کہ ہر سامع عام ازیں کہ وہ فن تجوید سے مس رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو مگر تغایر مشتبہات کو باسانی معلوم کر لیتا ہے اور مغایر الخارج حروف میں ان تمام امور کے باوجود خود تغایر بین الخارج ایک بڑی امتیاز پیدا کرنے والی چیز ہے۔

الحاصل اس قسم اول کے مشتبہ الصوت حروف کا فرق سیکھنا نہایت ضروری کہ اکثر اس میں امتیاز نہ ہونے کی وجہ سے کلمہ بدل کر معنی متغیر ہو جاتے ہیں۔

قسم دوم: یعنی حروف کا مشارکت فی الصفات کی وجہ سے مشتبہ الصوت ہونا۔ لہذا اس اشتباہ کو زائل کرنے والی بھی چند چیزیں ہیں۔

(۱) ہر حرف کا تغایر و تباین وضعی۔

(۲) ہر ایک کی صوت طبعی۔

(۳) ہر ایک حرف کے ادا کی مخصوص رعایات۔

(۴) بعض میں اس کی خاص صفات۔ کہ ان میں سے ہر ایک ایسے مشتبہ الاصوات حروف میں بین فرق پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ پھر سب کا اجماع تو کمال کا امتیاز پیدا کر دے گا۔ اور اگر ان متشارك فی الصفات حروف میں تغایر بین الخارج بھی ہے تو یہ ایک خودزبردست فرق کرنے والی چیز ہے۔ لہذا اس قسم دوم کے مشتبہ الاصوات کا فرق سیکھنا بھی حتمی اور لازمی ہے کہ اس فرق کے نہ ہونے کی وجہ سے بھی کلمہ متغیر ہو کر معنی اکثر بگڑ جاتے ہیں مگر اس وقت چند متجو داور نئے مدعیان علم تجوید نے مشارکت فی بعض الصفات کا نام اتحاد ذات سمجھ رکھا ہے۔ کہ ”ضاد معجمہ“ کو بالقصد ”ظا معجمہ“ پڑھنا شروع کر دیا ہے اور جب کوئی شخص اعتراض کر دیتا ہے تو نہایت جرأت و دلیری سے کہہ دیتے ہیں کہ ”ضاد معجمہ“ کو چونکہ ”ظا معجمہ“ سے اکثر صفات میں مشارکت ہے اس لئے اس کو ”ظا معجمہ“ کی آواز میں ادا کیا جاتا ہے لہذا میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس جیسے مغالطوں کی حقیقت سے آگاہ کروں۔

چنانچہ اگر بقول ان کے مشارکت فی بعض الصفات ایک حرف کی آواز کو دوسرے کی آواز میں فنا کر دیتی ہے تو ملاحظہ ہو کہ ”حامہملہ“ اور ”شین معجمہ“ میں مانجھ صفات میں مشارکت ہے۔ صرف ”شین

معجمہ“ میں ایک صفت نقشی زائد ہے۔ ”دال مہملہ“ اور ”با موحده“ میں پانچ صفات میں مشارکت ہے۔ صرف ایک صفت میں فرق ہے کہ ”دال مہملہ“ مصمتہ ہے اور ”با موحده“ مذلقہ ہے۔ یہ دو مثالیں تھیں کہ جن میں ایک ایک صفت کا فرق تھا۔ اب دو مثالیں وہ لیجئے جن میں ایک صفت کا بھی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ ”ہا“ اور ”ثا مثلثہ“ کہ ان دونوں میں ایک صفت کا بھی فرق نہیں ہے۔ کہ یہ دونوں مہموسہ۔ رخوہ۔ مستقلہ۔ منفتحہ۔ مصمتہ۔ ہونے میں برابر ہیں۔ اسی طرح ”کاف و تا فوقانیہ“ کہ یہ دونوں بھی پانچوں صفت مہموسہ۔ شدیدہ۔ مستقلہ۔ منفتحہ۔ مصمتہ میں برابر ہیں۔ لہذا اب ان نئے قاریوں کو چاہئے کہ پہلی دونوں مثالوں میں چونکہ اکثر صفات میں مشارکت ہے صرف ایک ایک صفت کا فرق ہے۔ جیسے ”ضاد معجمہ“ اور ”ظا معجمہ“ میں ایک صفت کا فرق ہے۔ تو جب باوجود ایک صفت کا فرق ہوتے ہوئے ”ضاد معجمہ“ ہم آواز ”ظا معجمہ“ کا ہی نہیں ہو گیا بلکہ ذات ”ظا معجمہ“ بن گیا۔ لہذا اس قاعدہ کی بنا پر ”ش معجمہ“ ہم آواز ”جیم“ اور ”زا“ اور ”دال مہملہ“ ہم آواز ”با موحده“ کا ہی نہیں ہو جائے بلکہ ”ش معجمہ“ ذات ”حامہملہ“ اور ”دال مہملہ“ اور ذات ”با موحده“ بن جائے۔

اب باقی رہیں آخر کی دو مثالیں تو ان میں مشارکت فی بعض الصفات ہی نہیں بلکہ مشارکت فی کل الصفات ہے۔ اور ”ضاد معجمہ“ اور ”ظا معجمہ“ میں تو ایک صفت کا فرق بھی تھا اور یہاں تو فرق کا نام ہی نہیں۔ لہذا ایک کو دوسرے کی ہم آواز ہونے کا تو کیا ذکر بلکہ ”ہا“ کو ”ثا مثلثہ“ اور ”ک“ کو ”ت“ ”فوقانیہ“ پڑھنا چاہئے باوجودیکہ ہر ناخواندہ بھی ”ح مہملہ“ اور ”شین معجمہ“ میں اور ”دال مہملہ“ اور ”ب موحده“ میں اور ”ہا“ اور ”ثا مثلثہ“ میں اور ”ک“ اور ”ت فوقانیہ“ میں بین فرق سمجھتا ہے۔

بالجملہ مشتبہ الصوت ہونے کا مدار یہ متجو دین کیا اب بھی مشارکت فی الصفات ہی قرار دیں گے۔ اور سنئے کہ ”ط مہملہ“ اور ”ت فوقانیہ“ مشتبہ الصوت ہیں باوجودیکہ چار صفات میں متغایر ہیں کہ ”ط مہملہ“ ”مجمورہ۔ مستعلیہ۔ مطبقہ۔ قلقلہ“ ہے اور ”ت فوقانیہ“ میں اس کی اضداد صفات ہیں یعنی مہموسہ۔ مستقلہ۔ منفتحہ۔ غیر قلقلہ۔ لہذا اگر مشتبہ الصوت ہونے کا مدار صرف مشارکت فی الصفات ہوتا تو باوجود چار صفات کے فرق ہوتے ہوئے یہ دونوں مشتبہ الصوت نہ ہوتے حالانکہ ان کو مشتبہ الصوت تسلیم کیا گیا ہے۔ علاوہ بریں ان متجو دین نے مشتبہ الصوت ہونے کا یہ مطلب کہاں سے تراشا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے ایسے ہم آواز ہو جائیں کہ جس میں سامع کو کوئی امتیاز ہی نہ ہو سکے۔ ملاحظہ ہو کہ یہی ”ت فوقانیہ“ اور ”ط مہملہ“ مشتبہ الصوت ہیں باوجودیکہ ہر سامع ان کی ادائیگی کے وقت ان میں بین فرق باسانی معلوم

کر لیتا ہے۔ لہذا ”ض معجمہ“ کو ”ظ معجمہ“ پڑھنا اور گلو خلاصی کے لئے مشتبہ الصوت کو آڑ بنالینا ان مجتہدین کا قرآن کریم میں تحریف کرنا ہے ورنہ ان مجتہدین کے ان قاعدہ کی بنا پر کیا ہر مشتبہ الصوت کا یہ طریقہ تلاوت ہے۔ پھر لطف کی ایک یہ بات ہے کہ مشابہت جانین سے مساوات چاہتی ہے۔ لہذا اس کی کیا وجہ ہے کہ ”ضم معجمہ“ کو ہم آواز ”ظ معجمہ“ کیا جاتا ہے اور ”ظ معجمہ“ کو ہم آواز ”ض معجمہ“ کے نہیں کیا جاتا کیونکہ ”ض معجمہ“ میں ایک صفت استطالت ”ظ معجمہ“ سے زائد ہے۔ لہذا باوجود اس کے اس کے خلاف پر کوئی دلیل ترجیح قائم ہوگئی ہے۔ اب باقی رہا یہ عذر کہ ”ض معجمہ“ کی ادائیگی میں نہایت دشواری اور اشکال ہے تو کیا یہ عذر تبدیل حرف کو جائز کر دے گا۔ علاوہ بریں جس شخص کو جس حرف کے ادا کرنے میں دشواری ہو تو کیا اس کے لئے یہی قاعدہ ہے کہ وہ اس طرح تبدیل حرف کر لیا کرے۔ لہذا پھر تو ہر شخص کا نیا ہی قرآن ہو جائے گا۔ نعوذ باللہ من هذه الخرافات۔

قسم سوم : یعنی زبان کے قصور کی وجہ سے مشتبہ الصوت ہونا۔ لہذا اس کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) عجز۔ (۲) عذر۔ ان دونوں کی تعریف اور حکم مقدمہ چہارم کی قسم سوم و چہارم میں مفصل گذر چکا۔

بالجملہ خلاصہ جواب یہ ہے کہ ”ض معجمہ“ ان دونوں حرف ”ظ معجمہ“ اور ”دہملہ“ سے ایک بالکل علیحدہ اور ممتاز حرف ہے۔ لہذا ”ض معجمہ“ نہ ”ظ معجمہ“ پڑھا جائے گا نہ ”دہملہ“ اور ”دہملہ“ منقطع نہیں ہوتی۔ اس کو منقطع لکھنا غلطی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

جواب سوال چہارم : سنت یہی ہے کہ رکوع میں ”سبحان ربی العظیم“ ہی کہا جائے اور عظیم میں ”ظا“ کو مخرج سے ادا کیا جائے اور بصورت عجز یا عذر اگر ”زا“ سے کہا اور وہ بجائے عظیم کے عزیم بن گیا تو یہ حضرت حق سبحانہ تعالیٰ کی شان اعلیٰ میں سخت گستاخی کا حکم ہو گیا کہ عزیم کے معنی قاموس میں۔ العدو الشدید کے ہیں۔ لہذا شامی نے ایسے عوام کے لئے جو ”ظا“ ادا نہ کر سکتے ہوں یہ حکم نقل کیا کہ وہ بجائے ”سبحان ربی العظیم“ کے ”سبحان ربی الکریم“ کہا کریں۔

عبارت یہ ہے :

السنة فی تسبیح الركوع سبحان ربی العظیم الا ان کان لا یحسن الظاء فیبدل به الکریم لئلا یجرى علی لسانه العزیم فنفسد به الصلوٰۃ کذا فی شرح درر البحار فلیحفظ فان العامة عنه غافلون حیث یاتون بدل الظاء بزاى مفحمة۔

اور صورت خطا میں بسبب تغیر معنی کے نماز فاسد ہو جائے گی۔

اقول قوله تفسد اشارة الى هذه واما فی العجز فالمتحار عدم الفساد كما بینا فی المقدمة الرابعة۔

(۲) ”سبحان ربی الاعلیٰ“ کی عین کو بھی صحیح طور پر ادا کیا جائے کہ عین کا مخرج سے ادا کرنا عوام کو زیادہ دشوار نہیں ہے بخلاف ”ظا“ کے کہ اس کی ادا مشکل ہے۔ اب چونکہ ”آلی“ میں دوسرے غیر مناسب شان حق جل جلالہ معانی بھی ممکن ہیں۔ لہذا ”اعلیٰ“ کو ”آلی“ ادا ہونے سے بچانا ضروری ہے اور صورت خطا میں احتیاط اسی میں ہے کہ نماز کے فساد کا حکم دیا جائے۔ کہ ”آلی“ کے معنی صراح میں بزرگ سرین کے بھی ہیں اور صورت عجز اور عذر میں نماز فاسد نہ ہوگی۔ کما فصلنا فی المقدمة الرابعة۔

(۳) ”ویاک“ میں ایک حرف یعنی ہمزہ حذف کیا۔ لہذا صورت خطا میں بقاعدہ متقدمین بوجہ تغیر معنی کے فساد نماز کا حکم ہے۔ اب باقی رہی۔

طحطاوی کی یہ عبارت :

و کثیرا ما یقع فی قراۃ بعض القرویین والاتراک والسودان ویاک نعبد بواو مکان الهمزة والصراط الذین بزیادة الالف واللام وصرحوا فی الصورتین بعدم الفساد وان غیر المعنی۔

لہذا اس میں یا عجز کی بنا پر عدم فساد کا حکم ہے۔ یا باعتبار اقوال متاخرین کے وسعت ملحوظ ہے۔

فالاولیٰ الاخذ فیہ بقول المتقدمین لانضباط قواعدهم وكون قولهم احوط وهو الذی صححه المحققون من اهل الفتاوی۔

(۴-۵) ”ض معجمہ“ کی جگہ اگر عذر ”ظ معجمہ“ یا ”دہملہ“ پڑھی تو اس کی نماز یقیناً فاسد۔ اور اگر وہ اس کی عادت بھی مقرر کرے تو اس کی امامت ہرگز درست نہیں۔ اس وقت جو نئے قاری ”ض معجمہ“ کو بالقصد ”ظ معجمہ“ پڑھتے ہیں وہ اپنا حکم مقدمہ چہارم کی بحث میں تلاش کر لیں۔ اب رہے ”دہملہ“ پڑھنے والے چونکہ مدعی تجوید نہیں اس لئے ان کا حکم ظانیوں کا سا نہیں ہے اگرچہ ”ض“ کو ”د“ پڑھنا بھی غلط ہے۔ اور اگر خطا ”ض“ کی جگہ ”ظا“ یا ”د“ پڑھی تو اس کا حکم ہر جگہ ایک نہیں جہاں معنی متغیر ہو جائیں نماز فاسد ہو جائے گی اور جہاں معنی متغیر نہ ہوں وہاں نماز فاسد نہیں ہوگی۔ ”غیر المغضوب“ میں ”ض“ کو ”ظا“ پڑھنے میں چونکہ معنی متغیر ہو گئے۔ لہذا نماز فاسد اور ”ولا الضالین“ میں ”ض“ کی جگہ ”ظا“ یا ”د“ پڑھنے

میں چونکہ معنی متغیر نہیں ہوئے۔ لہذا نماز فاسد نہیں ہوگی۔

چنانچہ غنیہ میں قاضی خان سے ناقل ہیں:

ولینس فی القرآن غیر المغضوب بالظاء والذال المعجمتین تفسد اذ لیس لهما معنی ولا الضالین بالظاء المعجمہ او الذال المهملة لا تفسد لوجود لفظہما فی القرآن وقرب المعنی۔

لہذا نماز تو ”غیر المغضوب“ پر ہی فاسد ہو جائے گی ”ولا الضالین“ تو نماز کے باہر کرے گا۔ اور بحالت عجز و عذر ”ض“ کی ”ظ“ یا ”ذ“ ہی نہیں بلکہ اگر کوئی اور حرف بھی بدلاتو خود اس کی نماز درست ہے۔ کما مر فی مب احث العجز والعذر۔

(۶) رحلة الشتاء والصيف کے ”ص“ کی جگہ اگر ”س“ ادا کیا تو نماز فاسد ہو جائے گی۔

غنیۃ میں ہے۔

رحلة الشتاء والصيف بالسین مکان الصاد تفسد للبعد الفاحش۔

اور عجز کی حالت میں بنا براتحاد مخرج یا فرق بمشقة یا عموم بلوی وغیرہ کے خود اس کی نماز درست

۔ کما هو مشرح فی کتب الفقہ۔

(۷) فائزون ”ذ“ سے پڑھنے میں بحالت خطا غالباً نماز فاسد ہو جائے گی کہ صراح اور قاموس و ثخب و تاج المصادر وغیاث میں اس کے کوئی معنی نہیں لکھے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بے معنی اور مہمل لفظ ہے۔ اسی بنا پر فساد کا حکم ہے اور حالت عجز میں نماز درست۔

(۸) اذا جاء نصر الله میں ”صاد“ کی جگہ ”س“ پڑھنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔

چنانچہ غنیۃ میں ہے۔

قرأ اذا جاء نصر الله بالسین لا تفسد لان من جملة معانية القطعة من الجيش وبتقديره يصح المعنى فان جيش الله هم الملائكة مستلزم للنصر۔

(۹) حمالة الحطب کی ”ط“ کی جگہ اگر ”ت“ بصورت خطا ادا کی تو نماز فاسد ہو جائے گی۔

غنیۃ میں ہے۔

ولو قرا حمالة الحطب بالتاء مکان الطاء تفسد۔

اور بحالت عجز درست۔

(۱۰) یکزب ”زا“ سے پڑھنے کی صورت میں اغلب یہی ہے کہ بحالت خطا نماز فاسد ہو جائے

کیونکہ یہ معنی بہت بعید ہوئے جاتے ہیں اور بصورت عجز درست۔ لہذا اگر ایک حرف کا دوسرے حرف سے بدلنا بالعمد ہے تو اس کی نماز فاسد اور امامت درست نہیں اور اگر بالخطا ہے تو بصورت تغیر معنی نماز فاسد اور بصورت صحت درست اور بصورت فساد اس کے مقتدیوں کی بھی نماز فاسد اور عجز کی حالت میں خود اس کی نماز درست لیکن وہ صحیح خوانوں کی امامت نہیں کر سکتا۔ وہ کذا حکم المعذور یہ خلاصہ جواب چہام ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

جواب سوال پنجم: ان مقامات میں الف کی زیادتی سے ”لا“ نفی بن جائے گا اور اس میں بجائے اثبات کے نفی کے معنی پیدا ہو جائیں گے تو اس میں معنی بہت زیادہ بگڑ جائینگے۔ لہذا بنا بر قول احوط حضرت امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تعالیٰ کے فساد نماز کا حکم ہے۔

چنانچہ شامی سے ناقل ہیں:

ولو زاد حرفاً لا یغیر المعنی لا تفسد عندهما وعن الثانی روایتان کمالو قرأوا نہی عن المنکر بزيادة الياء ويتعد حدوده يدخلهم نارا وان غیر یفسد۔

اور بحالت عجز بھی اس میں حکم فساد ہی زیادہ احوط ہے۔ کہ اس کے امتیاز میں زیادہ دشواری نہیں ہے۔ فلیتأمل۔

جواب سوال ششم: تغوڑ کے آخر میں چونکہ شیطان کا نام ہے اور اس کے بعد اس کی صفت رجم ہے۔ لہذا اس کا کسی اسم الہی سے وصل مناسب نہیں ہے اگرچہ وصل و وقف سے علمائے کرام نے معنی کا تغیر تسلیم نہیں کیا ہے۔ ہاں اگر معنی پر نظر رکھتے ہوئے اور اس اتصال کو اچھا سمجھتے ہوئے اس نے عدا وصل کو اختیار کیا تو یہ گنہگار ہوگا، جیسا کہ شامی کی عبارت سے مصرح ہے:

والاولی الاخذ بهذا فی العمد۔

ہاں بسم اللہ شریف کو اسمائے الہی سے وصل کر سکتے ہیں۔ کما هو مصرح فی کتب

التجوید۔

جواب سوال ہفتم: مقدمہ چہارم سے معلوم ہو چکا کہ عاجز اور معذور پر یہ واجب ہے کہ تصحیح

حروف میں رات دن پوری کوشش کریں اور اگر صحیح خواں کی اقتدا کر سکتے ہوں تو جہاں تک ممکن ہو اس کی

اقتدا کریں۔ یا وہ آیتیں پڑھیں جس کے حروف صحیح ادا کر سکتے ہوں اور اگر یہ صورتیں ممکن نہ ہوں تو اس زمانہ کوشش میں خود انکی نماز ہو جائے گی۔ باقی رہی امامت تو یہ دونوں اپنے اپنے مثل کی امامت بھی کر سکتے ہیں۔ لہذا ایسا مجود کہ جو حروف کو صحیح طور پر ادا کر لیتا ہے یہ دونوں اس کے امام نہیں بن سکتے ہیں۔ چنانچہ غنیہ میں ہے:

والذی ینبغی ان یکون الحکم فیہ کالحکم فی الثغ انہ یجتہد فی اصلاح لفظہ ولا تفسد صلوٰتہ مادام علی الاجتہاد ولکن لا یجوز لغيرہ الاقتداء بہ فاعلموا هذا الحکم فی کل من لا یحکبہ النطق بحرف وفصلنا فی المقدمة الرابعة۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب وصلى الله على خير خلقه سيدنا محمد وآله واصحابه اجمعين۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہجل

مسئلہ

(۲۶۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ رمضان المبارک میں تراویح کے اندر ختم کلام اللہ کے وقت تین مرتبہ سورۃ اخلاص جو پڑھی جاتی ہے تو آیا یہ تین مرتبہ پڑھنا شرع شریف سے ثابت ہے یا محض حفاظ کا طریقہ؟ اگر یہ ثابت ہے تو برائے کرم بالذکر اظہار فرمادیتے۔

الجواب

اللہم ہدایۃ الحق والصواب
قل هو اللہ شریف کا ختم تراویح میں تین مرتبہ پڑھنا محض حفاظ کا طریقہ نہیں بلکہ متاخرین نے امر مستحب قرار دیا ہے۔

چنانچہ فقہ کی مشہور کتاب غنیہ میں ہے:

وقرأۃ قل هو اللہ احد ثلاث مرات لم یستحسنہا بعض المشائخ وقال الفقہ ابو الیث هذا شیء استحسنہ اهل القرآن وائمة الامصار فلا یاس بہ۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ

(۲۶۶-۲۶۷-۲۶۸-۲۶۹)

حضرت ضیغ سنیت حامی سنیت حاجی بدعت عالم اہل سنت والجماعۃ مولانا المکرم ذوالمجد والکرم مولانا مولوی مفتی شاہ محمد اجمل صاحب زید مجدہم مفتی سنہجل ضلع مراد آباد۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔
حضور والا فقیر یہ چند سوالات بغرض حضور جوابات خدمت بابرکت بالا درجت میں روانہ کرتا ہے جوابات سے سرفرازی بخشی جائے۔

سوال اول: حفاظ و قراء حضرات قرآن پاک کی کوئی سورۃ یا رکوع لہجے کے ساتھ قرأت سے پڑھتے ہیں تو بڑی آیت ایک سانس میں نہ پڑھنے کی بنا پر درمیان آیت پر وقف کر دیتے ہیں۔ اور پھر جہاں سے وقف کرتے ہیں وہاں سے یا اس کے اوپر سے دوسری سانس سے پڑھتے ہیں۔ اس طرح بعض بعض لفظ تکرار سے پڑھے جاتے ہیں جیسے ”وقال الذین کفروا ربنا ارنا الذین اضلنا من الجن والانس“ پر وقف کر کے پھر سے دوسری سانس میں ”تتنزل علیہم الملائکۃ“ سے پڑھا۔ یا ”لو انزلنا هذا القرآن علی جبل لرئیته“ پر وقف کیا اور ”المہیمن العزیز الجبار المتکبر“ پڑھا۔ یا سورۃ بقرہ کا پہلا ہی رکوع شروع کیا اور بالغیب پر وقف کر کے پھر بالغیب سے پڑھنا شروع کیا۔ یا ”وقال الذین کفروا لا تسمعوا لهذا القرآن والغوا فیہ“ پر وقف کر دیا کچھ ٹھہرا پھر ”والغوا فیہ لعلکم تغلبون“ پڑھا۔ علیٰ ہذا القیاس۔ اس طرح تکرار سے قرآن شریف پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو کس بنا پر مفصل مدلل ارشاد فرمائیں۔ زید یہ کہتا ہے کہ تکرار الفاظ کے ساتھ قرآن شریف پڑھنا صحیح نہیں ہے جیسا کہ قراء اور حفاظ پڑھتے ہیں کہ ”تتنزل“ پر وقف کر کے یا ”من الجن والانس“ پر وقف کر کے یا ”علیٰ جبل لرئیته“ پر وقف کر کے۔ یا ”بالغیب“ پر وقف کر کے دوبارہ پھر تنزل پر سے۔ یا من الجن والانس۔ یا علیٰ جبل لرئیته۔ یا بالغیب سے پڑھنا صحیح نہیں۔ یا ایسا ہی ہے جیسا کہ ”اذابطشتم بطشتم جبارین“ یا۔ یعلمون یعلمون یا قواریر قواریر یہ جو لفظ تکرار آئے ہیں۔ لہذا ان کے علاوہ جہاں تکرار سے الفاظ نہ ہوں وہاں تکرار سے پڑھنا غلط ہے زید کا قول صحیح ہے یا نہیں کیا حکم شرعی ہے؟

سوال دوم: گول آیت پر لا بنا ہو تو وہاں ٹھہرنا وقف کرنا جیسے سورۃ فاتحہ میں رب العالمین پر وقف کر دیا۔ پھر الرحمن الرحیم پڑھا۔ مستقیم پر وقف کر کے صراط الذین انعمت علیہم پڑھا۔ یا سورۃ ناس میں الخناس پر وقف کر کے الذی یوسوس پڑھا۔ یا سورۃ فلق میں اذا وقب پر وقف کر دیا پھر ومن شر النفث پڑھا۔ یا سورۃ بقرہ شریف میں لعکم تتقون پر وقف کر کے الذین

جعل لكم الارض فراشا والسماء بناء پڑھا۔ یا سورہ ماعون میں ساہون پر وقف کیا پھر الذین ہم یسراؤن ویمنعون الماعون پڑھا۔ اس طرح جہاں گول آیت پر لا ہو تو وہاں پر وقف کرنا جائز ہے یا نہیں؟

زید کہتا ہے کہ گول آیت پر لا ہو تو وہاں پر وقف کرنا جائز نہیں۔ سابقہ قراء کے خلاف اپنی طرف سے جدت ہے جو قواعد حجاج ابن یوسف کے زمانہ میں قراء نے مقرر کئے ہیں ان کے خلاف ہے۔ لہذا رب العلمین پر وقف کر کے الرحمن الرحیم پڑھنا۔ یا مستقیم پر وقف کرنا۔ یا لعکم تنقون پر وقف کرنا علیٰ هذا القیاس۔ جہاں پر گول آیت لا ہو وہاں پر وقف کرنا صحیح نہیں ہے۔ وقف کر کے الرحمن الرحیم۔ یا۔ صراط الذین۔ یا۔ الذی جعل لكم الارض پڑھنا صحیح نہیں ہے۔ نیز یہ بھی کہتا ہے کہ الخناس پر وقف کر کے الذی یوسوس پڑھنا غلط کہ الخناس موصوف ہے، الذین اسم موصول یوسوس صمد، صمد موصول سے مل کر صفت ہوگی۔ لہذا اسم موصول کی ضمیر کس طرف پھیری جائیگی جب الخناس پر وقف کر دیا۔ زید کا قول صحیح ہے یا غلط شرعاً کیا حکم ہے؟

سوال سوم: سورہ اخلاص اس طرح پڑھنا کہ قل هو اللہ احدن اللہ الصمد یعنی احد پر نہ ٹھہرنا وقف نہ کرنا بلکہ احد کی دال پر پیش پڑھ کر نون قطنی اللہ الصمد میں اللہ سے پہلے بڑھا کر احدن اللہ الصمد پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ زید کا قول ہے نون قطنی بڑھا کر احدن اللہ الصمد پڑھنا صحیح نہیں ہے کہ احد پر وقف مطلق پر ہے، وقف مطلق پر وقف نہ کرنا اپنی جدت ہے، قراء سابقہ کے خلاف۔

سوال چہارم: سورہ لہب میں تب کی ب مشدد ہے، تب کو اس طرح پڑھنا کہ ب دوبارہ ہو ضروری ہے یا نہیں؟ بعض حفاظ اس طرح پڑھتے ہیں کہ تب پر وقف نہیں کرتے بلکہ تب کی ب دومرتبہ پڑھتے ہیں، ایک بار تب کے ساتھ، دوسری ب ما اغنیٰ عنہ کے ساتھ، یعنی وتب ما اغنیٰ عنہ اس طرح پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟۔ بینوا تو جروا

المستفتی، فقیر محمد عمران قادری رضوی مصطفویٰ غفرلہ ربہ محلہ منیر خاں پبلی بھیت شریف

۱۹ محرم الحرام ۱۳۷۶ھ

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

(۱) جب کلام تام نہ ہو اور کلمات کے درمیان معنوی تعلق بھی ہو اور لفظ کے اعتبار سے بھی ایسا تعلق ہو کہ ایک کلمہ مبتدا ہو اور دوسرا خبر ہو۔ یا ایک معطوف علیہ ہو دوسرا معطوف ہو۔ یا ایک موصوف ہو دوسرا صفت ہو۔ یا ایک مضاف ہو دوسرا مضاف الیہ ہو۔ یا ایک رافع ہو دوسرا مرفوع ہو۔ یا ایک ناصب ہو اور دوسرا منصوب ہو۔ یا ایک ذوالحال ہو دوسرا حال ہو۔ یا ایک مستثنیٰ ہو دوسرا مستثنیٰ منہ ہو۔ یا ایک مفسر ہو دوسرا مفسر ہو۔ یا ایک ممیز ہو دوسرا تمیز ہو۔ یا ایک موصول ہو دوسرا صلہ ہو۔ یا ایک شرط ہو دوسرا جزاء ہو۔ یا ایک عامل ہو دوسرا معمول ہو۔ یا اور لفظی تعلقات ہوں تو ایسے کلمات کے درمیان باختیار وقف نہ کیا جائے۔ اور اگر بحالت اضطراب ان کے درمیان سانس ہی ٹوٹ گیا یا کھانسی آگئی۔ یا سہو ہو گیا اور ان مجبوریوں کی بنا پر وقف کرنا پڑ گیا۔ تو جس کلمہ پر وقف کیا ہے اس کو دوہرایا جائیگا۔ یعنی پھر اسی سے سانس کی ابتدا کرنی ضروری ہے۔

چنانچہ علامہ علی قاری منہج فکریہ شرح جزریہ میں فرماتے ہیں:

وكذا لو وقف على المضاف دون المضاف اليه والصفة دون الموصوف والرافع دون المرفوع والناصب دون المنصوب والمنصوب دون الناصب وكذا الوقف على المعطوف دون المعطوف عليه وعلى ان واخواتها دون اسمها واسمها دون خبرها وعلى كان واخواتها دون اسمها واسمها دون خبرها وعلى ظننت واخواتها دون منصوباتها وعلى صاحب الحال دونها وعلى المستثنى منه دون الاستثناء وعلى المفسر دون المفسر وعلى الذى وما ومن دون صلاتهن وعلى صلاتهن دون معمولاتهن وعلى الفعل دون مصدره والله وعلى حرف الاستفهام دون ما استفهم بها عنه وعلى حروف الشرط دون المشروط وعلى المشروط دون الجزاء وعلى الامر دون جوابه الا ان يكون القارى مضطربا فانه يجوز الوقف حال اضطرابه كما نقطاع ونحوه لكن اذا وقف بابتدئ من الكلمة التى وقف عليها۔

(منہج فکریہ مصری صفحہ ۶۰)

تو سائل نے جن آیات کے متعلق سوال کیا ہے تو ان میں وقف نہ کلام تام پر ہوا نہ آیت پر۔ بلکہ وہ ایسے کلمات کے درمیان ہوا جن میں تعلق معنوی بھی ہے اور تعلق لفظی بھی ہے۔ تو جس کلمہ پر وقف ہو اسی کو دوہرایا جائیگا اور اسی سے ابتدا کی جائیگی۔ لیکن اگر قال الذین کفروا ربنا ارنا الذین اضلنا من الجن والانس سے نہ کی جائے کہ اس میں فعل و معمول فعل میں فصل ہو جائیگا۔ بلکہ الذین اضلنا سے

ابتدا کی جائے۔ اسی طرح ”لو انزلنا هذا القرآن علی جبل لرأیتہ“ پر سانس ٹوٹی تو علی جبل سے ابتدا نہ کی جائے کہ اس کے فعل اور معمول میں فصل ہو جائیگا، بلکہ لرأیتہ سے ابتدا کی جائے۔ اسی طرح سورہ بقرہ میں جب بالغیب پر سانس ٹوٹی تو ابتدا بالغیب سے نہ کریں بلکہ یومنون سے ابتدا کریں تا کہ فعل اور اس کے معمول میں فصل نہ ہو۔ بالجملہ ایسی تکرار کرنا اور دو ہرانا متعلقات اتصال معنوی اور لفظی کے اظہار کے لئے ہے تو قرآن کریم میں ایسی تکرار نہ فقط جائز بلکہ حسن ہے بلکہ بعض مقامات میں تو واجب ہے۔ اسی مخ فکریہ شرح جزریہ میں ہے:

ومن انقطع نفسه علی ذلك وجب علیہ ان یرجع الی ما قبلہ ویصل الکلام بعضہ ببعض فان لم یفعل اثم انما یستقیم فی الامثلة الاولی واما فی الامثلة الثانیة فینبغی ان یعود فالعو داحمد۔

زید چونکہ مسائل قراءت سے ناواقف ہے تو اس کا قول نہ فقط غلط ہے بلکہ نہایت جہالت پر مبنی ہے۔ اس کو اتنی جرأت نہ کرنی چاہئے کہ اس کے قول سے امت کا غلطی پر مجتمع ہونا لازم ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) جب گول آیت پر لا ہو تو وہاں پر وقف کرنا جائز ہے اگرچہ اس پر وقف کا نہ کرنا ہی اولیٰ ہے جامع العلوم میں ہے (لا) ”فالوجهان الوصل والوقف لکن الاول افضل“ ہاں جب آیت لا پر سانس ٹوٹ جائے تو اس کو دہرائے نہیں بلکہ ابتداء اس کلمہ سے کرے جو بعد آیت کے ہے کہ حقیقہ آیت ہی تو وقف کا محل ہے۔ مخ فکریہ میں ہے:

ان رؤس الآی وغیرہا فی حکم واحد من جهة تعلق ما بعده بما قبلہ وعدم تعلقہ ولذا جعلوا رمز لا ونحوہ فوق الفواصل کما کتبوها فوق غیرہا مع اتفاقہم علی جواز الابتداء بعد رؤس الآی۔

لہذا زید کا قول غلط ہے۔ خود حدیث شریف میں ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے آیت لا پر وقف کیا اور ابتدا بعد آیت کے کلمہ سے کی۔

کان النبی ﷺ اذا قرأ ایه فیقول بسم اللہ الرحمن الرحیم ثم یقف الحمد لله رب

الغلمیس۔ ثم یقف الرحمن الرحیم ثم یقف مالک يوم الدين ثم یقف الح (رواہ ام سلمہ رضی اللہ عنہما)

تو اس حدیث شریف سے ثابت ہو گیا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے الغلمیس پر وقف کیا پھر الرحمن سے ابتدا کی اور الرحمن پر وقف کیا تو یہ دونوں آیات لا کی ہیں تو اس حدیث شریف سے ثابت ہو گیا کہ حضور نے آیت لا پر وقف کیا اور ما بعد آیت کے کلمہ سے ابتدا فرمائی۔ تو زید کا قول حدیث شریف کے خلاف ہوا۔ اور فعل شارع علیہ السلام کے مخالف ثابت ہوا تو زید کو ایسی دلیری پر توبہ واستغفار کرنی چاہئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۳) جس کلمہ پر تنوین ہو اور اس کے بعد معرف باللام کلمہ ہو تو ان میں وصل کا یہ طریقہ ہے کہ ہمزہ کی حرکت نقل کر کے ماقبل کو دی جائیگی۔ اور جب پہلے کلمہ کے آخر میں تنوین تھی اور تنوین نون ساکن ہوتا ہے اور ساکن کو حرکت صرف کسرہ ہی دیا جاتا ہے تو خفی قلم سے نون کو لکھ کر اس کے نیچے کسرہ دیدیا جاتا ہے جیسے سورہ شعراء میں ہے کذبت عادن المرسلین اور سورہ النجم میں ہے اهلك عاد ن الاولی۔ ان آیات معرف باللام المرسلین اور الاولیٰ کی ہمزہ کی حرکت نقل کر کے عاد کی تنوین یعنی نون ساکن کو کسرہ دیا گیا۔

چنانچہ سراج القاری شرح قصیدہ شاطبی میں ہے ”ان ابن کثیر وابن عامر والکوفیین یقرؤن فی الوصل عاد ن الاولی“ بکسر التنوین وسکون اللام وبعدها همزة مضمومة۔ لہذا یہی قاعدہ قل هو اللہ احد ن اللہ الصمد میں ہے کہ احد پر تنوین ہے اور اس کے بعد لفظ اللہ معرف باللام ہے تو ہمزہ کی حرکت نون ساکن کو بصورت کسرہ دی۔ یہ جب ہے کہ احد اور اللہ کے درمیان وصل مقصود ہوا اگرچہ احد پر آیت ہے اور اس پر (ج) ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ اس پر وقف وصل دونوں جائز ہیں۔

حضرت مفتی عنایت صاحب البیان الجزیل میں فرماتے ہیں۔ ج علامت جائز کی ہے وہاں ٹھہرنا نہ ٹھہرنا برابر ہے۔ تو جب اس میں وصل بھی جائز ہے تو قل هو اللہ احد ن اللہ الصمد پڑھنا بھی بلاشبہ جائز ثابت ہوا۔ تو زید کا اس کو صحیح نہ کہنا بھی غلط ہے۔ اور احد پر آیت مطلق کہنا بھی غلط ہے اس کو چاہئے کہ وہ اپنی غلط بات سے رجوع کرے اور قول حق کو قبول کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۴) رسالہ وقف میں یہ قاعدہ موجود ہے۔ ”اگر حرف موقوف علیہ مشدد ہو خواہ حرف علت

ہو یا حرف تہ تشدید پر وقف کیا جائیگا تشدید میں کسی قسم کا نقصان نہ ہوگا۔ پس اگر مفتوح ہے تو سکون محض ہوگا جیسے تب۔ فاعلمن۔ الی۔ صواف۔ تو اس سے ثابت ہو گیا کہ تب کی ب کو مشدّد پڑھا جائیگا اور اس پر وقف ہی کیا جائیگا۔ کہ اس کے بعد آیت مطلق ہے تو اس کے مابعد سے وصل نہیں کر سکتے اور جب اس پر وقف ہے تو اس پر زبر نہیں پڑھ سکتے بلکہ اس پر وہی وقف کا سکون ہوگا۔ تو بعض حفاظ کا اس کے خلاف پڑھنا خلاف قاعدہ قرأت ہے جس کے غلط ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۲۶ صفر المظفر ۱۳۷۶ھ

کتبہ: المقتضی بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۲۷۰)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین حسب ذیل مسئلہ میں اللہ تعالیٰ ابر عظیم عطا فرمائے
کچھ لوگ ولا الضالین کو لا لظالمین بالقصد پڑھتے ہیں اور منع کرنے پر نہیں مانتے، کہتے ہیں
یہی صحیح ہے۔ استدعا ہے کہ اس میں چند باتوں کا اظہار فرمایا جاوے۔

اول: ض وظ کا بطریق تجوید صحیح پڑھنے کا طریقہ کیا ہے اور ولا الضالین کے معنی کیا ہیں مفید
نماز ہے یا نہیں؟ اور تبدیل حرف کر کے قصد پڑھنے والا کیسا ہے اور جوابات مدلل تحریر فرمائے جائیں
دوسرے کتب عربیہ شریف کا اردو ترجمہ فرمایا جائے۔

شرح فقہ اکبر ملا علی قاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (ص ۱۵۳) میں فرماتے ہیں:

”وفی المحيط سئل الامام الفضلی عن یقرأ الظاء المعجمة مکان الضاد
المعجمة او یقرأ اصحاب الجنة مکان اصحاب النار وعلی انعکس فقال لا تجوز امامتہ
ولو تعمّد یکفر قلت اما کون تعمده کفراً فلا کلام فیہ اذالم یکن فیہ لغتان ففی ضنین
الخلافاً سامی اما تبدیل الظاء مکان الضاد ففیہ تفصیل و کذا تبدیل اصحاب الجنة فی
موضع اصحاب النار و عکسہ ففیہ بخلاف و بحث طویل“

محیط میں ہے: امام فضلی سے اس شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جو ضاد کی جگہ ظاء معجمہ پڑھتا

ہے اور اصحاب النار کی جگہ اصحاب الجنة یا اس کے خلاف الٹا پڑھتا ہے تو فرمایا اس کی امامت جائز نہیں اور
اگر قصد پڑھا تو کافر ہو گیا۔ میں کہتا ہوں قصد پڑھنے والے کے کفر میں تو خلاف ہی نہیں جب اس میں
دولت نہ ہوں تو ضنین میں اختلاف ہے لیکن ضاد کی جگہ ظا کا بدلنا تو اس میں بھی تفصیل ہے اسی طرح
اصحاب النار کی جگہ اصحاب الجنة یا اس کے خلاف بدلنے میں اختلاف ہے اور لمبی بحث ہے

”خزینۃ الاسرار الکبریٰ صفحہ ۲۵ لو قرء الظاء مکان الضاد باعتماد راس۔

اللسان الی الاطراف الثنایا علیا او الضاد مکان الظاء باعتماد حافة اللسان الی الاضراس
”اگر ضاد کی جگہ ظا نوک زبان ثنایا علیا کے کنارے پر رکھ کر پڑھی یا ظا کی جگہ ضاد زبان کی کروٹیں داڑھوں
پر لگا کر پڑھا۔ یہی صفحہ دوسری جگہ ”لا تحوز الصلاۃ بدون التجوید“ تو نماز جائز نہیں یہ سبب
خلاف تجوید کے۔

تفسیر حقانی جلد آٹھ صفحہ ۵۴ کے حاشیہ میں فرماتے ہیں: صاحب کشف کہتے ہیں: ”واتقان
الفصل بین الظاء والضاد واجب الخ“ کہ ان دونوں حرفوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔

”ض“ اور ”ظ“ میں اکثر عجم فرق نہیں کرتے حالانکہ ان کے مخرج جدا ہیں۔ ”ظ“ کنارے
زبان اور اگلے دانتوں کی جڑ سے نکلتی ہے اور ضاد دائیں یا بائیں ڈاڑھ سے اور زبان کی جڑ سے۔ ایک کی
جگہ دوسرا پڑھنا ایسا ہے کہ جیسا دال کی جگہ جیم اور ث کی جگہ شین۔ اس میں مولینا عبدالحق صاحب نے
صاف تبدیل حروف لکھا ہے۔

المستفتی، محمد عبداللہ النعمی رضوی کھیری محلہ یدہ پور یوم دوشنبہ عید الفطر ۱۳۷۷ھ

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

زبان کی داہنی یا بائیں کروٹ جب بالائی داڑھوں سے متصل ہو یہ تو مخرج ضاد ہے اور ض کے ادا
کرتے وقت زبان کی کروٹ کا تا لو کی طرف اٹھنا۔ اور مخرج پر قوی اعتماد کرنا۔ اور مخرج لام تک
استطالت کرنا ضروری ہے۔ نیز اس کے ادا کے وقت یہ بھی ضروری ہے کہ زبان اگلے دانتوں پر ہرگز نہ
لگے اور نوک زبان سے کام نہ لیا جائے۔ اور شان شدت پیدا نہ ہو جائے۔ اور اس کے مطابق میں کوئی کمی
اور قصور نہ ہونے پائے۔ اور زبان کی نوک جب ثنایا علیا کے کنارے سے متصل ہو جائے تو مخرج ظ ہے۔
اس کے ادا کرتے وقت صرف نوک زبان سے کام لینا اور نوک زبان کا ثنایا علیا کے کنارے پر لگنا۔ اور

اس کا زبان کی کروٹ اور تالو سے بے لعلق ہونا اور استطالت سے دور رکھنا ضروری ہے تو یہ بطریق تجوید ظ کے صحیح پڑھنے کا طریقہ ہے۔ پھر قرآن میں بالعمد تبدیل حرف کر دینے۔ اور بالقصد ضاد کو ظا پڑھنے سے نماز فاسد ہو جائیگی۔

ردالمحتار میں ہے ”وان تعمد ذلك تفسد“ یعنی اگر بالقصد تبدیل حرف کی تو نماز فاسد ہو جائیگی۔ کبیری میں ہے ”قرأ الظاء المعجمة مكان الضاد المعجمة او على القلب مثال المغضوب مكان المغضوب و طعف الحياة مكان ضعف الحيوة تفسد صلاته وعلى القول بالفساد اكثر الائمة“ یعنی اگر ضاد کی جگہ ظا پڑھی یا ظا کی جگہ ضاد پڑھا جیسے مغضوب کی جگہ مغضوب پڑھا اور ضعف الحیوة کی جگہ طعف الحیوة پڑھا تو نماز تو اس کی فاسد ہو جائیگی اور اکثر ائمہ اسی حکم فساد کے قائل ہیں۔

اسی کبیری میں ہے ”وليسافى القرآن غير المغضوب بانشاء والذال المعجمتين تفسد اذ ليسا لهما معنى“ یعنی قرآن میں غیر المغضوب ظا اور ذال سے نہیں، اس سے نماز فاسد ہو جائیگی کہ ان کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔

فتاویٰ قاضی خاں میں ہے ”ولو قرأ والعاديات ظبحا بالظاء تفسد صلاته وكذا ولسوف يعطيك ربك فترضى قرأ فترضى بالظاء تفسد صلاته وكذا لو قرأ غير المغضوب بالظاء او بالذال تفسد صلاته“ یعنی اگر والعاديات ظبحا سے پڑھا تو اس کی نماز فاسد ہوگئی۔ اور ولسوف يعطيك ربك فترضى میں فترضى ظا سے پڑھا تو اس کی نماز فاسد ہوگئی۔ اور اسی طرح اگر غیر المغضوب کو ظا یا ذال سے پڑھا تو اس کی نماز فاسد ہو جائیگی۔ پھر جس نے بالقصد تبدیل حرف کی اور عمداً ضاد کو ظا سے بدلا تو وہ کافر ہو جائیگا۔ چنانچہ محیط کی عبارت سوال میں فقہ اکبر سے منقول ہے۔

نیز فتاویٰ عالمگیری میں ہے ”سئل الامام الفضلى عن يقرأ الزاء مقام الضاد او قرأ اصحاب الجنة مقام اصحاب النار قال لا تجوز امامته ولو تعمد يكفر“ یعنی امام فضلی سے سوال کیا گیا کہ جس نے زاء کو ضاد کی جگہ پڑھایا اصحاب النار کی جگہ اصحاب الجنة پڑھا تو فرمایا اس کی امامت جائز نہیں اور اگر عمداً ایسا کیا تو وہ کافر ہو گیا۔ تو ان کثیر عبارت سے یہ

ثابت ہو گیا کہ حرف کا قصد ابدلنا نماز کو فاسد کر دیتا ہے اور عمداً بدلنے والا کافر ہو جاتا ہے۔ تو جس نے عمداً بالقصد ضاد کو ظاء سے بدلا۔ اور اس پر یہ ڈھٹائی کہ منع کرنے پر بھی اس نے نہیں مانا۔ یہاں تک کہ اس بدلے ہوئے کو ہی صحیح جانا تو بلا شک اس کی نماز فاسد ہو جائیگی بلکہ اس کی نماز تو غیر المغضوب ہی پر فاسد ہو جائیگی۔ اب وہ ولا الظالمین تو نماز سے باہر ہو کر پڑھیکا پھر جب وہ اس قدر دلیر ہے کہ منع کرنے پر بھی باز نہیں آتا۔ اور غلط کو صحیح جانتا ہے تو وہ کافر بھی ہو گیا اس پر توبہ واستغفار واجب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ : الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمال غفرلہ الاول ۱۴ ذیقعدہ ۱۳۷۷ھ

استفتاء

(۲۷۱)

احمدہ واصلی علی حبیبہ الکریم علیہ الصلوٰۃ التسلیم۔
کیا ارشاد فرماتے ہیں حضرات حاکمان شریعت مطہرہ مندرجہ مسئلہ میں کہ
ان آیات میں الف تشنیہ ظاہر کر کے پڑھنا چاہیے یا حذف کر کے؟ بر تقدیر اول خلاف قواعد کا لزوم عارض ”بینو ابدال دلیل مع حوالۃ الكتب المعتمدة التي كانت الحجة للموافق وللمخالف خصوصاً۔

آیات یہ ہیں:

- | | |
|-------------------------|---------------------|
| (۱) فلما ذا قال الشجره۔ | سورہ اعراف ح ۴۸۔ |
| (۲) دعوا الله۔ | سورہ اعراف ح ۲۴۹۔ |
| (۳) واستبقا الباب۔ | سورہ یوسف ح ۱۴ ع ۳۔ |
| (۴) وقال الحمد لله۔ | سورہ نمل ح ۱۹ ع ۲۔ |

ہندوستان میں اکثر جگہ حذف کر کے پڑھتے ہیں بیرون ہند کا حال معلوم نہیں ہاں بعض حافظ الف ظاہر کر کے پڑھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے وقت میں بھی ہم لوگ الف ظاہر کر کے پڑھتے تھے اور حضرت نے منع و انکار نہ فرمایا کہ کس طرح پڑھنا چاہیے۔ مفصل و مدلل فتوے ارقام فرما کر تسلی خاطر فائز فرمائیں۔ ایک عالم کا فتویٰ بھی نقل کر کے ملاحظہ کیلئے نقل کر رہا ہوں، اگر اس میں کچھ خامی ہو تو اس کو واضح فرمادیں۔

مسئلہ

(۲۷۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بارے میں کہ

آیت کریمہ ”فلما ذاقا الشجرة“ کے پڑھنے کا کیا طریقہ ہے، یعنی جب ”ذاقا کو الشجرة“ کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو ذاقا کا الف پڑھا جائے گا یا نہیں؟۔ زید یہ کہتا ہے۔ کہ اس میں الف پڑھنا ضروری ہے۔ اور ترک کرنا غلط۔ اسلئے کہ تشنیہ کا صیغہ ہے۔ اگر الف ترک کیا جائے گا تو واحد کا صیغہ ہو جائیگا اور معنی بدل جائے گا، تو کیا زید کا قول اور استدلال صحیح ہے۔ اسی طرح واستبق الباب۔ قالوا الحمد لله اور دعوا الله میں تشنیہ کا الف پڑھا جائیگا یا نہیں؟۔

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

قاعدہ ہے کہ جب دو ساکن دو کلموں میں جمع ہوں اور دوسرا حرف مشدد ہو اور پہلا حرف مدہ ہو تو اول کو حذف کر دیتے ہیں جیسے ”يخشى الله، دعوا الله، دعى الله“ البتہ اگر ایک کلمہ میں ایسی صورت ہو تو حذف نہیں کرتے ہیں۔ جیسے ضالین، حاج، وغیرہ۔ نیز جب دوسرا ساکن و حرف مشدد نہ ہو اور پہلا حرف مدہ ہو تو اس صورت میں بھی ساکن اول حذف کیا جاتا ہے، جیسے ”فى الاخرة، على الهدى الى الله“ وغیرہ میں حروف علت حذف کر دیئے گئے ہیں۔

علم الصیغہ میں ہے: اجتماع ساکنین کہ در اس ساکن اول مدہ باشد و ساکن دوم حرف مشدد اگر در یک کلمہ باشد جائز است و مدہ را حذف نہ کنند چوں ضالین و اتحاجونى و این را اجتماع ساکنین علی حدہ می گویند و اگر در دو کلمہ باشد اول را کہ مدہ است حذف کنند چوں ”يخشى الله، دعوا الله، ادعى الله“ نیز اسی میں میں ہے: جین اجتماع ساکنین اگر اول مدہ باشد آں را حذف کنند۔

زبدہ میں ہے: ہر جا کہ اجتماع ساکنین شود اگر اول حرف مدہ زائدہ یا غیر مدہ باشد و دوم مدغم باشد در یک کلمہ حذف نہ کنند و ایں اجتماع ساکنین روا باشد ”دابة، خواصه“ بچھنیں در حال وقف چوں زید و عمر، و اگر نہ مدہ حذف کردہ شود۔ اغزرو الحید و قولی الحق۔ لہذا قواعد مذکورہ بالا کے مطابق الف تشنیہ گرا دیا جائے گا اور الف کے ساتھ پڑھنا خلاف قاعدہ ہوگا اور زید کا استدلال قواعد فن سے ناواقفی پر مبنی ہے، مقام تعلیل میں التباس کا لحاظ نہیں ہوتا۔

ساحب علم الصیغہ فرماتے ہیں: وحدیث التباس نخنے است کہ طفلان را باں فریب تو اں داد ورنہ

از التباس تا کجا خواهند گریخت، ہزار جا التباس بسبب اعلال گردیدہ است مثلاً تدعین واحد مونث حاضر بسبب اعلال با جمع مونث حاضر ملتبس شدہ و در جمیع ابواب ناقص مکسور العین و مفتوح العین چہ مجرد و چہ مزید ایں التباس موجود است۔

اور اگر اسی طرح التباس کا لحاظ ہے تو ان چار مقامات کی کیا تخصیص ہے، قرآن کریم میں ایسے التباس بہت سی جگہ لازم آتے ہیں۔ مثلاً جمع متکلم کا التباس جمع مونث غائب کیساتھ حسب ذیل آیات میں:

(۱) ولقد خلقنا الانسان فى اجسن تقویم۔

(۲) وقد فصلنا الايات لقوم يعلمون۔

(۳) ووصينا الانسان بوالديه۔

(۴) ثم اورثنا الكتاب الذين اصطفينا ہ۔

اور جمع مذکر حاضر کا التباس واحد مذکر حاضر کیساتھ حسب ذیل آیات میں:

قل ادعوا الذين زعمتم من دون الله فادعوا الله مخلصين۔

اور جمع مذکر حاضر کا التباس واحد مذکر غائب کے ساتھ یا واحد مونث غائب کے ساتھ اس آیت میں:

ولا تسبوا الذين يدعون من دون الله۔

اور جمع مذکر غائب کیساتھ اس آیت میں:

فيسبوا الله عدوا بغير علم۔

تو کیا ان آیات میں الف جمع اور واحد جمع اور واحد مذکر ظاہر کر کے پڑھے جائیگے؟ ہرگز نہیں، بلکہ الف جمع متکلم اور واحد جمع مذکر حذف کر کے پڑھتے ہیں اور التباس کا لحاظ نہیں رکھتے۔

بالجملہ صورت مسئلہ میں الف تشنیہ حذف کر کے پڑھنا ہی مقتضائے قواعد ہے اور الف کا ظاہر کرنا قواعد کے خلاف۔ نیز زید الف ظاہر کرنے کی جو وجہ ذکر کی وہ دعوا الله میں پائی نہیں جاتی کہ اس میں الف تشنیہ حذف کرنے سے واحد کیساتھ التباس نہیں ہوتا کہ واحد دعا ہے تو اس کا استدلال یوں بھی ناقص ہے واللہ تعالیٰ اعلم انتہی بالفاظہ۔

المستفتی محمد احمد المدعو بہ جہانگیر غفرلہ القدیر متعلم مدرسہ مظہر اسلام بریلی اعظمی مولد ارضوی مسلک

جواب صحیح ہے:

اور تفصیل مقام یہ ہے کہ ان کلمات آیات میں۔ ذاقا۔ دعوا۔ استبقا۔ قال۔ میں حرف اخیر الف تشنیہ ہے اور الف حرف مدہ ہے جو ہمیشہ ساکن رہتا ہے۔

مخ فکریہ شرح جزریہ میں ہے: حروف المد ثلاثۃ الا لف ولا تکنون الا ساکنۃ“ اور یہ الف معرف باللام کلمات سے ملا اور لام تعریف بھی ساکن ہے تو یہ اجتماع ساکنین ہو گیا۔ اور جواز اجتماع ساکنین کی ایک صورت تو وقف ہے۔

مخ فکریہ میں ہے: الوقف یجو زفیہ التقاء الساکنین مطلقا۔

سراج القاری شرح اشعار شاطبی میں ہے: ان التقاء الساکنین یغتفر فی الوقف۔

اور یہ ظاہر ہے کہ آیات کے یہ کلمات مقام وصل میں ہیں نہ کہ مقام وقف میں۔ دوسری صورت مد لازم ہے، اور یہ مد ان کلمات پر ہوتا ہے جن میں حروف مد کے بعد کوئی حرف ساکن ہو، اب وہ مد غم ہو، جیسے ضالین، دابة میں، یاد مظهر ہو جیسے، جیسے ص، ق، حروف مقطعات میں، اور الآن و اللہ میں۔ جزری میں ہے:

فلان ان جاء بعد حرف مد ساکن حالین وبالطول یمد

علامہ علی قاری مخ فکریہ میں فرماتے ہیں:

ذهب الجمهور الى التسوية بين مد المدغم والمظهر في ذلك كله اذا الموجب للمد هو التقاء الساکنین والتقاءهما موجود في كل لا حاجة للتفصیل في ذلك كله هذا هو التحقيق۔

ان آیات میں الف تشنیہ حرف مد بھی ہے اور اسکے بعد حرف ساکن لام تعریف بھی ہے، لیکن یہ ساکن نہ حرف مشدد ہے نہ حروف مقطعات میں سے کوئی حرف، تو ظاہر ہے کہ ان کلمات آیات میں نہ مد غم ہو نہ مد مظهر۔ لہذا جواز اجتماع ساکنین کی یہی دو صورتیں وقف اور مد لازم ہیں اور یہ ہر دو صورت کلمات آیات میں متصور نہیں۔ تو اب ان میں الف تشنیہ۔ کہ ظاہر کر کے پڑھنے میں اجتماع ساکنین لازم آتا ہے۔ اور علاوہ ان دو صورت کے اجتماع ساکنین ناجائز ہے۔

چنانچہ نوادر الوصول میں ہے۔ در غیر صورت مذکورہ اجتماع ساکنین جائز نیست (نوادر ص ۱۹۱)

لہذا اب مقام وصل میں اجتماع ساکنین سے بچنے کے لئے ان تین باتوں میں سے ایک بات ضروری ہے۔ یا تو ہر دو ساکنوں کو باقی رکھ کر مد کے ساتھ ادا کیا جائے۔ یا احد الساکنین کو حرکت دیجائے۔ یا ایک ساکن کو حذف کر دیا جائے۔

علامہ علی قاری مخ فکریہ میں فرماتے ہیں: تقرر فی علم التصریف انه لا یجمع فی الوصل بین الساکنین فاذا ادى الکلام الیہ حرك او حذف او زید فی المد ليقدر فحر کا۔ تو مد کا بیان تو ابھی گزر رہا کہ ان کلمات آیات پر مد نہیں کر سکتے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مد میں گویا اجتماع ساکنین ہی باقی نہیں رہتا۔

نوادر الوصول میں ہے: ہر دو جا گویا اجتماع ساکنین حقیقتہ نیست۔

مخ فکریہ میں ہے:

مدد ن لان الساکنین تلا فیا فصارا کحریک کذا قال ذوالخبر حرکت ایسے اجتماع ساکنین میں دی جاتی ہے جہاں پہلا ساکن مدہ نہ ہو، تو کہیں ساکن اول کو حرکت دیتے ہیں جیسے: انتم الفقراء، میں۔ کہیں ساکن دوم کو حرکت دیتے ہیں جیسے: رد وذب، میں۔ شافیہ میں ہے: فان لم یکن (ای اول الساکن) مدة حرك نحو اذهب اذهب الا فی نحو رد فحرک الثانی ملخصا۔ (ص ۱۵۸)

جامع العلوم میں ہے: وان لم یکن مدة حرك تحو اخشوا للہ۔

اور یہ ظاہر ہے کہ ان کلمات آیات میں حرکت بھی نہیں دی جاسکتی کہ ان میں ساکن اول حرف مدہ ہے۔ نیز ان میں ساکن اول الف ہے اور ساکن دوم لام تعریف ہے، اور یہ دونوں حرکت کو قبول نہیں کرتے۔

اب باقی رہا حذف تو یہ اس اجتماع ساکنین میں ہوتا ہے جن میں ساکن اول حرف مدہ ہو، تو اس میں ساکن اول ہی کو حذف کر دیا جاتا ہے۔

شافیہ میں ہے: فان كان غير ذلك واولهما مدة حذف نحو خف وقل۔

جامع العلوم میں ہے: فان كان (ای اول الساکن) مدة حذف سواء كان الساکنان

فی کلمۃ او فی کلمتین مستقلتین مثل یخشون اغزوا الحیش۔

فصول اکبری اور اس کی شرح میں ہے: پس ساکن اول اگر مدہ است در یک کلمہ یا دو کلمہ

آں سان رائیقلند نحو قول وبع۔

حاشیہ شافیہ میں ہے: ویلتقی الساکنان المدة ولا التعریف فیجب حذف المدة۔
ان کلمات آیات میں بھی ساکن اول مدہ یعنی الف ہے اور ساکن دوم لام تعریف ہے۔ لہذا
الف کا حذف واجب اور ضروری ہے۔

بعض نے حلقۃ البطان میں الف تثنیہ کو ثابت رکھا تو یہ دلیل نہیں بن سکتا کہ یہ استعمال شاذ
ہے۔

شافیہ میں ہے: وحلقۃ البطان شاذ۔

فصول اکبریٰ اور اس کی شرح نوادر الوصول میں ہے:

وحلقۃ البطان با ثبات الف تثنیہ وسکون لام در قولہم التقت حلقۃ البطان
شاذ، چہ کلام وجہ قیاسی در جواز آن یافتہ نمی شود۔
(نوادر ص ۱۹۰)

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ ان کلمات آیات میں الف تثنیہ کو حذف نہ کرنا اجتماع ساکنین علی حدہ
کرتا ہے جو ناجائز ہے، بلکہ یہ ظن جلی ہے جو عند القراء ممنوع ہے۔ تو اب الف تثنیہ کو ثابت رکھنا قواعد
صرف کے موافق، نہ اصول تجوید کے مطابق۔ مخالف کو الف تثنیہ کی قرآن کریم میں صرف یہ چار مثالیں
میں۔ ہم دس مثالیں اور پیش کرتے ہیں۔

(۱) فازلہما الشیطن۔ (سورہ بقرہ ع ۴)

(۲) فوسوس لہما الشیطان۔

(۳) عن تلکما الشجرة۔ (اعراف ع ۴)

(۴) منہما اذکرنی۔ (یوسف ع ۵)

(۵) کلنا الجنین۔ (کہف ع ۵)

(۶) من اتبعکمما الغلبون۔ (قصص ع ۴)

(۷) واتینہما الکتاب۔

(۸) وهدیناہما الصراط المستقیم۔ (والصفت ع ۴)

(۹) ینخرج منہما اللؤلؤ۔ (الرحمن ع ۱)

(۱۰) قیل ادخلا النار (تحریم ع ۱)

ان سب آیات میں الف تثنیہ کو حذف کیا جاتا ہے، اور قرآن کریم میں اس کی کثیر مثالیں اور بھی
ہیں۔ اور الف تثنیہ کی طرح جب معرف باللام کے ساتھ واج جمع ہو تو واو کو بھی حذف کیا جائیگا۔ قرآن کریم
میں واج جمع کی مثالیں الف تثنیہ سے بہت زائد ہیں۔ صرف سورہ اعراف میں ہے:

اتخذوا الشیطن۔ ع ۳

عملوا الصلحت۔ ع ۵

قالوا الحمد۔ ع ۵

ادخلوا الجنة۔ ع ۶

ففقروا للاقہ۔ ع ۱۰

فاوفوا بالکیل۔ ع ۱۱

فاوفوا لکیل۔ ع ۱۱

ذرو الذین۔ ع ۲۲

ان سب آیات میں واج جمع کو حذف کر کے پڑھا جائے گا۔ حاصل جواب یہ ہے کہ الف تثنیہ اور
واج جمع جب معرف باللام سے متصل ہو تو ہر دو کا حذف ضروری ہے اور انکا ثابت رکھ کر پڑھنا ناجائز
وممنوع ہے۔ مولیٰ تعالیٰ قبول حق کی توفیق دے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمیل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمیل العلوم فی بلدہ سنبھل

مسئلہ (۲۷۳)

حضرات علمائے کرام و قرائے عظام کیا فرماتے ہیں کہ

”ولا الضالین“ کو مخرج بالبدال سے ”دالین“ یا ”دوالین“ پر کے ساتھ یا ”ظالین“ یا ”زالین“
یا ”ذالین“ پڑھنا چاہئے؟ اس کا صحیح مخرج کیا ہے؟ ”ض“ کس کے مشابہ ہے؟ کیا اختلاف ہے
ترجیح کس کو ہے؟ کن صورتوں میں نماز فاسد ہوتی ہے کن صورتوں میں نہیں؟ مفصل تحریر فرمائیں۔
بنوا تو جروا۔

سید اطہر حسن موضع مرزا پور چوہاری ضلع پرتاپ گڑھ

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

ضاد۔ کا مخرج زبان کی بائیں جانب جب بالائی دائروں سے متصل ہو کر دراز ہو یہ آسان ہے۔ یاد دہانی جانب سے اس طرح یہ دشوار ہے۔ شرح جزری میں ہے:

تخرج الضاد من طرف اللسان مستطيلة الى مايلي الاضراس من الجانب الايسر وهو الايسر والاكثر ومن الايمن وهو اليسير العسير۔

اور دال، ذال، ظا، زاء، کے مخارج جدا ہیں۔ تو ضاد کو ان میں سے کسی مخرج سے نکالنا سخت غلطی اور تحریف القرآن ہے۔ ضاد۔ بقول بعض مشابہ بہ ظا ہے۔ لیکن مشابہت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ضاد کو عین ظا پر ہا جائے اور ان کے تغائر وضعی تباہین صوت طبعی اور امتیاز صفت خاص اور مخصوص کیفیات ادا سب کو میٹ دیا جائے اور ”ضاد“ کو بالکل ہم آواز ”ظا“ پڑھا جائے جیسا کہ اب چند مخوس زمانہ کی عادت ہے بلکہ جب ضاد کو اس کے مخرج اور تمام صفات کی رعایت کے ساتھ ادا کیا جائے گا تو اس کی۔ دال، ذال، ظا، زاء، کی آوازوں سے ممتاز آواز ہے۔ ”کما حققناه في فتاوانا الاجملية“ اب باقی رہا اس کا حکم تو اگر یہ بدلنا جان بوجہ کر بقصد اختیار ہے تو کفر ہے۔

چنانچہ علی قاری شرح فقہ اکبر میں محیط سے ناقل ہیں: ”سئل الامام الفضلي عمن يقرء الظاء المعجمة مكان الضاد المعجمة او على العكس فقال لا تجوز امامته ولو تعمدا يكفر۔“

(شرح فقہ اکبر مصری ص ۴۵۳)

امام فضلی سے اس شخص کا حکم دریافت کیا گیا جو ضاد کی جگہ، ظا، یا، ظ، کی جگہ، ضاد، پڑھتا ہے فرمایا اس کی امامت جائز نہیں اور اگر قصد پڑھا تو کافر ہو جائے گا۔

اور اگر ناواقفی سے ہو بالقصد نہ ہو یا بر بنائے لغزش ہو تو جہاں معنی متغیر ہو جائیں گے نماز فاسد ہو جائے گی ورنہ نہیں۔

چنانچہ یہی علامہ علی قاری فتاویٰ قاضی خاں سے ناقل ہیں:

ان قرء غیر المغضوب بظاء المعجمة وبالذال تفسد صلاته ولا الضالین بالظاء المعجمة والذال الهملة لا تفسد ولو بالذال المعجمة تفسد۔

(منہ فکر یہ شرح جزریہ مصری ص ۴۳)

غیر المغضوب کو ظ یا دال سے پڑھا تو نماز فاسد ہوگئی اور ولا الضالین کو ظ یا دال سے پڑھا تو نماز فاسد نہ ہوگی اور اگر دال سے پڑھا تو نماز فاسد ہوگئی۔ لہذا نماز تو غیر المغضوب ہی پر اگر اس کو ظ یا دال سے پڑھا فاسد ہو جائے گی ولا الضالین تو نماز کے باہر پڑھے گا۔

هذا ملخص رسالتنا الذي صنف في تحقيق الضاد فمن اراد التحقيق فليرجع اليها فيجد فيها ابحاثاً نفيسة“ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: اہل معتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۲۷۹ھ

۱۵ جمادی الآخرہ ۱۳۷۹ھ

مسئلہ (۲۷۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین کہ

صاحب فوائد ملیہ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت امام عاصم کو فی علیہ الرحمۃ بین السورتین تسمیہ پڑھتے ہیں تو اس لحاظ سے جس سورۃ کو قاری بلا تسمیہ پڑھیں گے وہ سورۃ امام کے نزدیک ناقص ہوگی۔

وعن ابی خزیمۃ ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قرأ بسم اللہ الرحمن الرحیم فی اول الفاتحۃ فی الصلوۃ وعدھا آیۃ ایضاً، الح۔

پھر علامہ جزری فرماتے ہیں: کہ بسم اللہ اس کو پڑھنا چاہئے۔ چنانچہ باسناد اسحاق نقل کرتے ہیں، ہم سورۃ فاتحہ اور ہر سورۃ کے شروع پر ہر حالت و خارج از صلوٰۃ قرآن سناتے ہوں خواہ نماز میں بسم اللہ پڑھا ہی کرتے تھے، اور قرآن مدینہ کا بھی یہی مذہب ہے۔

ان روایات سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ بین السورتین بسم اللہ نہ پڑھنے کا اختلاف ایسا ہے کہ جیسے اور اختلافات قرأت سبعہ کہ جس طرح انکا پڑھنا جائز ہے اسی طرح اس کا نہ پڑھنا بھی درست ہے۔ پس مبہملین کی روایت میں بسم اللہ بین السورتین جہاں پڑھنا چاہئے۔ کیونکہ فقہا کو اگرچہ اپنی ذاتی تحقیق اس مسئلہ میں کچھ ہی ہوتی تھی مگر روایت کے موقع پر آکر اس مسئلہ کو مسئلہ فن قرأت ہو جانے کی وجہ سے وہ قراء ہی کا اتباع کرتے تھے۔ حضرت امام مالک علیہ الرحمۃ باوجود اس کے کہ انکے مذہب میں بسم اللہ ہر سورۃ کا جز نہیں۔ مگر امام نافع سے مسئلہ پوچھ کر یوں ہی فرمایا کہ ہر علم کا مسئلہ اس کے اہل سے پوچھنا چاہئے، مدار علم قراءت نقل اور صحت روایت سے، قاسر، عقل کو اس میں دخل ہی نہیں، اور علم فقہ

منصوصات و مجتہدات دونوں سے مرکب ہے۔ مسائل منصوصہ میں شارع علیہ السلام کے مجتہدات کسی اور کا اتباع نہیں اور ائمہ کی تقلید مسائل اجتہاد پر ہے۔

لہذا ہر مسئلہ قرائت میں نقل و صحت روایت کے علاوہ اور سند کی ضرورت مسئلہ قراءت کی سند فقہاء کے اقوال سے تلاش کرنا غلطی ہے بلکہ اس کی سند ائمہ قراءت سے دریافت کرنی چاہیے۔ پس تصحیح روایات کے بعد اس پر عمل کرنا چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو کچھ بین الدفتین ہو، رسم عثمانی اس کی متحمل ہو اور قواعد نحویہ کے موافق ہو، نقل متواترہ کے ساتھ ہم تک پہنچا ہو وہ قرآن ہے اور تسمیہ پر یہ باتیں صادق آتی ہیں، نیز باجماع مذاہب اربعہ ہر حال میں قراءت سبعہ کے ساتھ قرآن پڑھنا جائز ہے۔ اختلاف قراءت خواہ بحرکت ہوں یا بکلمہ یا تبدیل و زیادتی کلمہ خواہ ان میں سے کسی طرح کا اختلاف ہو سب جائز پھر تسمیہ کو خاص نماز میں ناجائز کہنا کس طرح قبول کیا جاسکتا ہے۔ جب تک کہ دلیل نقلی قرآن یا حدیث سے نہ ہو۔ کیوں کہ مبسمین و غیر مبسمین سب دلائل نقلیہ متواترہ رکھتے ہیں، باوجود ان تمامی امور کے کہیں امام اعظم قدس سرہ سے اسکی تصریح بھی نہیں آئی، کہ تمامی قراء کے اختلاف تمام قرآن میں پڑھنے جائز ہوں۔ اور مبسمین کے قول کے موافق تسمیہ بین السورتین جائز نہ ہو۔ پھر یہ مسئلہ اجتہادی ہی نہیں، کیوں کہ منصوصات میں اجتہاد جائز ہی نہیں۔ اور ہم مسائل اجتہادیہ میں امام صاحب کے مقلد ہیں نہ کہ مسائل منصوصہ میں۔ لہذا فقہ میں تو مقلد ہیں کہ وہ مجتہد مطلق ہیں۔

اور مسائل قراءت میں ائمہ و راویان قرآن حکیم کے ہیں اور علم قراءت میں امام صاحب بھی راویان قرآن کے مقلد تھے و نیز علم قراءت میں شاگرد امام عاصم کے ہیں اور یہ بات کہیں ثابت نہیں ہوئی کہ امام صاحب نے قرآن کریم میں اجتہاد فرمایا ہے۔ کیونکہ سمعیات میں تو اجتہاد کی گنجائش ہی نہیں۔ اگر اجتہاد کی کہیں بھی گنجائش ہے تو جہاں سے ہے مبسمین کیلئے تسمیہ کی ممانعت مستتبہ ہوتا نہیں ورنہ احتمال اجتہاد اس مسئلہ میں محض بے سود ہے جو پزیرائی نہیں ہو سکتا ہے۔

پس جو لوگ بسم اللہ بالجہر تراویح میں پڑھنے کی بابت مبسمین کیلئے نزاع کرتے ہیں وہ قراء سبعہ کی حقیقت سے واقفیت نہیں رکھتے۔ لہذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ تراویح میں ہر سورۃ پر بسم اللہ پڑھنی چاہئے یا ایک سورۃ پر۔ نیز بالجہر یا بالسر اور سورۃ فاتحہ و دیگر سور پر بھی بالجہر یا بالسر پڑھے یا نہیں؟ اور کیا احکام و دلائل ہیں مع حوالہ کتب چہاب مرحمت فرمائیں۔

(۲) حرف ضا د معجمہ مشابہ بالذال ہے یا بالظاء اور جس وقت اس کو اس کے مخرج سے مع جمع

صفات ادا کیا جائے تو اس کی صورت کسی حرف سے مشابہ ہوگی یا نہیں۔ اگر ہوگی تو کس حرف کے ساتھ نیز جو شخص اس کو صحیح ادا کرتا ہے تو اس کو عوام کے کہنے پر کسی اور حرف کیساتھ بدل کر پڑھنا درست ہے یا نہیں؟ (دواد۔ ذواد۔ زواد۔ ظا وغیرہ) دریں صورت عمد اغلط پڑھنے والا خاطی و محرف کہلائے گا یا نہیں؟۔ نیز اس کی اقتدا درست ہوگی یا نہیں؟۔ بغض لوگ کہتے ہیں کہ ”ضاد و ظا“ میں فرق کرنا دشوار ہے۔ و ہما متشبا بہان فی الصوت و السمع۔

امام غزالی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: فرق درمیان ضاء و ظا بجا آورد و اگر نتواند روا باشد۔ تفسیر عزیزی میں ہے: فرق درمیان ضاد و ظا بسیار مشکل است خوانندگان ایں دیار ہر دورا یکساں می براند نہ در مقام ضاد ظا می شود و در مقام ضاد ظا۔ قاضی خاں میں ہے:

و لو قراء الظالین بالظا او بالذال لا تفسد صلوٰۃ و لو قرء الدالین تفسد۔ سوال کی صورت کو مد نظر رکھتے ہوئے مع دلائل کتب فقیہ و تجوید سے جواب مفصل تحریر فرمایا جائے المستفتی محمد حسن عثمانی قادری غفرلہ

الجواب

الحمد لله و کفی و الصلوٰۃ والسلام علی من اصطفیٰ و علی آلہ و صحبہ و

علی کل من اجتبیٰ اما بعد۔

فہم جواب کیلئے چونکہ چند مقدمات پر اطلاع بہت ضروری ہے۔ لہذا پہلے ان مقدمات ہی کو پیش کیا جاتا ہے۔

مقدمہ اولیٰ: تمام اہل اسلام کے نزدیک بلا شک بسم اللہ شریف قرآن کریم کی ایک آیت ہے۔ سورتوں کے درمیان فصل اور علیحدگی کیلئے نازل ہوئی ہے یہی امام اعظم اور احناف کرام کا بھی مذہب ہے۔

درمختار میں ہے: و ہی آية واحدة من القرآن کله انزلت للفصل بین السور۔

(درمختار ج ۱ ص ۳۴۴)

کبیری میں ہے: و انها من القرآن و به نقول انها آية منه نزلت للفصل بین السور

(کبیری مطبوعہ المطابع لکھنؤ ص ۳۰۰)

و کتا بتھا بقلم علیحدہ یو ید ذالک۔

حجۃ الاسلام امام ابو بکر رازی احکام القرآن میں فرماتے ہیں:

لا خلاف بین المسلمین ان بسم الله الرحمن الرحيم من القرآن -

(احکام القرآن مصری ج ۱ ص ۶)

حاشیہ عبد الحکیم علی البیضاوی میں ہے: والصحيح ما ذهب اليه المتأخرون انها من القرآن انزلت للفصل بين السور - (حاشیہ مطبوعہ لکھنؤ ص ۲۴)

اسی میں ہے: ان الاجماع انعقد على ان ما ثبت بين الدفتين بالافتاق من جميع الصحابة فهو كلام الله قطعاً وبسمله في اوائل السور كذالك -

(حاشیہ مذکور ص ۲۵)

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ بالا جماع بسم اللہ کلام اللہ ہے اور قرآن کی ایک آیت ہے جو مابین سورتوں کے فصل کیلئے نازل ہوئی۔ یہی اصحاب امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا صحیح مذہب ہے اور یہی مسلمانوں کا اتفاقی مسئلہ ہے۔

مقدمہ ثانیہ: تسمیہ آیت قرآنی تو ہے لیکن سورۃ فاتحہ یا اور سورتوں کا جز نہیں یعنی ان کی پہلی آیت نہیں ہے۔ بلکہ وہ تسمیہ فاتحہ میں تو ابتداء کتاب اللہ کیلئے ہے اور سورتوں میں فصل کیلئے ہے۔

غیث النفع فی القرأت السبع میں ہے:

ان البسملة ليست بآية ولا بعض آية من اول الفاتحة ولا من اول غيرها وانما كتبت في المصاحف للتمييز والتبرك او انها في اول الفاتحة لابتداء الكتاب على عادة الله عز وجل في ابتداء كتبه وفي غير الفاتحة للفصل بين السور -

در مختار میں ہے: ليست من الفاتحة ولا من كل سورة في الاصح -

(رد المحتار ج ۱ ص ۳۲۳)

کبیری میں ہے: بان من ههنا مذهب الجمهور على انها ليست آية من الفاتحة ولا من كل سورة - (کبیری ص ۹۹)

احکام القرآن میں ہے: مذهب اصحابنا انها ليست بآية من اوائل السور لتترك الجهر بها -

ان عبارات میں جو مذکور ہے وہ حضرت امام اعظم علیہ الرحمہ کا مذہب ہے۔

امام شافعی کا مذہب ان کے خلاف ہے۔ اس لئے کہ وہ تسمیہ کو سورۃ فاتحہ اور ہر سورت کی پہلی آیت مانتے ہیں۔ ان کی دلیلیں یہ ہیں۔ حدیث شریف میں ہے جس کو دارقطنی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی:

قال رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم اذا قرأتم الحمد لله فاقروا بسم الله الرحمن الرحيم انها ام القرآن و ام الكتاب و سبع مثاني بسم الله الرحمن الرحيم احذوا اي آياتها -

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم الحمد شریف پڑھو تو بسم اللہ الرحمن الرحیم بھی پڑھو، بیشک الحمد ام القرآن اور ام الکتاب اور سبع مثانی ہے، بسم اللہ الرحمن الرحیم اس کی آیات میں سے ایک آیت ہے۔

اور ان کی دلیل اجماع امت سے یہ ہے جس کو علامہ حلبی نے نقل کیا ہے: لا نهما اثبت في المصحف باجماع الصحابة مع الامم بتجريد ه عماليس القرآن -

(کبیری ص ۲۹۹)

خفیہ کی طرف سے ان ہر دو استدلالوں کے بہترین جواب دئے گئے۔ علامہ حلبی نے اس حدیث دارقطنی پر یہ جرح کی اور جواب دیا کہ:

انه روى موقوفاً ولو سلم صحته فغايبه التعارض المورث للشبهة ولو سلم عدم التعارض فخبر الواحد غير قاطع لشبهة القرآن لا يثبت مع الشبهة لان طريقه طريق اليقين لانه اصل الدين وبه تثبت الرسالة واقامة الحججة على الضلالة فلا يثبت كونها آية من السورة من السور بلا دليل قطعي كما في سائر الآيات -

(کبیری ص ۳۰۰)

وہ حدیث موقوف روایت کی گئی اور اگر اس کی صحت مان لی جائے تو اس کی غایت تعارض احادیث ہے جو شبہ کو پیدا کرنے والا ہے اور اگر عدم تعارض بھی مان لیا جائے تو خبر واحدہ کیلئے غیر قاطع ہے اور قرآن شبہ کیساتھ ثابت نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس کا طریقہ یقین کا طریقہ ہے کیونکہ یہی دین اسلام ہے اور اسی سے رسالت ثابت ہوئی اور ضلالت پر حجت قائم کی تو تسمیہ کا سورت میں سے کسی سورۃ کی آیت ہونا بغیر دلیل قطعی ثابت نہیں ہو سکتا ہے جیسا کہ اور آیات کا حکم ہے۔

اور علامہ حلبی نے اس دلیل کے مقابل اپنے دعویٰ پر اس حدیث کو پیش کیا جس کو صحیح مسلم وغیرہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی:

قال سمعت رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم يقول: قال الله قسمت الصلوة بيني وبين عبدی نصفين ولعبدی ما سأل فاذا قال العبد الحمد لله رب العالمين قال الله تعالى حمدني عبدی واذا قال الرحمن الرحيم قال الله اثنى علي عبدی واذا قال ملك يوم الدين قال الله تعالى مجدني عبدی واذا قال اياك نعبد واياك نستعين قال الله تعالى هذا بيني وبين عبدی ولعبدی ما سأل واذا قال اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين قال الله تعالى هذا لعبدی ولعبدی ما سأل - (مسلم شریف مع شرح نووی ج ۱ ص ۱۶۹)

انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں نے نماز کو اپنے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم کر دیا اور میرے بندے کیلئے وہ ہے جو سوال کرے۔ تو جب بندہ کہتا ہے ”الحمد لله رب العالمين“ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری حمد کی۔ اور جب اس نے کہا ”الرحمن الرحيم“ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری ثنا کی۔ اور جب اس نے کہا ”ما لك يوم الدين“ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری تجید کی اور جب اس نے کہا ”اياك نعبد واياك نستعين“ اللہ فرماتا ہے یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے بندے کیلئے وہ ہے جو سوال کرے۔ اور جب اس نے کہا ”اهدنا الصراط المستقيم صراط الذين انعمت عليهم غير المغضوب عليهم ولا الضالين“ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے بندے کیلئے اور میرے بندے کیلئے وہ ہے جو سوال کرے۔

علامہ حلبی نے کبیری میں اس حدیث شریف سے اپنے مسلک کی تائید میں اس طرح استدلال کیا: ولا شك ان المراد بالصلوة هنا الفاتحة لان المقسوم بها فسر فهو كقول الله تعالى ولا تحجر بصلو تك اي بقراءتك في الصلوة فالبداية بالحمد لله دليل على ان التسمية ليست من الفاتحة وانها سبع آيات بدونها حيث جعل الوسطى وهي اياك نعبد واياك نستعين بينه سبحانه وبين عبده والثالث قبلها له تعالى خاصه والثالث بعد ها لعبده فقط واذا لم تكن آية من الفاتحة لم تكن آية من غير ها لعدم القائل به ولا شك ان هذا

الحديث اصح من رواية الدارقطني - (کبیری ص ۳۰۰)

اور اس امر میں کوئی شک نہیں کہ حدیث میں صلوٰۃ سے مراد سورۃ فاتحہ ہے۔ اس لئے کہ جو چیز تقسیم ہوئی اسی نے یہ تفسیر کر دی اور اس کا مثل ”لا تحجر بصلو تك“ میں لفظ صلوٰۃ ہے کہ جس میں قرأت فی الصلوٰۃ مراد ہے تو سورۃ فاتحہ کو الحمد للہ سے شروع کرنا اس کی دلیل ہے کہ تسمیہ فاتحہ کی آیت نہیں اور فاتحہ کی بغیر تسمیہ کے سات آیات ہیں۔ اس لئے کہ خدا نے ”اياك نعبد واياك نستعين“ کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان آیت قرار دیا۔ اس سے پہلے کی تین آیات کو اپنے لئے خاص کیا اور اس کے بعد کی تین آیات کو اپنے بندے کیلئے مختص کیا۔ تو جب تسمیہ فاتحہ کی آیت نہیں تو وہ اور سورتوں کی بھی آیت نہیں کہ اس کا کوئی قائل نہیں۔ اور اس حدیث کی روایت دارقطنی سے زیادہ صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں۔

حضرت حجت الاسلام امام ابو بکر رازی تفسیر احکام القرآن میں اپنے مسلک کیلئے اس طرح استدلال کرتے ہیں:

ويدل ايضا على انها ليست من اوائل السورة ما حدثنا محمد بن جعفر بن ابان قال حدثنا محمد بن ايوب قال حدثنا سعد و قال حدثني يحيى بن سعيد عن شعبة عن قتادة عن عباس الجشمي عن ابي هريرة عن النبي صلى الله تعالى عليه وسلم قال: سورة في القرآن ثلاثون آية شفعت لصابها حتى غفر له تبارك الذي بيده الملك وانفق القراء وغيرهم انها ثلاثون آية سوى بسم الله الرحمن الرحيم فلو كانت منها كانت احدى وثلاثون آية وذلك خلاف قول النبي صلى الله تعالى عليه وسلم ويدل عليه ايضا اتفاق جميع قراء وفقهاء هم على ان سورة الكوثر ثلاث آيات وسورة الاخلاص اربع آيات فلو كانت منها لكانت اكثر ما عدا -

(احکام القرآن مصری ج ۱ ص ۹)

اور اس پر کہ تسمیہ اوائل سور سے ہے یا نہیں یہ حدیث دلالت کرتی ہے جس کی ہمیں روایت کی محمد بن جعفر بن ابان نے انہوں نے کہا کہ ہمیں حدیث بیان کی محمد بن ابویوب نے انہوں نے کہا کہ ہمیں حدیث بیان کی سعد نے انہوں نے کہا مجھے روایت بیان کی تکی بن سعد نے وہ روایت کرتے ہیں شعبہ سے وہ قتادہ سے وہ عباس شمی سے وہ ابو ہریرہ سے وہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کہ حضور نے فرمایا: ”ترآن میں تیس آیات کی ایک سورۃ ہے جو اپنے پڑھنے والے کی شفاعت کرے گی یہاں تک کہ اس کی

مغفرت کر دی جائے گی وہ سورۃ ملک ہے۔ اور قراء وغیرہ قراء سب نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ اس کی تیس آیات سوائے بسم اللہ کے ہیں۔ تو اگر تسمیہ اس کا جز ہوتی تو اس میں اکیس آیات ہوتیں اور قول نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مخالف ہو جاتا۔

اور نیز اس پر تمام شہروں کے قراء اور فقہاء کا اتفاق کرنا کہ سورۃ کوثر میں تین آیات ہیں اور سورۃ اخلاص میں چار آیات ہیں یہ دلالت کرتے ہیں کہ اگر تسمیہ سورتوں کا جز ہوتی تو ان سورتوں کی آیات زیادہ ہو جاتیں۔

تو ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم سورتوں کا جز نہیں اور ان کی پہلی آیت نہیں۔ اب رہا شافعیہ کے استدلال اجماع کا جواب تو علامہ حلبی کبیری میں اس استدلال کے جواب میں فرماتے ہیں:

واجماع الصحابة على اثباتها في المصاحف لا يلزم منه انها آية من كل سورة بل اللازم منه مع الامر بالتجريد عن غير القرآن انها من القرآن و به نقول انها آية منه نزلت للفصل بين السور۔

اور صحابہ کے مصاحف میں تسمیہ کے ثابت رکھنے پر اجماع سے یہ لازم نہیں آتا کہ تسمیہ ہر سورۃ کی پہلی آیت ہو بلکہ مع اس حکم کے کہ مصحف کو غیر قرآن سے خالی کیا جائے یہ لازم آیا کہ تسمیہ قرآن کی آیت ہو اور ہم یہی کہتے ہیں کہ تسمیہ قرآن کی آیت ہے سورتوں میں فصل کیلئے وہ نازل ہوئی۔

بالجملہ اس بحث سے ثابت ہو گیا کہ جو لوگ تسمیہ کو سورۃ فاتحہ کی پہلی آیت قرار دیتے ہیں ان کا مذہب روایت و درایت ہر طرح ضعیف ہے اور ہمارے لئے ناقابل عمل ہے اور مذہب حنفی ہر لحاظ سے قوی اور مدلل ہے۔

مقدمہ ثالثہ: نماز کی ہر رکعت میں تسمیہ کا سورۃ فاتحہ سے قبل پڑھنا سنت ہے۔ اور اس کا بعد فاتحہ کے سورۃ سے پہلے پڑھنا منسوخ نہیں اور قول مفتی بہ یہی ہے کہ فاتحہ اور سورۃ کے درمیان تسمیہ نہ پڑھی جائے۔

طحاوی سے مراقی الفلاح میں ہے:

و تسن التسمية اول كل ركعة قبل الفاتحة لا نه صلى الله تعالى عليه وسلم كان يفتح صلاته بيسم الله الرحمن الرحيم۔

اسی میں ہے: لا يسمى بين الفاتحة والسورة في قولها قال في المضمرات والفتوى على قولها۔

در مختار میں ہے: ولا تسـ بين الفاتحة والسورة مطلقا ولو سرية ولا تكره اتفا

قا۔

احکام القرآن میں ہے:

روى ابو يوسف عن ابى حنيفة انه يقرأها في كل ركعة مرة واحدة عند ابتداء قراءة فاتحة الكتاب ولا يعيدها مع السورة عند ابى يوسف۔

(احکام القرآن مصری ج ۱ ص ۱۲)

اسی میں ہے: واما من قرأها في كل ركعة فوجه قوله ان كل ركعة لها قراءة مبتدأة لا ينوب عنها القراءة في التي قبلها كان كذلك حكم الثانية اذا كان فيها ابتداء قراءة ولا يحتاج الى اعادة تها عند كل سورة لانها فرض واحد و كان حكم السورة في الركعة الواحدة حكم ما قبلها لانها دوام على فعل قد ابتدأه حكم الدوام و حكم الا ابتداء كالركوع۔

یہ مذہب حنفیہ ہوا اور اس مذہب کی تائید دارقطنی کی یہ حدیث کرتی ہے:

قال رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم اذا قمت في الصلوة فقل بسم الله الرحمن الرحيم الحمد لله رب العالمين حتى تجمعها و قل هو الله احد الى آخرها۔

(صحیح البخاری ج ۱ ص ۳۶۶)

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم نماز میں کھڑے ہو تو بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھو یہاں کہ ان کو ختم کر دینا اور قل هو اللہ احد آخر سورۃ تک پڑھو۔

علامہ حلبی کبیری میں نہایت صاف طور پر تصریح فرماتے ہیں:

اما تسمية عند ابتداء السورة بعد الفاتحة عند ابى حنيفة لا ياتي بها لافي حال الجهر ولا في حال المخافة و كذا عند ابى يوسف لما تقدم انها ليست بآية من اول السورة و الا تيان بها في اول كل ركعة لما تقدم من الاحاديث الدالة على انه عليه السلام كان ياتي بها سرا و كذا الخلفاء الراشدون ولم يرو شي في الا تيان بها اول

(کبیری ص ۳۰۱)

لیکن فاتحہ کے بعد سورۃ کے ابتداء میں بسم اللہ پڑھنا تو امام اعظم کے نزدیک اس کو نہ پڑھنے نہ جہر کی حالت میں نہ آہستہ پڑھنے میں اور اسی طرح امام ابو یوسف کے نزدیک پہلے گزر چکا کہ تسمیہ سورۃ کی پہلی آیت نہیں اور تسمیہ کا ہر رکعت کے اول میں لانا تو اس پر دلالت کرنے والی حدیثیں منقول ہوئیں کہ حضور علیہ السلام تسمیہ کو آہستہ پڑھتے اور اسی طرح خلفائے راشدین کرتے اور تسمیہ کے اول سورۃ پڑھنے میں کوئی حدیث مروی نہیں۔

مخالف کے پاس کوئی ایسی روایت نہیں جس سے تسمیہ کا فاتحہ کے درمیان پڑھنا مسنون ثابت کر سکے تو مذہب مخالف روایت و درایت کسی طرح ثابت نہ ہو سکا اور مذہب حنفیہ ہر طرح ثابت کر دیا گیا۔ مقدمہ رابعہ: نماز میں تسمیہ کے بالجہر پڑھنے میں سوائے ترمذی کے صحاح نے کوئی حدیث روایت نہیں کی اور ترمذی نے جو یہ حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی:

كان النبي صلى الله تعالى عليه وسلم يفتح صلوته بيسم الله الرحمن الرحيم -
تو اس کا ضعف خود ہی اس طرح بیان کیا: قال ابو عيسى و ليس اسناده بذلك -

پھر اس کے حاشیہ میں ہے: قال بعض الحفاظ ليس حديث صريح في الجهر الا في اسناده مقال عند اهل الحديث ولذا اعرض ارباب المسانيد المشهوره الاربعه واحمد لم يخرجوا منها شيئا مع اشتغال كتبهم على احاديث ضعيفة - علامہ حلبی کبیری میں فرماتے ہیں:

قال ابن التيمية وروينا عن الدارقطني انه قال لم يصح عن النبي صلى الله تعالى عليه وسلم في الجهر حديث و قال الحازمي احاديث الجهر وان كانت ماثورة عن نفر من الصحابة غير ان اكثرها لم يسلم من الشوائب - (کبیری ص ۳۰۱)

علامہ عینی عمدۃ القاری میں فرماتے ہیں:

احاديث الجهر وان كثرت روايتها فكلها ضعيفة وليست مخرجة في الصحاح ولا في المسانيد المشهوره - (حاشیہ بخاری مجتبیٰ ج ۱ ص ۱۰۳)

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں:

وبتحقیق ثابت شدہ است از آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و از خلفاء راشدین و صحابہ رضوان

اللہ علیہم اجمعین کہ جہر کی کردند بسملہ اگر نماز جہری می بود۔ و شیخ ابن الہمام از بعض حفاظ لعل کرده کہ ہیج حدیث ثابت نشد کہ صریح باشد در جہر بہ تسمیہ مگر آنکہ در اسناد وی سخن است و ہیج یکے از ارباب مسانید اربعہ مشہورہ اخراج نہ کرد و حدیثہ در اں باوجود آنکہ کتب ایشان مشتمل ست بر احادیث ضعیف و چندیں از صحابہ و تابعین و تبع تابعین و غیر ہم از ائمہ لا تعد ولا تحصى ذکر کرده اند کہ جہری کردند و احیاناً اگر بعض جہر روایت کردہ اند برائے تعلیم بود یا بجہت کمال قرب بعضی از مقتدیاں آنرا۔

(اشعۃ اللمعات کشوری ج ۱ ص ۳۷۳)

ان عبارات سے ظاہر ہو گیا کہ مدعیان تسمیہ بالجہر کے پاس غیر مجروح صحیح مرفوع حدیث اپنے اثبات مدعی کیلئے نہیں ہے۔ جب مشہور صحابہ نے تسمیہ بالجہر میں کسی صحیح مرفوع حدیث کی تخریج نہیں کی تو خود ہی ثابت ہو گیا کہ تسمیہ بالجہر کا مذہب ضعیف ہے۔ اور تسمیہ بالسر کا مذہب اصح ہے۔ چنانچہ روایات بکثرت اسی کی تائید کرتی ہیں۔

حدیث: (۱) بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

ان النبي صلى الله تعالى عليه وسلم و ابا بكر و عمر كانوا يفتحون الصلوة بالحمد لله رب العالمين - (ج ۱ ص ۱۰۳)

بیشک نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر اور عمر نماز کو الحمد للہ رب العالمین سے شروع کیا کرتے تھے۔

* مسلم شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

حدیث: (۲)۔ قال صليت مع رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم و ابي و بكر

عمر و عثمان فلم اسمع احدا منهم يقرأ بسم الله الرحمن الرحيم -

(مسلم مع شرح نووی ج ۱ ص ۱۷۴)

انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور خلیفہ اول حضرت ابو بکر اور خلیفہ ثانی عمر اور خلیفہ سوم حضرت عثمان کے ساتھ نماز پڑھی تو میں نے ان سے کسی کو بھی بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھتا ہوا نہیں سنا۔

اسی مسلم شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

حدیث: (۴) ان النبي صلى الله تعالى عليه وسلم و ابا بكر و عمر و عثمان كانوا

يفتتحون بالقرأة بالحمد لله رب العالمين - (ابوداؤد مجتبیٰ)

بیشک نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور عمر و عثمان الحمد للہ رب العالمین سے قرأت شروع کرتے تھے۔

ابوداؤد شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی:

حدیث: (۵) قالت کان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یفتتح الصلوۃ بالتکبیر والقرأة بالحمد لله رب العالمین۔

انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نماز کو اللہ اکبر سے اور قرأت کو الحمد للہ رب العالمین سے شروع کرتے تھے۔

حدیث: (۶-۷) عن عبد اللہ بن مغفل قال: سمعنی ابی وانا فی الصلوۃ اقول بسم اللہ الرحمن الرحیم فقال یابنی محدث ایاک والحدث وقال لم ار هذا من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کان ابغض الیہ الحدث فی الاسلام قال وقد صلیت مع النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ومع ابی بکر وعمر و عثمان فلم اسمع احدا منهم یقولها فلما اذا انت صلیت فقل الحمد لله رب العالمین۔

(ترمذی علیہ دہلی ج ۱ ص ۳۳)

ترمذی شریف میاں حضرت عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے مروی انہوں نے کہا مجھے میرے باپ نے نماز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کہتا ہوا سنا تو انہوں نے مجھ سے کہا اے بیٹے یہ نئی بات ہے اور تو نئی بات سے بچ اور کہا میں نے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں سے کسی کو نہ دیکھا کہ وہ انہیں سخت ناپسند تھی اور فرمایا کہ میں نے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر و عمر و عثمان کے ساتھ نماز پڑھی تو میں نے ان میں سے کسی کو تسمیہ کہتے ہوئے نہ سنا تو اس کو تو بھی اب مت کہہ تو نماز پڑھ تو الحمد للہ رب العالمین کہنا۔

ترمذی شریف میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی:

حدیث: (۸) کان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و ابو بکر وعمر و عثمان یفتتحون القرأة بالحمد لله رب العالمین۔

۱ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر اور حضرت عثمان قرأت کو الحمد للہ

رب العالمین سے شروع کرتے تھے۔

نسائی شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی:

حدیث: (۱۰) صلیت مع النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ومع ابو بکر وعمر و عثمان رضی اللہ عنہما فیفتحن بالحمد لله رب العالمین۔ (نسائی انصاری ص ۹۱)

کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ اور حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ساتھ نماز پڑھی تو انہوں نے الحمد للہ رب العالمین سے نماز شروع کی۔

حدیث: (۱۱) قال صلی بنا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فلم یسمعنا قرأة بسم اللہ الرحمن الرحیم و صلی بنا ابو بکر وعمر و عثمان فلم نسمعها منہما۔

(نسائی ج ۱ ص ۹۲)

انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی تو ہم نے بسم اللہ الرحمن الرحیم کا پڑھنا نہیں سنا اور ہمیں حضرت ابوبکر و عمر نے نماز پڑھائی تو ہم نے تسمیہ کو ان دونوں سے نہیں سنا۔

نسائی شریف میں انہیں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی:

حدیث: (۱۲) قال صلیت خلف رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و ابی بکر وعمر و عثمان رضی اللہ عنہم فلم اسمع احدا منهم یجهر ببسم اللہ الرحمن الرحیم۔

(نسائی ص ۹۲)

انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کے پیچھے نماز پڑھی تو ان میں سے کسی کو بسم اللہ الرحمن الرحیم کو بالجہر کیساتھ پڑھتے ہوئے نہیں سنا۔

نسائی شریف میں حضرت مغفل بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی:

حدیث: (۱۳) اذا سمع احدا یقرأ بسم اللہ الرحمن الرحیم یقول صلیت خلف رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و ابی بکر وعمر رضی اللہ عنہما فما سمعت احدا منهم قرأ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ (نسائی مطبوعہ انصاری ص ۹۲)

اور جب ہم میں سے کسی کو بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھتے ہوئے سنتے تو کہتے میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے پیچھے نماز پڑھی تو میں نے ان میں سے کسی کو نہیں سنا کہ اس نے بسم الرحمن الرحیم پڑھی ہو۔

ابن ماجہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی:

حدیث: (۱۴) کان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یفتتح القراءة بالحمد لله رب العالمین۔ (ابن ماجہ نظامی دہلی ج ۱ ص ۵۹)
انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قرأت کو الحمد للہ رب العالمین سے شروع فرماتے تھے۔

ابن ماجہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی:

حدیث: (۱۵) کان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و ابو بکر و عمر یفتتحون القراءة بالحمد لله رب العالمین۔ (ابن ماجہ ص ۵۹)
بیشک نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قرأت کو الحمد للہ رب العالمین سے شروع فرماتے تھے۔
ابن ماجہ میں حضرت عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے مروی:

حدیث: (۱۷) قال صلیت مع رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و مع ابی بکر و عمر و عثمان فلم اسمع رجلاً یقولہ فاذا قرأت فقل الحمد لله رب العالمین۔ (ابن ماجہ ص ۵۹)

انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ اور حضرت ابو بکر کے اور عمر کے ساتھ اور عثمان کیساتھ نماز پڑھی تو میں نے کسی شخص کو تسمیہ پڑھتا ہوا نہیں سنا۔ پس جب تو قرأت کرے تو الحمد للہ رب العالمین پڑھنا۔

موطا امام مالک میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی:

حدیث: (۱۸) قال: قمت و راء ابی بکر و عمر و عثمان فکلہم کان لا یقرأ بسم اللہ الرحمن الرحیم اذا افتتحون الصلاة۔ (موطا ص ۱۰)

انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت ابو بکر اور عمر اور عثمان کی اقتدا کی تو یہ سب بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں پڑھتے تھے جب نماز شروع کرتے۔

بیہقی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی:

حدیث: (۱۹) کان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و ابو بکر و عمر یقرآن یعنی لا یجھرون بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ (بیہقی ج ۲ ص ۵۲۰)

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور ابو بکر اور عمر بسم اللہ الرحمن الرحیم کو باجھ نہیں پڑھتے تھے۔
امام طبرانی تہذیب الآثار میں حضرت ابو وائل رضی اللہ عنہ سے راوی:

حدیث: (۲۰) قال لم یکن عمر و علی یجھران بسم الرحمن الرحیم و لا بامین، (الجوہر النقی ج ۲ ص ۴۸)

انہوں نے کہا کہ حضرت عمر اور حضرت علی بسم الرحمن الرحیم اور آمین جبر سے نہیں کہتے تھے۔
امام طبرانی معجم کبیر میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے راوی:

حدیث: (۲۱) ان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و ابو بکر و عمر کانوا یسرون بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ (صحیح البخاری ج ۱ ص ۳۸۹)
بیشک نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر اور عمر بسم اللہ الرحمن الرحیم کو بالسر یعنی پوشیدہ طور پر پڑھتے تھے۔

حدیث: (۲۲) لم یجھر النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بالبسملة حتی مات۔ (کبیری ص ۳۰۱)

کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تسمیہ کو بالجہر نہ پڑھایا یہاں تک کہ وفات پائی۔
امام طبرانی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے راوی:

حدیث: (۲۳) ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کان یسر بسم اللہ الرحمن الرحیم و ابابکر و عثمان و علیا۔ (کبیری ص ۳۰۱)

بیشک رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر و عثمان اور علی بسم اللہ الرحمن الرحیم کو بالسر آہستہ پڑھتے۔

حدیث: (۲۴) قال الجھر بسم الرحمن الرحیم قرأه الا عراب۔ (الجوہر النقی ج ۲ ص ۴۷)

انہوں نے فرمایا: بسم اللہ الرحمن الرحیم کو بالجہر پڑھنا اہل قریہ کی قرأت ہے۔
ابو بکر رازی احکام القرآن میں حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی:

قال جهر الامام بسم اللہ الرحمن الرحیم فی الصلاة بدعة۔ (احکام القرآن، ج ۱ ص ۱۵)

انہوں نے کہا کہ امام کا بسم اللہ الرحمن الرحیم کو نماز میں بالجہر پڑھنا بدعت ہے۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم سورۃ فاتحہ سے پہلے پڑھی جاتی تھی۔ لیکن جہری نمازوں میں بالجہر نہیں پڑھی جاتی تھی، بلکہ بالسر آہستہ پڑھی جاتی تھی، خود نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین اور اجلہ صحابہ و تابعین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جہر کے ساتھ بسم اللہ نہیں پڑھتے اور الحمد للہ رب العالمین سے جہر سے شروع کرتے۔ انہیں احادیث سے استدلال کرتے ہوئے مذہب امام اعظم کا واضح و راجح ہونا ظاہر ہو گیا۔ لہذا نماز میں بسم اللہ کا آہستہ پڑھنا مسنون ہوا۔

ردالمحتار میں ہے: والسر لانہا سنۃ۔ اور بالجہر پڑھنا مکروہ ہوا۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ویکرہ الجہر بالتسمیۃ والتامین۔

یہ حنفی مذہب کے دلائل کا ایک نمونہ پیش کر دیا گیا ہے۔ ان مقدمات کے بعد سوال کا جواب خود ہی واضح ہو گیا مگر چونکہ سوال مذہب حنفیت کے خلاف بعض مغالطوں اور غلط استدلالوں پر مشتمل ہے اس لئے اس کے ہر جملے کا جواب دے دیا جاتا ہے۔ پھر اختصار ملحوظ ہے۔

صاحب فوائد مکلیہ تحریر فرماتے ہیں: کہ حضرت امام عاصم کو فی رحمۃ اللہ علیہ بین السورتین تسمیہ پڑھتے ہیں تو اس لحاظ سے جس سورۃ کو قاری بلا تسمیہ پڑھے گا وہ سورۃ امام کے نزدیک ناقص ہوگی۔

اقول: حضرت امام عاصم کا فعل غیر نماز میں قابل لحاظ لائق عمل ہو سکتا ہے، لہذا خارج نماز میں جب تلاوت کرے تو سورۃ کو بلا تسمیہ کے نہ پڑھے۔

ردالمحتار میں ہے: وفی خارج الصلوٰۃ اختلاف الروایات والمشائخ فی التعوذ والتسمیۃ قبل یخفی التعوذ دون التسمیۃ والصحیح انہ یتخیر فیہما ولكن یتبع امامہ من القراء وہم یجہرون بہما الاحمزۃ فانہ یخفیہما۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۳۲۲)

باقی رہا نماز میں تو اس میں ائمہ اربعہ کا اتباع کیا جائے گا۔ کہ احکام صلوٰۃ کا تعلق ائمہ اربعہ سے ہے نہ کہ ائمہ قراء سے، جسکی تفصیل آگے آتی ہے اس کے بعد کہا۔

وعن ابی خزیمة ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قرء بسم اللہ الرحمن الرحیم فی اول الفاتحۃ فی الصلوٰۃ وعدھا آیۃ ایضا الخ۔

اقول: اس حدیث پر علامہ علاء الدین بن علی نے الجوہر النقی میں یہ جرح لکھی ہے:

لیس فی الحدیث عدھا آیۃ الامن وجہ ضعیف۔

نیز اس حدیث میں ابن ملیکہ کی سماعت حضرات ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

وقال الطحاوی فی کتاب الرد علی الکراہیسی لم یسمع ابن ابی ملیکہ هذا الحدیث من ام سلمۃ۔ (الجوہر النقی، ج ۲ ص ۲۴)

ان کے درمیان میں ایک راوی یعلیٰ بن مملک متروک ہے تو اس حدیث ضعیف و مجروح پر حدیث صحیح کے بالمقابل بناء مذہب قرار دینا ناقابل اعتماد و استدلال ہے۔ اسکے بعد لکھا۔

پھر علامہ جزری فرماتے ہیں کہ بسم اللہ منزل من اللہ ہے اسکو پڑھنا چاہیے۔

اقول: بسم اللہ کے منزل من اللہ ہونے کا کون انکار کرتا ہے، احناف کے نزدیک بھی وہ منزل من اللہ ہے جیسا کہ مقدمہ اولی سے ظاہر ہو چکا ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ اسکو پڑھنا چاہیے تو اس کے نماز وغیر نماز میں ابتدائے قراءۃ میں پڑھنے کو کون منع کرتا ہے احناف اس کو کہیں سنت کہیں مستحب کہتے ہیں جیسا کہ اوپر مفصل مذکور ہوا۔

پھر کہا: چنانچہ باسناد اسحاق نقل کرتے ہیں: ہم سورۃ فاتحہ اور ہر سورۃ کے شروع ہر حالت و خارج از صلوٰۃ قرآن سناتے ہوں خواہ نماز میں بسم اللہ پڑھا ہی کرتے تھے۔

اقول: اسحاق بن مسیب کو علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں فرماتے ہیں: کہ وہ ضعیف ہیں۔ علاوہ بریں وہ کسی حدیث کی روایت نہیں کر رہے بلکہ محض اپنے عمل کا ذکر کر رہے ہیں، اور انکا عمل سب کے لئے حجت نہیں۔ اور اگر اس سے بھی قطع نظر کیجئے تو اسے سورۃ فاتحہ اور ہر سورۃ سے پہلے نماز میں کون نا جائز قرار دیتا ہے۔ مقدمہ ثالثہ سے ظاہر ہو چکا کہ تسمیہ کا قبل سورۃ فاتحہ کے پڑھنا مسنون ہے اور سورۃ سے پہلے پڑھنا بھی جائز ہے۔ تو انکا کلام ہمارے خلاف نہیں۔

پھر کہا: اور قراء مدینہ کا بھی یہی مذہب تھا۔

اقول: قراء مدینہ کا مذہب اس تسمیہ کے جزء سورۃ ہونے میں امام عاصم وغیرہ قراء کوفہ کے بالکل مخالف ہے۔

تفسیر بیضاوی میں ہے: بسم اللہ الرحمن الرحیم من الفاتحۃ وعلیہ قراء مکۃ والکوفۃ و فقہائہا و ابن المبارک والشافعی و خالفہم قراء المدینۃ والبصرۃ و فقہائہا و مالک۔

تو اس عبارت سے ظاہر ہو گیا کہ قراء مدینہ کا مذہب حضرت امام عاصم وغیرہ قراء کوفہ کے خلاف ہے تو ان کو انکا ہم مذہب کہنا کس قدر غلط بات ہے۔ اس کے بعد کہ ان روایات سے یہ امر ثابت ہوتا ہے

کہ بین السورتین بسم اللہ نہ پڑھنے کا اختلاف ایسا ہے کہ جیسے اور اختلافات قراءت سبعہ کہ جس طرح اس کا پڑھنا جائز ہے اسی طرح اس کا نہ پڑھنا بھی درست ہے۔

اقول: نتیجہ تو معلوم ہے لیکن ان روایات سے اس امر کا ثابت ہونا محل نظر ہے جیسا کہ اوپر کی تفسیر سے ظاہر ہے۔ پھر ان روایات کا بجنہ حجت ہونا بھی محل کلام ہے۔

اسکے بعد کہا: پس مہملین کی روایات میں بسم اللہ بین السورتین وجہ پڑھنی چاہیے۔

اقول: خارج نماز میں تو تسمیہ کا بین السورتین جہر سے پڑھنا محل نزاع نہیں۔ رہا نماز میں تسمیہ کا جہر پڑھنا تو وہ بین السورتین ہی کیا بلکہ قبل سورۃ کے بھی کسی غیر مجروح صحیح حدیث سے ثابت نہیں، بلکہ صحیح حدیثوں کے خلاف ہے جیسا کہ مقدمہ رابعہ سے ظاہر ہے۔ تو اب ان صحیح حدیثوں کے خلاف یہ استدلال کرنا کہ تسمیہ کو جہر پڑھنا چاہیے جہالت نہیں ہے تو اور کیا ہے بلکہ دین میں اپنی رائے ناقص سے دخل دینا ہے۔

اس کے بعد کہا: کیوں کہ فقہا کو اگرچہ اپنی ذاتی تحقیق اس مسئلہ میں کچھ ہی ہوتی تھی مگر روایت کے موقع پر آ کر اس مسئلہ کو فن قراءت ہو جانے کی وجہ سے وہ قراء ہی کا اتباع کرتے تھے۔

اقول: اوپر مذکور ہوا کہ نماز میں تسمیہ کا پڑھنا، پھر ہر رکعت میں پڑھنا اور ایک رکعت میں بھی ایک بار پڑھنا یا چند بار پڑھنا بالجہر پڑھنا یا بالسر پڑھنا یہ سب فقہ کے احکام ہیں نہ کہ فن قراءت کے۔ تو جب یہ فقہ کے احکام ہوئے تو ان میں اتباع فقہا کا ہو گا یا قراء کا۔ قراء کا اتباع ہر اس بات میں ہو گا جو بات فن قراءت کی ہو، اور جو بات ان کے فن ہی کی نہ ہو تو اس میں قراء کا اتباع کس طرح کیا جاسکتا ہے۔

صاحب فوائد نے نہ تو تجوید کے امتیاز کو سمجھا، نہ فقہاء و قراء کے مذہب کے فرقوں کی جانا، نہ انکے طریقہ استدلال سے واقفیت حاصل کی، نہ انکے دلائل پر مطلع ہونے کی سعی کی۔ پھر اس نے فقہا کی ذاتی تحقیق سے اگر یہ مراد لی ہے کہ انہوں نے نص صریح کے خلاف جو استدلال کیا ہے وہ انکی ذاتی تحقیق ہے تو ہمارے فقہا کرام کی ایسی تحقیق کوئی نہیں پیش کی جاسکتی ہے۔ اور اگر یہ مراد ہے کہ انہوں نے نص کے خلاف تو نہیں کیا لیکن نص سے علت کو اخذ کر کے کسی غیر منصوص کیلئے قیاس کیا تو یہ خلاف روایت ہی کب قرار پایا۔ اس کو خلاف روایت کہنا ہی سخت نادانی ہے۔ اس مسئلہ تسمیہ میں ہمارے فقہاء احناف نے جو احکام بتائے وہ بالکل موافق روایات ہیں جیسا کہ اوپر کے مقدمات سے ظاہر ہو چکا۔ صاحب فوائد نے فقہا کا تسمیہ میں وہ کون سا حکم دیکھا جو صحیح روایت کے خلاف ہو اور قراء اسکے مقابل صحیح روایت پر عامل

ہوں۔ اور جو بات پیش کی گئی اس میں تو صحیح روایات فقہاء کی موافقت کر رہی ہیں جیسا کہ مقدمات میں گذرا۔

اس کے بعد کہا: حضرت امام مالک علیہ الرحمۃ نے باوجود اسکے کہ انکے مذہب میں بسم اللہ ہر سورۃ کا جز نہیں مگر امام نافع سے مسئلہ پوچھ کر یوں ہی فرمایا کہ ہر علم کا مسئلہ اس کے اہل سے پوچھنا چاہیے۔ اقول: یہ قاعدہ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہر علم کا مسئلہ اس کے اہل سے پوچھنا چاہیے۔ لیکن صاحب فوائد اپنے اس دعوے کو تو کسی دلیل سے ثابت کر دے کہ نماز سے تسمیہ کا فاتحہ و سورۃ سے پہلے ہر رکعت میں پڑھنا اور اس کا بالجہر پڑھنا علم قراءۃ کا مسئلہ ہے پھر ہم سے مطالبہ کرے۔

رہا امام مالک کا یہ واقعہ۔ اول تو کسی معتبر کتاب کے حوالہ سے نہیں، علاوہ بریں حضرت امام مالک نے اپنے قول پر خود عمل نہیں کیا۔ اور اپنے مذہب سے کیوں رجوع نہیں فرمایا، مصنف کو اپنے استدلال میں کسی کا قول سوچ سمجھ کر پیش کرنا تھا۔ لہذا اقول حضرت امام مالک نے اسکو کیا فائدہ پہنچایا۔

پھر اس کے بعد کہا: مدار علم قراءت نقل و صحت روایت پر ہے۔ قیاس و عقل کو اس میں دخل نہیں۔ اقول: نہ تو تمام قواعد علم تجوید نقل و صحت روایت پر موقوف ہیں جو قواعد عربیہ اس میں جاری ہیں ان میں صحت روایت کیسے متصور ہوگی۔ نہ اس کے سارے مسائل تجوید قیاس و عقل کے بالکل خلاف ہیں، کہ بعض مسائل تجوید موافق قیاس و عقل بھی ہیں جو فن تجوید کے واقف کار پر بھی مخفی نہیں۔

اسکے بعد کہا: علم فقہ منصوصات و مجتہدات دونوں سے مرکب ہیں۔

اقول: اگر مجتہد کو منصوص کا مقابل ٹھہرا کر مجتہدات سے خلاف منصوصات مراد لیا گیا ہے تو یہ غلط ہے اور حقیقت وہ مجتہد ہی نہیں ہے۔

توضیح میں ہے: فمعنی القیاس ان النص الوارد فی المقیس علیہ وارد فی المقیس معنی و ان لم یکن واردا صریحا۔

ردالمحتار میں ہے: المراد بالمجتہد فیہ ما کان مبنیا علی دلیل معتبر شرعا بحیث یسوغ للمجتہد بسببہ مخالفة غیرہ بخلاف ما اذا کان قولا مخالفا للكتاب کحل متروک التسمیۃ عمدا فانہ لا یسمی مجتہدا فیہ۔ (ردالمحتار ص ۳۳۱)

تو مجتہدات بمعنی منصوصات ہی ہوتے ہیں ان کو خلاف منصوص نہیں کہا جاسکتا۔

پھر اس کے بعد کہا۔ مسائل منصوص میں شارع علیہ السلام کے سوا کسی کا اتباع نہیں اور ائمہ کی

تقلید مسائل اجتہادیہ میں ہے۔

اقول: نہ تو مطلقاً یہ صحیح ہے کہ شارع علیہ السلام کے سوا کسی اور کا اتباع مسائل منصوصہ میں نہیں کہ مسائل منصوصہ میں ائمہ اور فقہاء کا بھی اتباع کیا جاتا ہے۔

در مختار میں ہے: و اما نحن فعلينا اتباع مار حجوہ و ما صححوہ۔

اور نہ حقیقت یہی صحیح ہے کہ مسائل اجتہادیہ میں صرف ائمہ ہی کی تقلید کی جاتی ہے۔ بلکہ اس تقلید ائمہ میں اتباع رسول علیہ السلام بھی حاصل ہے۔

علامہ شعرانی میزان الشریعہ میں فرماتے ہیں: ما من قول من اقوال المجتہدین و مقلد یہم الا و ینتہی سندہ برسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ثم بجرئیل ثم بحضرة اللہ تعالیٰ۔ (میزان مصری ج ۱ ص ۴۴)

تو جب مسائل اجتہادیہ کی سند حضرت شارع علیہ السلام تک پہنچتی ہے تو تقلید ائمہ میں اتباع رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بھی حاصل ہو گیا اور مصنف کا دعویٰ ہر پہلو پر باطل ثابت ہوا۔

اس کے بعد کہا: لہذا ہر مسئلہ قرآن میں نقل و صحت روایت کے علاوہ اور سند کی ضرورت نہیں۔

اقول: جب ہر مسئلہ قرآن میں نقل و صحت روایت پر موقوف نہیں ہے تو سرے سے یہ دعویٰ ہی صحیح قرار نہیں پایا۔ پھر باوجود اس کے یہ کہنا بے جا ہے۔ کہ جس کا مدار روایت پر ہو اس میں سند کی ضرورت نہیں، اسکے بعد کہا: مسئلہ قراءت کی سند فقہاء کے اقوال سے تلاش کرنا غلطی ہے بلکہ اس کی سند ائمہ قراءت سے دریافت کرنی چاہئے۔ پس تصحیح روایت کے بعد اس پر عمل کرنا چاہئے۔

اقول: جس طرح مسئلہ قراءت کی سند اقوال فقہاء سے تلاش کرنا غلطی ہے۔ اسی طرح فقہی مسئلہ کی اقوال قراء سے تلاش کرنا بھی سخت غلطی بلکہ انتہائی جہالت ہے کہ فقہی مسئلہ اقوال فقہاء سے ہی لیا جاتا ہے، تو نماز میں ہر سورۃ پر بسم اللہ پڑھنا یا نہ پڑھنا اور بالجہر پڑھنا یا بالسر پڑھنا یہ فقہی مسئلہ ہے اس کو اقوال فقہاء سے ہی اخذ کر کے عمل کیا جائے گا۔

اس کے بعد کہا:

دوسری بات یہ ہے کہ جو کچھ بین الدفتین ہو رسم عثمانی اس کی متحمل ہو اور قواعد تجوید کے موافق ہو نقل متواتر کیساتھ ہم تک پہنچا ہو وہ قرآن ہے اور تسمیہ پر یہ سب باتیں صادق آتی ہیں۔

اقول: لا ریب تسمیہ قرآن کی آیت ہے۔ فقہاء کا یہی مسلک ہے۔ مقدمہ اولیٰ میں اس کو بدلائل

ثابت کر دیا ہے۔

اس کے بعد کہا: نیز باجماع مذاہب اربعہ ہر حال میں قرآن سب سے کیساتھ قرآن پڑھنا جائز ہے۔

اقول: نماز میں قرآن کا قراءت سب سے کیساتھ پڑھنا جائز ہے۔ لیکن عوام کے انکار کرنے یافتہ میں پڑ جانے کا خوف ہو تو اپنی اس قراءت کے سوا جس سے عوام واقف ہیں کسی دوسری قراءت میں نہ پڑھنا چاہئے۔

در مختار میں ہے: و یجوز بالروایات السبع لکن الا ولی ان لا یقرأ بالغریبۃ عند

العوام صیانۃ لد بینہم۔

اس کے بعد کہا: اختلاف قراءت بحرکت ہوں یا بکلمہ یا بتبدیلی و زیادتی کلمہ خواہ ان میں سے کسی طرح کا اختلاف ہو سب جائز ہے۔

اقول: جو اختلاف قراءت سب سے بلکہ عشرہ کے موافق ہو گا وہ تو بلا شک جائز ہے۔ اور جو اختلاف عشرہ سے بھی متجاوز ہو اس میں تغیر معنی بھی ہوتا ہو تو وہ کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ اور اس کو نماز میں کیسے روا رکھا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد کہا: پھر تسمیہ کو نماز میں ناجائز کہنا کس طرح قبول کیا جا سکتا ہے جب تک کہ وہ دلیل نقلی قرآن یا حدیث سے نہ ہو۔

اقول: تسمیہ کو نماز میں ناجائز کس نے کہا ہے۔ فقہاء حنفیہ تو نماز میں تسمیہ کو قبل سورۃ فاتحہ کے تو مسنون کہتے ہیں۔ اور بین السورتین کو جائز لکھتے ہیں جیسا کہ مقدمہ ثالثہ سے کہ وہ تو اس کو جائز لکھتے ہیں، پھر اس کے بعد کہا: باوجود ان تمام امور کے کہیں امام اعظم قدس سرہ سے اس کی تصریح بھی نہیں آئی کہ تمامی قراء کے اختلاف تمام قرآن میں پڑھنے جائز ہوں اور مبسمین کے قول کے موافق تسمیہ بین السورتین جائز نہ ہو۔

اقول: مذہب امام اعظم کا اتفاق مسئلہ یہی ہے کہ ائمہ سب سے بلکہ عشرہ کی روایت سے جتنی قراءتیں ہو چکیں اس کا نماز میں پڑھنا جائز ہے۔

ردالمحتار میں ہے: القرآن الذی تجوز بہ الصلوٰۃ بالاتفاق هو المضبوط فی

مصحف الأئمة اللتی بعث بها عثمان رضی اللہ عنہ الی الا مصارو هو الذی اجمع

علیہ الأئمة العشرة و هذا هو المتواتر جملة و تفصیلاً فما فوق السبعة الی العشرة غیر

شاذ وانما الشاذ ما وراء العشرة وهو الصحيح۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۳۲۱)

رہا خود امام اعظم کا قول تو وہ اگر اس کے خلاف ہوتا تو مذہب حنفی کا یہ متفقہ مسئلہ نہ ہوتا اور حضرت امام کی تسمیہ بین السورتین کے متعلق یہ تصریح موجود ہے۔

احکام القرآن میں ہے: روی هشام عن ابی یوسف قال ابو حنیفہ عن قراءة بسم الله الرحمن الرحيم قبل الفاتحة الكتاب وتحديد ما قبل السورة التي بعد فاتحة الكتاب فقال ابو حنیفہ یجزیہ قرأتها قبل الحمد۔ (احکام القرآن مصری ص ۱۲ ج ۱)

نیز اسی میں ہے: روی ابو یوسف عن ابی حنیفہ انه یقرأها فی کل رکعة مرة واحدة عند ابتداء قراءة فاتحة الكتاب ولا یعيدھا مع السورة عند ابی حنیفہ۔

اور اختلاف قراء کا جواز اور تسمیہ بین السورتین کے جواز کا قول ان کے خلاف اولیٰ ہونے کے منافی نہیں۔

رد المحتار میں ہے: الجواز المشروعية بمعنى عدم الحرمة فلا ينافي كونه خلاف اولیٰ۔ (ج ۱ ص ۳۳۴)

لہذا یہ دونوں جائز ہیں۔ لیکن خلاف اولیٰ ہیں۔

اس کے بعد کہا: پھر یہ مسئلہ اجتہادی بھی نہیں کیونکہ منصوصات میں اجتہاد جائز نہیں۔

اقول: مصنف نے نماز میں تسمیہ بین السورتین کے مسئلہ اجتہادی ہونے کا انکار کیا ہے اور اسکو منصوص مانا لیکن اس کے منصوص ہونے پر کوئی روایت پیش نہیں کی بلکہ وہ کوئی صریح حدیث پیش کر بھی نہیں سکتا کہ اس میں کوئی حدیث مروی ہی نہیں۔

چنانچہ علامہ حلبی کبیری میں تصریح کرتے ہیں: والاتیان بها فی اول کل رکعة كما تفقد من الاحادیث الدالة على انه عليه السلام كان ياتی بها سرا وكذا الخلفاء الراشدون ولم يرو شي في الاتیان بها اول السورة۔ (کبیری ص ۳۰۱)

تو اس کے منصوص ہونے کا دعویٰ تو غلط ثابت ہوا اور جب یہ غلط ہوا تو وہ مسئلہ اجتہادی قرار پایا۔ اس کے بعد کہا: ہم مسائل اجتہادیہ میں امام صاحب کے مقلد ہیں نہ کہ مسائل منصوصہ میں۔ لہذا مسائل فقہیہ میں تو مقلد ہیں کہ وہ مجتہد ہیں۔

اقول: جب اسکا مسئلہ اجتہادی ہونا ثابت ہو چکا تو مصنف اس میں باقرار خود امام صاحب کی

تقلید پر مجبور ہوئے اور خود ہی اس نے اپنی سعی کو ملیا میٹ کر ڈالا۔ اور قول امام صاحب کی تصریح ابھی گزر رہی کہ تسمیہ صرف سورۃ فاتحہ سے قبل پڑھا جائے اور پوشیدہ پڑھا جائے اور اسی رکعت میں بعد فاتحہ نہ پڑھا جائے۔

اس کے بعد کہا: اور مسائل قرآنہ میں ائمہ اور روایان قرآن حکیم کے ہیں۔

اقول: یہ تو صحیح ہے کہ مسئلہ قراءۃ میں ائمہ قرأت میں سے اپنے امام کے قول پر عمل کیا جائے گا۔ تو یہ جملہ ہی لغو قرار پایا۔

اس کے بعد کہا: اور علم قراءت میں امام صاحب بھی روایان قرآن کے مقلد تھے۔ نیز علم قرآن میں شاگرد امام عاصم کے ہیں۔

اقول: امام اعظم صاحب سے ان مشہور روایان قرآن کے موافق قرأتیں اور دیگر راویوں کی ہر طرح قرأتیں ثابت و مروی ہیں اور حضرت امام عاصم کی قراءۃ کے متعلق حضرت امام اعظم کا یہ قول علامہ ابن حجر کی نے مناقب امام اعظم میں نقل کیا ہے۔ قراءۃ عاصم قراءۃ مستقیمہ۔ لیکن آپ کی ان میں سے کسی امام خاص کی تقلید کرنا کسی معتبر کتاب میں نظر سے نہیں گذرا۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت امام اعظم صاحب حضرت امام عاصم کے شاگرد ہیں لیکن امام کردری صاحب فتاویٰ بزاز یہ نے مناقب میں حضرت امام عاصم کو حضرت امام کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ (دیکھو مناقب امام ج ۲ ص ۲۲۱)

اس کے بعد کہا: اور یہ بات کہیں ثابت نہیں ہوئی کہ امام صاحب نے قرآن کریم میں اجتہاد فرمایا ہے کیونکہ سمعیات میں تو اجتہاد کی گنجائش ہی نہیں۔

اقول: جس واقعہ میں نص موجود ہو اس میں اجتہاد و قیاس کیا ہی نہیں جاتا کہ اجتہاد و قیاس کی حاکمیت وہاں ہوتی ہے جہاں نص وارد نہ ہو۔ باقی رہا آیات میں اجتہاد کرنا تو استدلال بہ عبارت النص۔ اشارۃ النص۔ واقتضاء النص کیا ہیں۔ فعل مجتہد ہی تو ہے۔ تو یہ کہنا کہ سمعیات میں اجتہاد کی گنجائش ہی نہیں جہالت نہیں ہے تو اور کیا ہے۔

اس کے بعد کہا: اگر اجتہاد کی کہیں گنجائش ہے تو جہاں سے مبسملین کیلئے تسمیہ کی ممانعت مستنبط ہو بتائیں ورنہ احتمال اجتہاد اس مسئلہ میں محض بے سود جو پزیرائی نہیں ہو سکتا۔

اقول: یہ اوپر تفصیل سے گذر چکا کہ نماز میں تسمیہ کا ہر رکعت میں پڑھنا ایک بار پڑھنا یا چند بار پڑھنا اور بالکھڑ پڑھنا یا بالسر پڑھنا فقہی مسائل ہیں جو یقیناً اجتہاد سے مستنبط ہیں تو اس میں احتمال اجتہاد

کیا۔ اور جب مسائل اجتہادیہ سے ہیں تو اس میں مقلد کو دلیل دریافت کرنے کا کب استحقاق حاصل ہو سکتا ہے۔ تو قول امام کے معلوم ہو جانے کے بعد محل استدلال کے دریافت کرنے کا کیا حق ہے۔ علاوہ بریں ہم نے اوپر کافی دلائل جمع کر دیے ہیں۔

اس کے بعد کہا: پس جو کچھ لوگ بسم اللہ بالجہر تراویح میں پڑھنے کی بات مبطلین کیلئے نزاع کرتے ہیں وہ قرأت سبعہ کی حقیقت سے واقفیت نہیں رکھتے۔

اقول: احناف نماز میں تسمیہ بالجہر کو مکروہ کہتے ہیں۔ اب چاہے کہ وہ نماز فرض ہو یا تراویح یا نفل۔ اور جب وہ مکروہ کہتے ہیں تو مبطلین بالجہر سے نزاع ہی متحقق ہو گیا۔ علاوہ بریں نماز میں تسمیہ بالجہر کو قرأت سبعہ کی حقیقت سے کیا علاقہ کہ یہ فقہی مسئلہ ہے۔ اس کا مسئلہ قرأت سے کب مقابلہ۔ پھر جب ان فقہاء حنفیہ کو قرأت سبعہ کی حقیقت سے ناواقفیت نہ ہوگی۔ تو اس صاحب فوائد مکملہ کو کہاں سے واقفیت حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ نادار خود تو قرأت سبعہ کی حقیقت سے ناواقف واقف کاروں کو کس طرح دلیری سے ناواقف کہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ خود ہی اس کے ناواقف و جاہل ہونے کی بین دلیل ہے۔

پھر حاصل سوال یہ ہے۔ لہذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ تراویح میں ہر سورۃ پر بسم اللہ پڑھنی چاہئے یا ایک سورۃ پر۔ نیز بالجہر یا بالسور اور سورۃ فاتحہ و دیگر سور پر بھی بالجہر یا بالسور پڑھے یا نہیں؟ اور کیا احکام و دلائل ہیں؟ بحوالہ کتب جواب مرحمت فرمائیں۔

اقول: یہ تو ظاہر ہے کہ تراویح بھی نماز ہی ہے اور اس کے شرائط و احکام بھی وہی ہیں جو فرض کے ہیں۔ تو اس تراویح میں بھی ہر سورۃ پر بسم اللہ نہ پڑھے بلکہ ہر رکعت میں وہی سورۃ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھے اور تسمیہ بالجہر نہ پڑھے بلکہ بالسور ہی پڑھے۔ عبارت کتب فقہ اور دلائل شرعیہ مقدمات میں ان کے بعد سلسلہ میں کافی منقول ہو چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں مسئلہ مجوشہ پر کافی روشنی ڈالی گئی۔ طالب تحقیق کیلئے مسئلہ کا ایسا حاصل موجود ہے کہ جس کے بعد مزید بحث کی حاجت باقی نہیں رہتی اور منکر و معاندین کیلئے دفتر کے دفتر ناکافی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

جواب سوال دوم: ض۔ ظ۔ دال ان میں ہر ایک کا مخرج علیحدہ و جدا گانہ ہے۔ تو ان میں پہلا فرق امتیاز من حیث المخرج ہوا جو ہر ایک کے امتیاز صوت طبعی کو مستلزم ہے۔ دوسرا فرق من حیث الصفات ہے۔ توضع اور دال میں تو پانچ صفات کا فرق ہے یعنی ض۔ رخوہ۔ مستعلیہ۔ مطبقہ۔ مستطیلہ۔

غیر قلقلہ ہے۔ اور دال ان کی اضداد شدیدہ۔ مستقلہ۔ مفتحہ۔ قصیرہ۔ قلقلہ ہے۔ اور ض وظ میں چار صفات میں شرکت ہے۔ وہ رخوہ۔ مستعلیہ۔ مطبقہ۔ مصمتہ ہیں۔ اور ایک صفت استطالت کی بنا پر ض، ظ سے ممتاز و جدا ہے۔ توضع کو ان ہر دو دال، اور ظا سے من حیث المخرج اور من حیث الصفات ہر طرح کا امتیاز اور فرق حاصل ہوا۔ لہذا ان حروف میں بتائیں ذاتی بھی ہوا اور تغایر صفاتی بھی ہوا۔ اور جب ان میں بتائیں ذاتی و صفاتی دونوں ہیں تو یہ ان کے درمیان افتراق فی الصوت کو یقیناً مستلزم ہے کہ مشابہت فی الصوت یا تو اتحاد مخرج کی بنا پر ہوتا ہے جیسے ط۔ ت۔ میں۔ یا تقارب فی المخرج کی بنا پر۔ جیسے ظ۔ ز۔ میں۔ یا مشارکت فی الصفات کی بنا پر جیسے س۔ ث۔ میں۔ اور ض وظ۔ میں نہ تو اتحاد مخرج ہی ہے نہ تقارب مخرج نہ مشارکت فی الصفات۔ تو ان میں مشابہت تامہ فی الصوت کہاں سے آئیگی۔

لہذا ان کے درمیان مشابہت تامہ کے تو اسباب ہی نہیں پائے گئے۔ اب رہی مشابہت ناقصہ تو وہ اگر ض۔ ظ۔ سے مشارکت فی بعض الصفات ہونے کی بنا پر ہے تو ض کو دال سے باعتبار مخرج ظا سے زیادہ قرب اور مشارکت فی بعض الصفات کی بنا پر بھی ہے کہ ج اور دال مجبورہ، مصمتہ ہونے میں شریک ہیں تو جس طرح ض۔ کو ظ۔ سے مشابہت ناقصہ ہے اسی طرح ض۔ کو د۔ سے بھی مشابہت ناقصہ ہے۔ اسی بنا پر قاضی خاں کی یہ عبارت ہے:

لو قرأ یلبسون ثیاباً خضرًا بالذال او بالذال تفسد صلاته۔
اسی میں ہے:

لو قرأ غیر المغضوب بنظا او بالذال المعجمة تفسد صلاته ولا الضالین بالظاء المعجمة والذال المهملة لا تفسد صلاته ولو بالذال المعجمة تفسد۔ ولو قرأ نخل طلعتها هضیم قرأ بالظاء او بالذال تفسد صلاته۔

(فتاویٰ قاضی خاں مطبوعہ مصطفائی ص ۶۹-۷۰)

ان عبارات سے ظاہر ہے کہ ض۔ کی ظ یا دال سے تبدیل کا باعث وہی ان کی ض سے مشابہت ناقصہ ہی تو ہے توضع۔ کیلئے جیسے مشابہت ناقصہ ظ سے ہے ایسی ہی اس کو مشابہت ناقصہ دال سے بھی ہے۔

اور جب ض۔ کو اس کے مخرج سے مع جمیع صفات و شرائط کے ادا کیا جائیگا تو اس کی صوت طبعی ان ہر دو، ظ اور دال کی آوازوں سے ممتاز و جدا ہوگی۔ ظ۔ یا دال کی مشابہت ناقصہ سے ض کی اصل آواز

زمت نہیں جائے گی۔ اورض، عین، ظ۔ یا عین دال نہیں بن جائے گا۔ اورض کا ان دونوں سے تباہی ذالی اور تغایر فی بعض الصفات فنا ہو کر اتحاد ذات ہر گز ہر گز نہیں ہو سکتا۔ مشتبه الصوت حروف کی ادائیگی میں جس طرح ہر سامع ان کے درمیان بین فرق و امتیاز کر لیتا ہے۔ اسی طرح ض۔ اورظ۔ اور دال میں ممتاز فرق کا ہونا ضروری ہے۔ جو شخص ض کو صحیح ادا کرنے پر قادر ہو اس کو صحیح ادا کرنا ضروری ہے۔ عوام کی طرح کسی حرف کا بدلنا ہر گز جائز نہیں۔ اور جو ایسا کرے گا یقیناً محرف اور مغیر کہلائے گا۔

شرح جزری میں ہے: فلو ابدل ضا د بظاء عامدا ابطلت صلاته علی الاصح۔

(شرح جزری ص ۴۳)

اور جب اس کی نماز ہی باطل ہے تو اس کی اقتدا کیسے صحیح ہو سکتی ہے۔ اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ ض اور ظ میں فرق کرنا نہایت دشوار ہے تو کیا دشوار ہو نیکی بنا پر ان کے ذاتی فرق کو میٹ دیا جائے گا؟ ہر گز نہیں۔ بلکہ علامہ جزری اسے تمیز کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

جزریہ میں ہے:

و الضاد باستطالة و مخرج ميز من الظاء و کلها تجی

شرح جزری ہندی اس شعر کا ترجمہ و شرح اس طرح کرتے ہیں:

اور ضا د معجمہ کو ساتھ صفت استطالت کے اور ساتھ مخرج کے یعنی ضا د استطالت کی صفت میں اور مخرج میں اکیلا ہے اس صفت اور اس مخرج کا کوئی حرف نہیں۔ سو اس ضا د کو ہمیشہ تمیز یعنی فرق کرو اور جدا کرو طامعجمہ سے تاکہ مشابہ ظا کے نہ ہو جاوے۔ (شرح ہندی ص ۳۹)

اسی بنا پر علامہ علی قاری نے اس کی شرح میں فرمایا: ما کان تمیزه عن الظاء مشکلا

بالنسبة الی غیرہ امر الناظم بتمیزه عنه نطقاً۔ (شرح جزری مصری ص ۳۸)

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ ان کے فرق کا دشوار ہونا ہی ان کے درمیان فرق اور تمیز کا سبب بنا اور اس کے لئے خصوصیت سے حکم دیا گیا۔ اورض کو ظ کی مشابہت صوتی سے بچایا گیا۔

عبارت ”ہما متشابہان فی الصوت و السمع“ نہ اس کا کوئی حوالہ دیا نہ قائل کا نام بتایا۔ تو اس پر کیا توجہ کی جائے۔ مع ہذا اس مشابہت سے مراد مشابہت ناقصہ ہے نہ کہ مشابہت تامہ۔ اور قول امام غزالی کا یہ مطلب ہے کہ ان کے درمیان فرق کرنے میں اس کی سعی کی جائے۔ اگر کسی مجبوری یا لغزش لسانی سے فرق نہ ہو سکا تو اس کی صحت نماز کا حکم دیدیا جائے۔

عبارت تفسیر عزیزی کا جواب یہ ہے کہ شاہ صاحب لوگوں کی غلطی بیان فرما رہے ہیں کہ انہوں نے ضا د اور ظا کو یکساں کر لیا ہے اور ان کے ذاتی فرق اور طبعی امتیاز صوت کو میٹ دیا ہے۔ نہ یہ کہ شاہ صاحب ان ہر دو کو یکساں پڑھنے کا حکم دے رہے ہیں اور ان کے شرعی و ذاتی فرق اور طبعی امتیاز صوت کو ملیا میٹ کر رہے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب کی طرف سے ایسے خلاف شرع حکم کیسے نسبت کی جاسکتی ہے۔

عبارت قاضی خاں کا جواب یہ ہے کہ ضالین کو ظ یا ذال سے بدل کر پڑھنے میں تغیر نہیں ہوا اس لئے نماز فاسد نہیں اور ضالین کو د سے پڑھنے میں تغیر معنی لازم آتا ہے اس بنا پر نماز فاسد ہو گئی۔ یہ مطلب ہر گز نہیں کہ ض کو ظ یا ذال تو پڑھ سکتے ہیں اور دال نہیں پڑھ سکتے۔ ورنہ اس سے پہلا مسئلہ غلط ہو جائے گا کہ اس میں غیر المغضوب میں ض کو ظ یا د ہر ایک سے بدلنے پر فساد نماز کا حکم دیا ہے۔ بات وہی ہے کہ جو نکلے اس میں ہر ایک کے بدلنے میں تغیر معنی ہوتا ہے تو فساد نماز کا حکم دیا گیا ہے اور ظا و دال کا ایک ہی حکم ہو گیا۔ بحمدہ تعالیٰ ہر دو سوالات کے مکمل جوابات دیدئے گئے۔ مولیٰ تعالیٰ قبول حق کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

۲۵/ ذی الحجہ ۱۳۷۵ھ

(۲۷۵)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین دامت برکاتہم النوری مسائل حسب ذیل میں کہ

قرآن پاک میں ان آیتوں کو جو آیت پر ختم ہوئے یا وقف وغیرہ ہے کہ وہاں پر نہ ٹھہرنا ہے مگر وہاں پر نہ نہیں جیسے: ایاک نعبد و ایاک نستعین۔ من الحنۃ والناس۔ لکم دینکم ولی دین۔ عذاب عظیم۔ ان اللہ علی کل شئی قدير۔ للناس لعلہم یتفکرون۔ وهو العزيز الحکیم۔ علی مثلہ کہ ان پر مد نہیں ہے۔ مگر ان کو اس طرح پڑھنا کہ مد ہو جائے۔ مثلاً نستعین، حکیم، عذاب عظیم۔ علی کل شئی قدير۔ وغیرہ وغیرہ کہ ان پر مد نہیں ہے اور یہاں پر آیت ختم ہے یا وقف ہے کہ سانس توڑنا ہے، ٹھہرنا ہے، تو ختم آیت پر زیادہ کھینچنا کہ جہاں مد ہو جائے جس طریقہ سے اس آیت میں جہاں پر مد ہوتا ہے تو اس کو زیادہ قریب پانچ الف کے برابر کھینچا جاتا ہے۔ ایسے ہی یہ آیتیں

کہ مد نہیں ہے چونکہ ٹھہرنا ہے یا آیت ختم ہے یا وقف ہے ان کو تین چار الف کے برابر کھینچنا کہ مد ہو جائے جائز ہے یا نہیں۔ اور اسی طرح پڑھنے میں کوئی حرج شرعی ہے یا نہیں۔ نیز اس کی کیا شناخت کیا پہچان ہے۔ کہ یہ تین یا پانچ الف کے برابر مقید پڑھنے پڑھانے کی کیا شناخت و پہچان ہے۔

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

ختم آیت جیسے ایاک نستعین۔ عذاب عظیم۔ لعلہم یتفکرون۔ وغیرہ پر وقف میں مد کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ کہ یہ مد جائز ہے اس مد کو مد متصل و منفصل کی طرح لکھا نہیں جاتا۔ یہ مد و الف یا تین الف کے برابر کھینچا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کو چار یا پانچ الف کی مقدار کھینچنا غلط ہے۔ الف دوزیر سے حاصل ہوتا ہے، جس کی مقدار انگلی کا اٹھانا یا لفظ الف کا کہنا ہے جس کو فن تجوید سے ذوق ہے دو یا تین یا چار الف کے کھینچنے کی مقدار کا صحیح اندازہ کر لیا کرتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: اعمتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۲۷۶)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مسائل مندرجہ ذیل میں
زید کہتا ہے کہ نماز میں ولا الضالین وغیرہ موقعوں پر ضاد پڑھے اور ظاد نہ پڑھے، تو نماز باطل ہو جائے گی اور پڑھنے والا گمراہ ہے، لہذا از روئے شرع یہ بتایا جائے کہ زید کا یہ قول صحیح ہے، یا غلط اور زید کے بارے میں کیا حکم ہے؟

الجواب

اللهم هداية الحق والصواب

زید کا قول غلط و باطل ہے اور اپنی لاعلمی سے اس نے یہ مسئلہ بالکل الٹ دیا ہے۔ شرعی مسئلہ تو یہ ہے کہ جس نے عمداض کو ظ سے بدل دیا تو صحیح مذہب کی بنا پر اس کی نماز باطل ہو جائے گی۔

چنانچہ ملا علی قاری بحر سے ناقل ہے: لو ابدل ضا دبضاء عمدا بطلت صلوٰتہ علی الاصح
(مخ فکریہ مصری ص ۴۳)

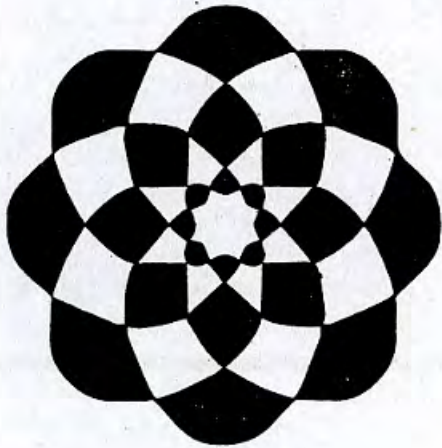
لفساد المعنی۔

بلکہ اس کو عمد ابدلنے والا نہ فقط خاطی بلکہ کافر ہے۔ محیط میں ہے۔ سنل الامام الفضلی عن

یقرأ الظاء المعجمة مكان الضاد المعجمة او علی العکس قال لا تجوز امامته ولو تعدد
یکفر۔ (فقہ اکبر، ۱۵۳)

ان عبارات سے زید کے قول کا غلط و باطل ہونا ظاہر ہو گیا۔ نیز زید کا مخالف تصریحات فقہ و منکر حکم شرع ہونا بھی ثابت ہو گیا واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: اعمتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل



اجمل الکلام فی عدم القراءات خلف الامام

مسئلہ (۲۷۷)

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

جس طرح الحمد پڑھنے والے لوگ امام کے پیچھے اپنے دلائل صریح و صاف حضرت ﷺ کی احادیث کے الفاظ سناتے ہیں اور معتبر معتبر احادیث کی کتابوں کے حوالے مستند علماء یہاں سے دیتے ہیں جن سے یقین کامل ہو جاتا ہے کہ الحمد پڑھنا مقتدی کو ضرور چاہئے بلا پڑھے نماز درست نہ ہوگی مثلاً یہ حدیث پیش کرتے ہیں قال رسول اللہ ﷺ لا صلوة لمن لم یقرأ بفاتہ الكتاب خلف الامام رواہ الترمذی کتاب القراءۃ ص ۴۷ و قال هذا اسناد صحیح (ترجمہ) یعنی فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ نہیں نماز ہوتی اس شخص کی جس نے امام کے پیچھے سورہ الحمد نہیں پڑھی روایت یا اس حدیث کو امام بیہقی نے کتاب القراءات میں اور کہا اس کی صحیح ہے لہذا مذہب حنفیہ میں جو متقدمین کو الحمد پڑھنے کی ممانعت ہے کس قاعدہ اور دلیل کی رو سے ہے امید ہے کہ جواب کافی و روانی ہونا چاہئے ورنہ ان لوگوں کے کہنے اور بتانے سے چند آدمی اس طرف متوجہ ہوئے جات ہیں۔ بینوا تو جروا

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

ہندوستان میں امام کے الحمد پڑھنے والے بالعموم غیر مقلدین ہیں حضرات شافعیہ سے خطاب نہیں کہ وہ تو ایک امام کے مقلد ہیں بلکہ سارا خطاب غیر مقلدین ہی سے ہے ائمہ دین جن کے سینے میں علوم کے بحر موج تھے انہوں نے کیسی کیسی عرق ریزیاں کیں اور تختیں اٹھائیں تو اس مرتبہ کو پہنچے کہ آیت کریمہ اور احادیث شریفہ سے استنباط احکام کر سکیں غیر مقلدین کو آیات و احادیث سے استدلال کرنے کی کیا لیاقت ان بے خبر دان زمانہ کو تو ہنوز غالب و داغ کی ارد و سمجھنے کا سلیقہ بھی نہیں۔ یہ معدن علوم تک کیونکر رسائی کر سکتے ہیں قراءت خلف امام ہی کا مسئلہ لیجئے اس میں جس قدر احادیث وارد ہیں اور جو حکم قرآنی ہے سب پر نظر رکھ کر فیصلہ کرنا آج تک نہ کسی غیر مقلد کو میسر ہوا نہ انشاء اللہ آئندہ اس کے مجبوراً

وہ یہی کرتے ہیں کہ جو حدیث اس کے سامنے پیش کر دی جائے اس کی ماننے ہی میں طرح طرح کے حیلے حوالے نکالیں خواہ وہ مسلم و بخاری ہی کی حدیث یوں نہ ہو اور اپنے آپ بیہقی کی روایت لے آئیں اور اس کو معتبر مانیں مجھ یہاں بیہقی پر جرح مقصود نہیں ہے۔ بلکہ ان کی خود مطلبی اور نفسانیت کا ایک نمونہ پیش کرتا ہے کہ جو شخص اپنے مطلب کے موافق سمجھ کر کسی حدیث کو بیہقی سے اخذ کرتا ہے اور بیہقی کی کتاب کو حدیث کی ایسی معتبر و مستند کتاب مانتا ہے کہ اگر اس کے مخالف کوئی حدیث کسی دوسری کتاب کی پیش کر دی جائے تو اس میں کلام کرنے لگتا ہے یہ ہے غیر مقلدین کی نفسانیت العیاذ باللہ من شرور الانفس۔ بیہقی ہی یہی روایت جس سے سوال میں استنباط کیا غیر مقلدین جو روایت میں مفہوم مخالف کے قائل ہیں وہ اس کو کیا سمجھ کر پیش کر سکتے ہیں فصحاء کے کلام میں زیادہ افادیت سے خالی نہیں ہوتی تو حضور اکرم ﷺ نے فصحاء کو کیا نسبت اب غیر مقلد بتائے کہ جس حدیث کو اپنے مدعی کے لئے دلیل صاف و صریح بنا کر پیش کرتا ہے اس میں یا اتنے ہی الفاظ اس مطلب کے لئے کافی نہ تھے لا صلوة لمن یقرأ بفاتہ الكتاب کیا اس سے متدل کے نزدیک فرضیت قراءت فاتحہ مستفاد نہ ہوتی تھی اور نہیں ہوتی تھی تو کیا لفظ خلف امام افادہ فرضیت کرتا ہے شائد یہ کوئی مسلوب الحواس کہے تو کہے کوئی عقل و ہوش رکھنے والا نہ کہہ سکے گا اور اگر کہیں کہ لا صلوة لمن یقرأ بفاتہ الكتاب سے ہی فرضیت ثابت ہوگئی تو سوال یہ ہے کہ لفظ خلف الامام کس فائدہ کے لئے آیا آیا مطلب ہے کہ امام کے پیچھے پڑھنے والے کی نماز تو بغیر فاتحہ پڑھے نہ ہوگی مگر خود امام اور منفردوں کی نمازیں بغیر فاتحہ کے بھی ہو جاتی ہیں حدیث نقل کر دینا تو اسان مگر ذرا اس سمجھ کو بھی دیکھا یا یہ بات ہے کہ حدیث سمجھے یا نہ سمجھے لیکن مسائل دین میں داخل کر دینا اور ائمہ کی مخالفت کرنا روا ہو گیا پھر یہ بھی بتاؤ کہ لا صلوة لمن لم یقرأ عبقا بفاتحہ الكتاب کا مطلب کیا ہے آیا یہ کہ جس نماز میں امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھی صرف وہی نماز ناجائز ہے جب تو بتاؤ کہ ایسا ہے اور اس چیز کی نفی کرتا ہے اور دلیل خصوص ہی یہ مطلب ہے کہ جس نے کبھی امام کے پیچھے فاتحہ ترک اسی عمر کی کوئی نماز ہی صحیح نہ رہی سب باطل ہو گئیں عمل ہی حبط ہو گئے اگر یہ کہو تو یا تم سے پہلے دنیا میں اور کوئی بھی اس کا قائل ہوا ہے اور پھر جن صحابہ نے امام کے پیچھے قراءۃ نہیں کی ان کی عمر بھر کی نمازیں یا ہوئیں اور پچھلی نمازیں جو تمام شرائط و ادب کے ساتھ ادا کی گئیں تھیں ان کی صحت پہلی پر موقوف تھی یا ترک فاتحہ خلف الامام کفر موجب حبط عمل ہے ہر بات دلیل معتبر سے کہو یہ اور بتا دو کہ لا صلوة میں نفی حقیقت کی ہے یا صفت کی صحت کی ہے یا فضیلت کی بر تقدیر اول ثبوت فرضیت خبر و اد محتمل المراد سے لازم فالازم باطل

فالمرء لوم ثلثہ اور یہی غیر مقلدین کا مذہب ہے جیسا کہ الفاظ مندرجہ استفتاء سے ظاہر ہے اور الحمد پڑھنا مقتدی کو ضرور چاہیے بلا پڑھے نماز درست نہ ہوگی۔

بر تقدیر ثانی فرضیت خلف الامام کس کے گھر سے آئیگی۔ پھر یہ بھی بتاؤ کہ فرضیت قرآنہ خلف الامام میں یہ حدیث مطلق ہے یا مقید خاص ہے یا عام۔ اگر خاص یا مقید ہے تو دلیل تقید و تخصیص کیا ہے؟۔ نیز یہ کہ اس حدیث کی صحت محض بیہقی کی تصحیح سے بطور تقلید شخصی کافی ہے یا اس کی تحقیق کا اور کوئی ذریعہ ہے اور اگر ہے تو یاد دریافت کرنے کی باتیں تو اور بھی بہت ہیں محرمہ دین کی تقلید سے بھاگنے والوں خفی قلعی انھیں دو چار باتوں میں کھل جائیگی اور پتہ چل جائیگا کہ کلام رسول اللہ ﷺ کے سمجھنے کے لئے ائمہ دین کی تقلید ضروری ہے۔ ورنہ حدیث جس کو غیر مقلد صریح کہتا ہے۔ عمر بھر کی غربی میں بھی نہیں سمجھا جاسکے گا جب تک کہ ائمہ دین کی تقلید نہ کرے یا مقلدین سے در یوزہ گری نہ کرے۔ ان سب سے گذر کر میں یہ کہتا ہوں کہ جب کہ قرآن پاک میں رب العزت تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: فاذا قرء القرآن فاستمعوا له وانصتوا یعنی جب قرآن پڑھا جائے تو اس کو سنو اور ساکت رہو۔

یہ آیت خاص اسی مسئلہ قرأت خلف الامام میں نازل ہوئی، تو اس کا عموم ہی حجت ہے۔ ایسی صاف و صریح آیت کو غیر مقلدین کیا حدیث سے منسوخ کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تمہارے نزدیک آیت حدیث سے منسوخ ہو سکتی ہے۔ اور حدیث بھی خبر واحد اور وہ بھی ایسی جس کا مطلب غیر مقلدین کو سمجھنا دشوار۔ اب سنئے کہ اس آیت سے قرأت کہ وقت سکوت کا وجوب صاف طور پر ثابت ہو رہا ہے۔ پہلے تو میں آپ کو اسی بیہقی سے سنواؤں کہ یہ آیت کس معاملہ میں نازل ہوئی۔

امام بیہقی امام احمد سے نقل کرتے ہیں۔ قال اجمع الناس علی ان هذه الآیة فی الصلوٰۃ۔ یعنی امام احمد نے فرمایا کہ لوگوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہ آیت نماز کے باب میں نازل ہوئی۔ پھر انہیں بیہقی کی روایت سنو:

عن مجاهد قال کان علیہ الصلوٰۃ والسلام یقرأ فی الصلوٰۃ فسمع قرآنہ فتی فنزل فاذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا۔

یعنی مجاہد سے مروی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نماز میں قرأت فرماتے تھے تو ایک جوان انصاری کا پڑھنا سننا تو یہ آیت نازل ہوئی، فاذا قرئ القرآن (الآیہ)

ملاحظہ ہو کہ قرآن پاک کی آیت قرأت خلف الامام کے روکنے کیلئے نازل ہو رہی ہے۔

ابن مردویہ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

عن معاویۃ بن قوت قالت سالت بعض اشیا خنا من اصحاب رسول ﷺ احسبه قال عبد اللہ بن مغفل اکل من سمع القرآن وحب علیہ الاستماع والانصات قال انما نزلت هذه الآیة و اذا قرئ القرآن فاستمعوا وانصتوا فی القراءۃ خلف الامام۔

یعنی معاویہ ابن قرہ نے کہا میں نے اصحاب رسول اللہ ﷺ میں سے اپنے بعض بزرگوں سے دریافت کیا، راوی کہتا ہے مجھے خیال ہے کہ معاویہ نے عبد اللہ بن مغفل کا نام لیا، ان سے دریافت کیا کہ ہر کوئی جو قرآن سنے اس پر سننا اور خاموش رہنا واجب ہے۔ فرمایا یہ آیت نازل ہی ہوئی ہے قرأت خلف الامام میں۔

امام ابوالبرکات عبد اللہ بن محمود نسفی اپنی تفسیر مدارک التزیل میں فرماتے ہیں:

جمهور الصحابہ رضی اللہ عنہ عنہم علی انہ فی استماع الموتم۔

یعنی جمہور صحابہ کرام اس پر ہیں کہ یہ آیت مقتدی کے قرأت سننے اور خاموش رہنے کے باب میں نازل ہوئی۔

ابن مردویہ اور بیہقی نے روایت کیا ہے:

عن ابن عباس صلی النبی ﷺ فقراء خلفہ قوم فخلطوا علیہ فنزلت هذه الآیة۔

یعنی ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ حضور انور ﷺ نے نماز پڑھائی قوم نے آپ کے پیچھے قرات کی اس سے آپ پر قرات میں خلط واقع ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

عبد اللہ بن حمید اور ابوراسخ اور بیہقی ابوالعالیہ سے روایت کرتے ہیں۔ ان النبی ﷺ کان اذا صلی باصحابہ قرأ فقرأ من اصحابہ فنزلت۔

یعنی جب حضور انور ﷺ نے اپنے اصحاب کو نماز پڑھائی اور قرات کی تو آپ کے اصحاب نے بھی قرات کی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

الحمد للہ غافل منصف کیلئے مسئلہ تو فیصل ہو گیا کہ جب قرات خلف الامام کی ممانعت میں آیت نازل ہوئی اور آیت نے مقتدی پر خاموش رہنا واجب کیا اور اس پر جمہور صحابہ نے اجماع کیا تو اب مقتدی کیلئے قرات ثابت کرنے کی ہر کوشش بیکار ہے کہ حدیث خبر واحد حکم قرآنی کو ہرگز ہرگز منسوخ نہیں کر سکتی، مقتدی کا امام کے پیچھے خاموش رہنا آیت کریمہ سے ثابت ہو گیا تو اس سے بڑھ کر اور کوئی دلیل

ہوگی جس سے غیر مقلدین کی تسکین ہو سکے۔ ضرورت تو نہیں ہے کہ مسئلہ میں طول کیا جائے مگر غیر مقلدین کے لئے احادیث سے بھی چند صاف و صریح تائیدات پیش کر دیجائیں مولیٰ تعالیٰ انکو ہدایت فرمائے۔

چھ احادیث تو آیت کے ذیل میں مذکور ہوئیں اب مزید اور سنئے۔

حدیث (۷) مسلم شریف میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: **صلیٰ بنارسول اللہ ﷺ صلوٰۃ الظهر او العصر فقال ایکم قزأخلقی بسبح اسم ربک الاعلیٰ فقال رجل: انا ولم اردبها الا الخیر، قال: قد علمت ان بعضکم خالحنیہا۔**

(مسلم شریف مع شرح مطبوعہ مجتہبائی دہلی باب نہی الماموم عن جہر بالقراۃ خلف امامہ

صفحہ ۱۷۲ ج ۱)

یعنی ہم کو نبی ﷺ نے ظہر یا عصر کی نماز پڑھائی، فرمایا تم میں سے کسی نے میرے پیچھے سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھا، ایک شخص نے عرض کیا: میں نے، اور میں نے سوائے خیر کے اور کچھ ارادہ نہیں کیا۔ فرمایا بیشک میں نے جانا کہ تمہارے بعض لوگ مجھ سے اس میں جھگڑا کرتے ہیں یعنی تم امام کے پیچھے قرأت نہ کرو۔

حدیث (۸) اسی مسلم شریف میں ایک طویل حدیث میں یہ الفاظ ہیں: **واذا قرأفانصتوا،**

(مسلم شریف، باب التشہد فی الصلوٰۃ ص ۱۷۲ ج ۱)

یعنی حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

حدیث (۹) ترمذی شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: **ان رسول اللہ ﷺ انصرف من صلوٰۃ جہر فیہا بالقراۃ فقال هل قرأ معی احد منکم انفا؟ فقال رجل: نعم یا رسول اللہ! قال: انی اقول مالی انازع القرآن قال فانتہی الناس عن القراۃ مع رسول اللہ ﷺ فیما یجہر فیہ رسول اللہ ﷺ من الصلوات بالقراۃ حین سمعوا ذلك من رسول اللہ ﷺ۔** (ترمذی شریف مطبوعہ مجیدی کانپور باب ماجاء فی ترک القراۃ خلف الامام ص ۵۰ ج ۱)

یعنی رسول اللہ ﷺ اس نماز سے فارغ ہوئے جس میں قرأت بالجہر پڑھی، فرمایا: کیا میرے ساتھ تم میں سے کسی نے ابھی قرأت کی؟ ایک شخص نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ! فرمایا میں کہتا ہوں مجھے کیا ہوا کہ مجھ سے قرآن میں جھگڑا کیا جاتا ہے، راوی نے کہا کہ لوگ حضور کے ساتھ قرأت کرنے سے

ان نمازوں میں باز رہے جن میں حضور جہر کے ساتھ قرأت فرماتے تھے جب سے یہ بات انہوں نے حضور اقدس ﷺ سے سنی۔

حدیث (۱۰) اسی ترمذی شریف میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: **من صلی رکعۃ لم یقرأ فیہا بام القرآن فلم یصل الا ان یکون وراء الامام۔**

(ترمذی شریف ص ۵ ج ۱)

یعنی جس نے نماز پڑھی اور اس میں سورہ فاتحہ نہیں پڑھی تو اس نے نماز ہی نہیں پڑھی مگر جب امام کے پیچھے ہو۔ کہ اس میں سورہ نہیں پڑھی جاتی۔

حدیث (۱۱) ابوداؤد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا کبر فکبروا واذا قرأفانصتوا۔**

(ابوداؤد شریف ض المطبوعہ مجتہبائی دہلی، باب الامام یصلیٰ من قعود ص ۹۶)

یعنی امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، تو جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

حدیث (۱۲) اسی ابوداؤد شریف میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: **ان رسول اللہ ﷺ خطبنا فعملنا و بین لنا سنتنا و علمنا صلوتنا فقال اذا صلیتم فاقیمو صفوفکم ثم لیؤمکم احدکم فاذا کبر فکبروا واذا قرأفانصتوا۔**

(ابوداؤد شریف ج ۱ ص ۱۳۶ باب التشہد مطبوعہ مذکور)

یعنی نبی کریم ﷺ نے خطبہ پڑھا تو ہمیں سکھایا اور سنت کا بیان کیا اور ہمیں نماز کا طریقہ تعلیم کیا اور فرمایا: جب تم نماز پڑھو تو اپنی صفوں کو سیدھا کرو، پھر تم میں سے ایک امامت کرے، پس جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

حدیث (۱۳) ابوداؤد شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: **ان رسول اللہ ﷺ انصرف من صلوٰۃ جہر فیہا بالقراۃ فقال هل قرأ معی احد منکم انفا فقال رجل: نعم یا رسول اللہ! قال: انی اقول مالی انازع القرآن، قال فانتہی الناس عن القراۃ مع رسول اللہ ﷺ فیما یجہر فیہ النبی ﷺ بالقراۃ من الصلوات حین سمعوا ذلك من رسول اللہ ﷺ۔** (ابوداؤد شریف ض اباب من کرہ القراۃ بفاتحہ الکتاب اذا جہر الامام ص ۱۷۷ ج ۱)

یعنی حضور اقدس ﷺ اس نماز میں جس میں قرات بالجہر پڑھی جاتی ہے، فراغت کی تو فرمایا: کیا ابھی تم میں سے کسی نے میرے ساتھ قرات کی؟ ایک شخص نے عرض کیا: ہاں یا رسول اللہ ﷺ، حضور نے فرمایا: میں کہتا ہوں مجھے کیا ہو کہ میں قرات میں منازعت کیا جاؤں، راوی نے کہا کہ لوگ حضور ﷺ کے ساتھ قرات کرنے سے ان نمازوں میں باز رہے جن میں حضور ﷺ بالجہر قرات کرتے تھے جب سے انہوں نے حضور ﷺ سے یہ سنا۔

حدیث (۱۴) اسی ابوداؤد شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بطریق دیگر مروی: یقول صلی بنا رسول اللہ ﷺ صلوٰۃ نظن انها الصبح بمعناه الى قوله مالی انازع القرآن۔ (ابوداؤد شریف ج ۱ ص ۱۸۰)

یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی، ہمیں خیال ہے کہ وہ صبح کی نماز تھی، اور پھر اوپر کی حدیث کا پورا مضمون یہاں تک بیان کیا کہ مجھے کیا ہو کہ میں قرآن میں منازعت کیا جاؤں۔

حدیث (۱۵) اسی ابوداؤد شریف میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: ان النبی ﷺ الظھر فجاء رجل یقرأ خلفه بسبح اسم ربك الاعلیٰ فلما فرغ قال ایکم قرأ؟ قالوا: رجل، قال: قد عرفت ان بعضکم خالجنیہا۔

(ابوداؤد شریف ج ۱ باب من رأى القرأۃ اذا لم تکھر) یعنی حضور نبی کریم ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی، ایک شخص آیا اور اس نے آپ کے پیچھے ”سبح اسم ربك الاعلیٰ“ پڑھا، حضور ﷺ جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: تم میں سے کس نے قرات کی؟ لوگوں نے عرض کیا: ایک شخص نے، فرمایا میں نے جانا کہ تم میں سے بعض نے مجھ سے قرات میں منازعت کی۔

حدیث (۱۶) اسی ابوداؤد شریف میں انہیں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بطریق دیگر بالفاظ آخر مروی ہے: ان النبی ﷺ صلی بهم الظھر فلما انفتل قال: ایکم قرأ بسبح اسم ربك الاعلیٰ فقال: رجل انا یا رسول اللہ! فقال علمت ان بعضکم خالجنیہا۔

(ابوداؤد شریف باب مذکور) یعنی حضور نبی کریم ﷺ نے لوگوں کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی، تو جب حضور نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: تم میں سے کس نے ”سبح اسم ربك الاعلیٰ“ پڑھا؟ ایک شخص نے عرض کی میں نے، فرمایا: میں

نے جانا تم میں سے بعض نے مجھ سے قرات میں منازعت کی۔

حدیث (۱۷) ابن ماجہ شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: قال رسول اللہ ﷺ: انما جعل الامام لیؤتم به فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا، واذا قال غیر المغضوب علیہم ولا الضالین فقولوا آمین الحدیث۔

(ابن ماجہ مطبوعہ نظامی دہلی ص ۶۱ باب اذا قرأ الامام فانصتوا)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، تو جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرات کرے تو تم خاموش رہو اور جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔

حدیث (۱۸) ابن ماجہ میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: قال رسول اللہ ﷺ اذا قرأ الامام فانصتوا فاذا عند القعدة فلیکن اول ذکر احدکم التشہد۔ (ابن ماجہ ص ۱۸۰)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب امام قرات کرے تو تم خاموش رہو اور جب وہ قعدہ میں پہنچے تو تمہارا پہلا ذکر تشہد ہے۔

حدیث (۱۹) اسی ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: صلی النبی ﷺ باصحابہ صلوٰۃ اظن انها الصبح فقال هل قرأ منکم من احد؟ قال رجل: انا، قال انی اقول مالی انازع القرآن۔ (ابن ماجہ ص ۱۸۰)

یعنی نبی کریم ﷺ نے اپنے اصحاب کو نماز پڑھائی، میں گمان کرتا ہوں کہ وہ صبح کی نماز تھی، فرمایا: کیا تم میں سے کسی نے قرات کی؟ ایک شخص نے عرض کی: میں نے، فرمایا: میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہو کہ میں قرآن میں منازعت کیا جاؤں۔

حدیث (۲۰) اسی ابن ماجہ میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: قال رسول اللہ ﷺ: من کان له امام فقرأ الامام له قرأۃ۔ (ابن ماجہ ص ۱۸۰)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کا امام ہو تو امام کا قرات کرنا اس کا قرات کرنا ہے۔ حدیث (۲۱) نسائی شریف میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: صلی النبی ﷺ الظھر فقرأ رجل خلفه بسبح اسم ربك الاعلیٰ، قال رجل: انا، قال قد علمت ان

بعضکم قد خالجنیہا۔

(نسائی ج ۱ مطبوعہ انصاری دہلی ص ۹۳ باب ترک القراءۃ خلف الامام فیما لم تکبر فیہ)
یعنی نبی کریم ﷺ نے نماز ظہر پڑھائی تو حضور کے پیچھے ایک شخص نے سج اسم ربک الاعلیٰ پڑھا، حضور نے بعد نماز فرمایا: کس نے سج اسم ربک الاعلیٰ پڑھا؟ ایک شخص نے عرض کیا: میں نے، فرمایا: میں نے جانا کہ تمہارے بعض نے مجھ سے قرأت میں منازعت کی۔

حدیث (۲۲) اسی نسائی شریف میں انہیں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بطریق دیگر بالفاظ آخر مروی ہے، ان النبی ﷺ صلی صلوٰۃ الظهر او العصر ورجل یقرأ خلفہ فلما انصرف قال ایکم قرأ سبح اسم ربک الاعلیٰ؟ قال رجل من القوم انا، ولم اردھا الا الخیر فقال النبی ﷺ قد عرفت ان بعضکم قد خالجنیہا۔

(نسائی شریف ص و باب مذکور)

یعنی حضور نبی کریم ﷺ نے نماز ظہر یا نماز عصر پڑھائی اور حضور ﷺ کے پیچھے ایک شخص نے قرأت کی، تو جب حضور ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: تم میں سے کس نے سج اسم ربک الاعلیٰ پڑھا؟ قوم میں سے ایک شخص نے کہا: میں نے، اور میں نے سوائے بھلائی کے اور کچھ ارادہ نہیں کیا، حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں نے جانا کہ تمہارے بعض نے مجھ سے قرأت میں منازعت کی۔

حدیث (۲۳) اسی نسائی شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، ان رسول اللہ ﷺ انصرف من صلوٰۃ جہر فیہا بالقراءۃ فقال هل قرأ معی احد منکم انفا، قال رجل نعم یا رسول اللہ! قال انی اقول مالی انزع القرآن،

(نسائی ص مذکور)

یعنی رسول اللہ ﷺ اس نماز سے فارغ ہوئے جس میں جہری قرأت پڑھی جاتی ہے، فرمایا: کیا تم میں سے کسی نے میرے ساتھ ابھی قرأت کی؟ ایک شخص نے عرض کی: ہاں یا رسول اللہ میں نے، فرمایا: میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہوا کہ میں قرآن میں منازعت کیا جاؤں۔

حدیث (۲۴) اسی نسائی شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: قال رسول اللہ ﷺ: انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا واذا قال سمع اللہ لمن حمدہ فقولوا اللہم ربنا لک الحمد۔

(نسائی شریف ص مذکور باب تاویل قوله عز وجل

واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے، پس جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم اللہم ربنا لک الحمد کہو۔

حدیث (۲۵) اسی نسائی شریف میں انہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بالفاظ دیگر مروی ہے: قال رسول اللہ ﷺ انما الامام لیؤتم بہ فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا۔

(نسائی صفحہ و باب مذکور)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امام اس لئے ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے۔ پس جب امام تکبیر کہے۔ تو تم بھی تکبیر کہو۔ اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

حدیث (۲۶) اسی نسائی میں حضرت ابو داؤد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ وہ کہتے ہیں۔ سئل رسول اللہ ﷺ فی کل صلوٰۃ قراءۃ قال: نعم، قال رجل من الانصار وجبت ہذہ فالتفت الی و کنت اقرب القوم منه فقال ما اری الامام اذا ام القوم الا وقد کفاهم۔

(نسائی شریف صفحہ مذکور باب اکتفاء المأموم بقراءۃ الامام)

یعنی رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا۔ کیا ہر نماز میں قرأت ہے۔ فرمایا: ہاں۔ انصار میں سے ایک شخص نے عرض کیا۔ کہ یہ قراءۃ واجب ہوئی۔ تو میری طرف توجہ فرمائی اور میں قوم میں حضور سے زیادہ نزدیک تھا۔ فرمایا میں یہی جانتا ہوں۔ کہ جب امام قوم کی امامت کرتا ہے۔ تو ان کے لئے وہی کافی ہے۔

حدیث (۲۷) موطا امام مالک میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ من صلی رکعۃ لم یقرأ فیہا بام القرآن فلم یصل الا وراء الامام۔

(موطا امام مالک مطبوعہ نظامی دہلی صفحہ ۲۱ باب ماجاء فی ام القرآن)

یعنی جس نے ایک رکعت نماز پڑھی۔ اور اس میں سورہ فاتحہ نہیں پڑھی۔ تو اس نے نماز ہی نہیں پڑھی مگر امام کے پیچھے۔

حدیث (۲۸) اسی موطا امام مالک میں ہے۔ ان عبد اللہ بن عمر کان اذا سئل هل یقرأ

أحد خلف الإمام قال إذا صلى أحدكم خلف الإمام فحسبه قراءة الإمام وإذا صلى وحده فليقرأ قال كان عبد الله بن عمر لا يقرأ خلاف الإمام۔

(موطا امام مالک باب ترک القراءة خلف الإمام فيما يجزئ ۲۲)

یعنی حضرت عبد اللہ بن عمر سے جب سوال کیا جاتا کہ کیا کوئی شخص امام کے پیچھے قرات کرے تو فرماتے جب تمہارا کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے۔ تو اسے امام کا قرات کرنا کافی ہے اور جب تمہارا نماز پڑھے تو قرات کرے۔ راوی نے کہا کہ حضرت عبد اللہ بن عمر امام کے پیچھے قرات نہیں کرتے تھے۔

حدیث (۲۹) اسی موطا امام مالک میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ ان رسول اللہ ﷺ انصرف من صلوٰۃ جهر فيها بالقراءة فقال هل قراء معي منكم احد انفا فقال رجل نعم انا يا رسول الله فقال رسول الله ﷺ اني اقول سالي انازع القرآن فانتهي الناس عن القراءة حين سمعوا ذلك من رسول الله ﷺ۔

(موطا امام مالک باب وصف مذکور)

یعنی رسول اللہ ﷺ اس نماز سے فارغ ہوئے جس میں قرات بالجہر پڑھی جاتی تھی۔ فرمایا کیا تم میں کسی نے میرے ساتھ ابھی قرات کی۔ ایک شخص نے عرض کیا: ہاں یا رسول اللہ ﷺ! تو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہو کہ میں قرآن میں منازعت کروں۔ راوی نے کہا کہ لوگ حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ قرات کرنے سے ان نمازوں میں باز رہے جن میں حضور بالجہر قرات کرتے جب سے انہوں نے یہ رسول اللہ ﷺ سے سنا۔

حدیث (۳۰) جامع مسانید امام اعظم میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ ان رسول اللہ ﷺ قال من كان له امام فقراءة الإمام له قراءة۔

(جامع مسانید امام اعظم مطبوعہ مجلس دائرة المعارف حیدرآباد صفحہ ۳۳۱ جلد اول)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کا امام ہو تو امام کا قرات کرنا اس کا قرات کرنا ہے۔

یہ حدیث بکثرت طرق مروی ہے۔

حدیث (۳۱) اسی جامع مسانید امام اعظم میں انہیں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بالفاظ دیگر مروی ہے۔ ان رجلا قرأ خلف النبي ﷺ في الظهر او في العصر او مي اليه رجل منها فلما انصرف قال: اتنهاني ان اقرا خلف رسول الله ﷺ فتذاكرا ذلك حتى سمع النبي ﷺ فقال

رسول الله ﷺ: من صلى خلف الإمام فقراءة الإمام له قراءة۔

(جامع مسانید امام اعظم صفحہ نمبر ۳۳۲ رج اول)

یعنی ایک شخص نے نبی ﷺ کے پیچھے نماز ظہر یا عصر میں قرات کی اس کو ایک شخص نے اشارہ سے منع کیا۔ تو جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو کہنے لگا کیا تو مجھ کو رسول اللہ ﷺ کے پیچھے قرات کرنے سے منع کرتا ہے یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ نے ان دونوں کی یہ گفتگو سنی تو حضور نے فرمایا جس نے امام کے پیچھے نماز پڑھی تو امام کا قرات کرنا اس کا قرات کرنا ہے۔

یہ حدیث بھی بطرق کثیرہ مروی ہے۔

حدیث (۳۲) اسی جامع مسانید امام اعظم میں انہیں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بالفاظ دیگر مروی ہے: قال: صلى رسول الله ﷺ بالناس فقرا رجل خلفه فلما قضى الصلوٰۃ قال ايكم قرأ خلفي ثلاث مرات فقال رجل انا يا رسول الله فقال من من صلى خلف الإمام فان قرأ الإمام له قراءة۔ (جامع مسانید امام اعظم ص ۳۳۷ ج ۱)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو نماز پڑھائی، ایک شخص نے آپ کے پیچھے قرات کی، جب حضور ﷺ نے نماز پوری فرمائی تو فرمایا: تم میں میرے پیچھے کس نے قرات کی؟ یہ تین مرتبہ فرمایا، تو ایک شخص نے عرض کی: یا رسول اللہ میں نے قرات کی، تو حضور ﷺ نے فرمایا: جو امام کے پیچھے نماز پڑھے تو بیشک امام کا قرات کرنا اسی کا قرات کرنا ہے۔ یہ بھی چند طرق سے مروی ہے۔

حدیث (۳۳) اسی جامع مسانید امام اعظم میں انہیں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بالفاظ دیگر مروی ہے: انصرف النبي ﷺ من صلاة الظهر والعصر فقال من قرأ منكم سبح اسم ربك الاعلى فسكت القوم حتى سأل عن ذلك مرارا فقال رجل من القوم انا يا رسول الله فقال: رأيتك تناز عني او تخالجنى القرآن۔ (جامع مسانید امام اعظم ص ۳۳۸ ج ۱)

یعنی حضور نبی کریم ﷺ نماز ظہر یا نماز عصر سے فارغ ہوئے تو فرمایا: تم میں سے کسی نے سبح اسم ربك الاعلى پڑھا، تو سب لوگ ساکت رہے یہاں تک کہ حضور ﷺ نے یہ بار بار دریافت فرمایا، تو قوم میں سے ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے پڑھا، حضور سید عالم ﷺ نے فرمایا: میں نے تجھے جانا کہ تو مجھ سے قرآن میں منازعت کرتا ہے۔

اس حدیث کے بھی چند طریق بیان کئے گئے ہیں۔

حدیث (۳۲) اسی جامع مسانید امام اعظم میں ہے: ان عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہم یقرأ خلف الامام لا فی الر کعتین الاولین ولا فی غھرہما۔

(جامع مسانید امام اعظم ص ۳۱۰ ج ۱)

یعنی حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ امام کے پیچھے قرأت نہ کرتے، نہ پہلی دونوں رکعتوں میں اور نہ ان کے غیر میں۔

حدیث (۳۵) اسی جامع مسانید امام اعظم میں ہے: لا یقرأ علقمۃ خلف الامام حرفالا فیما یجھر فیہ ولا فیما لا یجھر فیہ ولا یقرأ فی الاولین بام الكتاب ولا غیر ہا خلف الامام ولا اصحاب عبد اللہ جمیعا۔

(جامع مسانید امام اعظم ص ۳۱۰ ج ۱)

یعنی حضرت علقمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ امام کے پیچھے کوئی حرف نہیں پڑھتے تھے، نہ ان نمازوں میں جن میں قرأت بالجہر پڑھی جاتی ہے اور نہ ان نمازوں میں جن میں بالجہر نہیں پڑھی جاتی، اور انہوں نے امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ آخر کی دو رکعتوں میں ہڑھی اور نہ ان کے حیر میں اور نہ اصحاب عبد اللہ نے۔

حدیث (۳۶) مسند امام احمد میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: ان رسول اللہ ﷺ قال: من كان له امام فقرأه الامام له قراءة۔

یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کا امام ہو تو امام کا قرأت کرنا اس کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (۳۷) مسند امام احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: صلی رسول اللہ ﷺ باصحابہ صلوٰۃ اظن انها الصبح فقال هل قرأ منكم من احد؟ قال رجل: انا، قال: انی اقول مالی انازع القرآن۔

یعنی رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب کے ساتھ ایک نماز پڑھی، مجھے خیال ہے کہ وہ نماز صبح تھی، فرمایا: کیا تم میں سے کسی نے قرأت کی؟ ایک شخص نے عرض کیا: میں نے، فرمایا: میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہوا کہ میں قرآن میں منازعت کیا جاؤں۔

حدیث (۳۸) مسند امام احمد میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: لا صلوٰۃ الا بقراءة فاتحة الكتاب فی كل ركعة الا وراء الامام۔

یعنی نماز کی ہر بغیر سورۃ فاتحہ پڑھے کامل نہیں ہوتی مگر جب امام کے پیچھے ہو۔

حدیث (۳۹) دارقطنی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے: ان رسول اللہ ﷺ قال: من كان له امام فقرأه الامام له قراءة۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کا امام ہو تو امام کا قرأت کرنا اس کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (۴۰) اسی دارقطنی میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے: قال رسول اللہ ﷺ: يكفيك قراءة الامام خافتا وجہرا۔ یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تجھے امام کی قرأت کافی ہے، سری ہو یا جہری۔

حدیث (۴۱) اسی دارقطنی میں حضرت مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں: من قرأ خلف الامام فقد اخطأ الفطرة۔

یعنی جس نے امام کے پیچھے قرأت کی تو اس نے فطرت سے خطا کی۔

حدیث (۴۲) اسی دارقطنی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا کبر فکبروا واذا قرأ فانصتوا۔

یعنی امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، پس جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

حدیث (۴۳) اسی دارقطنی میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: كان النبی ﷺ یصلی بالناس ورجل یقرأ خلفه فلما فرغ قال من ذا الذی یخالجنی سورة کذا فنہام عن القراءة۔

یعنی حضور نبی کریم ﷺ لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے، ایک شخص نے حضور کے پیچھے قرأت کی جب حضور ﷺ فارغ ہوئے تو فرمایا: کون ہے جس نے فلاں سورت کے ساتھ مجھ سے منازعت کی تو حضور ﷺ نے انہیں امام کے پیچھے قرأت کرنے سے منع فرمادیا۔

حدیث (۴۴) اسی دارقطنی میں حضرت مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: قال رجل: اقرأ خلف الامام او انصت؟ قال بل انصت فانه یکفیک۔

یعنی ایک شخص نے حضور حضور نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: میں امام کے پیچھے قرأت کروں یا خاموش رہوں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: بلکہ خاموش رہو کہ تجھے یہی کافی ہے۔

حدیث (۴۵) اسی دارقطنی میں حضرت شعبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: ان السببی عَلَيْهِ السَّلَامُ قال: لا قراءة خلف الامام - یعنی حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: امام کے پیچھے قرات نہیں۔

حدیث (۴۶) طبرانی نے اپنی معجم اوسط میں حضرت ابوسعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی: قال رسول الله ﷺ: من كان له امام فقرأه الامام له قراءة - یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس کا امام ہو تو امام کا قرات کرنا اس کا قرات کرنا ہے۔

حدیث (۴۷) صحاح ستہ کے ائمہ سے امام بخاری، امام مسلم، امام ابو داؤد اور امام ابن ماجہ ان سب کے استاذ حضرت ابوبکر ابن ابی شیبہ اپنی مصنف میں حضرت علقمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ: ان عبد الله بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کان لا يقرأ خلف الامام فيما يجهر ولا فيما يخافت فيه واذا صلى وحده قرأ في الاولين بفاتحة الكتاب وسورة ولم يقرأ في الاخرين سورة۔

یعنی حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ امام کے پیچھے قرات نہیں کرتے تھے، نہ ان نمازوں میں جن میں جہر کیا جاتا ہے اور ان نمازوں میں جن میں آہستہ پڑھا جاتا ہے، اور جب تنہا پڑھتے تو پہلی دو رکعتوں میں فاتحہ پڑھتے اور ساتھ میں سورت بھی، اور پچھلی دونوں رکعتوں میں کوئی سورت نہیں ملائے۔

حدیث (۴۸) اسی مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: من كان له امام فقرأه له قراءة - یعنی جس شخص کے لئے امام ہو تو اس امام کا قرات کرنا اسی کا قرات کرنا ہے۔

حدیث (۴۹) اسی مصنف ابن ابی شیبہ میں انہیں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ: قال لا يقرأ خلف الامام - یعنی حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کہ امام کے پیچھے قرات نہ کرے۔

حدیث (۵۰) اسی مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم سے مروی ہے: قال من قرأ خلف الامام فقد اخطأ الفطرة - یعنی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: جس نے امام کے پیچھے قرات کی تو اس نے فطرت سے خطا کی۔

حدیث (۵۱) اسی میں ابو داؤد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: جاء رجل الى عبد الله

فقال اقرأ خلف الامام فقال: ان في الصلوة شغلا وسيكفيك قراءة الامام - یعنی ایک شخص حضرت عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: کہ امام کے پیچھے قرات کروں؟ تو فرمایا: نماز میں یہ ایک شغل ہے اور تجھے امام کا قرات کرنا کافی ہے۔

حدیث (۵۲) مؤطا امام محمد میں وہب بن کیسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ: انه سمع جابر بن عبد الله رضی اللہ تعالیٰ عنہ يقول: من صلي ركعة لم يقرأ فيها بام القرآن فلم يصل الا وراء الامام - (مؤطا امام محمد مصطفائی باب القراءة في الصلوة خلف الامام ص ۹۳)

یعنی وہب نے حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سنا، وہ فرماتے ہیں: کہ جس نے ایک رکعت پڑھی اور اس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی تو اس نے نماز ہی نہ پڑھی مگر جب امام کے پیچھے ہو۔

حدیث (۵۳) اسی مؤطا امام محمد میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ: قال رسول الله ﷺ: من صلى خلف الامام فان قرأه الامام له قراءة -

(مؤطا امام محمد باب مذکور ص ۹۶) یعنی حضور انور ﷺ نے فرمایا: کہ جس نے امام کے پیچھے نماز پڑھی تو بیشک امام کا قرات کرنا اسی کا قرات کرنا ہے۔

حدیث (۵۴) اسی مؤطا امام محمد میں ہے: عن وائل قال سئل عبد الله بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن القراءة خلف الامام، قال انصت فان في الصلوة شغلا وسيكفيك ذلك الامام - (مؤطا امام محمد باب مذکور ص ۹۶)

یعنی حضرت وائل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے قرات خلف الامام کا مسئلہ دریافت کیا گیا تو فرمایا خاموش رہو یعنی امام کے پیچھے قرات نہ کرو، بیشک نماز میں یہ ایک شغل ہے اور امام کا قرات کرنا تیرے لئے کافی ہے۔

حدیث (۵۵) اسی مؤطا امام محمد میں ہے: ان عبد الله بن مسعود كان لا يقرأ خلف الامام في ما يجهر فيه لا في الاولين ولا في الاخرين -

(مؤطا امام محمد باب مذکور ص ۹۶) یعنی عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ امام کے پیچھے قرات نہ کرتے تھے، نہ جہری نماز میں نہ سری نماز میں نہ پہلی دو رکعتیں میں نہ پچھلی دو رکعت میں۔

حدیث (۵۶) اسی موطا امام محمد میں ہے: عن نافع عن ابن عمر قال: اذا صلى احدكم خلف الامام فحسبه قراءة الامام واذا صلى وحده فليقرأ قال: وكان عبد الله بن عمر لا يقرأ خلف الامام۔ (موطا امام محمد باب مذکور ص ۹۳)

یعنی حضرت نافع سے مروی کہ حضرت عبد اللہ بن عمر نے فرمایا کہ جب تمہارا کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو اسے امام کا قرأت کا کرنا کافی ہے۔ اور جب تنہا نماز پڑھے تو قرأت کرے۔ راوی نے کہا کہ عبد اللہ بن عمر امام کے پیچھے قرأت نہیں کرتے تھے۔

حدیث (۵۷) اسی موطا امام محمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے: ان رسول اللہ ﷺ انصرف من صلوٰۃ جهر فيها بالقراءة فقال هل قرأ معي منكم من احد فقال رجل اننا يا رسول الله اقال فقال اني اقول مالي انازع القرآن فانتهي الناس عن القراءة مع رسول الله ﷺ فيما جهر به من الصلوٰۃ حين سمعوا ذلك۔

(موطا امام محمد مصطفائی باب القراءة في الصلوٰۃ خلف الامام ص ۹۳)

یعنی رسول اللہ ﷺ اس نماز سے فارغ ہوئے جس میں قرأت بالجہر ہوتی ہے، فرمایا: کیا تم میں سے کسی نے میرے ساتھ قرأت کی؟ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ میں نے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں: کہ حضور نے فرمایا: میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہوا کہ میں قرآن میں منازعت کیا جاؤں، تو لوگ حضور ﷺ کے ساتھ جہری نمازوں میں قرأت سے باز رہے جب سے انہوں نے یہ سنا۔

حدیث (۵۸) اسی موطا امام محمد میں نافع سے مروی ہے: ان ابن عمر كان اذا سئل هل يقرأ احد مع الامام قال اذا صلى احدكم مع الامام فحسبه قراءة الامام وكان ابن عمر لا يقرأ مع الامام۔ (موطا امام محمد باب مذکور ص ۹۳)

یعنی جب حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے دریافت کیا گیا کہ کیا کوئی امام کے ساتھ قرأت کرے تو فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص امام کے ساتھ نماز پڑھے تو اس کو امام کا قرأت کرنا کافی ہے اور ابن عمر امام کے ساتھ قرأت نہیں کرتے تھے۔

حدیث (۵۹) اسی موطا امام محمد میں ہے: عن ابن عمر قال: من صلى خلف الامام كفته قرأته۔ (موطا امام محمد باب مذکور ص ۹۳)

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں جس نے امام کے پیچھے نماز

پڑھی تو اسے امام کی قرأت کافی ہے۔

حدیث (۶۰) اسی موطا امام محمد میں ہے: عن ابن عمر رضي الله تعالى عنهما انه سئل عن القراءة خلف الامام قال تكفيك قراءة الامام۔ (موطا امام محمد باب مذکور ص ۹۳)

انہیں ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ ان سے قرأت خلف الامام کا مسئلہ پوچھا گیا تو فرمایا: تجھ کو امام کی قرأت کافی ہوگی۔

حدیث (۶۱) اسی موطا امام محمد میں ہے: عن ابن مسعود رضي الله تعالى عنه قال انصت للقرأة فان في الصلوٰۃ شغلا وسيكفيك الامام۔ (موطا امام محمد باب مذکور ص ۹۸)

یعنی حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں: تو قرأت کے لئے خاموش ہو، بیشک نماز میں ایک شغل اور تجھے امام کافی ہے۔

حدیث (۶۲) اسی موطا امام محمد میں حضرت عبد اللہ بن شداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا: ام رسول اللہ فی العصر قال فقرأ رجل خلفه فغمزه الذي يليه فلما صلى قال لم غمزني؟ قال: كان رسول الله ﷺ قد امك فكرهت ان تقرأ خلفه فسمع النبي ﷺ فقال: من كان له امام فان قرأته له قراءة۔ (موطا امام محمد باب مذکور ص ۹۸)

یعنی رسول اللہ ﷺ نے نماز عصر میں امامت فرمائی، راوی نے کہا کہ ایک شخص نے حضور ﷺ کے پیچھے قرأت کی تو اس کے پڑوسی نے اس کو اشارہ سے روکا تو جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو اس نے پڑوسی سے کہا کہ تو نے مجھے اشارہ سے کیوں روکا تو اس نے جواب دیا کہ حضور ﷺ تیرے آگے تھے تو میں نے تیری حضور کے پیچھے قرأت کو مکروہ جانا، تو اس کو نبی ﷺ نے سنا اور فرمایا: جس کے لئے امام ہو تو بیشک اس امام کا قرأت کرنا اسی کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (۶۳) اسی موطا امام محمد میں ہے: عن علقمة بن قيس قال: لان اعرض على حمرة احب الي من ان اقرأ خلف الامام۔ (موطا امام محمد باب مذکور ص ۹۸)

یعنی حضرت علقمة بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: مجھے آگ کی چنگاری کو منہ میں لینا امام کے پیچھے قرأت کرنے سے زیادہ پسند ہے۔

حدیث (۶۴) اسی موطا امام محمد میں ہے: عن ابراهيم رضي الله تعالى عنه قال: ان اول من قرأ خلف الامام رجل اتهم۔ (موطا امام محمد ص ۹۸)

یعنی حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: امام کے پیچھے سب سے پہلے جس نے قرأت کی وہ متہم شخص تھا۔

حدیث (۶۵) اسی مؤطا امام محمد میں ہے: ان سعدا قال: ووددت ان الذی یقرأ خلف الإمام فی فیہ جمرۃ۔ (موطا امام محمد ص ۹۸)

یعنی حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں پسند کرتا ہوں کہ جو امام کے پیچھے قرأت کرے اس کے منہ میں چنگاری ہو۔

حدیث (۶۶) اسی مؤطا امام محمد میں ہے: ان عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: لیت فی فم الذی یقرأ خلف الإمام حجرا۔ (موطا امام محمد ص ۹۸)

یعنی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کاش کہ امام کے پیچھے پڑھنے والے کے منہ میں پتھر ہوتا۔

حدیث (۶۷) اسی مؤطا امام محمد میں ہے: ان زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: من قرأ خلف الإمام فلا صلوٰۃ لہ۔ (موطا امام محمد ص ۱۰۰)

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: جس نے امام کے پیچھے قرأت کی تو اس کی نماز نہیں۔

حدیث (۶۸) شرح معانی الآثار معروف طحاوی میں ہے: عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: ان رسول اللہ ﷺ انصرف من صلوٰۃ جهر فیہا بالقرآۃ فقال هل قرأ منکم معی احد انفا؟ فقال رجل نعم یا رسول اللہ! فقال رسول اللہ ﷺ: انی اقول مالی انازع القرآن، قال فانتہی الناس عن القرآۃ مع رسول اللہ ﷺ فیما جهر فیہ رسول اللہ ﷺ بالقرآۃ من الصلوات حین سمعوا ذلك منہ۔ (طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۲۸ باب القرآۃ خلف الامام)

یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس نماز سے فارغ ہوئے جس میں قرأت بالجہر ہوتی ہے فرمایا: کیا تم میں سے ابھی میرے ساتھ کسی نے قرأت کی؟ ایک شخص نے عرض کیا: ہاں یا رسول اللہ! تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہوا کہ میں قرآن میں منازعت کیا جاؤں، راوی نے کہا کہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قرأت کرنے سے ان نمازوں میں باز رہے جن میں رسول اللہ ﷺ قرأت بالجہر فرماتے تھے جب سے لوگوں نے حضور ﷺ سے یہ سنا۔

حدیث (۶۹) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا قرأ فانصتوا۔

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۲۸ باب القرآۃ خلف الامام)

یعنی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: امام اس لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقراد کی جائے تو جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

حدیث (۷۰) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: کانوا یقرؤن خلف النبی ﷺ فقال خلطتم علی القرآۃ۔

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۲۸ باب القرآۃ خلف الامام)

یعنی حضرت عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کہ لوگ حضور نبی کریم ﷺ کے پیچھے قرأت کرتے تھے تو حضور ﷺ نے فرمایا: تم نے مجھ پر قرأت خلط کر دی۔

حدیث (۷۱) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: ان النبی ﷺ قال: من کان لہ امام فقرآۃ الامام لہ قرآۃ۔

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۲۸ باب القرآۃ خلف الامام)

یعنی حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس شخص کا امام ہو تو امام کا قرأت کرنا اسی کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (۷۲) اسی طحاوی شریف میں ہے: حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے انہیں الفاظ اور مضمون کے ساتھ مروی ہے۔ (طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۲۸ باب القرآۃ خلف الامام)

حدیث (۷۳) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: ان النبی ﷺ قال: من صلی رکعۃ فلم یقرأ فیہا بام القرآن فلم یصل الا وراء الامام۔

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۲۸ باب القرآۃ خلف الامام)

یعنی حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے ایک رکعت پڑھی اور اس میں سورہ فاتحہ نہ پڑھی تو اس نے نماز ہی نہ پڑھی مگر امام کے پیچھے۔

حدیث (۷۴) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: صلی رسول اللہ ﷺ ثم اقبل بوجہہ فقال: اتقرؤن والامام یقرأ فسألکم ثلاثا فقالوا انا

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۱۲۸ باب القراءۃ خلف الامام)

لنفع قال فلا تفعلوا۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی پھر لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا: کیا تم لوگ قراءت کرتے ہو اور امام بھی قراءت کر رہا ہے تو لوگ چپ رہے یہاں تک کہ حضور ﷺ نے ان سے تین مرتبہ سوال کیا تو بولے بیشک ہم نے قراءت کی، حضور ﷺ نے فرمایا: تم قراءت نہ کرو۔

حدیث (۷۵) اسی طحاوی شریف میں ہے: قال علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ: من قرأ خلف الامام فليس على الفطرة۔ (طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۱۲۸ باب القراءۃ خلف الامام) یعنی حضرت مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: جس شخص نے امام کے پیچھے قراءت کی تو وہ فطرت پر نہیں۔

حدیث (۷۶) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن عبد الله بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: انصت للقرأة فاب في الصلوة شغلا وسيكفيك ذلك الامام۔

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۱۲۸ باب القراءۃ خلف الامام) یعنی حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: خاموش رہو یعنی امام کے پیچھے قراءت نہ کرو بیشک نماز میں یہ ایک شغل ہے اور امام تجھے کافی ہے۔

حدیث (۷۷) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: ليت الذي يقرأ خلف الامام ملئ فوه ترابا۔

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۱۲۹ باب القراءۃ خلف الامام)

یعنی حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کاش کہ جو شخص امام کے پیچھے قراءت کرے اس کا منہ خاک سے بھر دیا جائے۔

حدیث (۷۸) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن عبيد الله رضی اللہ تعالیٰ عنہ انه سأل عبد الله بن عمرو بن ثابت وجابر بن عبد الله رضی اللہ تعالیٰ عنہم فقالوا: لا تقرأ خلف الامام في شي من الصلوات۔

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۱۲۹ باب القراءۃ خلف الامام)

یعنی حضرت عبید اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مع عبد اللہ بن عمرو بن ثابت وجابر بن عبد اللہ رضی اللہ

تعالیٰ کھم سے قراءت خلف الامام کا مسئلہ دریافت کیا تو ان ہر سہ حضرات نے جواب دیا کہ نمازوں میں سے کسی نماز میں امام کے پیچھے قراءت نہ کرو۔

حدیث (۷۹) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن ابی حمزة رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: قلت لابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اقرأ والامام بين يدي فقال: لا۔

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۱۲۹ باب القراءۃ خلف الامام)

یعنی حضرت ابو حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے عرض کیا: کہ میں نماز میں قراءت کر سکتا ہوں اور امام آگے موجود ہو تو فرمایا: نہیں۔

حدیث (۸۰) اسی طحاوی شریف میں ہے: عن نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: ان عبد الله بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما كان اذا سئل هل يقرأ احد خلف الامام يقول: اذا صلى احدكم خلف الامام فحسبه قراءة الامام وكان عبد الله بن عمر لا يقرأ خلف الامام۔

(طحاوی مطبوعہ لاہور ص ۱۲۹ باب القراءۃ خلف الامام)

یعنی جب حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے دریافت کیا جاتا کہ کیا امام کے پیچھے کوئی قراءت کرے تو فرماتے جب تمہارا کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کا قراءت کرنا کافی ہے، اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما امام کے پیچھے قراءت نہیں کرتے تھے۔

حدیث (۸۱) سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن ابی موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: ان رسول الله ﷺ كان يعلمنا اذا صلى بنا فقال: انما جعل الامام ليؤتم به فاذا كبر فكبروا واذا قرأ فانصتوا۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص ۱۵۶ ج ۲)

باب من قال يترك المأموم القراءة فيما جهر فيها الامام بالقراءة)

یعنی حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: کہ رسول اللہ ﷺ جب ہمیں نماز پڑھاتے تو ہمیں تعلیم کرتے اور فرماتے کہ امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، تو جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو۔

حدیث (۸۲) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن ابی هريرة رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: ان النبي ﷺ قال: انما جعل الامام ليؤتم به فلا تختلفوا عليه فاذا كبر فكبروا واذا قرأ فا

نصتوا واذا قال غیر المغمضوب علیہم ولا الضالین فقولوا آمین۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص ۱۵۶)

ج ۲ باب من قال یتک الماموم القراءۃ فیما جہر فیہا الامام بالقراءۃ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے تو تم امام سے اختلاف نہ کرو، اور جب امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو اور جب امام غیر المغمضوب علیہم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔

حدیث (۸۳) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

قال: ان النبی ﷺ ان النبی ﷺ انصرف من صلوۃ جہر فیہا بالقراءۃ فقال هل قرأ معی احد منکم انفا فقال رجل نعم یا رسول اللہ! قال انی اقول مالی انازع القرآن قال فانتہی الناس عن القراءۃ مع رسول اللہ ﷺ فیما جہر فیہ النبی ﷺ بالقراءۃ من الصلوات حین سمعوا ذلك من رسول اللہ ﷺ۔ (السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص ۱۵۶ ج ۲ باب من قال یتک الماموم القراءۃ فیما جہر فیہا الامام بالقراءۃ)

یعنی حضور نبی کریم ﷺ اس نماز سے فارغ ہوئے جس میں جہری قراءت پڑھی جاتی ہے۔ فرمایا کیا تم میں سے کسی نے میرے ساتھ ابھی قراءت کی ایک شخص نے عرض کی ہاں یا رسول اللہ فرمایا میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہوا کہ میں قرآن میں منازعت کروں۔ راوی نے کہا کہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قراءت کرنے ان نمازوں میں باز رہے جن میں حضور قراءت نہ کرتے جب سے انہوں نے یہ رسواللہ ﷺ سے سنا۔

حدیث (۸۴) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن عبد اللہ بن بحدینہ رضی اللہ

تعالیٰ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: هل قیر احد منکم انفا فی الصلوۃ؟ قالوا نعم، قال: انی اقول مالی انزع القرآن فانتہی الناس عن القراءۃ حین قال ذلك۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص ۱۵۸ ج ۲)

یعنی حضرت عبداللہ بن بحدینہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم میں سے کسی نے ابھی نماز میں قراءت کی؟ لوگوں نے عرض کیا: ہاں، فرمایا: میں کہتا ہوں کہ مجھے کیا ہوا

کہ قرآن میں منازعت کیا جاؤں، تو لوگ جب سے حضور ﷺ نے فرمایا قراءت کرنے سے باز رہے۔

حدیث (۸۵) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ

عنہ قال: ان النبی ﷺ ان کان من خلفہ یقرأ فجعل رجل من اصحاب النبی ﷺ ینہاہ

عن القراءۃ فلی الصلوۃ فلما انصرف اقبل علیہ الرجل فقال: انتہانی عن اقرآۃ خلف رسول

اللہ ﷺ فتنازعا حتی ذکر ذلك لرسول اللہ ﷺ فقال النبی ﷺ: من صلی خلف الامام فان

قراءۃ الامام لہ قراءۃ۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص ۱۵۹ ج ۲)

باب من قال لا یقرأ خلف الامام علی الاطلاق)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھائی اور آپ

کے پیچھے ایک شخص قراءت کرتا تھا، تو حضور ﷺ کے اصحاب میں سے ایک صحابہ اس کو نماز میں قراءت

کرنے سے منع کرنے لھے تو جب وہ شخص نماز سے فارغ ہوا تو ان صحابی کی طرف متوجہ ہو کر بولا کیا تم نے

مجھے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے قراءت کرنے سے منع کیا؟ تو انہوں نے جھگڑا کیا یہاں تک کہ حضور نبی کریم

ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جو امام کے پیچھے نماز پڑھے تو بیشک امام کا ورا نکھرنا

اسی کا قراءت کرنا ہے۔

حدیث (۸۶) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن عبد اللہ بن شداد رضی اللہ تعالیٰ

عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: من کان لہ امام فان قراءۃ الامام لہ قراءۃ۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص ۱۵۹ ج ۲)

باب مذکور)

حضرت عبداللہ بن شداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس

کے لئے امام ہو تو امام کا قراءت کرنا اس مقتدی کا قراءت کرنا ہے

حدیث (۸۷) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ

عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: من کان لہ امام فقراءۃ الامام لہ قراءۃ۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص ۱۵۹ ج ۲)

باب مذکور)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس کے لئے امام ہو تو امام کا قرأت کرنا اسی کا قرأت کرنا ہے۔

حدیث (۸۸) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: من صلیٰ رکعة لم یقرأ فیہا بام القرآن فلم یصل الا وراء الامام۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص ۱۵۹ ج ۲ باب مذکور)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا: جس شخص نے ایک رکعت پڑھی اور اس میں سورۃ فاتحہ نہ پڑھی تو اس نے نماز ہی نہ پڑھی مگر جب امام کے پیچھے ہو۔

حدیث (۸۹) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن ابی وائل رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: ان رجلاً سأل ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن القراءة خلف الامام فقال: انصت للقرآن فان فی الصلوۃ شغلاً وسیکفیک ذاک الامام۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص ۱۵۹ ج ۲ باب مذکور)

ایک شخص نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے قرأت خلف الامام کا مسئلہ دریافت کیا تو فرمایا: قرآن کے لئے خاموش رہو، بیشک یہ نماز میں ایک شغل ہے اور تجھے یہ امام کافی ہے۔

حدیث (۹۰) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن نافع عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ انه کان یقول: من صلی وراء الامام کفاه قرأۃ الامام۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص ۱۵۹ ج ۲ باب مذکور)

حضرت نافع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے تھے: جس نے امام کے پیچھے نماز پڑھی اس کے لئے امام کی قرأت کافی ہے۔

حدیث (۹۱) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: کان رسول اللہ ﷺ یصلی بالناس ورجل یقرأ خلفہ فلما فرغ قال: من ذا الذی ینخالجنی سورتی فنفی عن القراءة خلف الامام۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص ۱۵۹ ج ۲ باب مذکور)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک شخص نے آپ کے پیچھے قرأت کی، جب حضور ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: مجھ سے کسی نے میری سورت میں منازعت کی تو امام کے پیچھے قرأت سے منع فرمایا۔

حدیث (۹۲) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہما قال: ان النبی ﷺ صلی یوما الظہر فجاء رجل فقرأ خلفہ سبح اسم ربک الاعلیٰ فلما فرغ قال: ایکم القاری؟ قال: انا، قال: قد ظننت ان بعضکم خالجنیہا۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص ۱۵۹ ج ۲ باب مذکور)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ ایک دن ظہر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ ایک شخص آئے اور انہوں نے آپ کے پیچھے سج اسم ربک الاعلیٰ پڑھا، جب حضور فارغ ہوئے تو فرمایا: تم میں سے کون قرأت کر رہا تھا؟ ایک شخص نے کہا: میں، فرمایا: میں نے جانا کہ تم میں سے بعض نے میرے ساتھ قرأت میں منازعت کی۔

حدیث (۹۳) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن ابی الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: سئل رسول اللہ ﷺ افی کل صلوۃ قرأۃ قال: نعم، فقال رجل من الانصار: وجبت هذه، فقال لى رسول اللہ ﷺ وکنت اقرب القوم الیہ، ما اری الامام اذا ام القوم الا قد کفاهم۔ (السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص ۱۵۹ ج ۲ باب مذکور)

حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ کیا ہر نماز میں قرأت ہے؟ فرمایا: ہاں، انصار میں سے ایک شخص نے کہا: قرأت واجب ہوگئی، تو رسول کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا: کہ میں قوم میں حضور ﷺ سے زیادہ قریب تھا، میں امام کو جانتا ہوں جب وہ قوم کی امامت کرتا ہے تو وہی ان کے لئے کافی ہے۔

حدیث (۹۴) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن عطاء بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہما قال: سئل زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن القراءة مع الامام فقال: لا اقرأ مع الامام۔

فی شیء۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص ۱۵۹)

ج ۲ باب مذکور)

حضرت عطاء بن یسار رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے امام کے ساتھ قرات کرنے کا مسئلہ دریافت کیا گیا تو فرمایا: میں امام کے ساتھ کچھ نہیں پڑھتا ہوں۔

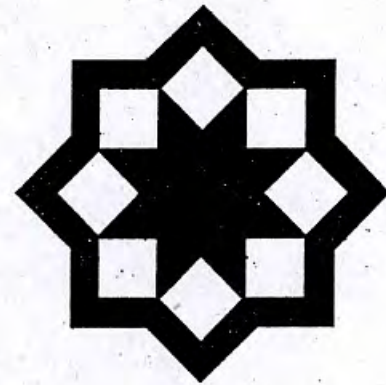
حدیث (۹۵) اسی سنن کبریٰ بیہقی شریف میں ہے: عن زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال: من قرأ وراء الامام فلا صلوٰۃ۔

(السنن الکبریٰ معروف بہ بیہقی شریف مطبوعہ دائرۃ المعارف عثمانیہ حیدرآباد ص ۱۵۹)

ج ۲ باب مذکور)

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: جس شخص نے امام کے پیچھے قرات کی تو اس کی نماز نہیں۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۲۸۱ھ



﴿۲۰﴾

باب الجماعۃ

(۲۷۸)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص جماعت ثانیہ کے حرام ہونے کا قائل ہے۔ دریافت یہ امر ہے کہ از روئے شرع جماعت ثانیہ حرام ہے یا نہیں؟

از رام نگر منڈی

الجواب

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

سائل کا جماعت ثانیہ کو حرام کہنا کتب فقہ کے بالکل خلاف ہے۔ حرام ایک بہت بڑی چیز ہے۔ وہ کتنی ہی عرق ریزی کرے اس کا ناجائز ہونا بھی ثابت نہیں کر سکتا۔ جماعت ثانیہ فقہائے کرام کے نزدیک بالاتفاق جائز ہے۔

الحجۃ القاطعۃ میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ ناقل ہیں۔

و یجوز تکرار الجماعۃ بلا اذان واقامۃ ثانیۃ اتفاقاً و فی بعضها اجماعاً بلا کراہۃ

قال فی الدرر هو الصحیح۔

یعنی جماعت کی تکرار بغیر اذان و تکبیر کے اجماعاً بلا کراہت جائز ہے۔ اس قول میں جماعت ثانیہ کے بلا کراہت جائز ہونے بلکہ اجماع بلا کراہت پر کیسی صاف صراحت ہے۔ علاوہ بریں درر میں یہ تصریح کردی کہ صحیح بھی یہی قول ہے۔ اسی میں مجمع البحرین سے منقول ہے۔

و تکرار ہا فی مسجد محلۃ باذان ثان یعنی اذا کان للمسجد امام معلوم و جماعۃ

معلومۃ فصلوا فیہ بجماعۃ باذان واقامۃ لایباح تکرار الجماعۃ باذان واقامۃ عندنا و قید

باذان ثان لا نھم ان صلوا بلا اذان ثان یباح اتفاقاً۔

یعنی محلہ کی مسجد میں دوسری اذان کے ساتھ جماعت کا مکرر کرنا جب کہ اس مسجد میں امام اور مقتدی متعین ہوں اور اذان واقامت کے ساتھ جماعت پڑھ چکے ہوں اسی مسجد میں ہمارے نزدیک

جماعت کا اذان و اقامت کے ساتھ مکرر کرنا غیر مباح ہے۔ اور اذان ثانی کی قید میں یہ فائدہ ہے کہ اگر جماعت کا بغیر اذان اعادہ کیا جائے تو باتفاق علماء مباح ہے۔ اسی میں ہے:

ثم قد علمت ان الصحيح انه لا يكره تكرار الجماعة اذالم تكن على هيئة الاولى! يعنى میں نے بہ تحقیق اس کا صحیح ہونا جانا کہ جماعت جب پہلی ہیئت پر نہ ہو تو مکروہ نہیں ہے۔

عائلیگی میں ہے: المسجد اذا كان له امام معلوم وجماعة معلومة في محلة فصلی
اهله فيه بالجماعة لا يباح تكرارها فيه باذان ثان اما اذا صلوا بغير اذان يباح اجماعا۔

یعنی جب مسجد محلہ میں امام اور مقتدی متعین ہوں اور وہ جماعت پڑھ چکے ہوں اس میں دوسری اذان کے ساتھ جماعت کا مکرر کرنا غیر مباح ہے لیکن بلا اذان جماعت ثانیہ مباح ہے بالا جماع۔

ان عبارتوں سے ثابت ہوا کہ جماعت ثانیہ بلا کراہت جائز ہے۔ اور اسی پر اجماع بھی ہے۔ لیکن محلہ کی مسجد میں اذان جماعت ثانیہ کے لئے دوبارہ نہ کہی جائے اور امام کی جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ جماعت قائم کی جائے۔

الحجة القاطعة میں رد و المختار سے ناقل ہیں: عن ابی یوسف اذا لم تكن على الهيئة الاولى لا تكره ولا تكره وهو الصحيح۔ وبالعدول عن المحراب تختلف الهيئة كذا في البزاية۔

یعنی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ جب پہلی ہیئت پر نہ ہو تو مکروہ نہیں ہے۔ ورنہ مکروہ اور قول صحیح ہے۔ اور محراب سے علیحدہ ہونا ہی ہیئت کو بدلتا ہے۔

بلکہ فقہاء اس کی بھی تصریح فرماتے ہیں۔ کہ بازار کی مسجد میں جماعت ثانیہ کے لئے اذان و اقامت کا اعادہ افضل ہے۔

خزائن الاسرار شرح تنویر الابصار میں ہے: لو کان مسجد طریق جاز اجماعاً کما فی مسجد لیس له امام ولا موذن ویصلی الناس فیہ فوجا فوجا فان الافضل ان یصلی کل فریق باذان واقامة علی حدة کما فی امالی قاضی خاں۔

یعنی اگر مسجد راستہ کی ہو اور اس میں گروہ گروہ آکر نماز پڑھتے ہیں تو افضل یہ ہے کہ ہر گروہ اذان و اقامت کے ساتھ جماعت کریں اس کے جواز پر اجماع ہے اس مسجد کی مانند کہ جس میں امام مؤذن مقرر نہ ہوں۔

مسئلہ

(۲۷۹)

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک مقتدی دوسری رکعت میں امام کے ساتھ جماعت میں آکر ملا۔ امام صاحب نے دو رکعت کے بعد تشہد پڑھی اور اس مقتدی کی ایک رکعت والے نے بھی تشہد پڑھی۔ امام صاحب نے دو رکعت پوری کر کے تشہد پڑھی اور اس مقتدی نے بھی تشہد پڑھی اور ایک باقی رکعت کو پورا کر کے پھر تشہد پڑھی اس مقتدی کی چار رکعت میں تین تشہد ہوئے۔ جو شخص جان کر ایسا کرے اس کی نماز میں شریعت کے لحاظ سے کچھ نقص تو واقع نہیں ہوتا؟۔ یا کسی سے سہوا ایسا ہو جائے تو اس کا کیا حکم ہے۔۔ بینوا تو جروا

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

۔۔۔ اس میں کوئی نقص نہیں۔ اس مقتدی کو ایسا ہی کرنا چاہئے۔ یہاں تو چار رکعتوں میں تین تشہد ہوئے اور کتب فقہ میں تو ایسی صورت بھی لکھی ہے جس میں تین رکعتوں میں دس تشہد ہوں۔

ادرك الامام فى تشهد المغرب الاول وتشهد معه فى الثانية وكان عليه سهو فسجده وتشهد معه فى الثالثة وتذكر الامام سجدة تلاوة فسجد معه وتشهد الرابعة وسجد للسهو وتشهد معه الخامسة - فاذا سلم قام الى قضاء ما فاتة فصلى ركعة تشهد السادسة ويصلى ركعة اخرى ويتشهد السابعة - وكان قد سها فيما يقضى فيسجد ويتشهد الثامنة ثم تذكر انه قرأ آية سجدة فى قضائه فيسجد لها ويتشهد التاسعة ثم يسجد للسهو ويتشهد العاشرة -

(طحاوى على مراقى الفلاح مصرى ص ٢٤٠)

ہذا یہ صورت بلاشبہ جائز ہے۔ واللہ تعالیٰ علم بالصواب۔

کتبہ: المتقصد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبدمحمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۲۸۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک امام صاحب نے صبح کی نماز پہلی رکعت میں سورہ یٰسین کا آخری پورا رکوع پڑھ کر اس کے متصل دوسری سورۃ والصفات کا پہلا پورا رکوع پڑھا۔ ایسا کرنے سے لوگوں کی نماز ہو جاتی ہے یا کہ نہیں اور کیا کیا نماز میں نقص واقع ہوتے ہیں؟ آپ مع فقہ کی کتاب یا حدیث سے ساتھ صفحہ و باب کے حوالہ دیں۔ بینواتو جروا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

صورت مسئلہ میں بلا شک نماز ہو جائے گی لیکن یہ خلاف اولیٰ ہے۔ تا تار خانہ میں ہے:

اذا جمع بین سورتین فی رکعة رأیت فی موضع انه لا باس به وذكر شیخ الامام لا ینبغی له ان یفعل علی ما هو ظاهر الروایة۔ (رد المحتار مصری ج ۱ ص ۳۸۳) غنیۃ المستملی شرح المنیہ میں ہے:

الاولیٰ ان لا یفعل فی الفرض ولو فعل لا یکره۔ (غنیۃ مطبوعہ فخر المطالع لکھنؤ ص ۲۶۲) لہذا صورت مسئلہ میں صرف اولویت کا خلاف لازم آتا ہے اور کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبید محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۲۸۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع کہ ایک مسجد کے امام کا کئی مرتبہ چوری کی عادت اس کے مقتدیوں کو پایہ ثبوت تک پہنچ گئی۔ اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ یہ امام صاحب اسی مسجد کی امامت پر برقرار رکھے جاسکتے ہیں؟ بینواتو جروا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جب چوری کرنا گناہ کبیرہ ہے تو چور ارتکاب کبیرہ کی وجہ سے فاسق ہوا۔

رد المحتار میں ہے: المراد به من یرتکب الکبائر کشارب الخمر والزانی واکل الربا

(رد المحتار ص ۳۹۳)

ونحو ذلك۔

فاسق سے مراد وہ شخص ہے جو کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرے جیسے شراب پینے والا، زنا کرنے والا، سود کھانے والا اور مثل اس کے۔

علامہ طحطاوی شرح مراقی الفلاح میں فاسق کی بحث میں فسق کی شرعی تعریف لکھتے ہیں:

وشرعا خروج عن طاعة الله تعالى بارتکاب کبيرة۔ (طحطاوی ص ۱۷۶)

فسق شریعت میں ارتکاب کبیر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طاعت سے خارج ہونے کا نام ہے۔

اور فاسق کی امامت مکروہ ہے۔

کنز الدقائق میں ہے: کرہ امامة العبد والاعرابی والفسق۔ (یعنی ج ۱ ص ۳۷)

غلام۔ دہقانی۔ فاسق کی امامت مکروہ ہے۔

ملتقى الابحار میں ہے:

تکرہ امامة العبد والاعرابی والاعمی والفسق۔ (حاشیہ شرح وقایہ فارسی ص ۳۴)

غلام۔ دہقانی۔ نابینا۔ فاسق کی امامت مکروہ ہے۔

نور الایضاح میں ہے: کرہ امامة العبد والاعمی والاعرابی وولدزنا والجاهل

(نور الایضاح ص ۲۲)

والفسق۔

غلام، نابینا، دہقانی، حرامی، جاہل، فاسق کی امامت مکروہ ہے۔

مراقی الفلاح میں ہے: کرہ امامة الفاسق لعدم اهتمامه بالدين فتجب اهانة شرعا

(ص ۱۷۶)

ولا يعظم بتقديمه للامامة۔

فاسق عالم کی اہانت بوجہ دینی اہتمام ہونے کے مکروہ ہے اور شرعا اس کی اہانت واجب ہے تو

اس کو امامت کے لئے پیش کر کے تعظیم نہ کی جائے۔

تنویر الابصار میں ہے: یرکھ امامة عبد و اعرابی و فاسق۔ (شامی ج ۱ ص ۳۹۳)

غلام۔ دہقانی۔ فاسق کی امامت مکروہ ہے۔

بالجملہ فاسق کی امامت مکروہ ہے اور اس کراہت سے مراد مکروہ تحریمی ہے۔

چنانچہ شرح منیہ میں ہے: ان کراہۃ تقدیمہ کراہۃ تحریم۔ (غنیۃ ص ۹۷۹)

فاسق کے امامت کے لئے پیش کرنے کی کراہت تحریمی کراہت ہے۔

طحاوی میں ہے: مفادہ کون الکراہۃ فی الفاسق تحریمۃ۔ (ص ۱۷۶)

امامت فاسق کے مکروہ ہونے کا مفاد تحریمی ہے۔

حاصل جواب یہ ہے کہ چور کی اپنے فسق کی وجہ سے امامت مکروہ تحریمی ہے اور جب وہ چوری کا عادی ہے اور مقتدیوں کو اس کا فسق پایہ ثبوت کو پہنچ گیا ہے تو اس کی امامت بدرجہ اولیٰ مکروہ تحریمی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المختصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۶۷ھ

مسئلہ

(۲۸۲)

علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں

کہ زید اپنے ساتھیوں کے ساتھ مسجد میں بیٹھا رہتا ہے۔ پہلی جماعت جب ختم ہوئی امام نے سلام پھیرا تو فوراً وہ دوسری جماعت کرتا ہے۔ مسلمانوں میں تفریق پیدا کرتا ہے اور کر رہا ہے۔ جماعت توڑنے کی کوشش میں رہتا ہے جس سے مسلمانوں میں نفاق پیدا ہو رہا ہے۔ لہذا از روئے شرع شریف کے بتایا جائے کہ زید کا فعل جائز ہے یا ناجائز۔ بینوا تو جروا

مستفتی، حسین بخش حاجی محمد اسماعیل کی دکان نمبر ۱۱ لاگٹ سوداگر پٹی کاشی پور کلکتہ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اگر پہلی اور دوسری جماعت کے لوگوں میں اختلاف عقائد کا فرق ہے کہ ایک جماعت بد مذہبوں والی، غیر مقلد، قادیانی وغیرہ کی جماعت ہے۔ اور دوسری اہل سنت صحیح العقیدہ لوگوں کی جماعت ہے تو اہل سنت و جماعت کی ان بد مذہبوں کے ساتھ اور بد مذہب امام کی اقتداء میں پڑھنا ناجائز و ناروا ہے۔

دارقطنی کی حدیث شریف میں ہے ”ولا تصلوا معهم“ یعنی تم بد مذہب امام کی اقتداء میں نماز نہ پڑھنا۔

فقہ کی مشہور کتاب کبیری میں ہے ”روی محمد عن ابی حنیفۃ و ابی یوسف رحمہما

اللہ ان الصلوٰۃ خلف اہل الاہواء لا یجوز“۔

یعنی حضرت امام اعظم ابو حنیفۃ و امام ابو یوسف علیہما الرحمۃ سے امام محمد علیہ الرحمۃ نے روایت کی کہ بیشک بد مذہبوں کے ساتھ اور ان کے پیچھے نماز جائز نہیں۔

تو اگر پہلی جماعت بد مذہبوں کی ہے اور زید سنی صحیح العقیدہ ہے تو زید کا بد مذہبوں کی جماعت میں شریک نہ ہونا اور دوسری جماعت کرنا صحیح و جائز فعل ہے۔ اور اس کو نفاق و تفریق بین المسلمین کہنا غلط اور اندھا پن ہے۔ اور کہنے والوں کے دین سے ناواقف ہونے کی روشن دلیل ہے۔ اور اگر ان دونوں جماعتوں میں اختلاف عقائد بالکل نہیں ہے۔ لیکن جماعت اولیٰ کے امام میں کچھ شرعی عملی خامی ہے۔ یعنی کسی طرح کا فسق ہے تو زید کا اس بناء پر پہلی جماعت میں شرکت نہ کرنا اور دوسری جماعت منعقد کرنا قابل ملامت و لائق مواخذہ نہیں۔ مگر اس کا بوقت جماعت اس شان سے وہاں موجود رہنا اور فوراً دوسری جماعت قائم کر دینا شرعاً یہ طریقہ مذموم و ناپسندیدہ ہے۔ اور اس صورت میں تفریق بین المسلمین کی مجرم وہ جماعت ولیٰ ہے کہ اس نے ایسے فاسق امام کو کیوں مقرر کر رکھا ہے۔ جس کے پیچھے نماز مکروہ تحریمی ہو جو واجب الاعداء ہو۔ اور اگر ان دونوں جماعتوں اور اس کے امام میں اعتقاد اور عمل کسی طرح کا فرق نہیں بلکہ زید کو اس امام سے محض دنیوی امور کی بنا پر عداوت و دشمنی ہے تو پھر زید کے یہ افعال جماعت اولیٰ میں شریک نہ ہونا اور اس کے بعد فوراً جماعت ثانیہ قائم کرنا شرعاً مذموم و ناجائز ہے اور فی الواقع تفریق بین المسلمین ہے۔ زید کو اپنی ایسی ناپاک حرکت سے باز آنا چاہئے مولیٰ تعالیٰ قبول حق کی توفیق دے۔

کتبہ: المختصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۶۷ھ

۹ صفر المظفر ۱۳۶۷ھ

(۲۸۳)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ

زید پڑھا لکھا اور صوم و صلوٰۃ کا پابند ہے مگر مسجد و نماز کے پابند نہیں، محلہ کی مسجد زید صاحب کے

مکان سے صرف چار سو قدم کے فاصلے پر ہے، برسات میں بارش وغیرہ کی وجہ سے راستہ ضرور خراب و تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ پھر بعد ختم برسات راستہ بہت صاف ستھرا ہو جاتا ہے مگر زید صاحب موصوف کے لئے، جاڑا، گرمی، برسات سب برابر ہے۔ حالانکہ اپنی کاموں کے لئے مسجد سے بھی دوری فاصلے پر دن تو دن اندھیری شب میں جاتے آتے ہیں اور مسجد کے لئے ہمیشہ عذر درپیش رہا کرتا ہے۔ مسجد میں صرف جمعہ کی امامت کے لئے چلے جاتے ہیں، باقی پنج گانہ اپنے گھر پر پڑھا کرتے ہیں۔ اس پر بعض لوگ کہتے ہیں کہ بغیر عذر شرعی مکان پر نماز ہرگز نہ ہوگی، اور ایسے امام جو بغیر عذر شرعی تارک مسجد و جماعت ہوں ان کے پیچھے نماز درست نہیں۔ لہذا شرعی حکم سے بالشریح بحوالہ کتب فقہ مطلع فرمایا جائے؟

المستفتی، عبدالکمال مظفر پوری خریدار سنی

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جو شخص بغیر عذر شرعی کے تارک جماعت کا عادی ہو وہ فاسق ہے۔

رد المحتار میں ہے ”انہ یأثم اذا اعتاد التارك“ اور جب وہ فاسق قرار پایا تو اس کو امامت کے لئے پیش کرنا مکروہ ہے اور سوائے جمعہ کے اس کے پیچھے جو نماز پڑھی جائیگی وہ واجب الاعادہ ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المقتضی بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۶۱ھ

۳ رمضان المبارک ۱۳۶۱ھ

(۲۸۴)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

زید فجر کی سنت مسجد میں ایک طرف کو ادا کر رہا ہے اور جماعت ہو رہی ہے۔ کیا یہ سنت ادا ہو جائیں گی؟

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جماعت کے وقت فجر کی سنتیں مسجد میں پڑھ سکتا ہے لیکن اس کے اور جماعت کے درمیان ستون

دیوار وغیرہ کا آڑ ہو۔ یا اندر باہر کا فرق ہو۔ اور اگر خارج مسجد میں کوئی جگہ ہو تو وہاں پڑھنا زیادہ بہتر ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: المقتضی بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۶۱ھ

(۲۸۵)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

امام کے مصلی پر پہنچنے سے پہلے تکبیر کہنا جائز ہے یا نہیں: اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت کریمہ کیا تھی اور آپ کس وقت مصلی پر تشریف لاتے تھے: بینوا تو جروا؟

المستفتی محبوب حسین محلہ محمود خاں سرائے ۱۲ رجب المرجب سنہ ۱۳۶۲ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بلا شک امام کے مصلی پر جانے سے پہلے تکبیر کا شروع کر دینا جائز ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس میں ایسا عمل ہوتا تھا۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب حضور کو حجرہ شریفہ سے برآمد ہوتا ہوا دیکھتے اقامت (تکبیر) شروع کر دیتے۔

چنانچہ حاکم نے مستدرک میں یہ حدیث حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی:

کان بلال یؤذن ثم یمهل فاذا رأى رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم قد خرج فاقام الصلوة هذا حديث صحيح على شرط مسلم (وفى رواية) فاذا رأى النبي صلى الله تعالى عليه وسلم قد اقبل اخذفى الاقامة (رواه حاكم فى المستدرک) (وفى رواية) لا يقيم

حتى يرى النبي صلى الله تعالى عليه وسلم فاذا راه اقام حين يراه (رواه مسلم والبيهقى)

حضرت بلال اذان کہتے پھر توقف کرتے پھر جب حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نکلتے ہوئے دیکھتے تو نماز کے لئے اقامت کہتے (یہ مسلم کی شرط پر حدیث صحیح ہے) (ایک روایت میں ہے) کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو برآمد ہوتا دیکھتے تو اقامت شروع کر دیتے (اس حدیث کو حاکم نے

مستدرک میں روایت کیا) (اور ایک روایت میں ہے) کہ حضرت بلال اقامت نہیں کہتے یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھتے پس جب آپ کو دیکھتے تو دیکھنے کے ساتھ ہی اقامت کہتے؛

ان احادیث سے ظاہر ہو گیا کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جس وقت حجرہ شریفہ سے باہر تشریف لاتا ہوا دیکھتے موزن اقامت شروع کر دیتے۔ تو ظاہر ہے کہ اقامت امام کے مصلے پر جانے سے پہلے شروع کر دی گئی اور یہ طریقہ حضور ہی کی تعلیم سے جاری ہوا۔ ورنہ اس پر ضرور منع فرمادیتے اور خود حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عادت کریمہ مقرر معلوم نہیں ہوتی۔ کبھی حجرہ شریفہ سے برآمد ہوتے اور موزن آپ کو دیکھتے ہی اقامت شروع کر دیتے جیسا کہ ان احادیث میں مذکور ہے اور کبھی تکبیر کی آواز سن کر حجرہ شریفہ سے باہر تشریف لاتے۔

چنانچہ بخاری و مسلم و ترمذی وغیرہ میں حضرت ابو قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

اذا اقيمت الصلوة فلا تقوا موا حتى تروني: جب نماز کے لئے اقامت کہی جائے تو کھڑے نہ ہو یہاں تک کہ مجھے دیکھ لو۔

علامہ علی قاری مرقات میں اس حدیث کے تحت فرماتے ہیں:

ولعله صلى الله تعالى عليه وسلم كان يخرج من الحجره بعد شروع المؤذن في الاقامة ويدخل في محراب المسجد عند قوله حي على الصلوة؛

شاید کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم موزن کے اقامت شروع کر دینے کے بعد حجرہ سے نکلتے تھے اور محراب مسجد میں حی علی الصلوٰۃ کے کہنے کے وقت داخل ہوتے: اور کبھی اقامت کے ختم کے وقت حجرہ شریفہ سے برآمد ہوتے۔

چنانچہ مشکوٰۃ شریف کے حاشیہ میں بحوالہ مرقات یہ عبارت ہے:

قال ابن حجر و كان يخرج صلى الله تعالى عليه وسلم عند فراع المقيم من اقامته فامرهم بالقيام حينئذ لا نه وقت الحاجة اليه :

ابن حجر نے کہا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مقيم کے اقامت سے فارغ ہونے کے وقت برآمد ہوتے تھے اور صحابہ کو اس وقت کھڑے ہونے کا حکم فرماتے۔ کیونکہ اسی وقت قیام کی حاجت ہے؛ اور کبھی ان کے علاوہ اور صورتیں عمل میں آتیں (الحاصل) امام کے مصلے پر پہنچنے سے قبل تکبیر شروع کر دینا جائز ہے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت ہے (واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب)

کتبہ: الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجل غفر له الاول

مسئلہ

(۲۸۶)

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بیٹھ کر پڑھنے والے امام کی اقتدا کھڑے ہو کر کرنے کا جواز تنویر الابصار، درمختار، کنز الدقائق، عینی، بحر الرائق، شرح وقایہ، نہایہ، غنیۃ، فتاویٰ خانہ، فتاویٰ سراجیہ، قدوری، جوہرہ نیرہ، جامع الفتاویٰ، نور الایضاح، مراقی الفلاح، طحاوی، ہدایہ وغیرہ متون و شروح میں موجود ہے۔ اور کیونکہ نہ موجود ہو کہ بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف، نسائی شریف، بیہقی وغیرہ کتب حدیث میں مروی ہے کہ خود نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کا یہ آخری فعل ہے کہ حضور نے آخر مرض میں بیٹھ کر نماز پڑھائی اور صحابہ نے آپ کی اقتدا میں کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔

چنانچہ درمختار میں ہے:

(وصح اقتداء قائم بقاعد) یرکع ویسجد لا نه ﷺ آخر صلاته قاعدا و هم

(شامی ص ۴۱۳ ج ۱)

قائمون و ابو بکر یبلغهم تکبیرہ۔

البتہ فرائض میں شیخین اور امام محمد میں اختلاف منقول ہے۔ شیخین جواز کے قائل ہیں اور حدیث ان کی متدل ہے۔ اور امام محمد بر بنائے قیاس اس کو ناجائز فرماتے ہیں۔ لیکن فرائض میں بھی اکثر فقہاء نے قول شیخین کو ترجیح دی اور اسی کو قول مفتی بہ قرار دیا۔

اب رہے نواقل و تراویح اس میں یہ اقتدا باتفاق جائز ہے۔

شامی میں ہے: (قوله و قائم بقائد) ای قائم ساجد او موم و هذا عندهما خلافا

لمحمد و اقتداء القاعد بکونہ یرکع ویسجد لا نه لما کان موم جبالم بجز اتفاقا

والخلاف ایضا فیما عدا النفل اما فیہ فیجوز اتفاقا و فی التراویح فی الاصح۔

(شامی ص ۴۱۳ ج ۱)

بالجملہ صورت مسئلہ میں یعنی تراویح امام کا بیٹھ کر پڑھنا اور مقتدیوں کا کھڑا ہو کر اس کی اقتدا کرنا باتفاق فقہا صحیح درست ہے۔ اب اس تحقیق کے بعد کسی عالم کا اس میں اختلاف کرنا اس کی نادانگی کی دلیل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المختصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۲۸۷ھ

مسئلہ (۲۸۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ میں کہ
ایک شخص صبح یا ظہر کی نماز کیلئے مسجد میں پہنچتا ہے جماعت ہو رہی ہے۔ ایک رکعت پہنچنے سے پہلے ختم ہو جاتی ہے، دوسری رکعت امام کے ساتھ ملتی ہے، امام اپنی نماز پوری کر کے سلام پھیرتا ہے، بعد کا آنے والا شخص جسکی ایک رکعت فوت ہوئی ہے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور ثنا اور اعوذ کے بعد الحمد اور سورۃ پڑھ کر اپنی نماز ادا کر لیتا ہے۔ زید اس کے خلاف بتلاتا ہے کہ شانہ پڑھی جائے۔ زید اپنے عمل کے ثبوت میں بہشتی زیور۔ مفتاح الحجۃ۔ شرح وقایہ پیش کرتا ہے۔ شخص مذکور اپنے عمل کے ثبوت میں مالابد۔ بہار شریعت۔ فتاویٰ عالمگیری، درمختار لاتا ہے۔ لہذا ان دونوں شخصوں میں کون حق بجانب ہے۔ مدلل طریقہ سے جو کتب دینیات مذہب حنفی میں ہو رقم فرمایا جائے۔ کہ مسئلہ حقہ پر عمل ہو۔ ونیز نماز جہر و خفی کا عمل بھی تحریر فرمایا جائے کہ مسبوق کو کس طرح نماز پڑھنی چاہیے۔
ممتاز الہی اشرفی نقشہ نویس چنگی چندوسی۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علی رسولہ الکریم
مسبوق جب امام کے سلام کے بعد اپنی باقی نماز پڑھنے کیلئے کھڑا ہو تو وہ ثنا پڑھے پھر تعوذ اور الحمد اور سورۃ ملائے۔ ثنا کا پڑھنا عامہ کتب فقہ میں موجود ہے۔
تنور الابصار و درمختار میں ہے:

المسبوق من سبقہ الامام بها او بعضها وهو منفرد حتی یثنیٰ ویعوذ ویقرء۔

(ردالمحتار مصری ص ۴۱۸ ج ۱)

مسبوق وہ مقتدی ہے کہ امام کی اس سے پہلے سب نماز کی رکعتیں یا بعض رکعات ہو چکیں تو وہ

منفرد کے حکم میں ہے یہاں تک کہ وہ ثنا اور تعوذ اور قرأت پڑھے۔

علامہ شامی ردالمحتار میں قولہ یثنیٰ کے تحت میں فرماتے ہیں:

تفریع علی قولہ منفرد فیما یقضیہ بعد فراغ اما مہ قیاتی بالثناء والتعوذ لا نہ للقرآن
ویقرأ لا نہ یقضی اول صلا تہ فی حق القرآن کما یأتی حتی لو ترک القرآن فسدت۔

(ردالمحتار۔ مصری ص ۴۱۸ ج ۱)

یہ مصنف کے قول منفرد کی تفریع ہے کہ مسبوق اپنی باقی نماز کی امام کے فارغ ہونے کے بعد قضا کرے تو وہ ثنا اور تعوذ پڑھے۔ تعوذ قرأت کیلئے ہے۔ اور قرأت پڑھے اسلئے کہ حق قرأت میں وہ اپنی پہلی نماز کی قضا کر رہا ہے۔ جیسا کہ آئندہ آئے گا۔ یہاں تک کہ اگر اسنے قرأت ترک کی تو نماز فاسد ہو جائیگی نور الایضاح اور اس کی شرح مراتی الفلاح میں ہے:

فیاتی بہ المسبوق فی ابتداء ما یقضیہ بعد الثناء۔ (طحاوی ص ۱۶۴)۔

تو مسبوق تعوذ کو ثنا کے بعد اپنی فوت شدہ نماز کی ابتداء میں لائے۔

فتاویٰ قاضی خاں میں ہے:

ولو ان المسبوق لم یأت بالثناء فی اول الصلاۃ فقام الی قضاء ما سبق ذکر فی
الکیسانیات انہ یأتی باثناء عند محمد رحمہ اللہ تعالیٰ ولم یدکر فیہ خلافا وبعد
الفراغ من الثناء یعوذ۔ (قاضی خاں ص ۴۳)۔

اگر مسبوق ثنا اول نماز میں نہ لایا پھر اپنی فوت شدہ کو قضا کی طرف کھڑا ہوا کیساتیات میں ذکر کیا گیا کہ امام محمد علیہ الرحمہ کے نزدیک وہ ثنا پڑھے گا اور کسی مخالف قول کا اس میں ذکر نہیں کیا اور ثنا سے فارغ ہو کر وہ تعوذ پڑھے۔

اسی فتاویٰ خانہ میں ہے:

المسبوق اذا ادرك الامام فی القرآن التی یجهر فیہا لا یأتی بالثناء فاذا اقام الی
قضاء ما سبق یأتی بالثناء ویعوذ للقرآن۔ (خانہ ص ۵۱)۔

مسبوق نے جب امام کو جہر کی قرأت میں پایا تو وہ اب شانہ پڑھے۔ پھر جب اپنی فوت شدہ کی قضا کی طرف کھڑا ہو تو ثنا پڑھے، اور قرأت کے لئے تعوذ پڑھے۔

فتاویٰ سراجیہ میں ہے:

المسبوق اذا قام الى قضاء ما سبق فانه يستفتح لان هذا اول صلاته في حق القراءة وان كان اخر صلاته في حق القعدة۔

(ش خانیہ ص ۹۶)

مسبوق جب فوت شدہ نماز کو طرف کھڑا ہو تو وہ ثاپڑھے۔ اسلئے کہ حق قرأت میں یہ اس کی پہلی نماز ہے۔ اگرچہ حق قعدہ میں یہ اس کی آخر نماز ہے۔

شرح وقایہ اور عمدۃ الرعاۃ فی حل شرح الوقایہ میں ہے:

المسبوق وهو الذى ادرك آخر صلوٰۃ الامام فلم يلتزم اداء الكل خلف الامام فهو في اداء ما لم يدركه مع الامام منفرد حتى يجب عليه القراءة (قال المحشى) قوله منفرد اى حقيقة وحكما ايضا ولذا يقرأ المسبوق القرآن ويتعوذ ويثنى۔ (شرح وقایہ ص ۹۷ ج ۱)

مسبوق وہ ہے جس نے امام کی آخر نماز کو پایا اور امام کے پیچھے کل نماز کو ادا نہ کر سکا تو وہ اس کی ادا میں جو امام کے ساتھ نہ ملی منفرد کے حکم میں ہے یہاں تک کہ اس پر قرأت واجب ہے۔ محشی نے کہا کہ وہ حقیقہ اور حکماً منفرد ہے۔ اسی لئے مسبوق قرآن پڑھے گا اور تعوذ پڑھے گا اور ثاپڑھے گا۔

الحاصل فقہ کی مشہور کتب تنویر الابصار۔ درمختار۔ ردالمحتار۔ نور الایضاح۔ مراقی الفلاح۔ فتاویٰ قاضی خاں۔ فتاویٰ سراجیہ۔ شرح وقایہ۔ عمدۃ الرعاۃ سے نہایت واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ مسبوق جب اپنی فوت شدہ رکعات پوری کرے گا تو وہ ثاپڑھے گا۔ اور عبارت قاضی خاں سے معلوم ہوا کہ یہ ایسا قول ہے جس کا کوئی مخالف قول منقول نہیں۔ لہذا اب زید اس کے خلاف قول کہاں سے لایگا۔ زید کا شرح وقایہ کو اپنے استدلال میں پیش کرنا اس کی ناقابلیت کی دلیل ہے۔

اقول اولاً: شرح وقایہ میں غالباً جو مسبوق کیلئے ثاپڑھنے کی ممانعت کی ہے وہ اس صورت میں ہے کہ جب یہ مسبوق بوقت شروع ثاپڑھے چکا ہے کہ ثنا کی مشروعیت نماز میں ایک ہی مرتبہ کیلئے ہے چنانچہ فقہائے کرام دوسری رکعت میں ثنا تعوذ نہ پڑھنے کی یہی علت لکھتے ہیں۔

درمختار میں ہے:

الرکعة الثانية کالاولی فیما مر غیر انه لا یأتی بثناء ولا تعوذ فیها اذ لم یشرع الامر۔

تو اس بنا پر شرح وقایہ کی عبارت۔ المسبوق یقرأ ولا یثنی فیتعوذ، کا یہ مطلب ہوا کہ وہ

مسبوق جو بوقت شروع ثاپڑھے چکا ہے وہ قرأت اور تعوذ پڑھے اور ثنا نہ پڑھے کہ ثنا کی نماز میں تکرار نہیں ہوتی اور وہ شروع میں ثاپڑھے چکا ہے تو یہ عبارت ہماری پیش کردہ عبارات کے مخالف نہیں ہوئی:

ثانیاً: اور اگر زید عبارت شرح وقایہ کا یہ مطلب سمجھتا ہے کہ یہ اس مسبوق کے لئے ہے جس نے بوقت شروع ثنا نہیں پڑھی ہے تو اس میں فقہاء کے طبقہ ثالثہ کے مجتہد فی المسائل امام اجل فخر الدین قاضی خاں کی مخالفت لازم آتی ہے جیسا کہ عبارت منقولہ فتاویٰ خانیہ سے ظاہر ہے۔

ثالثاً: اگر مخالفت قاضی خاں سے بھی قطع نظر کر لی جائے تو محرر مذہب اجل شاگرد امام اعظم حضرت امام محمد رحمۃ اللہ کی کتاب کی صریح مخالفت ہوتی ہے۔

رابعاً: جب اصحاب مذہب سے کوئی مخالف قول منقول نہیں جیسا کہ کیسانیات سے ظاہر ہوا تو کیا زید قول شرح وقایہ کو مخالف قول ہونے کا صالح سمجھتا ہے۔

خامساً: اس عبارت شروع وقایہ میں قرأت کے ساتھ تعوذ پڑھنے کا حکم ہے اور تعوذ کے لئے متواتر یہ ہے کہ وہ بعد ثناء پڑھا جائے۔

چنانچہ کبیری میں ہے:

ولا يتعوذ الا بعد الثناء لانه المتواتر۔ (کبیری صفحہ ۱۹۸)

تو اس صورت میں تعوذ کا بلا ثنا کے اجازت دیدینا خلاف متواتر ٹھہرتا ہے۔ بالجملہ شرح وقایہ کی عبارت کی تاویل وہ ہے جو ہم نے اقوال کے بعد لکھی ہے کہ اس میں دیگر کتب فقہ سے مخالفت لازم نہیں آتی اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس عبارت میں ناخین یا مطابع کی غلطی ہو اس کا قرینہ یہ ہے۔

کہ میرے پاس شرح وقایہ کا ایک فارسی ترجمہ ہے جو مولانا عبدالحق سرہندی نے ۱۰۸۶ھ میں زمانہ حضرت سلطان محمد اورنگ شاہ عالمگیر علیہ الرحمۃ میں کیا ہے اور مطبع مرتضوی دہلی میں ۱۲۸۳ھ میں طبع ہوا ہے۔ اس میں جب اس مقام کو دیکھا گیا تو مترجم ان الفاظ میں ترجمہ کرتے ہیں:

بعد از ثنا تعوذ گوید بداں کہ تعوذ تابع قرأت است نہ تابع ثناء۔ پس مسبوق پیش از قرأت خود تعوذ بخواند و موتم را چوں قرأت نیست تعوذ نہ خواند۔ (ص ۳۰)

لہذا اس ترجمہ میں شرح وقایہ کے لفظ ”لا یثنی“ کا ترجمہ ہی نہیں کیا۔ بالجملہ زید کا شرح وقایہ سے استدلال کرنا غلط ثابت ہوا۔

اسی طرح مفتاح الحجۃ سے اسکا استناد ہے۔

اولاً: زید کا مفتاح الجنتہ کا مذہب کی ان مشہور و معتمد و مستند کتابوں کے مقابلہ میں پیش کرنا ہی سخت جہالت ہے۔

ثانیاً: اگر بالقرض مفتاح الجنتہ میں یہ مسئلہ زید کے قول کے موافق بھی ہے تو کیا مفتاح الجنتہ ان مذہب کی کتابوں کی تمام تصریحات کو ناقابل عمل اور غیر معتبر اور غلط قرار دیدے گی۔

ثالثاً: میں نے مفتاح الجنتہ جو مولوی شاہ کرامت علی صاحب جوہپوری کی تصنیف ہے اور ۱۳۰۶ھ میں مطبع نامی لکھنؤ میں چھپی ہے، اس کے چار مقام دیکھے لیکن مجھے اس میں مسبوق کے ثاپڑھنے کی ممانعت کسی میں نظر نہ آئی۔ بلکہ اس میں ایک مستقل باب احکام مسبوق میں ملا جس میں وہ صاف تحریر فرماتے ہیں۔

جو شخص کہ امام کے ساتھ آخر نماز میں ملے یعنی اس کے اوپر کی نماز جاوے تو اس کو مسبوق کہتے ہیں اور مسبوق کا مسئلہ اس طرح پر ہے کہ مثلاً ایک شخص فجر کی نماز میں امام کو دوسری رکعت میں پاوے تو ثا اور تعوذ اور تسمیہ کہے۔ (ص ۵۷)

اسی کتاب کے یہ آخری الفاظ۔ تو ثا اور تعوذ اور تسمیہ کہے۔ اگر اس سے وقت شروع مراد لیا جائے تو یہ خلاف تصریحات کتب فقہ قرار پاتا ہے کہ مسبوق کا بوقت شروع تعوذ و تسمیہ پڑھنا اب تک کی فقہ کی کتاب میں نظر سے نہیں گزرا۔ ثا کے متعلق تو اتنا کتب فقہ میں ہے کہ مسبوق سری نماز میں ثاپڑھ سکتا ہے لیکن اس میں بھی اگر امام کو دوسرے سجدے میں یا قعدہ میں پایا تو بہتر یہ ہے کہ بغیر ثاپڑھے شامل ہو جائے۔ اور رکوع اور پہلے سجدے میں بھی اگر گمان غالب یہ ہے کہ ثاپڑھنے میں اس امام کے ساتھ شرکت نہ ہو سکے گی جب ثا نہ پڑھے۔

الحاصل شروع میں ثا کے متعلق بھی مطلقاً مسبوق کو اجازت نہیں ملی تو پھر تینوں ثا اور تعوذ اور تسمیہ کا شروع میں مراد لینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؛ تو لا محالہ اس عبارت مفتاح الجنتہ کی یہ مراد لینا ہے کہ جب مسبوق اپنی فوت شدہ رکعات پڑھنے کیلئے کھڑا ہوا تو ثا اور تعوذ اور تسمیہ کہے لہذا اب زید آنکھیں کھول کر دیکھے کہ مفتاح الجنتہ سے بھی مسبوق کیلئے ثاپڑھنے کا حکم ثابت ہوا۔ تو زید کا مفتاح الجنتہ کو سند میں لانا بھی غلط ہوا۔

اب باقی رہا زید کا بہشتی زیور کو اپنی سند میں پیش کرنا تو بہشتی زیور بھی کوئی ایسی کتاب ہے جسکو سند میں پیش کیا جاسکے۔ کہ کہیں اس میں کہانیاں، غیر معتبر قصے، کہیں صابن بنانے، کھانا پکانے کی ترکیبیں

اور کہیں رنگنے اور پارسل وغیرہ ڈاک خانہ کے طریقے۔ کہیں امراض کے علاج ہیں تو کہیں مخصوص شکایات کے شرمناک و حیا سوز نسخے۔ کہیں مسلمان کو مشرک و بدعتی بتانے کے باطل عقائد ہیں تو کہیں مرجوح اور غیر مفتی بہ مسائل۔ تو ہر ذی عقل کے نزدیک تو ایسی کتاب قابل سند نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر زید اس بنا پر پیش کرتا ہے کہ وہ اس کے حکیم الامت تھانوی صاحب کی مصنفہ ہے، اس کے ایک ایک حرف ایک ایک لفظ پر ایمان ہے کہ اس کے خلاف آیات قرآنی۔ اور احادیث نبوی آجائیں تو وہ سب قابل انکار ہیں۔ تو پھر ایسے شخص کی کتب فقہ اور تصریحات فقہا کیا تسکین کر سکتی ہیں۔

لہذا اب ایسی الٹی کھوپڑی کیلئے انہیں بہشتی زیور والے حکیم الامت تھانوی کے فتاویٰ اشرفیہ سے تین زبردست اور عظیم الشان پہاڑیاں لاتے ہیں۔ زید بگوش ہوش سنے۔ امداد الفتاویٰ معروف بہ فتاویٰ اشرفیہ مطبوعہ مجتبائی دہلی۔ ۱۳۲۹ھ۔

سوال، جو شخص فرض ظہر یا عصر کی چوتھی رکعت میں شریک ہو اوہ تین رکعت باقی کس طور سے ادا کرے، کس رکعت کے بعد جلسہ کرے اور کن رکعتوں میں ختم سورت کرے۔ کئے رکعت بدو سورت کے پڑھے؟ اور جو شخص تیسری رکعت میں شریک ہو اوہ دو رکعت باقی کس طور سے ادا کرے؟۔ جو مغرب کی تیسری رکعت میں امام کیساتھ شریک ہو اوہ اپنی دو رکعت باقی کس طور سے ادا کرے؟۔ جلسہ اور ختم سورت کن رکعت میں کرے فقط۔

الجواب۔ جسکی کوئی رکعت امام کے ساتھ فوت ہوگئی ہو اس کو مسبوق کہتے ہیں اس کی باقی نماز حق قرأت میں اول ہوتی ہے اور حق تشہد میں آخر۔

یقضی اول صلوٰۃ فی حق قرأۃ و آخر ہافی حق تشہد۔ (در مختار)
پس جو شخص ظہر یا عصر میں چوتھی رکعت میں شریک ہوا۔ بعد فراغ امام کے کھڑا ہو کر ثا اور تعوذ پڑھ کر فاتحہ و سورت پڑھے۔ اور یہ رکعت پوری کر کے قعدہ کرے پھر کھڑا ہو کر وہ رکعت بھی فاتحہ و سورت سے پڑھ کر پچھلی رکعت فقط فاتحہ سے پڑھ کر نماز تمام کرے۔ اور جو تیسری میں شریک ہو اوہ دونوں رکعتیں فاتحہ و سورت سے پڑھے اور ان دونوں کے بیچ میں جلسہ نہ کرے۔ دونوں کے بعد قعدہ اخیرہ کو کے فارغ ہو۔ جو مغرب کی تیسری میں شریک ہو اوہ دونوں میں فاتحہ و سورت پڑھے اور ہر رکعت پر بیٹھے۔ فقط

واللہ اعلم۔ از فتاویٰ اشرفیہ حصہ اول ص ۲۲۔
سوال۔ جس میں پانچ سوالات اور ہیں اور چھٹا سوال بالکل یہی ہے۔ صرف اتنے الفاظ کا تغیر

ہے (کئے رکعت کے بعد جلسہ کرے) یعنی بجائے کس کے کئے ہے، کریں کے کرے ہے۔ ختم سورت کی جگہ ضم سورت ہے، اور بجائے اس کے کہ پہلے سوال کو فقط پر ختم کر دیا۔ اس میں اتنی عبارت اور زائد کی جواب بسند کتب تحریر ہو۔ بینوا عند اللہ تو جروا۔

معلوم ہوتا ہے کہ فتاویٰ کے صفحات زائد کرنے کیلئے ایک سوال کو بار بار لکھا گیا ہے اور فرق کیلئے اسپر پانچ سوالوں کا اور اضافہ کر دیا گیا ہے تاکہ پہلے سے ممتاز ہو جائے۔ یا اسی سائل نے بعینہ اسی سوال کو کسی شبہ کے بنا پر پھر انہیں الفاظ میں دریافت کیا ہے۔ یا کس دوسرے سائل نے کسی شک کی بنا پر اسی سوال کو پھر نقل کر دیا ہے ورنہ کسی ناواقف سائل نے بالکل سوال کی وہی شکل وہی الفاظ وہی ترتیب کس طرح لکھی۔ اب جو چند الفاظ کا فرق ہے وہ کتابت میں بھی ہو جاتا ہے۔ اب جواب کا حال دیکھئے۔

الجواب۔ اس جواب اور پہلے جواب میں بالکل فرق نہیں۔ ایک دو جگہ تو اتنا معمولی فرق ہے کہ اس جواب میں لفظ جوزائد ہے اس میں نہیں ہے۔ اور اس میں آخر میں لفظ فقط ہے۔ اس میں ہے البتہ شروع میں ایک یہ فرق ہے کہ جسکی کوئی رکعت امام کے ساتھ فوت ہوگئی ہو اس کو مسبوق کہتے ہیں یہ عبارت تو پہلے جواب کی ہے، اس جواب میں بجائے کوئی کے ایک دو ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ بالکل پہلے جواب ہی کو نقل کر دیا ہے اور اسی طرح اسی فتاویٰ کا حجم مکررات سے بڑھایا گیا ہے۔ یہ ہے اس حکیم الامت کی قابلیت کا ایک نمونہ۔ پھر اس جواب میں ایک یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس میں مسبوق کی تعریف اب ان الفاظ میں ہوگئی جسکی ایک دور رکعت امام کے ساتھ فوت ہوگئی ہو اس کو مسبوق کہتے ہیں۔ تو اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ جسکی تین رکعتیں فوت ہوگئی ہوں یا چار رکعتیں فوت ہوگئی ہوں اور وہ قعدہ اخیرہ میں شریک ہوا ہے۔ وہ ان کے نزدیک مسبوق نہیں تو نہ معلوم اس کو یہ کیا کہتے ہیں۔ باوجودیکہ مسبوق کی تعریف اسی درمختار میں ہے جسکی انہوں نے عبارت اسی جواب میں نقل کی ہے۔

بالجملہ اس جواب میں بھی انہوں نے مسبوق کو ثنا اور تعوذ کا حکم ان الفاظ میں دیا ہے کہ بعد فراغ امام کے کھڑا ہو کر ثنا و تعوذ پڑھ کر فاتحہ و سورت پڑھے۔ یہ سوال و جواب اسی فتاویٰ امدادیہ معروفہ۔ فتاویٰ اشرفیہ کے ص ۱۰۷ اور ص ۱۰۸ پر ہے۔

سوال۔ مسبوق رکعات جہر یہ و خفیہ میں ثنا و تعوذ و تسمیہ تینوں پڑھے یا نہیں؟ اور جب بعد فراغت کے اپنی بقیہ رکعتیں ادا کرنے کے لئے کھڑا ہو تو اس وقت ثنا و تعوذ و تسمیہ تینوں پڑھے یا صرف تعوذ و تسمیہ پر قناعت کرے؟۔ جو کچھ فرق اس مسئلہ کے متعلق رکعات جہر یہ و خفیہ میں ہو مطلع فرمائے گا۔

الجواب۔ فی الدر المختار قبل باب الاستحلاف المسبوق منفرد حتی یثنی و یعوذ و یقرأ و ان قرأ مع الامام بعدم الاعتداد بہا لکراہتہا مفتاح السعادة فیما یقضیہ اہ مختصرا۔ اس عبارت سے دو امر مستفاد ہوئے ایک یہ کہ مسبوق امام کے ساتھ ثنا و تعوذ و تسمیہ نہ پڑھے۔ دوسرے یہ کہ بعد فراغ امام کے جب اپنی بقیہ نماز پڑھنے کھڑا ہو سب چیزیں اور قرأت پڑھے اور جہری دوسری اس حکم میں دونوں برابر ہیں۔ لا طلاق الدلیل واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۱۷۱ یقعدہ ۱۳۲۳ھ۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ان تینوں جوابوں میں انہیں بہشتی زیور کے مصنف تھانوی نے مسبوق کے لئے صاف لکھ دیا کہ وہ بعد فراغ امام کے کھڑا ہو کر ثنا و تعوذ پڑھ کر فاتحہ و سورت پڑھے۔ اسی طرح تیسرے جواب میں صاف کہا کہ وہ بعد فراغ نماز امام کے جب اپنی بقیہ نماز پڑھنے کھڑا ہو سب چیزیں اور قرأت پڑھے۔ سب چیزوں سے مراد ثنا و تعوذ و تسمیہ ہے کہ انہوں نے خود انکا ذکر کیا اور سوال ہی ان کے متعلق ہے، تو اب زید بتائے کہ وہ اس مسبوق کے مسئلہ میں بہشتی زیور کو مانا گیا یا فتاویٰ اشرفیہ کو۔ پھر یہ بھی بتائے کہ ان دونوں کتابوں میں سے کون سچی ہے کون جھوٹی اور کون حق پر ہے اور کون باطل اور کس پر عمل کیا جا لگا اور کس کو ناقابل عمل ٹھرایا جائیگا؟۔

افسوس جس تھانوی کی محبت میں قرآن عظیم سے منہ موڑا۔ احادیث رسول کریم کو چھوڑا۔ سلف و خلف کی کتابوں سے تعلق توڑا۔ اسی تھانوی نے زید کی عزت خاک میں ملا دی۔ تمام حجت و بحث کی عمارت گرا دی۔ مخالف کی بات بنادی۔ موافق کے منہ پر مہر سکوت لگا دی۔ بحمد اللہ اس مسئلہ پر نہایت کافی بحث ہوگئی اور حقانیت آفتاب کی طرح روشن ہوگئی جس پر اب مخالف کو مجال سخن و جانے دمزدن باقی نہیں۔ مولیٰ تعالیٰ مخالف کو قبول حق کی توفیق دے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

اور مسبوق بعد فراغ امام جب اپنی باقی نماز پڑھنے کیلئے کھڑا ہو تو اگر وہ سری نماز ہے تو وہ قرأت آہستہ پڑھے اور جہری نمازوں میں مختار ہے کہ چاہے قرأت آہستہ پڑھے یا جہر کے ساتھ۔

لان المسبوق منفرد فی حق ما بقی والمنفرد ان قضی السریۃ یخاف وان قضی الجہریۃ خیر فکذلک المسبوق هذا مستفاد من الطحطاوی ورد المختار وغیرہما۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۲۸۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ
مسجد کے متصل برآمدہ ہے اور درمیان کی دیوار کی موٹائی ایک گز یا اس سے کم و بیش ہو اور اس میں
صرف دو کھڑکیاں ہوں دروازہ یا در کچھ نہ ہوں تو اس برآمدہ میں امام مسجد کی اقتدا کرے تو یہ اقتدا صحیح ہو
سکتی ہے باوجود کہ یہ مقتدی مسجد کے اندر مقتدیوں سے جدا ہیں۔ مسجد کے اندر کی صف سے ان کا اتصال
نہیں ہے۔ اور جب اتصال صفوف نہیں ہے تو کیا ان دونوں کھڑکیوں کا کھلا ہونا ان کی اقتدا کو درست
کرے گا یا نہیں؟۔ امام مسجد کے اندر ہے اور اس کے ساتھ مسجد میں مقتدی ہیں اور کچھ مقتدی اس برآمدہ
میں۔ بیوا تو جروا

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

اتصال صفوف اقتدا کے لئے ضروری ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ مقتدی کو امام کے
انتقالات کا علم سن کر یاد دیکھ کر ہو جائے۔ مراقی الفلاح میں ہے:

من صلی علی سطح بیتہ المتصل بالمسجد او فی منزله بحنب المسجد وینہ
وبین المسجد حائط مقتدیا بامام فی المسجد وهو یسمع التکبیر من الامام او من المکبر
تجوز صلاته۔

(طحاوی مصری ص ۱۷۰)

جس نے اپنے گھر کی چھت پہ نماز پڑھی جو مسجد سے متصل ہے یا اپنے گھر میں جو مسجد کے پہلو
میں ہے اور اس کے اور مسجد کے درمیان دیوار ہے اور وہ مسجد کے امام کی اقتدا کر رہا ہے اور وہ امام یا مکبر
کی تکبیر سنتا ہے تو اس کی نماز جائز ہے اور اقتدا صحیح ہے۔
فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

یصح ان کان الحائط صغیر الا یمنع او کبیر اولہ ثقب لا یمنع الوصول وکذا اذا
کان الثقب صغیر ایمنع الوصول الیه لکن لا یشتبہ علیہ حال الامام سماعاً او رویۃ ہو
الصحیح۔

(ص ۱۷۶ ج ۱)

اور اقتدا صحیح ہے اگر دیوار چھوٹی ہو اور مانع نہ ہو۔ اور اگر بڑی ہو اور اس میں ایسا سوراخ ہو جو
آواز پہنچنے کیلئے مانع نہ ہو اور اسی طرح جب سوراخ چھوٹا ہو اور آواز پہنچنے کیلئے مانع ہو لیکن اس پر امام کا حال

سکریا دیکھ کر مشتبہ نہ ہو یہی صحیح قول ہے۔

ان عبارات سے واضح ہو گیا کہ صورت مسئلہ میں جب برآمدہ مسجد سے متصل ہے اور جو دیوار ہے
اس کا ایسا عرض نہیں جو اتصال صفوف کو مانع ہو پھر اس دیوار میں بھی کھڑکیاں ہیں جن سے امام کے
انتقالات کا علم بلا اشتباہ ہو جائیگا تو برآمدہ کے مقتدیوں کو امام مسجد کی اقتدا کرنا صحیح ہے اور اتصال صفوف
حاصل ہے کہ ان کھڑکیوں سے کم از کم امام کی آواز ان برآمدہ کے مقتدیوں کو ضرور پہنچے گی۔ لہذا یہ مقتدی
مسجد کے اندر کے مقتدیوں سے جدا نہیں ہوئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: ا. معتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنہجل

(۲۸۹)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ ذیل میں کہ
زید مولوی اشرف علی تھانوی کا مرید اور خلیفہ ہے اور دیوبندی عقائد بھی رکھتا ہے مگر کبھی کبھی میلاد
شریف کی محفلوں میں شرکت کر کے سلام بھی پڑھ لیتا ہے لیکن ضروری نہیں سمجھتا۔ اور کھانا وغیرہ پر فاتحہ بھی
کر لیتا ہے۔ لہذا زید کے پیچھے اہل سنت و جماعت کی نماز ہوگی یا نہیں؟ اور سینوں کو اس کے پیچھے جان
بو جھ کر نماز پڑھنا کیسا ہے؟ صاف صاف بیان کیجئے۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

جب زید مولوی اشرف علی تھانوی کا مرید و خلیفہ ہے تو وہ انکو کم از کم مسلمان اور عالم پیشوا تو اعتقاد
کرتا ہی ہوگا اور انکے عقائد و احکام کو صحیح جانتا ہوگا اور انکی کتاب حفظ الایمان کے کفری قول کو کفر نہ سمجھتا ہو
گا۔ تو زید کے بدن مذہب و گمراہ ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ دیوبندی عقائد بھی رکھتا ہے
لہذا زید کے پیچھے اہل سنت و جماعت کی نماز ہرگز نہ ہوگی اور ہمارے برادران اہلسنت ان کے پیچھے
نماز نہ پڑھیں۔

کبیری میں ہے:

وعن ابی حنیفۃ و ابی یوسف رحمہما اللہ تعالیٰ ان الصلوٰۃ خلف اہل الاہواء

لا تجوز۔

اور ظاہر ہے کہ زید تفصیل بالا کی بنا پر اہل اہواء سے ہے تو اس کی نماز حقیقہ نماز نہیں اور وہ جماعت دراصل جماعت نہیں۔ اب باقی رہا زید کا میلاد شریف کی محفل میں شریک ہونا اور سلام پڑھنا اور فاتحہ وغیرہ اعمال کر لینا تو ان پر سنیت کا دارومدار نہیں، دیوبندی اس کو کسی اعتقاد کی بنا پر نہیں کرتے ہیں بلکہ عوام اہل سنت کو اپنی دام تزویر میں پھانسنے کے لئے کرتے ہیں۔ تو ان کی ان باتوں پر انہیں سنی سمجھ لینا ہمارے عوام سنی بھائیوں کی سادہ لوحی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: ۱۔ مقتضی بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل
(۲۹۰) سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ اقامت سے پہلے یا اقامت شروع ہوتے ہی مقتدیوں کو کھڑا ہو جانا چاہئے یا حی علی الفلاح کے وقت؟

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم
اقامت سے پہلے یا بوقت شروع مقتدیوں کا کھڑا ہو جانا مکروہ ہے۔ بلکہ انہیں حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا چاہئے۔

عالمگیری میں ہے: اذا دخل الرجل عند الاقامة يكره له الانتظار قائما ولكن يقعد ثم يقوم اذا بلغ المؤذن قوله حي على الفلاح كذا في المضمرة ان كان المؤذن غير الامام وكان القوم مع الامام في المسجد فانه يقوم الامام والقوم اذا قال المؤذن حي على الفلاح عند علمائنا الثلاثة وهو صحيح والله تعالى اعلم۔

کتبہ: ۱۔ مقتضی بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۲۹۱-۲۹۲-۲۹۳-۲۹۴)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں حضرات علماء کرام و مفتیان شرع عظام و امت برکاتہم النور یہ مسائل ہذا میں کہ (۱) لاؤڈ اسپیکر پر نماز درست بلا کراہت جائز ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو صحیح و جائز نہ ہونے کا

کیا سبب ہے۔ کیا کوئی صورت ہے کہ جس سے نماز لاؤڈ اسپیکر پر صحیح و درست بلا کراہت جائز ہو جائے۔ نیز اذان و اقامت لاؤڈ اسپیکر پر پڑھنا کیا جائز ہے یا نہیں؟

(۲) گراموفون سے جو آواز نکلتی ہے وہ عین آواز متکلم ہے یا نہیں، لاؤڈ اسپیکر سے جو آواز نکلتی ہے وہ عین آواز متکلم ہے یا نہیں؟

(۳) لاؤڈ اسپیکر پر نماز ہو تو مقتدیوں کی نماز ہوگی یا نہیں۔ اگر نہیں ہوگی تو کس بنا پر مفصل و مدلل بیان کیجئے؟

(۴) لاؤڈ اسپیکر پر نماز ہو تو امام کی نماز ہوگی یا نہیں اگر نہیں ہوگی تو کس بنا پر مفصل مدلل بالتفصیل تحریر فرمائیں۔ مینو اتو جروا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) امام و مقتدی کے درمیان تکبیرات وغیرہ کی آواز پہنچانے کے لئے لاؤڈ اسپیکر ایک واسطہ ہے اور ظاہر ہے کہ وہ انکا غیر ہے، انکی نماز میں شریک نہیں۔ تو مقتدی کی نماز کی بنا ایسی چیز پر لازم ہے جو انکا غیر ہے اور خود نمازی نہیں۔ لہذا مقتدی نے قول غیر پر عمل کیا جو مفسد صلوٰۃ ہے۔

ردالمحتار میں ہے: اخذ المصلى غير الامام بفتح من فتح عليه تفسد ايضا كذا في البحر عن الخلاصة او اخذ الامام بفتح من ليس في صلاة۔ تو لاؤڈ اسپیکر کی آواز پر جو لوگ اقتدا میں ارکان نماز ادا کریں گے انکی نماز نہ ہوگی۔

اب باقی رہی یہ تحقیق کی لاؤڈ اسپیکر اور گراموفون میں جو آواز مسموع ہوتی ہے وہ عین آواز متکلم اور قرع اول ہی ہے۔ یا نہیں۔ تو اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ان سے عین آواز متکلم بھی سنی جاتی ہے تو اس سے تو کسی طرح انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آواز متکلم پر برقی طاقت کی آواز کا شمول اصل آواز متکلم سے کئی گنا زائد ہے۔ اسکا ثبوت ظاہر ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز اس قدر دور تک پہنچ جاتی ہے کہ اصل آواز متکلم اتنی دور تک ہرگز ہرگز نہیں پہنچ سکتی۔ اسی غلبہ کی بنا پر اس آواز کی نسبت لاؤڈ اسپیکر یا گراموفون کے طرف کردی جاتی ہے۔ اور ہر سننے والا یہ بے تکلف کہتا ہے کہ یہ لاؤڈ اسپیکر یا گراموفون کی آواز ہے اور یہ آلات اس آواز کو اپنی کیفیات کے ساتھ اس قدر مکیف کر دیتے ہیں کہ کبھی اصل متکلم کی آواز کا امتیاز مٹ جاتا ہے اور پہچان میں نہیں آتا کہ کون بول رہا ہے۔ تو ان آلات کے تصرفات کا انکار نہیں کیا

جاسکتا۔ لہذا یہ ماننا پڑے گا کہ ان آلات سے عین آواز متکلم میں زبردست اضافہ اور بین فرق پیدا ہو گیا تو اس آواز پر نہ سجدہ تلاوت واجب، نہ اقتدا صحیح۔ اور اب استعمال کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان آلات میں عین آواز متکلم اپنی اصلیت پر باقی نہیں رہتی اور قرع اول باقی نہیں رہتا بلکہ آواز بازگشت ہو جاتی ہے تو اس بنا پر اقتدا ہی صحیح نہیں ہے۔

رہی امام کی نماز تو اس کے لئے یہ وجہ فساد تو نہیں ہے مگر وہ بھی کراہت سے خالی نہیں، اس لئے کہ آلہ سے نماز کے شغل خاص میں خلل پیدا ہوتا ہے، جو کراہت کو مستلزم ہے۔ رہا اذان و اقامت کا حکم تو اس میں اگرچہ نماز کے سے احکام نہیں لیکن ان میں اس آلہ کا استعمال خلاف اولیٰ ضرور قرار پائے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

کتبہ: المقتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدۃ سنہجل

مسئلہ (۲۹۵-۲۹۶-۲۹۷)

کیا فرماتے ہیں حضرات علماء کرام و مفتیان شرع عظام دامت برکاتہم النور یہ مسائل ہذا میں
(۱) آج ہی یہاں کی جامع مسجد میں پیش امام صاحب جو یہاں کے خطیب بھی ہیں تکرار ہوتے ہوئے جھگڑا ہو گیا۔ وہ اس بحث پر کہ جماعت فرض سے پڑھا ہوا شخص ہی جماعت سے نماز وتر پڑھ سکتا ہے۔ دوسرا شخص جماعت سے وتر نہیں پڑھ سکتا، اس کا جماعت سے وتر پڑھنا جائز نہیں۔ یہ کہاں تک صحیح ہے۔ اصل مسئلہ کا حل کیا ہے؟

(۲) ہمیشہ کی طرح رمضان میں حیدرآباد سے رائے پور جامع مسجد کو تراویح پڑھانے اختر نجمی صاحب آئے ہیں اور جامع مسجد کے پیش امام جو خطیب بھی ہیں، یہ اعتراض پیش کر رہے ہیں، کہ جو پیش امام داڑھی صاف کرائے اس کے پیچھے اس کی امامت جائز نہیں۔ نماز پڑھنا نہیں چاہتے، یہ کیا صحیح ہے۔ اصل مسئلہ کیا ہے؟

(۳) یہ پیش امام جامع مسجد جو خطیب بھی ہیں، آجکل جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں، اور ابو الاعلیٰ مودودی کا لٹریچر ہر وقت زیر مطالعہ رکھتے ہیں، چونکہ یہ رائے پور کے خطیب ہیں، کیا انہیں سنیوں کو بحیثیت خطیب کے اس طرح دوسری جماعتوں سے رابطہ پیدا کر لینا جائز ہے۔ اور کیا انکی خطابت و امامت جائز ہے؟ کیا انہیں سنی اپنا امام بنا سکتے ہیں۔ یہاں کے دیگر سنی بھائی امامت سے ہٹا دینا چاہتے

ہیں۔ کیا ان کیساتھ ایسا سلوک کرنا جائز ہوگا۔ اور پھر خطیب صاحب کی کئی ایک ٹریژین بھی انعام کی ہے اس کا کیا کریں۔ آیا اس حکومت کے قبضہ میں دیدیں، نتیجہ میں کاروائی یہی صورت اختیار کرے گی۔ خطیب کا بیان یہ ہے کہ درگاہوں پر نہ جاؤ۔ نذر و نیاز نہ کرو۔ اور پھر یہ صاف کہتے ہیں، کہ زندے مردوں کو فائدہ پہنچاؤ۔ مردے زندہ کو کیا فائدہ پہنچائیں گے۔ کیا ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے؟

یہ میں اکیلا معلوم کرنا نہیں چاہتا ہوں۔ بلکہ میرے تمام اہل محلہ بھی اس کے خواہش مند ہیں۔ میرے محلہ کی مسجد میں اس پر بہت قیاس ہوا پھر میں نے انکو اطلاع لکھ کر جواب کا انتظار کرنے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ حالات دن بدن بگڑتے جا رہے ہیں، اس لئے اپنے معلوماتی کونیں سے کچھ فیض ہمیں بھی پہنچاویں۔ بیک وقت میں نے کافی سوالات لکھ دیا۔ مگر میں مجبور تھا، قبلہ محترم، کچھ واقعات ہی ایسے پیش آگئے۔ تو آپ سے معلوم کر لینا ہی مناسب سمجھا، اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) جس نے فرض عشاء جماعت سے نہ پڑھی ہو وہ وتر بھی جماعت سے نہ پڑھے۔ ردالمحتار میں ہے۔ اذا لم یصل الفرض معہ لا یتبعہ فی الوتر۔ اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ جس نے جماعت سے فرض نہ پڑھے ہوں وہ جماعت سے وتر نہیں پڑھ سکتا۔ جو اسکے خلاف کہتا ہے وہ اس عبارت شامی کا جواب دے۔ اور اپنے دعوے پر بھی وہ ایسی عبارت پیش کرے ساری علمی قابلیت کی پول کھل جائے گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۲) جو شخص یکمشت سے کم داڑھی رکھتا ہو، یا بالکل صاف ہی کرادیتا ہو، وہ بلاشبہ فاسق ہے۔ اس کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے۔ اور اس کے پیچھے جو نماز پڑھی جائے گی، وہ واجب الاعداد ہوگی، لہذا خطیب کا یہ اعتراض تو صحیح ہے، کہ اسکے پیچھے نماز نہ پڑھنی چاہیے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۳) جب یہ امام و خطیب جامع مسجد مودودی جماعت سے تعلق رکھتا ہے، اور مودودی کے لٹریچر کو صحیح جانتا ہے، اور عقائد و اعمال کی تصدیق کرتا ہے، اور اسکے بالمقابل عقائد مسائل اہل سنت کو غلط و باطل اور بدعت و شرک کہتا ہے، اور اسکے قول کے بموجب ساری امت کو بدعتی و مشرک جانتا ہے، تو اس امام کو جامع مسجد کی امامت سے علیحدہ کر دینا ضروری ہے، اہل سنت اس کے پیچھے ہرگز ہرگز نماز نہ

پڑھیں، کہ یہ امام گمراہ ہو گیا اور گمراہوں کے پیچھے نماز کے جائز ہونے کا قول خود ہمارے امام اعظم علیہ الرحمۃ کا ہے۔

کبیری میں ہے۔ روی محمد عن ابی حنیفہ و ابی یوسف ان الصلوٰۃ خلف اهل الهواء لا تجوز۔ لہذا لائل اسلام اس امام کو جامع مسجد کی امامت سے علیحدہ کر دیں کہ اس کے پیچھے کسی کی نماز نہیں ہوتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۲۸۸ھ

(۲۹۸)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

زید کا کہنا ہے کہ نماز پڑھنے میں امام سب کچھ پڑھتا ہے۔ مقتدی کو بھی سب پڑھنا چاہیے، اور اگر امام کے اوپر بات ہے تو مقتدی کو کچھ بھی نہ پڑھنا چاہیے، التحیات تسبیح رکوع وسجود بھی نہ پڑھنا چاہیے کہ امام تو سب پڑھتے ہیں۔
المستفتی حبیب اللہ مظفر پور

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

عقلاً تو مقتدی کو نماز میں سب کچھ پڑھنا چاہیے تھا کہ وہ اپنے فریضہ کو ادا کر رہا ہے لیکن قرأت کے متعلق چونکہ حدیث شریف میں وارد ہو گیا۔ من کان له امام فقرأه الامام له قراءة۔ یعنی جس کا امام ہو تو امام کا قرأت کرنا اسی کا قرأت کرنا ہے تو اس حدیث کے حکم سے مقتدی سے صرف قرأت کو معاف کر دیا گیا۔ باقی رہے اور اذکار، ثنا، تسبیحات، تشہد چونکہ ان کے لئے کوئی شارع علیہ السلام کا ایسا حکم وارد نہیں، تو مقتدی ان سب کو پڑھے گا جن میں امام کا پڑھنا مقتدی کے لئے کافی ہو سکتا ہے، فقط۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۲۸۸ھ

(۲۹۹)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

بڑے مقامات پر جیسے دہلی، اجمیر شریف، وغیرہ، عیدین، عرس وغیرہ کے موقع پر نماز کے لئے لوگ چھتوں پر بھی نماز پڑھتے ہیں۔ کہیں امام سے اونچے کہیں نیچے، کہیں درمیان میں، زیادہ جگہ چھوٹی ہوئی تو لوگوں کی کثرت کی وجہ سے امام کی آواز سنائی نہیں دیتی ہے، تو امام کی حرکت وانتقال کے وقت توپ چھوڑی جاتی ہے، توپ کی آواز پر لوگ رکوع، سجدہ وغیرہ کرتے ہیں تو اس صورت سے نماز ہوگی یا نہیں؟ کثرت کی وجہ سے نماز کا محققہ ادا نہیں ہو سکتی ہے۔ مصلی چاروں طرف سے دبا ہوا ہے، بچوں کی طرح نماز میں دھکے لگتے جاتے ہیں، سجدہ بھی گھٹنوں کے قریب ہی ہوتا ہے، ایسی حالت کی نماز ہوگی کہ نہیں۔ اس پر بھی لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو پڑھتے ہیں خدا قبول کرے یا نہ کرے۔ امام کی آواز سنائی دینے کے لئے لاؤڈ اسپیکر استعمال کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر استعمال کیا تو نماز ہوگی یا نہیں؟

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

ازدہام کے مواقع پر چھت اور ہر اس جگہ اقتدا کی جاسکتی ہے جہاں تک صفوں کا اتصال ہو، درمیان میں فاصلہ نہ ہو، امام کے انتقالات کا صحیح طور پر علم ہوتا ہو اگرچہ بوجہ کثرت کے سجدہ گھٹنوں کے قریب ہی کرنے پڑتے ہوں۔ اور ہر طرف سے دباؤ پڑتا ہو۔ اور امام کی آواز بھی نہ سنتا ہو، صرف مکبرین کی تکبیروں کی آواز آتی ہو، جس پر رکوع سجدہ وغیرہ ادا کرتا ہو۔ چاہے وہ مقام امام کی جگہ سے پست ہو یا بلند ہو۔ تو اس طرح مقتدی کی نماز ہو جائے گی، لیکن توپ کی آواز یا لاؤڈ اسپیکر کی آواز پر رکوع یا سجدہ وغیرہ انتقالات کرنا اور اس کو امام کی اقتدا سمجھنا سخت غلطی ہے، کہ یہ ہر دونوں چیزیں نمازی نہیں، لہذا ان کا امام ومقتدی کی نماز کے درمیان میں آجانا مقتدی کی نماز کے لئے مفید صلوٰۃ ہے۔ تو لاؤڈ اسپیکر یا توپ کا نماز کے انتقالات کے لئے شرعاً ناجائز ممنوع ہے۔ ان کی آوازوں پر اقتدا صحیح نہیں۔ اس میں میرا ایک مستقل مبسوط فتویٰ ہے، جو فتاویٰ اجملیہ میں موجود ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۲۸۸ھ

مسئلہ

(۳۰۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ
بوقت جماعت نماز پنجگانہ میں اکثر اشخاص تکبیر کے قد قامت الصلوٰۃ الفاظ ہونے تک بیٹھے رہتے
ہیں۔ شریعت میں یہ امر کیسا ہے؟

ح۔ م۔ اشرفی ۲۵ اکتوبر

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم
نماز پنجگانہ کی جماعتوں کے لئے لوگوں کو صف بنا کر بیٹھ جانا مستحب ہے اور پھر جب مکبر (حی
علی الفلاح) پر پہنچے اس وقت سب لوگوں کو کھڑا ہونا چاہئے ابتداء تکبیر سے کھڑا ہو جانا مکروہ ہے جیسا
کہ فتاویٰ عالمگیری و شامی وغیرہ کتب فقہ میں بالتصریح موجود ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب
کتبہ: المقتضی بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبید محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

اللہ اکبر

﴿۲۱﴾

باب الامامت

مسئلہ

(۳۰۱-۳۰۲-۳۰۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ
(۱) ایک شخص یہ کہتا ہے کہ جو شخص زانی ہو یا اغلام کرتا ہو اور کرتا ہو یا قمار بازی کرتا ہو یا شراب
پیتا ہو اس قسم کے تمام لوگوں کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے آیا یہ کہنا اس شخص کا درست ہے یا نہیں جواب
مع حوالہ قرآن و حدیث کے ہونا چاہئے۔
(۲) جو شخص ایسا ہو کہ اس کو علم ہے کہ میری عورت کا دوسرے شخص سے تعلق ہے اور اس نے اپنی
آنکھ سے اپنی عورت کو زنا کراتے دیکھ لیا ہو اور اس پر بھی اس نے عورت کو طلاق نہ دی اور نماز پڑھانے
کے لئے تیار ہو تو ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں؟
(۳) اگر نکاح سے آزاد ہو گئی ہو اس نے طلاق دیدی ہو اور بغیر نکاح اپنی بیوی بنا کر رکھتا ہو تو
ایسے شخص کے پیچھے بھی نماز درست ہے یا نہیں۔ بینوا تو جروا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) فاسق معلن۔ زانی۔ مغلم۔ جواری۔ شرابی۔ اور ہر وہ شخص جو کوئی گناہ کبیرہ بالا اعلان کرتا ہو
اس کو امام بنانا معصیت ہے اور امامت کے لئے پیش کرنا مکروہ تحریمی۔

کبیری میں ہے: لو قدموا فاسقا یا ثمون بناء علی ان کراهة تقدیمہ کراهة تحریم
لعدم اعتنائہ بامور دینہ و تساہلہ فی اتیان بلوازمہ فلا یعدہ منہ الاخلال ببعض شروط
الصلوٰۃ و فعل ما ینافیہا بل هو العال بال نظر الی فسقہ۔ (ص ۴۷۹)

اور مراقی الفلاح میں ہے: کرہ امامۃ الفاسق العالم لعدم اهتمامہ بال دین فتجب
اھانتہ نہرعا فلا یعظم بتقدیمہ للإمامۃ۔ (حاشیہ طحاوی مصری ص ۱۷۶)

طحاوی میں ہے: ومفادہ کون الکراہۃ فی الفاسق تحریمیۃ۔ (ص ۱۷۶)

جوہرہ نیرہ میں ہے: نو تکرہ الصلوٰۃ خلف شارب الخمر واکل الربا لانه فاسق۔

(ص ۸۵)

شامی میں ہے: اما الفاسق فقد عد کراہۃ تقدیمہ بانہ لایہتم لامر دینہ و بان فی تقدیمہ للامامۃ تعظیمہ وقد وجب علیہم اہانتہ شرعاً۔ (مصری ص ۳۹۳)
ان عبارات سے صاف طور پر معلوم ہو گیا کہ فاسق کا امام بنانا گناہ اور اس کا امامت کے لئے پیش کرنا مکروہ تحریمی ہے اور انتہائی درجہ ہے کہ فاسق کے پیچھے نماز مکروہ تنزیہی ہوگی اور ہر نماز جو کراہت سے ادا ہو اس کا اعادہ کرنا چاہئے۔

مراتی الفلاح میں تجنیس سے ناقل ہیں: کل صلوٰۃ ادیت مع الکراہۃ فانہا تعاد۔

(حاشیہ طحاوی ص ۲۰۱)

طحاوی میں ہے: اطلق الکراہۃ فعم التحریمة والتنزیہۃ۔ (ص ۲۰۱)
لہذا اب کراہت کو قطع نظر کرتے ہوئے نفس جواز لیکر مسئلہ بیان کرنا فقہ سے ناواقفی کی دلیل ہے اور قلوب عوام سے عظمت شرع کم کرنے کی بری سبیل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب
(۲) ایسے شخص کو امام نہیں بنانا چاہئے۔

لعلۃ نفرة الناس عنہ ولکراہتہم وفیہ التقلیل بالجماعۃ۔

حدیث شریف کا ایسے ہی امام کے متعلق ارشاد ہے:

لا یقبل اللہ الصلوٰۃ من تقدم قوما و ہم لہ کارہون۔ (رواہ ابو داؤد)

اللہ تعالیٰ اس شخص کی نماز قبول نہیں فرماتا جو کسی قوم کا امام بنے اور وہ اس سے کراہیت کرے۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) یہ شخص بھی فاسق ہے اس کا مفصل حکم جواب اول میں مذکور ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المتوسل بنعال النبی الافضل المدعو بمحمد اجمل بن الشاہ محمد اکمل الحقہما اللہ بحزبہ الاول ناظم المدرسة الموسومة باجمل العلوم الواقعة فی بلدة سنہل۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسة اجمل العلوم فی بلدة سنہل

(۳۰۴)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ

زید و بکر عرصہ چھ سال کا ہوا ایک جنازہ میں شریک تھے اس اثناء میں بکر نے سوال کیا کہ اگر کوئی ہندو جو کہ عرصہ دراز تک کسی مسلمان کے یہاں ملازم رہے اور فوت کر جائے تو رسم میت بطریق اہل اسلام ادا کریں گے یا بطریق اہل ہندو زید نے جواباً کہا کہ بطریق اہل ہندو۔ بکر نے کہا اس کے منہ میں کلمہ کادم کیا ہوا پانی ڈال کر رسم میت بطریق اہل اسلام ادا ہوگی زید نے اس کے متعلق چند آیات قرآن پیش کیا اور کہا کہ ہر گز رسم میت بطریق اہل اسلام ادا نہ کریں گے۔ بکر نے کہا کہ میں کلمہ کو مانتا ہوں قرآن کو نہیں مانتا۔ زید نے کہا کہ تم کافر ہو گئے توبہ کرو بصورت عدم توبہ زید نے سلام وکلام اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا ترک کر دیا کچھ عرصہ بعد لوگوں نے اس کا سبب دریافت کیا اس نے گفتگوئے مذکورہ کا قطعاً انکار کیا اور کہا کہ میں نے ایسا نہیں کہا بلکہ یوں کہا ہے کہ کوئی مسلمان کسی ہندو کے یہاں ملازم رہے اور اذکان اسلام کو تمام وکمال ادا نہ کیا ہو اور فوت کر جائے تو رسم میت کی ادائیگی کا کیا طریقہ ہے بصورت عدم شہادت کے زید نے اس کا بیان حلفی طلب کیا اس نے اس کا بھی انکار کر دیا تو آیا بکر خارج از اسلام ہو گیا یا نہیں۔ بر بنائے محاصمت ہذا ما بین زید و بکر کچھ عرصہ ہوئے ایک متنازعہ ہوا تھا اس میں بکر نے زید کو حرامی کہا اور اس کا اعلان بھی تمام گھوڑوں میں کر دیا جب اس کی دلیل طلب کی گئی تو اس نے کہا کہ والدہ زید نے بغیر طلاق لئے ہوئے موضع ہذا میں آخر عقد ثانی کر لیا تھا اور یہ زید شوہر ثانی سے ہے اور اپنے قول کی صداقت میں ان شخصوں کا بیان حلفی پیش کیا جن سے زید سے دشمنی تھی زید نے کہا کہ یہ بالکل غلط ہے واقعہ دراصل یہ ہے کہ میری والدہ نے شوہر اول سے طلاق پا کر موضع ہذا میں آخر عقد ثانی کیا تھا بلکہ بعد طلاق کے بھی وہ تین ماہ وہیں رہی اور شہادت میں والدہ کے ماموں و نانا اور ایک ایک گڈریہ کا بیان حلفی پیش کیا۔

واضح ہو کہ زید و بکر دونوں حافظ ہیں بلکہ زید نابینا اور شوہر اول و ثانی دونوں فوت کر چکے ہیں شوہر اول نے جو عقد ثانی کیا تھا وہ عورت اب تک موجود ہے اور اس کا بیان حلفی مطابق زید ہے اور اس کے برادر کے اکثر بیانات اس کے خلاف ہیں تو آیا زید حرامی ہے یا نہیں اور اس کے پیچھے تراویح و دیگر نمازیں پڑھنا کیسا ہے۔ بیوا تو جروا بالکتاب وبالْحساب فقط

فقیر حافظ رمضان علی عفی عنہ ڈاکخانہ واسٹیشن بھر واری ضلع الہ آباد

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بلا شک قرآن کریم کی کسی آیت یا کسی کلمہ کا بلکہ کسی حرف کا انکار کفر ہے حضرت قاضی عیاض شافعی شریف میں فرماتے ہیں:

جميع من ينتحل التوحيد متفقون ان الجھود بحرف من التنزيل كفر۔

(شرح شفا مصری صفحہ ۵۵۲)

لیکن جب بکر کے اس قول پر نہ کوئی شہادت ہے نہ وہ خود اقرار کرتا ہے تو محض ایک زیدی شہادت کی بنا پر اس کو کافر قرار نہیں دیا جاسکتا اور اس کا بیان حلفی سے انکار کرنا احتمال کفر کو متعین نہیں کرتا کہ بیان حلفی نہ دینے کی اور وجہ بھی ہو سکتی ہیں لہذا بکر کا خارج از اسلام ہونا ہرگز ثابت نہیں ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

اسی طرح زید جب حرامی ہوگا کہ بکر اس کو شہادت شرعی سے ثابت کرے۔ اور مسئلہ امامت میں بعد ثبوت زید کی امامت مکروہ تنزیہی ہے۔ کہ اس سے افضل کوئی اور امام موجود ہو۔ چنانچہ کبیری میں مبسوط سے ناقل۔

انما یکرہ تقدیم الاعمی اذا کان غیرہ افضل منہ۔

اور جب اس مسجد میں زید سے افضل کوئی دوسرا امام موجود نہ ہو تو وہی اولیٰ ہے چنانچہ عینی میں بدائع سے ناقل ہیں:

اذا کان لا یوازیه غیرہ فی الفضیلۃ فی مسجدہ فہو اولیٰ وقد استخلف النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ابن ام مکتوم علی المدینۃ (وہو کان اعمی) واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنجل

(۳۰۵)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

اقامت جب پڑھی جائے تو حی علی الفلاح کے بعد کھڑا ہونا سنت ہے یا کہ مستحب اس کا جواب بحوالہ کتب فقہ معہ عمارت مرحمت فرمائیں۔ بینوا تو جروا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

آج کل اکثر جگہ یہ رواج پڑ گیا ہے کہ بوقت تکبیر سب لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں بلکہ بعض جگہ تو یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ جب تک امام مصلیٰ پر کھڑا نہ ہو جائے اس وقت تک تکبیر ہی نہیں کہتے تو یہ بات مکروہ اور خلاف سنت ہے اور تصریحات کتب فقہ اور اقوال فقہاء احناف بلکہ خود قول امام الائمہ سراج الائمہ حضرت امام ابو حنیفہ علیہ الرحمہ کے خلاف ہے بلکہ عمل صحابہ کرام و حدیث خیر الانام علیہ التحیۃ والسلام کے بھی خلاف ہے مسلمانوں کو چاہئے کہ ایسے غلط فعل اور بلادلیل عمل سے پرہیز کریں مکروہ اور خلاف سنت رواج سے بچیں اور شروع تکبیر سے کھڑے نہ ہوں کتب فقہ میں تو یہاں تک تاکید موجود ہے کہ اگر کوئی شخص ایسے وقت میں مسجد میں آیا کہ تکبیر ہو رہی تھی تو وہ فوراً بیٹھ جائے اور جب تکبیر کہنے والا حی الفلاح کہے تو یہ شخص کھڑا ہو۔

(۱) چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

اذا دخل الرجل عند الاقامة یکرہ لہ الانتظار قائما ولكن یقعد ثم یقوم اذا بلغ المؤذن قوله حی علی الفلاح۔ کذا فی المضممرات (ص ۲۴۰)

جب کوئی شخص تکبیر کے وقت آئے تو اسے کھڑے ہو کر انتظار کرنا مکروہ ہے بلکہ وہ بیٹھ جائے پھر جب تکبیر کہنے والا حی علی الفلاح پر پہنچے تو کھڑا ہو ایسے ہی مضممرات میں ہے۔

(۲) جامع الرموز میں ہے:

لو دخل المسجد احد عند الاقامة یقعد لكرامة القيام والانتظار۔ (ج ۱ ص ۷۲)
اگر کوئی شخص تکبیر کے وقت مسجد میں داخل ہو تو قیام اور انتظار کے مکروہ ہونے کی وجہ سے بیٹھ جائے۔

(۳) رد المحتار میں ہے: یکرہ لہ الانتظار قائما ولكن یقعد ثم یقوم اذا بلغ المؤذن حی علی الفلاح۔ (رد المحتار ص ۲۸۰)

(تکبیر کے وقت آنے والے کو) کھڑے ہو کر انتظار کرنا مکروہ ہے بلکہ وہ بیٹھ جائے پھر تکبیر کہنے والا حی علی الفلاح پر پہنچے تو وہ کھڑا ہو۔

(۴) طحاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

واذا اخذ المؤذن في الإقامة ودخل رجل المسجد فانه يقعد ولا ينتظر قائما فانه مكروه كما في المضمرات وقهستاني ويفهم منه كراهة القيام ابتداء الإقامة والناس عنه غافلون۔

(طحاوی مصری ص ۱۶۱)

جب تکبیر کہنے والا تکبیر شروع کرے اور کوئی شخص مسجد میں آئے تو وہ بیٹھ جائے اور کھڑے ہو کر انتظار نہ کرے کہ یہ مکروہ ہے جیسا کہ مضمرات اور قهستانی میں ہے اور اس سے شروع تکبیر سے کھڑے ہونے کی کراہت معلوم ہوئی اور لوگ اس سے غافل ہیں۔

ان عبارات سے ثابت ہوا کہ جب تکبیر میں آنے والے کو تھوڑی دیر کے لئے کھڑے ہو کر انتظار کرنا مکروہ ہے تو شروع تکبیر سے کھڑے ہو کر انتظار کرنا تو بدرجہ اولیٰ مکروہ ہوا۔ اب باقی رہا یہ امر کہ مقتدیوں کو تکبیر میں کس وقت کھڑا ہونا چاہئے اس کی چند صورتیں فقہاء نے لکھی ہیں جنہیں بہ تفصیل ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) امام محراب کے قریب نہیں ہے اور تکبیر ہو رہی تھی کہ مسجد میں صفوں کے آگے سے داخل ہوا تو سب مقتدی امام کو دیکھتے ہی کھڑے ہو جائیں۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، دارمی، طبرانی، وغیرہ اکتب احادیث میں یہ حدیث مروی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۱) (حدیث) اذا قيمت الصلاة فلا تقموا حتى تروني۔ (بخاری شریف ص ۸۸)

جب نماز کے لئے تکبیر کہی جائے تو تم کھڑے نہ ہونا یہاں تک کہ تم مجھے دیکھ لینا۔

(۲) در مختار میں ہے: وان دخل من قدام قاموا حين يقع بصرهم عليه۔

اگر امام صفوں کے آگے سے آئے تو اسے مقتدی جس وقت دیکھیں کھڑے ہو جائیں۔

(۳) طحاوی علی مرقی الفلاح میں ہے: وان دخل من قدامهم قاموا حين راوه۔

(طحاوی ص ۱۶۱)

اگر امام صفوں کے سامنے سے داخل ہو تو مقتدی اسے دیکھتے ہی کھڑے ہو جائیں۔

(۴) عینی شرح کنز الدقائق میں ہے: وان دخل من قدام يقومون حين يقع بصرهم عليه

(عینی ص ۳۱)

اگر امام سامنے سے آئے تو مقتدیوں کی اس پر جب نگاہ پڑے کھڑے ہو جائیں۔

(۵) بدائع میں ہے: ان دخل الامام من قدام الصفوف فكلما رواه قاموا لانه كما

دخل المسجد قام مقام الامامة۔ (بدائع ص ۴۰۰)

اگر امام صفوں کے آگے سے آیا تو اس کو جب مقتدی دیکھیں کھڑے ہو جائیں اس لئے کہ وہ مسجد میں داخل ہوا تو امامت کی جگہ پر قائم ہو گیا۔

(۲) امام محراب کے قریب نہ ہوا اور مسجد میں صفوں کے پیچھے سے آیا ہو تو امام جس صف پر گذرتا جائے وہی صف کھڑی ہوتی جائے۔ یہ مضمون اس حدیث شریف سے بھی مستفاد ہوتا ہے اور بکثرت کتب فقہ سے ثابت ہے۔

مراتی الفلاح اور طحاوی میں ہے: وان لم يكن حاضرا يقوم كل صف حين ينتهي اليه

الامام في الاظهر وفي عبارة بعضهم فلما جاوز صفا قام ذلك الصف۔ (طحاوی ص ۱۶۱)

وان لم يكن حاضرا لا يقوم القوم كل صف حين ينتهي اليه الامام في الاظهر وفي

عبارة بعضهم فكلما جاوز صفا قام ذلك الصف۔ (طحاوی مصری ص ۱۶۱)

اگر امام مسجد میں موجود نہ ہو تو وہ امام جس صف تک پہنچے وہ ہی صف کھڑی ہوتی جائے اور

یہی قول ظاہر تر ہے اور بعض فقہاء کی یہ عبارت ہے کہ امام جس صف پر گذرے وہی صف کھڑی ہو جائے

عینی شرح کنز الدقائق میں ہے:

وان لم يكن امام بقرب المحراب بان كان في موضع آخر في المسجد وخارجه

ودخل من خلف فيقوم كل صف ينتهي اليه الامام على الاظهر ملخصا۔ (رد المحتار ص ۳۳)

اگر امام محراب کے قریب نہ ہوا اور مسجد کی کسی دوسری جگہ میں ہو یا مسجد سے باہر ہو اور صفوں کے

پیچھے سے داخل ہو تو امام جس صف تک پہنچے وہی صف کھڑی ہوتی جائے بنا بر قول ظاہر تر کے۔

بدایہ میں ہے:

وان كان خارج المسجد لا يقومون مالم يحضر لقول النبي صلى الله تعالى عليه

وسلم لا تقموا في الصف حتى تروني خرجت (وفيه ايضا) وان دخل من وراء الصفوف

فالصحيح انه كلما جاز فصار في حقهم كانه اخذ مكان۔ بدائع ج ۱ ص ۲۰۰

اگر امام مسجد سے باہر ہو تو مقتدی اس کے آنے تک کھڑے نہ ہوں جیسا کہ فرمان نبی صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم ہے: تم صف میں کھڑے نہ ہو یہاں تک کہ مجھ کو نکلتا ہوا دیکھو (اور اسی میں ہے) اگر امام

صفوں کے پیچھے سے آیا تو شیخ قول یہ ہے کہ جب وہ کسی صف سے گزر گیا تو ان کے حق میں ایسا ہو گیا کہ گویا کہ وہ اپنی جگہ پہنچ گیا۔

(۳) امام مسجد میں محراب کے قریب موجود ہے تو امام و مقتدی اس وقت کھڑے ہوں جب تکبیر کہنے والا حی علی الفلاح تک پہنچے۔

علامہ قاری علی علیہ رحمۃ الباری مرقاۃ میں اس حدیث شریف کے تحت میں فرماتے ہیں: جو نمبراً میں منقول ہوئی۔

ولعله صلى الله تعالى عليه وسلم كان يخرج من الحجرة بعد شروع المؤذن في الإقامة ويدخل في محراب المسجد عند قوله حي على الصلاة ولذا قال أئمتنا ويقوم الامام والقوم عند حي على الصلاة۔ (حاشیہ مشکوٰۃ شریف ص ۶۴)

شاید کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حجرے شریف سے تکبیر کہنے والے کی تکبیر شروع کرنے کے بعد نکلتے تھے اور محراب مسجد میں حی علی الصلوٰۃ کہنے کے وقت تشریف لاتے اس لئے ہمارے ائمہ نے فرمایا کہ امام اور مقتدی حی علی الصلوٰۃ کے وقت کھڑے ہوں۔ نووی شرح مسلم میں ہے:

كان انس رحمه الله تعالى يقوم اذا قال المؤذن قد قامت الصلاة وبه قال احمد رحمه الله تعالى۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس وقت کھڑے ہوتے تھے جب تکبیر کہنے والا قد قامت الصلاة کہتا اور یہی امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

(۳) کتاب الآثار میں ہے:

عن الامام الاعظم عن طلحة عن مطرف عن ابراهيم انه قال اذا قال المؤذن حي على الفلاح فينبغي للقوم ان يقوموا للصلاة قال محمد وبه ناخذ وهو قول ابى حنيفة۔

(صحیح البہاری ص ۴۶۹)

حضرت امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت ابراہیم نے فرمایا کہ جب تکبیر کہنے والا حی علی الفلاح کہے تو قوم کے لئے کھڑا ہونا مناسب ہے امام محمد نے فرمایا کہ ہم اسی کو دلیل بناتے ہیں اور یہی امام اعظم ابو حنیفہ کا قول ہے۔

(۴) وقایہ میں ہے:

ويقوم الامام والقوم عند حي على الفلاح۔ (شرح وقایہ ص ۱۶۸)

امام اور مقتدی حی علی الفلاح کے وقت کھڑے ہوں۔

ملتقى البحر میں ہے: واذا قال حي على الصلاة قام الامام والجماعة۔

(شرح وقایہ فارسی ص ۲۸)

جب تکبیر کہنے والا حی علی الصلوٰۃ کہے تو امام اور جماعت کھڑی ہو۔

کنز الدقائق میں ہے: القيام حين قيل حي على الفلاح۔ (کنز قیومی ص ۱۳)

اور کھڑا ہونا جس وقت حی علی الفلاح کہی جائے۔

نور الايضاح میں ہے: والقيام حين قيل حي على الفلاح۔

(نور الايضاح مطبوعہ قاسمی ص ۲۸)

اور کھڑا ہونا جب حی علی الفلاح کہی جائے۔

تنویر الابصار میں ہے: والقيام حين قيل حي على الفلاح ان كان الامام يقرب المجراب۔ (شامی ص ۳۳۶)

اور کھڑا ہونا جس وقت حی علی الفلاح کہی جائے اگر امام محراب کے قریب میں موجود ہو۔

مراقی الفلاح میں ہے۔

ومن الادب القيام اي قيام القوم والامام ان كان حاضراً يقرب المجراب حين قيل اي وقت قول المقيم حي على الفلاح لانه امر له فيجاء۔

(طحاوی ص ۱۶۱)

اگر امام محراب کے قریب موجود ہو تو تکبیر کہنے والے حی علی الفلاح کے وقت امام اور مقتدیوں کا کھڑا ہونا مستحب ہے اس لئے کہ اس نے حی علی الفلاح سے قیام کا حکم کیا تو اس کی اجابت کی جائے۔

در مختار میں ہے: والقيام للامام والمؤمن حين قيل حي على الفلاح خلافاً لزمفر

فعنده عند حي على الصلاة۔ (حاشیہ رد المختار ص ۳۳۶)

اور امام اور مقتدی کو حی علی الفلاح کے وقت کھڑا ہونا چاہئے اور امام زفر سے اس کی مخالفت مروی

ہے ان کے نزدیک حی علی الصلوٰۃ پر۔

یعنی شرح کنز الدقائق میں ہے:

الخامس (من الاداب) القيام اى قيام الامام والقوم حين قيل اى حين يقول المؤذن حى على الفلاح۔ (یعنی ص ۳۱)

مستحبات سے پانچواں مستحب تکبیر کہنے والے کے حى على الفلاح کہنے کے وقت امام اور مقتدیوں کا کھڑا ہونا ہے۔

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

قوله لانه امر به فيجاب اى لان المقيم امر بالقيام اى ضمن قوله حى على الفلاح فان المراد بفلاحهم المطلوب منهم حينذ الصلوة فيبادر اليها بالقيام۔ (طحطاوی ص ۱۶۱)

مراقی الفلاح کے اس قول لانه امر به فيجاب کا یہ مطلب ہے کہ تکبیر کہنے والے نے اپنے قول حى على الفلاح کے ضمن میں کھڑے ہونے کا حکم کیا ہے کہ نمازیوں کی فلاح مراد ہے جو حى على الفلاح سے مطلوب ہے اس وقت نماز سے اس کی طرف قیام سے مبادرت چاہئے۔

تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق میں ہے: قوله والقيام حين قيل حى على الفلاح لانه امر به فيستحب المسارعة اليه۔ (ص ۱۰۸)

صاحب کنز کا یہ قول کہ حى على الفلاح کے وقت کھڑا ہونا چاہئے اس کی علت یہ ہے مکبر حى على الفلاح کہہ کر حکم دیتا ہے تو قیام کی طرف مسارعت مستحب ہے۔

بحر الرائق شرح کنز الدقائق میں ہے:

قوله والقيام حين قيل حى على الفلاح لانه امر به فيستحب المسارعة اليه

اطلقه فشمّل الامام والمأموم ان كان الامام يقرب المحراب۔ (ص ۳۲۱)

صاحب کنز کا یہ قول کہ حى على الفلاح پر قیام ہو اس کی علت یہ ہے کہ بکرنے حى على الفلاح سے قیام کا حکم کیا ہے تو قیام کی جانب عجلت مستحب ہے اور صاحب کنز نے قیام کو مطلق کہا تو یہ حکم امام اور مقتدی کو شامل ہے جب کہ امام محراب کے قریب موجود ہو۔

مجمع الانهر شرح ملتقى البحر میں ہے:

واذا قال المؤذن فى الإقامة حى على الصلاة قام الامام والجماعة عند علمائنا

(مجمع الانهر ص ۳)

الثلة۔

جب مکبر تکبیر میں حى على الصلوٰۃ کہے تو چاہئے تینوں امام (یعنی امام اعظم اور ان کے شاگرد امام یوسف اور امام محمد) کے نزدیک امام اور جماعت اس وقت کھڑے ہوں۔

بدائع میں ہے: ان المؤذن اذا قال حى على الفلاح فان كان الامام معهم فى المسجد يستحب للقوم ان يقوموا فى الصف۔ (بدائع ص ۲۰۰)

جب مکبر حى على الفلاح کہے پس اگر امام ان کے سامنے مسجد میں موجود ہو تو مقتدیوں کو صف بنا کر کھڑا ہونا مستحب ہے۔

ذخیرہ میں ہے: يقوم الامام والقوم اذا قال المؤذن حى على الفلاح عند علمائنا الثلاثة۔ (شامی ص ۳۳۶)

جب مکبر حى على الفلاح کہے تو ہمارے تینوں اماموں کے نزدیک امام اور مقتدی کھڑے ہوں۔ مبسوط للامام السرخسی میں ہے: فان كان الامام مع القوم فى المسجد فانى احب لهم ان يقوموا فى الصف اذا قال المؤذن حى على الفلاح۔ (ص ۳۹)

اگر امام قوم کے ساتھ مسجد میں موجود ہو تو ان کے لئے محبوب جانتا ہوں کہ وہ صف میں اس وقت کھڑے ہوں جب تکبیر کہنے والا حى على الفلاح کہے۔

شبلی حاشیہ زیلعی میں ہے:

قال فى الوحيز والسنة ان يقوم الامام والقوم اذا قال المؤذن حى على الفلاح اه مثله فى المبتغى۔ (ص ۱۰۸)

جب تکبیر کہنے والا حى على الفلاح کہے تو امام اور مقتدیوں کا کھڑا ہونا سنت ہے یہ وجہ میں کہا اور ایسا ہی مہتمی میں ہے۔

عالمگیری میں ہے: وان كان المؤذن غير الامام وكان القوم مع الامام فى المسجد فانه يقوم الامام والقوم اذا قال المؤذن حى على الفلاح عند علمائنا الثلاثة وهو الصحيح۔

(ص ۲۴۲)

اگر مکبر امام کے علاوہ ہو اور قوم امام کے ساتھ مسجد میں موجود ہو تو ہمارے تینوں اماموں کے نزدیک جب تکبیر کہنے والا حى على الفلاح کہے اس وقت امام اور قوم کھڑے ہوں مفتی بہ صحیح مذہب ہے۔

اسی طرح اصلاح ۲۱۔ ایضاح ۲۲۔ ظہیر ۲۳۔ درر ۲۴۔ غرر ۲۵۔ فیض ۲۶۔ نقاہ ۲۷۔

حاوی ۲۸- مختار ۲۹- طحاوی ۳۰- در المختار ۳۱- قہستانی ۳۲- مضمرات ۳۳- شرح کنز علامہ ملا سبکین ۳۴- شرح کنز علامہ شیخ مصطفیٰ ۳۵- فتح المعین ۳۶- شرح نبلائی ۳۷- محیطہ ۳۸- بزازیہ ۳۹- وجیزہ ۴۰- مبتغی ۴۱- عمدۃ القاری ۴۲- فتح الباری ۴۳- در المقتی ۴۴- موطا امام محمد ۴۵- مالا بدمنہ ۴۶- میں یہ مسئلہ مذکور ہے جن کی عبارات بخوف طوالت نقل نہیں کی گئی ہیں اور چار عبارات اور ایک حدیث ابتدا میں نقل ہوئی کل تعداد (۵۰) ہو گئی ان عبارات سے نہایت واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ حی علی الفلاح پر کھڑا ہونا مستحب ہے اور یہ خود امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرمان سے ثابت ہے بلکہ احادیث سے مستفاد ہے البتہ ان عبارات میں بعض طبیعتیں یہ احساس کرینگی کہ اکثر عبارات میں حی علی الفلاح پر کھڑے ہونے کا حکم ہے اور بعض میں حی علی الصلوٰۃ پر تو بظاہر ان میں تعارض معلوم ہوتا ہے مگر حقیقتہً کوئی تعارض نہیں ہے تطبیق عبارت کی صورت یہ ہے کہ اول الذکر عبارات سے ابتدا مراد ملی جائے اور ثانی الذکر سے انتہا۔ یعنی جب مکبر حی علی الصلوٰۃ کو تمام کر کے حی علی الفلاح پر پہنچے تو امام اور مقتدی کھڑے ہو جائیں اس طور پر ظاہری تعارض بھی نہیں رہا۔

(۴) اگر امام خود ہی تکبیر کہے تو جب تک وہ پوری تکبیر کہہ کر فارغ نہ ہو جائے اس وقت تک مقتدی کھڑے نہ ہوں یعنی اس صورت میں بعد فراغت تکبیر مقتدی کھڑے ہوں۔

عالمگیری میں ہے: وان كان المؤذن والامام واحدا اقام في المسجد فالقوم لا يقومون ما لم يفرغ عن الاقامت۔ (ص ۴۴)

اگر امام اور مکبر ایک ہوں پس اگر امام نے مسجد میں تکبیر کہی تو مقتدی کھڑے نہ ہوں جب تک امام تکبیر سے فارغ نہ ہو۔

عالمگیری میں ہے: اگر خود ہی امام نے تکبیر کہی لیکن مسجد سے باہر کہی تو مقتدی فوراً بعد فراغت تکبیر کھڑے نہ ہوں بلکہ اس وقت کھڑے ہوں کہ امام مسجد میں داخل ہو جائے۔

عالمگیری میں ہے: وان اقام خارج المسجد فمشائخنا اتفقوا على انهم لا يقومون ما لم يدخل الامام المسجد۔

اگر امام نے مسجد سے باہر تکبیر کہی تو ہمارے مشائخ کا اس بات پر اتفاق کہ مقتدی اس وقت تک کھڑے نہ ہوں جب تک امام مسجد میں داخل نہ ہو۔

بالجملہ اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ مقتدیوں کو شروع سے کھڑا ہونا یقیناً مکروہ ہے اور درمیان

تکبیر میں پہلی دو صورتوں میں مقتدیوں کے کھڑے ہونے کے لئے تکبیر کا کوئی کلمہ مقرر نہیں کیا جاسکتا کہ ان دونوں صورتوں میں مقتدیوں کا کھڑا ہونا امام کے آنے پر موقوف ہے کہ وہ جب آئے گا یہ اسی وقت کھڑے ہوں گے تیسری صورت میں کلمہ حی علی الفلاح پر مقتدیوں کا کھڑا ہونا مستحب ہے سوال میں اسی صورت کو دریافت کیا گیا ہے اور اکثر یہی صورت پیش آتی ہے چوتھی صورت میں مقتدیوں کو فراغت تکبیر کے بعد کھڑا ہونا چاہئے۔

الحاصل یہ تمام صورتیں صرف مقتدیوں کے لئے ہیں اب باقی رہا امام تو اس کے لئے تیسری صورت میں تو کتب فقہ میں اس قدر تصریح ہے کہ وہ بھی حی علی الفلاح پر کھڑا ہو علاوہ اس کے امام کے لئے کوئی خاص حکم مذکور نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: مقتضی بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۰۶ھ

(۳۰۶)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

زید کی عمر ۱۸ سال کی ہے کہ جو بالغ حافظ قرآن خوش آواز صحت کے ساتھ پڑھنے والا ہے البتہ اس کے ابھی تک داڑھی نہیں نکلی ہے مونچھیں نمودار ہیں اور سوا اس کے اور کوئی صحت سے پڑھنے والا بھی نہیں ہے تو ایسی صورت میں از روئے شرع شریف زید کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں اور اگر جائز ہے تو اس کا جواب بحوالہ کتب فقہ معہ عبارت مرحمت فرمائے گا۔ بینا تو جروا

المستفتی حافظ عبدالوہاب سنہ ۱۴۰۶ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

شخص مذکور کی جب اٹھارہ (۱۸) سال کی عمر ہے تو وہ بلاشبہ یقیناً بالغ ہے کہ شرع میں پندرہ برس کا بالغ قرار دیا گیا ہے۔

کنز الدقائق میں ہے: ویفتی بالبلوغ فقہا بخمس عشرة سنة۔

در مختار و تنویر الابصار میں ہے: فان لم يوجد فيها شيء فحتى يتم لكل منهما خمس

عشرة سنة وبه يفتی۔

ان عبارات سے واضح ہو گیا کہ قول مفتی بہ یہی ہے کہ جب پندرہ برس کی عمر ہو جائے تو وہ شرعاً بالغ ہے اور سوال میں اس کی عمر اٹھارہ برس کی ظاہر کی گئی ہے لہذا اس کے بالغ ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں اب باقی رہی امر (بے ریش) کی امامت تو فقہاء نے اس کے مکروہ تنزیہی ہونے کی یہ علت لکھی ہے کہ وہ ایسا خوبصورت ہو کہ محل فتنہ اور شہوت بن جائے۔

شامی میں ہے: تکرہ خلف امرد الظاهر انها تنزيهه ايضا والظاهر كما قال الرحمتي ان المراد الصبيح الوجه لانه محل الفتنه۔

اور شخص مذکور کو سائل نے بروقت فتویٰ طلب کرنے کے پیش کیا تو وہ ایسا خوبصورت نہیں ہے جو محل شہوت و فتنہ ہو لہذا اس کی امامت مکروہ تنزیہی بھی نہیں ہے۔

حاصل جواب یہ ہے کہ شخص مذکور یقیناً بالغ ہے اور ایسا امرد بھی نہیں ہے جس کی امامت مکروہ تنزیہی ہو۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المتعصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدۃ سنجل

مسئلہ (۳۰۷)

جناب مفتی صاحب اسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
اس ناچیز کو جمعہ کی نماز کے متعلق مسئلہ دریافت کرنا ہے

ایک مسجد میں نماز پڑھتے تھے تو ان کو معلوم ہوا کہ شیخ احمد مدینوار کے مرید ہیں تو وہاں نماز پڑھنا چھوڑ دیا ہے تب دوسری مسجد میں جانے لگے تو ان کا بھی معلوم ہوا کہ سینما وغیرہ دیکھا کرتے ہیں اور حافظ قرآن کہلاتے ہیں تو وہاں بھی جانا چھوڑ دیا تیسرے مسجد کا بھی وہی حال ہے تو چوتھے مسجد میں نماز جمعہ پڑھنے لگے تو وہ امام حافظ ہیں ظاہری تقویٰ درست ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ کسی کو بھلا برا نہیں کہنا چاہئے اپنا اعمال کو صحیح رکھنا چاہئے اور شاہ سعود کو کہتے ہیں کہ وہ اسلام کے صحیح راستہ پر ہیں اور مدینہ شریف کے مزار کا اچھی طرح خیال کرتے ہیں تو ہم کو پورا معلوم نہیں ہے اس لئے مسئلہ دریافت طلب ہے کہ اب اس اطراف میں کوئی اور مسجد نہیں کہ جمعہ جا کر پڑھیں اور لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ تین جمعہ چھوڑ دینے سے مسلمان سے خارج ہو جاتا ہے تو اب ہم کیا کریں نماز جمعہ کے بارے میں کیا حکم نافذ ہے زیادہ کیا لکھوں فقط والسلام

عبد الحمید معرفت ماہنامہ سنی لکھنؤ

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علی رسولہ الکریم

مفتی کی نماز کی صحت امام کی نماز کی صحت پر موقوف ہے تو جب امام ہی کی نماز صحیح نہ ہو تو پھر مفتی کی نماز کیسے صحیح ہو سکتی ہے ادھر تو بد مذہب گمراہ کافر مرتد کی نہ نماز حقیقہ نماز ہے نہ ان کی جماعت حقیقہ جماعت ہے بلکہ ان کی کوئی عبادت شرعاً عبادت ہی نہیں ادھر مولوی حسین احمد صدر مدرس مدرسہ دیوبند اور شاہ سعود نجدی کو جو شخص مسلمان جانے اور ان کو اسلام کے صحیح راستے پر بتائے۔ تو گویا وہ ان کی شان الوہیت اور رسالت میں گستاخیوں اور ان کی بد اعتقادیوں اور کفریات کو اسلام کا راستہ جانتا ہے تو یہ بھی ان کفریات اور گستاخیوں کے ساتھ ایسا راضی ہو گیا کہ انھیں کو اسلام کا صحیح راستہ بتائے گا لہذا یہ شخص بھی کفر کو اسلام بتا کر مرتد و کافر کو مسلمان ٹھہرا کر شرعاً خود کافر ہو گیا۔

شرح فقہ اکبر اور تمام کتب عقائد میں ہے ”الرضا بالكفر کفر“

تو ایسے بد مذہب و بد عقیدہ کی نہ نماز نماز ہے نہ جماعت جماعت ہے تو ایسے امام کے پیچھے نماز صحیح ادا نہیں ہو سکتی مسلمان ایسے بد مذہبوں کی ہرگز ہرگز اقتداء نہ کریں۔ اب باقی رہا ایسے امام کا حکم جو بد مذہب تو نہیں ہے لیکن وہ بد عمل فاسق ہے تو اس کے پیچھے بیچ وقت نماز تو مکروہ تحریمی ہے اور واجب الاعادہ ہے لیکن جمعہ اس کے پیچھے بلا کراہت کے جائز ہے۔ اور ظاہر ہے کہ پہلی اور چوتھی مسجد کے امام بد عقیدہ دیوبندی ہیں ان کے پیچھے ہرگز ہرگز نماز نہ پڑھے اب باقی رہا لوگوں کا یہ قول کہ تین جمعوں کے ترک سے خارج اسلام ہوتا ہے غلط و باطل ہے۔ حدیث شریف میں جو تارک کے لئے وعیدیں ہیں وہ ان کے لئے ہیں جو جمعہ بلا عذر نہیں پڑھتے ہیں اور امام کے بد عقیدہ ہونے کی بنا پر تو ترک جمعہ بعد از ہے بلکہ اس کی اقتداء میں خود جمعہ ہی کب ادا ہوگا تو وہ جمعہ حقیقہ جمعہ ہی نہیں ہے تو ترک جمعہ کی وعید اس کے لئے نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المتعصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدۃ سنجل

۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۷ھ

مسئلہ (۳۰۸-۳۰۹)

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

(۱) کہ بعد نماز عید بہت سے لوگ امام کے مصلے کے نیچے روپیہ یا پیسے رکھ دیا کرتے ہیں۔ کیا امام کو اس رقم کا کھانا جائز ہے یا ناجائز؟

(۲) بہت سے دنوں سے ہماری مسجد میں امام مستقل ہے کوئی شخص باہر کا چند دنوں کے واسطے آئے اور وہ نماز پڑھائے اس کے بعد پھر پردیس چلا جائے تو اس امام کے پیچھے نماز جائز ہے یا ناجائز۔ امام مسجد میں مستقل ہے اور لوگ دوسرے آدمیوں کی خوشنودی مزاج کے لئے دوسرے امام کو کھڑا کر دیتے ہیں اس پر چند آدمیوں نے نماز پڑھنا چھوڑ دی ہے۔ بینوا تو جروا

المستفتی، احمد حسن صابری چنور

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) جب وہ رقم مال زکوٰۃ وصدقہ واجبہ ہی سے نہ ہو یا ہو تو وہ امام اس کا اہل و مستحق ہو پھر وہ دینا بھی تنخواہ امامت کے سلسلہ میں بھی نہ ہو بلکہ یہ دینا بہ نیت محض اس کی اعانت کے لئے ہو تو اس امام کو ایسی رقموں کا لینا بلاشبہ جائز ہے۔ بلکہ لوگوں کو اپنے امام کی ایسی خدمتیں و اعانتیں کرنی چاہیں واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) جس مسجد میں امام مستقل ہو تو باہر کا شخص اس امام کی اجازت سے نماز پڑھا سکتا ہے اور جب وہ باہر کا شخص امام مستقل سے اعتقاد و عملاً ہر طرح افضل ہو تو وہ امام کی اجازت سے نماز پڑھا سکتا ہے اور نمازیوں کو بغیر اس کی اجازت کے ایسی جرأت نہیں کرنی چاہئے بلکہ بہتر یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے امام سے عرض کریں اور امام ان کو نماز پڑھانے کی اجازت دے۔ اور نماز ایسے امام کے پیچھے ناجائز ہوتی ہے جس میں کوئی وجہ شرعی ہو اور جنہوں نے فقط اتنی سی بات پر جماعت ترک کر دی ان کو ایسا نہ کرنا چاہئے کہ امام کی اقتداء کسی وجہ شرعی پر چھوڑی جاتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

۱۴ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ

مسئلہ (۳۱۰-۳۱۱-۳۱۲-۳۱۳-۳۱۴-۳۱۵-۳۱۶-۳۱۷-۳۱۸)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

(۱) زید پیش امام ہے اور باوجود سید ہونے کے بالا اعلان صدقہ اور خیرات لیتا ہے اور فطرہ کھاتا ہے اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا ناجائز ہے؟

(۲) زید پیش امام ہے اور کاشتکاری اور نکاح خوانی اور خیاطی کرتا ہے اور اپنے گھر سے کھاتا پیتا ہے لیکن صاحب نصاب ہونے کے باوجود زکوٰۃ نہیں دیتا اور قربانی نہیں کرتا اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا ناجائز؟

(۳) زید پیش امام ہے اور کچھری میں دوسرے کی ضد پر جھوٹا حلف اٹھاتا ہے اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا ناجائز؟

(۴) زید پیش امام ہے اور وہابیہ جیسے غیر مقلدین دیوبندیہ نجریہ وغیرہ بدنہ ہوں سے الحاق کرتا ہے اور ان کے ساتھ میل جول رکھتا ہے اور اپنے کو اہل سنت والجماعت کہتا ہے اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ مندرجہ ذیل مسائل پر دستخط کرو تو دستخط نہیں کرتا ایسی صورت میں زید سنی حنفی ہے یا وہابی ہے اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے یا ناجائز وہ مسائل یہ ہیں۔

(۱) غیر مقلدین وہابیہ مرتد ہیں مسلمان نہیں۔

(۲) غیر مقلدین وہابیہ کے پیچھے نماز حرام ہے۔

(۳) لازم ہے اہل سنت و جماعت کو کہ غیر مقلدوں کو اپنی مسجدوں میں نہ آنے دیں اور نکال دیں۔

(۴) غیر مقلدین وہابیہ کے ذبیحہ میں احتیاط لازم ہے۔

(۵) غیر مقلدین وہابیہ سے شادی بیاہ کرنا حرام ہے۔

(۶) زید پیش امام ہے اور قرآن اور خطبہ غلط اور خلاف تجوید پڑھتا ہے اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا ناجائز؟

(۷) زید پیش امام ہے اور حد شرع سے اپنی داڑھی کم کراتا ہے کتر و اتا ہے اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا ناجائز؟

(۸) زید پیش امام ہے اور بالا اعلان بدنہ ہوں کا ساتھ دیتا ہے اور ان کے پس پشت اپنے کو سنی حنفی کہتا ہے ایسا شخص سنی حنفی ہے یا نہیں اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے یا ناجائز؟

(۹) زید پیش امام ہے اور ضروریات دین اور مسائل ضروریہ سے عموماً اور مسائل امامت سے

خصوصاً نادانانہ ہے اس کے پیچھے نماز جائز ہے یا ناجائز۔

سائل، معرفت علین دھوبی ٹانڈا حرمت نگر ڈاکخانہ بلا سپور رام پور چھمن پسیلپور والے

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

ان احوال کی بنا پر زید کے سنی حنفی ہونے کا دعویٰ صحیح نہیں کہ اگر وہ فی الواقع سنی حنفی ہوتا تو بلا تاویل ان بعد والے نمبروں پر دستخط کر دیتا لہذا جب اس نے ان احکام شرعیہ متعلقہ وہابیہ غیر مقلدین پر دستخط نہیں کئے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ احکام اس کے نزدیک صحیح نہیں۔ اور ان احکام کا صحیح نہ جانا خود اس کے بد مذہب اور وہابی غیر مقلد ہونے کی دلیل ہے پھر مزید سوال میں اس کے فق و فجور کے کافی افعال مذکور ہیں تو نماز تو اس کے پیچھے ناجائز ہے لہذا زید کا عمل اور اعتقاد غلط اور فاسد ہے تو نہ اس کے سنی حنفی ہونے کا دعویٰ صحیح نہ اس کے پیچھے نماز جائز و روا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: اہل معتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

۲۵ ذیقعدہ ۱۳۶۶ھ

مسئلہ

(۳۱۹)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

زید نے کہا کہ اس مسجد پر لعنت اور میری امامت پر لعنت آپ لوگ مجھ کو خدا کے واسطے معاف کریں میں نماز نہیں پڑھاؤں گا ایسے شخص کو امام بنانا جائز ہے یا نہیں باذلیل قوی کتب شرع شریف تحریر فرمایا جاوے۔ گواہان حاجی محمد یعقوب صاحب، حافظ عبدالریاض صاحب، حافظ محمد لائق احمد صاحب، اقرار حسن خاں صاحب، اشفاق صاحب، محمد شفیع صاحب۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

زید کے یہ ہر دو جملے بہت سخت اور قبیح ہیں۔ فوراً اس کو توبہ کرنی چاہئے پھر جب تک وہ توبہ نہ کرے اس کو امام بھی نہ بنانا چاہئے کہ اس کی ایسی جرأت و دلیری پتہ دیتی ہے کہ شعار مذہبی و احکام دینی

کی اس کے دل میں کچھ قدر نہیں ہے تو وہ امامت جیسی ذمہ داری کی چیز میں نہ معلوم کیا کیا فرو گذاشت کریگا۔ لہذا لوگوں کی نمازوں کے لئے ایسے غیر ذمہ دار شخص کو امام بنانا خلاف احتیاط اور نامناسب ہے

نقطہ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۷ جمادی الاخریٰ ۱۳۷۸ھ

مسئلہ

(۳۲۰)

لو قام الامام الی الركعة الخامسة و يعلمه رجل هل له ان يقتدی به فیها بنیة الفرض ویلقنه ام لا ؟

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

صح الاقتداء به فی هذه الصورة وله ان یلقنه قبل ان یقید الخامسة بسجدة صرحه صاحب رد المحتار ناقلاً عن البحر لو اقتدی به مفترض فی قیام الخامسة ولم یقع قدر التشهد صح الاقتداء لانه لم یخرج من الفرض قبل ان یقیدها بسجدة۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: اہل معتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۳۲۱)

هل یحصل باقتداء الحافظ الجاهل عن شرائط الوضوء والصلوة وفروضهما وسننها فضیلة الجماعت وایضاً جاہل بمفسداتہما ام لا؟۔ او هل یجوز الاقتداء للعالم ام لا؟۔ والافراد افضل عن هذا الجماعة احسن الینا یرحمکم اللہ بجاہ سید العرب والعجم علیہ السلام۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

قال النبی ﷺ فلیثو مکم علماء کم فتقدیم الجاهل مع کون العالم حاضراً مکروه فاقتداء العالم له اولی من الافراد لحصول فضیلة الجماعة کما هو مصرح فی کتب الفقه واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

مسئلہ

(۳۲۲)

امام کے لئے تنخواہ لینا جائز رکھا گیا ہے۔ اگر قرآن شریف پڑھ کر اس کا ثواب بخش دینے کے بدلے میں کچھ لینا جائز ہو تو فیہا اور اگر ناجائز ہے تو امام کے لئے تنخواہ دینا جائز قرار دیا گیا ہے، وہ بھی جائز ہونا چاہئے۔ کیونکہ ادھر قرآن شریف پڑھنے کا عوض ہے اور ادھر نماز پڑھانے کا عوض ہے۔

بیوا تو جروا

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

امامت۔ اذان۔ تعلیم القرآن پر تنخواہ لینا متاخرین نے ضرورتاً جائز قرار دیا۔

چنانچہ فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہے:

وبعض مشائخنا رحمہم اللہ تعالیٰ استحسنوا الاستیجار علی تعلیم القرآن
الیوم لظہور التوانی فی الامور الدینیۃ ففی الامتناع تضییع حفظ القرآن وعلیہ الفتوی
وزاد متن المجمع الامامة وبعضهم الاذان والاقامة والوعظ۔

ہمارے بعض مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس وقت تعلیم قرآن پر اجرت لینا اچھا سمجھا کہ امور دینیہ
میں سستی ظاہر ہے۔ تو منع کرنے میں حفظ قرآن کا ضائع کرنا ہے، اسی پر فتویٰ ہے۔ اور متن مجمع میں
امامت کو اور بعض فقہانے اذان اور تکبیر اور وعظ کو زائد کیا۔

اور میت کے ایصال ثواب کی غرض سے تلاوت پر اجرت و تنخواہ لینا کوئی ضروری چیز نہیں۔

چنانچہ رد المحتار میں ہے:

وقد ذکرنا مسئلة تعلیم القرآن علی الاستحسان یعنی للضرورة۔ ولا ضرورة فی
الاستیجار علی القراءة علی القبر۔
(رد المحتار ص ۳۶ ج ۵)

ہم نے مسئلہ تعلیم قرآن بضرورت استحسان کا ذکر کیا اور قبر پر پڑھنے کی اجرت لینے میں کوئی
ضرورت نہیں۔

تو میت کے ایصال ثواب کی غرض سے تلاوت کا امامت وغیرہ پر قیاس مع الفارق ہے کہ یہاں
ضرورت داعی الی الجواز اور وہاں ضرورت ہی نہیں پائی جاتی تو اس کو امامت وغیرہ قیاساً
نہیں کر سکتے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: ۱۔ معتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۲۳ھ

(۳۲۳-۳۲۴-۳۲۵-۳۲۶-۳۲۷-۳۲۸-۳۲۹)

مسئلہ

(۳۳۰-۳۳۱-۳۳۲-۳۳۳-۳۳۴-۳۳۵-۳۳۶-۳۳۷)

کیا فرماتے ہیں نابان رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ومفتیان مذہب احناف مسائل مندرجہ
ذیل کے بارے میں کہ

(۱) لفظ امام شہر بغیر کسی تاویل و توجیہ کے اپنی ترکیبی حیثیت سے صحیح ہے یا غلط؟

(۲) لفظ امام شہر اصطلاحات شرعیہ میں منقول ہے یا نامشروع و بے اصل ہے؟ اگر منقول ہے تو

اس کی تعریف شبینہ ظاہرہ میں کیا ہے اور اس کو شرعاً کن احکام کے اجراء کا اختیار ہے؟

(۳) کسی ایسے مقام کی جامع مسجد کا امام جمعہ وعیدین یا امام مسجد جو مقام شہر یا پرگنہ ہونے کے
ساتھ شرعاً بھی قول مفتی بہ پر مصر ہو، ایسے امام کو امام شہر وعیدین یا امام پنجگانہ جو مقام یا شہر یا پرگنہ ہونے
کے ساتھ ساتھ شرعاً بھی قول مفتی بہ مصرع ہو ایسے امام کو امام شہر یا قاضی شہر کہنا شرعاً جائز ہے یا ناجائز؟

(۴) امام مذکور اپنے آپ کو شہر یا قاضی شہر کہے اور لکھے یا لوگوں سے امام شہر وقاضی کہلوائے یا
شہر پرگنہ کے امام مسلمان ایسے امام کو امام شہر یا قاضی شہر کہیں اور لکھیں تو یہ کہنا یا کہلوانا اور لکھنا شریعت
ظاہرہ میں درست ہے یا نہیں؟

(۵) امام مذکور جو اپنے آپ کو امیر المومنین و خلیفۃ المسلمین جانے اور اعتقاد کرے یا اپنے آپ
کو ایسا قاضی متصور کرے جو سلطان اسلام کا مقرر کردہ قاضی ہو اور عوام کو بھی ایسا ہی امیر المومنین وقاضی
بادر کرائے یا عام مسلمان ایسے امام کو امیر المومنین اور سلطان اسلام کا مقرر کردہ قاضی اعتقاد آجائیں امام
مذکور عام مسلمان کا ایسا اعتقاد صحیح و درست ہے یا نہیں؟ اور ایسے امام و عوام مؤمنین کیلئے شرعاً کیا حکم ہے؟

(۶) امام مذکور کے اختیارات و احکام وہی ہوں گے جو امیر المومنین وقاضی شرع کے ہیں یا وہ
بالکل بے اختیار ہوگا اور شرعاً اس کے احکام نافذ نہ ہوں گے؟

(۷) امام مذکور یا کسی عالم مفتی کا کسی حکم شرع کے بارے میں عوام مؤمنین سے یہ کہنا یا اعلان کر

ناکہ میرے حکم سے یہ کام کرو اور اس کا ثواب و عذاب میرے گردن پر ہوگا جائز و روا ہے یا ناجائز و جہل نادانی ہے؟

(۸) اگر امام مذکور یا کسی عالم و مفتی کے ایسے کہنے یا اعلان کرنے پر عام مسلمان اس پر عمل کریں اور فی الحقیقت امام مذکور یا مفتی و عالم کا ایسا حکم گناہ خلاف حکم شریعت ظاہر ہو تو کیا عام مسلمان شرعاً مجرم و گنہگار نہ ہوں گے اور سب کے گناہوں کا عذاب و وبال صرف امام مذکور یا مفتی و عالم پر ہوگا یا عام مسلمان بھی اس کے خلاف شرع حکم پر عمل کرنے کے باعث شرعاً مجرم و گنہگار و مستحق عذاب عقبی ہوں گے؟

(۹) کسی ایسے مقام کی بڑی مسجد کے امام کو جو شرعاً مصر نہ ہو شرعاً سلطان اسلام کا مقرر کردہ قاضی مانا جائے یا نہیں؟

(۱۰) کتاب القاضی الی القاضی کے شرعاً مستند و معتبر ہونے کے لئے کتنی شرائط ضروری ہیں؟

(۱۱) کیا کسی شہر کی جامع مسجد کا امام یا غیر مصر کی بڑی مسجد کا امام جسے نہ باشندگان شہر نے نہ سلطان اسلام نے قاضی مقرر کیا ہو لیکن وہ امام خود کو شرعاً قاضی متصور کرے اور کتاب القاضی الی القاضی کی طرح باہم احکام شرعیہ نافذ کر لینے کے لئے خط بھیجے تو شرعاً ایسا امام قاضی ہوگا یا نہیں اور اس کے خط کا اعتبار ان احکام شرعیہ میں ہوگا یا نہیں جن میں شہادت ضروری ہے؟

(۱۲) اور اگر عام مسلمان ایسے امام کو شرعاً قاضی جانیں اور اس کے مکتوبات مذکورہ کو احکام شرعیہ مذکورہ میں معتبر جانیں تو ایسے عوام خطا کار ہوں گے یا نہیں؟

(۱۳) کسی شہر کی جامع مسجد کے امام یا غیر مصر کی بڑی مسجد کے امام کو شرعاً کیا کیا اختیارات حاصل ہیں اور ان کے کیا کیا احکام نافذ کردہ واجب العمل ہوں گے؟

(۱۴) اگر کسی شہر کی جامع مسجد کے امام یا غیر مصر کی بڑی مسجد کے امام اپنے آپ کو قاضی متصور کر کے کتاب القاضی الی القاضی کی بنا پر رویت ہلال عیدین کا حکم و اعلان اس طرح کریں کہ سب لوگ آج روزہ افطار کر لیں۔ یا آج قربانی کر لیں۔ لیکن نماز عید الفطر یا نماز عید الاضحیٰ کل ہوگی جبکہ تین چار گھنٹہ کے قریب نماز عیدین کا وقت باقی ہو اور کوئی عذر شرعی بھی تاخیر نماز عیدین کا نہ ہو تو اگلے روز نماز عیدین بکراہت ادا ہوگی یا بغیر کراہت اور کسی عذر شرعی کی صورت میں اس اعلان کی بنا پر اگلے روز کی نماز مکروہ ہوگی یا غیر مکروہ؟

(۱۵) شہر کی جامع مسجد یا عید گاہ سے پہلے شہر کی کسی دوسری ایک مسجد میں یا متعدد مساجد میں

جمعہ یا عیدین ادا کیجائے تو وہ نماز جمعہ یا عیدین صحیح و درست ہوگی یا نہیں؟ جبکہ اس دوسری مسجد یا متعدد مساجد میں زمانہ دراز سے نماز جمعہ و نماز عیدین ہو رہی ہوں۔ ایک شہر میں جامع مسجد یا عید گاہ کے علاوہ دو سری متعدد مساجد میں نماز جمعہ و عیدین ادا کی جائے تو قول راجح و مفتی بہ پر وہ نماز جمعہ اور نماز عیدین جائز ہوگی یا ناجائز؟ امور مستفسرہ بالا کے جوابات مدلل بحوالہ کتب فقہیہ معتبرہ لکھے جائیں۔

المستفتی حاجی محمد ظہور صاحب کارخانہ چمچہ لال مسجد مراد آباد

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

(۱) لفظ امام شہر ترکیبی حیثیت سے صحیح ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) لفظ امام شہر فارسی ترکیب ہے جس کا عربی میں ترجمہ امام المصر ہے اور لفظ امام المصر اصطلاحات شرعیہ میں منقول ہے اور اس کی تعریف کتب فقہ میں اس طرح موجود ہے۔ مجمع الانہر شرح ملتقى الابحر میں ہے:

امام المصر و هو سلطانہ - (از مجمع الانہر مصر ج ۱ ص ۱۸۲) یعنی امام مصر سلطان شہر اور امیر البلدہ ہے۔ اور شرعاً اس امام کو ان احکام کے اجرا کے اختیارات ہیں۔

علامہ شامی باب الامامۃ میں عقائد نسفیہ سے ناقل ہیں:

والمسلمون لا بد لهم من امام يقول تنفيذ احكامهم و اقامة حد و دهم و سد ثغورهم و تجهيز جیو شہم و اخذ صدقاتہم و قهر المتغلبه و المثلصصه و قطاع الطريق و اقامة الجمع و الاعباد و قبول الشہادات القائمة علی الحقوق و تزویج الصغار و الصغار الذین لا اولیاء لهم و قسمة الغنائم۔ اھ

(رد المحتار مصری ج ۱ ص ۳۸۴)

اور مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ ایک امام ہو جو ان کے لئے تنفیذ احکام اور اجراء حدود اور شہر کی رخنوں اور دوسرے خطروں کے انتظام اور لشکروں کی تیاری اور صدقہ کے قبول کرنے اور متغلبوں اور چوروں کو روکنا اور غلبہ حاصل کرنے اور جمعہ و عیدین کے قائم کرنے اور حقوق پر شہادتوں کے سننے اور قبول کرنے اور نابالغ بچوں کے نکاح کرنے پر جن کے ولی موجود نہ ہوں اور مال غنیمت کی تقسیم کرنے پر قادر ہو۔

اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ جس کو ایسے اختیارات حاصل ہوں وہ شرعاً امام شہر ہے اور جسے ایسے اختیارات حاصل نہ ہوں وہ ہرگز ہرگز امام شہر نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) جامع مسجد کے امام کو کتب شرع میں امام جمعہ اور امام مسجد فقہاء کرام لکھتے ہیں:

در مختار میں ہے: امام المسجد الجامع اولی من امام الحی ای مسجد محلہ۔

(رد المحتار ج ۱ ص ۶۱۶)

جامع مسجد کا امام محلہ کی مسجد کے امام سے بہتر ہے جبکہ اس کا اہل ہو۔

علامہ حلبی کبیری میں صلوٰۃ الجنائزہ کے ذکر میں فرماتے ہیں:

الاولی بالامامة فيها السلطان ثم القاضي ثم امام الجمعة ثم امام الحی ثم الوالی۔ (از کبیری مطبوعہ فخر المایع لکھنؤ ص ۵۴۱)

نماز جنازہ کی امامت کیلئے سب سے بہتر سلطان ہے پھر قاضی پھر امام جمعہ پھر امام محلہ پھر ولی میت۔ مجمع الانہر میں فتح القدیر سے نقل ہیں:

الخليفة اولی ان حضر ثم امام مصر و هو سلطان ثم القاضي صاحب الشرط ثم خليفة القاضي ثم امام الحی (فيه ايضاً) امام المسجد الجامع اولی من امام الحی۔

(مجمع الانہر ص ۱۸۲)

امامت نماز جنازہ کیلئے سب سے افضل اور حقدار خلیفۃ المسلمین ہے اگر وہ موجود نہ پھر امام شہر یعنی امیر بلدہ پھر قاضی شہر کو تو ال شہر پھر خلیفہ والی پھر خلیفہ قاضی پھر امام محلہ اور امام جامع مسجد امام محلہ سے بہتر ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ فقہائے کرام جامع مسجد کے امام کو امام المسلمین الجامع اور امام الجمعہ کے لقب سے ذکر کرتے ہیں۔ اور امیر شہر کو امام المصر یعنی امام شہر کے لقب سے ملقب کرتے۔ امام جامع مسجد منجملہ والیوں کے کوئی والی بھی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ نماز جنازہ کی امامت کے حق دار ہونے میں یہ خلیفہ قاضی کے بعد ہے اور خلیفہ قاضی خلیفہ والی کے بعد ہے اور خلیفہ والی کو تو ال شہر کے بعد ہے اور کو تو ال قاضی کے بعد ہے اور قاضی امیر بلدہ یعنی امام شہر کے بعد ہے اور امام شہر خلیفۃ المسلمین کے بعد ہے تو یہ امام جامع مسجد اس خلیفہ قاضی کے برابر نہ ہو سکا جو قاضی سے دو درجہ نیچے ہے۔ پھر یہ قاضی شہر کی برابر کس طرح ہو سکتا ہے پھر جب یہ قاضی کے درجہ تک نہ پہنچ سکا تو اس کو امیر البلدہ یعنی امام شہر کس

معنی کی بنا پر کہا جاسکتا ہے۔ اور امام عیدین امام جمعہ ہی کی حیثیت رکھتا ہے اور امام ہجگاہ کا امام جامع مسجد سے بھی کم رتبہ ہے۔ لہذا بغیر ثبوت تامہ اور ولایت عامہ کے امام جامع مسجد کو قاضی شہر اور اس سے بڑھ کر امام شہر کہنا کتب فقہ کی تصریحات کے خلاف ہے اور فقہائے کرام کی کھلی ہوئی مخالفت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۴) جواب نمبر دو سے یہ ثابت ہو گیا کہ امام جامع مسجد اپنی شوکت و ولایت عامہ نہ ہونے کے باعث نہ شرعاً قاضی شہر ہے اور نہ امام شہر تو اس کو لوگوں کا قاضی یا امام شہر کہنا یا لکھنا شریعت طاہرہ میں کس طرح درست ہو سکتا ہے اور اس کا خود اپنے آپ کو قاضی شہر یا امام شہر کہنا، یا لکھنا اور زیادہ قبیح و مذموم اور اس کا دوسروں سے یہ کہلوانا اور زیادہ بدترین شنیع فعل ہے۔

حدیث شریف میں اس کی سخت ممانعت وارد ہے۔ ابن ماجہ شریف میں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روای ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

من ادعی ماليس له فليس منا و ليتبؤ مقعده من النار۔

(جامع صغیر للسيوطی ج ۲ ص)

جو شخص ایسی چیز کا دعویٰ کرے جو اس میں نہ ہو تو وہ ہم میں سے نہیں اور وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے۔ (۵) جو امام جامع مسجد اپنے اندر شوکت تامہ اور ولایت عامہ حاصل نہ ہونے اور تنفیذ احکام واجراء حدود پر قادر نہ ہونے کے باوجود بھی اپنے آپ کو امیر المؤمنین و خلیفۃ المسلمین یا قاضی جانے یا دوسروں کو یہ باور کرائے یا عوام اس کو ایسا اعتقاد کریں تو ایسا امام و عوام کا لانعام انتہائی جاہل و نادان ہے ورنہ احکام شرع کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۶) جب یہ امام جامع مسجد نہ امیر المؤمنین نہ قاضی نہ اور کسی طرح کا حاکم و والی تو اس بے اختیار کے کیا اختیارات ہو سکتے ہیں اور اس کے تمام احکام کس طرح نافذ ہو سکتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۷) امام مذکور یا کسی عالم کا اپنی ناقص تحقیق اور غلط حکم کی بنا پر ایسا اعلان کرنا نہایت جرأت و دلیری اور انتہائی جہالت و نادانی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۸) امام جامع مسجد یا غیر مفتی شہر عالم کا ایسا اعلان و حکم اگر مخالف شرع ہے تو اس پر مسلمانوں کو عمل کرنا گناہ و ممنوع ہے۔

بخاری و مسلم اور ابوداؤد، نسائی وغیرہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ حضور نے فرمایا :
لا طاعة لاحد في معصية الله انما لطاعة في المعروف -

(جامع صغیر مصری ج ۲ ص ۱۹۳)

اللہ کی معصیت میں کسی کی اطاعت نہیں کہ اطاعت تو نیکی ہی میں ہوتی ہے۔
بلکہ ان کے گناہوں کا وبال اس امام مذکور وغیرہ پر بھی ضرور ہوگا۔

حدیث شریف میں ہے جس کو ابوداؤد نے اور حاکم نے مستدرک میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ حضور نے فرمایا: من افتی بغير علم كان اثمه على من افتاه -

(جامع صغیر ص ۱۲۸)

جس نے بلا علم کے فتویٰ دیا تو اس کا گناہ اس فتویٰ دینے والے پر ہوگا۔

(۹) جب امام مذکور کی حیات میں نہ کبھی یہاں سلطان اسلام ہوا نہ اب ہے تو اسے سلطان اسلام کا مقرر کردہ قاضی کوئی اسے سمجھ والا تو مان نہیں سکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۱۰) قیاس کا اقتضا تو یہ تھا کہ کتاب القاضی الی القاضی مطلقاً شریعت میں معتبر نہ ہوتی کہ خط مشابہ خط کے ہوا کرتا ہے اور عقلاً خط قاضی خود بیان قاضی سے زیادہ قوی نہیں تو بیان قاضی قابل عمل ہوتا اور خط قاضی نا قابل عمل ہوتا۔ مگر اجماع نے کتاب قاضی کو قابل عمل قرار دیا اور خود بیان قاضی کو نا قابل عمل ٹھہرایا۔

چنانچہ مجمع الانہر میں ہے: والقیاس یا بی جواز العمل بکتاب القاضی لان القاضی الکاتب لو حضر بنفسه مجلس المکتوب الیه و عبر بلسانه عما فی الکتاب لم يعمل به القاضی فکیف بالکتاب و فیہ شبه التزویر اذ الخط یشبه الخط والخاتم یشبه الخاتم الا انه یجوز استحسانا للاحاجة الناس الیه لما روی ان علیاً رضی اللہ تعالیٰ عنہ جوزه لذلك و علیہ اجمع الفقهاء - (مجمع الانہر ج ۲ ص ۱۶۵)

قیاس کتاب القاضی الی القاضی پر عمل کرنے کے جواز کا انکار کرتا ہے کیونکہ خود قاضی کا تب اگر مجلس قاضی مکتوب الیہ میں حاضر ہو جائے اور اپنی زبان سے مضمون کتاب کو بیان کرے تو اس کو قاضی مکتوب الیہ قابل عمل نہ ٹھہرائے تو کیسے اس کتاب کو قابل عمل قرار دیں جس میں گڑھ دینے کا شبہ ہو کہ خط خط کا مشابہ ہو جاتا ہے اور مہر مہر کے مشابہ ہو جاتی ہے۔ مگر لوگوں کی حاجت کیلئے کتاب القاضی کو استحسان

جائز قرار دیا کہ حضرت مولانا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے اس کتاب القاضی کو جائز ٹھہرایا اور اسی کے اوپر فقہاء کرام نے اجماع کیا۔

اس عبارت سے بمقابلہ بیان قاضی کے خط قاضی کا باجماع حجت ہونا ثابت ہوا۔ لیکن خط قاضی کا حجت ہونا اس کے تمام شرائط کے جمع ہو جانے پر موقوف ہے۔

عالمگیری میں ہے: یجب ان یعلم ان کتاب القاضی الی القاضی صار حجة شرعا فی المعاملات بخلاف القیاس لان الکتاب قد یفتعل و یزور و الخط یشبه الخط و الخاتم یشبه الخاتم ولكن جعلناه حجة بالاجماع ولكن انما یقبله القاضی المکتوب الیه عند وجود شرائطه - (فتاویٰ عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۱۷۲)

یہ جو بنا واجب ہے کہ قاضی کا خط دوسرے قاضی کی طرف معاملات میں خلاف قیاس حجت شرعی ہے کہ خط بنایا اور گڑھا جاسکتا ہے اور خط خط کے مشابہ ہو جاتا ہے لیکن ہم نے اس کو اجماع سے حجت قرار دیا مگر اس کو بھی قاضی مکتوب الیہ اس کے تمام شرائط کے پائے جانے پر قبول کرے۔

لہذا شرائط کتاب القاضی الی القاضی سے اگر ایک شرط بھی نہ پائی جائے تو پھر کتاب القاضی نہ حجت شرعی نہ اس پر عمل جائز۔ تو اب شرائط کتاب القاضی کا ذکر ہدایہ، درمختار، رد المحتار، مجمع الانہر۔ فتاویٰ عالمگیری وغیرہا سے نقل کیا جاتا ہے اور ان کی عربی عبارات کو بخوف طوالت نقل نہیں کیا۔ لہذا وہ شرائط کتاب القاضی یہ ہیں۔

(۱) کتاب القاضی جس شہر سے دوسرے کی طرف جائے تو ان پر دو شہروں کے درمیان مقدار سفر کی مسافت کا ہونا۔ اور بقول بعض کم از کم اتنی مسافت کا ہونا کہ جانے والا اسی دن میں مکان واپس نہ آ سکے۔

(۲) قاضی کا تب کا اگر نام مشہور ہو تو اس کا نام و قاضی بلد فلاں ورنہ اس کے باپ، دادا کے اسی کتاب ہی میں مکتوب ہونا۔

(۳) قاضی کا تب کے روبرو جس واقعہ پر شہادت گزرے اس واقعہ کا تفصیلی ذکر کتاب میں ہونا۔

(۴) شاہدین واقعہ کے اسماء مع نام پدر و جد کے اس کتاب میں ہونا۔

(۵) قاضی کا تب کے روبرو جس واقعہ پر شہادت گزرے اس واقعہ کا تفصیلی ذکر کتاب میں ہونا۔

(۶) قاضی کا ان شاہدین واقعہ کے عدالت کا کتاب میں لکھنا اور اگر قاضی کو ان کی عدالت کا خود

علم نہ ہو تو یہ بھی لکھ دینا کہ میں نے ان کی عدالت پر فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں مزکیوں سے دریافت کر کے اعتماد کیا۔

(۷) قاضی کا شاہدین کتاب کے اسماء مع نام پدر و جد کے اور مع ان کے عدالت کے کتاب میں لکھ دینا۔

(۸) اس کتاب پر دو عادلوں کو شاہد بنانا۔

(۹) ان شاہدین کتاب کے اسماء مع نام پدر و جد کے لکھ دینا اور مع عدالت کے کتاب میں لکھ دینا۔

(۱۰) کتاب میں تاریخ و یوم اور سنہ کا لکھنا۔

(۱۱) قاضی کا تب کا آخر کتاب میں یہ لکھنا کہ میں فلاں بن فلاں قاضی بلدہ ہوں، یہ میری

کتاب ہے، اس میں میرا حکم ہے، میری مہر اس پر چپاں ہے، یہ کتاب اس قدر کاغذ کی اتنی سطروں میں ہے، میں نے فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں پر اس کو لکھ کر پڑھا۔ اور اس کے مضمون و حکم پر مطلع کیا۔ اور ان کے سامنے اس پر مہر لگائی اور انہیں اس پر شاہد بنایا۔ میں نے یہ آخری سطر میں اپنے حکم سے فلاں تاریخ میں لکھیں۔

(۱۲) قاضی کا تب کا شاہدین کتاب پر اس کتاب کو پڑھنا۔

(۱۳) ان شاہدین کتاب کے سامنے کتاب کو طے کر کے سر بمہر کرنا۔

(۱۴) قاضی کا تب کا مجلس قضا میں ان شاہدوں کو یہ کتاب سونپنا۔

(۱۵) شاہدین کتاب کا مضمون کتاب کو محفوظ کرنا بلکہ اس کی نقل کو اپنے پاس رکھنا۔

(۱۶) ان تمام شاہدوں کا مسلمان صحیح العقیدہ ہونا عادل ہونا۔

(۱۷) خاص مکتوب الیہ کا اس کتاب کے کندہ ہونے پر اور مہر کے صحیح باقی رہنے کو بغور پہلے دیکھ

لینا کہ اس کو کھلا ہونا اور مہر کو ٹوٹا ہوا پانے کی حالت میں قبول نہ کرنا۔

(۱۸) خاص مکتوب الیہ پھر شاہدین کتاب کی شہادت لے اور وہ یہ کہیں کہ ہم شہادت دیتے ہیں

کہ فلاں بن فلاں قاضی بلدہ فلاں کی کتاب ہے جو آپ کے پاس بھیجی ہے اس نے اسے ہمارے سامنے پڑھا اس کا مضمون ہے۔ اس پر ہماری موجودگی میں مہر لگائی اور ہمیں اس پر گواہ بنایا اور ہمیں یہ مجلس میں سونپی۔ یہ اسی خاص کی مہر ہے۔

(۱۹) قاضی مکتوب الیہ اس شہادت کے گزر جانے کے بعد اس کتاب کو کھول کر دیکھے۔

(۲۰) پھر مضمون کتاب کا اگر اس شہادت کے موافق ہو ورنہ بصورت مخالفت وہ کتاب قابل رد ہے۔

(۲۱) قاضی کا تب اس قاضی کے کتاب پڑھنے تک زندہ رہے نہ وہ معزول ہونے سے جنون و فسق اور رد لاحق ہو۔

(۲۲) قاضی مکتوب الیہ بھی وصول کتاب تک زندہ رہے نہ وہ معزول ہونے سے خارج از بلد ہو۔

(۲۳) اگر قاضی خارجی کی کتاب آئے اور قاضی مکتوب الیہ ہی جانتا ہے کہ اس کے شاہد خارجی ہیں یا یہ علم نہ ہو کہ شاہد خارجی ہیں یا اہل عدل تو یہ قاضی مکتوب الیہ اس کتاب کو قبول نہ کرے۔

(۲۴) ظاہر الروایت میں ہے کہ قاضی شہر قاضی شہر یا قاضی قریہ کو کتاب لکھ سکتے ہیں اور قاضی قریہ قاضی شہر کو نہ لکھے۔

(۲۵) قاضی مکتوب الیہ کا اس کتاب قاضی پر عمل کرنا ضروری نہیں اس کو اس پر عمل کرنے اور نہ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

یہ ۲۵ شرائط کتاب القاضی ہیں جو کتاب القاضی الی القاضی کے معتبر و مستند ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۱۱) جب ایک امام جمعہ کو نہ سلطان اسلام نے قاضی مقرر کیا نہ اہل شہر کے علماء اور اکابر نے قاضی تجویز کیا تو وہ شرعاً قاضی ہی نہ ہوا تو اس کا خط نہ کتاب القاضی الی القاضی نہ حجت شرعی۔ در مختار میں ہے: القاضی یکتب الی القاضی وهو نقل الشهادة حقيقة ولا يقبل من حکم بل من قاضی مولی من قبل الامام ملخصاً۔

قاضی دوسرے قاضی کی طرف خط لکھے کہ یہ حقیقہ شہادت کا نقل کرنا ہے اور حکم کا خط قبول نہ کیا جائے گا بلکہ اس قاضی کا جو امام کی طرف سے مقرر کیا ہوا ہو۔

(۱۲) عوام کا ایسے امام جمعہ کو قاضی شرع ماننا یا اس کے خط کو حجت شرعی جاننا خلاف شرع ہے تو ان کے خطا کار و گنہگار ہونے میں کوئی شک نہیں، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۱۳) شریعت نے امام جامع مسجد کو ولایت عامہ کے اختیارات نہیں دیئے تو نہ اسے احکام نافذ کرنے کا حق حاصل نہ اس کے ہر حکم کا ماننا اس پر عمل کرنا واجب۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

(۱۴) جو امام جامع مسجد شرعاً قاضی شرع نہ ہو تو شرعاً نہ اسے کتاب القاضی الی القاضی لکھنے کا حق

حاصل، نہ مکتوب الیہ کیلئے اس کا خط قبول کے قابل۔ نہ ایسا خط ثبوت رویت ہلال کے لئے طریق موجب، نہ مسلمانوں کو اس پر عمل کرنا واجب۔ تو اس پر اس کا اعلان و حکم غلط و باطل ہے۔ لہذا اس پر روزہ کے افطار کی اباحت، نہ قربانی کی اجازت۔ پھر جنہوں نے اس اعلان پر روزہ افطار کر لیا یا قربانی کر لی ان پر ایک روزہ کی قضا لازم اور قربانی واجب، مسلمانو! جب اس امام کی مسائل شرع اور احکام دین سے ناواقفی و جہالت کا یہ حال کہ یہ نماز عیدین کا تین چار گھنٹہ وقت باقی رہنے کے باوجود بھی بلا کسی عذر شرعی کے دوسرے دن نماز عیدین کے ادا کرنے کا اعلان کرتا ہے تو اس میں نہ قاضی شہر ہونے کی اہلیت نہ مفتی شہر بننے کی صلاحیت۔ پھر یہ بے خبر نادان انسان شرائط کتاب القاضی الی القاضی سے کس طرح واقف ہو سکتا ہے۔

بالجملہ جب اس امام کے نزدیک رویت ہلال کا ثبوت زوال سے تین چار گھنٹے قبل پہنچ چکا تو اتنے وقت میں اعلان ہو کر لوگوں کا اجتماع بھی ہو جاتا اور نماز عیدین بھی اسی دن میں ہو سکتی تھی۔ لیکن اس امام نے اس دن میں بلا کسی عذر شرعی کے نماز عیدین نہیں پڑھی۔ تو اس نے سب لوگوں کی نماز عید قضا کرادی کہ بلا عذر عید الفطر تو دوسرے دن جائز نہیں اور نماز عید الاضحیٰ مکروہ ہے۔

درمختار میں ہے: یحوز تا خیرھا الی آخر ثالث ایام النحر بلا عذر مع الکراہۃ و بہ ای بالعذر بدونها فالعذر هنا لنفی الکراہۃ و فی الفطر للصحة۔ (رد المحتار۔ ج ۱ ص ۵۸۶)

اور نماز عید الاضحیٰ کی تاخیر بغیر عذر کے قربانی کے اخیر تیسرے دن تک جائز مع الکراہت ہے اور بعذر جائز بلا کراہت ہے تو عذر اس میں تو کراہت کی نفی کے لئے ہے۔ اور نماز عید الفطر میں صحت کے لئے ہے۔

مجمع الانہر شرح ملتقی الا بحر میں ہے: یسئى بالتأخیر من غیر عذر فیہ تأخیر الواجب بلا ضرورة عند القائل بالوجوب فالعذر فی الاضحیٰ لنفی الکراہۃ و فی الفطر للجواز۔

(ج ۱ ص ۱۷۵)

بغیر عذر کے نماز عید الاضحیٰ کی تاخیر اساعت ہے کہ اس میں بلا ضرورت قائل وجوب کے نزدیک تاخیر واجب ہے تو عذر نماز عید الاضحیٰ میں معنی کراہت کے لئے ہے اور نماز عید الفطر میں جواز کے لئے ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: لو اخروها الی ثلثة ایام من غیر عذر جاز الصلوٰۃ وقد اساء و

فی الفطر الجواز حتی لو اخروها الی الغد من غیر عذر یجوز۔ (ج ۱ ص ۷۸)

اگر بغیر عذر کے نماز عید الاضحیٰ کو تین دن تک مؤخر کر دیا تو نماز جائز مع الکراہت ادا ہوئی۔ اور عذر نماز فطر میں جواز کے لئے یہاں تک کہ اگر اس کو بغیر عذر کے دوسرے دن تک مؤخر کیا تو یہ جائز نہیں۔ ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ بلا عذر شرعی دوسرے دن عید الاضحیٰ کی نماز پڑھنا تو مکروہ ہے اور عید الفطر کی نماز صحیح اور جائز نہیں۔

لہذا اس امام نے جب بلا عذر شرعی دوسرے دن نماز عید الفطر پڑھائی تو وہ نماز صحیح و جائز نہیں ہوئی تو لوگوں کی یہ نماز ادا نہ ہونے کا گناہ و وبال اس امام کی گردن پر رہا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۱۵) ایک شہر میں جامع مسجد یا عید گاہ کے علاوہ کسی اور ایک مسجد یا متعدد مساجد میں نماز جمعہ و

عیدین بلاشبہ جائز ہے۔

مجمع الانہر شرح ملتقی الا بحر میں ہے: تجوز صلاة العبد فی مصر فی موضعین وعند محمد فی ثلاثة مواضع کما فی الفتح لکن قد کان جواز الجمعة فی المصر الكبير فی مواضع كثيرة لدفع الحرج لان فی اتحادالموضع حرجا بینا لا استدعائه تطویل المسافة علی الاکثر کما بین آنفا وهذه العلة تجری فی العید علی انه صرح فی بعض المعتمرات جوازه اتفاقا وبهذا عمل الناس اليوم۔ (مجمع الانہر۔ ج ۱ ص ۱۷۳)

نماز عید شہر میں دو مقام میں اور امام محمد کے نزدیک تین جگہوں میں جائز ہے جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔ لیکن بڑے شہر میں دفع حرج کیلئے اکثر جگہوں پر بھی جائز ہے۔ اس لئے کہ ایک جگہ پر خاص کرنے سے کھلا ہوا حرج لازم آتا ہے کہ اکثر لوگوں کو طویل مسافت طے کرنا پڑے گی۔ اور یہی علت عید کے لئے بھی جاری ہے، اور بعض معتبر کتابوں میں جواز عید کی بالاتفاق تصریح کی اور اس وقت لوگوں کا عمل اسی پر ہے۔

در المنہی شرح ملتقی میں ہے: تصح فی مصرفی مواضع كثيرة هو الصحيح و علیہ الفتوی۔ (ج ۱ ص ۱۶۷)

ایک شہر میں کثیر مقاموں پر جمعہ کی نماز صحیح ہے اور یہی صحیح مذہب ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

مراقی الفلاح و طحاوی میں ہے:

وتصح إقامة الجمعة فی مواضع كثيرة بالمصروفنائہ وهو قول ابی حنیفة و محمد

فی الاصح (فی الطحطاوی قال السرخسی و به نأخذ و علیہ الفتوی۔ (ص ۱۹۲)

ایک شہر میں بہت سی جگہوں پر جمعہ کا قائم کرنا صحیح ہے اور اسی طرح فناء مصر میں اور یہی امام اعظم اور امام محمد کا صحیح قول ہے۔ اور امام سرخسی نے فرمایا کہ ہم اسی قول کو اختیار کرتے ہیں اور اسی پر فتویٰ ہے۔ و تؤدی الجمعة فی مصر و احد فی مواضع كثيرة و هو قول ابی حنیفة و محمد و هو الصحيح و ذکرہ امام السرخسی انه الصحيح من مذهب ابی حنیفة و به نأخذ هکذا فی البحر الرائق۔ (عالمگیری - ج ۱ - ص ۷۵)

جمعہ ایک شہر میں چند مقامات پر ادا کیا جائے اور یہی امام اعظم و امام محمد کا صحیح قول ہے اور امام سرخسی نے ذکر کیا کہ مذہب امام اعظم کا صحیح قول یہی ہے اور ہم اسی کو اختیار کرتے ہیں۔ اسی طرح بحر الرائق میں ہے:

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ شہر میں جامع مسجد یا عید گاہ کے علاوہ کسی ایک مسجد میں یا متعدد مساجد میں نماز جمعہ و عیدین کا بقول رائج و مفتی بہ پڑھنا جائز و صحیح ہے اور جب شہر میں تعدد جمعہ و عیدین کا جواز ثابت ہو گیا تو پھر قول رائج کی بنا پر جامع مسجد یا عید گاہ سے پہلے یا بعد کا فرق کوئی چیز نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المقتسم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۲۸ھ

مسئلہ

(۳۲۸-۳۳۹-۳۴۰-۳۴۱-۳۴۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

اگر کسی امام کی وجہ سے محلہ کے نمازیوں میں اختلاف ہو جائے تو ایسی حالت میں متولی کو اس امام کا رکھنا یا اس امام کا رہنا ضروری ہے۔ متولی کو بغیر اطلاع یا نمازیوں کے مرضی کے خلاف امام کا رکھنا درست ہے؟ امام کی وجہ سے مقتدیوں میں اختلاف ہونا ذیل میں درج ہے۔

(۱) نماز میں امام کو بوجہ عادت یا بغیر کسی تکلیف کے اپنے داہنے پیر کے انگوٹھے کو حرکت دینا۔

(۲) نماز فرض کے علاوہ امام کا بغیر کسی تکلیف کے سنت یا نفل یا واجب کا بیٹھ کر ادا کرنا۔

(۳) نماز میں امام کا رکوع یا سجدہ میں جاتے ہوئے اپنے پاؤں کو بار بار حرکت دینا اور سجدہ

میں اپنی دونوں کہنیوں یا ایک کہنی کا زمین پر ٹیک دینا ایسی حالت میں نماز پوری ہوتی ہے یا نہیں؟
(۴) امام نماز کا پانچوں وقت کا پورا پابند نہ ہونا۔

(۵) امام کا اخلاق اچھا نہ ہونا۔ اور صاف نہ رہنا اور نہ دوسروں کو ہدایت کرنا وغیرہ۔

برائے کرم اس کا تحریری طور پر جواب فرمادیں تاکہ محلہ کا اختلاف اور ہو جائے۔

المستفتی مستری محمد رمضان، جناب مولوی محمد اشفاق صاحب محمد حمید جودھپور

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

امام مذکور امور بالا کی عادات ترک کرے۔ خصوصاً یہی امور اختلاف کا باعث ہیں اور بعض ان میں مکروہ بھی ہیں۔ تو شرعاً اسے ان امور سے احتیاط اور پرہیز کرنا ضروری ہے۔ اور متولی کو بھی یہی چاہئے کہ اہل محلہ کی رضامندی کو ملحوظ رکھے خصوصاً ان کی ایسی بات جو کسی شرعی غلطی کی بنا پر ہو۔ بالجملہ امام مذکور آداب شرعی کو مد نظر رکھے اور اہل محلہ کے اختلاف دور کرنے کا ثواب حاصل کرے۔ اور متولی یہ ایثار کرے کہ اہل محلہ کو راضی کر کے اختلاف بین المسلمین کو دور کرے۔ مولیٰ تعالیٰ ان سب کو اجر و ثواب جزیل عطا فرمائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المقتسم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۲۸ھ
یکم ربیع الآخر ۱۳۲۸ھ

مسئلہ

(۳۲۶-۳۲۷-۳۲۸-۳۲۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) ہماری مسجد میں جو امام ہیں وہ ایک پیر سے لنگڑا اور ایک ہاتھ سے لنجا ہے، لیکن چلتا پھرتا ہے۔ اس کی اہمیت درست ہے یا نادرست؟۔ اور اس کے پیچھے نماز پڑھنی شرع مطہرہ میں جائز ہے یا ناجائز یا مکروہ ہے؟۔ شرع محمدی میں ایسے آدمی کے پیچھے نماز پڑھنی مکروہ لکھی ہے، اور بہار شریعت میں بحوالہ فتاویٰ عالمگیری کے یہ لکھا ہے کہ ایسے شخص سے دوسرے شخص کو کہ جس کے اندر یہ بات نہیں ہو اس کو امام بنانا اہل ہے۔

(۲) مسجد کا تیل اپنے اور اپنی بیوی کے کھانے میں خرچ کرتا ہے، اگر اس سے منع کیا گیا تو چند

مرتبہ یہ جواب دیا کہ میرے لئے جائز ہے۔ کیونکہ میں محتاج ہوں اور یہ بات اس کی غلط ہے کیونکہ یہاں پر معقول تنخواہ پر امامت کر رہا ہے۔

(۳) صدقہ فطر بھی اس نے لیا ہے، شرح وقایہ میں لکھا ہے کہ جس کے اوپر صدقہ واجب ہے اس کو صدقہ لینا ناجائز ہے۔

(۴) مسجد کی لکڑی بھی اس نے گھر کے خرچ میں جلائیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ کل وجوہات مذکورہ پر نظر ڈال کر موافق شریعت مطہرہ کے ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھیں یا اس کو امام بنانا کیا ہے۔ برائے کرام جواب بحوالہ مستند حدیث شریف کے مرحمت فرمائیں۔ جواب اس کی پشت پر ہی لکھ دینا۔
راقم عبداللطیف قریشی اشرفی موضع نگلہ ڈاک خانہ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

امام مذکور میں نہ فقط اتنے جسمانی عیوب بلکہ شرعی نقطہ نظر سے یہ اہم نقص ہیں کہ وہ حلت و حرمت کا امتیاز نہیں کرتا مسجد کے تیل کو اپنے استعمال میں لاتا ہے، مسجد کی لکڑیاں اپنے گھر میں جلاتا ہے۔ صدقہ فطر خود اس پر واجب ہے۔ لیکن وہ باوجود اس کے دوسروں سے وصول کرتا ہے، تو ایسے جری وغیر محتاط اور غیر متشرع شخص کو امام نہ بنانا چاہئے، یہی قطنی کی حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

اجعلوا ائمتکم خیار کم فانہم وفد کم فیما بینکم و بین ربکم۔

(بخاری، ج ۲، ص ۴۵۹)

تم اپنے امام بہتر شخصوں کو بناؤ کیونکہ وہ تمہارے رب کے درمیان تمہارے قاصد ہیں۔
حاکم نے مستدرک میں حضرت مرشد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ان سرکم ان یقبل صلوٰتکم فلیؤمکم خیار کم۔ (ص ۴۵۹)

تمہیں اگر یہ اچھا لگے کہ تمہاری نماز مقبول ہو تو تمہارے بہترین شخص تمہاری امامت کریں۔
ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ امام ہر اعتبار سے بہتر شخص ہو، پابند شرع ہو، نیک و صالح ہو، نظر عوام میں حقیر نہ ہو، دینی احکام میں محتاط ہو، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: ۱۔ معتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۳۵۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین بابت اس مسئلہ کے کہ پیش امام مسجد جو امامت کی خدمت انجام دے رہا ہے، اور جو کچھ نذرانہ ان کو ملتا ہے وہ اس کو تنخواہ تصور کر لے اور یہ کہے میری تنخواہ کئی ماہ سے نہیں ملی تو اگر امامت کے نذرانہ کو تنخواہ کہہ کر لیتا ہے تو اس کی امامت جائز ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

امام اپنی امامت پر تنخواہ طے کر کے ماہ بماء مطالبہ کر سکتا ہے۔ درمختار میں ہے: ویفتی الیوم بصحتها لتعليم القرآن والفقہ والامامة والاذان۔ (شامی مصری ج ۵ ص ۳۶)
فتاویٰ خیرہ میں ہے: واخذ الاجرة علی الامامة لا یقول به المتقدمون اصلا واستحسنه المتأخرون لاشتغال الناس بمعاشهم وقلة من یعمل حسنة لوجه الله تعالیٰ۔
صاحب مجمع الانہر ذخیرہ وروضہ سے نقل ہیں۔ یحوز الاستیجار علم التعلیم والفقہ والامامة۔
(مجمع الانہر مصری ج ۲ ص ۳۸۵)

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ امامت کی اجرت اور تنخواہ لینا جائز ہے۔ متاخرین فقہاء کرام نے اس کو مستحسن قرار دیکر فتویٰ جواز دیا۔ تو جب امامت کی تنخواہ لینا جائز ثابت ہوئی تو اب اس امام مذکور کا یہ مطالبہ تنخواہ کوئی فعل ناجائز نہیں ہوا۔ لہذا اس بنا پر اس کی امامت جائز ثابت ہو گئی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: ۱۔ معتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۳۵۱-۳۵۲-۳۵۳-۳۵۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و شرع متین حسب ذیل مسائل پر جواب مع دستخط و مہر کے روانہ فرما

میں۔

(۱) ایک پیش امام ایسا بنانا ہے جسے کوئی چیزیں نظر نہیں آتی ہیں، خفیف نجاست کا اندازہ نہیں کر سکتا مگر حتی الامکان پاکی کا خیال رکھتا ہے اور گاؤں کے اندر سب سے زیادہ مسئلہ مسائل جانتا ہے اور تین پارہ کا حافظ ہے۔ گاؤں کے رئیس کے یہاں سے تنخواہ پانے والا مقررہ پیش امام عرصہ دراز سے چلا آتا ہے اور عقائد اہل سنت والجماعت رکھتا ہے۔ پر ایک لڑکوں کی تعلیم دینے والے دیوبندی مولانا کے یہاں دعوت پر جس میں گاؤں کے اور چند اشخاص بھی گئے تھے تین روز شرکت کرتا ہے اور اس شخص کے پوچھنے پر جس نے جاتے وقت اس سے کہہ دیا تھا کہ تعلیم اور لڑکوں کی بود باش کے متعلق دریافت کیا کہتا ہے کہ انتظام معقول ہے اور تعلیم اچھی ہوتی ہے وہاں لڑکوں کو بھیجنا ہرج نہیں۔ اس بنایہ کچھ لوگ اس کی پیش اما مت سے گریز کرتے ہیں حالانکہ اس کے عقائد میں کچھ فرق نہیں آیا۔ اس کے پیچھے نماز ہو سکتی ہے یا نہیں اور ان گریز کرنے والے اشخاص کا علیحدہ اسی گاؤں کی دوسری مسجد میں نماز جمعہ پڑھنا درست ہے یا نہیں؟

(۲) دیوبندی لوگوں سے ملنے، جلنے، اٹھنے، بیٹھنے، کھانے، پینے، سلام و دعا کرنے سے ہی کیا کفر کا فتویٰ ہوتا ہے یا نہیں یا براونا جائز ہے؟ اگر اس کے عقائد میں کچھ فرق نہ آئے۔

(۳) کبار کافر کے بھرے ہوئے پانی سے غسل و وضو کرنا۔ اس میں پکا ہو کھانا کھانا، بازاری (کا فروں کے یہاں بنی ہوئی) مٹھائیاں کھانا، کافروں سے ملنا جلنا درست ہے یا نہیں؟ اور سوائی لینا کیسا ہے؟

(۴) سوال ۲-۳ کے عمل پیرا لوگوں کا مقابلہ۔

محمد اسماعیل خاں ہیڈ ماسٹر اسلامیہ پرائمری اسکول ہردوئی ضلع باندہ یو پی ۱۳ اگست ۱۹۵۴ء

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

(۱) امام مذکور جب تک عقائد اہل سنت و جماعت ہی پر قائم ہے اور وہ باوجود اس کے دیوبندیوں سے اجتناب اور پرہیز نہیں کرتا تو یہ اس کی بد عملی ہے۔ اسے پہلے اس بری عادت سے روکا جائے اگر وہ اپنے ان حرکات سے رجوع کر کے دیوبندیوں سے اجتناب کرنے لگے جب تو اس کے پیچھے نماز پڑھنا چاہئے اور گاؤں کی دوسری مسجد میں جمعہ قائم نہ کرنا چاہئے اور اگر وہ اپنی پہلی عادت سے باز نہ آئے اور ان

سے میل جول باقی رکھے تو اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھنا چاہئے۔ اور دوسری مسجد میں جمعہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ لا نہ فاسق و الصلوٰۃ خلف الفاسق مکر وہ واجب الا عادة۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) دیوبندیوں سے ملنا جلنا، ان کے پاس بلا ضرورت اٹھنا بیٹھنا، ان کے ساتھ کھانا پینا، ان سے سلام و کلام کرنا۔ ان کے ساتھ بیاہ و شادی کرنا ناجائز ہیں۔ احادیث شریفہ میں ہے: لا توا کلو ہم ولا تشار بوہم ولا تناکحوہم ولا تسلموا علیہم ایا کم و ایا ہم۔ (رواہ ائمة الحدیث فی سننہم)

اور جب اس کے عقائد میں فرق نہیں آیا ہے تو محض ان امور کی بنا پر فتویٰ کفر عائد نہیں ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) کفار کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا یا مٹھائی اگر اس میں ناپاکی کا یقین نہ ہو تو اس کو کھانا جائز ہے لیکن کفار کی بے احتیاطی اور گندہ مزاجی کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کا کھانا خلاف اولیٰ اور نامناسب ہے بلکہ احتیاط و تقویٰ کے تو بالکل خلاف ہے اور ان کے ہاتھ کا بھرا ہوا پانی جس میں ان کی انگلی کے ڈوب جانے کا گمان غالب ہے۔ اس سے وضو و غسل نہیں کرنا چاہئے۔ کفار سے ملنے جلنے کا حکم جواب نمبر (۲) میں مذکور ہوا اور سوائی لینا دینا یہ ہمارا مانوس لفظ نہیں اس لئے کوئی حکم نہ دیا جاسکا۔ اس کو آپ بالتفصیل دریافت کریں تو جواب دیا جائے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۴) یہ بھی مجمل ہے اس کو آپ بالتفصیل دریافت کریں تو حکم بیان کیا جاسکتا ہے۔

کتبہ: المقتضی بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،

العبد محمد اجمیل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمیل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۵۴ھ

۲۸ رزی الحجہ ۱۳۵۴ھ

مسئلہ

(۳۵۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص وکیل یا مختار کا محرر ہے اور امامت کی اہلیت بھی رکھتا ہے، بعض حضرات کا خیال ہے کہ جو شخص وکیل یا مختار کا محرر ہو اس کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز ہے۔ امید ہے کہ جواب سے مطلع فرمائیں گے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اگر شخص مذکور فی سوال دین میں مطعون نہ ہو اور فواحش ظاہرہ سے اجتناب کرتا ہو اور اہلیت امامت رکھتا ہو تو اس کی امامت نہ فقط جائز بلکہ افضل ہے، شامی میں ہے: وان کان افضل القوم فہو ادلی۔ پھر اس کی اقتدا میں کیا شبہ و شک کیا جاسکتا ہے، اور اگر وکیل کے محرر ہونے میں اس کو از تکاب کبار کرنا ہی پڑتا ہے تو اس کو امامت کیلئے خود بھی تیار نہیں ہونا چاہیے۔ اور لوگوں پر فسق ظاہر ہو تو وہ بھی اس کی اقتدا سے پرہیز کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدۃ سنجل

(۳۵۶)

مسئلہ

ایک شخص کے ہاتھ پیر منھ پر برص کے سفید داغ ہیں اور یہ شخص حافظ قاری بھی ہے، اب اس کے لئے علماء دین اور شرع متین کا کیا فتویٰ ہے، اس کے پیچھے کسی قسم کی نماز ہو سکتی ہے، یا نہیں؟

حافظ غلام رسول

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

محض کسی کو سفید برص کے داغوں کی بنا پر امامت کے لئے نا اہل سمجھنا سخت جہالت ہے، شریعت میں اس کا کوئی وجود نہیں اور جب وہ دین میں مطعون نہیں اور فواحش ظاہرہ سے اجتناب کرتا ہے اور حافظ قاری ہے تو اس کو امامت کے لئے منتخب کرنا بلا شک جائز ہے۔ بلکہ اولیٰ اور افضل ہے، شامی میں ہے: وان کان افضل القوم فہو اولی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدۃ سنجل

(۳۵۷)

مسئلہ

محترمی مکرمی جناب مولانا مفتی اجمال شاہ صاحب قبلہ السلام علیکم گزارش عرض یہ ہے:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ ہمارے سنی مسلمانوں میں چند لوگ یہ کہتے ہیں کہ سنیوں کی نماز دیوبندیوں کے پیچھے جائز ہے، اور بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ نہیں ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ یہ لوگ بدعتیہ ہے، اور ان کے پیچھے سنیوں کی نماز جائز نہیں ہے۔ براہ کرم مع صحیح حوالہ کتاب مفصل جواب سے مطلع فرمائیں۔ بینوا تو جروا،

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

دیوبندی اپنے عقیدہ میں اپنی جماعت کے سوا تمام مسلمانوں کو بدعتی اور مشرک کہتے ہیں بلکہ ان کے حکم سے اس زمانہ سے لیکر سلف صالحین ائمہ وتابعین آل واصحاب وخلفاء راشدین بلکہ حضرات انبیاء کرام ومرسلین حتی کہ خود حضور سید المرسلین محبوب رب العالمین صلوٰات اللہ علیہم اجمعین میں سے کوئی بھی مشرک سے بچ نہ سکا، اسی بنا پر انہوں نے اولیا کرام کی شانوں میں گستاخیاں کیں۔ اللہ تعالیٰ کی بے عیب ذات کے لئے مکر اور جھوٹ جیسے عیوب ثابت کئے، انکی یہ بدعتیہ گیاں انکی کتابوں تقویۃ الایمان، حفظ الایمان، براہین قاطعہ، تحذیر الناس، وغیرہ رسائل میں چھپی ہوئی موجود ہیں انکی انہیں بدعتیہ گویوں کی بنا پر علماء حرمین شریفین نے ان پر کفر کے فتوے دئے۔ تو کم از کم ان کا گمراہ و اہل ہوا ہونا ناقابل انکار بات ہے اور اہل ہوا کے پیچھے نماز ناجائز ہے۔

فقہ کی مشہور و معتبر کتاب میں یہ حکم ہے: زوی عن محمد عن ابی حنیفۃ وابی یوسف ان الصلوٰۃ خلف اہل الاہواء لا تجوز۔ (کبیری-ص ۲۸۰)

امام محمد نے روایت کی حضرت امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف سے کہ بیشک اہل ہوا کے پیچھے نماز ناجائز ہے۔

یہ حکم خود حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ سے مروی ہے تو جو لوگ یہ کہتے ہیں انکے پیچھے سنیوں کی نماز جائز نہیں ہے بالکل صحیح کہتے ہیں انکی یہ بات فقہ کی کتاب اور قول حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ کے حکم کے موافق ومطابق ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدۃ سنجل

مسئلہ

(۳۵۸-۳۵۹-۳۶۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس تلفظ اور کلمہ میں کہ

(۱) شافعی کی امامت حنفی کے لئے بالکل جائز اور درست نہیں گویا ایسے قائل کسی حد تک تعزیر کا قابل نہیں؟

(۲) کسی زمانے میں ایسے الفاظ بولنے والوں کے ساتھ عوام مسلمانوں کو کیا سلوک کرنا چاہیے؟

(۳) کوئی ایسا شخص خطبہ پڑھنے کو منبر پر چڑھ رہا تھا جس نے امام محمد اور یس الشافعی رحمۃ اللہ

تعالیٰ علیہ کے مذہب کی پڑھی ہے اور امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مذہب کی کتب فقہ درسیہ ختم کر دیا ہے اور حواشی اور فتاویٰ میں بغیر تحقیق کے نگاہ بھی ڈالا اور پکاسنی حنفی المذہب ہونے کے ساتھ رسم رسوم میں ظاہر طور پر کوئی شرعی برائی بھی نظر آتی نہیں۔ ایسے حالت میں دوسرا ایک شخص ہاتھ پکڑ کر اس کو منبر سے اتار اور یوں بولتے ہوئے اتارا کہ تو شافعی ہے تیری امامت صحیح نہیں۔ اور روکنے والا روکتے وقت اس کا ہاتھ میں ایک عصائے بانسا بھی موجود تھا اور اسی عالم نے فساد و شور سے ڈرتے ہوئے خاموش بیٹھ گیا تو فوراً مانع امامت العالم نے وہاں کے (اسی مسجد کے امام) امام سے یہ کہلایا آپ مسجد کا امام ہو آپ خطبہ پڑھاؤ اور امامت کرو جو عربی الفاظ کی صحت اور مسائل حنفیہ ضروریہ کی کی وقفیت سے خالی ہے۔ اور ان سے خطبہ اور نماز پورا کیا، اب استفتائیہ ہے کہ گویا مانع خوف بالعصا کا یہ قول و کلمہ کہاں تک مقبول ہے کہ شافعی کی امامت حنفی کے لئے جائز نہیں۔ نیز ان مانع کی یہ حرکت شرعاً مذموم ہے یا محبوب۔ حالانکہ عالم صاحب کا کھڑا ہونا امام کا اصرار اور محبوب ترین اجازت کے بعد تھا اگر مذموم ہو تو ایسی حرکت کرنے والوں سے اہل محلہ کس قدر اور کیسا برتاؤ و سلوک کرنا شرعاً ضروری ہے۔ دلائل شرعیہ کے ماتحت میں براہین قطعیہ اگرچہ ظنیہ ہوں، جواب مرحمت فرمادیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علی رسولہ الکریم

شافعی المذہب صحیح العقائد اور اہل سنت و جماعت ہوتا ہے وہ فروعات میں احناف سے اختلاف رکھتا ہے تو صحت عقائد کی بنا پر تو شافعی کے پیچھے حنفی کی نماز جائز ہونی چاہیے۔ باقی رہا اختلاف

فروعی تو اگر شافعی امام اختلافی مسائل میں احناف کی رعایت مد نظر رکھتا ہے۔ جیسے فصدونی وغیرہ میں رعایت احناف کی بنا پر۔ تو ایسے شافعی امام کے پیچھے حنفی کی نماز بلا کراہت جائز ہے۔ احکام احناف اور رعایت احناف کو مد نظر نہیں رکھتا تو ایسے شافعی امام کے پیچھے حنفی کی نماز جائز مع الکراہت ہے۔

رد المحتار میں ہے: ذهب عامة مشائخنا الى الحواز اذا كان يحتاط في موضع الخلاف والا فلا والمعنى انه يجوز في المراعى بلا كراهة وفي غيره معها۔

اسی میں شرح منیہ سے ناقل ہیں: واما الاقنابا بالمخالف في الفروع كالشافعي فيحوز مالم يعلم منه ما يفسد الصلوة على اعتقاد المقتدى عليه الاجماع انما اختلف في الكراهة۔ لہذا اب جو نادان حنفی امامت شافعی کو حنفی کیلئے مطلقاً ناجائز کہتا ہے وہ غلط کہتا ہے۔ اور اگر بر بنائے تعصب کہتا ہے تو اسکو اپنے اس فعل مذموم سے رجوع کرنا چاہیے۔ اہل محلہ انکو سمجھائیں اگر وہ باز آگیا تو ٹریک ورنہ اس سے تعزیر پر ہیز کر سکتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

کتبہ: المقصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۰۲ھ

مسئلہ

(۳۶۱-۳۶۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین کہ

(۱) معمم بھرنا اور امید انعام میں معمم بھر بھیجنا جائز ہے یا نہیں، اور جو ایسا کرے اس کے اس فعل کے سبب نماز پڑھنا اس کے پیچھے جائز ہے یا نہیں، اور اس کو امام بنانا کیسا ہے؟

(۲) کسی ناجائز کام کو کرنے میں لفظ ان شاء اللہ کہنا مثلاً یوں کہ انشاء اللہ یا خدا کا حکم ہوا تو میں معمم بھر کر بھیجوں گا۔ اس طرح کہنا کہ خدایا اس کے رسول جل جلالہ وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا حکم ہوا یا اولیاء کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی مدد ہوئی، تو انعام پاؤں گا۔ معمم بھر کر بھیج رہا ہوں اس طرح کہنا شرعاً کیا ہے جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) معمم بھرنا اور اس پر انعام لینا یہ سب قمار اور جوا ہے۔ اور قمار کی حرمت سے کون مسلمان نہ

واقف ہے۔ تو اس کام کا کرنے والا گنہگار و فاسق ہوا۔ اور فاسق کی امامت مکروہ ہے۔ جو واجب الاعادہ ہے۔ رد المحتار میں ہے۔ و اما الفاسق فقد عللوا الکراهۃ تقدیمہ بانہ لا یهتم بامر دینہ و بان فی تقدیمہ للامامۃ تعظیمہ وقد وجب علیہم اہانتہ شرعاً۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۲) یہ معمم بھر کر بھجے وقت لفظ ان شاء اللہ کہہ کر یا یہ کہہ کر کہ خدا اور رسول جل جلالہ و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا حکم ہوا تو انعام پاؤں گا، اس لئے معمم بھر کر بھج رہا ہوں۔ تو اس فعل حرام پر ایسا کہنا شرعاً ناجائز و ناروا ہے۔ ایسے شخص پر توبہ و استغفار لازم ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب،

کتبہ: المقصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنہ ۱۲۸۱ھ

مسئلہ

(۳۶۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین کہ

ہمارے سنی مسلمانوں میں چند لوگ یہ کہتے ہیں کہ سنیوں کی نماز دیوبندیوں کے پیچھے جائز ہے اور بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ نہیں ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ یہ لوگ بد عقیدہ ہیں اور انکے پیچھے سنیوں کی نماز جائز نہیں ہے۔ براہ کرم صحیح معہ حوالہ کتاب مفصل جواب سے مطلع فرمائیں۔

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

دیوبندی قوم کے عقائد و مسائل چونکہ کتب عقائد و احکام اسلام کے خلاف ہیں یہاں تک کہ اکابر دیوبند کا عقیدہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی توہین کرنا ہے۔ جیسے اس سیوح قدوس کے لئے کذب و عیوب کو ثابت کرنا دیوبندیت کی جان ہے۔ اور حضرات انبیاء علیہم السلام کی شانوں میں گستاخیاں کرنا جیسے ان حضرات کو نادان، بیخبر، عاجز، بے اختیار لکھنا، بڑے بھائی کی سی عزت ماننا، انکی سرداری کو چودھری اور گاؤں کے زمیندار جیسی بتانا۔ انکو اللہ کی شان کے آگے چار سے زیادہ ذلیل ٹھہرانا، انکو وہ چیز سے کمتر قرار دینا، ان سے قوت و کمال میں جادوگر اور طلسم کو زائد کہنا۔ امتیوں کو اعمال میں ان سے بڑھا دینا۔ انکے علوم کو بچوں، پاگلوں، جانوروں کے علوم کی برابر بتانا۔ وغیرہ کفری اقوال ہیں۔ جن دیوبندیت کی بنیاد ہے۔ اور انکی کتابیں مطبوعہ موجود ہیں تو انہیں اقوال کی بنا پر اکابر علماء دیوبند

عرب و عجم مفتیان حرمین شریفین نے کفر کے فتوے دئے جو حسام الحرمین اور الصورام الہندیہ میں مطبوعہ موجود ہیں۔ تو جب ان دیوبندیوں کا کفر و ضلالت انکی کتابوں رسالوں سے ظاہر ہے پھر انکے پیچھے اہل اسلام کی نماز کس طرح جائز ہو سکتی ہے۔ فقہ کی مشہور کتاب کبیری میں ہے۔ روى محمد عن ابی حنیفہ و ابی یوسف ان الصلوٰۃ خلف اهل الاھوالا تجوز۔ یعنی امام اعظم علیہ الرحمۃ سے مروی ہے کہ گمراہوں کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ تو جب گمراہوں کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ تو یہ دیوبندی تو حد کفر تک پہنچ چکے تو انکے پیچھے نماز کس طرح جائز ہو سکتی ہے۔ لہذا جن لوگوں نے کہا تھا کہ دیوبندیوں کے پیچھے سنیوں کی نماز جائز نہیں، انکا قول بالکل صحیح ہے اور کتب فقہ کے موافق ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

کتبہ: المقصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنہ ۱۲۸۱ھ

مسئلہ (۳۶۴-۳۶۵-۳۶۶-۳۶۷-۳۶۸-۳۶۹-۳۷۰-۳۷۱-۳۷۲-۳۷۳)

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

کیا فرماتے علمائے دین و مفتیان شرع متین اس امر میں کہ ایک شخص مسمی زید نے سیکڑوں مسلمانوں کے رو برو مسجد میں ایک دلخراش تقریر کی جس سے مسلمانوں کے قلوب بے چین ہیں ازراہ کرم شرعی نقطہ نظر سے ان امور کے احکام بیان فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

(۱) زید نے کہا کہ جھنڈا رسم کفار ہے۔

(۲) جھنڈا اسلام میں نہ کبھی تھا اور نہ کبھی بلند کیا گیا۔

(۳) یہ بھی کہا کہ اگر جھنڈے کا ثبوت اسلام میں پایا جاتا تو جھنڈے کا صدر مسلمان ہی ہوتا

جھنڈوں کا صدر کبھی مسلمان نہیں ہوا۔ باوجود اس کے کہ امر وہہ میں تقریباً بیالیس جھنڈے ہیں اور ہر جھنڈے کا صدر مسلمان ہی ہے،

(۴) یہ بھی کہا کہ جتنے جھنڈے کے حامی ہیں اور ترغیب صوم و صلوٰۃ کے نعرے لگاتے ہیں وہ

سب کے سب غنڈے ناہنجار نابکار ہیں۔ بد معاش اغلام باز زنا کار و لاندہب ہیں۔

(۵) یہ بھی کہا کہ شعراء گمراہ ہوتے ہیں وہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ایسے الفاظ سے یاد کرتے

ہیں۔ مجھے اب مد سے بلا لو،

(۶) شعرائے اسلام کہتے ہیں۔ محمد ﷺ اسکو نہیں سنتے اور نہ انکو سلام پہنچ سکتا ہے۔

(۷) یہ بھی کہا کہ حضرت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مثل اور مردوں کے مردہ ہو چکے ہیں انکی قبر پر جا کر کہیں تو شاید سن سکیں۔

(۸) یہی بھی کہا کہ کچھ کہہ رہا ہوں اسلامی کتب دیکھ کر اور سمجھ کر کہہ رہا ہوں، کسی کے بہکانے سے نہیں کہہ رہا ہوں۔

(۹) کیا ایسا شخص مسلمانوں کا امام ہو سکتا ہے کیا اس تقریر کے حامی کے پیچھے مسلمانوں کی نماز ادا ہو سکتی ہے؟

(۱۰) ہر ایک نمبر کے محازی جواب مرحمت فرمائیے۔ کیا اسلامی کتب اسی قسم کی تعلیم سے بھرپور ہیں۔ ہر ایک نمبر کے مطابق جواب دیں گے، زحمت گوارہ فرمائیے۔

حکیم ڈاکٹر اخلاق محمد محلہ منڈی چوب امریہ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱-۲) اسلام میں جھنڈا تھا، اور ہمیشہ رہا اور خود بانی اسلام علیہ السلام، کے دو جھنڈے تھے، ایک سیاہ رنگ کا دوسرا سفید جو غزووں میں بلند کئے جاتے تھے، حضرت شیخ محقق عبدالحق محدث دہلوی مدارج النبوة میں نقل فرماتے ہیں۔ وآں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم روایت بودیک روایت سیاہ بود کہ عقاب نام داشت دیگر لوئے سفید بود۔ اب زید کا جھنڈا کو رسم کفار بتانا کیسی زبردست جرات و دلیری ہے۔ اور خود اسکی جہالت و نادانی کی کیسی روشن دلیل ہے۔ بیشک یہ زید اپنے اس باطل قول سے رجوع کرے اور توبہ و استغفار کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

(۳) اکثر جھنڈے کا بلند کرنے والا مسلمانوں کا صدر اور سردار ہی ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ بخاری و مسلم شریف کی حدیث میں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جنگ خیبر میں حضرت مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ کو اسی خصوصیت و امتیاز کی بنا پر جھنڈا عطا فرمایا اور ایک دن قبل یہ مرثدہ دیا۔ ولا عطين الراية غدا رجلا يفتح الله على يديه يحب الله ورسوله ويحبه الله ورسوله۔ یعنی میں جھنڈا اکل ایسے شخص کو دوں گا کہ اللہ جس کے ہاتھ پر فتح عطا فرمائے گا، جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔ اور اللہ و رسول اس سے محبت رکھتے ہیں۔

اسی طرح جنگ موتہ میں حضرت زید بن حارثہ امیر لشکر تھے جو جھنڈے کو بلند کرتے تھے جب وہ شہید ہو گئے تو حضرت جعفر طیار کو امیر بنایا گیا، تو انہوں نے جھنڈے کو بلند کیا۔ جب وہ بھی شہید ہو گئے، تو حضرت عبد اللہ بن رواحہ کو امیر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے اس جھنڈے کو بلند کیا۔ جب وہ بھی شہید ہو گئے تو حضرت خالد بن ولید کو امیر متعین کیا گیا۔ انہوں نے اس جھنڈے کو بلند کیا۔ فتح مکہ میں تو ہر قبیلہ اور جماعت کا علیحدہ علیحدہ ممتاز جھنڈا تھا تو اس لشکر میں کثیر جھنڈے بلند تھے۔ جیسا کہ کتب سیر

مواہب لدنیہ وغیرہ میں ہے تو اس طرح سرداران مسلمین نے جھنڈوں کو بلند کیا و لہرایا ہے۔ تو اب زید کا قول کس قدر غلط اور باطل ثابت ہو اور وہ کس قدر دینی امور سے ناواقف اور بیخبر ظاہر ہوا۔ اور وہ کتنا بڑا جاہل، اور نادان قرار پایا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۴) احادیث میں وارد ہے، کہ زمانہ نبوی میں اعلان نماز کے لئے کثیر بن صلت کے گھر کے قریب جھنڈا نصب کیا گیا۔

ابوداؤد شریف کی حدیث میں ہے۔ فتاویٰ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم العلم الذی عند دار کثیر بن الصلت فصلی ثم خطب الح۔ یعنی حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس جھنڈے کے پاس تشریف لائے جو کثیر بن صلت کے گھر کے قریب تھا، پھر حضور نے نماز عید پڑھائی، اس کے بعد خطبہ پڑھا تو جب اعلان صلوٰۃ کے لئے جھنڈے کا ثبوت موجود ہے تو ترغیب صلوٰۃ کے لئے جھنڈا بلند کرنے کی بھی یہی حدیث اصل و دلیل قرار دی جاسکتی ہے۔ زید جو اس کو ممنوع کہتا ہے، وہ بھی تو اس کی ممانعت پر کوئی حدیث صریح پیش کرے ورنہ دعویٰ بلا دلیل قابل قبول نہیں۔ اسی طرح اس جھنڈے کی حمایت شرعاً ممنوع نہیں تو اس کے حامیوں پر لعن و طعن کس دلیل کی بنا پر ہے۔ پھر تو غیر صوم و صلوٰۃ کے لئے نعرے لگانا بھی شرعاً ممنوع نہیں۔ بلکہ فعل محمود و مستحسن ہے۔ کہ حدیث شریف میں ہے۔ مارأه المومنون حسنا فهو عند الله حسن۔ یعنی مسلمان جس چیز کو اچھا جانیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔ تو زید اسکی برائی کو بھی کسی نص سے ثابت کرے۔ پھر اس کا سب مسلمانوں کو غنڈا و ناہنجار بنا کر اور بد معاش کہنا اور اغلام باز و زنا کار بتانا اگر درحقیقت باعتبار واقع کے صحیح ہے جب تو وہ مجرم قرار نہیں پاتا اور اگر یہ باتیں خلاف واقعہ فقط افتراء الزام ہیں یا محض اس جھنڈے کو بلند کرنے یا ترغیب صوم و صلوٰۃ کے نعرے لگانے کی بنا پر ہیں تو زید شرعاً سخت مجرم و گنہگار اور مفتری و کذاب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۵) مطلقاً شعر کو گمراہ کہہ دینا اسکے خود گمراہ ہونے کے دلیل ہے۔ صحابہ کرام میں حضرت حسان بن ثابت، عبداللہ بن رواحہ، کعب بن مالک، کعب بن زہیر، ابوسفیان بن حارث، عباس بن مرداس، عدی بن حاتم وغیرہ ہیں۔

اور امام شعبی نے فرمایا: کان ابوبکر یقول الشعر و کان عمر یقول الشعر و کان علی اشعر منہما و روی عن ابن عباس انہ کان ینشد الشعر و ینشدہ فی المسجد۔

(تفسیر خازن، ج ۸، ص ۱۱۰)

یعنی حضرت ابوبکر شعر کہتے تھے، اور حضرت عمر شعر کہتے، اور حضرت مولیٰ علی دونوں سے بڑے شاعر تھے، حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ شعر کہتے اور مسجد میں شعر پڑھواتے تھے، پھر سلف و خلف میں صد ہا شعر گزرے اور وہ مسلمان شاعر جو حمد و نعت و مدح و منقبت و عطا و نصیحت کے اشعار حد شرع میں رہ کر کہتا ہے تو کیا یہ گمراہ ان سب کو گمراہ کہہ سکتا ہے۔ اب باقی رہا شاعر کا یہ لکھنا کہ مجھے اب مدینہ بلا لو، ہرگز ہرگز گمراہی نہیں۔ اگر زید اسکو گمراہی کہتا ہے تو کسی معتبر دلیل سے ثابت کرے لیکن انشاء اللہ تعالیٰ وہ کسی دلیل سے اسکا گمراہ ہونا ثابت نہیں کر سکتا اور نہ اسکے ہر کہنے والے کو گمراہ کہہ سکتے ہیں۔

(۶) فقط شعر اہی نہیں بلکہ ہر مسلمان نماز جیسی عبادت میں حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر السلام علیک ایہا النبی کہہ کر سلام بھیجتا ہے تو اگر حضور روحی فداہ تک سلام نہیں پہنچ سکتا نہ وہ اسکو سن سکتے ہیں تو پھر ساری امت کا یہ فعل کیا زید کے نزدیک لغو و بیکار ہے۔ پھر شارع علیہ السلام نے بلکہ قرآن مجید میں خود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو صلوٰۃ و سلام کا حکم کیوں دیا۔ علاوہ بریں خود زید ہی نماز میں ان کلمات سلام کو قعدہ میں پڑھتا ہے یا نہیں۔ اگر پڑھتا ہے تو کیا سمجھ کر پڑھتا ہے۔

نسائی شریف کی حدیث میں ہے۔ ان لله ملائكة سياحين في الارض يبلغونني من امتي السلام۔

یعنی حضور اکرم ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ کے کچھ فرشتے ہیں زمین میں سیر کرنے والے جو مجھ تک میری امت کا سلام پہنچاتے ہیں۔ تو یہ زید اس حدیث کا انکار کر کے خود بھی گمراہ ہوا یا نہیں۔

اسی طرح دلائل الخیرات میں یہ حدیث ہے: اسمع صلاة اهل محبتی واعرفهم۔

یعنی حضور فرماتے ہیں کہ میں اپنے عشاق کے صلوٰۃ و سلام کو خود سن لیتا ہوں اور ان کو پہچانتا ہوں۔

تو اب اس زید کا ان احادیث کے خلاف یہ کہنا کہ امتی کا سلام نہ حضور تک پہنچتا ہے، نہ حضور سن سکتے ہیں۔ اس زید کی کیسی جرات و دلیری و گمراہی و بیدینی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

۷۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام مثل اور مردوں کے ہرگز ہرگز مردہ نہیں ہیں، بلکہ وہ بعد وفات بھی اپنی قبور میں زندہ ہیں۔

امام بہقی نے کتاب حیاۃ الانبیاء میں اس حدیث کی روایت کی۔

الانبياء احياء في قبورهم يصلون۔ یعنی حضرات انبیاء کرام اپنی قبروں میں زندہ ہیں نماز پڑھتے ہیں۔

اسی طرح یہی بیہقی شعب الایمان میں اس حدیث کے راوی:

من صلی علی عند قبری سمعته۔ یعنی حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو میری قبر کے پاس مجھ پر درود پڑھے اس کو میں خود سن لیتا ہوں۔

اب زید کا ان احادیث کے خلاف یہ کہنا کہ حضور مثل اور مردوں کے مردہ ہو چکے ہیں اور وہ قبر کے پاس کے سلام کو شاید سن سکیں۔ کیسی جرات و دلیری اور بیدینی و گمراہی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

(۸) اسلامی کتب اور صریح احادیث سے اس فتویٰ میں زید کی ہر بات کا غلط ہونا اور خلاف دین ہونا ثابت کر دیا گیا۔ اب اس زید کی یہ جرات اور ڈھٹائی کرنا کہ اسکی ہر بات موافق کتب اسلامی ہے صریح کذب اور افتراء ہے۔ اگر وہ قول کا سچا اور بات کا پکا ہے تو ان کتب اسلامی کو پیش کرے ورنہ، لعنۃ اللہ علی الکاذبین۔ پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لے۔

(۹) ایسا جری شخص جو قرآن و حدیث کی کھلی ہوئی مخالفت کرے۔ عقائد اسلام کے خلاف عقیدہ بنائے، مسلمانوں پر افتراء و بہتان باندھے، انکو گمراہ بتائے، وہ ہرگز ہرگز مسلمانوں کا امام نہیں ہو سکتا، ایسے گمراہ اور اہل ہوا کے پیچھے، اہل اسلام کی نماز ادا نہیں ہو سکتی ہے۔ فقہ کی مشہور کتاب کبیری میں ہے:

وروی محمد عن ابی حنیفہ و ابی یوسف ان الصلوٰۃ خلف اهل الاھواء لا یجوز۔ (کبیری ص ۴۸۰)

یعنی حضرت امام محمد نے حضرت امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہم سے روایت کی کہ اہل ہوا گمراہ کے پیچھے نماز جائز نہیں، لہذا اہل اسلام ایسے گمراہ کے پیچھے ہرگز ہرگز نماز نہ پڑھیں، واللہ تعالیٰ اعلم،

کتبہ: المقصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۳۷۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ زید دہلی کا رہنے والا ہے اور مراد آباد کی کسی مسجد میں امامت کرے بیوی بچے سب دہلی میں رہتے ہیں تو کیا زید کے تنہا ہونے سے امامت میں فرق آتا ہے۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم صورت مسئلہ میں زید کی امامت میں کسی طرح کا فرق نہیں آتا۔ اگر ایسا ہوتا تو سلف وخلف دوسرے دور دراز مقامات پر کسی کو امام بنا کر روانہ نہ کرتے۔ پھر اگر شرع میں یہ شرط ہوتی تو کسی کتاب میں تو نظر سے گزرتی، تو معلوم ہوا کہ یہ شرط جاہلانہ دماغ کی پیداوار ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المتعصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۳۷۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ زید کی بیوی بچے سب ساتھ ہیں مگر زید کی بیوی پردہ نہیں کرتی بے پردہ رہتی ہے تو کیا بیوی کے بے پردہ رہنے کی وجہ سے زید کی امامت میں کوئی فرق آئے گا۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم زید کی بیوی جب بے پردہ پھرتی ہے، اور اسکو زید بے پردگی سے نہیں روکتا تو زید کے پیچھے نماز نہ پڑھی جائے، جامع العلوم میں فتاویٰ برہانیہ سے ناقل ہیں:

قال ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ: امرأۃ خرجت من البيت ولا یمنعها زوجها فهو دیوث لا تجوز الصلوٰۃ خلفه ولا یقبل شهادته وعلیہ الفتویٰ۔

تو اس عبارت سے ظاہر ہوا ہو گیا کہ بیوی کی بے پردگی سے شوہر کی امامت میں فرق آجاتا ہے۔

کتبہ: المتعصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۳۷۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ زید کی لڑکی جوان ہو گئی ہے اور ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی ہے تو لڑکی کی شادی نہ ہونے سے زید کی امامت میں کچھ فرق آتا ہے؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم صرف لڑکی کا جوان ہو جانا اور اسکی شادی کا نہ ہونا، امامت پر اثر انداز نہیں۔ اگر باپ جوان لڑکی کی شادی میں جلدی کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المتعصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۳۷۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ اگر زید گنہگار کی پوجا کرے، یا حد شرع سے داڑھی کم رکھے، اور دوسری رسم اہل ہنود کی کرے، تو کیا ان صورتوں میں زید امامت کر سکتا ہے؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم جب زید حد شرع سے داڑھی کم رکھتا ہے تو وہ فاسق ہوا اسکی امامت اس بنا پر تو مکروہ تحریمی ہوئی اور اگر وہ گنہگار کی پوجا کرے یا اہل ہنود کی اور رسمیں ادا کرے تو اس بنا پر امامت کا بالکل اہل ہی نہیں رہا، تو اس صورت میں کوئی اسکی اقتداء ہی نہ کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

مسئلہ

(۳۷۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین کہ اگر زید گائے، بکری، بیل، ذبح کرنے جاتا ہے، تو اسکی امامت میں کوئی فرق ہے؟

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

زید پر جانور ذبح کرنے کی بناء پر کوئی الزام شرعی عائد نہیں ہوتا، تو اس بناء پر کوئی اثر اس کی امامت پر نہیں پڑتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم، بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۳۷۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین شریعت کی رو سے

ایک شخص کتنے ہی آدمیوں سے عداوت رکھتا ہے اور مجھ سے بھی عداوت رکھتا ہے اور میرے خلاف جھوٹا دعویٰ کیا تھا۔ پنجکوٹ میں اور اس کے متعلق یہ آواز بھی اٹھی ہوئی ہے کہ یہ شخص نماز نہیں پڑھتا۔ لیکن وہ کبھی کبھی امام کی غیر موجودگی میں نماز پڑھانے کھڑا ہو جاتا ہے اور میری طبیعت اس کے پیچھے نماز پڑھنے کو نہیں چاہتی ہے تو میرے لئے کیا حکم ہے اور ایسا شخص نماز پڑھانے کے قابل ہے کہ نہیں اور دونوں میاں بیوی ذرا ذرا سی بات پر جھگڑتے رہتے ہیں اور اسکی بیوی بستی کے باہر جانوروں کا گوبر لینے کے لئے بھی جاتی ہے ایسے شخص کے لئے امام بننے کا کیا حکم ہے شریعت کا جواب دیں باقی میرا نور محمد ولد خدا بخش مقام ڈاکخانہ مانگر والی ضلع کوئٹہ متصل جمعہ مسجد سلام۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

شخص مذکور کے یہ افعال و اعمال اس حد تک مشہور ہو گئے کہ ان سے عام طور پر مقتدی واقف ہیں یا وہ یہ افعال بالاعلان کرتا ہے تو وہ شرعاً فاسق معلن ہے اور فاسق معلن کو امام بنانا مکروہ تحریمی ہے لہذا وہ

اگر امام بھی بن جائے تو جو شخص اس کے فاسق معلن ہونے کی بنا پر اس کی اقتداء نہ کرے تو وہ شرعاً مجرم نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۳۸۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک شخص حافظ قرآن و ذی علم ہوتے ہوئے بھی اپنی منکوحہ بیوی کے انتقال ہو جانے کے بعد منکوحہ بیوی کی چھوٹی بہن کو حافظ صاحب نکال لائے ہیں جو دوسری جگہ بیاہی ہوئی تھی اس نکالی ہوئی مسماۃ کو اتنی مدت تک بلا نکاح رکھے رہے کہ دو بچے پیدا ہوئے وہ اب تک بحیات ہیں اور سن تمیز کو پہنچ چکے ہیں اور حافظ صاحب کا بایاں پیر بھی کٹا ہوا ہے ایڑی ہے اور کچھ تھوڑا حصہ اور ہے بچہ نہیں ہے لیکن سطلے پھرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہے بچوں کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد نکالی ہوئی مسماۃ کے شوہر سے طلاق لیتے ہیں اور عدت گزار کر کے اپنا عقد نکالی مسماۃ کے ساتھ کرتے ہیں اور حافظ صاحب کہتے ہیں کہ میں نے اپنے گناہوں سے توبہ کر لیا ہے دوئم یہ کہ حافظ صاحب نماز پنجگانہ فرض اور جمعہ کی پڑھا سکتے ہیں یا نہیں سوئم یہ کہ مقامی مولوی کے انتقال ہو جانے کے بعد دیگر قریبی موضع کے ایک حافظ قرآن صاحب تراویح و نماز عید و بقرہ عید کی پڑھاتے تھے لیکن امسال یہ حافظ صاحب مذکور عید بقرہ عید کی نماز پڑھانے کے لئے جبراً کھڑے ہوئے اور امامت کی جس کی وجہ سے مسلمانوں میں دو جماعتیں ہو گئیں اور نماز دو جگہ ہوئی۔ ایسی حالت میں ہم کو از روئے شرع محمدی جواب سے مطلع کیا جاوے آیا کہ حافظ مذکور کے پیچھے نماز پنجگانہ فرض و جمعہ پڑھنا درست ہے یا نہیں اس کی ایک نقل الہ آباد اور ایک دہلی بھی روانہ کر رہا ہوں امید ہے کہ جواب سے جلد مطلع کریں۔

نوٹ:- جماعت میں اس سے زیادہ ذی علم کوئی نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ جند محمد حسن فرحت

مرچنٹ بہروری پوسٹ خاص

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

امام کے لئے جب پیر کا کٹنا ہونا شرعی مجبوری کی کسی حد تک نہیں پہنچا ہے تو اتنی بات سے ان کی امامت قابل اعتراض نہیں۔ ہاں جب غیر منکوحہ عورت کو اپنے پاس رکھا اور اس سے حرام کاری میں جلا ہوا جس سے اہل محلہ بھی واقف ہیں۔ اور اہل مسجد اس گناہ پر مطلع ہیں تو اس کا امام بنانا شرعاً مکروہ ہے اس کے پیچھے نماز مکروہ واجب الاعادہ یہ نماز پنجگانہ کے لئے حکم ہے رہا جمعہ اور عیدین اس میں اس قدر کراہت نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۲۹ ربیع الثانی ۱۳۷۹ھ

کتبہ: المقتضی بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۹ھ

مسئلہ

(۳۸۱-۳۸۲-۳۸۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں۔

(۱) صلوٰۃ عید الفطر و صلوٰۃ عید الاضحیٰ کی جماعت سے پیشتر ایک شخص عید گاہ کے منبر پر کھڑا ہو کر صلوٰۃ پکارتا ہے اس کا جواز کتاب اللہ کتاب سنت سے مدلل ومفصل طور سے ہے یا نہیں اور چند افراد کا کہنا ہے کہ جو شخص منبر پر صلوٰۃ کہتا ہے اس فرد پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس شخص کو اپنا منہ قبلہ رخ رکھنا چاہئے جس طرح نماز میں جہت کعبہ کھڑے ہوتے ہیں۔ جانب مشرق منہ نہیں رکھنا چاہئے۔ یہ کیا ہے صلوٰۃ کہنے میں جہت قبلہ رخ کرنے کا ثبوت قرآن وحدیث سے مدلل ومسکت مع دلائل واضح عبارات صحیح وساطعہ مع متون وشروح مطابع مصنفین و صفحات سے مطلع فرمائیں۔

(۲) مثلاً ایک امام مسجد اسمگلر یعنی ایفون فروخت کرتا ہے اس کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں ایسا شخص امامت کے قابل ہے یا نہیں؟

(۳) ایک شخص نے اپنی زوجہ دوم کی بغیر طلاق دیئے ایک لڑکی سے ناجائز تعلقات کے طور سے عقد سوم اس لڑکی ہذا سے کر لیا ہے یہ نکاح سوم از روئے شریعت کے درست ہو یا نہیں لہذا مسائل خلاشہ کو کافی شافی وافی مستند دلائل سے تحریر فرمائیں۔

راقم حافظ محمد قاسم غنی عنہ اجملی خادم بینواتو جروا ۱۷ اپریل

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) کتاب اللہ اور سنت سے اس کی صریح ممانعت کا نہ ہونا دلیل جواز ہے باوجود اسکے کسی اور دلیل کی حاجت نہیں باقی رہی اس کا قبلہ کو رخ نہ کرنا اور لوگوں کی طرف منہ کرنا تو یہ درست ہے کہ بعد فراغت نماز امام کا لوگوں کی طرف متوجہ ہونا اور دعا کرنا اور خطیب کا جہت قبلہ سے موڑ کر لوگوں کی طرف منہ کرنا اس کی کافی دلیل ہے۔ اعتراض کرنے والے اسی پر غور کر کے مسئلہ کو حل کر لیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) ایفون کا فروخت کرنا شرعاً حرام ہے تو اس کا مرتکب فاسق قرار پایا اور فاسق کی امامت بہ تصریح فقہاء کرام مکروہ تحریمی بتاتے ہیں تو یہ شخص ہرگز قابل امامت نہیں اور اس کے پیچھے نماز درست نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) زوجہ کی لڑکی سے نکاح حرام و ناجائز ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں محرمات کے ذکر میں ہے:

والثانیۃ بنات الزوجة و بنات اولادها وان سفلین۔

تو یہ نکاح ہرگز صحیح نہ ہوا بلکہ باطل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المقتضی بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۹ھ

کیم ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ



(۳۸۴)

مسئلہ

لو قرء المصلیٰ فی الرکعة الاولى من السورة البقرة ثم فی الرکعة الثانية نسی الحرف وتفکر فلم یتذکر له وقرأ سورة اخرى فهل علیه سجدة السهو ام لا۔

کتبہ: المتعصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علی رسولہ الکریم

لا یلزمه سجود السهو فی هذه الصورة نعم ان طال تفکره ومنعه التفکر عن القراءة یجب علیه سجود السهو صرح به فی الغنیة واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المتعصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۳۸۵)

لو قرء سورة فی الرکعة الاولى ولم یختم لطولها ثم فی الرکعة الثانية شرع سجدہ اخرى وهو حافظ فهل علیه سجود السهو۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علی رسولہ الکریم

لا یجب علیه سجود السهو فی هذه الصورة لعدم وجود سبب من اسبابه کہ یفہم من کتب الفقہ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المتعصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۳۸۶)

لو سہا عن القعدة الاخيرة وقام الی الخامسة فتذکر قبل السجود وجلس فهل علیه سجود السهو ام لا ؟

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علی رسولہ الکریم

ذکر فی القیة ان سہا عن القعدة الاخيرة فی ذوات الاربع وقام الی الخامسة یعود الی القعدة ما لم یسجد للخامسة ویسجد للسهو لتاخير القعدة وان قید الرکعة الخامسة بالسجدة بطل فرضه و تحولت صلواتہ نفلًا واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المتعصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۳۸۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسائل ذیل میں
الحمد شریف میں غالباً سات آیتیں ہیں ان میں سے ہر ایک کا پڑھنا واجب ہے یا کل الحمد کا؟۔
اگر ہر آیت واجب ہے تو اگر امام ایک آیت چھوڑ دے سہو سے، یا مکرر پڑھے، یا جہر میں اخفا اور اخفا میں جہر کرے۔ اس صورت میں کیا حکم ہے؟ اگر الحمد کی ہر آیت واجب ہے نماز کے اندر تو اس کا حکم بھی واجب کے احکام جیسا ہوگا یا اسکے خلاف؟

المرسل مولوی محمد عبداللہ خاں از نگینہ مسجد اون ضلع ایوت محل برار

۲۸ جولائی ۵۱ء بروز جمعہ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

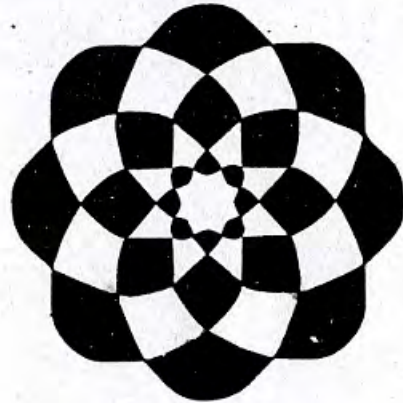
الحمد شریف کی ہر آیت واجب ہے۔ اور جب ہر آیت واجب ہوئی تو اس کے ترک یا تکرار یا اختلاف جہر و سر پر سجدہ واجب ہے۔

در مختار میں ہے: "ويسجد بترك آية منها (ای الفاتحة) وهو أولى قلب فكل آية واجبة"

(شامی ص ۳۲۱) واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۲۷/ شوال المکرم ۱۳۷۰ھ ۱۹۵۱ء

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل



۲۳۴

باب صلوٰۃ المسافر

(۳۸۸-۳۸۹) از سنجل محلہ کوٹ

مسئلہ

کہا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) ایک شخص نے اپنے گھر سے ارادہ پینتالیس کوس کے سفر کا کر لیا لیکن پندرہ کوس پر چل کر قیام کیا اور وہاں پر اپنے کام میں مصروف رہا اور اس کام کا ارادہ بھی اس نے گھر ہی سے اپنے دل میں کر لیا تھا، اور اسی طرح متعدد مقامات پر اپنے کاموں کی وجہ سے رکا رہا اور اپنے کام پورا کرتا رہا۔ اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ یہ شخص مسافر ہا یا نہیں؟ اور اس پر احکامات مسافر واجب ہوں گے یا نہیں؟۔ بینو تو جروا

(۲) ایک شخص نے رمضان المبارک میں فرض جماعت کے ساتھ ادا نہیں کئے۔ البتہ تراویح ضرور جماعت کے ہمراہ ادا کیں۔ تو یہ شخص وتر جماعت کے ساتھ پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسافر جبکہ پینتالیس کوس تک اپنے گھر سے جانے کا ارادہ کر کے چلا۔ یا اپنے شہر اور بستی کی آبادی سے اس نے تجاوز کیا تو اس پر مسافر کے احکام واجب ہو گئے۔ اور یہ احکام جب تک واجب رہیں گے کہ جب تک کہ اپنے شہر پر واپس نہ آئے کہ پندرہ یوم یا زیادہ کی اقامت کی نیت نہ کرے۔ پس شخص مذکور فی السؤال کو مسافر کے احکام ادا کرنے پڑیں گے۔

شرح وقایہ میں باب صلاۃ المسافر میں ہے:

هو من قصد سيرا وسطا ثلثة ايام ولها ليها وفارق بيوت بلده۔

اور اس کے بعد ہے: وله رخص تدوم وان كان عاصيا في سفره حتى يدخل بلده او

ينوى اقامة نصف شرر ببلدة او قرية۔

اور ہدایہ میں اس باب میں: واذا فارق المسافر بيوت المصر صلي ركعتين ولا يزال

على حكم السفر حتى ينوى الإقامة في بلدة او قرية۔

وتر جماعت سے ادا کرنے چاہیں اگرچہ فرض جماعت سے ادا نہ کئے ہوں۔

در مختار میں ہے: ولو لم يصلها اي التراويح بالامام او صلاها مع غيره له ان يصلی الوتر معه۔
کتبہ عبدالوحید سنہجلی۔

الجواب صحیح بلاریب، محمد معین الدین عفی عنہ مدرس مدرسہ محمودیہ ریاست چھتاری ضلع بلندشہر

الجواب صحیح سعید احمد عفی عنہ مدرس مدرسہ سراج العلوم سنہجلی ر

الجواب صحیح محمد مظہر اللہ عفی اللہ عنہ سنہجلی مدرس مدرسہ عبدالرب دہلی

الجواب صحیح محمد عبدالحق عفی عنہ

المجیب مصیب:- خصوصاً در بارہ وتر صغیری میں مذکور ہے۔

واذا لم يصل الغرض مع الامام قبل لا يتبعه في التراويح ولا في الوتر وكذا اذا لم يصل

معه التراويح لا يتبعه في الوتر والصحيح انه يجوز ان يتبعه في ذلك كله۔ محمد کریم غفرلہ مدرس مدر

سہ الشرع سنہجلی

صح الجواب:- اور خاص وتر کے متعلق کبیری میں یہی لکھا ہے کہ صورت مذکورہ میں جماعت کے

ساتھ پڑھنا چاہئے۔

وقال ابو يوسف اذا صلى مع الامام شيئا من التراويح يصل مع الوتر وكذا اذا لم

يدرك معه شيئا منها وكذا اذا صلى مع غيره له ان يصلی الوتر معه وهو الصحيح ذكره ابو

الليث۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

عبدالوحید عفی عنہ سنہجلی مدرس مدرسہ میرٹھ سیٹی

الجواب

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم:

یہ دونوں جواب ان سوالات سے بالکل غیر متعلق ہیں۔ مجیب صاحب کو جب یہ مسائل معلوم نہیں

تھے تو پھر قلم اٹھانے کی کیا ضرورت تھی۔ اور پھر اگر کاش یہ حضرات ان عبارات کو اپنے اپنے جواب میں نقل

نہ کرتے تو مجھ کو اتنی کافی بحث کی ضرورت بھی نہ ہوتی۔ اس وقت صرف ان کا جواب ہی غلط ٹھرتا۔ مگر جب

انہوں نے عوام کو دھوکا دینے کے لئے کتب فقہیہ سے بے علاقہ عبارتیں نقل کی ہیں۔ لہذا مجھ کو ان کی علمی

قابلیت اور ان عبارات کے صحیح محمل کے اظہار کی ضرورت ہوئی اور عوام کو ان کے فریب سے آگاہ کرنا لازم

ہوا۔ علاوہ بریں ان میں ہر ایک غالباً صدر مدرس ہے اور بعض کا اکثر عمر کا حصہ اسی درس و تدریس میں گذرا

مگر سخت افسوس ہوتا ہے ان میں ابھی تک عربی عبارات کی صحیح مراد نکالنے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی اور

اپنے مدعا پر دلائل اور عبارات کا منطبق کرنا بھی نہیں آیا۔ اور سوال و جواب میں تعلق اور عدم تعلق کی معرفت

بھی حاصل نہیں ہوئی۔ اور پھر یہ انہیں صاحبوں کی حالت نہیں ہے بلکہ ان کے پیشوا مولوی رشید احمد گنگوہی

اور مولوی اشرف علی تھانوی بھی اسی غلطی میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ فتاویٰ رشیدیہ اور فتاویٰ اشرفیہ میں مسئلہ وتر کو

اسی طرح لکھا ہے۔ لہذا میں ان حضرات سے یہ التجا کرتا ہوں کہ آپ حضرات کی جب یہ حالت زار ہے تو

لہذا مسلمانوں کی حالت پر رحم کیجئے اور ان کو ایسے غلط فتوے دیکر فرقہ بندی کی بلا میں گرفتار نہ کیجئے۔

جواب مسئلہ سفر

شخص مذکور فی السؤال مسافر نہیں ہوا بلکہ مقیم ہی رہا۔

تقدیر اول: جو سفر احکام شرع متغیر کرنے کا سبب ہے وہ کم از کم تین دن کا سفر ہے۔

چنانچہ کبیری میں ہے: السفر التام الذی به يتغير الاحكام لكونه مظنة المشقة المقتضية

للتخفيف من الثلاثة۔

اس لئے اگر کوئی شخص تمام دنیا کی سیر کر آیا اور کسی مکان خاص سے اس کا قصد متعلق نہ ہوا جس میں

تین دن کی مسافت ہو تو یہ شخص مسافر نہ ہوگا۔ چنانچہ جو ہرہ نیرہ میں ہے:

لو طاف جميع الدنيا ولم يقصد مكانا بعينه بينه وبينه ثلاثة ايام لا يصير مسافر۔

لہذا سفر کے احکام مرتب ہونے کے لئے تین دن کی مسافت کا ارادہ ضروری ہوا۔

مقدمہ دوم: اس مقدار سفر میں نزول بھی ضروری ہے۔ اب وہ نزول یا استراحت کے لئے ہوگا

یا حاجت کے لئے۔ نزول استراحت تو بضرورت مدت سفر کے ساتھ لاحق کر دیا گیا۔ چنانچہ جو ہرہ نیرہ میں

ہے:-

فالحقت مدة الاستراحة بمدة السفر للضرورة۔

اب رہا نزول حاجت تو یہ علت قصر سفر یعنی مشقت کی شرط ثانی کے منافی ہے۔

شامی میں ہے: العلة في الحقيقة هي المشقة واقیم السفر مقامها ولكن لا يثبت عليها

الابشرط ابتداء وبشرط بقاء فالاول مفارقة البيوت قاصدا مسيرة ثلاثة ايام و الثاني استكمال

السفر ثلاثة ايام فاذا وجد الشرط الاول ثبت حكمها ابتداء فلذا يقصر بمجرد مفارقة العمران

نادیا ولا یدوم الا بشرط الثانی فهو شرط لاستحکامها علة فاذا عزم على ترك السفر قبل تمامه بطل بقائوها علة لقبولها النقض قبل الاستحکام۔

یعنی سفر میں تخفیف کی علت حقیقیہ مشقت ہے اور سفر اس کا قائم مقام ہے۔ لیکن اس کا علت ہونا دو شرطوں کے ساتھ مشروط ہے۔

پہلی شرط تین دن کی مسافت کا قصد کر کے اپنے شہر کی عمارتوں سے جدا ہونا۔ دوسری شرط تین دن کے سفر کو کامل کرنا۔ لہذا جب شرط اول پائی جاتی ہے سفر کا ابتدائے حکم ثابت ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے بشرط سفر اپنے شہر کی عمارتوں سے جدا ہوتے ہی قصر کا حکم ہو جاتا ہے لیکن شرط ثانی کے ساتھ وہ حکم قصر باقی رہتا ہے۔ تو یہ دوسری شرط علت سفر کے استحکام کی شرط ہے۔ لہذا اگر کسی نے مقدار سفر تمام ہونے کے قبل سفر کے ترک کرنے کا ارادہ کیا تو قصر کا حکم جو علت کی بقا سے حاصل ہوا تھا باطل ہو جائے گا کہ استحکام سفر سے پہلے ہی اس نے نقض کو قبول کر لیا۔

لہذا اس عبارت کا یہ نتیجہ نکل کر آیا کہ نزول حاجت جو مقدار سفر کے اندر ہو وہ استحکام سفر کو باطل کرتا ہے۔ اور ایسے شخص پر قصر کے بقائے حکم کو نہیں چاہتا۔

مقدمہ سوم: سفر و اقامت میں اقامت اصل ہے کہ سفر عارض ہے۔

چنانچہ شامی میں ہے: الاقامة للرجل اصل والسفر عارض۔

یہی ہدایہ و طحاوی و جوہرہ نیرہ و در مختار و شرح وقایہ وغیرہ میں ہے۔ اور جب ایسا سفر ہو کہ نہ کہیں اس میں مقدار سفر کامل ہو نہ استحکام سفر متحقق ہو تو ایسے سفر کے لئے یقیناً اقامۃ اصل ہے ناقض ہو جائے گی۔ چنانچہ شامی میں اس کو ان الفاظ میں تعبیر کیا ہے:

اذالم يتم علة فكانت الاقامة ناقضا للسفر العارض۔

لہذا اب اس کا محض قصد سفر بغیر استحکام سفر کے اس اقامۃ اصلیہ کو باطل نہیں کرے گا۔

مقدمہ چہارم: فقہ کا یہ قاعدہ ہے کہ جب نماز کے قصر اور اتمام دونوں کے وجوہ قائم ہوں تو احتیاطاً اتمام یعنی چار رکعت فرض پڑھنے کو ترجیح دی جائے گی۔

چنانچہ شامی میں ایک مسئلہ کی دلیل میں فرماتے ہیں:-

اجتمع في هذه الصلوة ما يوجب الاربع وما يمنع فرجحتا ما يوجب الاربع احتياطاً۔ خلاصہ کلام کا یہ ہے کہ شخص مذکور فی السؤال کا حکم انہیں مقدمات سے ظاہر ہو گیا۔

مزید توضیح کے لئے عرض کرتا ہوں۔

اولاً: مقدار سفر کا ارادہ کرنا اس کو ابتداءً تو مسافر ثابت کرتا ہے لیکن اس کا پندرہ یا آٹھ آٹھ کوس پر اترنا اس کے مقدار سفر والے ارادہ کی مخالفت کرتا ہے اور بقائے سفر کے حکم کو باطل کرتا ہے۔ لہذا یہ شخص مقدمہ دوم کے اعتبار سے مسافر نہیں ہوا۔

ثانیاً: جب نماز قصر کے لئے تین یوم کے سفر کا قصد ضروری ہوا جیسا کہ مقدمہ اول سے معلوم ہوا۔ اب اس کا مقدار سفر کے اندر بار بار اس طرح اترنا جن کے نیت گھر ہی سے اپنی کسی حاجت کے لئے کی تھی نزول استراحت تو نہیں کیا جاسکتا جس کو سفر کے ضروریات میں شمار کیا جائے، اور اتصال قطع نہ ہو۔ بلکہ وہ شخص بلا ضرورت سفر کو قطع کر رہا ہے اور مقدار سفر کا نام

لیکر محض رخصت سفر کے احکام کا افادہ چاہتا ہے۔ لہذا اس کا ابتدا ہی سے تین یوم کے سفر کا ارادہ نہیں ہوا۔ اور اس پر مسافر کی تعریف صادق نہیں آتی۔

ثالثاً: جب یہ شخص مسافر شرعی نہیں ہوا تو اس پر احکام سفر کس طرح مرتب ہو گئے باوجودیکہ اقامت اصل ہے جیسا کہ مقدمہ سوم سے معلوم ہو چکا۔ لہذا شخص مذکور مقیم ہی رہا۔

رابعاً: جہاں سفر و اقامت دونوں محتمل ہوں وہاں چار رکعت پڑھنے کو فقہاء نے رائج قول قرار دیا ہے۔ اور یہاں تو سفر شروع ہی سے متحقق ہوا نہ شخص مذکور شرعاً مسافر ہوا۔ لہذا ایسا شخص قصر نہیں پڑھے گا بلکہ چار رکعت نماز ہی پڑھے گا۔

الحاصل مسئلہ تو نہایت وضاحت سے ثابت ہو چکا اس میں جائے سخن باقی نہیں رہی۔ منصف کے لئے بہت کافی دانی ہے اور ہٹ دھرم کے لئے ایک دفتر بھی ناکافی ہے۔ لیکن مزید اطمینان کے لئے اس کا جزیہ بھی پیش کیا جاتا ہے۔ چنانچہ عالمگیری بحر سے اور بحر معراج الدرایہ سے ناقل ہے:-

من اراد الخروج الى مكان ويريد ان يترخص برخص السفر ينوي مكانا ابعد منه وهذا غلط۔

یعنی جس نے ایک مکان کی طرف نکلنے کا ارادہ کیا اور یہ چاہتا ہے کہ سفر کی رخصت سے فائدہ اٹھا

ئے اور اس سے ایک اور دوسری جگہ کی نیت رکھتا ہے، یہ غلط ہے۔ بالجملہ مسئلہ کا صحیح جواب تو یہ ہے کہ جو ان چند الفاظ میں لکھا گیا۔ اب ان ملایان دیوبند کے جوابات وہ اس قابل ہی نہیں ہیں جن کی طرف کوئی عاقل

التفات کرے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ مدرسہ دیوبند میں اسی قسم کے سوالات سے غیر متعلق جوابات لکھے گئے ہوں کیے جاتے ہوں اور پھر علمی استعداد کا یہ حال ہے کہ مقدار سفر ۲۵ رکوس قرار دیتے ہیں باوجودیکہ ہندوستان میں کوس کی مقدار انگریزی میل کے اعتبار سے بہت مختلف ہے۔ کہ کہیں سوا میل کا کوس ہوتا ہے، کہیں دو میل کا، کہیں اور بیش و کم کا۔ لہذا اب کوس سے کون سا کوس مراد لیا جائے اور کس کوس سے مقدار سفر کا تعین کیا جائے۔ اور ان ۲۵ رکوس میں وہ کون سے کوس ہیں جس کے چلنے والے کو مسافر کہا جائے۔

اب یہ مجیب صاحبان پہلے اسی سے اپنی گلو خلاصی کرا لیں پھر اپنے فتوؤں میں اور کچھ پیوند لگائیں۔ الحاصل میں اس وقت اتنے ہی جواب پراکتفا کرتا ہوں اور ان کے فتوؤں کے باقی مواخذات کو نظر انداز کرتا ہوں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

جواب مسئلہ وتر

اس مسئلہ کی حقیقت یہ ہے کہ رمضان شریف میں وتر کے جماعت سے پڑھنے اور نہ پڑھنے کو فقہاء کرام نے چند صورتیں بیان فرمائیں ہیں جو کتب فقہیہ میں ادنیٰ غور و فکر سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ اور چونکہ میں نے التزام کیا ہے کہ میں بھی اپنے جواب میں انہیں کتابوں کا حوالہ دوں گا جن کو ہمارے مجیب صاحبان نے پیش کیا ہے۔ لہذا ان کتابوں میں اس مسئلہ کی بظاہر چار صورتیں بیان فرمائیں ہیں۔

(۱) فرض جماعت سے پڑھے اور تراویح جماعت سے نہ پڑھیں تو وتر جماعت سے پڑھے۔

چنانچہ درمختار میں ہے: ولو لم یصلھا ای التراویح بالامام او صلاھا مع غیرہ لہ ان یصلی الوتر معہ۔

شامی اس کے تحت میں لکھتے ہیں: ای قد صلی الفرض معہ۔

یعنی خلاصہ مطلب یہ ہے کہ جس نے تراویح امام کے ساتھ نہیں پڑھیں اور فرض امام کے ساتھ پڑھ چکا ہے تو وہ وتر امام کے ساتھ پڑھے۔

(۲) فرض جماعت سے ایک امام کے ساتھ پڑھے اور تراویح دوسرے امام کے ساتھ تو وہ بھی وتر جماعت سے پڑھ سکتا ہے۔

درمختار میں ہے: او صلاھا مع غیرہ لہ ان یصلی الوتر معہ۔

کبیری میں ہے: و کذا اذا صلی التراویح مع غیرہ لہ ان یصلی الوتر معہ وهو الصحيح ان دونوں عبارتوں کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ جب تراویح ایک امام کے ساتھ پڑھیں اور فرض

دوسرے کے ساتھ تو وہ دوسرے کے ساتھ وتر جماعت سے پڑھے۔

(۳) فرض جماعت سے پڑھ کر کچھ تراویح بھی امام کے ساتھ پڑھیں تو وہ بھی وتر جماعت کے ساتھ پڑھے۔

چنانچہ کبیری میں ہے: قال ابو یوسف البانی اذا صلی مع الامام شیئا من التراویح یصلی معہ الوتر وهو الصحيح۔

یعنی جب امام کے ساتھ کچھ تراویح بھی پڑھیں تو وہ وتر جماعت سے پڑھے۔

(۴) فرض جماعت سے نہیں پڑھے اور تراویح جماعت سے پڑھی تو وہ وتر جماعت سے نہ پڑھے۔

اب ملاحظہ ہو کہ سائل چوتھے نمبر کا سوال کرتا ہے مگر ہمارے ان مجیب صاحبان کے جوابات کو ملاحظہ کیجئے۔ وہ لکھتے ہیں: وتر جماعت سے ادا کرنے چاہئیں اگر فرض جماعت سے ادا نہ کئے ہوں۔

اب ہمارے مجیب مولوی عبدالوحید صاحب اردو عبارت میں تو سائل کو یہ جواب دیتے ہیں اور چونکہ یہ سمجھتے ہیں کہ سائل عربی زبان سے ناواقف ہے لہذا اس کی تسلی کے لئے درمختار کی یہ عبارت نقل کر دیتے ہیں: ولو لم یصلھا ای التراویح بالامام او صلاھا مع غیرہ لہ ان یصلی الوتر معہ۔

اور مجیب صاحب ترجمہ یا تو یوں نہیں کرتے ہیں کہ عوام پر یہ راز کھل جائے گا کہ عبارت مدعا کو ثابت نہیں کرتی۔ عبارت کی تو یہ مراد ہے کہ جو فرض جماعت سے پڑھ چکا ہے اور تراویح جماعت سے نہیں پڑھیں تو وہ وتر جماعت سے پڑھے۔ جیسا کہ پہلے نمبر میں ہم نے اس عبارت کو پیش کیا اور قدرے تفصیل آئندہ آئے گی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مجیب صاحب عبارت ہی کو نہ سمجھے۔ اس لئے کہ اس کے بعد لکھتے ہیں:

اس عبارت سے متبادر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ فرض بھی بغیر جماعت سے پڑھے ہوں گے۔ مجیب صاحب آفریں ہے آپ کی اس سمجھ پر۔ کیا آپ اسی سمجھ پر مدرسہ کرتے ہیں؟ کیا جناب کے نزدیک تراویح کی جماعت اور فرض کی جماعت میں کوئی ملازمہ ہے جس سے آپ نے یہ نتیجہ نکالا؟ مجیب صاحب آپ کی سمجھ کی تو مجھے اتنی شکایت نہیں مگر جناب کے مقتدا حکیم الامتہ فقیہ زماں صاحب الشریعۃ والطریقہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی اپنے فتاویٰ "امداد الفتاویٰ" کے جلد اول کے صفحہ ۲۰ اور فتاویٰ اشرفیہ کے حصہ اول کے صفحہ چار میں جناب ہی کی پیش کردہ عبارت درمختار کو اسی آپ کے مزعموہ

مسلم کی سند میں پیش کرتے ہیں تو آپ کے اس صاحب شریعت کی سمجھ تو سمجھ سے ورا ہے۔ لہذا میرا خطاب نہ فقط آپ سے بلکہ آپ کی شریعت کے صاحب شریعت سے بھی ہے کہ اگر آپ کی سمجھ میں اس عبارت کی صحیح مراد نہیں آتی تھی تو اسی درمختار کا حاشیہ شامی ہی دیکھ لیا ہوتا کہ علامہ شامی ”لو لم یصل الخ“ کی تصویر مسئلہ لکھتے ہیں۔

ای قد صلی الفرض معہ خلاصہ۔

مطلب یہ ہے کہ صاحب درمختار نے جو یہ لکھا ہے کہ تراویح امام کے ساتھ نہ پڑھنے کی صورت میں وتر جماعت سے پڑھ سکتا ہے۔ یہ اسی صورت میں ہے کہ امام کے ساتھ فرض پڑھ چکا ہو۔

مسلمانو! آپ نے دیکھا کہ سائل تو یہ دریافت کرتا ہے کہ جس شخص نے فرض جماعت سے نہ پڑھے ہوں اور تراویح کی جماعت میں شامل ہو جائے، تو وہ وتر جماعت سے پڑھے یا نہیں۔ لہذا اس کے جواب میں اثر فعلی تھا نووی یا ہمارے مجیب کا اس عبارت درمختار کو پیش کر دینا (جس کا شامی یہ مطلب بیان کرتے ہیں، کہ تراویح جماعت سے نہ پڑھنے کی حالت میں وتر جماعت سے جب پڑھ سکتا ہے کہ امام کے ساتھ فرض پڑھ چکا ہو۔) مسلمانوں کو صریح دھوکہ دینا ہے۔ مجیب صاحب و صاحب شریعت ذرا آپ ہی انصاف سے کہتے کیا یہ درمختار کی عبارت اس سائل کے سوال کا جواب ہوگئی؟ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ لہذا آپ صاحبان کا اس عبارت کو اس کے جواب میں لکھ مارنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اب میں کہنے کے لئے مجبور ہوں کہ آپ صاحبوں سے عربی عبارت کا صحیح مفہوم نکالنا نہیں آتا تو پھر آپ کا یہ مدرسی اور صاحب شریعت اور فقیہ زماں کے دعوے کیا معنی رکھتے ہیں۔ اور اگر عربی عبارت کا صحیح مفہوم سمجھنے کی لیاقت رکھتے ہو تو اس عبارت کے یہاں نقل کرنے میں سوائے مسلمانوں کو مغالطہ میں ڈالنے کے کیا آپ کا اور کوئی صحیح مقصد تھا؟

مسلمانو! اس عبارت میں جو بات کہی گئی تھی اس کی صحیح مراد صرف اپنی طرف سے نہیں بلکہ علامہ شامی نے جو اس کا مطلب بیان کیا وہ نقل کر دیا گیا۔ اب ان مجیبوں کی ذہن دوزی کے لئے یہ عرض کرتا ہوں کہ یہی درمختار کی عبارت ہمارے مسلک کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ چنانچہ یہی علامہ شامی اسی عبارت کے تحت میں فرماتے ہیں: لکنہ اذا لم یصل الفرض معہ لا یتبعہ فی الوتر۔

یعنی جب فرض امام کے ساتھ نہیں پڑھے تو وتر جماعت سے نہیں پڑھے گا۔

کہئے! مجیب صاحب یہ عبارت درمختار آپ کو کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ کاش اگر آپ شامی کو دیکھتے تو اتنی شرمندگی نہ اٹھانی پڑتی۔ لیکن دیکھی تو ضرور ہوگی مگر شاید عبارت کا مفہوم جناب نے نہیں سمجھا ہوگا۔

عربی کی عبارت ہے ممکن ہے کہ ذہن کی رسائی نہ ہوئی ہو اس لئے میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ جناب کی اس پیش کردہ درمختار کی عبارت کا مطلب اردو زبان میں پیش کروں تا کہ جناب کے سمجھنے میں آسانی ہو اور وہ بھی آپ ہی کے پیشوا محمد احسن صاحب نانوتوی جو اسی درمختار کے ترجمے ”غایۃ الاوطار“ میں لکھتے ہیں:

ولولم یصلہا ای التراویح بالامام او صلاھا مع غیرہ لہ ان یصلی الوتر معہ۔

اور اگر نہ پڑھا تراویح کو امام کے ساتھ یا تراویح کو دوسرے امام کے ساتھ پڑھا تو نمازی کو جائز ہے کہ وتر کو امام کے ساتھ پڑھے۔

مراد اس سے یہ ہے کہ فرض کو جماعت کے ساتھ پڑھا اور تراویح کو جماعت سے نہیں پڑھا تو وتر جماعت سے پڑھ سکتا ہے۔ لیکن اگر فرض تنہا پڑھے ہوں تو جماعت سے نہ پڑھے۔ لہذا اہل انصاف غور فرمائیں کہ یہ وہی عبارت ہے جس کو صاحب شریعت دیوبند اپنے ہر دو فتاویٰ میں اور ہمارے مجیب صاحب اس لئے نقل کر کے لائے ہیں کہ یہ ہر دو صاحبان اسی عبارت سے یہ ثابت کریں کہ جس نے فرض تنہا پڑھے ہوں وہ وتر جماعت سے پڑھے۔ اور علامہ شامی اور مولوی محمد احسن اس عبارت کا یہ مفہوم بیان کرتے ہیں کہ اگر فرض تنہا پڑھے ہوں تو وتر کو جماعت سے نہ پڑھے۔ لہذا انھوں نے محض دھوکہ دینے کے لئے اپنے فتووں میں اسی عبارت درمختار کو نقل کیا ہے یا نہیں؟ اور اس عبارت کی مراد ان مجیبوں کے مسلک سے نہ صرف بے تعلق بلکہ بالکل خلاف ہے اور ہمارے مسلک کا قوی ہونا ثابت کرتی ہے۔ اور نہ آج تک کسی دیوبندی نے کوئی ایسی صریح عبارت پیش کی ہے جس کی صریح یہ مراد نکلتی ہو۔ کہ جس نے فرض تنہا پڑھے تو وہ بلا کراہت وتر جماعت سے پڑھے۔

اب مجیب کا یہ کہنا: اور دوسری کتابوں میں فرض کی بغیر جماعت سے پڑھنے کی تصریح ہے۔ کہاں تک واقعیت رکھتا ہے۔ مجیب صاحب اگر کچھ ہمت ہو تو پیش کیجئے لیکن خدا کے لئے کوئی درمختار کی سی عبارت پیش نہ کر دیجئے گا جو آپ کے لئے وبال جان بن جائے۔

اب رہا کلام حسین کے متعلق ان پر بھی یہی کل بحث ناطق ہے وہ بھی اپنی گلو خلاصی کی کوشش کریں۔ خصوصاً مولوی عبدالوحید صاحب مدرس میز تاشی کا کبیری کے بے علاقہ عبارت کو پیش کر دینا۔ تو یہ ان کی انتہائے قابلیت کی بین دلیل ہے کہ مولانا صاحب کبیری ہی کے صحیح مفہوم نکالنے سے قاصر ہیں۔ اور مولوی کریم بخش صاحب کی صغیری کی عبارت۔ لہذا یہ خود انھوں نے اپنی طرف سے تلاش کر کے نہیں لکھی ہے۔ چونکہ ان کی شریعت کے صاحب شریعت نے اپنے دونوں فتاویٰ میں اس کو لکھا ہے انھوں نے بھی بلا

سوچے سمجھے اسی عبارت کو نقل کر دیا۔ لہذا میں اس کے متعلق صرف یہ عرض کرتا ہوں کہ اولاً تو یہ عبارت مراد میں صریح نہیں اور اگر آپ اس کی صراحت کے مدعی ہیں تو یہ سات سوالات حاضر ہیں ان کے جواب آنے پر پھر اور کچھ پیش کیا جائے گا۔

(۱) مع الامام میں الف لام کونسا ہے اور اس کا کیا فائدہ ہے؟

(۲) مع امام اور مع الامام میں کچھ فرق ہے یا نہیں اگر ہے تو کیا؟

(۳) جواز جب کراہت کو بھی شامل ہے تو اس پر کیا دلیل ہے کہ یہاں جواز بلا کراہت ہے؟

(۴) قہستانی کی اس صریح عبارت ”لکنہ اذا لم یصل الفرض معہ لا یتبعہ فی الترتیب“ کا جواب ہے؟

جواب ہے؟

(۵) پھر قہستانی سے نقل کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ صاحب منیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

(۶) پھر علامہ شامی کا اسی قہستانی کی عبارت کو نقل کر کے اس پر اعتماد کرنا کیا آپ کے مسلک

قوت پہنچاتا ہے یا ہمارے مسلک کو؟

(۷) آپ کے پیشوا مولوی محمد احسن کا ہمارے مسلک کی تصریح کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟

فی الحال اتنے ہی جواب پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ جناب نے اگر حوصلہ افزائی کی تو پوری تفصیل حاضر

کردوں گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۰۰ھ

(۳۹۰)

مسئلہ

ما قولکم دام فیضکم وفضلکم فیما اذا اقتدی المقیم بالمسافر فی الركعة الثانية

من العشاء هل یقرء فی الثلث الاتی یا تیہا الامام بعد فرغ امامہ ام لا؟ وان قلتم بالقرء

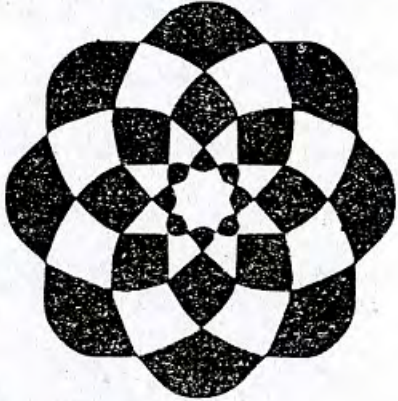
فی الركعة من الركعات ففی ایتهن یقرأ استحباباً؟

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اذا كان المقيم مسبقاً واما ما مسافر وفات الركعة الاولى فيقضى الركعة بعد سلام الامام بالقرءة لان القرءة في حقه فرض كما صرح الطحاوی فی حاشیة الفلاح فكان الاحتياط فی حقه القرءة فصار جعله منفرداً اولی من جعله مقتدياً فكانت قرأته فيما یفنی فرضاً واما الركعتان الاخیرتان فلا یقرء فی الاصح واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۰۰ھ



﴿ ۲۳ ﴾

باب المکروہات والمفسدات

(۳۹۱-۳۹۲-۳۹۳-۳۹۴)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسائل ذیل میں

(۱) زید امامت کرتا ہے اور نماز کی حالت میں کرتے کے گریبان کے اوپر کا ایک بٹن کھلا رکھتا ہے اور حالت نماز میں اسے مسنون بتاتا ہے بلکہ نماز اور غیر حالت نماز میں ہر وقت کھلا رکھتا ہے اور اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں مشکوٰۃ شریف کی وہ حدیث پیش کرتا ہے جو کتاب اللباس فصل ثانی میں معاویہ بن قرہ کے والد صاحب سے مروی ہے اور شمائل ترمذی میں بھی اس کو روایت کیا ہے۔ مشکوٰۃ شریف کی روایت یہ ہے:

عن معاویہ بن قرہ عن ابيه قال اتيت النبي صلى الله تعالى عليه وسلم في رهط من مزينة فبايعوه وانه لمطلق الاضرار فادخلت يدي في جيب قميصه فمست الخاتم رواه ابو داؤد۔

تو کیا زید کا ثبوت دعویٰ میں اس حدیث شریف کو پیش کرنا صحیح ہے یا غلط؟

(۲) اور کیا ائمہ اربعہ میں سے کسی نے مسنون بتایا ہے یا محدثین یا شارحین حدیث نے سنت فرمایا ہے؟

(۳) کرتے کا بٹن نماز میں کھلا ہوا رکھنے کو سنت سمجھنا اور اسی حالت سے نماز پڑھنا یا پڑھانا مسنون ہے یا خلاف سنت؟

(۴) اگر نماز میں کھلا ہوا رکھنا سنت نہیں ہے تو اس کو مسنون کہنے والا شریعت پر افترا کرتا ہے یا نہیں؟ اور شریعت پر افترا کرنے والے اپنی طرف نئے مسائل گڑھ کر مسلمانوں میں فتنہ و فساد اختلاف و افتراق پیدا کرنے والے کے لئے کیا حکم ہے اور اس کے پیچھے نماز پڑھنا اور اسے امام بنانا جائز ہے یا نہیں؟۔ بینوا تو جروا۔ المستفتی عبدالکریم ۲۴ ذیقعدہ ۱۳۷۵ھ ساکن قصبہ آنولہ ضلع بریلی

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

(۱) حالت نماز میں کرتے کے بٹن کھلے رکھنا اور اس کے نیچے میں خوری بھی نہ ہو تو یہ سدل ہے جو مکروہ تحریمی ہے۔ فقہاء نے سدل کی یہ تعریف کی ہے کہ کسی کپڑے کو اس کے خلاف عادت لٹکا چھوڑ دینا۔

طحاوی میں ہے: (السدل) فی الشرع الارسال بدون لبس معتادا۔ (ص ۲۰۴)

کبیری میں ہے: حد السدل وهو الارسال من غیر لبس۔ (ص ۳۳۶)

اور یہ بات بدیہی ہے کہ کرتا پہننے وقت ہر شخص عادت بٹن لگایا کرتا ہے تو جس نے اس کے بٹن نہ لگائے اس نے اس کے لبس معتاد کا خلاف کیا جس پر سدل کی تعریف صادق آئی اور نماز میں سدل مکروہ تحریمی ہے۔

در مختار میں ہے: (کرہ سدل) تحریما للنہی (ثوبہ) ای ارسالہ بلاللبس معتاد۔

(شامی مصری ج ۱ ص ۲۳۸)

اور حدیث شریف میں ہے جس کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔

ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نہی عن السدل فی الصلوٰۃ۔

(مشکوٰۃ شریف ص ۷۳)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نماز میں سدل سے منع فرمایا۔

اسی لئے علامہ ابراہیم حلبی نے یہ مسئلہ تحریر فرمایا کہ اگر قبا کی آستینیں پہن لیں اور بٹن نہ لگائے تو یہ سدل کے مشابہ ہو جائے گا اور اگر اس کے بٹن لگائے تو اس میں سدل بھی لازم نہ آیا اور مکروہ بھی نہ ہوا،

عبارت یہ ہے: لو ادخل یدیه فی کمیه ینبغی ان یقید بما اذا لم یزرارہ لانه یشبہ السدل ح اما انه الاضرار فقد التحق بغيره من الثياب فی اللبس فلا سدل فيه فلا یکرہ۔

(کبیری ص ۳۳۶)

لہذا اس صورت میں کرتے کے بٹن کا نماز میں کھلا رکھنا مکروہ تحریمی ثابت ہوا۔

اور جب کرتے کے نیچے میل خوری بھی ہو تو حالت نماز میں کرتے کے بٹن کھلے رکھنا مکروہ تنزیہی ہے۔ علامہ شامی خزائن سے ناقل ہیں:

ذکر ابو جعفر انه لو ادخل يديه في كميه ولم يشد وسطه اولم يزراراره فهو مسي لانہ يشبه السدل -
(شامی ج ۱ ص ۴۳۹)

یہی علامہ شامی حلیہ سے ناقل ہیں: اختلف فی کراہۃ شد وسطه اذا كان عليه قميص ونحوه ففي العتابة انه يكره لانه صنيع اهل الكتاب - (شامی ج ۱ ص ۴۳۹)
بالجملہ کتب فقہ کی تصریحات سے تو مسئلہ واضح ہو چکا۔ اب باقی رہا جاہل زید کا یہ دعویٰ (کرتے کے گریبان کے اوپر کے بٹن کا حالت نماز میں کھلا رہنا مسنون ہے) نہ صرف بلاد لیل بلکہ کتب فقہ کی تصریحات کے خلاف ہے۔ وہ اپنے اس دعویٰ پر کوئی حدیث پیش نہیں کر سکتا اور اس نے جو حدیث پیش کی ہے اس سے اس کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس کے اس استدلال سے اس کی جہالت ضرور ثابت ہوتی ہے۔

اولاً: حدیث شریف میں کوئی لفظ بھی حالت نماز پر دال نہیں اور غیر حالت نماز پر حدیث کی صریح دلالت ہے تو اب زید کا غیر حال نماز کو حال نماز پر قیاس کرنا جہالت نہیں تو اور کیا ہے۔
ثانیاً: اسی مشکوٰۃ شریف میں حدیث شریف کے وازرروه ولو بشوكة کے حاشیہ میں مرقات سے ناقل ہیں:

ومن آداب الصلوٰۃ زرا القميص - یعنی نماز کے آداب سے قمیص کے بٹن لگانا ہے۔
تو اب زید کا اپنی پیش کردہ حدیث کو حالت نماز کے لئے دلیل بتانا کیسی سخت جہالت ہے۔
ثالثاً: زید کی پیش کردہ حدیث میں جو امور ہیں وہ بیان جواز کے لئے ہیں۔ علامہ ابراہیم بیجوری نے المواہب اللدنیہ علی الشماکل الحمد یہ میں اسی زید کی پیش کردہ حدیث کی شرح میں فرمایا:

وفی هذا الحديث حل لبس القميص وحل الزر فيه وحل اطلاقه وسعة الجيب لجيب تدخل اليد فيه وادخال يد الغير في الطرق - (مواہب لدنیہ مصری)

لہذا اب زید اپنے زعم باطل کی بنا پر حالت نماز میں فقط بٹن کھلے رہنے کو مسنون نہ کہے بلکہ حالت نماز ہی کے اندر گریبان میں غیر کے ہاتھ داخل کرنے کو بھی مسنون قرار دے۔

ع۔ بریں عقل و دانش بیاہر گریست
رابعاً: زید نے شامی ترمذی کی اسی حدیث پر عمل کیا جس میں حالت نماز پر کوئی دلالت بھی نہ تھی باوجودیکہ اسی شامی ترمذی میں اسی حدیث کے بعد دوسری یہ حدیث بھی ہے۔

عن انس بن مالك ان النبي صلى الله تعالى عليه وسلم خرج وهو يتكلم في اسامة بن زيد عليه ثوب قطري قد توشح به فصلى بهم - (شامی ص ۵)

جس میں صاف بیان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی چادر شریف کو دھنی بغل شریف کے نیچے سے نکال کر بائیں شانے پر محرم کی طرح امامت فرمائی۔
لہذا زید نے اس سنت پر کبھی کیوں نہیں عمل کیا اور وہ اس طرح کیوں امامت نہیں کرتا۔
خامساً: حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہر فعل کو مسنون سمجھ کر بلا تحقیق قابل عمل جاننا خود جہل و نادانی کی دلیل ہے۔

یہی علامہ ابراہیم بیجوری اسی مواہب لدنیہ میں اسی حدیث انس کی شرح میں فرماتے ہیں:
انه صلى الله تعالى عليه وسلم قد يفعل المكروه لبيان الجواز ولا يكون مكروها في حقه بل يثاب عليه ثواب الجواز - (مواہب ص ۶۰)

سادساً: زید ایک بٹن کھلا رکھتا ہے اور وہ جس حدیث شریف کو ثبوت میں پیش کرتا ہے اس میں ایک بٹن کی تخصیص نہیں بلکہ اس میں مطلق الاقرار ہے تو اس تخصیص کا حدیث میں کہاں ذکر ہے؟۔
سابعاً: فقہ کی تصریحات کے موجود ہوتے ہوئے زید کی یہ جرأت و دلیری کہ وہ احادیث سے مسائل کا استخراج و استنباط کرتا ہے۔ اس کی انتہائی جہالت کی دلیل اور ضلالت کی سبیل ہے باوجودیکہ یہ مرتبہ اب کسی کو حاصل نہیں۔

حضرت سیدی عبدالوہاب شعرانی میزان الشریعۃ الکبریٰ میں فرماتے ہیں:
ليس في قوة احد بعد الاثمة الاربعة ان يتكررا احكام ويستخرجها من الكتاب والسنة فيما نعلم ابدا - (میزان مصری ج ۱ ص ۳۶)

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب
فقہ کی تصریحات سے فقہائے کرام کا مسلک معلوم ہو گیا کہ وہ نماز میں بٹن کھلے ہوئے چھوڑنے کو مکروہ کہتے ہیں۔ اور محدثین و شارحین کا قول مرقات کے حوالے سے گذرا کہ آداب نماز سے بٹنوں کا لگانا ہے۔ مزید اباحت کی حاجت نہیں ہے۔ جب فقہ کی کتابوں سے اس کی کراہت ثابت ہو چکی تو زید کا اس کو سنت کہنا گویا مکروہ کو سنت کہنا ہے اور اس کا اس طرح نماز پڑھنا مکروہ خلاف سنت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

شامی سے عبارت منقول ہوئی کہ جس نے نماز میں بٹن کھلے ہوئے رکھے وہ گنہگار ہے۔ اسے مکروہ و گناہ نہ جانے اور اسے مسنون کہہ کر نہ فقط شریعت پر بلکہ خود شارع علیہ السلام پر عداوت کر رہا ہے وہ اس حدیث کا مصداق ہے۔

من کذب علی متعمدا فلیتبؤا مقعده من النار۔ (مشکوٰۃ ص ۳۲)

اسے چاہئے کہ استغفار کرے اور امت میں اختلاف و افتراق پیدا نہ ہونے دے اور مسلمانوں میں فتنہ و فساد کی بنیاد نہ قائم کرے۔

اب باقی رہا زید کا امام بنانا اور اس کی اقتدا اس کا حکم بھی اسی تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ جب نماز کی نماز مکروہ ہوئی اور شرعاً ہر ایسی نماز جو بکراہت ادا ہو اس کا اعادہ کیا جائے۔

مراقی الفلاح میں تجنیس سے ناقل ہیں: کل صلوٰۃ ادیت مع الکراہۃ فانہا تعداد لا علی وجہ الکراہۃ۔ (طحطاوی مصری ص ۲۰۱)

تو اب ایسے امام کی اقتدا میں جو نماز ہوگی اس کے اعادہ کا حکم ہوگا۔ لہذا اس میں حرج کثیر لا آتا ہے اس وجہ سے اس امام ہی کو بدلنا چاہئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۰۱ھ

مسئلہ

(۳۹۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ ذیل میں
زید مولوی کہلاتا ہے اور امامت کرتا ہے تین سال سے کرتے کے اوپر کا بٹن کھول کر نماز پڑھتا
اور اسکو سنت بتاتا رہا لیکن جب ایک اور مولوی سے اسی مسئلہ میں بحث ہوئی تو زید نے اسے مستحب
لیکن اس مولوی نے اس کو مستحب بھی تسلیم نہ کیا چونکہ زید کے اس فعل سے عام مسلمانوں میں بے
پہیل رہی تھی اور اندیشہ تھا کہ کہیں تصادم ہو جائے اس مولوی نے زید سے یہ کہا بالفرض اگر میں
مستحب بتانے کو تسلیم کر لوں (جو میرے نزدیک نہیں ہے) تب بھی آپ کو مناسب ہے کہ مسلمانوں
بے چینی دور کرنے کے واسطے اس بٹن کو آپ بند کر لیں زید نے بٹن بند کیا۔ لہذا اب سوال یہ ہے کہ
سال سے جو نماز زید کے پیچھے پڑھی گئیں وہ درست ہوئیں یا نہیں، اگر نہیں تو اس کی ذمہ داری

عائد ہوتی ہے اور کیا کفارہ واجب ہوتا ہے صحیح جواب سے مطلع فرمائیں والسلام
مرسلہ علیم الدین عفی عنہ کثرہ سنیہ کوچہ بنگلہ آنونہ ضلع بریلی۔

نوٹ: - اس دوران میں بٹن کے متعلق اکثر علماء دین کے فتوے بٹن کھلا رکھنے کے خلاف میں
آئے لیکن زید اس کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا اور کسی مولوی سے اس مسئلہ میں بحث کرنا گوارہ نہیں کی یہ
ایک اتفاق تھا جو زید نے مذکورہ بالا مولوی سے بحث کی اور ان کی جرح پر مستحب قرار دیا۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علی رسولہ الکریم

دو سال کے قریب ہوئے کہ اسی قصبہ آنولہ ہی سے بتوسط مولوی عبداللطیف صاحب جناب
عبدالکریم صاحب نے یہی سوال بھیجا تھا جس کا مبسوط جواب لکھ دیا گیا تھا اور اس میں فقہ کی عبارات
سے بٹن کھول کر نماز پڑھنے کی کراہت پر کافی تصریحات پیش کرائی گئیں تھیں اور اس زید کے دعوے سنت کی
دھجیاں اڑادی گئیں تھیں اور اس کی پیش کردہ حدیث کے غلط استدلال پر سات رد بلیغ کئے گئے تھے۔ یہ
سائل بھی چونکہ اسی قصبہ کا ساکن ہے لہذا اس فتوے کو عبدالکریم سے حاصل کر کے ملاحظہ کرے کہ اس
میں جواب مکمل و مدلل ہے میں اس وقت بوجہ اپنی عدم الفرستی کے اس جواب کا خلاصہ عرض کرتا ہوں۔
اگر کرتے کے نیچے کوئی کپڑا نہ ہو تو کرتے کے بٹن کھول کر نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے اور اگر کرتے کے نیچے
کوئی کپڑا ہو تو کرتے کے بٹن کھول کر نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے اور شرعاً ہر ایسی نماز جو بکراہت ادا ہو اس کا
اعادہ کیا جائے۔

مراقی الفلاح میں ہے: کل صلوٰۃ ادیت مع الکراہۃ فانہا تعداد۔
لہذا جب امام کی نماز قابل اعادہ ہے تو مقتدی کی نماز کیوں قابل اعادہ نہ ہوگی۔
بالجملہ جس جس مقتدی نے اس امام کی اقتداء جس قدر نمازوں میں کی ہے ان تمام نمازوں کا
اعادہ کرنا چاہئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۰۱ھ

مسئلہ

(۳۹۶)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں

بلا عذر شرعی بنڈی (سینڈو بنیان کے مطابق) پہن کر نماز پڑھنا کیسا ہے آیا ایسا کرنے سے نماز ہوتی ہے یا نہیں میرے دو سوال کا جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں عام فہم دیا جاوے۔
المستفتی، محمد رضا گوہر قادری قریشی ۳۲۲۹ معرفت لکھنؤ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بلا حاجت فقط بنڈی بنیائیں پہن کر نماز پڑھنا مکروہ ہے مراقی الفلاح میں ہے

تکرہ الصلوٰۃ فی ثياب البذلة بکسر الباء وسكون الذال المعجمة ثوب لا یصان عن الدنس ممتهن وقيل مالا یذهب به الی الکبراء۔ تو ایسی نماز کو دوبارہ پڑھنا چاہئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۶ھ

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنجل

مسئلہ

(۳۹۷)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں

تکبیر نماز کھڑے ہو کر سننا مکروہ تنزیہی یا مکروہ تحریمی؟

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

فتاویٰ عالمگیری میں ابتدا سے کھڑے ہو جانے کو اقامت میں مکروہ لکھا ہے لیکن غالباً یہ کراہت تنزیہی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنجل

مسئلہ

(۳۹۸)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں

زید کہتا ہے کہ ٹوپی سے نماز مکروہ ہے۔ احکام شریعت مصنفہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا حوالہ دیتا ہے۔ کیا احکام شریعت میں مکروہ لکھا ہے؟۔ جواب دیں امام ٹوپی سے نماز پڑھا دے تو کیا وہ نماز مکروہ ہے جواب مہر شدہ ارسال فرمائیں۔ نیاز، غیور علی رضوی منزل غفرلہ بری سادڑی

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جس طرح عمامہ باندھنا سنت ہے اسی طرح صرف ٹوپی کا اوڑھنا بھی سنت ہے، تو صرف ٹوپی سے نہ تو نماز مکروہ ادا ہوتی ہے نہ امام کا ٹوپی سے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ احکام شریعت میں اس کی کراہت کی تصریح ہماری نظر سے تو گذری نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۸ ذیقعدہ ۱۳۶۶ھ

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنجل

مسئلہ

(۳۹۹)

حضرت مولینا مولوی المکرم والمکرم مفتی اعظم شاہ محمد اجمل صاحب قبلہ مدرسہ اجمل العلوم سنجل۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

گزارش خدمت شریف میں یہ ہے کہ حضرت کا فتویٰ تشریف لایا لیکن اس فرمان شرع کو زید نے غلط بتایا۔ زید کا کہنا ہے کہ ٹوپی سے نماز مکروہ ہوتی ہے جس کے پاس عمامہ موجود ہو اور کپڑا میسر ہو تو وہ ٹوپی سے نماز نہیں پڑھ سکتا۔ حوالہ میں ”راہ نجات“ نامی چھوٹی کتاب مطبوعہ نولکشو پریس لکھنؤ کی پیش کرتا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ کپڑا میسر ہوتے ہوئے ٹوپی سے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ نماز ہو جاتی ہے مگر ثواب کم ہو جاتا ہے۔ اور آپ کے فتویٰ پر جواب کا حوالہ دلائل شرعیہ سے جلد از جلد جواب عنایت فرمائیں کہ ٹوپی سے نماز بالکل درست ہوتی ہے یا نہیں۔ اور ”راہ نجات“ کتاب سنی نے لکھی ہے یا شیعہ نے لکھی ہے وہ کتاب مستند ہے یا نہیں؟۔ آپ بہار شریعت یا احکام شریعت جیسی معتبر کتاب کا حوالہ ضرور دیں۔ آپ علاوہ اس مسئلہ کے جواب کے یہ بھی دیں کہ ٹوپی اوڑھنا سنت ہے یا نہیں؟۔

تکلیف کی جزا حق تبارک وتعالیٰ عنایت کریگا۔ اگر ایک دو دستخط مفتیوں کے اس جواب پر ہو جائے تو بہتر ہے۔ لگ۔ اللہ اللہ۔ مگر وضو، شہادت، کھڑک، سکا، آج، جہاد، تہجد

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بغیر عمامہ کے صرف ٹوپی کا پہننا سنت ہے اور خود فعل رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔

چنانچہ ابن عساکر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے راوی ”کان یلبس القلنسوة بغیر

(از زاد المعاد مصری جلد ۱ صفحہ ۱۳۱)

عمامة“

حضور اکرم ﷺ بغیر عمامہ کے ٹوپی استعمال کرتے تھے

اس حدیث سے آفتاب کی طرح ثابت ہو گیا کہ صرف ٹوپی کا پہننا بھی سنت رسول علیہ السلام

ہے۔ اور جب اس کا سنت ہونا ثابت ہو چکا تو ٹوپی سے نماز مکروہ اور نادرست کس طرح ہو سکتی ہے۔ پھر

ٹوپی سے نماز کا مکروہ ہونا آج تک کسی معتبر کتاب میں تو دیکھا نہیں۔ اور کتاب راہ نجات کوئی مستند و معتبر

کتاب نہیں۔ لہذا یہ کراہت کا حکم کیسے ہو سکتا ہے کہ نماز میں عمامہ کا ہونا صرف مستحب ہے۔ فقہ کی مشہور

کتاب مراقی الفلاح میں ہے۔ المستحب للرجل ان یصلی فی ثلاثة اثواب ازار وقبض

(ہامش طحاوی مصری صفحہ ۲۰۴)

وعمامة۔

آدمی کے لئے تین کپڑوں تہبند اور قمیص اور عمامہ کے ساتھ نماز پڑھنا مستحب ہے۔ تو جب نماز

میں عمامہ کا ہونا مستحب قرار پایا تو ٹوپی سے غیر مستحب لازم آیا جو شرع میں خلاف اولیٰ کہلاتا ہے۔ تو

خلاف اولیٰ تو مقابل مستحب کا ہے نہ کہ مکروہ۔ تو ٹوپی سے نماز کا مکروہ قرار دینا جہالت و نادانی نہیں ہے تو

اور کیا ہے۔ تو زید کا قول حدیث کے بھی خلاف ثابت ہوا اور فقہ کی تصریح کے بھی مقابل ٹھہرا۔ لہذا میرا

پہلا فتویٰ حدیث و فقہ کے موافق صحیح ثابت ہوا۔ اور قول زید غلط اور مخالف حدیث و فقہ کے قرار پایا۔ نیز

اسی تحقیق سے راہ نجات کے حکم کا بھی غیر مفتی بہ اور نامعتبر ہونا ظاہر ہو گیا۔ مولیٰ تعالیٰ زید کو حق کے قبول کر

لینے کی توفیق عطا فرمائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۲۹ ذیقعدہ ۱۳۶۶ھ

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۰۱ھ

مسئلہ

حضرت قبلہ علمائے دین کیا فرماتے ہیں در بارہ ان مسائل کے کہ

کسی آدمی کے پیر کے انگوٹھے اور انگلی زمین سے نہیں جمتے یعنی انگوٹھ اور انگلیاں پیر کی ان کا

پیٹ نہیں بھرتا۔ ایسے شخص کے لئے کیا حکم ہے کہ نماز پڑھائے یا نہیں؟ وہ شخص اپنی معذوری بتلاتے

ہیں تو کیا ان کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں؟ فقط جواب سے مطلع فرمائیے عنایت ہوگی۔

المستفتی، شمشاد احمد منیر سیرت کمیٹی محلہ پچھم تھوک نزد مسجد ڈونڈوئہ ضلع ایٹہ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

نماز میں بحالت سجدہ پاؤں کے انگوٹھوں اور انگلیوں کے پیٹ کا زمین پر لگانا بلکہ جمنا شرعا

ضروری و شرط ہے۔ صرف انگلی کی نوک زمین سے لگ جانا کافی نہیں۔ اگر شخص مذکورہ فی الواقع معذور

و مجبور ہے تو اس کی نماز ہو تو ہو جائیگی لیکن وہ غیر معذور لوگوں کا امام نہیں بن سکتا۔ کہ ایسے معذور امام کے

پیچھے غیر معذور مقتدیوں کی نماز درست نہیں۔ لہذا نہ ایسے معذور امام کو امام بنایا جائے نہ غیر معذور مقتدی

ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۲۴ رجب المرجب ۱۳۶۷ھ

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۰۱ھ

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

نماز میں اگر تھوکنے کی ضرورت ہو تو کیا کرے۔ یا تھوک کو نگل جائے یا کسی جانب تھو کے۔ اگر

مجد میں نماز پڑھ رہا ہے اور یہ صورت پیش آئے تو اس میں کیا عمل کرے اور تھوکنے کی عادت بنا لینا کیسا

ہے؟ زید اب تک دوران نماز میں جب کبھی مکان پر نماز پڑھتا تھا سامنے کی طرف تھوکنے کا عادی تھا۔

اس عمل میں کسی نے اعتراض کیا تب اس نے ایک عالم سے یہ مسئلہ پوچھا۔ عالم نے بجائے سامنے

تھوکنے کے دائیں بائیں جانب تھوکنے کی اجازت دی۔ پھر دوسرے سے دریافت کیا تو تھوکنے کی

اجازت اس نے بھی دیدی لیکن اس طرح سے تھو کے کہ برابر والے کو معلوم نہ ہو۔ زید اپنے عمل کے ثبوت

میں ایک عالم کے عمل کو پیش کرتا ہے۔ عالم کا عمل یہ ہے کہ نماز جماعت کی عالم موصوف بڑھاتا ہو دوران

نماز میں جب ضرورت تھوکنے کی ہوتی ہے سامنے برتن رکھا ہوا ہے، اس کو اس میں تھوک لیا اور پھر اسی طرح سے برتن اپنی جگہ پر رکھ دیا، جھکنے اور اٹھنے میں نہیں ہوا اور اس کی نماز میں تو کوئی فرق نہیں آیا۔ مدلل طریقہ پر مسئلہ کا جواب دیں۔

ممتاز الہی اشرفی عنی عنہ شعبان المعظم ۱۳۶۰

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم۔
نماز میں تھوکنہ مکروہ ہے، چنانچہ مراقی الفلاح میں بیان مکروہات میں ہے:
ویکرہ ان یرمی بزاقہ۔ (ص ۲۰۳)

اور اگر تھوکنے کیلئے مضطر ہو تو اس کے لئے احادیث میں یہ چند صورتیں بیان فرمائی ہیں۔

بخای شریف میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ان احدکم اذا صلی قام فی الصلوٰۃ فانما ینا جی ربہ وان ربہ بینہ و بین القبلة فلا یبزقن احدکم قبل قبلتہ ولكن عن يساره او تحت قدمه۔ ثم اخذ طرف رداءه فبصق ثم رد بعضه علی بعض فقال او یفعل هكذا۔ (مشکوٰۃ شریف ص ۷۱)

جب تم میں کوئی شخص نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے رب سے مناجات کرتا ہے۔ بیشک اس کے اور قبلہ کے درمیان رب ہوتا ہے تو تم میں کوئی قبلہ کی طرف ہرگز نہ تھو کے۔ البتہ بائیں جانب یا زیر پا تھو کے۔ پھر حضور نے اپنی چادر کا ایک گوشہ لیا اس میں تھوکا اور اس گوشہ کو مل دیا اور فرمایا: یا اس طرح کرے۔

حضرت شیخ محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:
اواگر مسجد است البتہ بچینیں کند و در غیر مسجد اختیار دارد کہ در جانب چپ بیند از دیار پیا:
اگر مسجد میں ہے تو ایسا ہی کرے اور اگر غیر مسجد میں تو اسے اختیار ہے کہ دائیں جانب تھو کے یا زیر پا۔

مراقی الفلاح میں ہے: ویکرہ ان یرمی بزاقہ الا ان یضطر فیاخذ بثوبہ او یلقیہ تحت رجلہ الیسری اذا صلی خارج المسجد:
(ص ۲۰۳)

اور نماز میں تھوکنہ مکروہ ہے ہاں بحالت اضطراب اسے اپنے کپڑے میں لے یا بائیں پاؤں کے

نیچے پھینک دے۔ یہ جب ہے کہ غیر مسجد میں نماز پڑھ رہا ہو۔

بالجملہ اگر نمازی مسجد میں نماز پڑھ رہا ہے اور اسے تھوکنے کی ضرورت ہی پیش آجائے تو حرمت مسجد کے لحاظ سے اس کے لئے بہتر طریقہ یہی ہے کہ وہ اپنے کسی کپڑے کے حصہ میں تھو کے اور مسجد کو ملوث نہ کرے۔ اور غیر مسجد میں بھی دائیں جانب اور سامنے نہ تھو کے۔ بائیں جانب کی اجازت ہے اور یہ بیان اس وقت ہے جب اس کی ضرورت شدید پیش آجائے ورنہ اس کی کراہت مصرح ہے۔

اب رہا اس کی عادت بنا لینا اس کے منافی صلاۃ ہونے میں کوئی شک نہیں، اور جس عالم نے دائیں طرف تھوکنے کی اجازت دی اور پھر مسجد اور غیر مسجد کا فرق نہیں کیا یا محض اپنی رائے سے کہا کہ اس طرح تھو کو کہ برابر والے کو نہ معلوم ہو۔ یہ سب تصریحات کتب شرعیہ کے خلاف ہے اور زید اپنے عمل کے ثبوت میں جس عالم کا عمل پیش کرتا ہے یہ واقعی عمل کثیر ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المتعصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۶۰

(۲۰۲)

مسئلہ

لو رفع شخص فی الصلوٰۃ یدیه او رجلیه مرة أهذا فعل واحد ام کثیر؟

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

الاصل ان العمل الکثیر یفسد الصلوٰۃ وفسره بعضهم کما فی ردالمحتار ان ما یعمل عادة بالیدین کثیر وان عمل بو احدة کالتعمم وشد السراویل۔ وما عمل بو احد قلیل وان عمل بهما کحل السراویل ولبس القلنسوة ونزعها الا اذا اکرر ثلاثا متوالیة۔
فرفع الیدین فی الصلوٰۃ ان کان مما یعمل عادة بالیدین فکثیر ویفسد به الصلوٰۃ ولو مرة والا فهو قلیل لا یفسد به الصلوٰۃ لو کان مرة الا اذا رفعهما ثلاثا متوالیة واما لو رفع یدیه عند الركوع والرفع۔

منه کما هو مذہب الشافعی فیکرہ عندنا فلا یفسد الصلوٰۃ وقس حکم عمل الرجلین علی حکم عمل الیدین کما هو مصرح فی ردالمحتار۔ واحسن الاقوال الذی علیہ عامة الفقهاء و هو کل عمل یغلب علی ظن الناظر الی المصلی انه لیس فی

ہاں اگر وہ رکوع یا سجدہ میں ادا ہو سکے تو آیت سجدہ کا پڑھنا مکروہ نہیں۔

تو امام اگر آیت سجدہ پڑھ کے سجدہ تلاوت نہیں کرتا ہے تو اس میں ترک واجب لازم آتا ہے اگر سجدہ تلاوت کرتا ہے تو مقتدی اشتباہ میں پڑ جائیں گے۔ ہاں اگر آیت سجدہ آخر آیت تھی اور اس سے فوراً رکوع و سجدہ کر لیا تو اس میں کوئی نقص لازم نہیں آتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: مقتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۰۵ھ

(۲۰۵-۲۰۶)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں حضرات علمائے کرام و مفتیان شرع عظام دامت برکاتہم العالیہ مسائل حسب ذیل کی بابت کہ

(۱) زید کہتا ہے پیلی بھیت، بریلی، کانپور، مراد آباد میں لاؤڈ اسپیکر سے نماز پڑھنے کو علمائے کرام صرف انہیں چار شہروں کے منع کرتے ہیں اور بمبئی، لاہور، کراچی، پشاور وغیرہ تمام پاکستان اور مدینہ طیبہ مکہ معظمہ میں لاؤڈ اسپیکر پر نماز پڑھی جاتی ہے۔ صرف مذکورہ بالا شہر پیلی بھیت بریلی کانپور مراد آباد میں لاؤڈ اسپیکر سے نماز نہیں پڑھی جاتی ہے۔ اور یہاں کے علمائے کرام منع فرماتے اور لاؤڈ اسپیکر سے نماز پڑھنے کو ناجائز قرار دے کر بمبئی کراچی وغیرہ تمام پاکستان مدینہ طیبہ مکہ معظمہ وغیرہ کے علمائے کرام کے خلاف فتویٰ صادر فرما کر وہاں کے علمائے کرام کی مخالفت کرتے ہیں۔ اگر واقعی لاؤڈ اسپیکر پر نماز نہیں ہوتی ہے تو پھر وہاں کے علماء منع کیوں نہیں کرتے؟ حالانکہ پاکستان میں حکومت بھی اسلامیہ ہے شرعاً کیا حکم ہے؟

(۲) زید یہ کہتا ہے کہ مدینہ طیبہ اور مکہ معظمہ میں جو نماز لاؤڈ اسپیکر سے ہوتی ہے وہ جس صورت سے وہاں پر ہوتی ہے وہ جائز اور نماز صحیح ہوتی ہے۔ یعنی وہاں کے لاؤڈ اسپیکر بہت زیادہ قیمت کے ہوتے ہیں اور وہاں امام کے گلے میں ایک ہارن جو ہار کی شکل میں ہوتا ہے پڑا ہوتا ہے۔ اور وہ کئی ہزار روپے کی قیمت کا ہوتا ہے۔ یہاں کے لاؤڈ اسپیکر اس قیمت کے نہیں ہوتے جس قیمت کا وہاں کا وہ ہار ہوتا ہے اور وہ امام گردن میں ڈال کر نماز پڑھاتا ہے، یہاں پر یہ نہیں ہے۔ لہذا وہاں پر نماز لاؤڈ اسپیکر پر جائز و صحیح ہے۔ اور یہاں پر صحیح نہیں ہے۔ لاؤڈ اسپیکر پر نماز اسی وجہ سے یہاں کے علماء منع کرتے ہیں۔ اور ناجائز قرار دیتے ہیں۔ اور وہاں پر وہاں کے علماء منع نہیں کرتے ناجائز قرار نہیں دیتے۔ کہ یہ طریقہ نماز

ہونے کا ہے۔ شرعاً کیا حکم ہے؟

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

(۱) زید کا یہ دعویٰ ہی غلط و باطل ہے۔ لاؤڈ اسپیکر سے نماز باجماعت پڑھنے کو صرف چار شہروں پیلی بھیت، بریلی، مراد آباد، اور کانپور کے علماء منع کرتے ہیں۔ اور بمبئی، لاہور، کراچی، پشاور تمام پاکستان، مدینہ طیبہ، مکہ مکرمہ کے علماء منع نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ اس کو جائز جانتے ہیں۔ ہاں زید کا یہ دعویٰ اس وقت صحیح ہوتا کہ وہ علمائے بمبئی، پاکستان، حرمین شریفین کے جواز کے فتاویٰ پیش کرتا۔ اور جب وہ ایسا کوئی فتویٰ پیش نہ کر سکا تو اس کا یہ دعویٰ بغیر ثبوت ہوا جو قابل قبول نہیں۔ اور فی الواقع اگر اسکے جواز کا کوئی فتویٰ ہو تو اس کا علم ہوتا، نظر کے سامنے گزرتا، لیکن میں نے تو ابھی تک کسی سے سنا بھی نہیں کہ کسی مفتی نے اس کے جواز پر فتویٰ دیا ہو۔ دیوبندی جماعت ایسے فتوے لکھنے میں سبقت کیا کرتی ہے۔ لیکن ابھی تک انہوں نے بھی اس کے جواز کا کوئی فتویٰ نہیں لکھا۔ بلکہ اسکے خلاف فتاویٰ دیوبند میں یہ فتویٰ چھپا ہوا موجود ہے۔

نماز باجماعت میں آلہ مکبر الصوت (لاؤڈ اسپیکر) کا استعمال امام کی تکبیرات اور قرأت کو عام مقتدیوں تک پہنچانے کے لئے کرنا بالکل ناجائز ہے۔ اور جو لوگ تکبیر تحریمہ اس آلہ کی آواز پر کریں گے ان کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ (فتاویٰ دیوبند، ج ۸، ص ۷۰)

اور اس طرح مفتیان مظاہر العلوم، سہارنپور، اور مفتیان ڈھانیل ضلع سورت، و مفتیان مدرسہ فتح پوری و مدرسہ امینیہ دہلی نے نماز باجماعت میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ناجائز اور اسکی آواز پر اقتداء غلط اور نماز مقتدی کی فاسد قرار دی ہے۔ اور مفتی دہلی حضرت مولانا مولوی مظہر اللہ صاحب، امام مسجد فتح پوری نے تو اسکے عدم جواز پر ایسا مبسوط فتویٰ دیا ہے جو رسالہ ہو گیا جس کا نام قصد السبیل ہے۔

اس میں یہ ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ آلہ امام اور مقتدیوں کا غیر ہے۔ اور امام کا غیر مقتدی کے قول پر اور مقتدی کا غیر امام کے قول پر عمل کرنا مفسد صلوٰۃ ہے۔ پس آلہ کی آواز پر جو لوگ ارکان نماز ادا کریں گے انکی نماز نہ ہوگی۔ (قصد السبیل ص ۱۰)

اب اس سے زید کا یہ دعویٰ غلط ہو گیا کہ صرف چار شہروں پیلی بھیت، بریلی، مراد آباد، کانپور کے علماء منع کرتے ہیں، رسالہ امانت الاسلام جو کراچی میں شائع ہوا ہے اس میں ہندوستان کے شہروں سے

دہلی، سہانپور، دیوبند، ڈھابیل ضلع سورت، اجمیر شریف، کچھوچھ شریف۔ بھاوپور، مراد آباد، امردہ، تھانہ بھون کے فتوے چھپے ہیں جس میں اسکو منع کیا گیا ہے۔ تو زید کا جھوٹ کس قدر ظاہر ہو گیا، کہ صرف چار شہر کے علماء منع کرتے ہیں۔ اسی طرح اس کا یہ کہنا بھی افترا اور جھوٹ ہے کہ تمام پاکستان کے علماء اس کو جائز جانتے ہیں۔ اسی رسالہ امانت الاسلام میں ملتان، تونسہ شریف، علی پور میدان، گولڑہ شریف لاہور، کراچی، جالندھر، ڈیرہ غازی خان، راولپنڈی، لائل پور کے مفتیوں کے مطبوعہ موجود ہیں بلکہ مفتی پاکستان اور ۵۷ مفتیوں کے فتویٰ چھپ چکے جن میں انہوں نے اسکو منع کیا۔ اور مفسد نماز قرار دیا۔ تو زید کا یہ دعویٰ کہ لاہور کراچی وغیرہ تمام پاکستان کے علماء اسکو منع نہیں کرتے، کس قدر صریح جھوٹ اور جھٹا افترا اور کھلا ہوا بہتان ہے۔

اب باقی رہا اس کا حرمین شریفین کا نام لینا تو یہ بھی علمائے حرمین پر افتراء معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کا کوئی جواز کا فتویٰ ابھی تک نہ نظر سے گزرانہ سماعت میں آیا۔ اب رہا زید کا ان مقامات کے عمل سے استدلال کرنا۔ تو عمل عوام ناجائز چیز کو جائز نہیں کر دیتا۔ کتنے ناجائز امور عوام کے معمول ہیں تو وہ محض عمل عوام کے بنا پر جائز نہیں ہو جاتے، پھر زید کی ایک زبردست جہالت یہ ہے کہ پاکستان میں حکومت اسلام ہے، وہاں علماء نے منع کیوں نہیں کیا۔ اس نادان سے پوچھو کہ مفتیان پاکستان نے اسکی ممانعت میں فتوے لکھ دیئے، رسائل چھاپ دیئے، تو پھر منع کرنا کس طرح ہوتا ہے۔ ہم نے جو رسالہ امانت الاسلام کا نام پیش کیا ہے اس میں اکثر فتاویٰ علمائے پاکستان ہی کے ہیں۔ اب آفتاب سے زیادہ روشن طور پر ثابت ہو گیا کہ علمائے بریلی، مراد آباد، پبلی بھیت، کانپور، نے جس طرح لاؤڈ اسپیکر سے نماز جماعت کو منع کیا اسی طرح بکثرت علمائے ہندوستان و مفتیان پاکستان نے بھی اسکو منع کیا ہے۔ حتیٰ کہ دیوبندی جماعت نے بھی اس میں کوئی اختلاف نہیں کیا۔ تو زید سخت لغو گو، کذاب، افترا پرداز ثابت ہوا۔ مولیٰ تعالیٰ اس کو قبول حق کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) زید کا یہ قول بھی انتہائی لغو و سراسر باطل ہے کہ لاؤڈ اسپیکر پر نماز حرمین شریفین میں صحیح ہے۔ نہ حرمین شریفین میں اور نہ غیر حرمین میں۔ حکم شرع مقامات کے بدل جانے سے بدل نہیں سکتا۔ نہ لاؤڈ اسپیکر کا زائد قیمتی ہونا اور کم قیمتی ہونا شرعاً فرق کر سکتا ہے۔ ہر ذی عقل جانتا ہے۔ کہ لاؤڈ اسپیکر جس طرح یہاں مکلف انسان نہیں، اسی طرح وہاں بھی نہیں۔ جس طرح یہاں نمازی نہیں وہاں بھی نہیں۔ جس طرح یہاں آواز پہنچانے کا آلہ ہے وہاں بھی اسی طرح ہے۔ یہاں اس کی آواز پر جس طرح نماز

نہیں ہوتی وہاں بھی نہیں ہوتی۔ یہاں اقتدا کی جو علت فساد ہے وہاں بھی وہی علت فساد ہے۔ تو اب زید کا یہاں کے لاؤڈ اسپیکر میں اور وہاں کے لاؤڈ اسپیکر میں فرق کرنا جہالت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے۔ اس کا کئی ہزار روپے کا قیمتی ہونا یا امام کے گلے میں بشکل ہار لٹکا دینا کیا اسکی حقیقت بدل دے گا۔ یا اس کو از قسم معدنیات سے مکلف انسان بنادے گا۔ حاصل یہ ہے کہ یہ سب زید کی جہالت ہے۔ حکم شرع وہی ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کا نماز جماعت میں لگا دینا، حرمین شریفین اور غیر حرمین ہر مقام پر ناجائز و نادرست ہے۔ اور مقتدی کی نماز کا مفسد ہے۔ مولیٰ تعالیٰ زید کو ہدایت فرمائے۔ اور باطل کی حمایت سے حفاظت فرمائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المتقصر بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدۃ سنجل

(۲۰۷-۲۰۸)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں حضرات علمائے کرام و مفتیان شرع متین دامت برکاتہم العالیہ مسائل حسب ذیل کی بابت کہ

(۱) زید کہتا ہے بعض لاؤڈ اسپیکر اس قسم کے ہوتے ہیں جو بولنے والے کی بعینہ آواز (اصل آواز) کیج کر کے یعنی کھینچ کر دور تک پہنچاتے ہیں۔ لہذا ایسے لاؤڈ اسپیکر سے اگر نماز پڑھی جائے تو امام اور مقتدیوں کی نماز بلا کراہت جائز و صحیح ہوگی۔ کیونکہ مقتدی جو لاؤڈ اسپیکر کی آواز پر رکوع و سجود کریں گے۔ یہ آواز درحقیقت امام ہی کی آواز ہوگی۔ لہذا مقتدیوں نے امام کی بعینہ آواز پر اقتدا کی اس لئے نماز صحیح و درست ہوئی کہ لاؤڈ اسپیکر نے امام کی اصل آواز مقتدیوں تک پہنچائی ہے۔ دریافت طلب یہ امر ہے کہ زید کا قول شرعاً صحیح ہے یا نہیں؟ کیا حکم شرعی ہے؟

(۲) جو لاؤڈ اسپیکر سے نماز پڑھائے اور جو پڑھیں وہ سب مجرم شرعی اور گنہگار ہوں گے یا نہیں؟

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

تقریروں میں لاؤڈ اسپیکر کے استعمال سے یہ ثابت ہوا کہ لاؤڈ اسپیکر سے قرع اول منتقل نہیں ہوا جیسے گراموفون میں قرع اول کا انتقال نہیں ہوتا بلکہ اس سے آواز بازگشت پیدا ہوتی ہے۔ اور برقی

طاقت کی بنا پر اس کا احساس مشکل ہو جاتا ہے۔ اور جب یہ حقیقت ہے تو اس میں بعینہ اصل آواز امام کا انتقال نہیں ہوا۔ تو اب آواز اسی آلہ لاؤڈ اسپیکر کی ہوئی۔ اسی لئے تو اس کی آواز سکر ہر شخص یہی کہتا ہے کہ لاؤڈ اسپیکر بول رہا ہے۔ میں لاؤڈ اسپیکر کی آوازیں سن رہا ہوں، سنو لاؤڈ اسپیکر کی آواز آرہی ہے۔ تو آواز کی نسبت آلہ کی طرف کی جاتی ہے؟

پھر جب یہ آواز اس آلہ ہی کی ہوئی تو یقیناً یہ آلہ غیر امام ہے۔ اور غیر نمازی ہے۔ لہذا جب مقتدی نے اس آلہ کی آواز پر اقتدا کی تو اس نے غیر امام ہی کے قول پر تو عمل کیا اور غیر نمازی کے واسطے سے ارکان نماز ادا کئے۔ اور یہ امور مفسد صلوٰۃ مقتدی ہیں۔

ردالمحتار میں ہے: و کذا الاخذ ای اخذ المصلی غیر الامام یفتح من فتح علیہ مفسد۔ تو اب قول زید کا غلط و باطل ہونا ظاہر ہو گیا اور مقتدی کی نماز کا غیر صحیح و نادرست ہونا ثابت ہو گیا اور اگر فرض کر لیجئے کہ اس آلہ میں بعینہ اصل آواز امام ہی منتقل ہوتی ہے لیکن یہ بات تو مان لینی پڑے گی کہ امام کی آواز ہوا میں مکیف ہو کر اس آلہ میں پہنچی، اور اس آلہ نے اگلی ہوا میں نیا تموج پیدا کیا تو اگلی ہوا کے تموج کا سبب قریب یہ آلہ ہی تو قرار پایا۔ تو اب اس آواز کی نسبت اس آلہ لاؤڈ اسپیکر کی طرف ضرور کی جائے گی۔ نیز امام کی آواز جہاں تک پہنچی اس آلہ نے اس میں اتنا تصرف کیا کہ اب وہ آواز اس مقام پر بھی پہونچادی جہاں اصل آواز امام کسی طرح پہونچ نہیں سکتی تھی۔ تو اس لاؤڈ اسپیکر کا اتنا تصرف تو ناقابل انکار ہے۔ اور جب لاؤڈ اسپیکر کا یہ تصرف تسلیم ہے اور اس آواز کی نسبت لاؤڈ اسپیکر کی طرف صحیح ہے، تو پھر وہی نتیجہ نکلا کہ مقتدی کے حق میں غیر امام کا تصرف اور آواز واسطہ بنی۔ تو مقتدی کی نماز کے فاسد ہو جانے کے لئے اس قدر کافی ہے۔ جیسا کہ عبارت ردالمحتار سے ثابت ہو چکا۔ لہذا زید کا قول ہر طرح غلط ثابت ہوگا۔ اور لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ سے مقتدی کی نماز کسی طرح صحیح و درست ثابت نہ ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

(۲) جب لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ سے اقتدا ہی صحیح نہیں، اور مقتدی کی نماز ہی ادا نہیں ہوتی تو جو اس سے نماز پڑھائے اور جو پڑھیں وہ سب شرعاً مجرم و گنہگار ہوں گے۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

رسالہ مکبر الصوت

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الذي بين لنا احكام الدين - والصلوة والسلام على رسوله وحببيه الذي اظهر لنا مسائل الشرع المبين - وعلى آله وصحبه الذين ايدوا الاسلام بالقوة المتين وعلى المجتهدين والفقهاء الذين اسسوا الاصول للحوادث الى يوم الدين وعلى علماء امتنا العاملين والمفتيين اجمعين -

اما بعد: حمداً سके وجہ کریم کو جس نے اپنے دین کے محافظت کیے لئے مجتہدین اور فقہاء کو پیدا کیا اور صلوٰۃ و سلام اس رسول پاک صاحب لولاک پر جنہوں نے اپنی شریعت کی حفاظت کے لئے ہر صدی قرن میں ایسے مفتی اور عالم بنائے جنہوں نے ایسے فتاوے اور احکام دیئے جو ہر زمانہ میں حوادث و واقعات کے لئے مثل نص کے ثابت ہوتے ہیں۔

چنانچہ ریڈیو اور لاؤڈ اسپیکر اگرچہ نو ایجاد آئے ہیں لیکن فقہ میں انکی نظیریں آج بھی موجود ہیں رویت ہلال کے متعلق ریڈیو، وائرلیس، ٹیلی ویزن وغیرہ کے شرعی احکام میں میرا ایک مستقل و مکمل رسالہ اجمل المقال مطبوعہ موجود ہے اور لاؤڈ اسپیکر کے متعلق مستقل رسالہ یہ ہے جسکے مطالعہ کے بعد اور کسی تحقیق کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ پہلے ۴۰ء میں جب تک اس لاؤڈ اسپیکر کی معرفت اور تجربہ نہیں ہوا تھا تو اس کا نماز میں امام کے سامنے لگانا مکروہ قرار دیا گیا تھا اور صرف کراہت کا فتوے دیا گیا تھا۔ اب چونکہ اس کی مکمل تحقیق اور تجربہ ہوا تو اس کا صدا اور آواز بازگشت ہونا ثابت ہوا۔ تو اب اسکو مفسد صلوٰۃ مقتدی قرار دیا گیا۔

لہذا حکم سے پہلے یہ چند مقدمات پیش کئے جاتے ہیں تاکہ فہم جواب میں آسانی ہو اور مسئلہ میں

فاقول وبتوفیق اللہ تعالیٰ اجول:

مقدمہ اولی: لاؤڈ اسپیکر میں قرع اول بعینہ منتقل ہوتا ہے اور امام یا قائل کی اصل آواز اس آواز سے مقتدیوں یا سامعین تک پہنچتی ہے، اس دعوے پر ابھی تک کوئی دلیل شرعی قائم نہ ہو سکی۔ اور ادھر تجربہ شہد ہے کہ اگر یہ بات فی الواقع ہوتی تو اس لاؤڈ اسپیکر میں بولنے والے کی آواز پہچان لی جاتی اور آواز ممتاز ہو جاتی لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ بسا اوقات معرفت آواز میں غلطی ہو جاتی ہے۔ تو ثابت ہو گیا کہ یہ آلہ اصل آواز کو اخذ کر کے اپنے خصوصیات سے متکیف کر کے آواز کا اعادہ کرتا ہے۔ چنانچہ نغمہ والی آواز اور بے نغمہ والی آواز اس میں ایک سی معلوم ہوتی ہے۔ رہا اسکا آواز کو بلند کر دینا تو یہ مسلم ہے۔ تو اسکی مثال اس طرح ہے جیسے کسی نے گیند کو پھینکا کچھ اوپر جا کر محرک اول کی تحریک کمزور ہو گئی۔ تو اس میں کسی نے ٹھوکر لگا دی تو اس ٹھوکر سے اسکی حرکت ضرور قوی ہو جائے گی اور وہ بجائے دس گز کے بیس گز تک پہنچ جائے گی۔ تو اس کا ۲۰ گز تک پہنچ جانا یہ محرک اول کی حرکت سے نہیں ہوا بلکہ محرک ثانی کی ٹھوکر سے ہوا۔ ابھی چند سال ہوئے کہ جامع مسجد بریلی میں ایک جلسہ تھا جس میں یہ لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا اور اس میں کافی تعداد میں علمائے کرام تھے۔ جن میں حضرت مفتی اعظم فقیہ لاٹانی مولانا مولوی شاہ الحان مصطفیٰ رضا خان صاحب ضرور قابل ذکر ہیں۔ تو یہ لاؤڈ اسپیکر واعظ کے الفاظ اور جملوں کا اسکے بعد اعادہ کرتا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر میں اعادہ کراتا اور تخت پر بیٹھنے والے دو ہر ایمان سن رہے تھے۔ میں نے یہ احباس کر کے علمائے کرام سے عرض کیا کہ اسوقت ثابت ہو گیا کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز صدا اور آواز بازگشت ہے۔ سب نے بالاتفاق اسکو تسلیم کیا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز صدا اور آواز بازگشت ہے۔

مقدمہ ثانیہ: جب مقدمہ اولی سے یہ ثابت ہو چکا کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز صدا اور آواز بازگشت ہے تو فقہ میں صدا کے احکام موجود ہیں۔

چنانچہ آیت سجدہ اگر صدا سے سنی جائے تو سامع پر سجدہ تلاوت واجب نہیں۔

تنویر الابصار میں ہے:

لا تجب بسماعہ من الصدا۔ صدا سے آیت سجدہ سننے سے سجدہ تلاوت واجب نہیں ہوتا۔

(از شامی ص ۵۴۰ ج ۱)

مراقی الفلاح میں ہے: لا تجب بسماعہا من الصدا وما هو یجیبك مثل صوتك فی الجبال والصحاری ونحوها۔ (طحاوی ص ۲۸۱)

صدا سے اور اس سے جو بھی آواز لوٹا دے جیسے پہاڑوں اور جنگلوں میں تو ان سے آیت سجدہ سننے سے سجدہ تلاوت واجب نہیں ہوتا۔

طحاوی ہلی مراقی الفلاح میں ہے:

فانہ لا اجابة فی الصدی وانما هو محاكاة۔ (طحاوی ص ۲۸۱)

غنیۃ شرح منیہ میں ہے: ولو سمعہا من الطائر او الصدی لا تجب لانه محاكاة وليس بقراءة۔ (غنیۃ ص ۴۶۸)

اگر آیت سجدہ کو پرندے یا صدا سے سنا تو سجدہ تلاوت واجب نہیں اس لئے کہ یہ آواز حکایت ہے قرأت نہیں ہے۔

در المنقذ میں ہے: لا تجب علیہ لو سمعہا من طائر او صدى۔

(حاشیہ مجمع الانہر مصری ص ۱۵۶ ج ۱)

اگر آیت سجدہ کو پرندے یا صدا سے سنا تو سننے والے پر سجدہ تلاوت واجب نہیں۔

ان عبارات فقہاء سے ثابت ہو گیا کہ صدا کی آواز کو فقہاء نے معتبر نہ مانا اور اس سے سجدہ تلاوت واجب نہیں کیا۔ تو مقتدی کے حق میں لاؤڈ اسپیکر کی صدا کیسے معتبر و کافی قرار دی جاسکتی ہے۔

مقدمہ ثالثہ: نماز میں خشوع کا حاصل ہونا اشد ضروری ہے۔ طحاوی میں ہے:

الخشوع حضور القلب وتسکین الجوارح والمحافظة علی الارکان۔

(طحاوی ص ۲۰۱ ج ۱)

خشوع قلب کا حاضر رہنا اور جوارح کا ساکن ہونا اور ارکان صلوٰۃ کی حفاظت کرنا۔

شامی میں ہے:

مبنى الصلوٰۃ على الخشوع والخشوع الذى هو روح الصلوٰۃ۔

مراقی الفلاح میں ہے:

نماز کی بنیاد خشوع پر ہے، اور خشوع نماز کی روح ہے۔

خشوع کا لحاظ جب نماز میں اس قدر ضروری ہے کہ وہ روح نماز اور مبنی صلوٰۃ ہے تو کون نہیں جانتا ہے کہ امام پر لاؤڈ اسپیکر کی پابندی ضرور خشوع کی منافی ہے۔ مقررین کو اس کی پابندی کبھی ایسی مشغول کر لیتی ہے کہ انھیں اپنی تقریر پوری کرنے کیلئے کبھی اس کو سامنے سے ہٹانا پڑ جاتا ہے۔ تو امام پر اس کی پابندی کس قدر شغل قلب اور نماز کے منافی ہوگی۔ تو اس لاؤڈ اسپیکر کا امام کے سامنے لگانا روح نماز اور مبنی صلوٰۃ کے خلاف ہے۔

مقدمہ رابعہ: جو چیز خشوع قلب کو زائل کرے وہ نماز میں مکروہ تحریمی ہے۔

بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے ایک منقش چادر میں نماز ادا فرمائی اور اسکو بعد نماز واپس کر دیا۔

قال النبی ﷺ كنت انظر الى علمها وانا في الصلوٰۃ فاخاف ان يفتنني۔

(بخاری ص ۱۷۵۴ ج ۱)

یعنی میں اس حدیث کے تحت میں فرماتے ہیں:

فيه طلب الخشوع في الصلوٰۃ والاقبال عليها ونفي كل ما يشغل ويلهي عنه۔

(یعنی ص ۲۵۹ ج ۲)

مراقی الفلاح میں ہے:

وتكره بحضرة كل ما يشغل البال كزينة وبحضرة ما يخل بالخشوع۔

(طحاوی ص ۲۰۱)

کبیری میں ہے:

فان كان اجنبيا من الصلوٰۃ ليس فيه تتميم لها ولا فيه دفع ضرر فهو مكروه

كاللعب بالاثوب او البدن و كل ما يحصل بسببه شغل القلب۔ (کبیری ص ۳۳۴)

ردالمحتار میں ہے:

منها الصلوٰۃ بحضرة ما يشغل البال ويخل بالخشوع۔ (ردالمحتار ص ۲۵۹ ج ۱)

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ ہر وہ چیز جس سے شغل قلب ہو اور دل میں تشویش ہو اور خشوع زائل ہو وہ نماز میں مکروہ تحریمی ہے۔ اس سے اجتناب و احتراز ضروری ہے۔ لہذا لاؤڈ اسپیکر کے نماز میں لگانے سے ظاہر ہے کہ شغل قلب اور تشویش ہوگی اور خشوع زائل ہوگا۔ تو اس کا نماز میں لگانا کم از کم مکروہ تحریمی ہے اور منافی نماز ہے۔

مقدمہ خامسہ: ظاہر ہے کہ یہ لاؤڈ اسپیکر جب نماز میں امام کے سامنے لگایا گیا تو یہ نہ امام ہے نہ اس کا مقتدی کہ اس میں شرائط امام و مقتدی نہیں پائے جاتے۔ تو یہ اجنبی ہو اور بقول استعمال کرنے والوں کے امام کی تکبیرات کا مقتدیوں تک پہنچانے والا واسطہ ہوا۔ گویا یہ مقتدیوں کے حق میں مبلغ تکبیرات امام قرار پایا۔ اور فقہائے کرام نے مبلغ کیلئے کچھ شرائط و احکام مقرر فرمائے ہیں۔

(۱) مسلم ہو۔ (۲) مکلف ہو۔ (۳) پابند شرع ہو۔ (۴) متصف بعبادت یعنی نمازی ہو۔

(۵) صاحب قصد و ارادہ ہو۔ (۶) اور وہ تبلیغ انتقالات بھی بقصد احرام کرتا ہو۔ یہاں تک کہ اگر مبلغ نے بقصد احرام تبلیغ نہیں کی بلکہ محض تبلیغ کیلئے آواز پہنچائی تو نہ خود اسکی نماز صحیح نہ اسکی تبلیغ پر جو لوگ انتقالات کرنے والے ہیں نہ انکی صحیح ہے۔

چنانچہ ردالمحتار میں ہے:

وكذا لك المبلغ اذا قصد التبليغ فقط خاليا عن قصد الاحرام فلا صلوٰۃ له ولا عن

بند ہو جانے کا خطرہ غالب ہے۔ علاوہ بریں اسکی تبلیغ مفسد صلاۃ بھی ہے تو ایک سنت قدیمہ اور سہل الحصول خالی از خطرات کو چھوڑ کر بلا ضرورت شرعی کے ایسی بدعت کو جو مشکل الحصول پر از خطرات کو اختیار کرنا بلکہ اس کو ترجیح دینا کوئی فقہ دانی ہے۔ کہ اس میں ترک سنت لازم آئے۔ بدعت کو رائج کیا جائے۔ لوگوں کو پریشانی میں مبتلا کیا جائے۔ انکی نمازوں کو فاسد کیا جائے۔ لہذا شریعت بمقابلہ سنت قدیمہ اقامت مکبرین کے موجود ہوتے ہوئے اس بدعت استعمال لاؤڈ اسپیکر کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتی۔ تو لاؤڈ اسپیکر کو نماز میں ہرگز استعمال نہ کیا جائے۔

ان مقدمات پر غور کرنے کے بعد مسئلہ کا جواب واضح ہو گیا کہ نماز میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ناجائز و بدعت ہے۔ اور جو لوگ اس کی آواز پر اقتدا کرتے ہیں ان کی نماز صحیح نہیں ہوتی بلکہ فاسد و باطل ہو جاتی ہے۔ اور اس کا نماز میں استعمال نماز کی بنیاد اور اس کی روحانیت کے خلاف اور منافی ہے۔ اب باقی رہا اذان کا حکم تو چونکہ اذان میں مقصود اعظم اعلام ہے۔

شامی میں ہے: ان الاصل فی مشروعیۃ الاذان الاعلام لدخول الوقت۔

تو جب اذان کی مشروعیت ہی اعلام کے لئے ہے اور اس لاؤڈ اسپیکر میں اعلام علی وجہ الکمال ہے لہذا جب اس میں کوئی محذور شرعی لازم نہیں آتا ہو اور ضرورت مقتضی ہو تو اس کا اذان میں استعمال جائز ہوا، اگر کوئی محذور شرعی لازم آئے تو اس کا استعمال نہ کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہجل

مسئلہ

(۴۰۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ نماز کے واسطے اگر دوہرا یعنی دو جا نماز بچھائے تو نماز میں کوئی کراہیت نہ ہوگی۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ نماز نہیں ہوتی ہے۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علی رسولہ الکریم

دو جا نمازوں کے بچھالینے سے کسی طرح کی کراہت پیدا نہیں ہوتی۔ اور جب کراہت ہی اس میں نہیں تو نماز کے نہ ہونے کا خطرہ ہی پیدا نہ ہوا۔ تو جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس سے نماز نہیں ہوتی انکا یہ حکم غلط ہے۔ یہ بیچارے مسائل دین سے ناواقف ہیں اسی بنا پر ایسی غلط بات کہہ رہے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہجل

مسئلہ

(۴۱۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس بارے میں کہ ایک امام صاحب ۴ رمضان المبارک نماز تراویح کے وتروں کی رکعت میں بغیر دعائے قنوت پڑھے رکوع میں جھک گئے۔ لیکن امام صاحب کو فوراً خیال آ گیا۔ اور کھڑے ہو کر دعائے قنوت پڑھی لی اور سجدہ سہوا داکر لیا بعدہ سلام پھردیا۔ سوال یہ ہے کہ وتر ہو گئے یا نہیں؟

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علی رسولہ الکریم

صورت مسئلہ میں امام کو رکوع میں پہنچ جانے کے بعد قیام کی طرف نہ لوٹنا تھا وہ آخر میں سجدہ سہو کر لیتا تو ترک دعائے قنوت کا نقصان پورا ہو جاتا و تراویح ادا ہو جاتے، لیکن جب امام غلطی سے قیام کی طرف لوٹ ہی گیا اور آخر میں اس نے سجدہ سہو بھی کر لیا تو وہ وتر بلا شک ادا ہو گئے۔ کہ سجدہ سہو کی غرض ہی اسی قسم کی غلطیوں کی اصلاح کرنا ہے۔ رد المحتار میں ہے۔ لانه لا صلاح ما فات ای ماترك من الواجبات

فی محلہ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۴۱۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ

اکثر اشخاص مسجد کے دروں میں نماز پڑھتے ہیں۔ اور جمعہ کی نماز میں بالخصوص قلت جگہ کے باعث نماز کو کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آیا امام جماعت کو ہی مسجد کے در میں نماز پڑھنا جائز ہے یا مقتدیوں کو بھی۔ یا مسجد کے دروں کی کتنی چوڑائی نماز پڑھنے کے لئے درکار ہے۔ اکثر دروں کی محراب نہیں ہوتی اس میں بھی ہر جامع مسجد میں اکثر دروں میں نماز پڑھتے ہیں۔ اس کی بابت شریعت کے کیا احکام ہیں؟۔

ح۔ م۔ اشرفی ۲۵ اکتوبر

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بلا ضرورت مسجد کے دروں میں نماز پڑھنا خلاف اولیٰ و مکروہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

﴿۲۵﴾

باب الجمعة**مسئلہ**

(۴۱۲-۴۱۳-۴۱۴-۴۱۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسئلہ نماز جمعہ کے متعلق جو ذیل میں درج ہیں۔
جواب اس کا مع حوالہ کتب معتبرہ مرحمت فرمایا جائے۔

(۱) آیا نماز جمعہ کی ادائیگی میں خطبہ ہونا ضروری ہے یا واجب یا سنت موکدہ یا غیر موکدہ یا مستحب ہے؟۔

(۲) آیا نماز مذکور میں خطبہ نہ پڑھا جائے تو نماز کی ادائیگی میں کچھ فرق آئے گا یا نہیں؟۔

(۳) آیا خطبہ کا نماز جمعہ سے پہلے ہونا ضروری ہے یا بعد میں بھی ہو سکتا ہے اور پیش امام اور خطیب کا ایک ہونا ضروری ہے یا علیحدہ علیحدہ بھی ہو سکتے ہیں؟۔

(۴) جو نماز بکراہت تحریمی ادا ہوئی تو اس کا اعادہ ضروری ہے یا نہیں؟۔ بینوا تو جروا۔

از بھوپال وکیل عدالت

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) خطبہ نماز جمعہ کے لئے فرض ہے۔ اسی لئے شرائط جمعہ میں اس کا شمار ہے۔

تنویر الابصار میں ہے۔ والرابع الخطبة۔

یعنی چوتھی شرط صحت جمعہ کی خطبہ ہے۔ اور اس سے واضح تصریح درمختار میں ہے:

(و کفت تحمیدہ و تہلیلہ او تسبیحہ للخطبة) المفروضة مع الکراهة۔

یعنی کافی ہے خطبہ فرض کے لئے ایک بار "الحمد لله يا لا اله الا الله يا سبحان الله" کہنا مگر انھیں الفاظ پر اکتفا کرنا مکروہ ہے باوجودیکہ فرضیت ادا ہو جائے گی۔ کیونکہ سنت یہ ہے کہ دو خطبے پڑھے جائیں۔ جیسے تنویر الابصار میں ہے: ویسن خطبتان بجلسة بینہما۔

اور مسنون ہیں دو خطبے مع ایک جلسہ کے ان کے درمیان میں۔
لہذا نفس خطبہ جمعہ کے لئے فرض ہوا۔

(۲) جب خطبہ نماز جمعہ کی صحت کے لئے شرط ہے۔ جیسا کہ تنویر الابصار اور اس کی شرح میں ہے۔ ویشترط لصحتها سبعة اشياء۔ یعنی جمعہ کی صحت کے لئے سات چیزیں شرط ہیں اور مجملہ ان کے چوتھی شرط جمعہ کی خطبہ ہے۔ تو جمعہ بغیر خطبہ کے ہرگز نہ ہوگا۔ کیونکہ شرط کی نفی سے مشروط کی نفی ہوتی ہے۔ درمختار میں ہے: فلو خطب قبله و صلى فيه لم تصح۔

یعنی اگر کسی نے خطبہ وقت سے پہلے پڑھ لیا اور نماز وقت میں پڑھی تو جمعہ درست نہیں ہوگا۔ لہذا جمعہ کی صحت کے لئے خطبہ کا ہونا ضروری ہے۔

(۳) خطبہ قبل نماز ہی ہوگا۔ درمختار میں ہے: والخامس كونها قبلها لان شرط الشيء سابق عليه۔

یعنی پانچویں شرط صحت جمعہ کی خطبہ کا نماز جمعہ سے پہلے ہونا ہے۔ اس لئے کہ شرط چیز کی اس سے پیشتر ہوا کرتی ہے۔ رہا پیش امام اور خطیب کا ایک ہونا تو یہ کوئی شرط نہیں ہے۔ اسی میں ہے:

لا يشترط اتحاد الامام والخطيب۔ یعنی خطبہ پڑھنے والے اور نماز پڑھانے والے کا ایک ہونا شرط نہیں ہے۔ علاوہ بریں علامہ ترمذی صاحب تنویر الابصار نے اس کی اور زیادہ تصریح فرمائی ہے:
لا ينبغي ان يصلى بالقوم غير الخطيب فان فعل بان خطب صبي باذن السلطان و صلى بالغ جاز۔

یعنی مناسب نہیں کہ سوائے خطبہ پڑھنے والے کے دوسرا شخص آدمیوں کو نماز پڑھائے۔ پس اگر ایسا کیا جائے کہ امام جدا ہو اور خطیب جدا اس طرح کہ خطبہ ایک نابالغ لڑکا سلطان کی اجازت سے پڑھے اور نماز کوئی بالغ پڑھائے تو جائز ہے۔ صاحب درمختار لفظ جائز کے بعد لکھتے ہیں: وهو المختار۔ یعنی یہی قول علماء کا اختیار کیا ہوا ہے۔ لہذا بنا بر مذہب مختار کے امام اور خطیب علیحدہ علیحدہ ہو سکتے ہیں اور ہرگز اس نماز میں کسی قسم کی کراہت یا خرابی نہیں ہوگی۔

(۴) شامی وغیرہ نے تصریح کر دی ہے کہ جو نماز بکراہت تحریمی ادا کی گئی ہو اس کا اعادہ واجب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

از محلہ چین سرائے سنجل

(۴۱۶)

مسئلہ

نحمدہ ونصلی علی رسول کریم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین درمیان خطبے میں اردو نظم کا پڑھنا ممنوع ہے یا نہیں؟

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

خطبہ غیر عربی میں پڑھنا خلاف سنت ہے، اب چاہے وہ اردو زبان میں ہو یا فارسی میں۔ اب رہی نظم اس کو علمائے کرام خود زبان عربی میں بھی پسند نہیں کرتے۔ چہ جائیکہ کسی اور زبان میں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۴۱۷) از گوالیار۔ قاسم جی، جان جی صاحب

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین وحامیان شرع متین ان مسائل میں کہ

جودونوں خطبہ کے درمیان علمائے سلف نے بروز جمعہ یا عیدین زبان اردو یا فارسی میں نظم اشعار وغیرہ پڑھنے کے لئے ترتیب وار لکھے ہیں اور لوگ پڑھتے آئے ہیں۔ اور اب بھی پڑھتے ہیں لیکن کہیں کہیں روک تھام ہونے کی وجہ سے زمانہ حال میں اختلاف ہو رہا ہے۔ کوئی خلاف سنت اور کوئی کچھ کہتا ہے۔ بالخصوص مولانا اشرف علی تھانوی بہشتی زیور، حصہ یازدہم، ص ۶۵ میں تحریر فرماتے ہیں کہ ”دونوں خطبوں کا عربی زبان میں ہونا اور کسی اور زبان میں پڑھنا یا اس کے ساتھ کسی اور زبان کے اشعار وغیرہ ملا دینا جیسا کہ ہمارے زمانہ میں بعض عوام کا دستور ہے خلاف سنت مؤکدہ اور مکروہ تحریمی ہے“ کیا یہ ارشاد آپ کا ہی ہے اور اسی صفحہ میں وعظ اور نصیحت کا خطبہ میں ہونا مسنون فرماتے ہیں۔ تو کیا وعظ مرہبہ زبان میں ہونا چاہئے یا عربی زبان میں؟ اگر مولوی صاحب کا یہ ارشاد بالاطحیک ہے تو خیال پیدا ہو تا ہے کہ مجموعات خطبات تصنیفات علمائے دین بڑے مفسرین زمانہ سابقہ کی ہوئی موجود ہے جس میں دونوں خطبوں کے درمیان نظم اردو پڑھنے کے لئے لکھے ہوئے ہیں تو کیا اعلیٰ درجہ کے مفسرین

شریعت سے بے خبر تھے یا کہ انھوں نے غلطی کی ہے؟ اور اگر خلاف سنت تھا تو اسی وقت کیوں نہ روکا گیا؟ مکروہ تحریمی فعل حرام اور خلاف سنت مؤکدہ کا کرنے والا گنہگار ہوتا ہے تو کیا علمائے دین سابقین سب کے سب گنہگار اور سزاوار ہوئے؟ اور جواب بھی خطبوں میں اردو نظم پڑھتے ہیں مستوجب سزا کے ہوتے ہیں؟

اگر مولوی صاحب موصوف کا قول غلط ہے تو جو اس آپ کی تصنیف مثلاً حفظ الایمان، اصلاح الرسوم، تعلیم الدین وغیرہ پر اعتماد رکھے اور نظم پڑھنے سے روک دیوے اور اذان میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نام کو بوسہ نہ دیوے اور دوسروں سے فرض واجب کی دلیل طلب کرے اور قبر کی مٹی جو میت کو لحد میں رکھ کر ایصال ثواب کے لئے دی جاتی ہے روک دیوے۔ غرض کہ جتنے کام علمائے دین نے ایصال ثواب کے لئے مروجہ کئے ہوئے ہیں سب کی ممانعت کرے اور جدید طریقہ رائج کرے اور قدیم کو چھڑا دے۔ تو ایسے شخص کا کیا مذہب ہے اور شریعت میں اس کا کیا حکم ہے اور اس کی امامت جائز ہے یا نہیں؟ اور جس جگہ زبان عربی کو کوئی نہ سمجھتا ہو خطیب تو درکنار سامعین اور مانعین بھی عربی کے مترجم نہ ہوں تو ایسے دیہات میں دونوں خطبہ عربی زبان میں پڑھ دینے سے خطبہ کی ایجاد کا مقصد ادا ہو سکتا ہے، اور خطبہ میں نظم کا رواج کب سے ہوا ہے اور کیوں ہوا؟ اس کی ضرورت تھی جو علمائے دین نے رائج کی اور بہ نسبت حال زمانہ کے وہ زمانہ علم اور دیانت داری میں کیسا ہے؟ اور از روئے خبر اس زمانہ سے بہتر تھا یا نہیں؟ اور اس زمانہ کو اجماع امت مانا جائے گا یا نہیں؟ بینوا تو جو را

حضرت جو کچھ بانکا تر چھا آیا وہی تباہی لکھ کر پیش خدمت عالیہ میں گزارش کر دیا ہے، آپ حضرات مقصد ضروریہ کو مد نظر رکھ کر فتاویٰ عنایت فرما کر مشکور فرمائیں گے۔ یہاں پر ایسا موقع ہے کہ اگر نظم کے جواز کا فتویٰ مل گیا تو وہابیہ کا اعتقاد سب غلط مانا جائے گا ورنہ برعکس۔ اس مناظر کے گرد و توابع میں کیا دیہات کیا شہر چاروں طرف نظم پڑھی جاتی ہے اور یہاں بھی پڑھی جاتی ہے، لیکن چند ماہ سے نئی روشنی والوں کی سازش سے روک دی گئی ہے۔ لہذا فتویٰ کی ضرورت ہے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

احکام شرع دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ ہیں کہ جن کو عقائد سے تعلق ہے اور ان کو اعتقادات کہتے ہیں۔ اس میں جو شخص مخالفت کرے گا وہ گمراہ، بددین ہو جائے گا۔ دوسرے وہ ہیں جو عمل سے تعلق رکھتے

ہیں ان کو شریعات کہا جاتا ہے۔ ان کے اختلاف سے کفر یا گمراہی یا بد مذہبی پیدا نہیں ہوتی۔ وہابیہ سے جو ہمارا اختلاف ہے وہ عقائد کے اعتبار سے ہے۔ وہ سید عالم نور مجسم فخر بنی آدم نبی مکرم رسول معظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخیاں اور بے ادبیاں کرتے ہیں، چھاپتے ہیں، شائع کرتے ہیں، اور مسائل شرعیہ عملیہ میں یعنی حلت و حرمت میں اگر ان کا ہمارا کہیں اتفاق ہو جائے تو وہ اتفاق ہمارے لئے کوئی مضرت نہیں ہے، ہم پر یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ان کی ہر بات میں خلاف کریں۔ چنانچہ اگر وہ نماز عصر میں چار رکعتیں بیان کرتے ہیں تو ہم ان کی مخالفت میں پانچ یا تین رکعتیں کہنے لگیں۔ یا وہ زنا کو حرام کہتے ہیں تو ہم ان کی مخالفت میں اس کو حلال کہنے لگیں۔

خلاصہ کلام کا یہ ہے کہ اس مسئلہ میں اگر وہ ہمارے موافق ہیں تو اس سے ان کے مذہب کی حقانیت ثابت نہیں ہوتی، نہ ان کو اس پر سنیوں سے کچھ کہنے کا حق ہے، اور نہ سنیوں کو خواہ مخواہ ان کی مخالفت کرنی روا ہے۔

اب اصل مسئلہ کے جواب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں کہ مسائل شریعت کے دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ ہیں کہ جن کی علت اور غرض تک ہماری عقل کو رسائی ہو جاتی ہے۔ مثلاً شراب کی حرمت اس وجہ سے ہے کہ اس میں نشہ ہے۔ اب اس علت کی وجہ سے ہم ہر اس چیز کو حرام کہہ دیں گے جس میں نشہ ہو۔ دوسرے وہ کہ جن کی علت و غرض تک ہماری عقل کو رسائی نہیں ہو سکتی ہے۔ مثلاً کسی شخص کی پشت میں پھوڑا ہے اور اس سے خون بہا اور اب شریعت اس کے لئے وضو کرنے کا حکم دیتی ہے۔ اب یہ بالکل عقل کے خلاف ہے کہ خون تو کہیں سے نکلے اور دھونے کا حکم دوسرے حصہ کو دیا جائے۔ لہذا اس بارے میں تمام علماء یہی لکھتے ہیں کہ اس کو بے تکلف جیسا شریعت نے بیان فرمایا ہے ہم تسلیم کر لیں گے۔ اپنی عقل سے اس میں تبدیلی اور تغیر ہرگز نہ کر سکیں گے۔ بالجملہ خطبہ کا عربی میں پڑھا جانا حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے زمانہ سے آج تک برابر ہر ملک اور ہر اقلیم میں جاری ہے۔ باوجود کہ دور صحابہ میں عرب کے علاوہ عجمیوں میں جمعہ قائم کر دیئے اور وہ عربی ہی پڑھے جاتے تھے باوجودیکہ وہ لوگ عربی زبان نہیں جانتے تھے۔ لیکن اس وقت یہ سوال نہیں اٹھا کہ خطبہ میں ہر ملک کی زبان شامل کر دی جائے، نہ پہلے ائمہ نے اس ضرورت کو محسوس کیا، نہ اور ہر صدی کے علماء نے اس کی اہمیت محسوس کی۔ آج چند برس سے کوتاہ اندیشوں اور سادہ لوحوں نے بغیر کسی عالم کے فتوے کے خود بخود اپنی طرف سے اردو، فارسی کے اشعار عربی خطبہ میں شامل کر دیئے ہیں اور اس وقت ہر جگہ سے یہی سوالات آرہے ہیں کہ خطبہ بالکل اردو میں

ہونا چاہئے اور حقیقت یہ ہے کہ خطبہ میں اردو یا فارسی زبان کو عربی میں شامل کرنا خلاف سنت متواتر ہے۔ چنانچہ حاشیہ شرح وقایہ میں ہے۔

لا شك ان قراءة الخطبة بغير العربية خلاف السنة المتوارثة من النبي صلى الله تعالى عليه وسلم والصنحابة رضوان الله تعالى عليهم اجمعين فيكون مكروها تحريما وكذا قراءة اشعار الفارسية والهندية فيها۔

یعنی بیشک خطبہ میں عربی کا پڑھنا حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی سنت کے خلاف ہے۔ پس مکروہ تحریمی ہوا اور ایسے ہی خطبہ میں فارسی اور ہندی کے اشعار کا پڑھنا۔

علاوہ بریں اس کے جواز کی اجازت دینے میں جو آئندہ نقصانات ہیں ان کا لحاظ رکھنا علماء کے لئے بہت ضروری ہے۔ عوام کو ان پر کیونکہ اطلاع نہیں ہے اس لئے وہ خواہ مخواہ اس مسئلہ کے لئے جبر کر تے ہیں۔ ہاں خطبہ کے مضمون کو بطریقہ وعظ بعد نماز جمعہ یا خطبے سے پہلے بیان کرنے کی اجازت ہے۔ اگر اس کی کافی تحقیقات دیکھنی ہو تو سنی کتب خانہ سے رسالہ ”السنية السنية في كون الخطبة بالعربية“ منگا کر ملاحظہ کیجئے۔

اور ان تھانوی صاحب پر علمائے عرب و ہند نے اسی ”حفظ الایمان“ وغیرہ کی عبارتوں پر کفر کے فتوے دیئے ہیں۔ لہذا ان کی کتابیں، ان کے مسائل، ان کے فتوے، ہرگز قابل عمل نہیں۔ خود ان کے پیچھے یا باوجود ان کی کتابوں پر مطلع ہونے کے جو ان کو صحیح عقیدہ پر جانے اس کی اقتدا کرنا اور اس کو امام بنانا ہرگز جائز نہیں۔ اور نام اقدس پر اذان میں انگوٹھے چومنا۔ یا قبر میں قل کئے ڈھیلے رکھنا۔ یا ایصال ثواب کے کام کرنا بالکل جائز ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: ۱۔ مقتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنہجل

(۲۱۸)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ اگر کوئی شخص کسی موقع پر کسی ذکر خیر یا کہیں مجمع میں کوئی بات بیان کرے تو اس وقت از روئے نصیحت کہ ہاتھ کے اشارہ سے سمجھانا اور بتلانا جائز ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم
وعظ یا خطبہ کی حالت میں فقط شہادت کی انگلی کے ساتھ اشارہ تو خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فعل سے ثابت ہے چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں بروایت مسلم شریف یہ حدیث مروی ہے
عن عمارة ابن زویب انه رای بشیر ابن مروان علی المنبر رافعا یدیه فقال قبح الله هاتین العبدین لقد رأیت رسول الله صلی الله تعالیٰ علیہ وسلم ما یزید علی ان یقال بیده هكذا او اشار باصبعه المسبحة۔

یعنی حضرت عمارہ ابن زویب سے مروی ہے کہ انہوں نے بشیر ابن مروان کو منبر پر ہاتھ اٹھائے ہوئے دیکھ کر کہا: اللہ تعالیٰ ان دونوں ہاتھوں کو ہلاک کرے، میں نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ نہیں زیادہ فرماتے کچھ فرماتے وقت مگر اپنے ہاتھ کے ساتھ اس طرح۔ پھر انہیں حضرت عمارہ نے اپنی انگشت شہادت کے ساتھ اشارہ کر کے دکھایا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: ۱۔ مقتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنہجل

(۲۱۹)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسائل ذیل میں
امام نے خطبہ پڑھا اور جب پڑھ چکا دوسرے شخص سے کہا آپ نماز پڑھائیے۔ اس شخص نے کہا خطبہ دوبارہ پڑھوں گا ورنہ نماز نہیں ہوگی، امام نے کہا کہ اگر دوبارہ پڑھوں گا تو گنہگار ہوں گا ان دو میں کون صحیح پر ہے؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم
امام اور خطبہ پڑھنے والے کا ایک ہونا ضروری نہیں۔ چنانچہ در مختار میں ہے:
لا یشرط اتحاد الامام والخطیب۔

طحاوی میں قتیہ سے ناقل ہیں: اتحاد الخطیب والامام لیس بشرط علی المختار نہر
لہذا صورت مسئلہ میں دوبارہ خطبہ پڑھنے کی ضرورت نہیں پہلا خطبہ کافی ہے۔

مسئلہ

(۲۲۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ امام جمعہ کے دن خطبہ پڑھ کر پہلے نماز کے یعنی خطبہ اور نماز کے درمیان میں بات چیت کر سکتا ہے یا نہیں مینو تو جروا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

خطبہ اور نماز کے درمیان دنیوی کلام کرنا مکروہ ہے۔ چنانچہ جو ہرہ نیرہ میں ہے:

اما المتعلق بامور الدنيا مکروه اجماعا و هكذا کله قبل الخطبة او بعدها

اور اسی طرح در مختار اور سر ارج اور بحر اور عنایہ اور نہایہ وغیرہا میں ہے۔ اب رہا کلام وافر تو اس

میں بھی امام صاحب کا یہی مسلک ہے کما هو عامة الكتب۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،

العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۲۱ھ

(۲۲۱-۲۲۲)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) سنت اخر ظہر کے پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ مولوی اشرف علی صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اخیر الظہر پڑھنا جائز نہیں۔ اور بہت کہتے ہیں کہ گاؤں میں پڑھنا چاہئے شہر میں نہیں، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ مثل نفل کے ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ مثل واجب کے ہے، ان میں کس کا قول صحیح ہے؟ اس مسئلہ میں بہت اختلاف ہو رہا ہے اب عرض یہ ہے کہ اس مسئلہ کی پوری تحقیق کر دی جائے اور ساتھ ہی ساتھ دلیلیں بھی نقل کر دیں جائیں اور ترجمہ اردو میں ہو۔

(۲) عید گاہ میں جمعہ کی نماز پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر عید گاہ سے ایک سو (۱۰۰) ہاتھ پر مسجد بھی ہو جب کہ سال گذشتہ عید الفطر جمعہ کے دن ہوئی اور اسی جگہ چار مسجد کے لوگ عید گاہ میں جمع ہوئے اور چاروں مسجدیں عید گاہ سے قریب ہیں کوئی ایک سو (۱۰۰) ہاتھ فاصلہ پر، کوئی تین سو ہاتھ فاصلہ پر، کوئی پانسو ہاتھ فاصلہ پر، اس صورت میں جمعہ کی نماز عید گاہ میں پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟۔ مینو تو جروا

العبد المذنب عبد الکریم خاں ضلع ہوشنگ ملک بنگال

الجواب

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

(۱) اقول وبالله التوفیق۔ ایسی آبادی جس میں چند محلے ہوں اور بازار بھی ہوں اور اس میں کوئی ایسا با اختیار کلم بھی ہو کہ مظلوم کا ظالم سے انصاف لینے پر قدرت رکھتا ہو اور جس کے متعلق کچھ دیہات بھی ہوں، اس کو بنا بر قول صحیح کے مصر کہتے ہیں۔ اور ہمارے عرف کی بنا پر وہ آبادی ضلع تحصیل یا پرگنہ کہلاتی ہے۔

چنانچہ غنیہ میں ہے:

صرح به فی تحفة الفقهاء عن ابی حنیفة انه بلدة كبيرة قیها سکک واسواق ولها رساتیق ومیها وال یقدر علی انصاف المظلوم من الظالم بحشمه وعلمه او علم غیره جمع الناس الیه یمایقع من الحوادث وهذا هو الاصح۔

تحتہ الفقہاء میں امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے تصریح ہے کہ مصر وہ بڑی آبادی ہے جس میں متعدد محلے اور بازار ہوں اور اس کے متعلق دیہات ہوں اور اس میں شہر کا حاکم ہو اپنی شوکت اور اپنے یاد دوسرے کے علم کے ذریعہ سے مظلوم کا انصاف ظالم سے لینے پر قادر ہو، لوگ اس کے یہاں نالاش میں رجوع کرتے ہوں اور یہی تعریف سب سے زیادہ صحیح ہے اور اسی تعریف کو بحر الرائق اور بدائع اور عینی شرح کنز الدقائق وغیرہ کتب فقہ نے اصح قول قرار دیا ہے۔ اور قریہ جات یعنی ان آبادیوں میں جہاں یہ مصر کی تعریف بالیقین صادق نہیں آتی وہاں جمعہ پڑھنے سے ظہر کی فرضیت ذمہ ہی باقی رہتی ہے۔ چنانچہ عینی اور بحر الرائق میں ہے:

شرط صحتها ان تودی فی مصر حتی لاتصح فی قرية ولا مفازة لقول علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ: لا جمعة ولا تشریق ولا صلوٰۃ فطر ولا اضحی الا فی مصر جامع او فی مدینة عظيمة رواه ابن حبان وابن ابی شیبہ وصححه ابن جزم وکفی بقوله قدوة واماما۔ غنیہ شرح منیہ میں ہے:

الشرط الاول المصر او فناءه فلا تجوز فی القرى عندنا وهو مذهب علی ابن ابی طالب وحذیفه وعطاء والحسن ابن ابی الحسن والنخعی ومجاهد وابن سیرین والثوری وسخنون۔

خلاصہ ان دونوں عبارتوں کا یہ ہے کہ صحت ادا کے لیے پہلی شرط اس آبادی کا مصر یا فناء مصر ہونا یہاں تک کہ ہمارے نزدیک گاؤں اور جنگل میں جمعہ صحیح نہیں۔ اس لئے کہ حضرت مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ سے مروی ہے کہ جمعہ اور تشریق اور عید الفطر اور عید النحر سوائے مصر جامع اور بڑی آبادی کے ادا نہیں ہوتے۔ اس کو ابن ابی شیبہ نے روایت کیا، اور ابن حزم نے تصحیح فرمائی۔ اور یہی حضرت علی اور حذیفہ اور عطا اور حسن ابن ابی الحسن اور نخعی اور مجاہد اور ابن سیرین اور ثوری اور سخون رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مذہب ہے۔

لہذا جب کسی آبادی پر مصر کی تعریف صادق آئے اور دیگر شرائط جمعہ بھی پائے جائیں تو وہاں ہمارے ذمہ سے یقیناً ختمہ جزا فرض وقت یعنی نماز ظہر کی فرضیت ساقط ہو جائے گی۔ اب رہا چار رکعت آخر الظہر کا اس کے متعلق میرے خیال میں اقوال فقہاء کو جمع کر کے ان میں تطبیق کی جائے تو چار حکم کتب فقہ سے معلوم ہوتے ہیں۔

حکم اول: جس آبادی پر مصر کی تعریف مذکور صادق آئے اس میں کسی قسم کا تردد اور شک نہیں ہے بلکہ اس کا مصر ہونا یقینی ہے اور اس میں جمعہ کی جماعت صرف ایک جگہ ہوتی ہے تو وہاں آخر الظہر پڑھنے کی حاجت نہیں۔

چنانچہ بحر میں ہے: وقد اُفتيت مرارا بعدم صلوٰۃ الاربع بعدها بنية اخر الظهر خوف اعتقاد عدم فرضية الجمعة وهو الاحتياط في زماننا۔

میں نے چند مرتبہ جمعہ کے بعد بنیت آخر ظہر چار رکعت نہ پڑھنے کو بخوف اس بات کے فتویٰ دیا کہ عوام جمعہ کے فرض نہ ہونے کا کہیں اعتقاد نہ کر لیں اور یہی ہمارے زمانہ میں احتیاط ہے۔

اور حاشیہ بحر میں ہے: واما في البلاد فلا شك في الجواز ولا تعداد الفرضية۔ لیکن شہروں میں پس جواز جمعہ میں کوئی شک ہی نہیں اور ظہر کا اعادہ نہ کیا جائے گا۔

حکم دوم: جس آبادی کا بنا بر تعریف مذکور کے مصر ہونا تو یقینی ہے لیکن اس شہر میں جمعہ چند مساجد میں ہوتا ہے تو وہاں آخر الظہر کا پڑھنا ایسے خواص کے لئے ہے جن کو فرض جمعہ ادا ہونے میں شک نہ ہو اور اختلاف علماء سے پرہیز کرنا بنظر تقویٰ ہو، اور شبہات سے بچنا بلحاظ اپنی حفاظت دین کے لئے ہو، اور جن عوام کو آخر الظہر پڑھنے میں جمعہ کے ادا ہونے میں شک اور تردد ہونے لگے وہ اس آخر ظہر کو نہ پڑھیں۔ چنانچہ شامی نے بحر کے اس قول: انه لا احتياط في فعلها لانه العمل باقوى الدليلین۔

کے جواب میں فرمایا:

اقول وفيه نظر بل هو الاحتياط بمعنى الخروج عن العهدة بيقين لان جواز التعدد وان كان ارجح واقوى دليلا لكن مبنية على شبهة قوية لان خلافه مروى عن ابی حنيفة ايضا واختار الطحاوی والتمرتاشی وصاحب در المختار وجعله العتابی الاظهر وهو مذهب الشافعی والمشهور عن مالك واحدى الروایتین عن احمد كما ذكره المقدسى في رسالته نور الشمعة في ظهر الجمعة بل قال السبكي من الشافعية انه قول اكثر العلماء ولا يحفظ عن صحابي ولا تابعي تجوز تعدد دها الخ وقد علمت قول البدائع انه ظاهر الرواية وفي شرح المنية عن جوامع الفقه انه اظهر الروایتین عن الامام قال في النهروفي الحادى القدسى وعليه الفتوى وفي التكملة للرازي وبه نأخذ اه فهو حينئذ قول معتمد في المذهب لا قول ضعيف ولذا قال في شرح المنية الاولى هو الاحتياط۔ لان الخلاف في جواز التعدد وعدمه قوى وكون الصحيح الجواز للضرورة للفتوى لا يمنع شرعية الاحتياط للفتوى الخ۔ قلت على انه لو سلم ضعفه فلا يخرج عن خلافه الاولى فكيف مع خلاف هؤلاء الائمة وفي الحديث المتفق عليه فمن اتقى الشبهات استبرأ لدينه وعرضه۔

میں نے آخر ظہر نہ پڑھنے کو احتیاط اس لئے کہا کہ آخر ظہر کی اجازت جواز تعدد جمعہ کے ضعف پر مبنی تھی اور باوجودیکہ جواز تعدد جمعہ اقویٰ وارح دلیل سے ثابت ہے، تو اب آخر ظہر نہ پڑھنے میں احتیاط ہوئی۔ تو اس کے جواب میں علامہ شامی فرماتے ہیں: مجھے اس میں اعتراض ہے بلکہ احتیاط اس میں ہے کہ آخر ظہر کو پڑھنے میں یقین کے ساتھ ذمہ سے نکل جاتا ہے کہ جواز تعدد جمعہ کا قول بھی امام صاحب سے مروی ہے اور اس کو طحاوی اور تمرتاشی اور صاحب در مختار نے مختار کہا اور عتابی نے اس کو ظاہر تر قول قرار دیا اور یہی مذہب امام شافعی کا اور امام مالک کا مشہور مذہب اور ایک قول امام احمد کا ہے۔ جیسا کہ اس کو مقتدی نے اپنے رسالہ ”نور الشمعة في ظهر الجمعة“ میں ذکر کیا۔ بلکہ امام سبکی نے فرمایا کہ اکثر علمائے شافعیہ کا یہی قول ہے اور تعدد جمعہ کی تجویز نہ کسی صحابی سے اور نہ کسی تابعی سے روایت محفوظ ہے۔ اور میں نے بدائع کے قول سے جانا کہ یہی ظاہر الروایت کا قول ہے اور شرح منیہ میں جوامع الفقه سے ناقل ہیں کہ دونوں روایتوں میں یہ (ط) کی ظاہر روایت ہے اور نہر میں کہا کہ حاوی قدسی نے اسی پر فتویٰ دیا اور عکلمہ میں رازی نے کہا کہ ہم اسی کو اخذ کرتے ہیں۔ لہذا اب عدم جواز تعدد کا قول مذہب میں معتقد ہوا۔

کہ ضعیف۔ اسی لئے تو شرح منیہ میں کہا کہ اولیٰ یہ ہی ہے کہ احتیاطاً آخر ظہر پڑھی جائے اس لئے کہ جواز تعدد اور عدم جواز دونوں قوی ہیں اور جواز تعدد جمعہ کی صحت پر بضرورت فتویٰ ہے تو یہ بنظر فتویٰ ظہر احتیاطی آخر ظہر کی مشروعیت کو کیسے مانع ہوگی۔ کہ اگر عدم جواز تعدد کے قول کو ضعیف بھی تسلیم کر لیا جائے جب بھی اس خلاف سے نکلنا (یعنی آخر ظہر پڑھنا) اولیٰ ہے اور خاص کر ایسے ائمہ کا خلاف ہو۔ حدیث متفق علیہ میں ہے کہ جوشبہات سے بچا اس نے اپنے دین کو اور آبرو کو بچا لیا۔

پھر یہی علامہ شامی قنیہ سے ناقل ہیں:

لما ابتلی اهل مرو باقامة الجمعتين فيهما مع اختلاف العلماء في جوازها امرائهم

بالاربع بعدها حتما احتياطاً۔

یعنی جب مرو کے رہنے والے اس میں دو جمعہ قائم کرنے میں مبتلا ہوئے باوجودیکہ اس کے جواز میں علما کا اختلاف تھا تو ان پیشواؤں نے احتیاطاً لازمی طور پر ان کو بعد جمعہ چار رکعتیں پڑھنے کا حکم دیا۔

اور اسی میں ظہیریہ سے ناقل ہیں:

واكثر مشايخ بخاري عليه ليخرج عن العهدة۔

یعنی اکثر بخارا کے مشائخ اسی پر ہیں کہ آخر ظہر پڑھنے میں یقین کے ساتھ ذمہ سے نکلنا پایا

جاتا ہے۔

اور اسی میں فتح سے ناقل ہیں۔

فائدة الخروج عن الخلاف المتوهم او المحقق وان كان الصحيح صحة التعدد

فهي نفع بلا ضرر۔

یعنی آخر ظہر پڑھنے سے یہ فائدہ ہے کہ متحقق یا وہی خلاف سے نکلنا ہے اگرچہ تعدد جمعہ کی صحت کا

قول صحیح ہے۔ تو آخر ظہر پڑھنے میں نفع بلا ضرر ہے۔

اور اس میں نہر سے ناقل ہیں۔

انه لا ينبغي التردد في ندبها على القول بجواز التعدد خروجاً عن الخلاف۔

یعنی جواز تعدد کے اقوال پر آخر ظہر کے مستحب ہونے میں شک کرنا ہی مناسب نہیں ہے کہ اس

میں خلاف سے نکل جانا ماحاتاً ہے۔

اور شرح باقانی میں اسی کو مفتی بہ قول قرار دیا ہے۔ لہذا ابن عبارتوں سے نہایت واضح طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ جس شہر میں متعدد جگہ جمعہ کی جماعت ہوتی ہو تو وہاں پر احتیاطاً آخر ظہر پڑھنا بہتر و اولیٰ ہے۔ ہاں اگر آخر ظہر کے التزام میں عوام کے لئے کوئی ایسا مفسدہ ہو جیسا علامہ طحاوی نے لکھا:

هو اعتقاد ان الجمعة ليست فرضاً لما يشاهدون من صلاة الظهر فيتكاسلون عن اداء الجمعة او اعتقادهم افتراض الجمعة والظهر بعدها۔

یعنی جب وہ نماز ظہر کا مشاہدہ کریں گے تو اس کا اعتقاد کریں گے کہ جمعہ فرض ہی نہیں ہے اور پھر وہ جمعہ کے ادا کرنے میں سستی کریں گے یا ان کا یہ اعتقاد کہ جمعہ فرض ہے اور اس کے بعد ظہر فرض ہے ہو جائے گا تو ایسے عوام کو آخر ظہر کا حکم نہ دیا جائے گا۔

چنانچہ یہی علامہ طحاوی فرماتے ہیں:

نحن لانقول به ولا نفتي بفعلها اصلاً بل ندل عليه الخواص الذين يحتاطون لامر دينهم ويتركون ما يريهم الى تحصيل يقينهم۔

یعنی ہم آخر ظہر کا عام فتویٰ نہیں دیتے ہیں بلکہ ہم ایسے خواص کو اجازت دیتے ہیں جو اپنے امور دینی میں احتیاط کرتے ہیں اور حصول یقین کے لئے شک میں ڈالنے والی چیزوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔

اور علامہ شامی فرماتے ہیں:

ان ادى الى مفسدة لاتفعل جهارا والكلام عند عدمها ولذا قال القدسي نحن لانامر بذلك امثال هذا العوام بل ندل فيه الخواص ولو بالنسبة اليهم۔

یعنی اگر آخر ظہر کا پڑھنا کسی فساد تک پہنچے تو اس کو علی الاعلان نہ پڑھا جائے اور گفتگو تو اس صورت میں ہے جب کسی فساد کا اندیشہ نہ ہو۔ اسی وجہ سے مقدسی نے فرمایا کہ ہم ایسے عوام کو حکم نہیں دیتے بلکہ خواص کو بتائیں گے اگرچہ وہ باعتبار ان کے خواص ہوں۔

در مختار میں ہے: واما من لا يخاف عليه مفسدة منها فالاولى ان تكون في بيته خفية۔

یعنی اور وہ شخص جس پر فساد کا اندیشہ نہیں ہے تو اس کے لئے اولیٰ یہ ہے کہ وہ اپنے گھر میں چھپ کر پڑھے۔

اور یہی مضمون مراقی الفلاح میں ہے:

وبفعل الاربع مفسدة اعتقاد الجهلة عدم فرض الجمعة او تعدد المفروض في

وقتہا ولا یفتی بالاربع الا للخواص ویكون فعلہم ایاہا فی منازلہم۔

یعنی آخر ظہر پڑھنے میں عوام کو جمعہ کے فرض نہ ہونے یا ایک وقت میں چند فرض کا اعتقاد ہو جائے تو ان کا حکم صرف خواص کو دیا جائے گا اور وہ بھی اس کو اپنے گھروں میں پڑھیں۔

اور یہی علامہ مقدسی سے نقل ہیں:

نقول انما نہی عنها اذا ادیت بعد الجمعة بوصف الجماعة والاشتہار۔

یعنی ہم نے جو بعد جمعہ آخر ظہر ادا کرنے کی عوام کو ممانعت کی وہ جب ہے کہ اس کو علی الاعلان جماعت کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

بالجملہ اب حکم دوم بھی فقہاء کی بہت سی تصریحات سے ثابت ہو چکا۔ لہذا اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

حکم سوم: وہ آبادی جس کے مصر ہونے میں بنا بر تعریف مذکور کے شک و تردد ہو تو وہاں آخر ظہر کا پڑھنا سب کے لئے واجب ہے۔

چنانچہ عالمگیری میں ہے:

ثم فی کل وقع الشک فی جواز الجمعة لوقوع الشک فی المصر او غیرہ اقام اہلہ الجمعة ینبغی ان یصلوا بعد الجمعة اربع رکعات وینوؤا بها الظہر حتی لو لم تقع الجمعة موقعها یخرج عن عہدۃ فرض الوقت بیقین۔

یعنی ہر وہ جگہ جس میں جمعہ ادا ہونے میں اس وجہ سے شک واقع ہوا کہ اس کے خود مصر اور غیر مصر ہونے میں شک ہے اور وہاں کے رہنے والوں نے جمعہ قائم کر لیا تو انہیں چاہئے کہ وہ بعد جمعہ چار رکعتیں بیت ظہر پڑھیں یہاں تک کہ اگر جمعہ سے اپنے وقت کا فریضہ ادا نہیں ہوا تو وہ اس کے پڑھنے سے یقین کے ساتھ فرض وقت کے ذمہ سے نکل جائے گا۔

اور یہی کافی اور محیط اور شامی اور غنیۃ اور فتاویٰ حجبہ میں اور بحر میں ہے:

واذا اشتبه علی الانسان ذلك (المصر) فینبغی ان یصلی اربعاً بعد الجمعة وینوی بها آخر فرض ادر کت وقتہ ولم أده بعد فان لم تصح الجمعة وقعت ظہرہ وان صحت کانت نقلاً۔

یعنی جب کسی شخص پر کسی جگہ کا مصر ہونا مشتبہ ہو اسے چاہئے کہ جمعہ کے بعد چار رکعت بیت آخر

فرض ظہر کے ادایوں کہے کہ میں نے اس کا وقت پایا اور اب تک ادا نہیں کیا تھا۔ لہذا اگر اس کا جمعہ صحیح نہیں ہوا تو اس کی ظہر ادا ہو جائے گی اور اگر جمعہ صحیح ہو گیا تو یہ نفل ہو جائے گی۔

اور غنیۃ میں فتاویٰ حجبہ سے ناقل ہیں کہ:

والاحتیاط فی القرئ (الكبيرة) ان یصلی السنة اربعاً ثم الجمعة ثم ینوی سنة الجمعة اربعاً ثم یصلی الظہر ثم رکعتین سنة الوقت هذا هو الصحیح المختار فان صحت الجمعة فقد ادى سنتها علی وجهها والا فقد صلی الظہر مع سنة۔

یعنی اور بڑے گاؤں (یعنی جس کے مصر ہونے میں شک ہو) میں یہ ہے کہ پہلے چار رکعت سنت پڑھے پھر جمعہ پھر چار رکعت سنت جمعہ کی نیت کرے پھر ظہر پڑھے اور دو رکعتیں سنت وقت کی پڑھے، یہی صحیح مختار ہے۔ تو اگر جمعہ صحیح ہو گا تو اس نے سنت کو اس کے طریقہ پر ادا کیا ورنہ اس نے ظہر تو مع اس کی سنت کے پڑھا۔ اب باقی رہی یہ بات کہ آیا اس صورت میں آخر ظہر کا پڑھنا واجب ہے یا مستحب تو۔ علامہ شامی لکھتے ہیں:

قال المقدسی ذکر الشحنة عن جده التصريح اما عند قيام الشك والاشتباه فی صحة الجمعة فالظاهر الوجوب ونقل عن شيخه ابن الهمام ما يفيدہ۔

یعنی مقدسی نے کہا کہ ابن شحنہ نے اپنے دادا سے اس تصریح کو ذکر کیا کہ جب صحت جمعہ میں کوئی اشتباہ یا شک قائم ہو پس ظاہر وجوب ہوا۔ اور جو ان کے شیخ ابن ہمام سے منقول ہے وہ اسی کا افادہ کرتا ہے۔ اور ترمذی اور قنیۃ کی تفصیل بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔

بالجملہ ایسی آبادی جس کے شہر ہونے میں شک اور تردد ہو جیسے بڑے بڑے گاؤں ان میں بعد جمعہ عوام و خواص ہر ایک کو آخر الظہر کیا خود ظہر پڑھنا ضروری ہے اور لازمی ہے۔

حکم چہارم: جو آبادی ایسی ہے کہ اس پر تعریف مصر کا کسی طرح صدق نہیں ہوتا جیسے گاؤں دیہات جس میں مصر ہونے کا شک تو کیا وہم بھی نہیں ہے۔ لہذا ایسے دیہات میں یقیناً جمعہ ادا نہیں ہوتا جیسا کہ ابتدا میں بحر الرائق اور غنیۃ کی عبارتوں سے ظاہر ہو چکا کہ فرض وقت یعنی ظہر ان کے ذمہ باقی رہتا ہے۔ لہذا ان کو ظہر کا پڑھنا فرض ہے۔

چنانچہ علامہ شامی جو اہر سے ناقل ہیں: لو صلوا فی القرئ لزم اداء الظہر۔

یعنی اگر دیہات والے دیہات میں جمعہ کی نماز پڑھیں تو ان کو ظہر ادا کرنا ضروری ہے۔

بلکہ عالمگیری اور فتاویٰ قاضی خان میں تو یہ عبارت ہے۔

ومن لا يجب عليهم الجمعة من اهل القرى او البوادي لهم ان يصلوا الظهر
بجماعة يوم الجمعة باذان واقامة۔

یعنی جو لوگ ایسے ہیں جن پر جمعہ واجب نہیں جیسے گاؤں اور جنگل کے رہنے والے ان کو چاہئے
کہ جمعہ کے دن ظہر کی نماز اذان واقامت کے ساتھ پڑھیں۔

ہاں جن دیہات میں نماز جمعہ عوام پڑھتے ہوں تو وہاں جمعہ تو ادا نہیں ہوتا لیکن بلحاظ دیگر مصالح
دینی کے ان کو منع نہ کیا جائے اتباعا لحدیث ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

وکفی بقوله قدوة واماما۔

کہ آخر نام الہی لیتے ہیں اور اس کے بعد ظہر کا ضرور حکم دیا جائے گا کہ ان کے لئے فرض وقت
ظہر ہے اور اس جمعہ سے ظہر کی فرضیت ذمہ سے ساقط نہیں ہوئی۔ لہذا ظہر کا پڑھنا سب پر فرض ہے۔

الحاصل آخر ظہر کا جس نے مطلقاً ہر جگہ ایک حکم دیا ہے اس کی نہایت نادانی اور اس کو احوال فقہاء
پر اطلاع نہیں ہے۔ ہماری اس تفصیل سے مسئلہ کہ ہر پہلو پر متعدد طریقہ پر روشنی پڑ گئی اور ہر جگہ کے لئے
علیحدہ حکم معلوم ہو گیا۔ اگر مزید تفصیل درکار ہو تو آئندہ کسی فرصت کے وقت روانہ کیجا سکتی ہے۔ بحمد اللہ
تعالیٰ منصف کے لئے یہی کافی و وافی اور معاند کے لئے دفاتر بھی ناکافی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) عید گاہ میں نماز جمعہ جائز ہے۔ اس لئے کہ جب نماز عید اس میں صحیح ہے تو نماز جمعہ بھی اس
میں ادا ہو جائے گی۔

چنانچہ علامہ شامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

کمان المصر وفناء شرط جواز الجمعة فهو شرط جواز صلوٰۃ العید۔

یعنی جیسے کے مصر یا فناء مصر جواز جمعہ کی شرط ہے ایسے ہی جواز نماز عید کی شرط ہے۔

اور مرآت الفلاح میں ہے:

(ويشترط لصحتها) اي صلوٰۃ الجمعة (سنة اشياء) الاول المصر او فناء ه سواء

مصلی العید او غیرہ لانہ بمنزلۃ المصر فی حوائج اہلہ۔

یعنی نماز جمعہ کی صحت کی چھ (۶) شرطیں ہیں۔ پہلی چیز مصر ہونا یا فناء مصر ہونا۔ اب چاہے وہ
عید گاہ ہو یا علاوہ اس کے اور جگہ کہ یہ اہل شہر کے حوائج کے اعتبار سے بمنزلہ مصر کے ہے۔ اور عینی شرح

کنز الدقائق۔ او مصلاہ۔ کے تحت میں لکھتے ہیں۔

عطف علی المصر او مصلی المصر مثل مصلی العید۔

یعنی اداء جمعہ کی ایک شرط مصر ہے یا اس کی عید گاہ۔

اور غنیہ میں ہے: والمسجد الجامع لبس بشرط ولهذا اجمعوا علی جوازها
بالمصلی۔

یعنی نماز جمعہ کے لئے جامع مسجد ہونا ہی شرط نہیں ہے۔ اسی لئے تو فقہانے جمعہ کی نماز عید گاہ
میں جائز ہونے پر اجماع کیا ہے۔

بالجملہ اس مسئلہ میں فقہاء کی تصریحات تو بہت زیادہ کتب میں موجود ہیں لیکن منصف کے لئے
یہی بہت کافی و وافی ہے۔ اب باقی رہا چند مساجد کا اس کے قرب میں ہونا یا عید گاہ میں جواز جمعہ کے لئے
مانع نہیں جیسا کہ ابھی غنیہ کی عبارت سے ثابت ہو چکا بلکہ میرے خیال میں اگر کوئی مانع شرعی نہ ہو تو ان
چار مسجدوں میں علیحدہ علیحدہ محلہ میں جمعہ ہونے سے بھی زیادہ بہتر ہے کہ ان چار مسجدوں کے نمازی ایک
جگہ جمع ہو کر جمعہ ادا کریں کہ اس میں تعدد جمعہ کی بحث سے ایک گونہ احتیاط لازم ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم
بالصواب

کتبہ: المختصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۲۳ھ

(۲۲۳)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک شخص نے نماز جمعہ پڑھائی اور ہر دو رکعت میں رکوع سے اٹھ کر زیادہ قیام کیا اور اسی طرح
سجد تین کے درمیان کچھ مقدار سے زیادہ بیٹھے نماز کے بعد امام صاحب سے معلوم کیا تو انھوں نے جواب
دیا کہ میں نے رکوع سے کھڑے ہو کر اور سجد تین کے درمیان وہ دعائیں پڑھیں تھیں جو حدیث شریف
میں حضور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ان حالتوں میں پڑھنی منقول ہیں دریافت طلب یہ امر ہے
کہ آیا یہ صورت نماز درست ہے یا نہیں اور کیا امام موصوف پر سجدہ سہو واجب تھا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

امام نماز جمعہ کے قومه (یعنی رکوع کے بعد قیام) اور جلسہ (یعنی دونوں سجدوں کے درمیان کا قعدہ) میں احادیث میں کسی چیز کا پڑھنا منقول نہیں ہے۔
تنویر الابصار میں ہے:

ويجلس بين السجدين مطمئناً وليس بينهما ذكر مسنون وكذا بعد رفعه من الركوع على المذهب -

اور دونوں سجدوں کے درمیان اطمینان سے بیٹھے اور اس میں کوئی ذکر و دعا سنت نہیں اور اسی طرح رکوع کے بعد قومه میں کوئی دعا نہیں یہی مذہب صحیح ہے۔
طحطاوی، سراج اور مجمع الانہر سے ناقل ہیں:

ومقدار الجلوس عندنا بين السجدين بمقدار التسبيحة وليس فيه ذكر مسنون كما في السراج كذا ليس بعد الرفع من الركوع دعاء وماورد فيهما محمول على التهجيد كما في المجموع الانهر -

اور ہمارے نزدیک دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنے کی مقدار ایک تسبیح سبحان اللہ کہنے کی مقدار ہے اور اس میں کوئی ذکر مسنون نہیں جیسا کہ سراج میں ہے اسی طرح رکوع کے بعد قومه میں کوئی دعا نہیں اور جو دعائیں ان دونوں میں وارد ہوئی ہیں وہ تہجد پر محمول کی گئی ہیں۔ جیسا کہ مجمع الانہر میں ہے، اسی طرح درمختار میں ہے تنویر الابصار کے اسی قول کو تحریر فرماتے ہیں:

وماورد محمول على النفل -

یعنی جو دعائیں قومه و جلسہ میں وارد ہوئی ہیں وہ نماز نافلہ کے لئے خاص کر دی گئی ہیں اور اسی طرح درر اور حلیہ اور خزائن وغیرہ کتب میں ہے۔ لہذا ان عبارتوں سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ فرائض کے قومه اور جلسہ میں کسی دعا کا پڑھنا منقول نہیں خصوصاً اگر مقتدی کو اتنا انتظار ناگوار ہو تو امام کو ہرگز نہیں پڑھنا چاہئے اور اگر امام سے فرائض میں ایسا واقعہ ہو جائے تو اختلاف سے بچنے کے لئے احتیاطاً سجدہ کرنا لینا چاہئے۔

شامی نے ایک یہ قول بھی نقل کیا ہے۔

لو اطلال هذه الجلسة وقومة الركوع اكثر من تسبيحة بقدر تسبيحة ساهيا يلزمه

السجود سهوا -

یعنی اگر جلسہ اور قومه کو ایک تسبیح کی مقدار سے زائد ایک تسبیح برابر بھول کر طول دیا تو اسکو سجدہ سہو لازم ہے۔

بالجملہ قومه اور جلسہ میں جو احادیث کی دعائیں منقول ہیں وہ فقہاء کے نزدیک نوافل کے ساتھ خاص ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۲۳ھ

(۲۲۳-۲۲۵)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین ان مسائل میں کہ

- (۱) جن گاؤں میں مدت سے جمعہ ہوتا آیا اسے بند کر دینا چاہیے یا اسے جاری رکھا جائے؟
- (۲) ایک مسجد میں ایک وقت میں دو جماعتیں ہوتی ہیں۔ ایک جماعت اہلسنت والجماعت کی ہوتی ہے اور ایک وہابی فرقہ کی۔ ان میں کوئی جماعت شرعاً جماعت ہوتی ہے؟ اور ایک سات ایک مسجد میں دو جماعتیں ہو سکتی ہیں یا نہیں؟۔ بینوا تو جرو

المستفتی محمد اسحاق ساکن موضع گھنور پور پر گنہ سنہ ۱۳۲۳ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

- (۱) جن مواضع میں عرصہ سے جمعہ کی جماعت ہوتی ہے اسے بہت سے مصالح دینی کی بنا پر بند نہ کیا جائے البتہ اس کے بعد فرض ظہر چار رکعتیں پڑھنی فرض ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔
- (۲) وہابیہ کی نماز اور جماعت بسبب ان کی گمراہی و ضلالت کے شرعاً نہ نماز ہے نہ جماعت نہ ان کی جماعت میں شریک ہونے کا فریضہ اس کے ذمہ سے ساقط ہو۔ اہلسنت کی جماعت واقعی جماعت ہے اس کے مقابلہ میں وہابیہ کی جماعت کو جماعت کہنا ہی غلطی ہے۔ ایک وقت میں صحیح العقیدہ لوگوں کی دو جماعتیں واقعی ممنوع ہیں لیکن اہلسنت کی جماعت وہابیہ کی جماعت کے وقت قائم کرنے میں شرعاً تو کوئی حرج نہیں البتہ بخوف فتنہ و فساد کے ایک وقت میں دو جماعتیں ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ مسیحی

مسئلہ

(۲۲۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین ان مسائل میں کہ جمعہ کے روز جمعہ کے پہلے صلوٰۃ پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

سائل نے جس میں صلوٰۃ کو دریافت کیا ہے غالباً یہ وہ صلوٰۃ ہے جو جمعہ کے دن پہلی اذان کے بعد دروازہ یا خارج مسجد میں باواز بلند پکاری جاتی ہے جیسا کہ بمبئی، کلکتہ، بریلی وغیرہ مقامات میں رائج ہے۔ لہذا یہ صلوٰۃ جمعہ کے روز دونوں اذانوں کے مابین اور سوائے مغرب کے چاروں اوقات میں اذان و تکبیر کے درمیان میں بلا شک جائز ہے۔

متاخرین فقہائے کرام نے اس کے نہ فقط جواز بلکہ استحسان کا حکم دیا اور اس کا نام تہویب رکھا۔ چنانچہ نور الایضاح میں اور اس کی شرح مراقی الفلاح میں ہے:

(ویشوب) بعد الاذان فی جمیع الاوقات لظہور التوانی فی الامور الدینیۃ فی

الاصح و تہویب کل بلد بحسب ماتعارفہ اہلہا۔ (طحاوی مصری ص ۱۱۴)

اور صحیح مذہب میں تمام وقتوں میں اذان کے بعد تہویب کہے کہ دینی باتوں میں سستی ظاہر ہے اور ہر شہر کی تہویب وہ ہے جو اس کے رہنے والے اسے سمجھیں (یعنی یہ جان لیں) کہ اذان کے بعد اذان دوسرے اعلان سے نماز کے لئے بلایا جا رہا ہے۔

طحاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

(قوله ویشوب الخ) هو لغة مطلق العود الى الاعلام بعد الاعلام وشرعا هو العود الى

الاعلام المخصوص (قوله بعد الاذان) على الاصح لا بعد الاقامة كما هو اختيار علماء الكوفة (قوله في جميع الاوقات) استحسنة المتأخرون وقد روى احمد في السنن والبيهقي وغيرهما باسناد حسن موقوفا على ابن مسعود ما رآه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن۔

(طحاوی مصری ص ۱۱۴)

تہویب لغت میں پہلے اعلان کے بعد دوسرے اعلان کی طرف مطلق لوٹنے کو کہتے ہیں۔

شریعت میں وہ دوسرے مخصوص اعلان کی طرف لوٹنا مراد ہوتا ہے کہ صحیح مذہب میں تہویب اذان کے بعد ہے نہ کہ تکبیر کے بعد جیسا کہ وہ علمائے کوفہ کا مختار بہ قول ہے۔ تہویب کا اذان کے بعد تمام اوقات نماز میں کہنا اسے متاخرین فقہاء نے مستحسن جانا اور استحسان کا ثبوت اس حدیث سے ہے جس کو امام احمد نے سنن میں اور دیگر محدثین نے بسند حسن حضرت عبداللہ بن مسعود سے موقوفاروایت کیا کہ جسے مسلمان حسن جانیں وہ فعل اللہ کے نزدیک اچھا ہے۔

کنز الدقائق اور شرح عینی میں ہے:

(ویشوب) من التہویب وهو العود الى الاعلام بعد الاعلام وانما اطلقه تنبیہا علی ما استحسنته المتأخرون من التہویب فی کل الصلوات بظہور التوانی فی الامور الدینیۃ۔

(یعنی مصری ج ۱ ص ۲۷)

تہویب وہ پہلے اعلان کے بعد دوسرے اعلان کی طرف لوٹنے کا نام ہے۔ صاحب کنز نے اس کو مطلق بیان کرنے میں اس بات پر تنبیہ کی کہ متاخرین نے اس تہویب کو تمام نمازوں میں مستحسن جانا اس لئے کہ دینی امور میں سستی ظاہر ہو چکی ہے۔

جوہرہ نیرہ شرح مختصر قدوری میں ہے:

المتأخرون استحسنته فی الصلوات کلها لظہور التوانی فی الامور الدینیۃ

وصفته فی کل بلد علی ماتعارفونہ۔ (جوہرہ نیرہ ج ۱ ص ۲۷)

متاخرین نے سب نمازوں میں تہویب کو مستحب جانا کہ امور دینیہ میں سستی ظاہر ہے اور تہویب کے الفاظ ہر جگہ کے لئے وہ ہیں جنہیں وہاں کے رہنے والے سمجھیں۔ (یعنی تہویب کے لئے کوئی خاص الفاظ مقرر نہیں ہیں۔)

تنویر الابصار و در مختار میں ہے: (ویشوب) بین الاذان والاقامة فی الكل للكل بماتعارفہ۔ (در مختار ج ۱ ص ۲۷)

اذان اور تکبیر کے درمیان تمام اوقات نماز میں ہر اس لفظ سے تہویب کہیں جسے لوگ جانتے ہوں۔

علامہ شامی عنایہ سے نقل ہیں:

احداث المتأخرون التہویب بین الاذان والاقامة علی حسب ماتعارفونہ فی جمیع

الصلوات سنوی المغرب۔

(زشامی ج ۱ ص ۲۷۲)

متاخرین نے سوائے مغرب کے تمام نمازوں میں اذان و تکبیر کے مابین تہویب کہنا ہر اس لفظ کے ساتھ جسے لوگ سمجھتے ہوں یہ نیا طریقہ ایجاد کیا۔

خود وہابیوں کے پیشوا مولوی خرم علی غایۃ الاوطار ترجمہ اردو در مختار میں لکھتے ہیں ”تہویب یعنی اعلام بعد الاذان کا طریقہ یہ ہے کہ بعد اذان بقدر بیس آیت پڑھنے کے ٹھہر جائے، پھر بلاوے اس طرح کہ الصلوٰۃ۔ یا یہ کہ چلو نماز تیار ہے۔ یا جس طرح رواج ہو۔ پھر اس کے بعد بقدر بیس آیت کے توقف کرے۔ پھر اقامۃ کہے کذافی الحجر۔ مگر مغرب میں تہویب نہیں۔ (غایۃ الاوطار ج ۱ ص ۱۸۱)

بخیاں اختصار چند عبارات پیش کی گئیں ہیں ورنہ اس کا جواز قیہ، ملتقط بحر الرائق، ہدایہ فتاویٰ قاضیخان، نہر، محبتے، درر، غرر، نہایہ، حسن المحاضرہ، خزائن، القول البدیع وغیرہ کتب میں ہے۔

بالجملہ ان عبارات سے روشن ہو گیا کہ تہویب نہ فقط جائز بلکہ مستحسن ہے اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ فقہائے کرام نے تہویب کے کوئی الفاظ خاص مقرر نہیں فرمائے بلکہ اس کے الفاظ کو عرف اور رواج پر موقوف رکھا ہے۔ لہذا ہمارے عرف میں الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ کے جیسے الفاظ صلوٰۃ و سلام میں رائج ہیں اب کسی منکر کو ان تصریحات کتب فقہ کے موجود ہوتے ہوئے جمعہ کے دن یا کسی اور دن صلوٰۃ پڑھنے پر لب کشائی اور دم مارنے کی کیا مجال ہے۔ لیکن وہابی کی دہن دوزی کے لئے خود انہیں کے پیشوا مولوی خرم علی کا قول نقل کیا جاتا ہے جو انہوں نے در مختار کی عبارت کے ترجمہ میں لکھا ہے۔

”رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر سلام کہنا نیا پیدا ہوا رائج الاخر ۷۸۱ سال ہجری میں عشاء کی نماز میں دو شنبہ کی رات پھر جمعہ کے دن پھر دس برس کے بعد پیدا ہوا سب نمازوں میں سوائے مغرب کے۔ پھر مغرب میں بھی دوبار سلام کہنا رائج ہو گیا۔ اور یہ امر بدعت حسنہ ہے۔ یہ فائدہ شارح نے جلال الدین سیوطی شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما کے حسن المحاضرہ سے نقل کیا اور سخاوی کے قول بدیع میں ہے کہ اس کی ابتداء حدوث سلطان صلاح الدین بن مظفر بن ایوب کے حکم سے ہوئی ۹۱ھ میں۔ طحاوی نے کہا کہ مغرب کا سلام ہمارے وقت میں رائج نہیں اور نہ سیوطی کی اس عبارت میں ہے جو نہر الفائق میں منقول ہے انتہی۔ بدعت حسنہ وہ ہے جو قواعد شریعت کے مخالف نہ ہوں۔“ (غایۃ الاوطار ج ۱ ص ۱۸۱)

حاصل کلام یہ ہے کہ صلوٰۃ کہنا فقط جمعہ کی نماز اور خطبہ سے قبل بلکہ سوائے مغرب کے چاروں

اوقات نماز میں مستحسن ہے۔ سلف صالحین۔ فقہائے متاخرین کا محبوب طریقہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۲۲۷)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین مسائل مندرجہ ذیل میں۔
لاؤڈ اسپیکر کا نماز عید میں لگانا جائز یا نہیں؟

ضروری نوٹ

(۱) مجالس اسلامیہ محافل و پند میں علمائے کرام کا لائوڈ اسپیکر کے ذریعہ تقاریر کرنا۔ اور تقریر میں قرآن کریم و احادیث نبویہ کی تلاوت کرنا۔ مسائل دین کی تعلیم دینا اس امر کی دلیل صریح ہے کہ لائوڈ اسپیکر کوئی آلہ لہو و لعب نہیں بلکہ ایک شیء مباح ہے۔

(۲) ماہرین فن برقیات سے تحقیق کی گئی کہ آلہ خالق الصوت نہیں بلکہ دافع الصوت ہے امام کی پست آواز کو بلند کرتا ہے جس طرح بولنے والا خود ہلکی اور باریک آواز سے گفتگو کرتے ہوئے گلے کی زیادہ طاقت صرف کرتے ہوئے بلند آواز سے بولے۔ اس کی نظیر غالباً ضعیف البصر کے لئے چشمہ۔ بہرے کے لئے آلہ مسامع الصوت ہو سکتے ہیں۔

(۳) لائوڈ اسپیکر کی آواز امام ہی کی آواز ہے۔ امام کی آواز کے مدت، ادغام، غنہ سرعت، بطو، مخارج حروف و صفات کسی میں کوئی فرق نہیں آتا، صرف پستی و بلندی میں امتیاز ہوتا ہے اور یہ بلندی و پستی خود امام کی آواز میں موجود ہے۔

(۴) جماعت کثیرہ میں صفوف تک امام کی آواز نہ پہونچنے کی شکل میں مکبرین کا انتظام کیا جاتا ہے لیکن امام اگر خود جمیع الصوت ہے اور آواز آخرف تک پہونچتی ہے تو مکبرین کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ تو پھر لائوڈ اسپیکر سے جس امام کی آواز بلند ہو جاتی ہے تو مکبرین کی ضرورت پیش نہ آتی۔

گی تو اس صورت میں سنت کے خلاف بھی نہ ہوگا۔ سنت کے خلاف اس وقت ہو سکتا ہے کہ مکبرین قائم نہ کئے جائیں اور امام کی آواز کے علاوہ کسی اور چیز سے آواز پہونچائی جائے اور وہ آواز امام کی آواز سے بالکل تابع نہ ہو۔

(۵) آلہ کے استعمال کے واسطے نماز میں امام کو ہاتھ پاؤں میں حرکت دینا نہیں۔ وضع قطع میں تغیر و تبدل نہیں۔ جس طرح بجلی کے پنکھوں سے ہوا لینے میں نمازی کو کوئی دخل نہیں اگرچہ اپنے ہاتھ سے پنکھا ہلانا جائز نہیں۔

(۶) جب نماز میں مریض لاشی کی ٹیک سے کھڑا ہو سکتا ہے۔ اس کے بھروسہ پر دفع و خفض ہو سکتا ہے اور یہ محض اس کے ضعف معذوری سے۔ تو آلہ کے ذریعہ آواز پہونچانا کیونکر منع ہو سکتا ہے حالانکہ نمازی کے ہاتھ میں لاشی رہتی ہے اور یہ آلہ نمازی سے دور۔

امید کہ امور مذکورہ پر غور فرماتے ہوئے لاؤڈ اسپیکر کے متعلق تسلی بخش جواب مرحمت فرمائیں۔ اگر جواب جواز ہے تو اختصار کافی۔ دلائل کی ضرورت نہیں۔ اور اگر عدم جواز ہے تو مدلل و متحقق درکار ہے۔

الجواب

نحمدہ و نصلى و نسلم على رسولہ الكريم

جواب سے قبل تین مقدمات پیش کئے جاتے ہیں تاکہ مسئلہ کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

مقدمہ اولیٰ:- نماز میں خشوع کا حاصل ہونا ضروری چیز ہے۔ خشوع قلب کے حضور اور ارکان صلوٰۃ کی محافظت اور جوارح کے سکون کا نام ہے۔

طحاوی میں ہے: الخشوع حضور القلب و تسکین الجوارح و المحافظة علی الارکان۔

(طحاوی ص ۲۰۱)

مراقی الفلاح میں ہے:

واختلفوا فی الخشوع هل هو من اعمال القلب كالخوف او من اعمال الجوارح كالسكون او هو عبارة عن المجموع قال الرازی الثالث اولیٰ و عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ الخشوع فی القلب۔

(طحاوی ص ۲۱۰)

شامی میں ہے:

قد حکى اجماع العارفين عليه وان من لوازمه ظهور الذل و غرض الطرف و خفض الصوت و سکون الاطراف۔

(شامی ج ۱ ص ۴۵)

ان عبارات سے خشوع کی حقیقت اور اس کے لوازم معلوم ہو گئے۔ لہذا خشوع کا لحاظ نماز میں کس قدر ضروری ثابت ہوا اس لئے خشوع کو بعض نے نماز کی روح فرمایا:

چنانچہ مراقی الفلاح میں ہے: الخشوع الذی هو روح الصلوٰۃ۔ (طحاوی ص ۲۰۱) اور بعض نے نماز کا مبنی قرار دیا۔

چنانچہ شامی میں ہے: مبنی الصلوٰۃ علی الخشوع۔ (شامی ج ۱ ص ۴۵۰)

الحاصل جب خشوع میں حضور قلب و تسکین جوارح و محافظت ارکان داخل اور عجز و حیا اور پستی آواز اس کو لازم آتا ہے کیونکہ نماز کا مبنی اور روح نہ قرار دیا جائے اور اسے نماز میں کیونکر ملحوظ نہ رکھا جائے۔ مقدمہ ثانیہ:- جو چیز اس خشوع کو زائل کرے۔ اور قلب کو دوسری طرف مشغول کرے وہ

چیز نماز میں مکروہ اور نمازی کو ہر ایسی چیز سے اجتناب و پرہیز لازم و ضروری ہے

چنانچہ بخاری شریف میں حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک چادر میں نماز پڑھی جو منقش تھی اس کو واپس فرمایا اور آپ نے اندیشہ شغل قلب کا اس طرح اظہار فرمایا:

قال النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کنت انظر الی علامہا وانا فی الصلوٰۃ فاختاف ان یفتنی۔

(بخاری شریف مصطفائی ج ۱ ص ۵۴)

یعنی میں اس حدیث کے تحت میں فرماتے: فیہ طلب الخشوع فی الصلوٰۃ والاقبال علیہا ونفی کل ما یشتغل ویلهی عنہ۔

(یعنی ج ۲ ص ۲۵۹)

مراقی الفلاح میں مکروہات صلوٰۃ کے بیان میں ہے: وتکرہ بحضرة کل ما یشتغل بالال کزینة و حضرة ما یخل بالخشوع۔

(طحاوی ص ۲۱۰)

طحاوی میں ہے: علة الکراهة المعقولة ما یحصل من تشویش البال و شغل الخاطر۔

(طحاوی ص ۲۰۹)

کبیری میں ہے:

فان كان اجنبيا من الصلوة ليس فيه تميم لها ولا فيه دفع ضرر فهو مكروه ايضا كاللعب بالثوب او البدن و كل ما يحصل بسببه شغل يخل بالخشوع -

(رد المحتار ج ۱ ص ۲۵۹)

ان عبارات سے واضح ہو گیا کہ ہر وہ چیز جن سے شغل قلب ہو۔ اور طبیعت میں تشویش ہو۔ اور خشوع زائل ہو وہ نماز میں مکروہ ہے اور نمازی کو اس سے اجتناب و احتراز ضروری ہے۔

مقدمہ ثالثہ :- اس میں چند ان چیزوں کا ذکر ہے جو محض شغل قلب اور منافی خشوع ہونے کی بنا پر مکروہ قرار دی گئیں۔ مراقی الفلاح میں مکروہات کے بیان میں فرمایا:

كعبته بثوبه و بدنه لانه ينافي الخشوع - (طحطاوی ص ۲۰۱)

یعنی نمازی کا اپنے کپڑے یا بدن کے ساتھ شغل کرنا اس لئے مکروہ ہے کہ یہ خشوع کے منافی ہے رد المحتار میں ہے: يكره للمصلي جعل نحو نعله خلفه لشغل قلبه -

(رد المحتار ج ۱ ص ۲۵۹)

نمازی کو اپنے جوتے کا پیچھے رکھنا اس لئے مکروہ ہے کہ اس میں اس کا قلب مشغول رہے گا۔

عالمگیری میں ہے: كره بعض مشائخنا النقش على المحراب وحائط القبلة لانه

(شامی ج ۱ ص ۴۶۲)

يشغل قلب المصلي -

کتب فقہ میں اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں مگر بخوف طوالت یہاں انہیں کو کافی سمجھا گیا۔

بالجملہ لاؤڈ اسپیکر میں یہ امور روز روشن کی طرح ظاہر ہیں کہ یہ منافی خشوع ہے اسکے ساتھ شغل

قلب ہوگا۔ اس کی رعایت خضوع علی وجہ الکمال کو مانع ہوگی۔ اس کی پابندی امام کے لئے انتشار طبیعت

کا باعث ہوگی۔ بلکہ یہ مشاہدہ ہے کہ واعظین کو کبھی اس کی پابندی باعث تشویش خاطر ہوتی ہے۔ تو

نماز میں اس کی کس طرح اجازت ہو سکتی ہے۔ اور مقدمہ ثانیہ میں جو حدیث منقول ہوئی کہ حضور سید عالم

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب ایک منقش کپڑے کو باندیشہ شغل قلب دفع فرمائیں تو کوئی ایسا جری شخص ہے

کہ لاؤڈ اسپیکر جیسی چیز سے شغل قلب کا اندیشہ نہ رکھے اور اسکو بجائے دفع کرنے کے اس کے اجراء کی

سعی کرے اور فقہائے کرام جب بدن اور کپڑے کے شغل قلب کو منافی خشوع قرار دیکر مکروہ ٹھہرائیں

اور نقوش محراب کو بخیاں شغل قلب مکروہ قرار دیں اور جوتے کے پیچھے رکھنے میں شغل قلب کا لحاظ فرما کر کراہت کا فتویٰ دیں تو کون ایسا دلیر ہے کہ لاؤڈ اسپیکر جیسی نئی شے میں شغل قلب کا احتمال بھی نہ جانے اور فقہاء کی علت کراہت کا مقابلہ کرے۔

حاصل جواب یہ ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کا نماز عیدین یا جمعہ وغیرہ میں استعمال کرنا ضرور باعث شغل قلب ہے اور اس کی پابندی ضرور خشوع کے منافی ہے۔ لہذا علت کراہت بوجہ احسن موجود ہے تو اس کا نماز میں استعمال ضرور مکروہ ہے۔

اب مستفتی صاحب کے چند نوٹ کے متعلق بھی مختصر عرض کیا جانا ہے۔

(۱) مجالس وعظ اور نماز ایک چیز نہیں کہ جو چیزیں مجالس وعظ میں روا ہیں وہ نماز میں بھی جائز ہو جائیں۔ نماز میں صرف لہو و لعب ہی ممنوع نہیں۔ کھانا پینا۔ کسی سے بات کرنا۔ دانے بائیں دیکھنا۔ آگے پیچھے بڑھنا۔ ہاتھوں سے بار بار حرکتیں کرنا۔ یہ سب مباحات ہیں نماز میں کب جائز ہیں۔ یہ دعویٰ نہیں ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کی وضع مثل آلات غنا کے لہو و لعب کے لئے ہوئی اور واضح کا اس سے یہ مقصود ہے بلکہ اس کی غراہت و ندرت اور اس کی قوت صوت اور اس میں واقع ہونے والے تغیرات اپنی طرف ایسا مشغول کر لیتے ہیں کہ بعض اوقات مقرروں کو اپنے سامنے سے لاؤڈ اسپیکر ہٹانا پڑ جاتا ہے اور محل مقصد تک پہنچا دیتا ہے۔

(۲) یہ گفتگو ہی بیکار ہے اور تعجب ہے کہ مستفتی صاحب نے کیوں لکھی۔ خلق الصوت کی کیا بحث یہ کسے وہم ہو سکتا ہے کہ کوئی ہو یا نہ ہو خود آواز پیدا کر لیتا ہے۔ احتمال ہے تو یہ ہے کہ متکلم کے جس قرع و خرک سے ہوا کے اجزاء متکلیف ہوتے چلے آ رہے تھے انہیں کو آلہ نے دوسری طرف پہونچایا یا اس ہوا متکلیف سے پھر قرع جدید پیدا ہوا۔ اور یہ بھی مسئلہ زیر بحث میں یکساں ہے کہ شغل تو دونوں صورتوں میں ہے۔

(۳) یہ بحث بیکار ہے بلکہ اور غلط۔ کہ حروف کے مخارج و صفات اور نفحات کا متوافق ہونا دلیل وحدت صلوٰۃ نہیں۔ فوٹو کی تصویری صورت سے اس کے نقشہ و ہیئت و مناسبت اعضا سے کس قدر مطابق ہوتی ہے مگر کون کہہ سکتا ہے کہ صورت اور ذی صورت میں مباہنت نہیں۔

(۴) کثرت جماعت کی صورت میں امام ہی کی آواز پہونچانے کا شریعت نے حکم نہیں دیا اور

امام پر جدوجہد لازم نہیں کی کہ اپنی طاقت سے جہاں تک آواز پہونچا سکتا ہے وہاں تک ضرور پہونچائے

اس سے زیادہ کے لئے مکمل ہے بلکہ امام اعتدال کے ساتھ قرأت کرے اور مکمل تبلیغ کیا کرے جب امام پر جہد نہیں رکھا گیا تو آلہ کس لئے۔ یہ آلہ تو بہت جہد تبلیغ سے اور ضرورت تبلیغ بالکبیر اس سے معدوم ہوتی ہے۔

(۵) یہ سب بیکار باتیں ہیں یہ کہتا کون ہے کہ ہاتھ پاؤں سے حرکت کی جاتی ہے اسلئے اس آلہ کا استعمال ناجائز ہے۔ بجلی کا پنکھا کوئی سنت کو معدوم کرتا اور کس شغل کا موجب ہے اور اگر ہے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

(۶) اگر یہ مقیس علیہ قرار دیا جاسکے تو امام کو بگل کے ذریعہ سے تکبیرات کے پہونچانے کی ضرورت پڑے گی۔ نماز نہ ہوئی کھیل ہو گیا۔ و ماکان صلواتہم عند البیت الامکاء و تصدیۃ۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۲۸

(۲۲۸)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ اکثر گاؤں میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے اور بعض مفتیوں نے یہ فتوے دیا ہے کہ گاؤں میں جو جمعہ ہوتا ہے اس کو بند کر دیا جائے چاہے وہاں ایک زمانہ سے جمعہ کی جماعت قائم ہو اب دریافت طلب یہ امور ہیں کہ آیا گاؤں میں نماز جمعہ کو واقعی بند ہی کر دینا چاہیے یا اسے قائم رکھا جائے اور قائم رکھنے کی صورت میں ظہر کی نماز بھی ادا کی جائے یا نہیں اگر ادا کیجائے تو اس کی کیا صورت ہے؟۔ بینوا تو جزوا۔
المستفتی صوفی ظہور شاہ از موضع دبھائی تحصیل ہاپور ضلع میرٹھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اس وقت دیہات کے مسلمانوں کی ایسی ناگفتہ بہ حالت ہو رہی ہے کہ ہر شخص فکر معاش میں مدہوش ہے زراعت کی مشغولیت میں منہمک ہے خوف الہی قلب سے نکل رہا ہے۔ نیکیوں کا شوق کم ہو رہا ہے عبادات کا ذوق مٹ رہا ہے۔ فرائض کا احترام کم ہو رہا ہے۔ بدیوں کی اشاعت ہے۔ گناہوں کی کثرت ہے۔ علی الاعلان کماز کا ارتکاب کیا جا رہا ہے۔ نہایت دلیری سے نماز روزہ کو ترک کیا

جا رہا ہے۔ مساجد نمازیوں سے خالی نظر آرہی ہیں دین سے بے رعبی بڑھتی جا رہی ہے۔ پھر ان میں وعظ و نصائح کے سلسلہ بند نہیں ترغیب و ترہیب کے ذریعے بہت کم ہیں اور اس پر ان لوگوں کی بے رغبتی اور بد شوقی اور زیادہ رنگ لاتی ہے چنانچہ ان کی مساجد میں نماز پنج وقتہ کی پابندی کے ساتھ جماعت کم ہوتی ہے۔ بسا اوقات اذان سے مسجد خالی رہ جاتی ہے، مسلمانوں کے بڑے سے بڑے گاؤں میں چند نمازی نظر آتے ہیں، ہاں ان کے مردہ جذبات میں جان ڈالنے والا، ان کے بے حس یا قلوب میں شوق کی لہریں پیدا کرنے والا، ان میں غسل و طہارت کا جذبہ پیدا کرنے والا، ان میں خط بنوانے اور کپڑے بدلنے کا ذوق پیدا کرنے والا، ان کے مشاغل دنیوی کو بند کرنے والا، ان کے کاروبار زراعت سے روکنے والا، ان کو مسجد کی طرف متوجہ کرنے والا، ان کو نماز کی جانب رغبت دلانے والا، ان کی جبین نیاز کو جھکانے والا، اگر کوئی دن ہے تو یہی جمعہ کا دن ہے۔ اس دن کا ان کے قلوب میں بڑا احترام ہے، اس دن لوازم نیاز مندگی کا اظہار کرنا ان کے نزدیک نہایت ضروری کام ہے، اس روز وہ لوگ نماز جمعہ کو ایسا امر اہم تصور کرتے ہیں کہ جو اس میں شرکت نہ کرے اس پر زبان طعن دراز کرتے ہیں، اس کو معیوب نظروں سے دیکھتے ہیں، پھر یہ بھی مشاہدہ ہے کہ اس نماز جمعہ کی وجہ سے بعض لوگ ایک دو روز بعض تین چار روز تک نماز کی پابندی بھی کر لیتے ہیں، بعض اپنے جذبہ شوق میں شہر میں جمعہ کے لئے چلے جاتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ گاؤں میں جمعہ ہونے کی وجہ سے مسجد میں زینت ہوتی ہے، نمازیوں کی کثرت ہوتی ہے، نماز کی تبلیغ ہوتی ہے، دین داری کی ترویج ہوتی ہے، طہارت کا ذوق دعاء و مناجات کا ذوق پیدا ہوتا ہے، بلکہ اس کے طفیل میں اور دو تین روز تک نماز ادا کرنے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

لہذا ان امور کو مد نظر رکھتے ہوئے گاؤں میں جمعہ کی جماعت کو جاری رکھنا قابل لحاظ اور قرین مصلحت ہے، بلکہ دیہات کے حالات پر مطلع ہونے کے بعد ہر مذہبی دردر کھنے والا شخص اس چیز کے لئے مضطر ہو جائے گا کہ ان میں جمعہ کی جماعت کو قائم رکھا جائے اور ان کے قلوب سے اس شعار مسلمین کا احترام کم نہ کیا جائے اور اس نازک دور میں ان کی اس قابل قدر رغبت کو کھینچ نہ لگائی جائے۔ ”مگر تعجب ہے ان مفتیوں پر جو ان تمام مصالح دینی سے آنکھیں بند کر کے جمعہ کو بند کرانے کے درپے ہو گئے ہیں، تو نہ ایسے مفتیوں کا حکم قابل عمل ہے، نہ ایسا فتویٰ لائق اعتماد ہے، یہ لوگ اگر غور کرتے“ تو شریعت میں ایسی بکثرت نظیریں موجود ہیں جن میں فقہائے کرام نے عوام کو فعل مکروہ سے محض ان کی امور خیر سے قلت رغبت اور ان سے خوف ترک فرض کا لحاظ فرماتے ہوئے نہیں منع کیا۔ ہم بخوف طوالت اس وقت صرف

دو نظیریں اسی سلسلہ نماز ہی میں پیش کرتے ہیں۔

علامہ شامی بحر سے بحوالہ تجنیس ناقل ہیں:

ان كسالى العوام اذا ضلوا الفجر عند طلوع الشمس لا يمنعون لانهم اذا صنعوا تركوها اصلا وادائها مع تجويز اهل الحديث لها اولی من تركها اصلا۔

(شامی مصری ج ۱ ص ۵۸۲)

عوام کے سست لوگ جب نماز فجر بوقت طلوع آفتاب پڑھیں تو انہیں منع نہ کیا جائے اس لئے کہ جب وہ منع کئے گئے تو وہ اس نماز کو بالکل ہی نہ پڑھیں گے اور محدثین کی تجویز پر اس وقت اس نماز کا ادا کرنا اس کے بالکل نہ پڑھنے سے بہتر ہے۔

علامہ شامی ردالمحتار میں اس عبارت کے چند سطر بعد فرماتے ہیں:

عدم منعهم عن صلاة الفجر عند طلوع الشمس لان ذلك لخوف تركها اصلا فيقع التارك في محذور اعظم۔ (ردالمحتار مصری ج ۱ ص ۵۸۲)

طلوع آفتاب کے وقت نماز فجر سے ان لوگوں کو منع نہ کرنا اس لئے ہے کہ اس میں بالکل نماز نہ پڑھنے کا خوف ہے تو وہ ترک نماز کے گناہ عظیم میں واقع ہو جائے گا۔

اسی طرح عوام کو عید گاہ میں عید کے دن نماز نفل سے نہیں روکا جاتا ہے درمختار میں ہے۔

اما العوام فلا يمنعون من تكبير ولا بنفل اصلا لقله رغبتهم في الخيرات۔

(شامی مصری ج ۱ ص ۵۸۲)

ان عبارات میں صاف طور پر موجود ہے کہ عوام کے سست لوگ نماز فجر بوقت طلوع آفتاب بھی پڑھیں تو انہیں اس وقت مکروہ میں بھی نماز پڑھنے سے منع نہ کیا جائے گا بخوف اس بات کے کہ وہ پھر نماز بالکل ہی نہ پڑھیں گے اور ان کی اس وقت مکروہ پر نماز کو محض ایک قول ضعیف کی تجویز پر اولیٰ قرار دیا گیا اور انہیں تارک کے فرض کے گناہ عظیم میں واقع ہونے سے بچالیا گیا اسی طرح عوام کو ان کے امور خیر میں رغبت کم ہونے کی بنا پر عید گاہ میں نفل نماز سے نہیں منع کیا جاتا۔

بالجملہ فقہائے کرام نے جب عوام کے لئے خوف ترک فرض اور ان کی امور خیر سے کم رغبتی کا اس قدر لحاظ فرمایا کہ انہیں اسی بنا پر فعل مکروہ سے نہیں روکا اور ان کے فعل کو قول ضعیف کی بنا پر اولیٰ قرار دیا تو کیا گاؤں کے جمعہ میں ان امور کا لحاظ نہیں کیا جائے گا بلکہ گاؤں میں جمعہ کی جماعت بند کرنے میں نہ

فقط ایک فرض کے ترک ہونے بلکہ چند فرائض کے ترک ہو جانے کا نہ صرف خوف بلکہ یقین ہے۔ ”تو کیا ان مفتیوں کے قول سے گاؤں میں جمعہ کی جماعت توڑ کر ان لوگوں کو ترک فرائض کے گناہ عظیم میں مبتلا کر دیا جائے“۔ پھر نیز گاؤں کے لوگوں کی نماز سے بے رغبتی کا حال کسی پر پوشیدہ نہیں ہے۔

لہذا اب جمعہ کی جماعت کس بنیاد پر بند کی جاسکتی ہے اور جب یہ مشاہدہ ہے کہ جمعہ کی نماز کی وجہ سے دو تین روز تک اور بھی چند اوقات کی نماز وہ لوگ پڑھ لیتے ہیں۔ ”تو ان مفتیوں کے نزدیک یہ دو تین روز کی نمازیں بالکل قابل لحاظ نہیں“۔ علاوہ بریں ہمارے نزدیک قول رائج و اصح کی بنا پر گاؤں پر تعریف مصر صادق نہیں آتی لیکن دوسرا قول مرجوح جو اکثر فقہاء کے نزدیک مفتی بہ بھی ہے اس کی بنا پر گاؤں مصر ہے اور آپ نے ابھی سنا کہ فقہاء نے ایک قول ضعیف کی بنا پر بخوف ترک فرض فعل مکروہ اولیٰ قرار دیا تو یہاں کیا جماعت جمعہ کو بخوف ترک فرائض قول مفتی بہ کی بنیاد پر بھی اولیٰ نہ قرار دیا جائے گا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ فقہاء کرام کی یہ دونوں نظیریں دیکھتے ہوئے گاؤں میں جمعہ کی جماعت کو بند کرنا سخت غلطی ہے لوگوں کو گناہ عظیم میں واقع کرنے کی تجویز ہے اور ان کے قلوب سے اس شعار مسلمین کی عظمت کم ہو جانے کی تدبیر ہے تعجب ہے کہ ان مفتیوں کو ایسی جرأت ودیوری کرتے ہوئے خوف الہی نہیں معلوم ہوتا یہ لوگ حضرت مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ کا فرمان دیکھ کر کچھ سبق حاصل کریں۔

درمختار میں اس عبارت مذکورہ کی دلیل بنا کر قول نقل کیا:

لان عليا رضى الله تعالى عنه راي رجلا يصلي بعد العيد فقيل اما تمنعه يا امير المؤمنين فقال اخاف ان ادخل تحت الوعيد قال الله تعالى ارأيت الذي ينهى عبدا اذا صلى۔ (شامی ج ۱ ص ۵۸۳)

کیونکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شخص کو بعد نماز عید نفل نماز پڑھتے ہوئے دیکھا عرض کیا گیا اے امیر المؤمنین کیا آپ اس کو نماز نفل پڑھنے سے منع نہیں فرماتے تو فرمایا میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ میں بھی اللہ تعالیٰ کے فرمان کی اس وعید میں داخل نہ ہو جاؤں بھلا دیکھتے تو جو منع کرتا ہے بندے کو جب وہ نماز پڑھے۔

بالجملہ گاؤں میں جب جمعہ ہوتا ہے تو اس کی جماعت کو قائم رکھا جائے گا اور برابر جمعہ کو پڑھا جائے گا۔ ”بلکہ اس کی شرکت کی لوگوں کو ترغیب دلائی جائے اور کسی ایسے غلط فتوے کی وجہ سے جمعہ کو بند نہ کیا جائے“۔ البتہ گاؤں کے لوگوں کو اس کے بعد ظہر کی نماز ادا کرنی ضروری اور فرض ہے۔

علامہ شامی رد المحتار میں جو اہر سے ناقل ہیں۔

ولو صلوا فی القرى لزهمم اداء الظهر۔ (شامی ج ۱ ص ۵۶۰)

اگر گاؤں میں جمعہ کی نماز پڑھیں تو انہیں ظہر کا ادا کرنا بھی لازم ہے۔

لیکن ظہر کے ادا کرنے کی بہتر صورت یہ ہے۔ جو علامہ خیر الدین ربلی کے فتاویٰ خیر یہ میں ہے جس کی عبارت یہ ہے:

والاحتياط في القرى ان يصلى السنة اربعاً ثم الجمعة ثم ينوي اربعاً سنة الجمعة ثم يصلى الظهر ثم يصلى ركعتين سنة الوقت فهذا هو الصحيح المختار۔

(فتاویٰ خیر یہ مصری ص ۱۲)

گاؤں میں احتیاط یہ ہے کہ چار رکعت سنت پڑھے پھر جمعہ پھر چار رکعت سنت پڑھے جمعہ کی نیت کرے پھر ظہر پڑھے پھر دو رکعتیں سنت وقت کی پڑھے یہی قول صحیح مختار ہے۔

حاصل جواب یہ ہے کہ جس گاؤں میں جمعہ ہوتا ہے اس کو ہرگز بند نہ کیا جائے بلکہ اس کی جماعت کو برابر قائم رکھا جائے اور جمعہ کو پڑھا جائے اور اس کے بعد چار رکعت سنت جمعہ پڑھ کر پھر ظہر کو ضرور ادا کیا جائے اس کے بعد دو رکعت سنت وقت اور نفل پڑھے منصف کے لئے یہ جواب نہایت کافی وافی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم الصواب

کتبہ: المقتضی بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۲۹۹ھ

(۲۲۹)

مسئلہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ احناف رحم کرے اللہ آپ لوگوں پر اور برکت دے علم میں کہ فیض پہنچاتے ہیں علم سے خلایق کو اس مسئلہ میں کہ۔

ہمارا گاؤں جو سات آٹھ سو گھر آبادی پر مشتمل ہیں لیکن اس میں نہ کوئی نہر اور نہ بازار ہے عرصہ بعید سے ایک بڑی مسجد میں (جو جامع مسجد کے نام سے موسوم ہے) لوگ نماز جمعہ پڑھتے چلے آ رہے تھے، اب دو چار ماہ سے ایک دوسری چھوٹی سی مسجد کے امام نے ازراہ عناد و حسد و تحریب جامع مسجد قدیمہ یہ حیلہ تراش کر کہ جامع مسجد کا خطیب داڑھی سنت سے کم رکھتا ہے یعنی کتر و اتا ہے اس کے پیچھے نماز جمعہ نہیں

ہوسکتی اسی چھوٹی مسجد میں الگ نماز جمعہ پڑھا رہا ہے نیز دو ماہ سے ایک سید مولوی صاحب ہمارے گاؤں آئے ہوئے ہیں جو اپنے آپ کو (الرضوی الحنفی الکشتی النظامی الخراسانی الہروی) لکھتے ہیں انہوں نے ایک تیسری چھوٹی سی مسجد میں مذکورہ بالا حیلہ تراش کر براہ عناد و حسد و تحریب جامع مسجد قدیمہ الگ نماز جمعہ پڑھانی شروع کر دی ہے سید صاحب موصوف سے اگر کوئی شخص تعدد نماز جمعہ کے متعلق اور شرائط اداۓ صحت نماز جمعہ کے متعلق مسئلہ دریافت کرتا ہے تو سید صاحب مدوح ارشاد فرماتے ہیں کہ شرائط نماز جمعہ جو کتب فقہ میں مندرج ہیں وہ فرقہ معتزلہ اور رافضیہ کی بنائی ہوئی ہیں نہ کہ جمہور ائمہ حنفیہ کی مزید برآں یہ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ نماز جمعہ بغیر شرائط کے ہر قریہ کی دو چار مسجدوں میں (خواہ قریہ صغیرہ میں (۳۰) گھر کی آبادی پر مشتمل ہو) پڑھ لینا جائز ہے کیونکہ نماز جمعہ عین فرض ہے نہ کہ مقید بالشرائط۔ و نیز صاحب مدوح سید صاحب نماز جمعہ جو نہ پڑھنے والے شخص کو بحوالہ مشکوٰۃ شریف منافق کہتے ہیں۔

اب دریافت طلب امور یہ ہیں کہ۔

(۱) مذکور بالا آبادی کا قریہ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟

(۲) مذکورہ بالا آبادی کے قریہ میں (جس کا اطلاق عرف عام میں قدیم الایام سے قریہ چلا

آتا ہے) امام اعظم کے مذہب پر نماز جمعہ جائز ہے یا نہیں؟

(۳) مذکورہ بالا قریہ میں امام اعظم کے مذہب پر مذکورہ بالا حیلہ تراش کر دو چار مسجدوں میں نماز

جمعہ پڑھانی جائز ہے یا نہیں؟

(۴) آیا سید صاحب موصوف جو شرائط اداۓ صحت نماز جمعہ کے انکاری ہیں اور شرائط اداۓ

صحت نماز جمعہ کو فرقہ معتزلہ و رافضیہ کی بنائی ہوئی بتلاتے ہیں اور کتب فقہ کو مشکوک بتلاتے ہیں وہ

(الرضوی الحنفی الکشتی النظامی الخراسانی الہروی) کہلانے کے مستحق ہیں یا نہیں اور وہ لامام و خطیب ہونے

کے مستحق ہیں یا نہیں؟

(۵) آیا بموجب ارشاد صاحب مذکور صاحب کنز و قدودی و ہدایہ و شرح وقایہ جنکی مصنفہ سب

میں شرائط اداۓ صحت نماز جمعہ مندرج ہیں (واقعی معتزلہ و رافضی حق پر تھے یا نہیں۔

(۶) اگر نہیں تو فقہائے کرام پر افترا و اتہام ہے یا نہیں؟

(۷) اگر افترا و اتہام ہے تو سید صاحب مذکور از روئے شریعت کس تعزیر کے مستوجب ہیں؟

(۸) آیا واقعی بموجب ارشاد سید صاحب نماز جمعہ عین فرض ہے یا مقید بالشرائط؟

(۹) اگر مقید بالشرائط ہے تو شرائط کا اثبات آیات شریف اور حدیث سے ہے یا محض قیاس میں مجتہد سے اور موقوف علیہ ہونے میں جمعہ کے لئے برابر ہیں یا نہیں؟۔

(۱۰) اگر شرائط جمعہ کا اثبات آیت شریف اور حدیث شریف سے ہے تو بحوالہ کتب معتبرہ تفسیر وحدیث وفقہ مفصل ومدلل متفق علیہ تحریر فرمادیں؟۔

(۱۱) نیر جمعہ کی نماز اگر مقید بالشرائط ہے تو باوجود مفقود ہونے شرائط کے جو شخص نماز جمعہ نہ پڑھے وہ بموجب ارشاد سید صاحب مذکور واقعی منافق ہے یا کیا اگر منافق نہیں ہے۔ تو منافق کہنے والے پر از روئے شریعت کیا تعزیر عاید ہوتی ہے؟۔

(۱۲) ازراہ عناد وحسد و تخریب جامع مسجد قدیمہ ایک قریہ کی دو تین مسجدوں میں نماز جمعہ پڑھنا امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے مذہب پر جائز ہے یا کیا؟ جیسا کہ آج کل ہمارے گاؤں میں پڑھی جارہی ہے؟۔ بینوا تو جروا

نوٹ:- ہر ایک امور مذکورہ بالا کا جواب باصواب بدلائل عقلی و فلتی بحوالہ کتب معتبرہ تفسیر وحدیث وفقہ بمعہ ترجمہ اردو عبارات عربیہ مفصل ومدلل متفق علیہ ہوتا کہ جواب الجواب کی نوبت نہ آئے نیز سوالات ہمراہ جوابات واپس ارسال فرما کر مشکور و ممنون فرمائیں عین مہربانی ہوگی۔

المستفتی احقر العباد غلام رسول ولد چوہدری غلام مصطفیٰ صاحب کھوکرا چپوت متوطن خاجیوالہ تحصیل ضلع گجرات (پنجاب) ۱۳-۶-۴۱

الجواب

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ الصلوٰۃ والتسلیم اہل اسلام میں ایسا اختلاف وگروہ بندی نہایت مذموم اور بہت زیادہ قابل افسوس ہے۔ اگر کاش مسلمان اپنی ذاتی عداوتوں اور نفسانی اغراض کو پس پشت ڈال کر احکام شرعی پر عمل کرنے کا خلوص قلب سے مصمم ارادہ کر لیں تو کوئی اختلاف ہی رونما نہ ہو اور بیچارے عوام گروہ بندی کی مصیبت سے نجات پائیں۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ چند خود غرض عالم بکمر نواقف مسلمانوں میں اپنا علمی وقار قائم کر لیتے ہیں اور اپنے حصول غرض کے رات دن نیا اختلاف پیدا کرتے رہتے ہیں عوام ان کا شکار بن جاتے ہیں اور گروہ بندی کے دلدل میں پھنس جاتے ہیں اور یہ جستجو نہیں کرتے کہ شریعت مطہرہ کا اس میں کیا حکم ہے اس اختلاف میں کون حق پر ہے اور کون باطل پر قرآن کریم نے ہر ایسے اختلاف کے ختم کرنے کا یہ طریقہ تعلیم

فرمایا ہے۔

فاسئلوا اہل الذکر ان کنتم لاتعلمون۔

یعنی اگر تم کسی چیز کو نہیں جانتے ہو تو جاننے والوں سے دریافت کرو۔

لہذا مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنے ہر اختلاف میں معتمد و مستند علماء کرام و مفتیان عظام سے فتوے طلب کریں اور حکم شرعی کے ظاہر ہو جانے کے بعد اپنے تمام اختلافات کو ختم کر دیں اور آپس میں محبت و دراد و الفت و اتحاد پیدا کریں اور خود غرضوں کی کسی بات کی طرف التفات و توجہ نہ کریں۔

بالجملہ میں اپنی عدیم الفرستی کیوجہ سے اس وقت مفصل اور مبسوط جوابات پیش کرنے سے قاصر ہوں مختصر جواب دیا جائے گا جو مدلل ہوگا جس میں بغیر کسی کی جانب داری کے صریح الفاظ میں حکم شرعی کا اظہار کر دیا جائے گا اور طالب حق کے لئے بہت کافی ثابت ہوگا اور معاند اور متعصب کے لئے دفتر کے دفتر ناکافی ہیں۔

(۱) اگر فی الواقع اس آبادی میں سات آٹھ سو گھر ہیں اور مسلمانوں کی اکثریت ہے اور اس میں

چند مساجد ہیں تو اس کے قریہ کبیرہ ہونے میں کیا کلام ہے جب کہ فقہاء کرام کے ایک قول مفتی بہ کی بنا پر غالباً اس پر مصر کی تعریف بھی صادق آجائے۔

در مختار میں ہے: المصر وهو مالا یسع اکبر مساجدہ اہلہ المکلفین بہا وعلیہ فتویٰ

اکثر الفقہاء۔

یعنی مصر وہ آبادی ہے جس کی بڑی مسجد میں وہاں کے مکلف مسلمان سمانہ سکیں اور اس قول پر اکثر فقہاء کا فتویٰ ہے۔

اگرچہ ہمارے نزدیک مصر کی وہ تعریف زیادہ معتمد ہے جو خود صاحب مذہب حضرت امام ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

عن ابی حنیفۃ انہ بلدۃ کبیرۃ فیہا سکک واسواق ولہا رساتیق و فیہا وال یتقدر علی انصاف المظلوم من الظالم بحشمہ و علمہ او علم غیرہ یرجع الناس الیہ فیما یقع من الحوادث وهذا هو الاصح۔ (شامی ص ۵۶۰)

یعنی امام اعظم علیہ الرحمۃ سے مروی ہے کہ مصر وہ بڑی آبادی ہے جس میں چند کوچے اور بازار

ہوں اور اس کے متعلق دیہات ہوں اور اس میں کوئی ایسا حاکم ہو جو اپنی سطوت اور علم سے یاد دوسرے کے علم سے ظالم سے مظلوم کے انصاف پر قادر ہو لوگ اس کے یہاں حوادث میں رجوع کرتے ہیں یہی تعریف زیادہ صحیح ہے۔

بالجملہ اس آبادی مذکور پر یہ تعریف صادق نہیں آتی تو اس کا مصر ہونا تو ثابت نہیں ہوا اور اس قدر بردست آبادی کو باوجود چند مساجد کے قریہ صغیرہ قرار دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا تو اس آبادی مذکور کو قریہ کبیرہ ہی مانا جائے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) اس آبادی مذکور کا جب کبیرہ ہونا متحقق ہو تو قریہ کبیرہ میں وجوب جمعہ کا تو حکم دیا نہیں جاتا لیکن مذہب مختار کی بنا پر جمعہ پڑھنے کے بعد احتیاط الظہر پڑھنے کا حکم دیا جائے گا۔ فتاویٰ خیرہ میں ہے:

والاحتیاط فی القرى (الكبيرة) ان یصلی السنة اربعاً ثم الجمعة ثم اربعاً من الجمعة ثم یصلی الظہر ثم یصلی الرکعتین سنة الوقت فهذا هو الصحیح المختار۔ (فتاویٰ خیرہ ص ۱۲۵)

غنیۃ شرح منیہ میں ہے:

قالوا فی کل موضع وقع الشک فی جواز الجمعة ینبغی ان یصلی اربع رکعات وینوی بہا الظہر حتی لو لم تقع الجمعة موقعها ینخرج عن عہدہ فرض الوقت ینیقین کذا فی الکافی قال فی فتاویٰ الحجۃ هذا فی القرى الکبیرة۔ (غنیۃ ص ۵۱۲)

ان عبارات کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ بڑے گاؤں میں احتیاط یہ ہے کہ چار سنت پڑھے پھر جمعہ پھر چار جمعہ کی سنت پڑھے پھر ظہر پھر دو رکعت سنت وقت کی پڑھے یہی مذہب صحیح و مختار ہے اور فقہاء نے فرمایا ہر وہ مقام جس میں جمعہ کے جائز ہونے میں شک ہو تو وہاں بہ نیت ظہر چار رکعت پڑھنا مناسب ہے یہاں تک کہ اگر جمعہ ادا نہیں ہوا تو وہ فرض وقت کے ذمہ سے تو یقیناً نکل جائے گا اسی طرح کافی نما ہے اور فتاویٰ حجہ میں فرمایا کہ یہ حکم بڑے قریہ میں ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ قریہ کبیرہ میں جمعہ کی ممانعت نہیں البتہ اس کے بعد احتیاط الظہر بنا بر مذہب مختار کے ادا کی جائے۔ لہذا جب مذکورہ آبادی کا قریہ کبیرہ ہونا ثابت ہو چکا تو اس میں جمعہ پڑھ سکتے ہیں البتہ اس کے بعد احتیاط الظہر کو پڑھنا چاہیے اور اس تفصیل و ترتیب سے ادا کیا جائے جس کا

ذکر اور گذرا کہ اس طریقہ میں فرض وقت یقین ذمہ سے ساقط ہوتا ہے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ (۳) جس آبادی پر بہ یقین مصر کی تعریف صادق آرہی ہے خود اس میں بھی تعدد جمعہ کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔

کبیری میں ہے: وامامن حیث جواز التعدد وعدمہ فالاولیٰ هو الاحتیاط لان الخلاف فیہ قوی اذ الجمعة جامع للجماعت ولم تکن فی زمن السلف تصل الا فی موضع واحد من المصر و کون الصحیح جواز التعدد وللضرورة للفتویٰ لا یمنع شرعیہ الاحتیاط للتقویٰ۔ (کبیری ص ۵۱۲)

ردالمحتار میں ہے: جواز التعدد وان کان ارجح واقوی دلیلاً لکن فیہ شبہ قوی لان خلافہ مروی عن ابی حنیفہ ایضاً واختارہ الطحاوی والتمرتاشی وصاحب المختار وجعلہ العنابی الاظہر وهو مذهب الشافعی والمشہور عن مالک واحدی الروایتین عن احمد کما ذکر المقدسی فی رسالۃ نور الشمعة فی ظہر الجمعة بل قال السبکی من الشافعیۃ ان قول اکثر العلماء ولا یحفظ عن صحابی ولا تابعی تجویز تعددہا۔ (ردالمحتار ج ۱ ص ۵۶۵)

ان عبارات کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ تعدد جمعہ میں خلاف بہت قوی ہے کہ جمعہ تمام جماعتوں کا جامع ہے اور زمانہ سلف میں مصر میں بھی ایک ہی جگہ پر نماز ہوتی تھی اور تعدد جمعہ کا جواز فتویٰ کی ضرورت کے لئے ہے تو یہ تقویٰ کے لئے احتیاط کی مشروعیت کو مانع نہیں اور تعدد جمعہ کا جواز اگر باعتبار دلیل کے رائج اور قوی ہے لیکن اس میں قوی شبہ بھی ہے کہ اس کے خلاف امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی اور اس کو طحاوی اور تمرتاشی اور صاحب مختار نے اختیار کیا اور عتابی نے اسی کو اظہر مانا اور یہی امام شافعی کا مذہب ہے اور امام مالک کا قول مشہور اور امام احمد سے یہ مروی ہے امام سبکی نے فرمایا کہ یہ اکثر علماء کا قول ہے اور کسی صحابی و تابعی سے تعدد جمعہ کی تجویز محفوظ نہیں۔

اگرچہ مصر میں قول اصح کی بنا پر تعدد جمعہ کو جائز قرار دیا گیا مگر مصر میں بھی افضل یہی ہے کہ بلا عذر شرعی جمعہ جامع مسجد ہی میں پڑھا جائے۔

غنیۃ میں ہے:

والافضل هو الجامع الواحد وذلك للخروج من الخلاف والخروج عن العہدۃ

(غنیۃ ص ۵۱۲)

بیقین -

تو وہ قریہ کبیرہ جس میں جمعہ کا جواز ہی محل تردد و شک میں ہے اس میں تعدد جمعہ کی کس طرح اجازت ہو سکتی ہے۔

بالجملہ مذکورہ بالا آبادی میں جامع مسجد ہی میں جمعہ ہونا چاہئے متعدد مساجد میں نہیں پڑھنا چاہئے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۴ تا ۷) شخص مذکور سخت جاہل ہے اور دین سے بے بہرہ ہے اور احکام شریعت سے بے خبر ہے اور کتب فقہ کا منکر ہے سلف و خلف کا مخالف ہے فقہاء کرام کا دشمن اور بدگو ہے اس پر توبہ اور استغفار لازم ہے اور تجدید ضرور ہے شرح فقہ اکبر میں ہے ”من ابغض عالما من غیر سبب ظاہر خیف علیہ الکفر قلت الظاہر انہ یکفر“ یعنی جس نے کسی عالم سے بغیر کسی سبب ظاہر کے بغض رکھا تو اس پر خوف کفر ہے۔ ملا علی قادری فرماتے ہیں کہ میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہ ہے کہ وہ کافر ہو جائیگا۔ لہذا شخص مذکور اس عبارت میں اپنا حکم دیکھے کہ فقہائے کرام کو بلا وجہ معتزلہ ورافضی کہہ کر اپنی عداوت قلبی اور بغض دلی کا صاف طور پر اظہار کر رہا ہے تو جب تک یہ شخص تائب نہ ہو اسکو امام نہ بنایا جائے۔ نہ اس سے سلام وکلام روا واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۸ تا ۱۰) نماز جمعہ فرض عین ہے۔ نور الایضاح و مرقا الفلاح میں ہے:

صلوٰۃ الجمعة فرض عین بالكتاب و السنة و الاجماع (طحاوی صفحہ ۲۹۱)

یعنی جمعہ کی نماز کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور اجماع امت سے فرض عین ہے۔

شخص مذکور کی یہ انتہائی جہالت ہے کہ وہ فرض عین کا مقابل فرض مقید بالشرائط قرار دیتا ہے اگر کسی معمولی طالب علم سے بھی دریافت کر لیتا تو اسکی یہ جہالت طشت از بام نہ ہوتی، پھر وہ فرض عین کے کیا معنی سمجھتا ہے کیا اس کے نزدیک شرائط کی قید فرض عین کی عینیت کو باطل کر دیتی ہے، اگر اس کے ذہن میں ایسا ہی ہے تو کیا اس کے ناپاک خیال میں نماز پنجگانہ مقید بالشرائط نہیں ہیں باوجودیکہ یہ فرض عین ہیں کیا وہ طہارت ستر عورت وقت نیت وغیرہ کو نماز کے شرائط نہیں جانتا اگر جانتا ہے تو کیا یہ نماز کے فرض عین ہونے کے منافی ہے، پھر جمعہ کے شرائط کا ثبوت آیات سے بھی ثابت ہے۔

چنانچہ تفسیر احمدی میں ہے: ان ثلاثة نفر يشترط في الجمعة سوى الامام عند

حنيفه خلا فالفهما و الحجة له قوله فاسعوا الى ذكر الله (احمدی صفحہ ۳۵)

اسی میں ہے: کما شرط لو جوب الجمعة اشروط الستة المذكورة لذلك يشترط لصحت ادائها ستة اخرى المصر او فنائه (احمدی صفحہ ۳۸۶)

ان عبارات کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ جمعہ میں امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نزدیک سوا امام کے تین شخصوں کا ہونا شرط ہے اور ان کی دلیل یہ آیت ہے اللہ کے ذکر کی طرف سعی کرو اور جس طرح و جوب جمعہ کے لیے چھ شرطیں ہیں اسی طرح اس کی صحت ادا کے لیے چھ شرطیں اور ہیں مصروف تائے مصرو وغیرہ اس طرح احادیث سے بھی ثابت ہے چنانچہ بیہقی میں بروایت حضرت علی کرم اللہ وجہہ حدیث میں مروی ہے ”لا جمعة الا في مصر جامع“ (ایضاً البہاری صفحہ ۵۲۷)

یعنی جمعہ مصر ہی میں ادا ہوتا ہے۔ یہ بطور نمونہ جمعہ کے شرائط کا ایک ایک آیت و حدیث سے اثبات کیا گیا ورنہ جمعہ کی ہر شرط آیت یا حدیث سے مستفاد ہے۔ بالجملہ شخص مذکور کا قول سراسر باطل ہے اور اس کی جہالت کی بین دلیل ہے مولیٰ تعالیٰ اسکو ہدایت کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۱۱) نماز جمعہ فی الواقع مقید بالشرائط ہے جیسا کہ اوپر کے جوابات سے ظاہر ہو چکا اور حدیث شریف میں اس تارک جمعہ کو منافقین میں شمار فرمایا ہے جو شرائط جمعہ کے موجود ہوتے ہوئے ادا کئے جمعہ پر قادر ہو کر بقصد جمعہ ترک کرے، چنانچہ الفاظ حدیث سے خود ظاہر ہے ”من ترك الجمعة من غير ضرورة كتب منافقا“ لیکن جو شرائط مفقود ہونے کی بنا پر جمعہ نہ پڑھے اس کو منافق کہنا مفہوم حدیث کے خلاف ہے اور اپنی رائے سے دین میں مداخلت ہے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۱۲) اس کا جواب نمبر ۳ میں گذرا کہ قریہ کبیرہ میں چند مساجد میں جمعہ نہ قائم کیا جائے پھر بلا عذر محض تخریب جامع مسجد کی نیت سے کرنا بہت قبیح مذموم ہے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۴۳۰)

مسئلہ

الحمد لله رب العلمين والعاقبة للمتقين اما بعد سلام و آداب -

عرض یہ ہے کہ جب خطیب منبر پر ہو اور مؤذن اذان پڑھے تو اذان کے بعد امام و مقتدیوں کو دعا

پڑھنی چاہئے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں علمائے دین کیا فرماتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ آپ پر رحمت فرمائے۔

المستفتی بشیر حسین از حسن پور

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جمعہ کے دن خطیب کے روبرو مؤذن اذان ثانی کہہ کر فارغ ہو تو خطبہ شروع کر دے۔

چنانچہ ابوداؤد شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے:

كان النبي صلى الله تعالى عليه وسلم يخطب خطبتين كان يجلس اذا صعد المنبر

حتى يفرغ اراه المؤذن ثم يقوم فيخطب ثم يجلس فلا يتكلم ثم يقوم فيخطب -

(ابوداؤد شریف مجتبیٰ ج ۱ ص ۱۶۳)

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دو خطبے پڑھتے تھے اور جب منبر پر تشریف لیجاتے اور خطبہ

پڑھتے پھر بیٹھ جاتے اور کوئی کلام نہ فرماتے پھر کھڑے ہو جاتے اور خطبہ پڑھتے۔

ابوداؤد نے اپنے مراسیل میں حضرت ابن شہاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی:

بلغنا ان رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم كان يبدأ فيجلس على المنبر

فاذا سكت المؤذن قام فخطب فيخطب الخطبة الاولى ثم جلس شيئا يسيرا ثم قام فخطب

الخطبة الثانية حتى اذا قضاها استغفر الله ثم نزل فصلى - (صحیح البہاری ج ۲ ص ۵۳۳)

ہمیں یہ بات پہنچی کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خطبہ شروع کرتے اور منبر پر جلوس فرماتے

پس جب مؤذن خاموش ہو جاتا تو کھڑے ہو جاتے اور خطبہ اولیٰ پڑھتے پھر کچھ دیر بیٹھتے پھر کھڑے

ہو جاتے اور خطبہ دوسرا پڑھتے یہاں تک کہ جب اسے پورا فرما لیتے تو استغفار کرتے پھر منبر

سے نیچے تشریف لاتے اور نماز پڑھاتے۔

ابن مندہ نے حضرت سعید بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی:

كان النبي صلى الله تعالى عليه وسلم يخرج فيجلس على المنبر يوم الجمعة ثم

يؤذن المؤذن فاذا فرغ قام يخطب - (صحیح البہاری ج ۲ ص ۵۳۲)

نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف لاتے اور جمعہ کے دن منبر پر جلوس فرماتے پھر جب مؤذن

اذان کہہ کر فارغ ہو جاتا تو حضور کھڑے ہو جاتے اور خطبہ پڑھتے۔

طبرانی نے کبیر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی:

قال رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم اذ دخل احدكم المسجد والامام على

المنبر فلا صلاة ولا كلام حتى يفرغ الامام - (صحیح البہاری ج ۲ ص ۵۴۴)

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا جب تمہارا کوئی شخص مسجد میں پہنچے اور امام منبر پر ہو تو

اس کے فارغ ہونے تک نہ کوئی نماز پڑھے نہ کوئی کلام۔

پہلی تین احادیث سے یہ ثابت ہوا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مؤذن کے اذان سے فارغ

ہونے اور خاموش ہو جانے کے بعد خطبہ کے لئے کھڑے ہو جاتے اور خطبہ شروع کر دیتے تھے لہذا فعل

شارع علیہ السلام میں اذان اور خطبہ کے درمیان دعا کرنے کی تصریح مذکور نہیں ہے اور چوتھی حدیث میں

حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صاف طور پر یہ فرمایا کہ امام کے منبر پر پہنچنے سے فارغ ہونے تک

کوئی کلام اور نماز نہیں اور ظاہر ہے کہ کلام کا عموم دعا کو بھی شامل تو اس حدیث سے دعا کی ممانعت مستفاد

ہو رہی ہے اسی طرح کتب فقہ میں اس دعا کا ثبوت نہیں ملتا فقہ کی مشہور کتاب۔

در مختار میں ہے اور وہ حاوی قدسی سے ناقل ہیں۔

اذا فرغ المؤذن قام الامام - (رد المحتار ج ۱ ص ۵۷۷)

جب اذان کہنے والے فارغ ہو جائیں تو امام خطبہ کے لئے کھڑا ہو جائے۔

ہدایہ کے متن ہدایہ اور قدوری میں ہے:

اذا خرج الامام يوم الجمعة ترك الناس الصلاة والكلام حتى يفرغ من خطبته -

(ہدایہ ج ۱ ص ۱۵۱ جوہرہ نیرہ ج ۱ ص ۵۲)

جب امام جمعہ کے دن نکلے تو لوگ نماز اور کلام چھوڑ دیں یہاں تک کہ امام اپنے خطبہ سے فارغ

ہو جائے۔

جوہرہ نیرہ شرح قدوری میں اس عبارت کے تحت میں ہے:

المراد مطلق الكلام سواء كان كلام الناس او التسبيح او تشبیت العاطس

اورد السلام في العيون المراد به اجابة المؤذن اما غيره من الكلام يكره بالاجماع - (وفیه

ابضا) قيل خلاف في كلام يتعلق بالآخرة اما المتعلق بامور الدنيا فمكروه اجماعا وهذا

كله قبل الخطبة وبعدها امام فيها فلا يجوز شيء من الكلام والقرأة والذكر اصلاً۔

(جوہرہ نیرہ ج ۱ ص ۹۲)

مراد مطلق کلام ہے برابر ہے کہ لوگوں کا کلام ہو یا تسبیح ہو یا چھینکے والے کے لئے دعا کرنا ہو یا سلام کا جواب ہو اور عیون میں ہے کہ کلام سے مراد موزن کے کلمات کا جواب دینا ہے لیکن اس کے سوا اور کلام تو وہ باجماع مکروہ ہے اور بعض نے کہا کہ فقہاء کا اختلاف اس کلام میں ہے جو آخرت سے متعلق ہو لیکن وہ کلام جو امور دنیا سے متعلق ہو تو وہ اجماعاً مکروہ ہے اور یہ کل بحث خطبہ سے قبل اور بعد میں ہے لیکن خطبہ کے درمیان تو اس میں اصلاً کوئی کلام اور قرأت اور ذکر جائز نہیں۔

تنویر الابصار در مختار میں ہے: اذ خرج الإمام من الحجرة ان كان والا فقيامه للصعود شرح المجمع فلا صلاة والكلام الى تمامها۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۵۷۴)

جب امام حجرہ میں ہو اور اس سے نکلے ورنہ اس کا منبر پر خطبہ کے لئے کھڑا ہونا تو تمام خطبہ تک نہ کوئی نماز ہے اور نہ کوئی کلام۔

علامہ شامی قولہ الی تمامہا کے تحت میں محیط اور غایۃ البیان سے ناقل ہیں:

انہا یکرہان من حین ینخرج الإمام الی ان یفرغ من الصلوة۔

(رد المحتار ج ۱ ص ۵۷۴)

نماز اور کلام امام کے نکلنے کے وقت سے نماز سے فارغ ہونے تک مکروہ ہیں۔

ان عبارات سے یہ واضح ہو گیا کہ امام موزن کی اذان سے فارغ ہونے کے بعد ہی خطبہ کے لئے کھڑا ہو جائے تو اذان کے بعد اگر دعا ہوتی تو فقہاء کرام اس کی تصریح فرماتے لہذا اثابت ہوا کہ اذان و خطبہ کے درمیان کوئی دعا مسنون نہیں نیز متون فقہ میں یہ مسئلہ موجود ہے کہ خروج امام سے فراغت خطبہ تک کوئی کلام و نماز نہیں شارحین فرماتے ہیں کہ عین خطبہ میں تو مطلق کلام ممنوع حتیٰ کہ قرأت و ذکر بھی ناجائز اب رہا خطبہ کا قبل و بعد تو اس میں کلام دنیوی تو باجماع مکروہ ہے لیکن اجابت موزن و ذکر تسبیح اور جواب سلام وغیرہ کلام اخروی انہیں بھی لفظ کلام کے عموم داخل کر کے نفی کر دیا گیا تو دعا کلام ہوئی اور کلام کا خروج امام سے فراغت نماز تک مکروہ ہونا بتصریح فقہ ثابت ہے اور یہ دعا خروج کے بعد یا کہ اذان کے بعد میں ہے تو اس دعا کا مکروہ ہونا انہیں عبارات سے ہے بلکہ اس دعا کی کراہت خود قول امام اعظم علیہ الرحمہ سے مستفاد ہے۔

مراتی الفلاح میں ہے: کان ابو حنیفۃ رحمۃ اللہ علیہ بکرہ تسمیت العاطس و

(طحاوی ص ۳۰۱)

السلام اذا خرج الإمام حتى یفرغ من صلاته۔

امام ابو حنیفہ علیہ الرحمہ چھینکے والے کے لئے دعا کو اور سلام کے جواب کو خروج امام سے فراغت نماز تک مکروہ قرار دیتے تھے۔

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ جب خروج امام سے فراغت نماز تک جواب سلام مکروہ جو شرعاً ضروری بھی ہے تو یہ دعا تو نہ شرعاً ضروری ہے نہ سنت لہذا اس درمیان میں دعا کی کراہت کیوں نہ ہوگی خاص کر وہ وقت اجابت جس میں دعا کی بکثرت احادیث میں ترغیب ہے لیکن اس وقت میں زبان سے دعا کرنے کی اجازت نہیں صرف قلب سے دعا کرنا مسنون قرار دیا گیا۔ چنانچہ علامہ شامی اسی ساعت اجابت کے متعلق فرماتے ہیں۔

وفی هذه الساعة اقوال اصحها او من اصحها انها فيما بين ان يجلس الإمام على المنبر الى ان يقضى الصلوة كما هو ثابت في صحيح مسلم عنه صلى الله تعالى عليه وسلم ايضا حليه، قال في المعراج سن الدعاء بقلبة لا بلسانه لانه مأمور بالسكوت۔

(رد المحتار ج ۱ ص ۵۷۸)

ساعت اجابت میں چار اقوال ہیں اصح قول یہ ہے کہ وہ ساعت امام کے منبر پر بیٹھنے سے فراغت نماز تک کے درمیان ہے جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت سے ثابت ہے جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مروی حلیہ معراج میں کہا کہ دعا قلب سے مسنون ہے زبان کے ساتھ نہیں کیونکہ سکوت کا حکم کیا گیا ہے۔

تو یہ دعا جس کا ذکر احادیث میں بھی نہیں اس کو زبان سے کس طرح کیا جائے گا بالجملہ اذان و اذان کے بعد زبان سے دعا کرنے کی بلا کراہت اجازت نہ احادیث سے ثابت نہ تصریح فقہاء سے ظاہر نہ قول امام سے مستفاد اب اسکے محض رواج کو پیش کرنا کوئی دلیل شرعی نہیں رسم کو سند بنانا کسی عاقل کا کام نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المقتسم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنجل

(۴۳۱)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

موضع بھکاری پور میں دو مسجدیں ہیں۔ ایک چھوٹی مسجد اور ایک بڑی جامع مسجد جس میں سترہ سال سے زائد جمعہ قائم اور ہوتا آیا ہے۔ آبادی اس گاؤں کے کل مسلمان نماز جمعہ میں آجاتے ہیں تو بڑی جامع مسجد موضع بھکاری پور کی بھر جاتی ہے۔ اور کچھ مختصر نمازی مسجد کے دروازے کے باہر انتظام کے ساتھ نماز جمعہ پڑھ لیتے ہیں۔ ایسا اتفاق رمضان المبارک میں الوداع کو ہو جاتا ہے یا کثرت نمازیوں کے علاوہ رمضان المبارک کے اور زمانے میں کبھی جامع مسجد بھر جاتی ہے اور کبھی خالی رہ جاتی ہے۔ ایک جگہ نماز جمعہ ہونے میں شوکت اسلام اور اتفاق واتحاد آپس میں مسلمانوں کا ظاہر ہوتا ہے۔ ویسے تو گاؤں میں دنیاوی رنجش نا اتفاقیات گھٹی بڑھتی رہتی ہیں۔ مگر نماز جمعہ اور عیدین ایک جگہ گاؤں کے کل مسلمان جمع ہو کر مل جل کر پڑھنے میں میل ملاپ اسلامی شان و شوکت اتفاق محبت میں بڑی ترقی تقویت ہوتی ہے، کتاب قانون شریعت بیان جمعہ میں لکھا ہے کہ جمعہ شعائر اسلام سے ہے اور جامع جماعت ہے یعنی عند المؤمنین۔ اب قریب ایک ماہ سے دوسرے چھوٹی مسجد میں جمعہ پڑھنے لگے ہیں جس میں کل اہل محلہ کا اتفاق نہیں۔ کچھ جامع مسجد میں نماز جمعہ پڑھنے جاتے ہیں۔ اور بقیہ چھوٹی مسجد میں جمعہ پڑھتے ہیں۔ دریافت طلب یہ امر ہے جس میں اسلام کی شوکت گھٹی کم ہوتی ہو اور محلہ میں سے کچھ اتفاق نہ کرتے ہوں۔ اور محلہ اور گاؤں میں اسلامی اتحاد میں فرق آتا ہو۔ اور مسلمانوں کی جماعت کے ٹکڑے ہوتے ہوں ایسی صورت میں جامع مسجد کو چھوڑ کر چھوٹی مسجد میں جمعہ پڑھ سکتے ہیں جمعہ ہو جائیگا یا نہیں؟ اور پڑھنے پڑھانے سے رک جانا چاہئے یا نہیں؟۔ دونوں مسجدوں کی تعمیر سو سال زائد کی ہیں ابھی تک چھوٹی مسجد میں امام مقرر نہیں تھا ایک ماہ ہوا امام مقرر کرنے پر جمعہ بھی قائم کر لیا ہے آبادی مردم شماری دو ہزار جس میں آٹھ سو نابالغ بچے لڑکے لڑکیاں۔ چھ سو عورتیں اور چودہ سو مرد بالغ ہیں۔ دونوں مسجدوں میں جمعہ ہو جائیگا یا نہیں؟ شرع مطہرہ سے آگاہی فرمائی جاوے۔

المستفتی، مقبول احمد شاہ بھکاری پور ڈاکخانہ خاص ضلع پبلی بھیت۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

ایسے موضعات میں جمعہ کی نئی جماعت قائم نہیں کی جاسکتی۔ لہذا چھوٹی مسجد میں نئی جماعت کا قائم کرنا ہی غلط ہے اور بڑی مسجد میں جب زمانہ دراز سے جمعہ کی جماعت قائم ہے تو نہ اس جمعہ کو بند کیا جائیگا اور نہ اس کی جماعت کو توڑا جائیگا اور نہ ایسے موضع میں دو جمعہ کی جماعتیں کی جائیں نہ مسلمانوں کے

اتحاد اتفاق کو ٹھیس لگائی جائے بلکہ سب لوگ صرف بڑی مسجد میں نماز جمعہ پڑھا کریں اور اس کے بعد چار رکعت فرض وقت ظہر کی ضرور پڑھا کریں۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ المتوسل النبی المرسل العبد الارذل محمد اول بن المفتی مولینا الحاج محمد اجمل

نائب مفتی اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۷ھ

الجواب صحیح محمد اجمل غفرلہ عزوجل مفتی مدرسہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۷ھ

مسئلہ

(۴۳۲)

کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین نسبت مسائل کے حوالہ جات قرآن و احادیث سے جواب عنایت فرمایا جائے

کیا خطبہ جمعہ کے دوران میں اردو اشعار پڑھنا چاہئے؟

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

جائز ہے مع الکراہۃ اور خلاف سنت متوارثہ۔ ہدایہ میں ہے۔

یحوز عند العجز الا انه یصیر شیئاً لمخالفة السنة المتوارثہ

توجب عربی سے عاجز ہونے کی صورت میں بھی اردو میں خطبہ پڑھنا خلاف سنت متوارثہ ثبات

ہوا تو باوجود قدرت کے اردو کے اشعار پڑھنا کیسے خلاف سنت متوارثہ نہ ہونگے۔ واللہ اعلم

کتبہ، المتوسل بالنبی المرسل العبد الارذل محمد اول بن المفتی

مولینا الحاج محمد اجمل نائب مفتی اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۷ھ

یکم جمادی الاخرہ ۱۳۷۷ھ

الجواب صحیح محمد اجمل غفرلہ عزوجل بلدہ سنہ ۱۳۷۷ھ

کتبہ: المتعصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۷ھ

مسئلہ

(۴۳۳)

کیا فرماتے ہیں علماء دین اور مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) میں چنگی حسن پور میں ملازم ہوں۔ صبح ۸ بجے سے شام کے ۸ بجے تک ۱۲ گھنٹہ ڈیوٹی رہتی

ہے۔ ایک مہینہ کی ڈیوٹی ایک چنگی پر رہتی ہے۔ جس میں پندرہ دن رات کو ڈیوٹی دینی پڑتی ہے اور پندرہ دن دن میں کیش ہر وقت رہتا ہے، مال آتا رہتا ہے ایسی حالت میں چنگی چھوڑ کر نماز جمعہ نہیں پڑھ سکتا اس حالت میں ہر مہینہ دو یا تین جمعہ نکل جاتے ہیں۔ جب کہ مولویوں کا مسئلہ ہے کہ اگر ایک جمعہ چھوٹ جائے تو یہ ہو جاتا ہے اور دوسرے پر یہ اور تیسرے پر یہ لہذا مجھے بتایا جائے کہ میرے لئے کیا حکم صادر ہوتا ہے واللہ اعلم جب ایسی حالت میں میں پابند غلام کے مانند ہوں اور میرے لئے شرعی حکم کیا ہے؟۔

(۲) محصول چنگی آرنہ مالی کو چھپا کر لیجانا اسلامی قانون کیا ہے اور ملازم چنگی کو آرنہ مال سے ملکر محصولی پیسہ بچانا کیا حکم۔ معہ حدیث اور دلائل سے بتایا جائے۔

المستفتی، منشی مہربان حسن منشی عبدالرحمن لال باغ چنور

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) بلاشبہ نماز جمعہ فرض ہے اور یہ کوئی ایسی مجبوری نہیں ہے جس کی بنا پر جانب شرع سے ترک جمعہ کی اجازت مل سکے۔ ہفتہ بھر میں صرف نماز جمعہ کے لئے کس طرح کا انتظام کیا جائے چاہے اتنے وقت کے لئے کسی کو پیسہ دیکر مقرر کیا جائے۔ یا اتنے وقت کی پابندی کو مستثنیٰ کر لیا جائے ورنہ پھر ایسی ملازمت شرعاً جائز نہیں جس میں ترک فرائض کرنا پڑے۔

(۲) چھپ کر مال آرنہ سے ملازم چنگی کو کوئی پیسہ حاصل کرنا ممنوع ہے اسی طرح مال آرنہ کو اپنے حال کو چھپا کر نہ لیجانا چاہئے۔ فقط کارڈ میں دلائل قرآن و حدیث نہیں لکھے جاسکتے اس لئے مجبوری ہے۔ یکم اگست ۱۹۵۸ء

مسئلہ

(۲۳۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ کوئی شخص نماز جمعہ میں قعدہ اخیرہ میں زریک ہوا تو اس کو جمعہ کی نماز ملی یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

نماز جمعہ کے قعدہ اخیرہ میں جو شخص شامل جماعت ہو گیا وہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد صرف دو رکعت فرض جمعہ پڑھے کہ اس نے یقیناً جمعہ پالیا ہے۔

کتبہ: المختصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنجل

(۲۳۵)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین ان مسائل میں کہ اذان ثانی جمعہ میں کہاں کھڑا ہو کر کہنا چاہئے؟ اور صلوٰۃ قبل از جماعت اور جماعت میں قدامت الصلوٰۃ پر کھڑے ہونا واسطے نماز باجماعت میں۔ مدلل مع حوالہ کتاب کے جواب باصواب سے سائل، چند امیاں حیات نگر ضلع مراد آباد دیوپی

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جمعہ میں اذان ثانی یعنی خطبہ کی اذان کا خارج مسجد میں ہونا حدیث شریف سے ثابت ہے۔ ابو داؤد شریف میں حضرت سائب رضی اللہ عنہ سے مروی ”کان یوذن بین یدی رسول اللہ ﷺ اذا جلس علی المنبر یوم الجمعة علی باب المسجد وابی بکر وعمر الخ“ (ابوداؤد مجتہبی ص ۱۶۲)

حدیث کا مضمون یہ ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ بروز جمعہ منبر پر تشریف فرما ہو جاتے تو دروازہ مسجد پر حضور کے سامنے اذان دیجاتی تھی اسی طرح خلافت صدیقی و فاروقی میں ہوتا رہا۔ اس حدیث شریف سے ثابت ہو گیا کہ خطبہ سے پہلے جو اذان ثانی ہوتی ہے وہ زمانہ نبوی سے برابر منبر کے مقابل دروازہ مسجد پر ہوتی رہی کسی بھی حالت میں اس کو مسجد کے اندر نہیں دیا گیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ دروازہ مسجد خارج مسجد ہوتا ہے تو اس اذان کا مسجد سے باہر ہونا مسنون قرار پایا، اسی بنا پر فقہاء نے اذان کو مسجد کے اندر کہنا ممنوع قرار دیا۔ فتاویٰ قاضی خاں و فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

ینبغی ان یوذن علی المذنة او خارج المسجد ولا یوذن فی المسجد

تو خطبہ سے پہلے اس اذان ثانی کا خارج مسجد میں خطیب کے سامنے ہونا حدیث شریف اور کتب فقہ سے ثابت ہو گیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب اذان کے بعد جو دوسرا اعلان کیا جاتا ہے اس کو تحویب کہتے ہیں بکثرت کتب فقہ میں اس تحویب کو جائز لکھا ہے لیکن اس تحویب کے لئے الفاظ خاص متعین نہیں ہیں اور صلاۃ و سلام کے الفاظ تحویب میں ۸۱ میں جاری ہوئے فقہاء نے انہیں جاز بلکہ

مستحسن قرار دیا۔ چنانچہ فقہ کی مشہور کتاب در مختار میں ہے:

التسليم بعد الاذان حدث في ربيع الاول اخر سنة سبع مائة واحدى وثمانين في
عشاء ليلة الاثنين ثم يوم الجمعة ثم بعد عشرين حدث في الكل الا المغرب ثم فيها مرتين
وهو بدعة حسنة۔ (در مصری ج ۳۱ ص ۲۷)

تو اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ اذان کے کچھ دیر کے بعد قبل از جماعت صلوٰۃ و سلام کہنا نہ فقط
جائز بلکہ مستحسن ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب
قد قامت الصلوٰۃ سے پہلے ہی علی الفلاح پر مقتدیوں کو کھڑا ہونا چاہئے اور اس سے پہلے کھڑا ہو
جانا مکروہ ہے فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”ادخل الرجل عند الإقامة كره له الا انتظار قائما ولكن يقعد ثم يقوم اذا بلغ
المؤذن قوله حي على الفلاح كذا في المضمرات ان كان المؤذن غير الامام وكان القوم
مع الامام في المسجد فانه يقوم الامام والقوم اذا قال المؤذن حي على الفلاح عند علمائنا
الثلاثة وهو الصحيح“۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۱۹ جماع الاخریٰ ۱۳۷۸ھ

کتبہ: ۱۔ مقتضی بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۸ھ

مسئلہ

(۴۳۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیین شرع متین مسائل ذیل کے

(۱) آیا گاؤں میں نماز جمعہ ائمہ اربعہ کے مذہب میں پڑھنی جائز ہے یا نہیں؟۔

(۲) جس گاؤں میں نماز جمعہ پڑھی جاتی ہو آیا اس گاؤں میں ان لوگوں کو جو گاؤں میں عدم جواز

جمعہ یا تساہل کی وجہ سے نماز جمعہ میں شامل نہ ہوئے ہوں واقعی جمعہ کے دن نماز ظہر کا باجماعت یا فردا فردا
نماز جمعہ سے قبل یا بعد جامع مسجد یا دیگر مسجدوں میں امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب میں پڑھنا مطلقاً
حرام ہے یا کیا؟۔

(۳) مسلمانوں کو ہندو کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا کھانا یا بھرا ہوا پانی پینا امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ یا

دیگر ائمہ کے مذہب میں شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو آیت (انما المشرکون نجس۔ الخ)

کا کیا جواب؟ اگر ناجائز ہے تو کن وجوہات کی بنا پر؟۔

(۴) مسلمان قصاب کو گوشت فروخت کرنے کے لئے روزمرہ خود ذبیحہ کا ذبح کرنا جائز ہے یا

نہیں؟ اگر ناجائز ہے تو کن وجوہات و واقعات کی بنا پر؟۔ (بینوا تو جروا)

(نوٹ) ہر ایک سوال کا جواب بمع وجوہات کتب معتبرہ فقہ و حدیث سے بمع ترجمہ اردو عبارت
عربیہ مفصل و مدلل تحریر فرما کر مشکور فرمادیں۔ تاکہ جواب الجواب کی نوبت نہ آنے پائے۔

المرسل۔ چودہری نصر اللہ خن طالب علم مدرسہ عربیہ حاجیوالہ

ڈاکخانہ خاص تحصیل ضلع گجرات ۴۲-۱۰-۱۶

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) حنفیہ کے نزدیک گاؤں میں جمعہ واجب نہیں، حدیث شریف میں ہے جس کو طبرانی نے
اوسط میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا:

قال رسول الله ﷺ خمسة لا الجمعة عليهم المرأة والمسافر والعبد والصبي واهل
البادية۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچ وہ شخص ہیں جن پر جمعہ نہیں، عورت، مسافر، غلام، گاؤں والے،
بچے۔

ہدایہ میں ہے: لا تصح الجمعة الا في مصر جامع او في مصلى المصرو لا تجوز في

القرى لقوله عليه السلام: لا الجمعة ولا تشريق ولا فطرو ولا اضحى الا في مصر جامع۔

جمعہ شہر یا اس کی عید گاہ ہی میں صحیح ہے اور گاؤں میں جائز نہیں، حدیث شریف میں حضور علیہ

السلام کا فرمان ہے کہ جمعہ اور تشریق اور فطر اور اضحیٰ شہر ہی میں ہے۔

فقہیہ شرح منیہ میں ہے:

الشرط الاول المصرا وفناءه فلا تجوز في القرى عندنا وهو مذهب علي ابن ابي

طالب وحذيفة عطاء والحسن بن ابي الحسن والنخعي ومجاهد وابن سيرين والثوري

وسنخون خلافا للاثمه الثلاثة۔

جمعہ کی پہلی شرط شہر یا فناء شہر ہے۔ تو ہمارے نزدیک جمعہ گاؤں میں جائز نہیں اور یہی حضرت

امیر المومنین علی اور حذیفہ اور عطاء اور حسن ابن ابی الحسن اور نخعی اور مجاہد اور ابن سیرین اور ثوری اور سنخون کا

مذہب ہے، ائمہ ثلاثہ اس کے خلاف ہیں۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ حنفیہ کے نزدیک گاؤں میں جمعہ جائز نہیں اور ائمہ ثلاثہ اس کے خلاف ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) جس گاؤں میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے تو بلحاظ مصالح دینی کے اسے بند نہ کیا جائے گا۔ کما فصلناہ فی فتاونا۔ لیکن ان لوگوں کو فرض ظہر پڑھنا ضروری ہے۔ شامی میں ناقل جواہر سے ہے:

لو صلوا فی القرى لزهم اداء الظہر۔ اگر گاؤں میں جمعہ پڑھا تو ان پر ادائے ظہر لازم ہے۔ اب چاہے یہ لوگ فرض ظہر فردا پڑھیں یا باجماعت۔ کبیری میں ہے:

ویکرہ للمعذورین والمسجونین اداء الظہر بجماعة فی المصریوم الجمعة سواء کان قبل الفراغ من الجمعة او بعده لان الجمعة جماعة للجماعات فینبغی ان لا تكون جماعة غیرها فی المصر الذی ہی فیہ ولثلا یتطرق الی الاقتداء بهم غیرہم بخلاف اهل القرى لانه لا جمعة علیہ فکان هذا الیوم فی حقہم لغیرہ کالایام۔

اس عبارت کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ معذورین اور قیدیوں کو جمعہ کے دن نماز جمعہ سے قبل یا بعد شہر میں فرض ظہر کا باجماعت پڑھنا مکروہ ہے اور گاؤں میں فرض ظہر کا باجماعت پڑھنا مکروہ نہیں یعنی بلا کراہت جائز ہے۔

بالجملہ گاؤں میں ظہر کا پڑھنا فرض ہے چاہے وہ جمعہ کی جماعت میں شامل بھی ہو چکا ہو واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب،

(۳) آیت کریمہ ”انما المشرکون نجس“ کی تفسیر میں علامہ ابوالبرکات نسفی تفسیر مدارک میں فرماتے ہیں:

انہم لا ینظہرون ول یتسلون ولا یحتنبون النجاسات فہی ملا بسۃ لہم

(مدارک مصری ص ۹۳ ج ۲)

بیشک مشرکین طہارت نہیں کرتے اور غسل نہیں کرتے اور نجاستوں سے پرہیز نہیں کرتے تو نجاست ان کے ملابس ہو گئی یعنی وہ نجاست والے ہوئے۔

ہندوں کے پلید مزاجوں اور گندی طبیعتوں کے بھی دن رات مشاہدے ہوتے ہیں اور انکا

ستوں سے پرہیز نہ کرنا ایسی ناقابل انکار بات ہے جسکے لئے ثبوت کی کوئی حاجت نہیں۔ پھر مسلمانوں کو ان کے ہاتھوں کے پکائے ہوئے کھانے اور پانی سے کیوں نہ احتیاط کرنی چاہیے خصوصاً وہ مسلمان کے ہاتھوں کی چیزوں سے کمال درجے کی احتیاط کرتے ہیں اور انکا کھانا پینا کسی طرح گوارہ نہیں رکھتے تو نہایت شرم وغیرت کی بات ہے کہ مسلمان طاہر و پاک ہو کر ان ناپاکوں کے ہاتھ کی چیزیں کھائیں اور جواز کی آڑ لیکر احتیاط کی صورت مٹائیں اور بمقابلہ کفار کے اپنی اسلامی شان گھٹائیں اور اپنی بیداری و حیات کے فنا ہو جانے کی یہ شرمناک تصویر اہل دنیا کو دکھائیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۴) مسلمان قصاب کا ذبیحہ بلا شک جائز ہے۔ تنویر لا البصار و در مختار میں ہے:

شرط کون الذابح مسلماً۔ یعنی ذبح کرنے والا مسلمان ہونا شرط ہے۔

کنز الدقائق میں ہے: وحل ذبیحۃ مسلم۔ یعنی مسلمان کا ذبیحہ حلال و جائز ہے۔

اور اگر اس کا محتاط اور دیندار ہونا قائل اعتماد نہ ہو تو اسی بنا پر اس سے احتیاط کیجائے، تو یہ ناجائز ہو نیکی بنا پر نہیں ہے بلکہ صرف احتیاط کی بنا پر ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: انا معتمد بن سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،

العبد محمد اجمیل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمیل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۲۷ھ

مسئلہ

(۲۳۷)

ما قولکم دام فضلکم؟ بلدۃ فی فتاھا محطة الریل و مدرستہ الانکلیزۃ الکبیرۃ بوسطہ محطة الشرطیۃ (پولیس اسٹیشن) وفی قرب المحطة ارض عمر فیھا عمارة علی سکوۃ المسافرین (مسافر خانہ) وفی تلك الارض ایضا بنی عمارة للعبادة یصلی فیھا الجماعة فی کل الاوقات مع جم غفیر من الطلبة الانکلیزۃ و هم خمسة وعشرون بعد المائة و هذه العمارة لیس فیھا محراب العرفی ولا المنبر العرفی بل یفرش للامام خاصة مصلی ولا یرفع الا عند التنظيف فهل یجوز ان تقام الجمعة فی البقعة المذكورة ام لا؟ فصلو فی الجواب وفصلو فی الثواب۔

هل یحصل الفضیلة فی تلك البقعة مع الکمال ام لا؟ فما ذایفعل لتحصل

الفضیلة الکاملة والارض والعمارات موقوفة فهل یجوز ان تجعل تلك العمارة

مسجدا حقیقیام لا؟ بینوا وجروا۔ المستفتی مولوی احمد الہی باری ۲۶ رجب المرجب ۱۳۲۷ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

شرط صحة الجمعة ان يكون المصر وفناءه وصرح بالمصر في تحفة الفقهاء عن ابي حنيفة عليه الرحمة انه بلدة كبيرة فيها سكك واسواق ولها رساتيق وفيها وال يقدر على انصاف المظلوم من الظالم بحشمه وعلمه او علم غيره يرجع الناس اليه فيما يقع من الحوادث وهذا هو الاصح كما في الغنية والعيني والشامي وغيرهم وصرح العيني شرط ادائها اي اداء صلوٰۃ الجمعة المصر فلا تجوز في القرى ولا مفازة، يقول على رضي الله تعالى عنه: لا الجمعة ولا تشريق ولا صلوٰۃ فطر ولا اضحى الا في مصر جامع فان صدق على هذه البلدة حد المصر بما تقام الجمعة فيها وفي فنائها ولا يلزم في فناء المصر ان يكون مسجد او اذا كانت هذه البقعة فناء المصر يحصل فضيلة الجمعة فيها والله تعالى اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمض بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدة سنجل

(۴۳۸)

مسئلہ

علمائے دین اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں کہ

جامع مسجد کو خالی رکھ کر قرب وجوار کی مسجدوں میں نماز جمعہ ادا کرنا جائز ہے یا نہیں؟
نیز خصوصاً ان مساجد میں جہاں پر کہ جامع مسجد کی اذان وقرات اچھی طرح سنتے ہیں نیز جامع مسجد شہر میں کیلئے کافی گنجان ہے برائے کرم اس بارے میں فتوے صادر فرما کر مشکور فرمادیں کہ تعدد جمعہ جائز ہو کر بھی قرب وجوار کی مساجد میں نماز جمعہ ادا کر کے مسجد جامع کو خالی رکھنا جائز ہے یا نہیں؟۔

المستقیان مسلمانان قصبہ اسلام آباد کشمیر بذیہ واعظ جلد محمد وطاہر وپردیشی۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

علاوہ جامع مسجد کے اور مساجد میں جواز جمعہ میں تو کوئی شک ہی نہیں ہو سکتا کہ تعدد جمعہ کا قائل

مفتی بہ ہے۔ درمختار میں ہے۔ تودی الجمعة فی مصر واحد بمواضع كثيرة مطلقاً علی المذهب وعلیہ الفتوی۔
(ردالمحتار ص ۵۶۵ ج ۱)

اور جامع مسجد میں جمعہ کا ادا کرنا افضل واولیٰ ہے۔ چنانچہ الاشباہ والنظائر میں ہے۔

اعظم المساجد حرمة المسجد الحرام ثم مسجد المدينة ثم مسجد بیت المقدس ثم الجوامع ثم مساجد المحال۔
(اشباہ ص ۵۶۱)

غنیۃ میں ہے: والافضل هو الجامع الواحد وذلك للخروج من الخلاف الخروج من العهد بیقین۔

اور ردالمختار میں ہے: والحاصل ان بعد القدس الجوامع ای المساجد الكبيرة الجامعة للجماعة الكثيرة لكن الاقدم منها افضل۔ (ردالمختار ص ۴۶۳ ج ۱)

لہذا قرب وجوار کی مساجد میں جمعہ پڑھنا خلاف اولیٰ اور ترک افضل ہے بلکہ حق جامع مسجد کو باطل کرنا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمض بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدة سنجل

(۴۳۹)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین ان مسائل میں

(۱) ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام؟۔

(۲) ہندوستان میں جمعہ فرض ہے یا نہیں؟۔

(۳) ایک امام جمعہ کی نماز بہ نیت نفل پڑھائے تو کیا مقتدیوں کی نماز جمعہ جو بہ نیت فرض پڑھتے ہیں ادا ہو جائیگی یا نہیں؟ اور جن مقتدیوں نے اس کے پیچھے جمعہ پڑھا ہے ان کے ذمہ سے فرض وقت یعنی فرض ظہر ساقط ہو گیا یا نہیں؟۔

(۴) جمعہ کے فرض کے بعد جو چار رکعت سنت پڑھتے یہ جناب رسول اقدس ﷺ سے مروی ہیں یا زمانہ اقدس کے بعد علماء نے ایجاد کئے ہیں؟۔ بینوا تو جروا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) ہندوستان ہمارے امام اعظم ابو حنیفہ و امام ابو یوسف و امام محمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے مذہب کی تصریحات کی بنا پر ہرگز ہرگز دار الحرب نہیں ہے بلکہ دارالاسلام ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

اعلم ان دار الحرب تصیر دارالاسلام بشرط واحد وهو اظہار حکم الاسلام فیہا قال محمد فی الزیادات: انما تصیر دارالاسلام دار الحرب عند ابی حنیفہ بشرط ثلاثة۔ احدهما اجراء احکام الکفار علی سبیل الاشتہار وان لا یحکم فیہا بحکم الاسلام۔ والثانی ان تکون متصلۃ بدار الحرب لا یتخلل بینہما بلد من بلاد الاسلام۔ الثالث ان لا یبقی فیہا مو من ولا ذمی آمننا بما مانہ الاولی الخ۔

(عالمگیری ص ۲۶۹ ج ۲)

جانو کہ دار الحرب ایک شرط سے دارالاسلام ہو جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں اسلام کے احکام علانیہ طور پر جاری ہوں۔ امام محمد نے زیادات میں فرمایا کہ امام اعظم کے نزدیک دارالاسلام کے دار الحرب ہو جائیگی تین شرطیں ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں احکام کفار علانیہ طور پر جاری ہوں اور احکام اسلام مطلقاً نہ جاری ہوں۔ دوسری شرط یہ ہے کہ یہ دار الحرب دوسرے دار الحرب سے ایسا متصل ہو کہ ان کے درمیان بلا واسطہ میں سے کوئی شہر نہ ہو۔ تیسری شرط یہ ہے کہ اس میں کوئی مسلمان اور ذمی اسلام کی اپنی پہلی امان ہر باقی نہ ہو۔

مجمع الانہر شرح ملتقى البحر میں ہے:

دار الحرب تصیر دارالاسلام با جراء احکام الاسلام فیہا کاقامة الجمعة والاعیاد وان بقى فیہا کافر اصلی وان لم یتصل بدار الاسلام (مجمع الانہر مصری ص ۶۵۹ ج ۱)

دار الحرب میں جمعہ اور عید قائم کر نیک احکام اسلام جاری ہو جانے کی بنا پر وہ دارالاسلام ہوتا ہے اگرچہ اس میں کفار باقی رہ جائیں اور وہ دارالاسلام سے نہ ملے۔

در مختار و تنویر الابصار میں ہے:

دار الحرب تصیر دارالاسلام با جراء احکام اهل الاسلام فیہا کجمعة وعیدون بقى فیہا کافر اصلی وان لم یتصل بدار الاسلام (شامی مصری ص ۲۶۱ ج ۳)

دار الحرب میں جب احکام مسلمین جاری ہو جائیں تو وہ دارالاسلام ہو جاتا ہے اگرچہ اس میں کفار باقی رہیں اگرچہ وہ دارالاسلام سے متصل نہ ہو۔

علامہ شامی طحطاوی سے ناقل ہیں:

لو اقرت احکام المسلمین واحکام اهل الشرك لا تكون دار حرب (را مختار مصری ص ۲۶۱ ج ۳)

اگر کہیں احکام مسلمین اور احکام مشرکین دونوں جاری ہوں تو وہ دار الحرب نہ ہوگا۔

ان عبارات سے آفتاب کی طرح روشن ہو گیا کہ جب ہندوستان میں مسلمان جمعہ وعیدیں اذان و اقامت۔ نماز باجماعت وغیرہ احکام اسلام علی الاعلان ادا کرتے ہیں اور ہندوستان کو اور کوئی دار الحرب احاطہ نہیں کر رہا ہے بلکہ دو جانبیں بلا واسطہ سے متصل ہیں تو یہ دار الحرب کس طرح قرار دیا جاسکتا ہے۔ اب باقی رہا یہ شبہ کہ اس میں احکام مشرکین بھی جاری ہیں تو اس شبہ کو طحطاوی کی عبارت نے صاف کر دیا کہ جہاں احکام مسلمین اور احکام مشرکین دونوں جاری ہوں تو وہ دار الحرب نہیں۔ لہذا اب باوجود ان عبارات کے ہندوستان کو دارالاسلام نہ کہنا اقوال ائمہ کی مخالفت ہے اور تصریحات فقہاء سے انکار ہے اور اپنی عقل و فہم کی دین میں مداخلت ہے۔ مولیٰ تعالیٰ قبول حق کی توفیق عطا فرمائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) بلاشبہ جمعہ فرض ہے۔ مراقی الفلاح میں ہے:

صلوٰۃ الجمعہ فرض عین بالکتاب والسنة والاجمع (طحطاوی مصری ص ۲۹۱)

قرآن اور حدیث اور اجماع سے نماز جمعہ فرض عین ہے۔

اب باقی رہا یہ عذر کہ جمعہ پڑھنے کیلئے بادشاہ کا ہونا شرط ہے اور ہندوستان میں بادشاہ اسلام نہیں ہے بلکہ کفار کی حکومت ہے تو جمعہ کی شرط ہی نہیں پائی جاتی۔ لہذا جمعہ فرض ہی نہیں ہوا۔ اس عذر کا جواب کتابوں میں موجود ہے کہ جہاں بادشاہ اسلام نہ ہو اور کفار کی حکومت ہو تو وہاں مسلمانوں کو جمعہ وعید قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ طحطاوی میں مجمع الفتاویٰ سے ناقل ہیں:

غلب علی المسلمین ولأه الكفار یجوز للمسلمین اقامہ الجمع والاعیاد (طحطاوی مصری ص ۲۹۲)

کفار کے والی مسلمانوں پر غالب آگئے تو مسلمانوں کیلئے عیدوں اور جمعوں کا قائم کرنا جائز ہے، فتاویٰ عالمگیری میں ہے: بلاد علیہا ولأه الكفار یجوز للمسلمین اقامہ الجمعہ۔

(عالمگیری ص ۷۵ ج ۲)

جن شہروں پر کفار کے احکام ہوں تو مسلمانوں کو جمعہ کا قائم کرنا جائز ہے۔

رد المحتار میں ہے: اما فی البلاد علیہا ولاۃ الکفار فیجو ز للمسلمین اقامۃ الجمع

(رد المحتار مصری ص ۲۶۱ ج ۳)

والعیاد

احکام کفار جن شہروں میں مسلط ہوں تو اہل اسلام کیلئے عیدوں اور جمعوں کا قائم کرنا جائز ہے۔

صاحب درمختار شرح ملتقی میں فرماتے ہیں:

اذالم یکن احد من ذکر (ای من السلطان و نائبه) فللناس ان یجتمعوا علی واحد

(شرح ملتقی ص ۵۶۵ ج ۱)

یصلی بهم للضرورة

جب بادشاہ اسلام اور اس کے نائب میں سے کوئی موجود نہ ہو تو ضرورت لوگ ایک شخص پر اتفاق

کر لیں کہ وہ انہیں نماز جمعہ پڑھائے۔

غنیۃ شرح منیہ میں ہے:

فان لم یکن احد من هؤلاء (ای السلطان و نائبه) فاجتمع الناس علی واحد

(غنیۃ مطبوعہ لکھنؤ ص ۵۱۳)

فصلی بهم جاز۔

بادشا اسلام اور اس کے نائب میں سے جب کوئی نہ ہو تو لوگ ایک شخص پر اتفاق کر لیں اور

انہیں نماز جمعہ پڑھائے تو جائز ہے۔

ان عبارت سے صاف یہ نتیجہ نکل آیا کہ ہندوستان میں اگرچہ کفار کی حکومت ہے اور بادشاہ

اسلام نہیں لیکن جمعہ کی صحت کیلئے اس قدر کافی ہے کہ مسلمان جمعہ وعیدیں قائم کرتے ہیں اور ایک شخص کو

امام مقرر کرتے ہیں۔ لہذا ہندوستان میں جمعہ کا فرض ہونا ثابت ہوا اور ادائے جمعہ سے نماز ظہر کی

فرضیت ساقط ہوگئی۔ اور اب کسی کا جمعہ کو نفل قرار دینا ان تصریحات فقہ کی مخالفت اور سخت نادانی و جہالت

ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۳) جو امام شہروں میں نماز جمعہ بہ نیت نفل پڑھتا ہے وہ سخت غلطی کا مرتکب ہے۔ پہلی غلطی یہ

ہے نفل کی جماعت قائم کرتا ہے اور نفل کی جماعت ناجائز ہے۔ رد المحتار میں ہے۔ ”النقل بجماعة

(رد المحتار ص ۵۶۶ ج ۱)

وہو غیر جائز۔

دوسری غلطی یہ ہے کہ وہ فرض پڑھنے والوں کی امامت کرتا ہے باوجودیکہ مسئلہ یہ ہے کہ فرض

پڑھنے والا نفل پڑھنے والے کی اقتدا نہیں کر سکتا۔

غنیۃ میں ہے۔ ص ۴۸۱، لا یقتدی المفترض بالمتنفل۔

ملتقی میں ہے۔ ص ۱۱۱، وفسدا اقتداء مفترض بمتنفل۔

عالمگیری میں ہے۔ ص ۴۲، لا اقتداء مفترض بالمتنفل۔

تیسری غلطی یہ ہے کہ جب اس کے نزدیک جمعہ فرض نہیں تو وہ فرض وقت یعنی ظہر کو جماعت سے

کیوں نہیں پڑھتا۔ جیسے قریہ جات میں نماز ظہر کا باجماعت پڑھنے کا حکم ہے۔

چنانچہ عالمگیری ص ۷۵ میں ہے۔ من لا تحب علیہم الجمعة من اهل القرى والبودی

لهم ان یصلی الظهر بجماعة یوم الجمعة باذان واقامة۔

بالجملہ فتہائے کرام نے تو عوام کے لئے بعد جمعہ آخر الظہر کی چار رکعتیں پڑھنے کو اسلئے فساد عظیم

قرار دیا کہ وہ لوگ جمعہ کی ادائیگی میں سستی اور کسل کرینگے اور جمعہ کے فرض نہ ہونے کا اعتقاد کر لیں گے،

چنانچہ طحاوی ص ۴۵۴ میں ہے:

وفی فعل الاربع مفسلۃ عظیمة وھی اعتقاد ان الجمعة لبست فرضا لما

یشاہدون من صلوۃ الظهر فتیکا سلون عن اداء الجمعة او اعتقادهم افتراض الجمعة

والظہر بعدها۔

اور یہ امام تصریحات فقہ کے خلاف بغیر کسی دلیل کے محض اپنی ناقص فہم سے جمعہ کی فرضیت ہی کا

انکار کرتا ہے تو یہ تو بہت زبردست فساد پیدا کرتا ہے اور مقتدیوں کی نماز کو فاسد کر رہا ہے۔ لہذا اس امام کا

یہ فعل نہایت مذموم ہے اور ان مقتدیوں کی نماز جو جمعہ بہ نیت فرض پڑھتے ہیں اس امام کے پیچھے ہرگز ادا

نہیں ہوتی کہ یہ اقتدا فاسد ہے اور انکا فریضہ وقت ان کے ذمہ سے ساقط نہیں ہوتا بلکہ اس امام کے پیچھے

باوجود اس اعتقاد کے ان لوگوں نے جس قدر جمعے پڑھے ہیں انکا حساب لگا کر اسی قدر قضاائے ظہر پڑھنا

ان کے ذمہ فرض ہے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۴) بعد جمعہ جو چار رکعتیں بہ نیت سنت پڑھی جاتی ہیں یہ واقعی سنت رسول ﷺ ہیں اور

حدیث شریف سے ثابت ہیں۔

مسلم شریف وابن ماجہ و بیہقی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم: اذا صلیتم بعد الجمعة فصلوھا اربعاً،

نیز ترمذی شریف و مسلم شریف و دارمی و بیہقی میں ہے:

من کان منکم مصلیا بعد الجمعة فیصلی اربعاً یعنی جو تم میں جمعہ کے بعد نماز پڑھے چار رکعتیں پڑھے۔

طبرانی اوسط میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی:

کان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یصلی قبل الجمعة اربعاً وبعدها اربعاً یعنی رسول اللہ ﷺ سے پہلے چار رکعتیں پڑھتے اور بعد میں چار رکعتیں پڑھتے۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ جمعہ کے بعد چار رکعتوں کا پڑھنا حدیث قوی و فعلی دونوں سے ثابت ہے۔ تو انہیں جو سنت نہ کہے وہ سخت جاہل اور دین سے ناواقف ہے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المستصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۴۴۰)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین صورت مسئلہ میں کہ موضع اٹواں بازار میں تقریباً ساٹھ گھر مسلمانوں کے آباد ہیں اور اطراف و جوانب کے مواضع میں جہاں مسلمان آباد ہیں یہاں مسلمانوں کی آبادی نسبتاً زیادہ ہے۔ بقائے حیات کی ضروری اشیاء یہاں بروقت مل جاتی ہیں اور ہر طرح کے ہنرمندوں اور پیشہ وروں کے لئے یہاں کسب معاش کی آسانیاں ہیں۔ زمانہ دراز نایادگار سے یہاں عیدین اور جمعہ کی نمازیں ہوا کرتی ہیں، اور اطراف و جوانب کے مواضع سے مسلمانان عیدین اور جمعہ کی نمازیں پڑھنے آیا کرتے ہیں، اب موضع بہٹیا میں جو موضع اٹواں بازار سے بالکل ملحق ہے اور جہاں کل بارہ گھر مسلمان ہیں ایک نو تعمیر کچھریل پوش مکان میں جو اسکول کے نام سے تعمیر کیا گیا تھا ایک امسال عید الفطر کے موقع پر اس ہستی کے باشندوں نے جو نماز اور طہارت کے مسائل میں مہارت تامہ نہیں رکھتے ملت بیضائے اسلامیہ کی ایک جہتی واجتماعیت کو پاش پاش کر کے جماعت اسلامیہ میں افتراق و انتشار کی صورت پیدا کر دی، اور نماز عید موضع بہٹیا میں پڑھی، بعد ازیں جمعہ بھی قائم کر لیا، اور اپنے اقربا اور ملنے جلنے والوں کو اٹواں بازار کی مسجد کی بجائے بیٹھا کی نو تعمیر عمارت میں نماز عیدین اور جمعہ ادا کرنے کی فہمائش شروع کر دی۔

موضع اٹواں بازار میں جمعہ کو ہاٹ لگتی ہے، اطراف و جوانب کے علاوہ دور دور کے کاروباری مسلمان خرید و فروخت کی غرض سے اٹواں بازار آیا جایا کرتے ہیں جس سے مسجد میں بہت اچھی

جماعت ہو جایا کرتی تھی، اب موضع بہٹیا کے باشندوں کے اس طرز عمل سے اٹواں بازار کی مسجد اور جماعت کو شدید نقصان پہونچا ہے اور مسلمانوں میں افتراق و انتشار بھی رونما ہو گیا ہے۔

اندریں حالات موضع بہٹیا مذکور میں عیدین و جمعہ کی نمازیں پڑھنی اور قائم کرنا کتاب و سنت کے موافق ہے یا مخالف جواب باصواب دیکر عند اللہ ماجور ہوں۔

نیز یہ بھی ارقام فرمائیں کہ۔ "ولا تکتونوا کالذین تفرقوا و اختلفوا من بعد ما جاءہم البینات و ازلک لہم عذاب عظیم۔"

کا منشور خداوندی اور نص قطعی ہوتے ہوئے جو لوگ اسلامی برادری اور اجتماعیت کے خلاف عام مسلمانوں کو قبائلی جماعت بندی کی تعلیم دیکر اور حمایت کر کے جماعت اسلامیہ میں انتشار و افتراق پیدا کرتے ہیں انہیں شریعت حقہ کی روشنی میں نیکوکار اور مصلح قوم سمجھا جائے یا گمراہ کن۔ ہر ایک سوال کا

جواب باصواب دیکر مسلمانوں کو افتراق و انتشار اور بے جا جماعت بندی سے بچائیں۔ ساتھ ساتھ یہ بھی ارقام فرمائیں کہ اسلامی اجتماعیت اور اسلامی برادری کے ہوتے ہوئے نسلی اور قبائل جماعت بندی رائج

کر کے مسلمانوں میں افتراق و تشتت پیدا کرنا کیسا ہے؟ جائز ہے یا ناجائز؟ اور اسکی تلقین و ہدایت کرنے والا شریعت کی اصطلاح میں کیا ہے؟

والسلام محمد واصل پیش امام جامع مسجد اٹواں ڈاکخانہ لکھے پور (ضلع گیا)

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم
مواضع میں جمعہ وعیدین کی جدید جماعت قائم کرنے کے شریعت اجازت ہی نہیں دیتی۔

حدیث شریف میں ہے:

لا جمعة ولا تشريق ولا صلوة فطر ولا اضحی الا فی مصر جامع او مدینة عظيمة۔
یعنی سوائے شہر جامع اور بڑے قصبہ کے اور کہیں جمعہ اور تشریق اور نماز عید الفطر وعید الاضحیٰ نہیں ہوتی۔

اس سے ثابت ہو گیا کہ جمعہ وعیدین کے ادا ہونے کے لئے شہر یا بڑے قصبہ کا ہونا ضروری ہے۔ تو مواضع میں جمعہ وعیدین ادا نہیں ہوتے۔ اسی بنا پر جمعہ وعیدین کی نمازوں کی جماعت

مواضع میں قائم کرنا غیر مشروع ہے۔ البتہ جس موضع میں زمانہ دراز سے جمعہ وعیدین کی نمازیں ہوتی

چلی آرہی ہیں اس میں جمعہ وعیدین کی جماعت کو بسبب دینی مصالح کے ہرگز ہرگز بند نہیں کیا جائے گا۔ اور ان لوگوں کو بعد میں فرض ظہر کی چار رکعتوں کے پڑھنے کا حکم دیا جائے گا کہ ان پر ظہر کا پڑھنا فرض ہے۔ علامہ شامی ردالمحتار میں جو اہر سے ناقل ہیں:

لو صلوا فی القرى لزهم اداء الظهر۔ (ردالمحتار مصری۔ ص ۵۶۰ ج ۱)
اگر گاؤں میں جمعہ کی نماز پڑھیں تو انہیں فرض ظہر کا ادا کرنا لازم ہے۔ اور ظہر کے ادا کرنے کی صورت یہ ہے جسکو علامہ خیر الدین رملی نے تحریر فرمایا۔

فتاویٰ خیر یہ میں ہے:

والا احتیاط فی القرى ان یصلی السنة اربعائم الجمعة ثم ینوی اربعاً سنة الجمعة ثم یصلی الظهر ثم یصلی رکعتین سنة الوقت فهذا هو الصحیح المختار۔

(فتاویٰ خیر یہ مصری ص ۱۲ ج ۱)

گاؤں میں احتیاط یہ ہے کہ پہلے چار رکعت سنت کی پڑھے پھر جمعہ پڑھے پھر چار رکعت سنت جمعہ کی نیت کر کے پڑھے پھر فرض ظہر پڑھے پھر دو رکعتیں سنت وقت کی پڑھے، یہی قول صحیح و مختار ہے۔ الحاصل صورت مسئلہ میں جب موضع اٹواں میں زمانہ دراز سے جمعہ وعیدین کی نمازیں ہوتی چلی آرہی ہیں۔ تو اس موضع اٹواں میں جمعہ وعیدین کو بند نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن وہ موضع بیٹیا جو موضع اٹواں کے ملحق اور قریب ہے اس میں اب جدید جماعت قائم کرنے کی جرات نہیں کرنی چاہیے اور خاص کر جب اس جماعت کے قائم کرنے سے نئی ٹولیاں بن جانے کا خوف ہے پھر تو انہیں موضع بیٹیا میں جمعہ وعیدین کی جدید جماعت قائم کرنا حرام و گناہ عظیم ہے۔ مولے تعالیٰ انہیں قبول حق کی توفیق دے اور اختلاف بین المسلمین کے شر سے محفوظ رکھے اور ان میں محبت و واداد اور اتفاق و اتحاد کی لہر پیدا کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۶ صفر المظفر ۱۳۷۲ھ

کتبہ: المقتسم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۴۴۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

زید کہتا ہے کہ خطبہ کا اردو میں ترجمہ کرنا اس مطلب سے کہ نمازیوں کی سمجھ میں آجائے جائے

ہے۔ بکر یہ کہتا ہے کہ خطبہ نماز کا حکم رکھتا ہے اور اردو میں ترجمہ کرنا ناجائز ہے۔ کیونکہ نماز اللہ تعالیٰ سے گفتگو ہے تو اللہ تعالیٰ کی زبان مبارک عربی ہے تو اللہ تعالیٰ کے دربار مقدس میں اردو بولنا گوسخت گستاخی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں کیسے آئے تو نیاز مند کو تسکین بخش جواب مرحمت فرمایا جائے۔ اور جو لوگ کہتے ہیں کہ نیت نمازیوں کی اردو میں کہی جاتی ہے تو یہ نیت نماز کے اندر ہے یا باہر؟
المستفتی کفش بردار آستانہ عالیہ رضویہ قادریہ محمد حنیف ورکس احمد رضوی قادری

۳ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

زید کا خطبہ کو اردو میں مطلقاً جائز کہنا خلاف تحقیق اور غلط ہے۔

ہدایہ میں ہے: الخطبة و التشهد علی هذا الخلاف۔

اور بکر کی اتنی بات تو صحیح ہے کہ اکثر امور میں خطبہ نماز کا حکم رکھتا ہے۔

درمختار میں ہے: کل ما حرم فی الصلوٰۃ حرم فیہا ای الخطبة۔

لیکن بکر کا یہ قول (کہ خطبہ کا اردو میں پڑھنا ناجائز ہے) صحیح نہیں کہ خطبہ کا غیر عربی میں پڑھنا جائز مع الکراہۃ اور خلاف سنت متوارثہ ہے۔

ہدایہ میں ہے: یجوز عند العجز الا انه یصیر مسیئاً لمخالفة السنة المتوارثۃ۔

جب عربی سے عاجز ہونے کی صورت میں بھی اردو میں خطبہ پڑھنا خلاف سنت متوارثہ ثابت

ہو تو غیر عاجز کا اردو میں خطبہ پڑھنا بدرجہ اولیٰ سنت متوارثہ کے خلاف ثابت ہوا۔ اسی طرح بکر کی یہ

بات بھی غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ کی زبان مبارک عربی ہے۔ اسلئے کہ پہلی کتب آسمانی عربی میں کہاں تھیں تو

صرف عربی کو اللہ تعالیٰ کی زبان بتانا بھی غلط ہے۔ (ہاں عربی اللہ تعالیٰ کے محبوب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم کی زبان ہے۔ اہل جنت کی زبان ہے۔ اسی طرح بکر کی یہ بات بھی غلط ہے کہ اللہ کے دربار میں

اردو بولنا سخت گستاخی ہے۔

کتب فقہ میں ہے: ردالمحتار کی یہ عبارت ہے:

واللہ تعالیٰ لا یحب غیر العربیۃ ولہذا کان الدعاء بالعربیۃ اقرب الی الاجابۃ فلا یقع

غیرہا من اللسن فی الرضا والمحبة لہا موقع کلام العرب۔

اس عبارت سے عربی زبان کا اللہ تعالیٰ کی زبان محبوب و پسندیدہ ہونا ثابت ہوا نہ کہ غیر عربی زبان میں دربار الہی میں بولنا سخت گستاخی ہو۔

اب باقی رہا یہ عذر کہ عربی سمجھ میں کیسے آئے۔ تو یہ خاص خطبہ ہی میں نہیں بلکہ کل نماز عربی میں ہے تو کیا اس عذر کی بنا پر نماز بھی اردو میں پڑھ لی جائے گی۔ درحقیقت خطبہ و نماز عبادت ہیں اور عبادت کا سمجھ میں آنا ضروری نہیں۔ اور سمجھ میں نہ آنے کا اگر احساس ہے تو عربی زبان کو سیکھا جائے کہ عربی میں مسلمان کے مذہبی ضروریات ہیں۔ غور کیجئے بلکہ قرآن کریم عربی میں ہے۔ تفاسیر عربی میں۔ احادیث عربی میں۔ عقائد اسلام عربی میں۔ احکام شرع فقہ عربی میں۔ کتب سیر عربی میں۔

مسلمان جب دنیوی ضروریات کے لئے انگریزی، ہندی زبان سیکھتا ہے تو اس ضرورت کی اس کی نظر میں اس قدر اہمیت بھی نہیں۔

اب باقی رہا اردو میں نماز کی نیت کرنا تو یہ عوام کیلئے جائز ہے۔ اور نیت کا زبان سے کرنا ضروری نہیں بلکہ نیت کرنا حقیقہ دل کا کام ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ نیت نماز سے خارج ہے۔ اب رہی یہ بات کہ فلاں مولانا صاحب خطبہ کا ترجمہ اردو کرتے ہیں تو وہ اپنے فعل کے ذمہ دار ہیں۔ ان کا فعل کوئی دلیل شرع نہیں۔ ہم نے جب کتب فقہ سے خطبہ کا اردو میں پڑھنا خلاف سنت متوارثہ ثابت کر دیا تو ان کا فعل سنت متوارثہ ثابت نہیں کر سکتا ہے کہ زمانہ اقدس سے صحابہ و تابعین ائمہ مجتہدین سلف و خلف سے غیر عربی میں خطبہ پڑھنا ثابت نہیں۔ بہار شریعت میں جو بعد نماز جمعہ کے خطبہ سنونا مستحب لکھا ہے یہ صحیح ہے اور درمختار کی عربی عبارت کا ترجمہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۲۰ جمادی الاول ۱۳۷۷ھ

کتبہ: ا. معتمد ب. ذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۷ھ

مسئلہ

(۲۲۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین ذیل کے مسائل میں کہ جمعہ کو جس شخص کو دوسری رکعت کا رکوع بھی نہ ملے یا صرف قعدہ اخیرہ ملے تو اس کی نماز جمعہ ادا ہوگی یا نہیں؟۔ ایک شخص نے فقیر سے دریافت کیا تھا کہ دوسری رکعت کا رکوع جمعہ کی نماز میں امام کے پیچھے نہ ملا تو نماز جمعہ ہوئی یا نہیں۔ فقیر نے بتایا ہو جائے گی۔ پھر اس نے کتاب طریق احمدی حصہ اول دکھایا۔ شروع کا ورق نہ تھا مصنف کا نام معلوم نہ ہوا اس میں تھا کہ جس کو امام کے پیچھے نماز جمعہ میں ایک

رکعت نہ ملے وہ بعد کو پوری کر لے۔ اور جس کو امام کے پیچھے ایک رکعت بھی پوری نہ ملے تو وہ ظہر کی نماز پڑھے۔ فقیر کی سمجھ میں نہ آیا شرعاً جو حکم ہو صادر فرمایا جائے؟۔ بینو تو جروا۔

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم
جمعہ کی جماعت میں کسی کو اگر صرف قعدہ اخیرہ ہی امام کیساتھ مل سکا تو اس نے فضل جماعت کو پایا تو پھر اسکا جمعہ بھی ادا ہو گیا یہی قول معتمد و مفتی بہ ہے۔ طریق احمدی کے قول کا ضعف خود اس سے ظاہر ہو گیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم
کتبہ: ا. معتمد ب. ذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۷ھ

مسئلہ

(۲۲۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین ذیل کے مسائل میں کہ
(۱) ہمارے ملک گجرات میں دعائے ثانی سنت و نوافل (یعنی نماز پوری کر لینے کے بعد) اوسط آواز سے پڑھتے ہیں۔ ان کے دعا مانگنے سے دیگر مصلیوں کی نماز میں کوئی خلل نہیں آتا، اور مقتدی آمین کہتے ہیں۔ اخیر میں فاتحہ کا اعلان امام کرتے ہیں، اور سب فاتحہ پڑھ لیتے ہیں، پھر امام صاحب و سلموا تسلیما کی آیت پڑھتے ہیں اور سب لوگ درود شریف پڑھتے ہیں، پھر امام صاحب سبحان ربك پورا پڑھ کر ختم کرتے ہیں۔ یہ طریقہ مستحسن ہمیشہ سے برابر چلا آرہا ہے۔

(۲) دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جمعہ کی اذان کے بعد فوراً تحیۃ الوضو پڑھ کر چند آدمی باری باری بلا آواز سے سورہ کہف پڑھتے ہیں، اور اس خیال سے جو لوگ نہ پڑھے ہوں وہ بھی شریک ثواب ہیں باقی لوگ خاموش ہو کر سنتے ہیں سورہ کہف پڑھے جانے کے بعد فاتحہ خوانی ہوتی ہے پھر سب لوگ سنتیں پڑھتے ہیں، پھر امام خطبہ پڑھتا ہے، یہ طریقہ مستحسن بھی ہمیشہ سے چلا آرہا ہے۔ عوام کو بھی اسی معمول سے خبر ہے۔

(۳) یہاں پچگانہ نماز کے بعد امام اور مقتدی آپس میں مصافحہ کرتے ہیں، چند آدمی اس پر بھی معترض ہیں کیا یہ فعل جائز ہے؟۔

(۴) مزارات اولیا کی آستانہ بوسی و تبرکات کا بزرگان دین کا بوسہ دینا اور بزرگان دین کی قدم بوسی وغیرہ کے متعلق کیا حکم ہے اور شریعت حقہ کے کیا دلائل ہیں؟۔

(۵) گجرات میں عام طور سے سینوں میں یہ رواج ہے کہ جمعہ کا پہلا خطبہ کچھ عربی پڑھتے ہیں اور اردو پھر خطبہ ثانیہ عربی میں پڑھتے ہیں۔ رواج ایسے زور پکڑے ہوئے ہے کہ اگر کوئی امام ایسا نہ کرے تو اس کے لئے مصیبت ہے ملازمت جاے عوام میں فتنہ فساد برپا ہو، اس طرف زیادہ تر عوام پیران طریقت و قاضی صاحبان کے کہنے پر چلتے ہیں، یہ حضرات بھی مذکورہ بالا طور پر خطبہ پڑھنے پر زور دیتے ہیں، علاوہ ازیں چند فتاوے جواز اردو کے متعلق آچکے ہیں، جواز کے استدلال میں منقول ہے وہ یہ ہیں، آیت کریمہ۔ و ما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ۔ و ارسلناک کافۃ للناس بشیرا و نذیرا۔۔

و کما قال فی در المختار۔ صح لو شرع فی غیر عربیۃ ای لسان کان و شرطنا عجزہ و علی هذا الخلاف الخطبة و ایضا فیہ والا مر بالسعی الی الذکر لیس الاستماع و فی العید و یعلم الناس فیہا ای فی الخطبة عید الفطر من لم یودھا ینفی تعلیمہم فی الجمعة التي قبلها لیخرجوها فی محلها و هكذا کل حکم احتیج الیہ لان الخطبة شرعت للتعلیم فافہم انتہی۔، کما فی السراجیۃ اذا لم یکن المفتی مجتہدا فالاصح انہ ینفی بقول الامام۔ و فی التجنیس الواجب عندی ان ینفی علی قول ابی حنیفۃ علی کل حال والحاصل انہ لا یرجح قول صاحبیہ او احدهما علی قول الامام الا بموجب عن ضعف دلیل او ضرورة او تعامل او اختلاف لسان و فی السراجیۃ ولو خطب بالفارسیۃ یجوز۔

جواہر اخلاطی میں ہے۔ ولو کبر بالفارسیۃ او بای لسان کان وهو یحسن العربیۃ او لاجاز بالاتفاق۔

غیاث المفتین میں ہے۔ لا یجوز صلوٰۃ الجمعة اذا لم یعلم الخطیب ما یقول۔

فتاویٰ علماء عرب و عجم ۱۳۳۵ھ سوال۔ ما قولکم دام فضلکم نفعنا اللہ بعلومکم فی الدین بلا دالاسلام و اہلہا لا یعلمون لسان العرب لا یفہون معانی النصوص القرآنیۃ والاحادیث الشریعۃ بلغة العربیۃ فهل یجوز للخطیب ان یقرأ او لا شیئا خطبة الجمعة بالعربیۃ ثم یترجم بلسانہم من نفس الخطبة ما یتضمن الا و امرو النواہی التي

لا بدمنہا انہ یسمعہا الناس فیمتنعون من المعاصی و یقتربون الحسنات من الاعمال الصالحات بینوا توجروا۔

الجواب۔۔ نعم یجوز ذلك اذا كان المترجم من المواعظ والا و امر والنواہی ماعد القرآن العظیم واللہ اعلم۔ امر برقمہ خادم الشریعۃ والمنہاج عبد اللہ بن عبد الرحمن سراج الحنفی قاضی القضاۃ و مفتی للاقطار العربیہ بمکۃ المحمۃ۔ کان اللہ لہما۔

حامدا و مصلیا و مسلما باسمہ سبحانہ و تعالیٰ اثبت الجواب واستمد بہ الہدایہ والصواب۔ عبد اللہ بن عبد الرحمن سراج الحنفیۃ ۱۳۲۵ھ مکہ معظمہ۔

اور بہار شریعت و احکام شریعت و الملقوظ و فتاویٰ افریقہ میں خلاف سنت متوارثہ و مکروہ لکھا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر سنی ائمہ مذکورہ بالا طور پر خطبہ نہیں پڑھتے تو ان فتاویٰ کا خلاف ہوتا ہے، ملازمت جاتی ہے، عوام میں فتنہ فساد ہوتا ہے۔ اور اگر پڑھتے ہیں تو بہار شریعت و احکام شریعت و الملقوظ و فتاویٰ افریقہ کا خلاف ہوتا ہے۔ مخالفین کو موقع ملتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا کریں اگر انہیں کتابوں پر عمل ضروری ہے تو ان عبارتوں اور فتاویٰ حریمین کا کیا جواب ہے۔۔

نوٹ اس طرف اردو خطبہ مذکورہ بالا سوالات معیار سنت سمجھے جاتے ہیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علی رسولہ الکریم

سنن و نوافل سے فارغ ہونے کے بعد امام کا باواز دعا مانگنا بلاشبہ جائز ہے۔ بلکہ اس کی اصل حدیث شریف سے ثابت ہے۔ چنانچہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی انہوں نے فرمایا۔

ما یفوت النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فی دبر صلوٰۃ مکتوبۃ ولا تطوع الاسمۃ اللہم اغفر خطایا کلہا اللہم اہدنی لصالح الاعمال والاخلاق الخ۔

(رواہ ابو نعیم الحافظ فی کتاب عمل الیوم واللیلۃ)

اس حدیث شریف سے ثابت ہو گیا کہ خود نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بعد فراغت نوافل بھی دعا کرتے تھے اور یہ دعا اس قدر بلند آواز سے ہوتی تھی کہ جس کو صحابہ کرام نے بھی سن لیا تو دعا کا بعد نوافل بلند آواز سے کرنا خود قول شارع علیہ سلام سے ثابت ہو گیا۔ نیز نماز کسوف، استسقا

نماز حاجت وغیرہ بھی نوافل ہی سے ہیں انکے بعد میں خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے باواز بلند دعائیں کیں اور دوسروں کو حکم بھی دیا تو نوافل و سنن کے بعد باواز دعا کرنے کو کس طرح ناجائز و بدعت کہا جاسکتا ہے۔ اب باقی رہا امام کی باواز دعا پر مقتدیوں کا آمین کہنا۔ تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کہ کتب فقہ میں جب بوقت اجتماع ایک شخص باواز دعا پڑھے تو یہی طریقہ تسلیم کیا گیا ہے کہ اور لوگ آمین کہیں۔

مراقی الفلاح میں ہے: اذ دعا یومنون علی دعائہ۔ پھر سورۃ فاتحہ خود احسن دعا ہے نیز وہ حمد و ثنائے الہی پر بھی مشتمل ہے۔ اور اس کے بعد و سلموا تسلیما۔ پر درود شریف کا پڑھنا تعمیل حکم ہے اور یہ سب آداب دعا سے ہیں پھر دعا حمد و ثنائے الہی پر ختم کرنا بھی آداب اجابت سے ہے اس کے لئے آیہ سبحان ربک، الآیہ سے تبرک حاصل کرنا اور زیادہ بہتر ہے۔ لہذا ملک گجرات کا یہ دعائے ثانی کا طریقہ شرعاً محمود و مستحسن ہے جو اسکو ناجائز و بدعت کہتا ہے وہ دین سے ناواقف ہے اور احکام شرع کو محض اپنی رائے ناقص سے ناجائز و بدعت قرار دیتا ہے ورنہ وہ انکے ناجائز و بدعت ہونے پر کوئی شرعی دلیل پیش کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) جہاں اذان جمعہ فوراً بعد زوال اول وقت میں ہوتی ہے تو تحیۃ الوضو یا تحیۃ المسجد اسی وقت پڑھنا چاہئے کہ وقت زوال میں نوافل ممنوع ہیں، اس کے بعد اگر ایک آدمی باواز بلند سورۃ کہف پڑھتا ہے اور سب لوگ خاموش سنتے ہیں تو اس میں کوئی ممانعت شرعی لازم نہیں آتی بلکہ اس میں سب لوگ جتنے سن لیں وہ بھی مستحق اجر و ثواب ہو جائیں گے، پھر بعد تلاوت قرآن دعا کرنا آداب اجابت دعا ہے کہ حدیث شریف میں ہے من قرء القرآن فلیسال اللہ بہ۔ تو جس نے قرآن پڑھا تو اللہ سے اسکے توسل سے سوال کرے۔ پھر سورۃ فاتحہ خود احسن دعا ہے۔ تو سورۃ کہف کے بعد فاتحہ خوانی کو کون ممنوع ٹھہرا سکتا ہے۔ پھر سنن جمعہ کا پڑھنا اور خطبہ کا سننا امور مختلف فیہ میں سے نہیں، جس کے جواز میں کوئی کلام ہو۔ لہذا عوام کے اس معمول میں شرعاً کوئی حرج نہیں۔ جو اس کو ناجائز کہتا ہے وہ اس کے عدم جواز پر کوئی صریح دلیل قائم کرے۔ ورنہ امور مباحہ کو محض اپنی ناقص عقل سے ناجائز و بدعت قرار دیتا ہے۔ دین میں اپنی عقل سے دخل دیتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

(۴) مسلمان سے مصافحہ کرنا سنت ہے، حدیث شریف میں ہے: تصافحو ایذهب الغل۔

(مشکوٰۃ شریف۔ ص ۴۰۱)

یعنی حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو تم مصافحہ کیا کرو کہ مصافحہ کینہ کو دور کرنا

پھر یہ مصافحہ تمام اوقات میں سنت ہی ہے، طحاوی علی مراقی الفلاح میں ہے: المصافحۃ سنۃ فی سائر الاوقات۔ اب کسی ملاقات اور کسی وقت کی تخصیص کر کے اس خاص وقت اور ملاقات کے مصافحہ کو اس مصافحہ مسنونہ سے خارج نہیں کر سکتا۔ لہذا نماز پنجگانہ کے اوقات کا مصافحہ بھی اس مصافحہ مسنونہ کے تحت میں داخل ہو کر بلاشبہ جائز ثابت ہوا۔

در مختار میں ہے: ان المصافحۃ مستحبۃ عند کل لقاء اماما اعتادہ الناس من المصافحۃ بعد صلاۃ الصبح والعصر فلا اصل له فی الشرع علی ہذا الوجه ولكن لا بأس به فان اصل المصافحۃ سنۃ و کونہم حافظین علیہما من بعض الاحوال او اکثر و فرط وافی کثیر من الاحوال او اکثرھا لا یخرج ذالک البعض عن کونہ المصافحۃ التی ورد الشرع باصلھا۔ قال الشیخ ابو الحسن البکری و تقییدہ بما بعد الصبح والعصر علی عادۃ کانت فی زمنہ والا فعقب الصلوات کھا کذا لک۔ (رد المحتار۔ ج ۵۔ ص ۲۵۲)

بیشک مصافحہ کرنے کی عادت مقرر کر لی ہے تو اس طریقہ پر شرع میں کوئی اصل اسکی نہیں ہے لیکن اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے کیونکہ مصافحہ کی اصل سنت ہے اور انکا بعض احوال میں مصافحہ پر محافظت کرنا اور اکثر احوال میں اس سے کوتاہی کر جانا ان بعض احوال کو اس مصافحہ سے خارج نہیں کر دیتا جس کی اصل شرع میں وارد ہوئی۔ شیخ ابوالحسن بکری نے فرمایا کہ مصافحہ کو فجر و عصر کو ساتھ مقید کر دینا اس عادت کی بنا پر ہے جو انکے زمانہ میں موجود تھی ورنہ مصافحہ کا سب نمازوں یعنی پنجگانہ نمازوں کے بعد بھی یہی حکم ہے کہ وہ جائز ہے۔ اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ نماز پنجگانہ کے بعد مصافحہ کا جواز شرع سے ثابت ہے۔ کتب فقہ میں یہ تصریح موجود ہے۔ اور جب ان اوقات میں مصافحہ کرنا جائز ثابت ہوا۔ اب چاہے مقتدی امام سے مصافحہ کریں یا آپس میں مصافحہ کریں۔ بالجمہ اس مصافحہ کا جواز حدیث اور فقہ سے ثابت کر دیا گیا جو اس کے جواز پر اعتراض کرتا وہ محض اپنی کم فہمی کی بنا پر مذہب پر اعتراض کرتا ہے۔ خود اسکے پاس اسکے عدم جواز کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۴) مزارات حضرات اولیاء کرام کا بوسہ جائز تو ہے، حضرت علامہ احمد مقرر مغربی فتح المتعال

فی مدح النعال میں ناقل ہیں: ان بعضهم کان اذ ارأی المصاحف قبلھا و اذ ارأی اجزاء الحدیث قبلھا و اذ ارأی قبور الصالحین قبلھا۔ (فتح المتعال)

بیشک بعض علماء جب مصاحف کو دیکھتے تو انکو چومتے اور جب حدیث کی جلدوں کو دیکھتے تو ان کو بوسہ دیتے، اور جب اولیا کی قبروں کو دیکھتے تو ان کو بوسہ دیتے، اور بعض روایات فقہ میں قبر والدین کے بوسہ دینے کا جواز منقول ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی الشیخۃ الممعات میں فرماتے ہیں:

در بعض روایات فقہیہ بوسہ دادن بر قبر پدر و مادر را نیز آمده است۔

لیکن اولی یہ ہے کہ عوام کے سامنے مزارات اولیا کرام پر بوسہ نہ دے۔

طحطاوی علی مرقاۃ الفلاح میں ہے: لا یمس القبر ولا یقبلہ فانہ من عادة اهل الكتاب، (طحطاوی ص ۶۲۳)

اور قبر کو نہ چھوئے نہ بوسہ دے کہ یہ اہل کتاب کی عادت ہے۔

اب باقی رہا بزرگان دین کو بوسہ دینا و اشیاء معظمہ آثار صالحین کا بوسہ دینا اور علماء اور صلحا کی دست بوسی و قدم بوسی کرنا تو یہ نہ فقط جائز بلکہ حسن و محمود ہے۔

فتح المتعال میں علامہ عراقی کا قول منقول ہے: اما تقبیل الا ماکن الشریفة علی قصد التبرک و ایدی الصالحین و ارجلہم فهو حسن محمود باعتبار قصد النیۃ۔ (ص ۳۳۹)

اور بقصد تبرک معظم مقاموں اور صالحین کے ہاتھوں اور قدموں کو بوسہ دینا باعتبار قصد و نیت کے حسن اور محمود ہے۔

اسی فتح المتعال میں ہے: کان ثابت البنانی لا یدع ید انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ حتی یقبلہا ویقول ید مست ید رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (فیہ ایضا) ان الامام احمد یسئل عن تقبیل قبر النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و تقبیل منبرہ فقال لا بأس بہ و عنہ انه غسل قمیص الشافعی و شرب الماء الذی غسلہ بہ۔ (فتح المتعال ص ۳۲)

و فیہ ایضا قد صرح جماعة من ائمتنا المہتدی بہم بتقبیل اسمہ الشریف علیہ السلام فیما ہو مکتوب فیہ و بتبجیلہ و التبرک بہ و رفعہ علی العیون والرؤس۔

حضرت ثابت بنانی حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ کو بغیر بوسہ دیئے ہوئے نہیں چھوڑتے اور فرماتے یہ وہ ہاتھ ہے جس نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دست مبارک کو چھوا ہے۔ حضرت امام احمد سے حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی قبر شریف اور ممبر شریف کے بوسہ دینے

کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں، انہیں امام احمد نے حضرت امام شافعی کی قیص کو دھویا اور دھوئے ہوئے پانی کو پی لیا۔ ہمارے ائمہ ہادی و رہبر ہیں ایک جماعت علماء نے ان سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نام شریف جس چیز پر لکھا ہوا ہو اس کو بوسہ دینے اور اس کی تعظیم کرنے اور اس سے تبرک حاصل کرنے اور اسکو آنکھوں اور سروں پر رکھنے کی تصریح کی۔

فقہ کی مشہور کتاب در مختار میں ہے:

طلب من عالم او زاهد ان یدفع الیہ قدمہ و یمکنہ من قدمہ لیقبلہ اجابہ۔

(در المختار ج ۵ ص ۲۵۳)

کوئی کسی عالم یا زاہد سے اس کا قدم اپنی طرف دراز کرنے اور اس قدم پر اسے بوسہ دینے کی موقع پانے کی خواہش کرے تو وہ عالم یا زاہد اس کی اجابت کرے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اخبار الاخیار میں حضرت شیخ احمد مجد شیبائی کے حال میں لکھتے ہیں جو جامع شریعت و صاحب ورع و تقویٰ تھے۔

اگر کہے پیش آمدہ گفتی کہ من حضرت رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم در خواب ویدہ ام با ادب نشستے و تمام قصہ رو یا را بشنودے و دست و پائے وے بوسیدے و دامان و آستینش اور ابروئے خود فرو مالیدے و بر جائے کہ آن شخص می گفت کہ در فلان جا دیدہ ام آنجا رفتے و بوسہ دادے و گرد آن جائے را خوردے و بر تن و بر جامہ چوں گلاب پاشیدے۔ (اخبار الاخیار ص ۱۸۵)

اگر کوئی شخص شیخ احمد کے سامنے آکر کہتا کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا ہے تو مودب ہو کر بیٹھ جاتے اور خواب کا پورا قصہ سنتے اور اس کے پھر پاؤں کو بوسہ دیتے، اور اس کے ہاتھوں اور آستینوں کو اپنے چہرے پر ملتے اور جس جگہ کو وہ کہتا کہ فلاں جگہ میں نے دیکھا ہے وہاں جاتے اور اس کو بوسہ دیتے اور اس مقام کی خاک کو اپنے چہرے پر ملتے، اور وہ پتھر ہوتا تو اس پتھر کو دھوئے اور اس پانی کو پی لیتے، اور اپنے بدن اور کپڑے پر گلاب کی طرح چھڑکتے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ علماء و صلحا کی دست بوسی و قدم بوسی اور آثار صالحین و تبرکات بزرگان دین کو بوسہ دینا اور مقام مقدسہ و اشیاء معظمہ کا بوسہ دینا اور اس سب اور اس ہر چیز کی جو کسی بزرگ کی طرف منسوب ہو تعظیم و توقیر کرنا اس سے تبرک حاصل کرنا آنکھوں سے لگانا جائز و مستحسن ہے۔ اور صحابہ و تابعین اور سلف و خلف صالحین کا مبارک فعل ہے اور عشق و محبت کی علامت ہے، اور جو انکے بوسہ کو

نا جائز اور بدعت کہے اور انکی تعظیم و توقیر سے جلے ان سے تبرک حاصل نہ کرے انکو اپنی آنکھوں سے لگا کر برا جانے وہ عمل صالحین کا مخالف ہے۔ بزرگان دین کا دشمن ہے۔ فعل سلف کو ناجائز کہتا ہے۔ طریقہ صالحین سے منحرف ہے۔ صرف باعتبار صورت کے مسلمان ہے۔ مولیٰ تعالیٰ اس کو ہدایت کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

(۵) بہار شریعت و احکام شریعت و فتاویٰ افریقہ میں جو اردو کے خطبہ پڑھنے کو خلاف سنت متواترہ و مکروہ تنزیہی لکھا ہے یہ حق ہے یہی میری بھی تحقیق ہے اور خاص اس مسئلہ میں میرا ایک مستقل رسالہ بھی ہے لیکن اگر وہاں کی مقامی خصوصیات کی بنا پر یہ بات فی الواقع صحیح ہے کہ انکے خلاف کرنے سے یقیناً فتنہ و فساد برپا ہو جائے گا تو رفع فتنہ کو مد نظر رکھتے ہوئے خطبہ کو اردو میں بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ کہ وہ جائز تو ہے لیکن بتدریج آہستہ آہستہ عوام تک صحیح مسئلہ پہنچایا جائے۔

اب رہیں سوال کی منقولہ عبارات اور فتاویٰ انکا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ ہمارے خلاف نہیں کہ ان عبارات اور فتاویٰ کا مقدمہ اور خلاصہ حکم اردو میں خطبہ پڑھنے کی جواز ہے۔ اور جواز کے ہم بھی مخالف نہیں لیکن جواز خلاف اولے مکروہ تنزیہی کو بھی عام ہے۔ ردالمحتار میں ہے۔ اطلاق الجائز و اراد بہ مایعم الکراہۃ۔ تو اس بنا پر بہار شریعت و احکام شریعت و فتاویٰ افریقہ میں اور ان فتوؤں میں کوئی تناقص نہیں اور حکم میں کوئی زبردست مخالفت نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدۃ سنجل

(۴۴۴)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسائل ذیل میں۔

ایک گاؤں جس کی آبادی دو سو گھر کی ہے ساٹھ گھر جس میں مسلمانوں کے ہیں ضرورت کی تمام اشیاء تقریباً مل جاتی ہیں جس کے چوطرفہ بارہ بارہ کوس دور شہر لگتے ہیں وہاں مسجد نہیں ہے اب مسلمان وہاں کے مسجد بنانا چاہتے ہیں اور جمعہ پڑھنا چاہتے ہیں کیا ایسی بستی میں مسجد بنانا اور جمعہ قائم کرنا از روئے شرع شریف کیسا ہے شہر کی مفصل تعریف لکھے گا۔ جس پر علمائے کرام کا اتفاق ہے۔

محمد شفیع مدرس مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد سادول پور ضلع چور ورا جستان

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

بلاشبہ ایسے گاؤں میں مسجد بنائی جائے اب رہا جمعہ کا قائم کرنا تو اس کے لئے شہر کا ہونا ضروری ہے۔ ثانی میں ہے: لاجمعۃ فی القری۔

شہر کی مفصل تعریف یہ ہے کہ اس میں مختلف محلے ہوں اور اس قدر بازار ہوں کہ وہاں کی ضروریات کے لئے کافی ہو اور اس میں ایک ایسا حاکم ہو جو معمولی مقدمات کا فیصلہ کرے کما حقہ علامہ ثانی فی ردالمحتار۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدۃ سنجل

(۴۴۵)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اہلسنت و جماعت کشف اللہ تعالیٰ نصر ہم و امداد ہم مسئلہ ذیل

(۱) میں کہ گذشتہ عید الفطر کا واقعہ ہے کہ ہمارے بلدہ گوبائی کی دس بارہ عورتوں سے عید الفطر کی نماز الگ الگ جماعت قائم کر کے پڑھ لئے ہیں۔ ایک نیم ملا خطرہ جان ناقص العقل نے امام ہو کے عورتوں کی عید کی نماز پڑھا دیا ہے ابھی اس کے بارے میں بہت فتنہ فساد ہو رہے ہیں اور ہونے کے اندیشے ہیں عورتوں کو بہت روکا گیا ہے آخر مانا نہیں سنتے ہیں اور عید الاضحیٰ کی نماز جماعت قائم کر کے پڑھنے کی تبلیغ کر رہے ہیں کیا یہ طریقہ شریعت میں جائز ہے یا نہیں؟

(۲) کیا فرماتے ہیں علماء کرام شرع متین اس مسئلہ میں کہ ہمارے شہر گوبائی میں عیدین کی نماز بہت بھاری جماعت ہوتی ہیں۔ لاؤڈ اسپیکر کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ اسپیکر کی آواز بہت بلند ہے دور تک جاتی ہے لہذا امام کے سامنے لاؤڈ اسپیکر رکھ کر نماز پڑھا دیتے ہیں اور سب لوگ سنتے اور خوش ہو جاتے ہیں کیا یہ جدید آلہ شریعت میں جائز رکھا ہے یا نہیں۔ مینو اتو جروا والسلام۔

احقر الناس خادم محمد عابد الرحمن پیش امام گوبائی

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

(۱) عورتوں پر نماز جمعہ وعیدین واجب نہیں ہے۔

طحطاوی میں ہے: فلا تجب علی امرأة۔

مراقی الفلاح میں ہے: فتجب علی من تجب علیہ الجمعة بشرائطها۔

توجب جمعہ عیدین کی نماز ان پر واجب ہی نہیں تو عورتوں کا اس کے لئے جماعت قائم کرنا غلط و باطل ہے نیز عورتوں کی جماعت مکروہ تحریمی ہے۔

در مختار میں ہے: یکرہ تحریمًا جماعة النساء ولو فی التراویح فی غیر صلوٰۃ جنازۃ۔

لہذا جب ان کی جماعت مکروہ تحریمی ہے تو اس کے لئے اہتمام و تداعی کرنا بھی ممنوع ہے وہ ہرگز ہرگز عید الاضحیٰ کی جماعت قائم نہ کریں۔

(۲) نماز میں لاؤڈ اسپیکر کا لگانا بلا ضرورت شرعی جو مقتدیوں کیلئے مفسد نماز ہے لہذا لاؤڈ اسپیکر کا امام کے سامنے ہونا ممنوع و ناجائز قرار پایا ہے اگر اس کی تفصیل وادلہ دیکھنی ہوں تو میرے ایک رسالہ میں جمع ہیں اور اس میں یوں نہیں لکھ سکتا کہ تقریباً ایک سال سے بیمار ہوں دلائل کثیرہ پیش کرنے سے مجبور ہوں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۲۶ رذیقہ ۱۳۷۹ھ

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۹ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿۲۶﴾

باب العیدین

(۳۳۶)

مسئلہ

جناب مفتی جی صاحب ہادی دین و جامع علوم ظاہری و منبع فیوض باطنی بعد مسنون السلام علیکم کے واضح ہو کہ آپ برائے مہربانی مسائل ذیل کے جواب باقاعدہ مہر کے تحریر فرمادیتے گے گا عین مہربانی ہوگی۔ بندہ کومنون و مشکور فرمایا گا۔ (نوٹ) خط صاف ہوتا کہ پڑھنے میں مشکوک نہ ہو۔

عید الاضحیٰ کو مسجد میں جگہ نہ رہنے کی وجہ سے تقریباتیں یا چالیس آدمی مسجد سے باہر تھے۔ ایک شخص مسجد سے باہر ٹین یعنی صحن میں تکبیر کہنے کے لئے مقرر کئے گئے۔ اب امام صاحب نے تکبیر تحریمہ کہی۔ ٹین میں جو تکبیر کہنے والے تھے انہوں نے بھی کہی لیکن اس وقت تک باہر کوئی انتظام صفیں سیدھی ہونے وغیرہ کا نہیں ہوا تھا۔ نہ امام صاحب نے اس پر غور کیا کہ انتظام نہیں ہوا ہے۔ وہ باہر والے اشخاص انتظام کرنے میں شور و غل کرتے رہے۔ انہوں نے اسی شور و غل میں تکبیر تحریمہ نہیں سنی۔ بعد میں ان لوگوں کے بیان سے معلوم ہوا کہ انہوں نے مسجد کی طرف غور کیا تو نماز میں اندرون مسجد سب آدمی مشغول تھے۔

تب ہم لوگوں نے نیت کی۔ ان لوگوں کو اختتام نماز کے بعد معلوم ہوا کہ ہماری تو ایک ہی رکعت ہو رہی ہے۔ کیونکہ ان کے شور و غل کے وقت پہلی رکعت فوت ہو چکی تھی اب ٹین میں جو تکبیر کہنے والے شخص تھے انہوں نے تکبیر تحریمہ کہی لیکن اس کے بعد پھر کوئی تکبیر یا ربنا لک الحمد پہلی رکعت میں نہیں کہا دوسری رکعت میں تکبیر کہنی پھر شروع کی اور وہ پوری تکبیریں اور ربنا لک الحمد کہی اب سلام پھیرنے کے وقت جب امام صاحب نے سلام سیدھی جانب کو سلام پھیرا تو جو شخص ٹین میں تکبیر کہنے والے تھے انہوں نے بھی پھیرا لیکن امام صاحب کو یہ عادت تھی کہ ہمیشہ دوسری جانب کو سلام کچھ رک کر پھیرتے ہیں یعنی تسلی کے ساتھ۔ لیکن اسی شخص نے جو ٹین میں تکبیر کہنے والے تھے انہوں نے امام صاحب سے پہلے بائیں جانب کو سلام پھیر دیا۔ تو اکثر لوگوں نے جو صحن مسجد اور ٹین میں تھے ان کے ساتھ سلام پھیر دیا اور کچھ لوگوں نے امام صاحب کی تائید کی اور اندرون مسجد سب لوگوں نے امام صاحب کی تائید کی اور بیرون مسجد والوں نے بھی کسی نہ کسی کی تائید پر سلام پھیرا۔ اس کے بعد بیرون مسجد کے آدمیوں نے کہا کہ ہماری تو ایک

رکعت ہوئی ہے۔ تو میں نے اور چند آدمیوں نے کہا کہ نماز دوبارہ پڑھ لو کیونکہ آدمی نہایت رہ گئے۔ تب امام صاحب نے بھی یہی کہا۔ لیکن اس کے بعد امام صاحب کہنے لگے کہ جن لوگوں کی نماز نہیں ہوئی ہے وہ آدمی دو رکعت نفل نماز ادا کریں تو عید کی نماز ادا ہو جائیگی یعنی دو رکعت نفل پڑھنے سے نماز عید الاضحیٰ درست ہوگئی۔ حل کر دیجئے گا۔ نماز عید الاضحیٰ ہوئی یا نہیں؟۔ یا کوئی شخص ان میں گنہگار ہوا یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

صورت مسئلہ میں مکبر نے بھی غلطی کی کہ اس نے پہلی رکعت کی تکبیرات انتقال ترک کر دیں اور دوسرا سلام امام سے قبل پھیر لیا۔ پھر سب سے زائد امام صاحب کی نہ صرف ایک غلطی بلکہ کثیر غلطیاں ہیں کہ انتظامات صفوف سے قبل ہی اس نے تکبیر تحریمہ شروع کر لی اور اس ناواقف شخص کو اپنی جانب سے ایسا مکبر تجویز کر دیا جو دوسروں کی نماز عید فوت ہو جانے کا سبب بنایا۔ پھر اس کی یہ غلطی بھی ہے کہ وہ اس صورت میں دوبارہ نماز عید پڑھنے کو تیار ہو گیا۔ پھر اس کی غلطی یہ ہے کہ اس نے یہ مسئلہ بتایا کہ دو رکعت نفل پڑھ لینے سے نماز عید الاضحیٰ ہو جائیگی اور حکم شرع یہ ہے کہ ان دو رکعات نفل سے گزرا نماز عید الاضحیٰ ادا نہیں ہوگی۔ پھر جن لوگوں نے اس امام کے ساتھ ہر دو رکعات نماز عید ادا کر لی ہے ان کی نماز عید ہوگئی اور بیرون مسجد کے وہ لوگ جنہوں نے امام کے ساتھ صرف ایک رکعت پڑھی ہے اور امام کے ساتھ سلام پھیر دیا ہے ان کی نماز عید ادا نہیں ہوئی تو یہ چار رکعت بہ نیت نماز چاشت پڑھ سکتے تھے؟۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۰۷ھ

(۳۴۷)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسائل ذیل میں

عید کی نماز کا سلام پھیر کر فوراً امام کو خطبہ پڑھنا چاہئے، یا سلام کے بعد دعا ”اللھم انت السلام“ پڑھنے کے بعد خطبہ کے لئے کھڑا ہونا چاہئے؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

نماز عید کا سلام پھیرنے کے بعد امام کو خطبہ پڑھنا چاہئے کہ نماز اور خطبہ کے درمیان کوئی دعا

جب نہیں۔ بخاری شریف میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی:

كان النبي ﷺ يخرج يوم الفطر والاضحى الى المصلى فاول شئ يبده به الصلاة ثم ينصرف فيقوم مقابل الناس والناس جلوس على صفوفهم فيعظهم ويوصيهم ويأمرهم

(صحیح البخاری (ص ۵۸۱ ج ۱)

حضور نبی کریم ﷺ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے روز عید گاہ کی طرف تشریف لے جاتے اور سب سے پہلی چیز یہ تھی کہ نماز پڑھتے پھر نماز سے فارغ ہو کر لوگوں کے سامنے کھڑے ہوتے اور لوگ صف بہ صف بیٹھے ہوتے اور حضور انہیں نصیحت فرماتے اور وصیت کرتے اور حکم فرماتے۔

طبرانی اور مسند امام احمد میں حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی:

كنا جلوساً ننتظر رسول الله ﷺ يوم الاضحى فجاء فسلم على الناس وقال ان اول من نسلك يومكم هذا الصلاة فقدم فصلى بالناس ركعتين ثم سلم فاستقبل القوم بوجهه ثم اعطى قوساً او عصاً فاتكأ عليها فحمد الله واثنى عليه فامرهم ونهاهم

(صحیح البخاری ص ۵۸۲)

ہم عید قربانی کے دن رسول اکرم ﷺ کے انتظار میں بیٹھے تھے تو حضور تشریف لائے اور لوگوں کو سلام کیا اور فرمایا آج کے دن پہلا فعل یہ نماز ہے پھر نماز پڑھانے کے لئے آگے بڑھے اور لوگوں کو دو رکعتیں پڑھائیں پھر سلام پھیر کر لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور کمان یا الاٹھی حاضر کی گئی تو اس پر اعتماد کیا پھر اللہ کی حمد و ثنا کی اور لوگوں کو بعض چیزوں کا حکم دیا اور بعض سے منع فرمایا۔

کتاب الآثار میں خود امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی:

كانت الصلاة في العیدین قبل الخطبة ثم يقف الامام على را حلقته بعد الصلاة فيدعو الخ۔

(صحیح البخاری (ص ۵۷۳ ج ۱)

دونوں عیدوں میں نماز خطبہ سے پہلے ہے پھر بعد نماز امام اپنی سواری پر کھڑے ہو کر خطبہ دے پھر دعا مانگے۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ نماز عید کی فراغت کے بعد امام کو خطبہ ہی پڑھنا چاہئے اور دعا بعد خطبہ کے پڑھے اور نماز و خطبہ کے درمیان کسی دعا کا پڑھنا ثابت نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ

(۲۴۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

ایک صاع کا وزن کتنا ہوتا ہے؟ ایک جگہ چار سیر دیکھا ہے اور ایک جگہ ساڑھے چار سیر دیکھا ہے۔ آپ اس کا وزن تولے کی شمار سے تحریر فرمائیے کہ صاع اتنے تولے کا ہوتا ہے۔ گیہوں یا گیہوں کا آٹا فطرے میں نصف دیا جائے گا اور کوئی چیز بھی ایسی ہے جو گیہوں کے برابر دی جائے گی، یا اس کے علاوہ ہر چیز گیہوں سے دو گنی دی جائیگی۔ بیواؤ تو جروا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

صاع حنیفوں کے نزدیک آٹھ رطل کا ہے۔ علامہ برہان الدین مرغینانی۔ ہدایہ میں فرماتے ہیں:

”الصاع عند ابی حنیفہ ومحمد ثمانية ارطال“ (ہدایہ ص ۱۹۰)

امام ابوحنیفہ و امام محمد علیہما الرحمة کے نزدیک صاع آٹھ رطلوں کا ہوتا ہے۔

امام اجل ابوالحسن بغدادی قدوری میں فرماتے ہیں:

الصاع عند ابی حنیفہ ومحمد ثمانية ارطال بالعراقی“ (مختصر القدوری ص ۵۱)

حضرت امام ابوحنیفہ و امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہما کے نزدیک صاع آٹھ رطل عراقی کا ہے۔

علامہ برہان الشریعہ وقایہ میں فرماتے ہیں:

”الصاع ما یسع فیہ ثمانية ارطال من مج او عدس“ صاع وہ ہے جس میں ماش یا مسور

کے عراقی آٹھ رطل بھرتے ہیں۔

علامہ ابوالبرکات نسفی کنز الدقائق میں فرماتے ہیں: ”وهو (الصاع) ثمانية ارطال“

(کنز الدقائق قیوبی ص ۲۲۹ ج ۱)

صاع آٹھ رطل کا ہوتا ہے۔ علامہ ابراہیم حلبی ملتقی الابحر میں فرماتے ہیں:

والصاع ما یسع ثمانية ارطال بالعراقی من نحو عدس او مج

(مجمع الانهر مصری ص ۲۲۹ ج ۱)

صاع وہ جس میں ماش یا مسور کے عراقی آٹھ رطل بھرتے ہیں:

فقہ حنفی ابوالفتح خوارزمی کتاب المغرب میں فرماتے ہیں: الصاع ثمانية ارطال عند اهل

(المغرب ص ۳۱۱ ج ۱)

العراق۔

اہل عراق کے نزدیک صاع آٹھ رطلوں کا ہے،

ان عبارات سے ثابت ہو گیا ہے کہ ہمارے امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نزدیک عراقی صاع

آٹھ رطل کا ہے اور اس میں یہ بھی تفصیل ہے کہ اس صاع میں مسور یا ماش کے آٹھ عراقی رطل سما جائیں۔

یا اس صاع کو اس طرح سمجھئے کہ صاع چار مد کا ہوتا ہے۔

علامہ شامی ردالمحتار میں شرح درالبحار سے ناقل: اعلم ان الصاع اربعة امد امدو الممد

رطلان والرطل نصف من۔ (از ردالمحتار مصری ص ۷۹ ج ۲)

جاننا چاہئے کہ صاع چار مدوں کا ہوتا ہے اور ایک مد دو رطلوں کا اور ایک رطل آدھے من کا۔

علامہ شیخ محمد طاہر مجمع بحار الانوار میں فرماتے ہیں: ”واجمعوا علی انه (الصاع) اربعة

(ص ۲۷۱ ج ۲)

امداد

سب نے اس پر اجماع کیا ہے کہ صاع چار مدوں کا ہے۔

ان ہر دو عبارات سے یہ ثابت ہوا کہ فقہاء کا اس پر اجماع ہوا کہ صاع چار مدوں کا ہے اور مد دو

رطل کا ہوتا ہے یا صاع تو یوں سمجھئے کہ صاع چار من کا ہوتا ہے اور من دو رطل کا ہوتا ہے۔

علامہ علاء الدین ہکشی صاحب درمختار اپنی کتاب بدرالمنشی شرح ملتقی میں فرماتے ہیں: ”

الصاع اربعة امناء والمن رطلان“ (بدرالمنشی مصری ص ۲۱۵)

صاع چار من کا ہے اور من دو رطل کا ہوتا ہے۔

علامہ صدر الشریعہ شرح وقایہ میں فرماتے ہیں: ”وعندنا نصف صاع من العراق وهو

(شرح وقایہ ص ۲۳۱ ج ۱)

منوان

ہمارے نزدیک عراقی آدھا صاع دو من کا ہے۔

ان ہر دو عبارتوں سے ثابت ہوا کہ عراقی صاع چار من کا ہوتا ہے اور ہر من دو رطل کا ہے۔

صل کلام یہ ہے کہ صاع کو اگر چار مد یا چار من کا بھی مان لیا جائے تو جب ہر مد اور من دو رطل کا ہے تو چار

مد یا چار من کے بھی وہی آٹھ رطل ہوتے ہیں جو مذکور ہوئے تو یہ اقوال تو مختلف ہوئے مگر سب کا نتیجہ ایک

ہی ہے۔ تو اب رطل کی تحقیق ضروری ہوئی کہ اس کی تفصیل سے صاع کا وزن معلوم ہو جائے گا۔

علامہ محقق شیخ زادہ مجمع الانهر میں فرماتے ہیں: ”وکل رطل عشرون استاراً“

(مجمع الانهر مصری ص ۲۲۹ ج ۱)

اور ہر رطل بیس استار کا ہوتا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ”الصاع ثمانية ارطال بالبغدادی و رطل البغدادی عشرون استاراً والاستار اربعة مثاقیل ونصف مثقال“ (عالمگیری مجیدی ص ۹۸)

صاع بغدادی آٹھ رطلوں کا ہے اور بغدادی رطل بیس استار کا ہے اور استار ساڑھے چار مثقال کا ہے۔

قاضی عبدالنبی احمد نگری جامع العلوم میں فرماتے ہیں: ”الصاع ثمانية ارطال والرطل نصف المن عشرون استاراً والاستار اربعة مثاقیل ونصف مثقال“ و باید دانست کہ ہر مثقال چہار و نیم ماہچہ است پس از استار یک تولہ و ہشت و ربع ماہچہ می شود و بریں حساب صاع دو صد و ہفتاد و پنج شود ہذا صاع عراقی ذہب الیہ ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ

(جامع العلوم حیدر آبادی ص ۲۳۰ ج ۲)

صاع آٹھ رطل کا ہے اور رطل نصف من یعنی بیس استار کا ہے اور استار ساڑھے چار مثقال کا ہے۔ اور جاننا چاہئے کہ ہر مثقال ساڑھے چار ماشہ کا ہے تو استار ایک تولہ سوا آٹھ ماشہ کا ہوا۔ پس اس حساب سے صاع دو سو ستر تولہ کا ہوا۔

اور یہ عراقی صاع ہے۔ ہمارے حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا یہی مسلک ہے۔

اسی جامع العلوم میں ہے: ”وفی القنیۃ مثقال بالکسر چہار و نیم ماشہ فیعلم من ہہنا ان المثلث ستم وثلثون حبة حمراء“ (جامع العلوم وحیدر آبادی ص ۲۱۰ ج ۲)

قنیہ میں ہے۔ مثقال ساڑھے چار ماشہ کا ہے۔ تو اسی سے معلوم ہوا کہ مثقال چھتیس سرخ کا ہموزن ہے۔

ان عبارات سے ظاہر ہو گیا کہ مثقال ساڑھے چار ماشہ کا ہے اور استار ساڑھے چار مثقال کا تو استار ایک تولہ سوا آٹھ ماشہ کا ہوا، اور رطل بیس استار کا تو رطل تینتیس تولہ نو ماشہ کا ہوا، اور صاع آٹھ رطل کا ہے تو صاع دو سو ستر تولہ کا ہوا جو انگریزی روپیہ سے سوا گیارہ ماشہ کا ہے، دو سو اٹھاسی روپیہ بھر کا قرار پایا۔ اور اس کا نصف صاع ایک سو چوالیس روپیہ بھر کا ٹھہرتا ہے۔ لیکن جب سیدنا اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس نصف صاع کا تجربہ کیا کہ اس پیمانے میں جو بھر کر تولے تو وہ ایک سو چوالیس بھر ہوئے اور

جب اسی نصف صاع شعیری میں گیہوں بھر کر تولے تو وہ من رطل کم پانچ رطل آئے یعنی ایک سو چوالیس روپیہ بھر جو کہ ایک سو چھتر روپیہ آٹھ آنے بھر گیہوں ہوئے۔ اور اس قدر وزن میں فرق ہو جانا بعید از قیاس نہیں ہے۔ کیونکہ جو ہلکا ہوتا ہے اور گیہوں بہ نسبت اس کے وزنی ہے تو جس برتن میں ایک سو چوالیس روپیہ بھر جو وزن میں اترے اسی میں جب گیہوں اسی طرح بھر کر تولے جائیں گے تو وہ یقیناً اس مقدار سے زائد ہوں گے کہ گیہوں جو سے زائد وزنی ہے۔ لہذا احتیاط اسی میں ہے کہ جب صدقہ فطر میں گیہوں یا اس کا آٹا دیا جائے تو ایک سو چھتر روپیہ آٹھ آنے بھر یعنی اس اسی روپیہ کی تول سے دو سیر تین جھٹانک اٹھنی بھر دیا جائے۔ اور جو اور گیہوں کے علاوہ جو غلہ دینا چاہیں تو ایک صاع جو یا نصف صاع گیہوں کی قیمت کے حساب سے دیا جائے، اس میں وزن کا اعتبار نہیں ہے۔

در مختار میں ہے: ”مالہ ینص علیہ کذرة وخبز تعتبر فیہ القیمۃ۔“

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المقتضی بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۸۱ھ



باب النوافل

مسئلہ

(۴۴۹)

کیا فرماتے ہیں علماء کرام و مفتیان عظام مسئلہ ذیل میں کہ
آیا سنتوں اور نفلوں کی چار رکعت کی نیت میں قعدہ اولیٰ میں صرف التحیات پڑھی جائیگی یا اس
کے بعد درود شریف اور دعا پڑھ کر تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہوں اور تیسری رکعت میں بسم اللہ اور
الحمد شریف سے قرأت شروع کی جائے یا اس سے پہلے سبحنک اللہم اور اعوذ باللہ بھی پڑھی جائیگی
بحوالہ کتب جواب سے مطلع فرمائیں۔ بینواتو جروا
المستفتی، عبد اللہ ساکن دیپاسرائے سنجل

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

ظہر کی پہلی چار سنت مؤکدہ اور جمعہ کے قبل و بعد کی چار چار سنت کا حکم تو فرض جیسا ہے کہ ان
کے قعدہ اولیٰ میں صرف التحیات پڑھ کر تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہو جائیں اور تیسری رکعت
سبحنک اللہم اور اعوذ باللہ سے شروع نہ کیا جائے بلکہ بسم اللہ اور الحمد للہ سے شروع کریں۔ لیکن ظہر
اور جمعہ کی ان سنتوں کے علاوہ اور تمام سنتوں۔ مستحبات۔ نفلوں کی چار رکعتوں میں قعدہ اولیٰ میں بعد
التحیات کے درود شریف اور دعا بھی پڑھی جائے اور تیسری رکعت کو سبحنک اللہم اور اعوذ باللہ سے
شروع کیا جائے۔

چنانچہ فقہ کی مشہور کتاب درمختار میں ہے ”ولا یصلیٰ علیٰ النبی ﷺ فی القعدة الاولى
فی الاربع قبل الظهر والجمعة وبعدها ولو صلیٰ ناسیا فعليه السهو وقيل لاشئ ولا
یستفتح اذا قام الی الثالثة منها لانها لتاكدھا اشبهت الفریضه وفی البواقی من ذوات الاربع
یصلیٰ علیٰ النبی ﷺ ویستفتح ویتعوذ ولو نذرًا لان کل شفعة صلاة“

(رد المحتار مصری جلد ۱ صفحہ ۲۷۴)

کتبہ: المقتسم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۴۵۰)

مسئلہ

هل یومر الصبیان بالنوافل کا ربع قبل العصر وضربوا علیٰ ترکھا ام لا؟

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

نعم یومر الصبی بالنوافل ویضرب اذا کان ابن عشر سنة لیتخلق بفعلها وبعثاده
ولقوله عليه السلام مروا اولادکم بالصلاة وهم ابنا سبع واضربوهم علیها وهم ابنا
عشر وفرقوا بینهم فی المضاجع رواه ابو داؤد۔ یستدل من الحدیث علی الصلوٰۃ وہی
مشملة علی النوافل ایضا وعلی ان الفرض فی حق الصبی نوافل فثبت الا مروا الضرب
للنوافل ایضا ویستوی فی التخلق والا اعتیاد الفرائض والنوافل بل ینبغی ان یومر بجمیع
المأمورات وینہی عن جمیع المنہیات کما صرح به فی رد المحتار واللہ تعالیٰ اعلم با
لصواب:

کتبہ: المقتسم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۴۵۱)

مسئلہ

سنت فجر کے متعلق جو حدیث ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ایک شخص کو فجر کی نماز کے بعد
دو رکعتیں پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ۔ صلوٰۃ الصبح رکعتیں رکعتیں۔ تو اس شخص نے جواب
دیا کہ میں فرض سے پہلے کی سنتیں نہیں پڑھی تھیں اب پڑھی ہیں اتنا سن کر حضور خاموش رہے اور کچھ نہ فرما
یا تو زید اس حدیث کی بنا پر کہتا ہے کہ فرض پڑھنے کے بعد فجر کی سنتیں پڑھ سکتے ہیں اگر فرض کے بعد سنتیں
جائز نہ ہوتیں تو حضور خاموش کیوں رہتے اس کو منع کرتے کہ ایسا آئندہ نہ کرنا۔ اگر اس حدیث کی ناسخ کو
لی حدیث ہو تو جواب میں تحریر کیجئے۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

فقہ کی کتب متون و شروح و حواشی و فتاویٰ وغیرہ میں فقہائے کرام کی یہ تصریحات موجود ہیں۔
روا مختار کی عبارت یہ ہے: لا یقضیٰ سنة الفجر الا اذا فاتت مع الفجر فیکفیضا تبعا
لقضائه لو قبل الزوال واما فاتت وحدها لا تقضیٰ قبل طلوع الشمس بالاجماع لکرہا
النفل بعد الصبح۔
(شامی ص ۵۰۳)

سنت فجر کی قضا نہ کی جائے مگر جب فرض کے ساتھ قضا ہو جائیں تو زوال سے پہلے تک فرض کی
قضا کی متابعت میں ان کی بھی قضا پڑھیں۔ لیکن جب فقط سنت قضا ہو جائیں تو باجماع طلوع آفتاب سے
پہلے قضا نہ پڑھیں کہ صبح کے بعد نفل مکروہ ہیں۔

تو اگر زید مقلد حنفی ہے تو اسے باوجود تصریحات فقہاء اور روایات مذہب کے حدیث سے استدلال
ل کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں اور جب فقہاء نے اس حدیث کے خلاف پراجماع کیا تو خلاف ظاہر ہو
گیا، بلاشبہ یہ حدیث ضعیف ناقابل عمل ہے کہ اجماع فقہاء حدیث صحیح کے خلاف پر کبھی نہیں ہو سکتا۔

اور اگر زید غیر مقلد ہے تو یہ بتائے کہ یہ کہاں ہے؟ اور اس کے رجال کیسے ہیں؟ اور اس کی
صحت کا کیا حال ہے؟ اور اس کا کونسا زمانہ ہے؟ اور اس کے معارض یہ احادیث ہیں:

عن ابن مسعود ان رجلا صلیٰ مع النبی ﷺ الصبح فلما انصرف صلیٰ رکعتین فقال
لہ ﷺ الصبح اربعاً؟ قال: یا رسول اللہ! انی کنت لم اصل رکعتی الفجر قال فلا اذا
- راوہ رزین -

عن قیس جد یحییٰ بن سعید الانصاری انه فعل مثل ذلك فقال لہ ﷺ مهلا
یا قیس! اصلا تان معاً؟ فقال: انی لم ارکع الرکعتین قال فلا اذا۔

(رواہ ابو داؤد و الترمذی)

اب زید اپنی پیش کردہ حدیث اور ان احادیث میں یہ بتائے کہ کون مقدم ہے اور کون متاخر اور
سکوت و ممانعت صریح میں کون رائج ہے کون مرجوح۔ بالجملہ جب زید ان امور صغیرہ کو بالتفصیل بیان
کردیگا تو پھر اس کے استدلال کی حقیقت بھی ظاہر کردی جائیگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمال غفرلہ الاول

مسئلہ

(۲۵۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ
صلاۃ اوابین جو چھ رکعت پڑھی جاتی ہے وہ فرض کے بعد کی دو سنتوں کے علاوہ چھ رکعتیں پڑھی
جاتی ہیں یا معہ سنتوں کے چھ رکعتوں کو پوری کی جاتی ہیں۔ حضور ہر مسئلہ کا جواب اطمینان بخش ہونا چاہئے
معہ حوالہ کتب کے۔

المستفتی محمد عبداللہ خاں مدرس مدرسہ عربیہ متصل رسالہ مسجد جہند باڑاہ۔ سی۔ پی۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

اوابین کی چھ رکعتوں کی ایک نیت ہی باندھی جائے، دو رکعتیں سنت کی اسی میں محسوب ہوں گی۔
در مختار میں ہے: هل تحسب الموكدة من المستحب ويؤدي الكل بتسليمه واحدة
اختار الكمال نعم۔
(شامی ص ۴۷۳۔ ج ۱)

کبیری میں ہے: وقع عندی انه اذا صلیٰ اربعاً بعد الظهر بتسليمه واحدة او اثنين يقع
عن السنة والمندوب سواء احتسب هو الموكدة منها اولاً۔ وفيه ايضا الحال في الست
بعد المغرب كما الحال هذه الاربع واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۲۵۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ
اگر ایک شخص رمضان کے مہینہ میں دو جگہ نماز تراویح پڑھاوے تو کیا یہ نماز تراویح ہو سکتی ہے۔
پہلی دفعہ اول رات میں اور دوسری دفعہ چھٹی رات میں اور امام صاحب کہتے ہیں کہ میں تو نفل پڑھاتا
ہوں تو کیا ایسی نماز ہو سکتی ہے اور اس امام کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں؟

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

نماز تراویح سنت مکرہ اور جماعت سے وقت پڑھنا صحیح ہے۔ اگر مہینہ پڑھنا چاہتا ہے اور دوسری

بار نوافل ہونگے اور نوافل کی جماعت مکروہ ہے۔

شامی میں ہے: والنفل بالجماعة غیر مستحب۔

اور جب اس امام میں سوا اس کے اور کوئی موانع امامت نہ ہوں تو اس کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ ہاں اسے ایسی عادت سے منع کیا جائے واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۵۷ھ

مسئلہ

(۲۵۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ بعض حضرات ایسے ہیں کہ وہ کبھی فرائض ادا نہیں کرتے اور اگر کرتے ہیں تو کبھی کبھی بخلاف اس کے کہ وہ نفل واحکام مستحبہ کرنے کو توڑے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں کہ بغیر ان باتوں کے تو دین ہی بیکار ہے۔ مثلاً سوم، کوئٹہ، گیارہویں شریف، تعزیہ داری، مروجہ عرس شریف، برسی، چہلم، رجبی شریف وغیرہ۔ دیگر یہ کہ کچھ حضرات یہ کہتے ہیں کہ بھائیو پہلے جب تک آپ لوگ فرائض ادا نہیں کریں گے، تو یہ تمہارے اوپر والے تمام اعمال کام نہیں دیں گے۔ اور نہ یہ قبول ہوں گے۔ اور وہ اس کی سند کے واسطے حضرت مولانا مولوی احمد رضا خان صاحب کی عبارت پیش کرتے ہیں، جو معہ حوالہ نقل کی جاتی ہے، کتاب الوظیفۃ الکریمہ مطبوعہ مطبع اہل سنت و جماعت بریلی واقع آستانہ عالیہ رضویہ بار سوم ۵۰ جلد ۱۴ کے آخر میں عبارت تحریر ہے۔ فقیر احمد رضا قادری غفرلہ پنجم محرم ۱۳۳۸ھ بھی تحریر ہے۔ اصلی عبارت۔

جس پر فرض باقی ہوں اس کے نفل اور اعمال مستحبہ کام نہیں دیتے بلکہ قبول نہیں ہوتے جب تک فرائض ادا نہ کرے۔

اس عبارت کے پیش کرنے پر بھی وہ لوگ احکام شریعت سے روگردانی کرتے ہیں۔ تو ایسے حضرات کی بابت شرعاً کیا حکم ہے؟ کیا وہ حق بجانب ہیں جو اعمال مستحبہ نقلی پر اڑے رہیں اور فرائض ادا نہ کریں؟ المستفتی لیاقت حسین انصاری۔ بلاری مراد آباد ۱۳۵۷ھ رمضان المبارک ۱۳۵۷ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

فرائض کی ادا ذمہ پر ضروری ہے یہاں تک کہ اس کا تارک سخت گنہگار اور فاسق ہو جاتا ہے اور نوافل واعمال مستحبہ نہ ذمہ پر ضروری نہ انکا تارک فاسق گنہگار۔ اور بلا شک جس پر فرائض باقی ہوں اسکے اعمال مستحبہ ونوافل قبول نہیں ہوتے۔ تو فرائض کا ادا کرنا تو فرض ہی ہوا اور مستحبات ونوافل صرف باعث اجر وثواب ہوئے تو فرائض ونوافل کا یہ فرق باعتبار عمل اور ادا کے ہے اور یہ امر تو اتفاقی ہے اس میں کوئی بھی شبہ بھرا کا اہل سنت و جماعت اور فرقہ ضالہ وہابیہ میں فرق نہیں، جو ہے اس کو سائل یا تو اپنی جہالت کی بنا پر نہیں سمجھ سکا یا وہ جان بوجھ کر مسلمانوں کو مغالطہ میں ڈالنا چاہتا ہے۔

فرق یہ ہے کہ اہل سنت نوافل میں مستحبات کو جائز اور سبب اجر وثواب اعتقاد کرتے ہیں، اور وہابیہ ان مستحبات کو ناجائز و بدعت کہتے ہیں، تو ان وہابیہ نے ان مستحبات کو ناجائز و بدعت بتا کر گویا نفل حلال کو حرام قرار دیا، جو گمراہی و ضلال ہے۔ لہذا اب فرق یہ ہوا کہ تارک فرض فاسق و گنہگار تو ہوا لیکن گمراہ و ضال نہیں ہوا۔ اور جو مستحبات کو ناجائز و بدعت کہتا ہے وہ نہ صرف گنہگار بلکہ گمراہ و ضال قرار پایا۔ تو حقیقہ یہ تقابل عمل کا عمل سے نہیں ہے بلکہ تقابل عمل کا عقیدہ سے ہے۔ تو اب اس سائل کی سخت جہالت یہ ہے کہ ترک عمل کا مخالفت عقیدہ سے تقابل کر رہا ہے۔ یا اس کا انتہائی فریب یہ ہے کہ وہ ترک فرض کی اہمیت دکھا کر اعتقادی امور سے گمراہ کرنے کی ناپاک سعی کرتا ہے۔

حاصل جواب یہ ہے کہ سوم، گیارہویں شریف، فاتحہ، عرس، برسی، رجبی شریف، وغیرہ امور مختلف فیہا تو یہ عملی طور پر تو ضرور مستحبات سے ہیں جو ان کو جائز اعتقاد کرتے ہوئے اگر نہ کرے تو نہ وہ گنہگار ہے نہ اس پر ملامت نہ عذاب۔ لیکن انکا عملاً وہابیہ تو کرتے ہی نہیں اور اس کے ساتھ ان امور کو ناجائز و بدعت کہتے ہیں۔ تو یہ ان مستحبات کو ناجائز و حرام ٹھہرا کر سخت گنہگار بھی ہوئے۔ اور گمراہ و ضال بھی ہوئے۔ تو ان مستحبات کو جائز اعتقاد کرنا شعار اہل سنت ہے۔ اور انکو بدعت و ناجائز اعتقاد کرنا شعار وہابیہ اہل ضلال سے ہے۔ تو وہابیہ کا ان امور مستحبہ کو ناجائز و بدعت کہنا، گویا حلال کو حرام قرار دینا ہے تو اس اعتبار سے اہل سنت کا اڑنا بالکل صحیح ہے، کہ یہ شعار اہل سنت ہے اور ان امور کو ترک کرانے والے وہابیہ ہیں جو اپنی فریب کاری سے مسلمانوں کو طریقہ حقہ سے گمراہ کرنے کی فکر میں ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ ان وہابیہ کے شر اور فریب و کمر سے بچائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۵۷ھ

مسئلہ

(۴۵۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ
عشاء کی دو سنت اور وتر کے درمیان جو دو نفل پڑھنے کا اکثر رواج ہے، اس کا کیا ثبوت ہے اور
سنت وتر کے درمیان دو نفل کیسے آئے؟ درمیان میں نہ پڑھتے ہوئے آخر میں چار نفل پڑھے جائیں تو
کیسا ہے؟ اور جمعہ، ظہر، مغرب عشاء میں جو نفل پڑھتے ہیں، ان کا ثبوت کہاں سے ہے؟ آیا کسی حدیث
سے ہے یا کسی بزرگ کے مقرر کردہ ہیں۔

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

فرض عشاء کے بعد علاوہ دو سنت مؤکدہ کے چار رکعت نفل پڑھنا مستحب ہے۔

مراتی الفلاح میں ہے: و ندب اربع بعد العشاء لما روينا لقوله صلى الله تعالى عليه
وسلم من صلى قبل الظهر اربعا كان كأنما تهجد من ليلته و من صلى هن بعد العشاء كان
كمثلهن من ليلة القدر۔

یعنی فرض عشاء کے بعد چار رکعت پڑھنا مستحب ہے، اس حدیث کی بنا پر جو ہم نے روایت کی
اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اس حدیث کی بنا پر کہ جس نے فرض ظہر سے پہلے چار رکعت پڑھیں تو
گویا اس نے اس رات کی تہجد کی نماز پڑھی۔ اور جس نے فرض عشاء کے بعد چار پڑھیں تو وہ لیلۃ القدر میں
چار رکعت پڑھنے کے مثل ہے۔ تو اس سے بعد عشاء چار نوافل پڑھنا مستحب ثابت ہو گیا پھر اگر ان نوافل
کی دو رکعت سنت مؤکدہ کے بعد اور پڑھ لی جائیں اور دو رکعت بعد وتر پڑھ لی جائیں تو اس میں کوئی
محظور شرعی لازم نہیں آتا۔ کہ حقیقۃً نوافل جبر نقصان کے لئے مشروع ہوئے ہیں۔

اسی مراتی الفلاح میں ہے: النوافل شرعت لجبر نقصان يمكن في الفرض۔

تو پہلی دو رکعتیں فرائض کے جبر نقصان کے لئے ہو گئیں اور بعد کی دو رکعات نفل وتر کے جبر
نقصان کے لئے ہوئیں۔ لہذا یہ طریقہ اس سے اولیٰ ہے کہ چاروں رکعات نفل اخیر میں پڑھے جائیں
اگرچہ اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح بعد جمعہ و ظہر اور بعد مغرب و عشاء جو نوافل پڑھے جاتے
ہیں، ان کا ثبوت بھی احادیث سے ثابت ہے۔

حدیث ترمذی شریف میں حضرت ام المؤمنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

من حافظ علی اربع رکعات قبل الظهر و اربع بعدھا حرّمہ اللہ علی النار۔ یعنی، جس
نے فرض ظہر سے پہلے چار رکعتوں اور بعد والی چار رکعتوں پر ہمیشگی کی تو اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ حرام فرما
دے گا۔

حدیث دیلمی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے، کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم نے فرمایا:

من صلی اربع رکعات بعد المغرب قبل ان يتكلم احد ارفع له في عليين و كان
كمن ادرك ليلة القدر في المسجد الاقصی و هو خير من قيام نصف ليلة۔

یعنی جس نے بعد فرض مغرب کے چار رکعتیں کسی سے بات کرنے سے پہلے پڑھ لیں تو وہ اس کو
علیین میں بلند کرائیں گی۔ اور وہ شخص اس کی مثل ہو جائے گا۔ جس نے مسجد اقصیٰ میں لیلۃ القدر کو پالیا
اور وہ نصف شب کے قیام سے افضل ہے۔

حدیث طبرانی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
نے فرمایا:

من صلی العشاء فی جماعة و صلی اربع رکعات قبل ان يخرج من المسجد كان
كعدل ليلة القدر۔

یعنی جس نے فرض عشاء جماعت میں پڑھے او چار رکعتیں مسجد سے نکلنے سے پہلے پڑھیں، تو وہ
لیلۃ القدر میں پڑھنے کے مثل ہیں۔ تو ان احادیث سے بعد ظہر و جمعہ اور بعد مغرب و عشاء نوافل کا پڑھنا
ثابت ہو گیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدۃ سنجل

(۴۵۶)

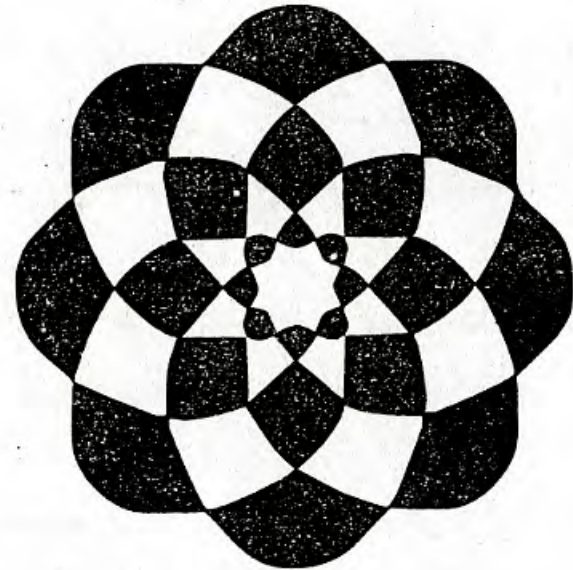
مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

مسجد میں جا کر کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اکثر اشخاص تحیۃ الوضو۔ تحیۃ المسجد۔ یا مستحب
نوافل یا سنت مؤکدہ ادا کرتے ہیں۔ یہ وقفہ شریعت میں کیسا ہے؟ ح۔ م۔ اشرفی ۲۵ اکتوبر

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم
مسجد میں داخل ہونے کے بعد تحیۃ المسجد دیگر نوافل بلا کسی وقفہ کے پڑھنے چاہئیں اور کچھ دیر بیٹھنے کے بعد تحیۃ المسجد یا نوافل کا پڑھنا مناسب و خلاف اولیٰ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب
کتبہ: المقتضی بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۸۷ھ



﴿۲۸﴾

باب التہجد

مسئلہ

(۲۵۷)

کیا فرماتے ہیں حضرات علماء اہل سنت اس مسئلہ میں کہ
زید کہتا ہے کہ تہجد کی نماز کا وقت عشاء کی نماز پڑھ کر سونے کے بعد ہے جب رات کے کسی حصہ
میں آنکھ کھلے پڑھ سکتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص عشاء کی نماز پڑھ کر ۹ بجے سویا اور دس بجے بیدار ہو گیا تو ۱۰ بجے
پڑھ سکتا ہے اگر شب بیداری کرے تو تہجد نہیں پڑھ سکتا ہے۔ بکر کہتا ہے کہ یہ مسئلہ غلط ہے اگر کوئی شخص
شب بیداری کرے تو بھی ۱۲ بجے کے بعد تہجد پڑھ سکتا ہے دریافت طلب امر یہ ہے زید صحیح کہتا ہے یا بکر
؟۔ بینا تو جروا

المستفتی، رمضان علی محلہ قاضی پورہ بہرائچ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم
تہجد کے معنی بہ تکلف نیند کا زائل کرنا ہے۔ ردالمحتار میں ہے ”التہجد از الۃ النوم بتکلف“
تو تہجد والا وہی شخص قرار پایا جو سونے کے بعد نماز نفل پڑھے۔ چنانچہ مجمع طہرانی کی حدیث میں ہے:
یحسب احدکم اذا قام من اللیل یصلی حتی یصبح انه قد تہجد انما تہجد المرأ
یصلی الصلوۃ بعد رقدہ۔ (ردالمحتار جلد ۱ صفحہ ۲۸۰)

یعنی تمہارا کوئی شخص گمان کرتا ہے کہ جب رات کے کسی حصہ میں نماز پڑھے یہاں تک کہ صبح
ہو جائے تو اس نے تہجد کو ادا کر لیا۔ بلکہ تہجد پڑھنے والا وہی شخص ہے جو سونے کے بعد نماز پڑھے
تو اس حدیث سے ثابت ہو گیا کہ نماز تہجد سونے کے بعد ہی ہوا کرتی ہے۔ اب باقی رہا یہ امر کہ
تہجد کا وقت کب سے شروع ہو جاتا ہے تو حدیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وقت تہجد نماز عشاء کے بعد ہی
سے شروع ہو جاتا ہے۔

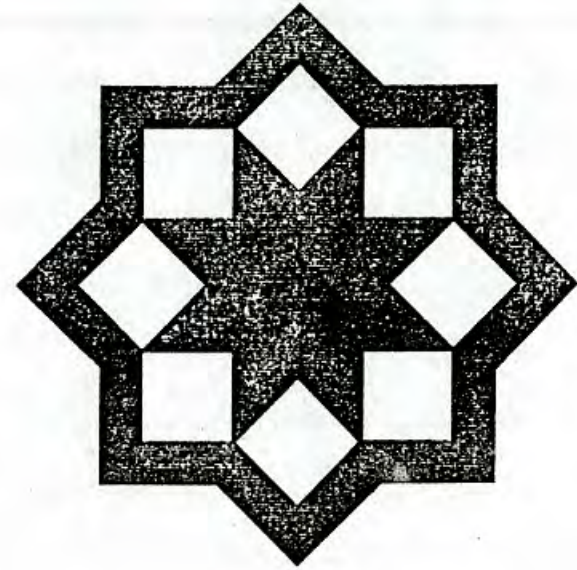
چنانچہ طبرانی کی حدیث مرفوع میں ہے:

”وما كان بعد صلوٰۃ العشاء فهو من الليل“ (رد المحتار جلد ۱ صفحہ ۴۸۰)

یعنی نماز عشاء کے بعد جو نفل بھی ہوگا وہ تہجد ہی ہے۔ تو اب جو شخص اول وقت میں نماز عشاء پڑھ کر سو گیا۔ پھر ایک گھنٹہ کے بعد آنکھ کھل گئی تو اب وہ جس قدر نفل پڑھیں گا وہ نماز تہجد ہی ہوگی۔ تو اسی سے قول زید کا صحیح ہونا اور قول عمر کا خلاف تحقیق ہونا ثابت ہو گیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۲ ربیع الآخر ۱۳۷۶ھ

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنجل



﴿۲۹﴾

باب قضاء الفوائت

(۴۵۸)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین دامت برکاتہم العالیہ مسائل ہذا میں جس شخص کی نماز فجر قضا ہو تو وہ پہلے ظہر کی نماز پڑھے یا فجر کی قضا؟۔ یونہی اگر ظہر کی قضا ہو تو عصر کو۔ یا عصر کی قضا ہو تو مغرب کو۔ اگر مغرب کی قضا ہو تو عشاء کو۔ اور عشاء کی قضا ہو تو فجر کو پہلے قضا نماز پڑھے بعد کو وقتی فرض نماز پڑھے۔ یا پہلے وقتی فرض پڑھنے کے بعد اگر جماعت ہو رہی ہو تو جماعت میں شریک: یا قضا پڑھے؟۔

زید یہ کہتا ہے کہ جس وقت کی نماز قضا ہوئی تو دوسرے روز اسی وقت پر پہلے قضا بعد کو وقتی فرض نماز پڑھے۔ مثلاً دو شنبہ مبارکہ کو نماز ظہر قضا ہوئی تو اب یوم سہ شنبہ کو پہلے قضا پڑھے بعد کو سہ شنبہ کی ظہر اگر چہ جماعت ہی کیوں نہ ہو رہی ہو۔ کیا زید کا کہنا صحیح ہے؟۔ بینو اب التفصیل تو جرو با جلیل۔
المستفتی، فقیر محمد عمران قادری رضوی مصطفوی غفرلہ ربہ محلہ میر خاں پیلی بھیت شریف

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

صاحب ترتیب پہلے قضا نماز پڑھے اس کے بعد وقتیہ نماز ادا کرے۔ نیز اگر جماعت ہو رہی ہو تو وہ پہلے اپنی قضا نماز پڑھے اور جماعت میں شرکت نہ کرے۔ اور غیر صاحب ترتیب پہلے وقتیہ نماز پڑھ سکتا ہے اور وہ قضا سے پہلے جماعت میں شریک ہو جائے۔

زید کا قول صحیح نہیں ہے کہ صاحب ترتیب پر وہ وقتی نماز سے پہلے قضا نماز کا پڑھنا ضروری ہے تو دوسرے دن کے اوقات کا انتظار کر ہی نہیں سکتا اور غیر صاحب ترتیب کو بھی جلد از جلد پہلی فرصت میں قضا نماز ادا کرنی چاہئے دوسرے روز کا انتظار پھر اسی وقت خاص کا التزام اس کے لئے ثابت کرنا مسائل دین سے ناواقفی کی دلیل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۲۲ صفر المظفر ۱۳۷۸ھ

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمال غفرلہ الاول



باب المساجد

مسئلہ

(۴۵۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک مسجد میں کڑیوں کی چھت ہے۔ اہل محلہ یہ چاہتے ہیں کہ چھت کو اکھاڑ کر ڈاٹ لگوادی جائے۔ اہل محلہ کے پاس صرف سو روپیہ جمع ہیں اس سے زیادہ دام ہونے کی توقع نہیں اور یہ کڑیاں مسجد کے کام میں آنے والی نہیں اور اسی طرح پڑی رہنے سے ضائع ہونے کا خوف ہے۔ لہذا دریافت طلب یہ امر ہے کہ ان کڑیوں کو فروخت کر کے کڑیوں کی قیمت ڈاٹ میں صرف کر سکتے ہیں یا نہیں؟۔ بینوا تو جروا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

کڑی تختے اجزائے مسجد میں داخل ہیں۔ اگر وہ فی الواقع اس مسجد کی حاجت سے زائد اور آئندہ بھی عمارت مسجد میں کام نہ آئیں اور ان کے اٹھا رکھنے میں ضائع ہونے کا خوف ہو تو اس محلہ کا ایک مسلمان دیندار خدا ترس موتمن معتمد اس بار کو اپنے اوپر اٹھا کر مناسب قیمت کے ساتھ فروخت کر سکتا ہے اور وہ قیمت ڈاٹ میں صرف ہو سکتی ہے۔

عالمگیری میں ہے: مسجد اراد رجل ان ينقضه ويسنيه احکم ليس له ذلك۔ لانه لا ولاية له مضمرات الا ان يخاف انه ينهدم تاتار خانیه۔ وتاويله ان لم يكن الباني من اهل تلك المحلة واما اهلها فلهم ان يهدمو او يجدوا ابناؤه وليفرشوا الحصى ويعلقوا القناديل لكن من مالهم لا من مال المسجد الا بامر القاضي خلاصه اه۔ وفي العقود الدرية عن البحر عمدة الفتاوى لا يجوز بيع بناء الوقف قبل هدمه اه۔ وفي الهندية عن السراجية لو باعوا غلة المسجد ونقض المسجد بغير اذن القاضي الاصح انه لا يجوز اه۔ وفي الدر صرف الحكم او المتولى نقضه ثمنه ان تعذر اعادته عليه الى عمارته ان احتاج والا حفظه ليحتاج الا اذا خاف فباعه فيبيعه ويمسك ثمنه ليحتاج۔ وفي الخانية من فصل المقابر والرباطات قد

ذکرنا ان الصحيح من الجواب ان بيعهم بغير امر القاضي لا يصح الا ان يكون في موضع لا قاضی هناك۔

مگر ہاں جو ان کو خریدے وہ کسی ناپاک یا تحقیر کی جگہ جیسے پاخانہ و غسل خانہ وغیرہ میں نہ لگائے، کہ مسجد کے اجزائے حرمت کا لحاظ ضروری ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: ا. معتمد ب. ذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد ا. جمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ ا. جمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۲۶۰ھ

مسئلہ

(۴۶۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ عورتوں کو مسجد میں دن یا رات میں بغرض عمارت دیکھنے مسجد کے اندر جانا جائز ہے یا نہیں؟۔

عبد الغفار ساکن محلہ کوئلہ ۲۸ شعبان ۱۲۵۴ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

عورتوں کے لئے مساجد میں جانے۔ جمعہ اور عیدین اور پنجو قتی جماعتوں کی شرکت کرنے کو شرع نے ممنوع قرار دیا حالانکہ شریعت میں ان چیزوں کی کیسی سخت تاکید ہے۔

در مختار میں ہے: ويكره حضور هن الجماعة ولولجمعة وعيد ووعظ مطلقا ولو عجزوا ليلا على المذهب المفتى به لفساد الزمان۔

مرآۃ الفلاح میں ہے: ولا يحضرن الجماعات لما فيه من الفتنة والمخالفة۔
جوہرہ نیرہ میں ہے: الفتوى اليوم على الكراهية فى الصلوات كلها لظهور الفسق فى هذا الزمان۔

علامہ شیخ مصطفیٰ کی شرح کنز میں ہے: ولا يحضرن الجماعات مطلقا ولو عجائز فى الفجر او غيره وعليه الفتوى۔

اسی طرح عینی۔ غنیۃ۔ طحاوی۔ بحر۔ نہر وغیر کتب فقہ میں ہے۔

ان عبارات سے واضح طور پر ظاہر ہو گیا کہ ہمارے مذہب کا اس زمانہ میں قول مفتی بہ یہی ہے کہ بوڑھی عورتوں کی بھی خصوصاً شب کے وقت میں خاص اداۓ فریضہ کے لئے مساجد میں جانا جائز

نہیں۔ تو ایک غیر ضروری چیز محض عمارت دیکھنے کے لئے عورتوں کا جانا کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔ عمارت دیکھنے کی نہ کوئی حاجت۔ نہ وہ شرعاً موکد۔ اور حدیث میں وارد ہے:

فاذا خرجت استشر فها الشيطان رواه الترمذی وفي رواية مسلم تقبل في صورة شيطان وتدبر في صورة شيطان الحديث۔

کہ جب عورت نکلتی ہے دو شیطان اس کے ساتھ ہوتے ہیں ایک آگے ایک پیچھے۔ بالجمہ عورت کا صرف عمارت دیکھنے کی غرض سے ہمارے زمانہ فسق و فجور میں نکلنا احتمال فتنہ و فساد سے خالی نہیں۔ لہذا وہ شرعاً ناجائز ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: اعمتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۶۱ھ

(۴۶۱)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ سود کے مال سے مسجد بنانا یا عید گاہ بنانا عند الشرع جائز ہے یا ناجائز؟۔ بینوا تو جروا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجد پاک مکان ہے اور سودی روپیہ مال خبیث ہے۔ لہذا مال خبیث سے مسجد کی تلویت ممنوع ہے۔ شامی میں ہے۔

لو انفق فی ذلك مالا خبیثا ومالا سببه الخبیث والطیب فیکره لان الله تعالی لا یقبل الا الطیب فیکره تلویت بیتہ بمالا یقبل۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: اعمتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۶۲ھ

(۴۶۲)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ مسجد کے فرش کے باہر کوئی درخت عشق پیچاں وغیرہ بو کر اس کی تیل دیوار یا سائبان مسجد برائے زیبائش پھیلا ناجائز ہے یا نہیں؟۔ بینوا تو جروا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

خارج مسجد درخت بو کر اس کی تیل دیوار یا سائبان مسجد پر بقصد زیبائش پھیلا ناجائز بہ نیت تعظیم مسجد ہو شرعاً ممنوع نہیں۔ کما هو مصرح فی کتب الفقہ لانہ فیہ تعظیم المسجد وتقع للناس ولبس فیہ تفریق الصفوف والضیق علی الناس کما فی الہندیۃ ورد المحتار والدر المختار والخلاصۃ وغیرہا فقط۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: اعمتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۶۳ھ

(۴۶۳)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ کسی مسجد کو ایک معاہدہ یا اقرار نامہ کے ذریعہ سے جس کی نقل اس استفتاء کے ہمرشتہ ہے گورنمنٹ بند بن کے محکمہ آثار قدیمہ کی سپرد کر دینا اور اس محکمہ کو مندرجہ اقرار نامہ اختیارات دیدینا اور پابندیاں قبول کرنا ناجائز ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجدیں خاص اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ: ان المسجدا لله۔

اور ولایت کافر کی مسلم پر جائز نہیں: لا ولاية لکافر علی المسلم کما قال اللہ تعالیٰ: لن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلاً۔

اقرار نامہ کی رو سے بہت امور میں نامسلم حکومت کے مقابلہ میں متولیان مسجد کو مجبور ہو جانا پڑتا ہے۔ کیونکہ مسجد کی تعمیر و حرمت قربت ہے اور یہ غیر مسلم سے صحیح نہیں۔

مسجد کی تعمیر مسلمان کے پاک مال سے ہو سکتی ہے۔ کافر کا مسجد بنانا اور اپنے روپے اور اختیار سے اس کی تعمیر کرنا یا مرمت کرنا ناجائز نہیں۔ کیونکہ مسجد کی تعمیر و مرمت قربت ہے اور وہ غیر مسلم سے صحیح نہیں۔

در مختار میں ہے:

و شرط سائر التبرعات كحرية وتكليف ان يكون قربة في ذاته -

مسجد عبادت کے لئے ہے سوائے مختلف کے دوسرے کے لئے اس میں کھانا۔ پینا۔ سونا۔ پینا۔ بلکہ دنیا کی باتیں کرنا تک ممنوع ہے۔ ان امور کی مسلمانوں کو بھی اجازت نہیں چہ جائے کہ مومن و کافر سب کے لئے ایک تماشا گاہ بنا دینا۔

الاشباه والنظائر میں ہے: ومن البيع والشراء كل عقد لغير المعتكف ويجوز له بقليل حاجة ان لم يحضر السلعة وانشاد الضالة والاشعار والاكل والنوم لغير غريب ومعتكف والكلام المباح -

مسجدوں میں بلحاظ حرمت مسلمانوں کے بچے تک لانے کی ممانعت ہے۔
حدیث شریف میں ہے:

جنبوا مساجدكم صبيانكم ومجانينكم وبيعكم وشراءكم ورفع اصواتكم وسيوفكم واقامة حدودكم -

مسجد میں آواز بلند کرنے کی ممانعت بھی اسی حدیث سے معلوم ہوگئی، پھر چہ جائیکہ ہر شخص مومن یا کافر کو سیر یا تماشا کے لئے مسجد میں آنے کی تمام اجازت دینا۔

مسجد میں مسلمانوں کو بھی خاص نماز و ذکر کے لئے آنے کی اجازت ہے اور ان کے داخلہ کے بھی بہت پابندیاں ہیں۔ چنانچہ جب یعنی بے غسل اور حائضہ اور نفساء مسجد میں داخل نہیں ہو سکتے۔

الاشباه والنظائر میں ہے: فممنها (ای من احکام المسجد) تحريم دخوله على الحنث والحائض والنفساء ولو على وجه المرور -

اسی طرح پیاز، لہسن یا کوئی ایسی چیز کھانے والا جس کی بدبو کھانے کے بعد اس کے منہ سے آتی ہو مومن بھی داخل نہیں ہو سکتا۔

الاشباه والنظائر میں ہے: ويكره دخوله لمن اكل ذاريج كريهة ويمنع منه -

اسی طرح جس کے بدن پر نجاست لگی ہوئی ہو وہ بھی مسجد میں داخل نہ ہوگا۔

عالمگیری میں ہے: لا يدخل المسجد من على بدنه نجاسة -

نیز مسلم و نا مسلم بے پردہ عورتیں بھی آئیں گی علاوہ اس کے کہ بے پردہ عورتوں کا اور پردہ نشینوں کا دن میں جماعتوں کے اوقات میں بھی آنا ممنوع ہے۔ عامہ کتب۔

لہذا اب کون تحقیق کرے گا کہ وہ عورتیں حائضہ ہیں یا نہیں؟۔ اور اس عام داخلہ کی اجازت کی صورت میں پاک اور ناپاک کا امتیاز کس طرح رہے گا۔ اور یہ کیسے معلوم ہوگا کہ اس کے بدن یا کپڑے پر نجاست لگی ہے یا نہیں؟۔ اور کس کس کا منہ سونگھا جائے گا کہ شرابی تک مسجد میں آئینگے۔ اس لئے اس قسم سے مسجد کی بے حرمتی ہوتی ہے۔

یہ اقرار نامہ متولیوں کے شرعی اختیارات سلب کرتا ہے اور اس سے تولیت کو نقصان پہنچتا ہے اور یہ واقف کے منشا کے خلاف ہے۔

ونية الواقف كنص الشارع -

علاوہ بریں متولیوں کو ایسا اقرار نامہ لکھنا اور کسی نا مسلم کو اسے اختیارات دینا جائز نہیں۔ کیونکہ واقف نے جب تصرف کی اجازت نہ دی ہو متولی اس تصرف کا اختیار نہیں رکھتا۔

كما هو مصرح في الكتب - والله تعالى اعلم بالصواب -

کتبہ: اہل معتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۴۶۴)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) بخد مت جناب قبلہ علمائے دین اسلام علیکم گذرش یہ ہے کہ ہمارے گاؤں کے سب مسلمانوں نے یہ رائے پاس کیا کہ جو مسلمان نماز جمعہ نہ ادا کرے جنازے میں نہ شامل ہو وہ پانچ آنہ جرمانہ دیں۔ وہ جرمانہ مسجد کی مرمت میں لگے سب نے اقرار کیا۔ اور ایک آدمی نے کہا میں نہیں دوں گا۔ جرمانہ دیکر نماز نہیں پڑھوں گا۔ بلکہ الگ رہوں گا ایسے آدمی کے ساتھ کیا کیا جائے۔

(۲) اس آدمی کے باپ نے زندگی میں کچھ روپیہ مسجد کے تعمیر میں چندہ دیا تھا زمانہ زیادہ گذر چکا اس نے سوال کیا ہمارا چندہ واپس کر دو سب کی رائے ہوئی کہ واپس کر دو وہ واپس کر دیا گیا۔ دینے کے بعد کہا کہ اس وقت چاندی کے روپیہ چلتے تھے ہم چاندی روپیہ کے بھاؤ لیں گے لوگوں نے کہا کیا لوگے کہا ایک کا ڈیڑھ۔ دیا گیا بتائیں آپ اسلامی قانون کیا ہے۔

(۳) پہلے سوال کے جرمانہ کی رقم مسجد میں لگ سکتی ہے یا نہیں۔ کسی عالم کو روپیہ دیکر یا غلہ دے کر نماز اس کے پیچھے پڑھنا روا ہے یا نہیں۔

خطبہ میں جو درود میں نظم درج ہیں پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟۔ برائے مہربانی جواب عنایت کریں۔ اور میں جاہل ہوں غلطی اور بے ادبی کی معافی چاہتا ہوں۔ اور سوالات بھی زیادہ اس کی بھی معافی چاہتا ہوں۔
المستفتی، عبد الجبار خاں معرفت رسالہ سنی لکھنؤ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) بے نمازی کی تنبیہ کے لیے ایسی سزا کے دینے میں کوئی حرج نہیں جو شرع کے خلاف نہ ہو، لیکن جنازہ میں شامل ہونا تو میت کا حق ہے جس کو کسی رشتہ دار کی سزا کی بنا پر ترک نہیں کرنا چاہیے۔ اور سزا میں مالی جرم مان کرنا تو شرعاً جائز ہی نہیں۔

چنانچہ ردالمحتار میں ہے: الحاصل ان المذهب عدم التعزیر باخذ المال

اور جب مالی جرم ماننا جائز ثابت ہوا تو شرعیہ مال خبیث قرار پایا۔ اور مال خبیث کو مسجد میں نہیں لگا سکتے۔ لہذا ایسی خلاف شرع رائے طے کرنا اور لوگوں کا اسکو اقرار کر لینا یہ سب غلط فیصلہ ہوا۔ اور جس شخص نے جرم مانہ دینے سے انکار کیا اگر وہ جرم مانہ ہی کا منکر ہے جب تو اس کا انکار کرنا صحیح ہے۔ اور اگر وہ نماز سے بھی انکار کرتا ہے تو وہ قابل سزا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۲) شخص مذکور کے باپ نے جو چندہ تعمیر میں دیا تھا اور وہ تعمیر ہی میں صرف بھی ہو چکا تو انکے بیٹے کو اب اس رقم کے طلب کرنے کا شرعاً کوئی حق حاصل نہیں۔ نہ لوگوں کو اسے اس رقم واپس کرنا چاہیے تھا۔ اور مزید اس کا ایک روپیہ کے مقابلے میں ڈیڑھ روپیہ کا مطالبہ ایسا غلط ہے جس کی اسلام اجازت ہی نہیں دیتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۳) سوال اول کے جواب میں مذکور ہوا کہ جرم مانہ کا مال خبیث مال ہے اور اس کا مسجد میں لگانا جائز نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۴) فقہائے متاخرین نے امامت کی تنخواہ کو جائز قرار دیا ہے تو تنخواہ دار امام کے پیچھے نماز کا شبہ جائز ہے۔ ہدایہ و درمختار وغیرہ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۵) خطبہ کا اردو کی نظم یا نثر میں پڑھنا خلاف سنت متواتر ہے اور مکروہ تنزیہی ہے۔ اس کا مفصل و مدلل جواب فتاویٰ اجملیہ میں ہے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجل غفرلہ الاول

(۴۶۵)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ گذارش یہ ہے کہ قصبہ کو چندہ میں آج زمانہ ۳۵ سال کا ہوتا ہے کہ اس وقت یہاں مسلمانوں کی حالت اچھی تھی اور سب گیا، پٹنہ، بنارس وغیرہ کے رہنے والے تھے، اور راجہ مامڑہ ان لوگوں کو بہت عزت اور قدر کرتا تھا۔ یہ لوگ عہدہ دار بھی تھے۔ یہاں ایک مسجد بنوائی اور اس وقت مسلمانوں کا خرچ ہوا اور راجہ مامڑہ نے بھی کافی روپیہ اور انجام دیکر مسجد بنوائی۔ بعد جب مسجد بن گئی تو چند جگہ سے چند عالموں اور علاموں کو بلوا کر میلاد ہوئی۔ بعد اس کے جتنا روپیہ راجہ مامڑہ کا خرچ ہوا تھا سب کے سامنے وقف کر دیا۔ وقف کرنے کے بعد بھی راجہ مامڑہ چند دفعہ اور بھی مسجد کی مرمت تعمیر بھی کیا۔ لہذا اس وقت اب وہ مسلمان بھی نہیں۔ اگر ہیں بھی تو ان کے خاندان والے۔ تو ان کی حالت اچھی نہیں۔ وہ عہدہ اور ہستی نہیں علاوہ ازیں اب راجہ مامڑہ کا وہ خود سر زمانہ نہیں۔ اسٹیٹ اس وقت ان کے ہاتھ سے نکل گیا۔ مسجد کی حالت اس وقت بالکل خراب ہے۔ تمام سے شق ہو گئی ہے ممکن ہے اگر اس سال مرمت تعمیر یہ لوگوں نے نہیں کیا تو شہید ہو جانے میں کوئی اندیشہ نہیں۔ خدا نخواستہ اگر ایسی حالت ہوئی تو آئندہ از سر نو بنانا غیر ممکن ہے۔ یہاں کے غیر مسلم مارواڑی اڑیہ جو ان کی آبادی بہت ہے یہ لوگوں کا سوال یہ ہوتا ہے اگر آپ لوگوں سے نہیں ہوتا ہے ہم لوگوں کو دیدتے ورنہ چندہ ہم لوگوں سے کافی روپیہ لیکر مسجد کی مرمت کرائیے ہم لوگ خوشی سے دینگے، دینے کو تیار ہیں، ہم چند ایسے غیر مسلموں سے سنا ہے راپور شفق صاحب کے یہاں لکھا ہوا حوالہ فتوے کا آپ کے یہاں کا جواب دیا۔ امید کہ آپ جواب سے بندہ کو آگاہ فرمائیں گے۔ فقط

راقم الحروف عبدالرزاق عراقی مقام وڈاکا نہ کوشی اسٹیٹ بامرہ ضلع سجھیر اڑیہ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

غیر مسلموں سے مرمت مسجد میں بھی چندہ نہیں لینا چاہئے۔ ہاں ایک یہ صورت ہو سکتی ہے کہ وہ لوگ کسی مسلمان کو اس چندہ کی رقم کا مالک بنادیں اور پھر وہ مسلمان اس رقم کو تعمیر مسجد میں خرچ کر دے اس میں کسی قسم کا حرج و خطرہ نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم ۱۱ جمادی الاخریٰ ۱۳۶۶ھ

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجل غفرلہ الاول

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

کہ میں ایک مسجد کا متولی ہوں اور مسجد کا کچھ روپیہ میرے نام سے بینک میں جمع ہے جس کا سود نہیں لیا جاتا ہے۔ مقامی حکومت مجھے مجبور کر رہی کہ یا تو مسجد کا یہ روپیہ خرچ کر دیا جائے ورنہ اس روپیہ سے سرکاری قرضہ کی دستاویزات خرید لی جائیں۔ سر دست مسجد کا کوئی ایسا کام بھی نہیں ہے جس میں روپیہ خرچ کر دیا جائے نہ ہی حکومت مسجد کے لئے کوئی زمین یا مکان وغیرہ خریدنے کی اجازت دیتی ہے۔ جس سے مسجد کی آمدنی میں اضافہ ہو سکے لہذا اس بارے میں مجھے مفصل جواب سے سرفراز فرمائیں کہ

(۱) از روئے شرع شریف مسجد کا روپیہ دیگر امور خیر میں خرچ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

(۲) اگر خرچ کیا جاسکتا ہے تو اس کا صحیح مصرف کیا ہو سکتا ہے۔

(۳) بینک میں مسجد کا جو روپیہ جمع ہے اس کا سالانہ سود لینا جائز ہے یا نہیں اگر سود لیا جائے تو اس

روپے کو کن امور میں خرچ کیا جائے۔

نوٹ مسجد کا محل وقوع ایسا ہے کہ جہاں مسلم آبادی بہت کم بلکہ الشاذ کا معدوم کے مصداق ہے جسکی وجہ سے اس مسجد میں کوئی دینی درس گاہ بھی قائم نہیں کی جاسکتی۔

خاکپائے علماء حاجی غلام مصطفیٰ مسلم سوسائٹی احمد آباد

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

صورت مسئلہ میں فی الواقع اس وقت جب وہ مسجد روپے سے بے نیاز ہے سر دست اس میں کوئی ایسا کام نہیں جس میں یہ روپیہ خرچ کر دیا جائے نیز اس کا ماحول بھی ایسا نہیں ہے جس کی بنا پر کوئی دینی درس گاہ بھی جاری کی جاسکے اور حکومت اس روپیہ سے مسجد کے لئے کوئی زمین یا مکان وغیرہ خریدنے کی بھی اجازت نہیں دیتی اور بصورت خرچ نہ ہونے کے اس روپیہ کو حکومت لینا چاہتی ہے تو اس مال بموقوفہ کے تحفظ کے لیے صرف ایک صورت ہے اس رقم کو کسی حاجتمند مسجد یا مدرسہ کو بطور قرض دیدیا جائے اور حکومت کو اس روپیہ کا خرچ باور کرا دیا جائے پھر جب اس مسجد کو کوئی حاجت ہو یا حکومت کی دینے سے بچنے کی کوئی صورت پیدا ہو تو اس قرض کو وصول کر لیا جائے اور مصالح مسجد میں صرف کیا جائے لہذا اس صورت میں وہ روپیہ اس دوسری مسجد یا مدرسہ میں درحقیقت اس کا مصرف صحیح سمجھ کر خرچ نہیں کیا

گیا ہے بلکہ اسکے ضائع ہو جانے سے تحفظ مقصود ہے جسکی ایک نظیر فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

مال موقوف علی المسجد الجامع واجتمعت من غلاتها ثمن نابت الا سلام نائبة مثل حادثة الروم واحتيج الى النفقة في تلك الحادثة اما المال الموقوف علی المسجد الجامع ان تكن للمسجد حاجة للحال فللقاضی ان يصرف فی ذلك لكن علی القرض اقول فی هذه الصورة المتولی قائم مقام القاضی فی تصرف المال الموقوف بل صرح فی الاشباه فی قاعدة الولاية الخاصة اقوی من الولاية العامة بعد ان ذکر فروعا و علی هذا لا يملك القاضی التصرف فی الوقت مع وجود ناظر ای متول الخ فان لم يثبت للمتولی هذه التصرف و لم ينقل مال هذه المسجد بطريق القرض الى مسجد اخر او مدرسة المحتاجين الى النقل اليهما فياخذ الحكومة وضاع وقف هذه المسجد و ايضا خرب المسجد الاخر او المدرسة فغرض الواقف بما قلنا و يعود الوقف الى محله۔

اور سود تو حرام و ناجائز ہی ہے پھر مسجد کے روپیہ پر سود لینا کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔ البتہ اس وقت اس منافع کی رقم کو بینک ہی میں نہ چھوڑ دینا چاہیے۔ بلکہ اس کو وہاں سے وصول کر کے فقراء کو بغیر نیت ثواب دیدیا جائے کہ ایسے مال حرام کا مصرف صرف فقراء ہی ہیں۔ ”اور ایسا مال خبیث مسجد میں تو کس طرح صرف نہیں کیا جاسکتا“ ”فیکره تلویث بیت الله بالمال الخبیث“ واللہ اعلم بالصواب۔

۱۲ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) مسجد کی آمدنی سے جو دوکانیں وغیرہ وقف مسجد کی ہیں اس سے فاتحہ وغیرہ دلا کر شیرینی لوگوں کو تقسیم کرنا کیسا ہے؟۔

(۲) جو شخص مسجد کو ملکیت ثابت کرے اس میں نماز ہو جائیگی یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

(۱) جس دوکان کی آمدنی مسجد کے لئے وقف ہے تو اس آمدنی سے فاتحہ وغیرہ کے لئے شیری نہیں خریدی جاسکتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) اگر فی الواقع جو مسجد کسی کی خاص ملک ہو اور اس میں دوسروں کو نماز پڑھنے کی اجازت نہ ہو پھر بھی اگر کسی نے اس میں نماز پڑھ لی تو ہو جائیگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۶۸ھ

مسئلہ

(۳۶۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ مسجد کا فرش عید گاہ لیجانا جائز ہے یا نہیں؟۔ بینواتو جروا مع حوالہ کتب تسلی بخش مرحمت فرمائیں
المستفتی، زید الدین فرید پور ضلع بریلی

الجواب

جو فرش مسجد کی ضرورت سے زائد ہو اس کو بوقت ضرورت عید گاہ لے جاسکتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۶۹ھ

مسئلہ

(۳۶۹)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ مسجد کی آمد کے لئے مسجد کے صحن میں جو قبرستان تھا وہ تمام قبروں کا صفایا کروا کر دکائیں بنالیں۔ اور زید سود کے چٹیاں چلاتا ہے جو ہر ہفتہ میں ایک وقت سوال پکارتا ہے جو ہزار اور پانچو نہیں سوال میں جو آدمی سود بڑا کر لیتا ہے اس کے نام سے وہ چٹی چھوڑتا ہے پھر وہ سود کے روپے کو بھی سوال چھوڑتا ہے۔ غرض یہ روپے سے مسجد کے لئے دوکانیں طیار ہوتی ہیں زید اس طرح روپیہ جمع کر کے مسجد کے لئے کام میں لانا جائز ہے یا ناجائز؟۔ عند اللہ ماجور وعند الناس مشکور فرمائیں۔

غوث ۳/۹ پیر مرچنٹ دکنی پیٹ مدن پھلی (ضلع چتراندھرا)

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجد میں کسی مال خبیث سود وغیرہ کا کوئی پیسہ ہرگز صرف نہیں کیا جاسکتا۔ نہ مسجد کے لئے ایسے خبیث مال سے دوکانیں تیار کرنے کی اجازت ہے۔ اور شرعاً قبرستان کی ایسی بے حرمتی کرنا اور اس کی قبروں کو صاف کرنا بھی ممنوع ہے۔ بالجملہ دین پاک مسجد کے لئے ایسی ناپاک آمدنی کی اجازت نہیں دیتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۳ شوال المکرم ۱۳۶۸ھ

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۰ھ

(۳۷۰)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

اس بستی میں دو مسجد ہے۔ ایک مسجد بالکل شہید ہموار زمین اور ایک مسجد جو ٹوٹی پھوٹی مرمت کے لائق تھی جس میں پنجوقتہ جماعت ہوتی تھی۔ بستی کے لوگوں نے چندہ کیا اور مشورہ ہوا کہ ٹوٹی پھوٹی مسجد کو اچھے حالت میں بنایا جائے اور اسی مسجد کا چندہ صحیح ہے۔ مگر ایک وہابی عالم نے فتویٰ دیا کہ جو مسجد بالکل شہید ہے ہموار زمین ہے اس کو بنایا جائے۔ چند لوگوں نے بالکل شہید مسجد کو بنایا۔ بعد میں ٹوٹی پھوٹی مسجد جس میں جماعت ہوتی ہے بالکل شہید ہو گیا۔ اب لوگ جماعت کی نماز نئی مسجد میں پڑھتے ہیں۔ ایک عالم صاحب نے فرمایا کہ اس مسجد کا روپیہ اس مسجد میں لگانا یہ مسجد کا قرض ہے۔ اس لیے اس مسجد میں نماز نہیں پڑھنا چاہیے ورنہ نماز باطل ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں ہم لوگ کیا کریں؟۔

ایم، اے جلیل معرفت رسالہ سنی لکھنؤ

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علی رسولہ الکریم

یہ تو صحیح ہے کہ ایسی مسجد کا چندہ جو خود مرمت کی محتاج تھی دوسری ایسی مسجد میں جو بالکل منہدم ہو چکی ہے ہرگز نہیں لگانا چاہئے تھا۔ لیکن جب ایسی غلطی ہو چکی اور اس چندہ سے وہ منہدم شدہ مسجد تعمیر ہو چکی تو اس میں نماز اور جماعت کا پڑھنا بلا شک جائز درست ہے۔ اس میں نماز کو باطل قرار دینا خود باطل علم ہے۔ البتہ پھر چندہ کر کے اس مسجد کا قرض ادا کر دیا جائے اور وہ مسجد بھی تعمیر کر دی جائے۔ واللہ تعالیٰ

اعلم بالصواب۔ ۴ شوال المکرم ۱۳۷۶ھ
کتبہ: المعظم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
 العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدۃ سنہل

مسئلہ

(۴۷۱)

مکرمی جناب قبلہ مولوی مفتی محمد اجمال شاہ صاحب سنہل شریف السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
 کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) گذارش یہ ہے کہ یہاں منڈی ٹکپور ضلع نینی تال میں ہم دو فریق ہیں اول ہم بفضل خدا فی
 اہل سنت اور دوم دیوبندی خیال یہاں مسجد ایک ہے اور اس ہی میں دونوں فرقہ کا ایک ہی امام ہے اہل
 سنت کے پیچھے نماز پڑھتے چلے آ رہے تھے اور پیش امام وغیرہ کا انتظام بھی فریق اول ہی کیا کرتے تھے مگر
 کچھ ماہ سے ہم لوگوں کی سچائی اور سیدھائی سے فریق دوم اپنا ہم خیال پیش امام مقرر کرنے میں کامیاب
 ہو گئے۔ بعد میں جب یہ معلوم ہو گیا۔ جیسا کہ ہمارے علماء کرام کا حکم ہے ہم فریق اول نے ان کے پیچھے
 نماز پڑھنا چھوڑ دیا اور زیادہ جھگڑا بڑھنے کی وجہ سے چند ماہ مسجد بھی چھوٹی رہی مگر کہاں تک صبر کیا جاتا پھر
 ہم فریق اول نے متفق ہو کر اپنا امام بلا کر یہ ارادہ کیا کہ ہم اپنی نماز الگ پڑھنے لگے۔ اس پر فریق اول
 دیوبندی صاحبان نے بڑا شر پیدا کیا اور نماز الگ پڑھنے کی ہماری جائز بات کا جھگڑا قرار دے کر نماز
 روکنے کی کوشش کی مگر درمیان میں یہاں بفضل خدا مسجد اور حجرات وغیرہ من جملہ آٹھ دوکان کے چار
 دوکان ہم فریق اول ایک کو دینا قرار پایا اور جس پر بفضل خدا وہ قابض ہیں علاوہ زمین جو پشت مسجد پر
 واقع ہے۔ وہ چار دوکانات کے فریق دوم دیوبندی صاحبان کو دی گئی جس کا اقرار نامہ باہمی مرتب ہو گیا
 اب اس ہی آراضی میں فریق دوم نے ایک مسجد جو کہ ضد کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے بنالی اور اس ضد سے
 مسلمانوں کو ضرر پہنچا جیسا کہ سورہ توبہ میں مسجد ضرار کا واقعہ گذرا لہذا اب وہ اپنی نماز الگ پڑھتے ہیں اور
 اس نو تعمیر مسجد میں نماز جو قرأت پڑھی جاتی ہے اس کا آواز قدیم مسجد میں بالکل صاف آتا ہے اور
 فاصلہ بھی اندازہ دس پندرہ گز کا ہے کیا ایسی حالت میں اس مسجد میں نماز جائز ہے۔

(۲) اب بموقع عید الفطر دیوبندی صاحبان میں ہم میں سے بعض حضرات اہل سنت کو بہ اصرار
 اپنے مکان پر لیجا کر سوئیاں وغیرہ کھلائیں اور پھر ان ہی حضرات فریق اول نے بھی دیوبندی صاحبان کو
 بلا بلا کر خاطر مدارات سے کھلایا پلایا جب کہ پیچھے مسجد اور مسجد خدا کے واسطے سے دیوبندی صاحبان سے

سلام دعا میل ملاپ بھی ترک کیا ہوا ہے۔ لہذا ان دونوں مسئلوں میں روتنی ڈال کر خدا اور رسول کے حکم
 سے ہم کو آگاہ فرمایا جائے تاکہ راہ راست نصیب ہو اور آئندہ غلط راہ سے بچیں اس مسئلہ میں اگر ہم پر کوئی
 کفارہ وغیرہ بھی واجب ہوتا ہو تو وہ بھی صاف صاف حکم خدا اور رسول سے جلد از جلد آگاہ فرما کر ثواب
 دارین حاصل فرمائیں۔

المستفتی، عبدالرؤف بقلم خود، جمیل بقلم خود، شفاعت خاں
 ۴ شوال المعظم ۱۳۷۶ھ ٹکپور منڈی ضلع نینی تال

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) نماز تو ان میں سے ہر ایک مسجد میں جائز ہے رہا قرأت دوسری کے لئے مانع قرار نہیں پاتی
 ۔ ہاں یہ بات پہلے ہی ضرور قابل لحاظ تھی کہ جدید مسجد کو مسجد قدیم کے اس قدر قریب تعمیر نہیں کرنا چاہئے تھا
 اب جب کہ وہ تعمیر ہو چکی ہے تو ان میں سے کسی کو غیر آباد اور ویران نہیں کیا جاسکتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم
 بالصواب

(۲) دیوبندیوں، غیر مقلدوں، قادیانیوں، رافضیوں وغیرہ گمراہوں سے میل جول، سلام کلام،
 ان کے ساتھ نشست وبرخاست ان کے ساتھ کھانے پینے۔ نماز پڑھنے نکاح کرنے کی ممانعت احادیث
 میں وارد ہے:-

ونسی صحیح مسلم ایاکم وایاہم لا یصلونکم ولا یفتنونکم (وفی ابی داود) وان
 مرضو فلا تعودوہم وان ماتو فلا تشہدوہم (وزاد ابن ماجہ) وان لقیموہم فلا تسلما
 علیہم (وعند العقیلی) لا تجالسوہم ولا تشاربوہم ولا تواکلوہم ولا تناکحوہم (زاد
 ابن حبان) لا تصلوا علیہم ولا تصلوا معہم۔

ان احادیث کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ گمراہوں سے الگ رہو۔ انہیں اپنے سے دور رکھو کہ وہ
 کہیں تمہیں بہکانہ دیں اور تمہیں فتنہ میں ڈال نہ دیں۔ وہ اگر بیمار پڑیں تو پوچھنے نہ جاؤ۔ اور اگر مر جائیں
 تو جنازہ پر حاضر نہ ہو۔ جب تم ان سے ملو تو سلام نہ کرو۔ ان کے پاس نہ بیٹھو۔ ان کے ساتھ پانی نہ
 پیو۔ ان کے ساتھ کھانا نہ کھاؤ۔ ان کے ساتھ نکاح نہ کرو۔ ان کے جنازے کی نماز نہ پڑھو۔ ان کے
 ساتھ نماز نہ پڑھو۔

لہذا ان گمراہوں کے ساتھ تعلقات کے بارے میں حضور نبی کریم ﷺ کے یہ احکام ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ ہم سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۹ شوال المکرم ۱۳۶۳ھ

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ

مسئلہ

(۳۷۲)

بخدمت جناب مولوی مفتی والی الحاج اجمل خان صاحب مدظلہ العالی

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں مدلل جواب عنایت فرمائیں

(۱) ہماری مسجد کا صحن کافی وسیع ہے نمازیوں کی تعداد کافی کم ہے صحن کا فرش شروع ہی سے سمٹ کا بنا ہوا ہے موسم گرما میں بہت گرم رہتا ہے دری وغیرہ کا کافی انتظام ہے اور پانی بھی چھڑکا جاسکتا ہے جس سے قدرے سکون نصیب ہو جاتا ہے چند احباب کا یہ کہنا ہے کہ مسجد کی چھت پر نماز پڑھی جایا کرے اگر ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ مسجد کی چھت پر نماز مکروہ ہے تو وہ چند مقامی مسجدوں کی جن کی چھت پر نماز پڑھی جاتی ہے مثالیں پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چھت کے سامنے کی دیوار قد آدم بنالی جائے اور محراب بنادی جائے نماز مکروہ نہیں ہوگی۔ فرمائیے کہ کیا حکم ہے اس بات میں۔

(۲) ایک مسلم کا ایک غیر مسلم عورت سے برسوں سے ناجائز تعلق ہے اس نے نکاح نہیں پڑھا ہے اور اس کے لطن سے بچے پیدا ہوتے ہیں اچانک کسی حادثہ کے باعث ناگہانی دونوں کی موت ہو جاتی ہیں فرمائیے ان کی تجہیز وتکفین کس طرح سے ہو کیا اصول اسلامی کے مطابق ہو ان کی جنازے کی نماز پڑھائی جاوے یا نہیں اگر کسی عالم کے فرمانے کے بموجب اس کی نماز جنازہ پڑھائی جاوے تو کیا نماز پڑھانے والے پر کفارہ واجب ہو جاتا ہے۔

(۳) کیا نابالغ کے پیچھے تراویح پڑھنا جائز ہے برائے کرم مذکورہ مسائل پر مکمل روشنی ڈالیں اور جواب عنایت فرمائیں۔

(۴) کیا فرماتے ہیں علماء دین ان مسائل میں کہ اگر کسی شخص نے دو سگی بہنوں سے نکاح کر رکھا ہے جو قطعاً حرام ہے اگر ان دونوں کے بطن سے اولاد ہو اور بالفرض سن بلوغیت کے پہنچنے سے پہلے

ان کا انتقال ہو جائے تو ان کی تجہیز وتکفین کیسے کی جاوے۔ یہ بھی فرمائیں کہ ایسے بچے جن کا ذکر ابھی کیا ہے سن بلوغیت پر پہنچ جائیں تو ان کی شادی کے کیا حکم ہے؟ اور مرنے پر تجہیز وتکفین کیا اسلامی اصول کے مطابق کی جاسکتی ہے؟ اور کیا ان کے جنازے کی نماز پڑھ سکتے ہیں؟۔ جواب عنایت فرمائیں سن بلوغ ہونا بالغ دونوں حالتوں میں اگر جدا احکام ہوں تو مرحمت فرمائیں۔ ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۶۱ھ

احقر العباد عبد الحمید پیش امام مسجد واقع محلہ دھوبی تلائی۔ بیکانیر راجستھان

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) بلا ضرورت کے مسجد کی چھت پر نماز پڑھنا مکروہ ہے کہ اس میں ترک تعظیم ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے ”وتکرہ الصلوٰۃ علی سطح الکعبۃ لما فیہ من ترک التعظیم“

رد المحتار میں ہے ”ولزمہ کراہۃ الصلوٰۃ ایضاً فوقہ (ای المسجد)“

بلکہ بلا حاجت مسجد کی چھت پر چڑھنا بھی مکروہ ہے۔

رد المحتار میں ہے ”نقل عن المفید کراہۃ الصعود علی سطح المسجد“

”تو ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ بلا ضرورت مسجد کی چھت پر نماز کا پڑھنا مکروہ ہے بلکہ صرف چڑھنا بھی مکروہ ہے کہ اس میں ترک تعظیم مسجد ہوتی ہے۔ اور صورت مسئلہ میں مسجد کی چھت پر بلا ضرورت ہی نماز پڑھنا اور چڑھنا ہے تو یہ مکروہ ہوا۔ اور اس میں ترک تعظیم مسجد کا گناہ بھی ہوگا۔ اور اوپر دیوار بنالینے اور اس میں محراب قائم کر دینے سے اس کی کراہت نہیں اٹھ سکتی۔ اور ترک تعظیم مسجد جائز نہیں ہو سکتی پھر اگر دوسری مساجد میں خلاف شرع کوئی فعل جاری ہو جائے تو وہ دلیل جواز نہیں بن سکتا بلکہ ان اہل مساجد کو بھی بلا ضرورت ایسا فعل مکروہ نہیں کرنا چاہئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) صورت مسئلہ میں جب وہ کہ زنا سے ہے تو اس بچہ کا نسب شرعاً اس حکم سے تو ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس کا باپ ہے قرار نہیں پاتا۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے ”ان قال انه فی من الزنا فلا یثبت نسبہ ولا یرث منه“

تو وہ بچہ احکام تجہیز وتکفین اور نماز جنازہ میں اس حکم زانی کا تابع تو نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا یہ بچہ اپنی ماں کے تابع ہوگا اور ماں غیر مسلمہ ہے تو اس بچہ کی نہ تو شرعی طور پر تجہیز وتکفین کی جائے گی نہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے۔ پھر اگر کسی عالم نے اسی صورت مسئلہ میں اس بچہ کی نماز جنازہ کا غلط حکم دیدیا اور اس

غلط حکم کی بنا پر کسی امام نے اس کی نماز جنازہ پڑھادی تو اس امام پر شرعاً کوئی کفارہ تو لازم نہیں آتا لیکن پھر بھی اس کو توبہ واستغفار کر لینی چاہئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) نابالغ کے پیچھے تراویح پڑھنا صحیح نہیں کبیری میں ہے:

ولا يصح اقتداء البالغ بغير البالغ في الفرض وغيره وهو الصحيح۔

(کبیری صفحہ ۲۸۱)

در مختار میں ہے: ولا يصح اقتداء رجل بامرأة وخثنى وصبي مطلقا ولو في جنازة ونفل على الاصح۔

(از رد المحتار صفحہ ۲۰۵)

رد المحتار میں ہے: انه لا يجوز في الصلوات كلها۔

طحطاوی میں ہے: قال بعض مشائخ بلخ يصح اقتداء البالغ بالصبي في التراويح والسنن المطلقة والنفل والمختار عدم الصحة بلا خلاف بين اصحابنا۔

(طحطاوی صفحہ ۱۶۷)

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

وعلى قول ائمة بلخ يصح الاقتداء بالصبيان في التراويح والسنن المطلقة كذا في فتاوى قاضى خاں والمختار انه لا يجوز في الصلوات كلها كذا في الهداية وهو الاصح هكذا في المحيط وهو قول العامة وهو ظاهر الرواية هكذا في البحر الرائق

(عالمگیری قیومی جلد ۱ صفحہ ۲۲)

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ بالغوں کو نابالغ کے پیچھے تراویح پڑھنا صحیح نہیں یہی عام فقہاء کا قول صحیح اور مختار اور اصح ہے اور یہی ظاہر الروایت ہے اور یہی اکثر مشائخ کا مسلک و مذہب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۴) بلاشبہ دو سگی بہنوں کا ایک وقت میں جمع کرنا حرام ہے قرآن کریم میں ہے:

(سورہ النساء)

وان تجمعوا بين الاختين۔

پھر جب ان سے اولاد ہو جائے تو وہ اگر سن بلوغ کو پہنچ جائے تو ان کے خود مسلمان ہونے کی بنا پر نکاح شادی بھی کی جائے گی۔ اور اگر شرعی طور تجہیز و تکفین بھی ہوگی اور نماز جنازہ بھی پڑھی جائیگی۔ اور اگر وہ اولاد سن بلوغ کو نہیں پہنچی ہے تو بھی وہ اپنی اپنی مسلمان ماں کی تبعیت میں شرعی طور پر تجہیز

وتفین کے مستحق اور ان کی نماز جنازہ بھی پڑھی جائیگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۱۹ محرم الحرام ۱۳۷۷ھ

کتبہ: مقتضی بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۲۷۳)

کیا فرماتے ہیں علماء کرم مفتیان عظام مسائل مندرجہ ذیل کے جواب میں

(۱) کہ شہر ناگور میں ایک مسجد محلہ نکاس میں مسجد جمالوں کے نام سے مشہور ہے کئی برسوں پہلے مسجد مذکور بہت نیچے چلی جانے کی وجہ سے بھرتی بھروا کر اور دوسری منزل کی شکل میں لے لی گئی تھی اور پہلی منزل میں بھرتی بھروادی گئی تھی اس پہلی منزل مسجد میں جس جگہ جماعت کی پہلی صف نماز پڑھا کرتی تھی ایک شخص نے دیوار میں دروازہ بنا کر ایک دوکان سی بنالی تھی اور اب وہاں ایک شخص دیگر چائے کا ہوٹل کرتا ہے۔

اسی پہلی منزل کی مسجد میں جہاں پہلی صف جماعت کی نماز پڑھتی تھی دوکان کا ہونا جائز ہے یا نہیں برائے کرم پوری طور پر جواب مرحمت فرمائیں۔

(۲) ایسے شخص کے لئے کیا حکم ہے جو کہ خلاف مرضی مسلمانان اہل محلہ زبردستی اس مسجد مذکور کے پہلی منزل میں جہاں پہلے صف نماز پڑھتی تھی دوکان داری کرتا ہو اور خالی نہیں کرتا ہو۔

(۳) ایک شخص جو مسئلہ سے واقف ہوتے ہوئے اس دوکاندار مذکور بالا کو غلط راستہ بتا کر مذکور مسجد خالی نہیں کرنے دیتا ہو ایسے شخص کے لئے شرعاً کیا حکم ہے۔ برائے کرم تینوں مسائل کے جواب مفصل طور پر مرحمت فرمائیں۔

المستفتی، مسجد محلہ نکاس ناگور محمد صدیق۔ صدر انجمن محمد حسین معتمد انجمن تبلیغ الی علی محمد یوسف

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جس محدود ذیل میں کا مسجد ہونا متعین ہو چکا تو وہ تحت الثریٰ سے آسمان تک مسجد قرار پا چکی۔ شرعاً اس کے کسی جز پر دوکان بنالینا ناجائز و حرام ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: اذا اراد الانسان ان يتخذ تحت المسجد حوانيت غلة لحرمة المسجد او فوکه وليس له ذلك كذا في الذخيرة۔

(عالمگیری قیومی جلد ۲ صفحہ ۳۴۷)

در مختار میں ہے: لو تمت المسجد یتیم ثم اراد البناء منع۔

(ردالمحتار جلد ۳ صفحہ ۳۸۲)

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ مسجد کے کسی جز پر نیچے اور اوپر اس کی مسجدیت کے تمام ہو جانے کے بعد ضرورت مسجد کے لئے بھی دوکانیں یا کوئی تعمیر کا بنانا ممنوع و ناجائز ہے شرعاً متولی کو یا اہل محلہ کو یا کسی مسلمان کو اس کے کسی حصہ کی مسجدیت کے باطل کر دینے اور اس میں تصرف کر کے دوکان بنانے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ لہذا شخص مذکور اگر اپنے اس خلاف شرع تصرف اور زبردستی دوکانداری سے باز نہ آوے۔ اور اس حصہ مسجد کو اپنے تصرف سے خالی نہ کرے۔ تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ قانونی۔ اخلاقی ہر طرح کے دباؤ و ڈال کر اس کے ناجائز تصرف سے اس حصہ مسجد کو خالی کرائیں۔ اور اس کے جدید دیوار کو منہدم کر کے اور دروازہ کو بند کر کے جیسی پہلی مسجد کی شکل تھی اسی طرح قابل جماعت و نماز بنا دیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

۳ صفر المظفر ۱۳۷۷ھ

کتبہ: ا. معتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۷ھ

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں

کہ ایک مسجد کی کچھ رقم چندہ کی بسلسلہ تعمیر مسجد جمع ہے لوگوں کا ارادہ ہے کہ اس رقم سے سینگ کا کھاد۔ یا انگریزی کھاد۔ یا آلو کی بیج خرید کر اہل ضرورت حضرات مسلم یا غیر مسلم کو کچھ نفع سے ادھار دیدیا جائے۔ جب آلو کی فصل آئے تب وہ روپیہ ان لوگوں سے وصول کر لیا جائے۔ اس صورت سے مسجد کا روپیہ بڑھ جائیگا اور تعمیر مسجد میں سہولت ہوگی۔ چونکہ اہل محلہ غریب لوگ ہیں۔ اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ روپیہ مذکور کو جو مسجد کی ملکیت ہو چکا ہے اس طرح سے تجارت میں لگانا اور پھر اس پر جو منافع حاصل ہوں مسجد میں لگانا شرعاً درست ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علی رسولہ الکریم

صورت مسئلہ میں اگر چندہ دہندگان یہی لوگ ہیں جو اس محدود رقم کو تجارت میں لگا کر

بڑھانے کا ارادہ رکھتے ہیں اور یہ چندہ تعمیر مسجد ہی کی غرض سے جمع کیا گیا ہے۔ اور اہل محلہ اپنی غربت کی بنا پر اس عمارت مسجد کی تکمیل نہیں کر سکتے ہوں۔ اور تجارت سے رقم کثیر ہو کر مسجد کی تعمیر مکمل ہو جانے کی امید ہو۔ تو ظاہر ہے کہ یہ مقصد محض منفعت مسجد اور تکمیل عمارت مسجد ہی کے لئے ہے تو بنا بر قاعدہ فقہ کے "الامور بمقاصدھا" اس سلسلہ تجارت میں اگر منافع کا ظن غالب ہے اور فساد و تضییع رقم کا خطرہ نہ ہو اور بہتر یہ ہے کہ کوئی نیک شخص اس رقم کا ضامن بن کر اس سے اشیاء مذکورہ یا اور کوئی چیز خرید کر منافع کے ساتھ بیچ کرے۔ اور اپنے اعتماد پر ادھار بھی بیچ دے تو شرعاً ایسا کرنا درست ہے۔ اور جائز طور پر جو اسکے منافع حاصل ہوں ان کے مسجد میں صرف کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور اگر ان ارادہ کرنے والے لوگوں کا چندہ ہی نہیں ہے تو چندہ دہندگان سے اس رقم سے تجارت کرنے کے لئے اجازت کا حاصل کر لینا ضروری ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: ا. معتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۷ھ

(۴۷۵)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

کہ حالیہ میونسپل انتخابات میں ہمارے حلقہ سے جملہ امیدواران غیر مسلم تھے۔ ان میں سے ایک نے کچھ رقم اس شرط پر پیش کی کہ جملہ مسلم ووٹران میری حمایت کریں چنانچہ اس پر عمل کیا گیا۔ اب رائے یہ قرار پائی کہ اس رقم کو مسجد کی مرمت میں صرف کر دیا جائے اور متعلقہ مسجد دکان تعمیر کر دی جائے جس کے کرایہ کی آمدنی مسجد میں صرف ہوتی رہے زید کہتا ہے کہ اس قسم کی رقوم مسجد میں لگانا یا دوکان بنانا کرایہ مسجد میں لگانا جائز نہیں ہے بکر کہتا ہے کہ مسجد میں لگانا تو واقعہً جائز نہیں مگر دوکان بنانا کرایہ لگا سکتے ہیں اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کس کی رائے صائب ہے اور کون حق پر ہے۔ بینو تو جو فقط السائل: قدرت اللہ ٹیلر ماسٹر بازار بزازہ چندوسی ضلع مراد آباد یو پی ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۷ء

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علی رسولہ الکریم

بہتر یہ ہے کہ ایسی رقم سے مسجد کو محفوظ رکھا جائے اگرچہ ووٹروں نے جب اپنی طرف سے اس رقم کو دیا ہے تو یہ تعمیر دوکان متعلقہ مسجد میں شرعاً صرف کی جاسکتی ہے اور اس کا کرایہ بھی مسجد میں صرف کیا

جاسکتا ہے لیکن حرمت مسجد کی ملحوظ رکھتے ہوئے احتیاط اسی میں ہے کہ مسجد کو ایسی رقم سے بچایا جائے۔
واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۲۵ ربیع الآخر ۱۳۷۷ھ

کتبہ: المقتسم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہجل

(۳۷۶)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

ایک مسجد کی افتادہ زمین ہے اس میں مدرسہ بنانا چاہتے ہیں تو اس زمین میں مدرسہ تعمیر ہو سکتا ہے مدرسہ کے لئے وہ زمین خریدی جاسکتی ہے یا کرایہ پر لی جائے تو تعمیر کا حق ہوگا یا عمارت تیار شدہ مسجد ہی کا وقف ہوگی۔ اور یہ کر سکتے ہیں کہ زمین مسجد ہی کی رہے اور عمارت مدرسہ پر وقف رہے بہر حال شرعا جو صورت درست وجائز ہو تحریر فرمائی جائے۔

المستفتی، مبین الدین عفی عنہ دارالعلوم شاہ عالم احمد آباد گجرات

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

جب وہ مسجد کی افتادہ زمین ہے تو وہ مسجد ہی کی موقوفہ زمین ہوئی پھر جب مسجد کی موقوفہ ہے تو اس کو خرید نہیں سکتے اب باقی رہا بغیر خرید کیے ہوئے اور بلا کرایہ کے اس پر مدرسہ کے لئے تعمیر کر لینا تو اس میں کچھ حرج نہیں کہ وہ تعمیر تو مسجد ہی کی قرار دی جائیگی۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

”متولی وقف بنی فی عرصۃ الوقف فهو للوقف“ لیکن اس میں دینی درس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تو مسجد کی افتادہ زمین میں دینی درس دیا جا رہا ہے۔ دینی درس تو خود مسجد میں جائز ہے۔

درمختار میں ہے ”لا لدرس او ذکر فی المسجد۔“

ردالمحتار میں ہے ”اس پر یہ تصریح کی گئی ”لانه ما بنی لذلك وان جاز فیہ“

یہاں تک کہ مسجد کے چراغ سے درس دینے میں کوئی حرج نہیں:

قاضی خاں میں ہے ”قالو لا باس بان یدرس به الی ثلث الیل“ تو جب خود مسجد میں درس

دینا جائز ہے تو افتادہ زمین مسجد میں درس کیونکر ناجائز ہو سکتا ہے فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۲۵ ربیع الآخر ۱۳۷۷ھ

کتبہ: المقتسم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہجل

(۳۷۷)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

موضع سانچور میں ایک مسجد کے اندر بجانب مشرق کنواں ہے اور غسل خانہ بھی انکار راستہ مسجد کے اندر سے گذرتا ہے بایں صورت جنبی وغیرہ کو غسل کرنے اور پانی بھرنے کے لئے ازراہ مسجد گذرنا جائز ہے یا نہیں جب کہ دوسرا راستہ نہ ہے نہ بنوانے کی جگہ ہے اور اس شکل کا حل درکار ہے مینو تو جرو المستفتی، ظہور الدین احمد ناگوری

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

اگر جنبی کو کنویں اور غسل خانے تک جانے کے لئے صرف ایک ہی راستہ ہو جو مسجد کے اندر سے ہو اور اسکے سوا کوئی دوسرا راستہ بنوانے کی جگہ بھی نہ ہو تو ایسی مجبوری اور ضرورت کے وقت مسجد کے اندر سے تیمم کر کے صرف گذر جانا جائز و درست ہے۔

ردالمحتار میں ایسی ضرورت کی چند نظیریں موجود ہیں: ”مسافر مر بمسجد فیہ عین ماء وهو جنب ولا یجد غیرہ فانه یتیمم لدخول المسجد عندنا (وفیہ عن درر ومجمع البحار) لا نحوز العبور فی المسجد بلا تیمم (وفیہ ایضا) فالظاهر وجوبہ علی من کان بابہ الی المسجد اراد المرور فیہ“ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۷۸ھ

کتبہ: المقتسم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہجل

(۳۷۸)

مسئلہ

هل يجوز ادخال الصبيان فی المسجد واجلا سهم علی فرش المسجد مع انهم لا

یستحون، بالا احتیاط؟

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

قال رسول الله تعالى عليه وسلم: جنبوا مساجدكم صبيانكم ومجانينكم الحديث - فيحرم ادخال الصبيان والمجانين حيث غلب تنجيسهم والا فيكره ولا يذهب منه حرمة المسجد ومهابته صرح به في الدر المختار وقال ابن الهمام يكره التعليم ان لم يكن ضرورة كان نفس التعليم ومراجمه الا لطفال لا يخلو عما يكره في المسجد والله تعالى اعلم بالصواب -

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۴۷۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ درمیان زید وبکر وعمر وغیرہ کے بابت چندہ محرم و چندہ مسجد کے نزاع پیدا ہو گیا ہے جس کا تقریباً تو عرصہ ۳ ماہ کا ہوا۔ صرف اس بات پر زید یہ کہتا تھا کہ روپیہ چندہ مسجد کا تحصیل کرنا چاہیے کیونکہ چندہ محرم وصول کرنے عمر وبکر وغیرہ گئے تھے چندہ پہلے محرم کا وصول کیا جائے گا بعد کی چندہ مسجد کا کیا جائے گا۔ چونکہ عمر وبکر وغیرہ ذی اثر ہستیاں ہیں اور اکثریت بھی اسی جانب ہے۔ اس حصہ سے عمر وبکر وغیرہ نے اہل قریہ پر زور ڈالا اور مجھے کہا اس بات پر ضرور زید کا حقہ کا پانی بند کر دیں اور زید کے کئی معاملہ دنیاوی دنیاوی گاؤں کا کوئی شخص شریک حال نہ ہو مثلاً موت شادی وغیرہ یہاں تک کہ زید کے یہاں ایک بیت ہوگئی تو اس کے تجہیز وتکفین میں گاؤں کا کوئی شخص شریک نہ ہوا اور دیگر موضع سے آدمی بلوا کہ اس بیت دفن کیا۔ یہاں تک کہ زید کے ساتھ عمر وبکر وغیرہ نے یہاں تک مستحق اختیار کی جائے کہ گاؤں میں یہ حکم ہوا ہے کہ زید کا جو کوئی شریک حال ہوگا اس کا بھی یہی تدارک حشر کیا جائیگا:

اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ صورت مذکور میں جبکہ محرم اس اہمیت کو پہونچ گیا ہے کہ مسجد کے چندے کو پس پشت ڈال کر محرم کے چندے کو اس قدر جدوجہد کے ساتھ وصول کیا جا رہا ہے تو مسجد کے مقابلہ میں محرم کو ترجیح دینا شرعاً جائز ہے یا ممنوع اور محرم بنانے میں جو روپیہ صرف کیا جاتا ہے شرعاً روپیہ کا صرف کرنے والا مستحق ثواب ہے یا عذاب؟۔

(۲) عمر بکر وغیرہ کا زید کے ساتھ اس قدر شدت کا برتاؤ شرعاً کس حد تک ہوگا اور عمر بکر وغیرہ شرعاً کس تعزیر کے مستحق ہونگے:

(۳) یہ بیان فرمائیں عمر بکر وغیرہ کا فتویٰ محرم کے متعلق حاصل کر کے دکھلایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں ہم اس کو نہیں مانیں گے ان کے فتوے کو نہ ماننے پر شرعاً علمائے کرام کیا حکم فرمائیں گے؟۔
بیوا تو جروا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) اللہ عزوجل اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نزدیک مساجد محبوب ترین جگہ ہے۔ ترمذی شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:
قال رسول الله تعالى صلى الله عليه وسلم: اذا مررتم برياض الجنة فارتعوا۔۔ قيل يا رسول الله ﷺ وما رياض الجنة قال المساجد۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم جنت کے باغوں پر گزرو تو میوہ چنا کرو۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ جنت کے باغوں سے کیا مراد ہے فرمایا: مسجدیں:
مسلم شریف میں انہیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:
قال رسول الله تعالى صلى الله عليه وسلم احب البلاد الى الله مساجدھا۔
رسول اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: محبوب ترین جگہوں میں اللہ کے نزدیک مساجد ہیں۔

بیہقی وطبرانی میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

قال رسول الله ﷺ ان عمار المسجد هم اهل الله:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسجد کے تعمیر کرنے والے اہل اللہ ہیں:

ابوالفرع نے کتاب العلل میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی:

قال رسول الله تعالى صلى الله عليه وسلم: من بنى لله مسجداً بنى الله له بيتاً في الجنة۔ ومن علق فيه قنديلاً صلى عليه سبعون الف ملك حتى يطفى ذلك القنديل۔ ومن بسط فيه حصيراً صلى عليه سبعون الف ملك حتى ينقطع ذلك الحصير۔ ومن

اخرج منه قذاة كان له كفلان من الاجر -

رسول مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اللہ کے لئے مسجد بنائی اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں گھر بنائیگا جس نے مسجد میں قدیل لگائی تو اس پر ستر ہزار فرشتے اس قدیل کے گل ہونے تک رحمت بھیجتے ہیں۔ اور جس نے مسجد پر چٹائی بچھائی اس پر ستر ہزار فرشتے رحمت کی دعا کرتے ہیں اور جس نے مسجد سے خس و خاشاک نکالا تو وہ اس کے لئے اجر و ثواب کا باعث ہوں گے:

ان احادیث سے مساجد کی عظمت و عزت اور اس کی امداد کرنے والے اس میں چندہ دینے والے اور ان کی خدمت کرنے والے کا اجر و ثواب معلوم ہو گیا اور محرم یعنی تعزیه کی عزت و عظمت کا احادیث میں کہیں ذکر نہیں اور اس میں خرچ کرنے والوں کا اجر و ثواب بھی کہیں شریعت میں موجود نہیں پھر مقابلہ کیا۔ ہر ادنیٰ شخص ہر نادان آدمی بھی ذرا غور و فکر سے کام لینے کی کوشش کرے تو اسے بھی مسجد کے چندہ کو محرم کے چندے پر یقیناً ترجیح دینی پڑے گی مسجد کے عبادت گاہ ہونے کا ایسا تعلق ہے جو مسلمانوں کے قلب سے کبھی مسجد کی عزت کم نہیں ہونے دیتا لہذا ایسا کون مسلمان ہے جو مسجد کے چندہ کو باوجود ضرورت مسجد کے محرم کے چندہ پر ترجیح نہ دیگا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس اختلاف میں نفسانیت رنگ دکھا رہی ہے۔ مولیٰ تعالیٰ مسلمانوں میں محبت و الفت پیدا کرے اور انہیں نفسانیت سے بچائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) مسلمان سے ایسا ترک تعلق شرعاً منع ہے۔

بخاری شریف میں حضرت ابوالیوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

قال رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم: لا يحل لرجل ان يهجر اخاه فوق ثلاثة ايام: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کسی شخص کے لئے اپنے بھائی مسلمان سے تین دن سے زیادہ ترک تعلق نہیں:

ابوداؤد شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

ان رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم قال: لا يحل لمسلم ان يهجر اخاه فوق ثلاث فدن هجر فوق ثلاث فمات دخل النار -

بیشک رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کسی مسلمان کے لئے اپنے بھائی مسلمان سے تین روز سے زیادہ علیحدگی حلال نہیں اور جس نے تین دن سے زیادہ جدائی کی پھر مر گیا تو وہ دوزخ

میں داخل ہوگا:

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ مسلمان اپنے مسلمان بھائی سے ترک تعلق نہ کرے اور ایسا ترک تعلق جو نہ فقط زندہ کے ساتھ بلکہ مردہ کے ساتھ بھی کیا جائے اشد گناہ ہے اور اس کی انتہائی حق تلفی ہے واقعہ یہ ہے کہ یہ نہایت بدترین حرکت ان سے صادر ہوئی: واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) علمائے اہل سنت کے شرعی فتوے سے انکار کرنا گناہ عظیم ہے کہ فتوے کے انکار سے ایک حکم شریعت کا انکار لازم آتا ہے اور یہ بات مسلمان کی شان سے بہت بعید ہے مولیٰ تعالیٰ اہل اسلام میں اخوت و محبت پیدا کرے اور ان میں مذہب کا سچا جذبہ پیدا کرے اور انہیں احکام شرعی پر عمل کرنے کی توفیق دے اور ان کے درمیان کے نفاق و عداوت کو دور کرے: واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب:

کتبہ: المستصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمل العلوم فی بلدۃ سنجل

(۲۸۰)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

جامع مسجد بھرت پور جملہ مسلمانان و ملازمان کے چندہ سے تعمیر ہوئی اور صدر دروازہ شرقی کی بلندی پر کتبہ کندہ ہو کر لگ چکا ہے اس جامع مسجد کے جنوبی و شمالی دونوں دروازہ اس وقت تک بلا تعمیر تھے لیکن وزیر بخش مرحوم منہار ان کی بیوہ نیاپنی برادری چوڑی فروشان بھرت پور کو ۱۴۲۰ھ طلاق زیورات دیکر عرض کیا کہ تم اس کو فروخت کرو اور شمالی دروازہ جامع مسجد جو بازار کی طرف ہے اس رقم سے تعمیر کرایا جائے اور میرے خاوند کی یادگار کا اس دروازہ پر ایک کتبہ نام کندہ کرا کر لگایا جائے۔ چونکہ جامع مسجد کی تنظیم کے واسطے ایک کمیٹی مقرر ہے ہم بچوں نے بیوہ سے عرض کیا کہ ہم یہ رقم داخل خزانہ جامع کرتے ہیں اور اس وقت درخواست دیتے ہیں چنانچہ ہماری قوم کے بیچ جامع مسجد کمیٹی کی خدمت میں پہونچے۔ اور عرض کیا کہ مبلغ نو سو روپیہ دو آنہ ہم بطور امانت اس غرض سے جمع کئے ہیں کہ ہم کو وقت ضرورت تعمیر دروازہ کیلئے ملے اور دروازہ بنائیںگی اجازت عطا فرمائی جائے اور ہم اس کو اپنی ہی منشاء کے موافق بنوائیں گے اور جو کمیٹی ہوگی تو ہم اپنی اہل برادری سے رقم چندہ فراہم کر کے لائیں گے اور دروازہ مذکور کو مکمل کرائیں گے مگر مر قوم کے نام کا اور ہماری برادری کا کتبہ دروازہ پر لگائیں گے۔

چنانچہ اس سوال پر ایک ممبر صاحب نے جواب دیا کہ حسب منشاء میں سب چیز شامل ہے اس کو

تحریر میں لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم لوگ خاموش ہو گئے اور تکمیل دروازہ کیلئے انتظامات شروع کر گئے اور تخمینہ کیا گیا تو رقم مذکور بالا بہت نا کافی تھی تب ہم نے اہل برادری سے چندہ فراہم کر کے تعمیر شروع کر دی۔ چونکہ سنٹ خشت ٹالس چینی وغیرہ کی اور کتبہ کی جگہ خالی چھوڑ دی گئی تھی جب دروازہ قریب مکمل پر آیا اور کتبہ بن کر آیا اور لگانے کا وقت آیا تو اہل شہر کے وہ افراد جو ہم سے عداوت رکھتے تھے اور ہمارے پیشہ کو اور ہم کو ذلیل سمجھتے تھے انہوں نے موقع کو غنیمت سمجھ کر اس قسم کی شورش پیدا کر دی کہ کتبہ دروازہ پر لگانے سے پوری مسجد پر ان کا قبضہ ہو جائیگا اس وجہ سے ان بعض افراد نے تمام شہر کو درغلا یا کہ ہم کتبہ تمہاری برادری کے نام سے ہرگز نہ لگانے دیں گے ہم لوگوں نے عرض کیا کہ کتبہ اگر شریعت سے ناجائز ہو گا تو ہم ہرگز نہ لگائیں گے اور اگر جائز ہو تو لگائیں گے۔ بعض حاسدیں نے اس پر یہ جواب دیا کہ اگر فتویٰ جواز کی صورت میں بھی آگیا ہم فتویٰ کو ہی ہرگز نہ مانیں گے چاہے کچھ ہو جائے اب قائل طلب بات اس مسئلہ میں یہ ہے کہ۔

(۱)۔ کتبہ لگایا جانا قبول کے نام سے جائز ہے یا نہیں صرف وقت شدہ شنی پر۔

(۲) فتویٰ کے نہ ماننے والوں پر کیا حکم ہے شریعت سے۔

(۳) ہم چوڑی والا ان نے وعدہ کیا بیوہ وزیر مرحوم سے کتبہ لگانے کا ہم کیا کریں۔

(۴)۔ اور ہم سے وعدہ کیا کمیٹی جامع مسجد نے کہ ضرور کتبہ لگانا کمیٹی کا کیا ارشاد ہے ایسی وقف شدہ چیز پر رقم نہویا فروخت کرنا جائز یا ناجائز ہے۔

(۵) اور مخالفین کا یہ بھی کہنا ہے جو رقم تم نے دروازہ پر صرف کی ہے لے لو ایسی وقف شدہ چیز پر رقم کہنا یا فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں۔

(۶) کتبہ کا مضمون یہ ہے۔ باب الوزير مرحوم دروازہ جماعت چوڑی سوداگران بھرتپور اور نہ تارخ و حکم طبیعت اللہ اکبر کنندہ یہ سب سنگ مرمر پر خوش قلم عمدہ ڈزاین سے تیار ہے۔

(۷) اس معاملے کے کتبہ لگانے میں کون کون ذمہ دار ہیں لگایا جائے یا نہیں براہ کرم جلد از جلد جواب مرحمت فرمایا جائے فقط والسلام۔

المستفتی احقر ریاض الحسن عرف بند اشرفی چوڑی سوداگر بھرتپور۔ ۳۳، ۳۴، ۱۵۔

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

بلا شک مسجد میں روپیہ صرف کرنا باعث اجر و ثواب ہے لیکن جب فخر و ناموری کیلئے نہ ہو اور جو کام فخر و ناموری کیلئے ہے وہ رب العزت کی بارگاہ میں قبول نہیں۔ حدیث شریف میں ہے:

يقول الله لهم يوم يجازى العباد باعمالهم اذهبوا الى الذين كنتم ترثون في الدنيا فانظروا هل تجدون عندهم جزاء خيرا رواه البيهقي في شعب الایمان۔

(مشکوٰۃ شریف ص ۲۵۶)

یعنی اللہ تعالیٰ جس روز بندوں کو ان کے اعمال کی جزاء دے گا تو جو لوگ دکھاوے کے لئے اعمال کرتے تھے ان کے لئے فرمایا گیا انہیں ان کی طرف یجاؤ جنہیں یہ دنیا میں دکھانے کیلئے اعمال کرتے تھے تو دیکھیں کہ کیا ان سے جزاء خیر پاتے ہیں۔

تو مسلمان کا ہر نیک کام رضائی الہی کیلئے ہونا چاہیے۔ اس میں خواہش نفسانی اور وسوسہ شیطان کا دخل نہ ہونا چاہئے۔ لہذا اگر یہ کتبہ محض فخر و شہرت اور ریادنا موری کی بنا پر ہے تو زوجہ وزیر بخش اور ان کی برادری کو اس پر ہرگز ہرگز اصرار نہ کرنا چاہئے اور درگاہ رب العزت میں رجوع کر کے یہ دعا کرنا چاہئے کہ مولیٰ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے اور اس کا اجر و ثواب مرحوم کی روح اور جن جن لوگوں نے شرکت کی ہے ان کو اپنے فضل و کرم سے عطا کرے اور ہمیں فخر و ناموری کے شیطانی خیالات سے بچائے۔

اور اگر اس کتبہ کا نصب کرنا فخر و ناموری کی غرض سے نہیں ہے تو اس کا لگانا نہ فقط جائز بلکہ سلف سے منقول ہے بلکہ اس کی اصل حدیث شریف سے ثابت ہے ابو داؤد و نسائی شریف میں ہے کہ حضرت اور بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے سرکار رسالت میں آکر عرض کیا:

يا رسول الله ان ام سعد ماتت فاي صدقة افضل قال الماء فحفرا بيرا وقال هذا

(ام سعد۔ از مشکوٰۃ ص ۱۶۹)

حضور ام سعد کا انتقال ہو گیا تو کونسا صدقہ افضل ہے؟ حضور نے فرمایا: پانی، تو حضرت سعد نے ایمان کے نام کا کنوئیں کھودوایا اور کہا کہ یہ کنواں ام سعد کے لئے ہے۔

تو اس حدیث اس کنوئیں کی نسبت ام سعد کی طرف کی گئی۔ اسی طرح بکثرت مقامات پر کنوئیں کا وجود ہے۔ خود مساجد کو لیجئے کہ انہیں ایسی نسبتیں ہوتی ہیں۔ مدینہ منورہ میں ایک مسجد علی ہے۔ ایک مسجد ابو بکر ہے۔ ایک مسجد ابی ابن کعب ہے۔ ایک مسجد سلمان فارسی ہے۔ اور مسجد بنی جعفر میں یہ کتبہ لگا ہوا موجود ہے جس کو حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے جذب القلوب میں نقل کیا۔

در ہمیں محراب سنگے است بروے نوشتہ خلد اللہ ملک الامام ابی جعفر المنصور المستنصر باللہ امیر المؤمنین عمر بنہ ثلثین و ستمائے

تو اگر ایسی نسبتیں اور کتبہ لگانا جائز ہوتا تو علمائے کرام و فقہائے عظام خود مدینہ شریف میں اس کتبہ کو رد کرتے اور اس پر عدم جواز کا فتویٰ صادر فرماتے۔ خود مسجد نبوی میں جب بادشاہ روم سلطان مراوے نے ممبر شریف ۹۹۸ھ میں پتھر کا تیار کرایا اور علمائے روم نے اس کی یہ تاریخ نکالی۔
منبر عمر سلطان مراد۔

اس قسم کی بکثرت مثالیں جذب القلوب میں ہیں۔ تو یہ بات نہایت صاف طرح پر ثابت ہوگی کہ مساجد وغیرہ اوقاف پر بانی کا نام کندہ کرنا ایسا جائز ہے کہ اس پر کبھی کسی نے اعتراض ہی نہیں کیا تو یہ کہنا کہ کتبہ لگانے سے وقف پر قبضہ ثابت ہو جائے گا سخت جہالت اور نادانی کی بات ہے اور مسلمانوں میں بلا وجہ کی شورش پیدا کرنا اور مسلمانوں کو ذلیل و حقیر کہہ کر ان کے دل دکھانا اذیت اور تکالیف پہنچانا شرعاً حرام ہے اور اپنی نفسانیت و ضد میں اس حد تک پہنچ جانا کہ اپنے خلاف حکم شرعی کے فتویٰ کے انکار کر دینے کا اظہار کرنا انتہائی اور دین سے بے تعلقی کی دلیل ہے مولیٰ تعالیٰ مسلمانوں کی حالت پر رحم فرمائے اور انہیں اختلاف و نفاق سے محفوظ رکھے اور حسد و خود نمائی سے بچائے اور حق کے قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ان میں حقیقی اتفاق و اتحاد پیدا کرے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: ا: مقتضی بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۲۸۱ھ

مسئلہ

(۲۸۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسائل ذیل میں

سی۔ پی کے علاقہ میں کچھ لوگ ایسے مسلمان ہیں کہ جار و کشتی کرتے ہیں جیسے کہ یوپی میں سبکی سڑکوں پر جھاڑو لگاتے ہیں۔ اگر وہ سی پی کے جار و کشتی مسلمان یوپی میں آئیں اور کسی مسجد میں نماز پڑھنے جائیں تو کیا ان کو مسجدوں میں داخل ہونے سے منع کیا جائیگا؟ اس کے متعلق جو مسئلہ ہو مطلع کیا جائے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بلاشبہ جار و کشتی بوجہ اسلام کے متقین میں داخل ہے اور حدیث شریف میں ہے۔

المساجد بیوت المتقین۔ یعنی مساجد متقیوں کے گھر ہیں۔ رواہ الطبرانی۔

تو مسجد جار و کشتی مسلمان کا بھی گھر ہوا۔ تو اس کو مسجد میں داخل ہونے سے کون روک سکتا ہے۔ ہاں جب مسلمان ناپاک ہو یا اس کے بدن اور کپڑے پر کسی طرح کی نجاست ہو یا اس سے کوئی بو آتی ہو تو اس کو دخول مسجد سے منع کیا جائے گا اس میں جار و کشتی اور غیر جار و کشتی سب برابر ہیں۔ محض جار و کشتی کا پیشہ دخول مسجد کے لئے مانع نہیں۔ جن مقامات پر مسلمان اس پیشہ کو کرتے ہیں وہ پاک و صاف ہو کر اچھے کپڑے بدل کر مسجد میں باجماعت نماز پڑھتے ہیں پھر جب وہ مسلمان ہیں تو انہیں جماعت اور مسجد کے اجر و ثواب سے کس طرح محروم کیا جاسکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: ا: مقتضی بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۲۸۱ھ

(۲۸۲)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

جب مسجد کا ٹین یا کڑی یا اینٹ وغیرہ اس مسجد کی عمارت سے جدا کر دئے گئے ہوں اور پھر ان کے تعمیر میں لگانے کی ضرورت باقی نہ رہے تو انہیں متولی فروخت کر سکتا ہے یا نہیں۔ اور خریدار انہیں اپنے مکان یا دوکان میں لگا سکتا ہے یا نہیں؟۔ بینوا تو جروا۔

المستفتی عبد المجید برف والا ساکن محلہ سرائے سنہ ۱۲۸۱ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجد کا ٹین، اینٹ، وغیرہ جب اس مسجد میں پھر نہ لگ سکے یا اس کے پڑے رہنے میں ضائع ہونے یا خراب ہو جانے کا خوف ہو تو انہیں فروخت کر سکتے ہیں اور اس کی قیمت مسجد کی عمارت میں صرف کی جائے گی۔ صاحب درمختار، درالمفتی شرح مفتی میں فرماتے ہیں:

و نقص الوقف ای المنقوض من خشب و حجر و اجر و غیرہا یصرف الی عمارتہ ان احتاج الیہا بالفعل و الا حفظ الی وقت الحاجة الیہا وان تعذر صرف عینہ بان لا یصلح لذلك یباع ای باعہ القاضی و المتولی و یصرف ثمنہ الیہا اقامۃ للبدل مقام

پھر جب شرعاً ان کی بیع جائز قرار پائی تو خریداران کو جہاں چاہے لگا سکتا ہے۔ ہاں ان کا یہ احترام چاہئے کہ انہیں ناپاک مقام پر نہ لگائیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۲۴ جمادی الاول ۱۳۳۵ھ

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۳۵ھ

مسئلہ

(۲۸۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ مسجد کی چھت پر نماز پڑھنا از روئے شریعت جائز ہے یا ناجائز؟ اگر چھت کی دیوار پر از روئے محراب بنوادی جائے تو اس صورت میں بھی نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ از روئے شریعت جواب جلد مرحمت فرمایا جائے۔ عین بندہ نوازی ہوگی فقط والسلام

سائل عثمان غنی عرف لاڈو میوہ فروش سبزی منڈی پالی مارواڑ جو دھپور
مورخہ دور رمضان المبارک یوم جمعہ ۱۳۷۰ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجد کی چھت بھی مسجد ہی ہے جو احکام مسجد کے ہیں وہ مسجد کی چھت کے بھی ہیں۔ کبیری میں ہے: ”کما لا یکرہ فی المسجد لا یکرہ فوقہ ایضاً“
تو ناجائز کس طرح قرار دیا جاسکتا ہے۔ خود خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھنا ترک تعظیم ہے مگر ہاں وجود اس کے جماعت سے نماز پڑھا بکراہت تنزیہی جائز ہے۔

درمختار میں ہے: یصح فرض ونفل فیہا وفوقہا ولو بلا سترة وان کرہ الثانی للہی وترک التعظیم منفرد او بجماعة

تو ان مساجد کی چھت پر جماعت ناجائز کس طرح ہو سکتی ہے۔ بیت اللہ کے لئے تو صراحتہً نہیں وارد ہے اس لئے جواز مع کراہت تھا اور باقی مساجد کے لئے بلا کراہت جواز ثابت ہوگا۔

لہذا جس کی مسجد میں نیچے صحن نہ ہو، یا ہو لیکن کم ہو اور گرمی اور گرمی کے موسم میں نیچے صحن گرمی معلوم ہوتی ہو اور چھت پر ایسی جہاد بویاری ہو جس سے کسی مکان کی بے بردگی نہ ہوتی ہو تو اس

ضرورت کی بنا پر اوقات گرمی میں جماعت سے نماز پڑھی جاسکتی ہے یہ خلاصہ تحقیق ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۳۵ھ

(۲۸۴)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین سوالات ذیل کے متعلق

(۱)۔ آیت کریمہ۔ ومن اظلم ممن منع مساجد اللہ ان یذکر فیہا اسمہ وسعی فی خرابہا اولئک ما کان لہم ان یدخلوها الا خائفین لہم فی الدنیا عزی ولہم فی الآخرۃ عذاب عظیم۔ میں ذکر سے کون کون سے ذکر مراد ہیں؟

(۲)۔ زید جو ایک مسجد کا متولی حکومت کی طرف سے مقرر کیا گیا ہے وہ مسجد میں اپنے آمرانہ طور پر عمل کیساتھ اہل جماعت کو مسجد کے اندر اکثر بیشتر (یہاں تک کہ رمضان المبارک میں روزے کی حالت میں) فحش فحشاں بہت شور کے ساتھ بکتا ہے کہ آواز مسجد کے باہر سڑک کے لوگ بھی باسانی سن سکتے ہیں۔ جب کہ مسجد کے اندر دنیا کی باتیں کرنا منع ہے تو پھر اہل جماعت کو بلند آواز سے گالی دینے والے خاص کر مسجد کے اندر اس کے متعلق کیا حکم ہے۔ (مسجد کے اندر اس صورت میں گالی دینے کے باعث بعض مصلیاں حنفی سنی نے فتنے کے اندیشے سے مسجد ترک کر دی ہے۔

(۳)۔ قمری ماہ کی سترہ تاریخ کو حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وابستگی اور عقیدت کے اظہار کے لئے کوئی شخص خود یا اہل جماعت چندہ کر کے میلاد مبارک مسجد میں کرنا چاہیں تو ممانعت کرنے والے کے متعلق کیا حکم ہے؟

(۴)۔ اسی طرح اگر مصیبت زدہ انسان مشکل کشائی کے لئے آیت کریمہ کا وظیفہ کرنا چاہے یا اہل جماعت اعدا کی شرائط کیوں سے بچنے کی غرض سے باجائز عالم دین متین بعد نماز عشا یا بعد نماز مغرب مسجد میں بیٹھ کر آیت کریمہ کا وظیفہ یا کوئی دوسرا ورد کرنا چاہیں تو ایسا کرنے کی ممانعت کرنے والے کے متعلق کیا حکم ہے؟

(۵)۔ یہاں اہل سنت والجماعت کی مسجد میں عام طور پر یہ قاعدہ ہے کہ ہر ماہ گیارہویں شریف اور بارہویں شریف کی فاتحہ ہوتی ہے مگر مسجد کے متولی زید کا کہنا ہے کہ بغیر میری اجازت کے مسجد میں کچھ

نہیں کر سکتے۔ درست ہے یا نہیں؟

لہذا صورت مسئلہ یہ ہے کہ ایسا شخص جو مسجد میں وظیفہ کریمہ گیارہویں شریف یا بارہویں شریف میلاد مبارک ختم قرآن یا درود، وظائف کی مجلس مقرر کرنے سے روکے شرعاً کسی مسجد کا متولی ہو سکتا ہے؟ اور کیا حکومت کو ایسے شخص کو متولی مقرر کرنے کا حق ہے؟ کیا مسجد کے متولی کو شریعت حق نے ایسے اختیار دئے ہیں کہ بغیر اس کی مرضی اور اجازت کے مسجد میں سوائے نماز پنجگانہ ذکر و فکر اور درود اور وظائف، ختم و میلاد مبارک کی کوئی مجلس منعقد کی جاسکتی، اور کیا آیت مذکورہ بالا کا ایسے شخص پر اطلاق نہ ہوگا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱)۔ آیت کریمہ مذکورہ میں ذکر سے مراد ذکر اللہ ہے، جو خود آیت کریمہ ہی کے کلمات سے ظاہر ہے۔ فرمایا جاتا ہے کہ ”ان یدکر فیہا اسمہ“ یعنی مساجد میں نام خدا ذکر کرنے سے روکے۔ اور ذکر اللہ جس طرح تسبیح و تحمید اور تہلیل و تکبیر ہیں اسی طرح تمام عبادات و دعا اور تلاوت قرآن کریم اور علم دین بھی ذکر اللہ ہی میں داخل ہیں۔

تفسیر احمدی میں ہے: و اذکر ربک فی نفسک عامۃ فی الاذکار من قرأ القرآن والدعا والتسبیح والتہلیل وغیرہ ذلك۔

اور تفسیر مدارک التنزیل میں ہے:

بنیت المساجد للعبادة والذکر ومن الذکر درس العلم۔

(تفسیر مدارک ج ۲ ص ۹۱)

اور اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ذکر پاک اور صحابہ و صالحین رضی اللہ عنہم کا ذکر بھی ذکر اللہ میں داخل ہے۔ چنانچہ حدیث قدسی شرح شفا شریف سے مع شرح کے نقل کے جاتی ہے۔

جعلتک ذکرک من ذکرى (ای نوع ذکر من اذکارى) (فمن ذکرک ذکرنى) ای

(شرح شفا ج ۱ ص ۲۶۰)

فکانہ ذکرنى۔

یعنی میں نے اپنے ذکروں میں سے آپ کو ایک ذکر کی قسم قرار دیا تو جس نے آپ کا ذکر کیا تو گویا

کہ اس نے میرا ذکر کیا۔ اسی بنا پر مجملہ اسمائے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آپ کا نام ذکر اللہ بھی ہے۔ چنانچہ زرقانی میں ہے:

قال مجاهد فی الاذکر اللہ تطمن القلوب انه محمد و اصحابہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم (زرقانی شرح مواہب ج ۳ ص ۱۳۰)

توان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ ذکر رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و ذکر صحابہ و صالحین رضی اللہ تعالیٰ عنہم بھی ذکر اللہ میں داخل ہے۔ اور تفسیر مدارک کی عبارت سے ثابت ہوا کہ مساجد ذکر اللہ ہی کے لئے بنائی گئیں ہیں۔ لہذا مساجد میں آیت کریمہ کا وظیفہ پڑھنا یا حلقہ ذکر کرنا یا کوئی درود دعا کرنا، یا محافل میلاد شریف و گیارہویں شریف کرنا یا وعظ اور مسائل شرعیہ کا بیان کرنا یا تلاوت قرآن کریم کرنا بلا شک جائز و درست ہیں۔ کہ یہ سب ذکر اللہ میں ہی داخل ہیں۔ یہاں تک کہ مسجد میں نکاح کی مجلس منعقد کرنا مستحب ہے۔

درمختار میں ہے: و یندب اعلانه (ای النکاح) و تقدیم خطبہ و کونہ فی مسجد۔

(رد المحتار ج ۲ ص ۲۶۸)

نیز قاضی کو مسجد میں مقدمات کرنے کی منجانب شرع اجازت ہے۔ درمختار میں ہے:

و یقضی فی المسجد و یختار مسجد ا فی وسط البلد تیسیرا للناس و یستدبرا لقلبة کخطیب و مدرس۔

(رد المحتار ج ۲ ص ۳۳)

لہذا جب شریعت مطہرہ نے قاضی کو مسجد میں مقدمات کرنے سے نہیں روکا، لوگوں کو مسجد میں مجلس نکاح سے منع نہیں کیا تو شریعت مطہرہ ذکر میلاد شریف، گیارہویں شریف، محفل وعظ، تعلیم مسائل شرعیہ، تلاوت قرآن کریم، حلقہ ذکر، وظیفہ آیت کریمہ، مجلس شہادت، وغیرہ ذکر خیر سے کس طرح منع کر سکتی ہے۔ کہ یہ سب امور ذکر اللہ ہیں اور مساجد ذکر اللہ ہی کے لئے بنائی گئی ہیں۔ تو انکا منع کرنے والا آیت کریمہ کے تحت میں دخل ہو کر گنہگار و ظالم قرار پایا۔

تفسیر مدارک میں ہے: وهو حکم عالم لجنس مساجد الله و ان مانع من ذکر الله مفرط فی الظلم۔

(تفسیر مدارک ج ۱ ص ۵۵) واللہ تعالیٰ اعلم،

(۲) مسلمان کو گالی دینا اور اذیت پہنچانا ممنوع ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

سباب المسلم فسوق رواہ الصحیحین عن ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

اور مسجد میں گالیاں بکنا مزید قباحت کو مستلزم ہے اور احترام مسجد کے خلاف ہے۔ اسی طرح مسجد میں آواز بلند کرنا اور شور مچانا ممنوع ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

جنبوا مساجدکم صبیانکم ومجانینکم وشراءکم وبيعکم وخصوماکم ورفع اصواتکم الحدیث۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۳) میلاد شریف سترہ تاریخ یا کسی تاریخ میں کرنا بلا شک جائز و مستحب ہے جس کے جواز کے قرآن و حدیث اور اجماع و قیاس سے تفصیلی دلائل میری رسالہ ”عطر الکلام فی استحسان المولد والقیام“ میں بکثرت موجود ہیں۔ لہذا میلاد شریف کا مسجد میں منع کرنا یقیناً جائز و مستحب ہے کہ یہ ذکر اللہ میں داخل ہے تو اس کا منع کرنے والا گویا ذکر اللہ کا منع کرنے والا ہے۔ اور بحکم آئیہ کریمہ گنہگار و ظالم ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

(۴) آئیہ کریمہ کا وظیفہ یا کوئی قرآن و حدیث کی دعاؤں کا ورد ذکر اللہ ہی میں داخل ہیں تو ان کے جواز میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ ہاں اگر کسی نمازی یا قاری کے لئے باعث تشویش ہو تو بآواز بلند نہ پڑھا جائے۔

ردالمحتار میں ہے: اجمع العلماء سلفاً وخلفاً علی استحباب ذکر الجماعة فی المساجد وغیرہا الا ان یشوش جہرہم علی نائم و مصل اوقاری الخ۔

تو اس کو منع کرنے والا اجماع علماء کا مخالف اور بحکم آئیہ کریمہ ظالم ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۵) مسجد میں مسائل شرعیہ کے ذکر کرنے کو بلا وجہ شرعی کے منع کرنا بڑی سخت جرأت و دلیری ہے۔ تفسیر مدارک سے معلوم ہوا کہ مساجد علم دین کے درس کے لئے ہیں اور یہ شخص مسائل شرع کے ذکر کو منع کر کے کیسا سخت مجرم و گنہگار بنا۔ مولیٰ تعالیٰ اس کو چشم بصیرت عطا فرمائے، واللہ تعالیٰ اعلم،

(۶) گیارہویں شریف و بارہویں شریف کی فاتحہ مساجد میں بلا شک درست و جائز ہیں، کہ یہ ذکر اللہ میں داخل ہے تو مسلمان کے لئے سب سے ضروری شریعت کی اجازت ہے اور جب شریعت کی اجازت ہے تو متولی کی اجازت کو کون پوچھتا ہے۔ ایسا شخص اہل سنت کی مساجد کا یقیناً متولی نہیں ہو سکتا، نہ حکومت ایسے شخص کو اہل سنت کی مساجد کا متولی بنانے کا حق رکھتی ہے۔ نہ متولی کو شریعت نے ایسے اختیارات دئے ہیں۔ لہذا یہ شخص آئیہ کریمہ کے حکم میں داخل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

کتبہ: الفقیر الی اللہ عز و جل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ

(۲۸۵)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ جو کہ حوض وضو کرنے کا مسجد کے صحن سے ملا ہے حوض تودہ درودہ ہے اور مسجد کے صحن کے باہر جہاں جوتے اتارے جاتے ہیں اس سے ملا ہوا غسل خانہ ہے اور اس سے نل لگا ہوا ہے جو کبھی بند بھی ہو جاتا ہے مگر غسل کرنے والے اہل محلہ جس میں کثیر تعداد بے نمازیوں کی ہے تو لوگ گھر سے بالٹیاں لا کر مسجد کے حوض سے پانی لیکر جہاں جوتے اتارے جاتے ہیں وہاں بیٹھ کر غسل کرتے ہیں، ایک بالٹی سے بدن بھگو کر صابن لگا کر دوبارہ سہ بارہ پھر اسی بالٹی کو حوض سے بھرتے ہیں اور مسجد کا صحن بھگوتے ہوئے آتے جاتے ہیں، ان کے بدن کا پانی ناپاک پانی صحن میں گرتا ہے، جماعت والے بخیاں فساد کے کوئی مزاحمت نہیں کرتے۔ اس کے لئے کیا حکم ہے علمائے دین کا؟۔ اور مسجد کے قریب تالاب کنوئیں نل وغیرہ ہیں مگر وہاں نہ جا کر مسجد ہی میں آتے ہیں اکثر اوقات حوض کا پانی بہت نیچے چلا جاتا ہے جس سے وضو کرنے والوں کو دقت اٹھانا پڑتی ہے، اور کپڑے دھو کر مسجد کے صحن میں سکھانے کو ڈالتے ہیں اور کوئی ضرورت مند گھڑی دیکھنے کے واسطے آیا تو وہی پانی پریوں پاؤں میں لگا ہوا مسجد میں چلے جاتے ہیں تو ایسی صورت میں کیا کرنا چاہئے۔

سائل شیخ جمن متولی مسجد پتھر پھوڑ۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجد کی تعظیم واحترام اور تطہیر وتنظیف یعنی اس کو پاک اوستھرا رکھنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔ کبیری میں ہے: تنزیہ المسجد من القذر واجب۔ (کبیری۔ ص ۵۶۸)

یہاں تک کہ مسجد کی دیوار اور صحن پر حتی کہ بوریوں پر تھوکرنا ممنوع ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ولا یسرق علی حیطان المسجد ولا بین یدیه علی الحصیر ولا فوق البواری ولا تحتھا وکذا المخاط۔ (عالمگیری۔ ص ۵۷)

اسی طرح صحن مسجد میں کلی کرنا یا وضو کرنا مکروہ ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: تکرہ المضمضة والوضوء فی المسجد۔

علامہ شامی ردالمحتار میں اس کی دلیل ان الفاظ میں فرماتے ہیں: لان ماء مستقدر طبعاً

یعنی وضو کا پانی ناپاک طبعاً ہے تو مسجد کا اس سے بچنا واجب ہے، جیسے رینٹ اور بلغم سے مسجد کی حفاظت واجب ہے۔ (تو جب مسجد کی وضو کے پانی سے حفاظت ضروری ہے تو غسل کے پانی سے مسجد کی حفاظت کس قدر ضروری ہے۔ لہذا ایسے بے نمازی لوگوں کا غسل کے پانی سے صحن مسجد کا آلودہ ملوث کرنا سخت ممنوع اور گناہ ہے، اور ان کی یہ نازیبا حرکت بالکل حرمت مسجد کے خلاف ہے، جو مسلمان کی شان سے بہت بعید ہے۔ اسی طرح کپڑے دھو کر صحن مسجد میں سکھانا یہ بھی احترام مسجد کے خلاف ہے۔

بالجملہ مسلمان کو اپنی عبادت گاہ مسجد کا انتہائی احترام ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اور وہ اپنے کسی فعل و عمل سے اہل مسجد کو ایذا و تکلیف ہرگز نہ پہنچائیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

کتبہ: اعمتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدۃ سنجل

(۴۸۶)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس امر میں کہ

ایک مسجد یہاں عرصہ دراز سے قائم ہے جس کے گرد و نواح ہر جانب مسلمان مقیم ہیں اور مسجد مذکورہ کی دیکھ ریکھ بذمہ اہل محلہ کے ہے جنکی تعداد تقریباً سو گھروں کی ہے۔ مسجد کی چبوتری سرکار کی طرف سے توڑنے پر اہل محلہ کو معلوم ہوا کہ مسجد کا قبالہ نہیں ہے، تب سب اہل محلہ نے متعین رائے سے اہل محلہ کے نام قبالہ بنانے کی درخواست حکومت موصوف میں کی گئی تو محلہ سے ایک قوم جو کہ چند گھروں کے شور گروں کے نام سے معروف ہے انہوں نے عذر داری حکومت موصوف میں پیش کی کہ یہ مسجد ہماری مورثی و مملوکہ و مقبوضہ ہے اس کا قبالہ محلہ کے نام نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ ہمارا ذاتی قبالہ ہونا چاہئے۔ ایسی صورت میں کیا اس مسجد میں نماز جائز ہے، یا نہیں، کیا قبالہ عذر داروں کے نام کا ہو جائے۔ ان کے کل گھروں کی تعداد آٹھ گھر کی ہے۔ قبالہ ان کے نام جائز ہے یا نہیں، اگر چند لمحہ کے لئے مان لیا جائے کہ عدالت موصوف نے عذر داروں کے نام قبالہ بنا دیا اور اہل محلہ مسجد مذکورہ سے دست بردار ہو گئے تو ایسی صورت میں ذمہ اہل محلہ کو کچھ علت تو نہیں ہے۔ فقط جواب بکتاب حدیث و فقہ مرحمت فرمائیں۔

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم
جو قوم ایسی مسجد کو اپنی مورثی مملوکہ کہتی ہے وہ برسر غلطی ہے کہ مسجد کسی کی مورثی مملوکہ نہیں ہوتی، بلکہ وہ موقوفہ ہوتی ہے، حکومت کسی کے نام کا بھی قبالہ دیدے لیکن اس میں نماز ہر مسلمان کو پڑھنا جائز ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی بانی مسجد نے کسی خاص اہل محلہ ہی کے لئے مسجد تعمیر کرائی تو دوسرے محلہ کے لوگوں کو بھی اس میں نماز پڑھنا جائز ہے۔

عالمگیری میں ہے: لو بنی مسجد الاہل محلة وقال جعلت هذا المسجد لاهل هذه المحلة خاصة كان لغير اهل تلك المحلة ان یصلی فیہ۔ تو پھر اس مسجد کے اہل محلہ ہی کو اس میں نماز پڑھنا کیسے ناجائز ہے۔ لہذا اگر وہ قبالہ اس قوم ہی کے نام ہو جائے تو اہل محلہ نہ اس مسجد سے دست بردار ہوئے نہ ان کا اس میں نماز پڑھنے کا حق باطل ہوا نہ انہیں اس بات کی اجازت ہے کہ وہ حقوق مسجد سے بے پروا ہی کریں۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

کتبہ: اعمتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدۃ سنجل

(۴۸۷)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں حضرات علمائے کرام و مفتیان شرع عظام دامت برکاتہم النور یہ مسائل حسب ذیل میں۔

(۱) قبرستان میں اور مسجد میں اور مسجد کے اندر اور بیرون مسجد یعنی جو مسجد بمعنی موضع صلوٰۃ کے باہر حدود مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں۔ اگر ان جگہوں میں اگر نماز جنازہ پڑھی جائے تو نماز بلا کراہت ادا ہوگی یا نہیں شرع کا حکم کیا ہے؟۔ بینوا تو جروا۔

(۲) قبرستان میں اور مسجد کے اندر (مسجد بمعنی موضع صلوٰۃ اور بیرون مسجد یعنی وہ جگہ جو مسجد بمعنی موضع صلوٰۃ کے باہر اور حدود مسجد میں ہو اس جگہ اور میت کے ساتھ جاتے وقت قبرستان کے اور میت کو کا نہادیت وقت حقہ پینا جائز ہے۔ یا نہیں؟۔ بعض جگہ یہ دستور ہے کہ میت کے ساتھ جاتے وقت بلکہ میت کو کا نہادیت وقت قبرستان تک حقہ لیتے ہوئے جاتے ہیں ان کا یہ فعل کیسا ہے اور ان پر شرعاً کیا حکم ہے نیز میت کو دفن کرنے سے پہلے یا بعد دفن موضع قبرستان سے باہر حقہ پینا جائز ہے یا نہیں۔ امام یا

موذن جو مسجد کے حجرے کے سامنے خارج مسجد میں حقہ پیئے تو کیا حکم ہے کیا جائز ہے یا نہیں؟
بینا تو جروا۔

المستفتی فقیر محمد عمران دادری رضوی مسطفوی غفرلہ ربہ محلہ خیر خان پبلی بھیت شریف۔

(۱۴ ذی الحجۃ الحرام - ۱۳۷۳ھ - ۱۵ اگست ۱۹۵۲ء)

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) خاص مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مکروہ ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: وصلوۃ الجنائزۃ فی المسجد الذی تقوم فیہ الجماعة مکروہۃ "اور حدود مسجد کے اندر فرش مسجد سے علیحدہ جو صحن ہو اور وہ داخل مسجد میں شمار نہ ہوا سمیں نماز جنازہ بلا کراہت جائز ہے۔ قبرستان میں اگر نماز جنازہ کے لئے کوئی جگہ متعین ہے تو اسمیں نماز جنازہ بلا شبہ جائز ہے۔ اور اگر کوئی جگہ متعین نہ ہو تو پھر اسمیں نماز جنازہ ضرور پڑھی جائے بلا ضرورت نہیں پڑھنی چاہیے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) مسجد میں حقہ پینا ناجائز ہے اور قبرستان میں یا میت کو اٹھاتے ہوئے حقہ کا پینا ترک ادب ہے اور قبور سے علیحدہ فاصلہ پر قبل دفن یا بعد دفن حقہ پینے میں کوئی حرج نہیں۔ امام اور موذن کو خارج مسجد میں یا اس حجرہ میں جو صحن مسجد سے جدا ہو حقہ پینے میں کوئی حرج نہیں واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۱۳۔ صفر المظفر۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

(۴۸۸)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین کہ

ایک شخص منشی عبد الحمید مرحوم نے موضع گدنا میں مسجد و مدرسہ کی تعمیر کی ہے مدرسہ کی احاطہ میں بھی ایک مسجد ہے ان ہر دو مساجد کے صدر دوازوں پر حسب ذیل کنبات سنگ مرمر نصب ہے۔

عبارات کنبات

(۱)

میری خدائے پاک سے ہے التجا سدا بھولے سے بھی قدم نہ رکھیں اسمیں بیوفا

اہل حدیث۔ غیر مقلد۔ محمدی

حنفی وشافعی جنبلی مالکی

بہر نماز اہل تقی وصفا وفا

(۲)

بنایا خوب ہے مسجد و مدرسہ حمید یہ

حنفی وشافعی و جنبلی و مالک

اہل حدیث غیر مقلد محمدی

بہر نماز مومن و مسلم و اتقیا

عبد الحمید حاجی نے مال وقف بھی کیا

سنت جماعت کیلئے مفید ہے یہ بنا

اہل فتن و ہابی یہ ہیں اس سے سب جدا

فضل خدا سے جب بنا ہے خانہ خدا۔ ۱۳۲۵ھ۔

ان ہر دو کتبات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بانی مسجد و مدرسہ کے نزدیک۔ اہل حدیث غیر مقلد محمدی اور وہابی اہل فتن اور بیوفا ہیں اور سنت جماعت سے خارج ہیں۔ اس لئے وہ اس مسجد و مدرسہ میں نماز وغیرہ کے لئے نہیں آسکتے ہیں اور مدرسہ کی تعمیر محض حنفی وشافعی و جنبلی و مالکی۔ اہل سنت جماعت کیلئے ہوئی ہے۔

کتبہ ثانی کے آخری شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسجد و مدرسہ کی تعمیر محض ان مومن و مسلم اور اتقیا کیلئے ہوئی ہے جو اہل حدیث غیر مقلد محمدی اور وہابی اہل فتن نہ ہوں۔ ان تشریحات کی موجودگی میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ

(۱) بانی مسجد و مدرسہ کا مساجد میں اس قسم کا کتبہ نصب کرنا از روئے شریعت پاک جائز ہے یا

نہیں۔

(۲) اہل حدیث غیر مقلد محمدی اور وہابی اہل فتن بیوفا ہیں یا نہیں۔ اور سنت جماعت سے خارج

ہیں یا نہیں۔

(۳) اگر بانی مسجد و مدرسہ کا نصب کتبہ صحیح و جائز ہے اور جس فریقوں کا تذکرہ انہوں نے اس

کتبہ میں کر کے انہیں سنت جماعت سے خارج بتایا ہے اس کو جو صحیح و جائز تسلیم نہ کرے اور اس پر عامل نہ ہو تو درین صورت ایسے شخص کے متعلق کیا حکم ہوگا۔ اس سلسلہ میں گزارش ہے کہ جواب مدلل معہ حوالہ کتب، وں تو بہتر ہے۔ محمد سلیم اختر موضع سان ڈاکخانہ ابویل گنج۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

(۱) شرعاً واقف اپنی بنا کردہ مسجد و مدرسہ کو مذہب اہلسنت و جماعت کے ایک خاص فرقہ حنفیہ کیلئے بھی متعین کر سکتا ہے۔ پھر تو اس میں اہلسنت و جماعت ہی کے دوسرے فرقہ مالکی شافعی۔ حنبلی کو مداخلت کا کوئی حق حاصل نہیں رہتا اگرچہ یہ فرقہ بھی یقیناً اہلسنت و جماعت ہی میں داخل ہیں۔ چنانچہ ردالمحتار میں ہے۔۔۔ مدرسة موقوفة علی الحنفیة مثلاً لا یملک احدان یجعلها لاهل مذہب آخرون۔ (ص ۲۸۰ ج ۳)

تو جو مخالف اہلسنت و جماعت ہو اور اسکے آنے سے بد مذہبی کا فتنہ پھیلنے کا خوف ہو تو واقف کا اس فتنہ بد مذہب سے حفاظت کیلئے اور گمراہی و ضلالت کا سد باب کرنے کی غرض سے اس مسجد و مدرسہ کا اہلسنت و جماعت کیلئے مخصوص و متعین کر دینا نہ فقط جائز بلکہ مستحسن اور ضروری ہے ”کما هو ظاهر من اکتب الفقہ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔“

(۲) علماء عرب و عجم کے فتوؤں سے وہابی۔ دیوبندی۔ غیر مقلد۔ نجدی مودودی۔ قادیانی۔ وغیرہ فرقہ باطلہ یقیناً اہل فتن اور سخت بیوفا ہیں۔ اور بلا شک اہلسنت و جماعت سے خارج ہیں جن کا تفصیلی ذکر اور حکم حسام الحرمین۔ الصوارم لہندیہ۔ فتاویٰ اہل سنت وغیرہ مطبوعہ کتب سے ظاہر ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۳) بانی مسجد و مدرسہ کے نصب کئے ہوئے۔ کتبوں کی صحت جواب نمبر (۱) سے ثابت وہ چکی۔ اور ان میں جن فرقوں کو خارج از اہلسنت و جماعت ظاہر کیا ہے اسکی صحت جواب نمبر (۲) سے ثابت ہوگی پھر جو اسکو صحیح نہ جانے اور اس پر عامل نہ ہو وہ منکر احکام شریعت اور مخالف اہلسنت و جماعت ہے۔ بلکہ وہ انہیں گمراہ فرقوں میں سے ایک فرقہ میں داخل ہے تو وہ شرط واقف کے خلاف نہ اس مسجد و مدرسہ کا متولی بنایا جاسکتا ہے نہ امام مقرر کیا جاسکتا ہے۔ نہ وہ کسی طرح کی ان میں مداخلت کر سکتا ہے کہ فقہاء کرم کا مسلمہ مشہور حکم ہے۔۔۔ شرط الوقف کنص الشاع ای فی المفہوم والد لالة و وجوب العمل بہ (از رد مختار) واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۴ ربیع الاخر شریف۔ ۱۳۷۴ھ۔

کتبہ: المختصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمیل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۰۵ھ

مسئلہ

(۴۸۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ یہاں جبل پور محلہ مکارم گنج میں ایک چھوٹی سی مسجد لب سڑک واقع ہے۔ جسکی مالی حالت کمزور ہے مسجد کے انتظامات مثلاً۔ صفائی پتائی۔ مرمت روشنی امام و موزن وغیرہ مصارف کے لئے ضرورت آمدنی کا کوئی معقول مستقل ذریعہ نہ ہونے کے باعث مسجد کے بعض مصلیان نے مسجد مذکورہ کے سائے او برآمدہ اور صحن کے شمال دیوار سے اندر کی جانب مسجد میں جہاں نماز ہوتی ہے مسجد کی چھٹ اور بیس فٹ طول لائے فرش پر ایک پختہ دیوار بنا کر دو دکانیں بنانا چاہتے ہیں۔ تاکہ مسجد کی آمدنی بڑھ جائے۔ مگر اس صورت میں مسجد کی شمالی جانب تقریباً چھ صفوں کا کافی حصہ مسجد سے کٹ جاتا ہے جس کی وجہ سے تقریباً چوبیس نمازیوں کی جگہ مسجد سے نکل جاتی ہے اور یہ مسجد کا فرش مسلم دوکانداروں کے استعمال میں آسکتا ہے۔ (جیسا کہ مندرجہ ذیل میں مسجد کے نقشے سے معلوم ہو سکتا ہے۔)

مگر اس کو بعض مصلیان مسجد۔ مسجد مذکورہ کی بے حرمتی اور نمازیوں کی تکلیف کے باعث سمجھتے ہوئے اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسجد کے فرش پر جہاں نماز ہوتی ہے دوکانیں نہیں بنائی جاسکتی ہیں۔

لہذا بعد ادب التماس یہ ہے کہ کیا مسجد کے اندرونی فرش پر جہاں نماز ہوتی ہے دوکانیں بنائی جا سکتی ہیں اور صورت مذکورہ میں مسجد کے اندر ایسی دیوار قائم کر کے صفوں کی جگہ مسجد سے خارج کرنا اور مسلم وغیر مسلم دوکانداروں کو حسب مرضی استعمال کے لئے دینا جائز ہے یا نہیں۔ جواب با جواب سے بحوالہ کتب سرفرازی پیشی جائے تاکہ اس پر عمل ہو سکے۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

بانی مسجد نے جس قدر زمین کو مسجدیت کے لئے متعین و محدود کر دیا ہے اس کا تحت الثری سے آسمان تک مسجد ہونا ایسا متعین ہو گیا ہے کہ اب کسی متولی یا اہل محلہ یا کسی مسلمان کو اس کے حصہ کی مسجدیت کو نہ باطل کرنا جائز۔ نہ اس کا علاوہ ذکر و نماز کے کسی اور شغل کے لئے مقرر کر دینا جائز۔ نہ اسکو اجرت پر دینا جائز۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ”ان ارادہ ان یجعلہ اشیا من المساجد لا یجوز“

فقد قيل ليس لهم ذلك وانه صحيح كذا في المحيط - (فيه ايضا) المسجد وان غرق واستغنى عنه اهله لا يعود الى ملك الباني هو مسجد ابد لا يصح والفتوى على هذا القول - ملخصا - (وفيه ايضا) اذا اراد انسان ان يتخذ تحت المسجد حوانيت غلة لمرة المسجد او فوقه ليس له ذلك كذا في الدخيرة -

صورت مسئلہ میں برآمدہ اور صحن مسجد کے اس حصہ کا مسجد ہونا ظاہر ہے تو اب اس میں دیوار یا دروازہ کا بنانا کرا اس حصہ کا مسجد سے خارج کر دینا کس طرح جائز ہو سکتا ہے۔ نیز اس کے دوکان بنادینے میں اس کو نماز سے روک دینا ہے اور یہ بھی ممنوع ہے۔ لان فیہا شغل ما اعد للصلاة ونحوہا كما ذكره العلامة الشامي۔ نیز اس حصہ زمین مسجد کا اجرت پر دینا لازم آتا ہے۔ لزوم ایجار قطعہ من ذلك لا يجوز، لکھذا مسجد کے ان ہر دو مقاموں پر دوکانیں بنانا یا دیوار بنا کر اس کو مسجد سے خارج کر دینا ناجائز و ممنوع ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المقتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۴۹۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شریعتین اس مسئلہ میں کہ

ایک مسجد تین سو سال کی تقریباً پرانی ہوگئی جو اونچی کرسی کی ہے اس کے خرچ کیلئے یہ خانہ دوکان بنی ہوئی ہے اور اس مسجد کے دروازے کے سامنے ملتا ہوا زینہ ہے اور زینہ کے ہر دو طرف مسجد کی زمین میں چبوترہ اس عمارت یعنی مسجد کی حد تک ہے مسجد کے اندر ایک مزار بھی ہے جس کو دیوار کھینچ کر علیحدہ کر دیا ہے بوجہ مزار کی دیوار کھینچنے کے مسجد کے اندر سے چھوٹی اور تنگ ہوگئی ہے اکثر و بیشتر جمعہ کے روز دو چبوتروں پر نماز پڑھتے ہیں بوجہ تنگی۔ مسجد تمام پختہ بنی ہوئی ہے۔ سقف خدہ ایک طرف غسل خانہ آب دست خانہ ہے اور چبوترہ کے پاس جوتا اتارنے کیلئے کچھ جگہ ہے غرض کہ مسجد کے لوازمات میں سے جو چیزیں ہوتی ہیں وہ سب ہیں۔ مذکورہ عمارت کو پیش نظر رکھتے ہوئے عرض یہ ہے کہ مسجد کے ان چبوتروں و غسل خانہ و آب دست خانہ کی جگہ کو دنیوی رفاه عام کے لئے یعنی سڑک وغیرہ کے لئے دے سکتے ہیں یا نہیں۔ یہ واضح رہے کہ یہ چبوترے وغیرہ سب مسجد کی زمین میں ہیں۔ اہل محلہ کی خواہش ہے

کہ ان چبوتریوں کو مسجد کے اندر لے لیا جائے تاکہ کشادگی ہو جائے اور بعض آدمیوں نے اپنا دنیاوی مفاد پیش نظر رکھتے ہوئے سڑک کے لئے ان کا فیصلہ کر لیا۔ شریعت کا اس کے لئے کیا حکم ہے اور مسجد کے وقف شدہ زمین کو سڑک بنانے کے لئے دینے والوں کو شرع شریف کیا حکم دیتی ہے؟۔

المستفتی قاضی بخش اللہ راجستھان

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جب یہ ہر دو موقعہ پر چبوترے مسجد ہی کے اس سے متصل ہیں تو صحن مسجد یا اس کے لواحق کو شرعاً سڑک کیلئے دینا جائز نہیں۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ان ارادوا ان يجعلوا شيئا من المسجد طريقا للمسلمين فقد قيل ليس لهم ذلك وانه صحيح كذا في المحيط -

اور خاص کر جب مسجد نمازیوں کیلئے تنگ ہو چکی ہو تو ان چبوتروں سے مسجد وسیع کر لینا ہے یہاں تک کہ اگر مسجد لوگوں پر تنگ ہو رہی ہو اور مسجد کے پڑوس میں کسی کی زمین پڑی ہو تو اس سے زبردستی وہ زمین بقیعت لیکر مسجد کو وسیع کرنے کا حکم ہے۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

لو ضاق المسجد على الناس وبجنبه ارض الرجل تؤخذ ارضه بالقيمة كرها كذا في الفتاوى قاضی خاں -

تو یہاں تو جو حاجت مسجد کے پورا ہونے کیلئے ہے اسی کے متصل اس کے موقعہ مسجد کے ان چبوتروں کو سڑک میں دیدینا مسجد کی سخت حق تلفی ہے جس کا استحقاق کسی متولی یا اہل محلہ کو ہرگز نہیں حاصل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۳۲۷۱ القعدہ ۲۷ ۱۳۷۱ھ

کتبہ: المقتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۴۹۱)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ

ایک شخص نے ایک مکان کہ جس میں صرف ایک کوٹھہ ہے اور کچھ صحن ہے، ایک مسجد کے واسطے وقف کیا کہ اس مکان کا آئینہ اس مسجد میں چھوڑ دے۔ یہ مکان کا متعلقہ اہل محلہ کی خواہش ہے

شکستہ ہوا۔ زید متولی نے درستی بھی اسی مسجد کے روپے سے کرائی جس مسجد کی واسطے وہ مکان وقف کیا گیا ہے، وہ کوٹھہ موجود ہے۔ اب کچھ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اس مکان کو خود مسجد بنائیں اور اس کوٹھہ کو گرا کر مسجد پختہ تعمیر کر دی جائے۔ اجازت تعمیر لی گئی ہے، مسجد تعمیر نہیں ہوئی ہے۔ ان لوگوں نے صرف ایک دروازہ تعمیر کیا ہے اور ایک غسخانہ بنایا ہے اور مل لگا ہے۔ اور اس موقوفہ مکان میں نماز پڑھنی شروع کی ہے، مراد آباد جامعہ نعیمیہ وغیرہ سوال بھیجا گیا، جواب آیا کہ مسجد نہیں تعمیر ہو سکتی۔ یہ مکان دوسری مسجد کی ملکیت ہے۔ لہذا عرض یہ ہے کہ صورت مذکور میں شرعاً کیا حکم ہے مسجد تعمیر ہو سکتی ہے یا نہیں؟

ضروری نوٹ۔۔ اس سے قبل آپ کے پاس ایک سوال قصبہ راجا کا سہیور سے بھیجا گیا تھا اس میں کیا سوال کیا گیا تھا یہی سوال تھا یا کچھ اور تھا، اس کا جواب بھی مرحمت فرمائیں۔ کچھ لوگ آپ کا نام لے کر شہرت لے رہے ہیں کہ مسجد بنانا جائز ہے، ہم مسجد بنائیں گے۔

مولوی صاحب نے حکم دے دیا ہے، ہر دو سوالوں کا جواب مرحمت فرمائیں۔ یہاں اختلاف بڑھ رہا ہے جلد سے جلد جواب تحریر فرمائیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جب مکان ایک مسجد خاص کے لئے وقف ہے اور اس کی آمدنی بھی اس مسجد میں صرف ہو رہی ہے۔ اس مکان کا کسی کو نہ مسجد بنالینا جائز ہے نہ اس مسجد کو نقصان پہنچانا درست کہ کسی کو ایسی تغیرات کا شرعاً اختیار حاصل نہیں۔ جامعہ نعیمیہ کا جواب صحیح ہے کہ اس مکان کی جگہ مسجد نہ تعمیر کی جائے۔ شریعت کا یہ نہایت کھلا ہوا حکم ہے، اس کے خلاف کوئی حکم نہ دیگا۔

راجہ کے سہس پور سے جو سوال آیا تھا غالباً اس کا یہ مفہوم تھا کہ اس مکان کو مسجد تعمیر کر لیا گیا ہے تو اس کی مسجدیت کو برقرار رکھا جائے یا نہیں، تو اس کا جواب جس کے پورے الفاظ تو محفوظ نہیں لیکن اس کا خلاصہ حکم یہ تھا کہ اس مکان کو ہرگز مسجد نہ بنانا تھا لیکن جب ناواقفی سے اس مکان کی جگہ مسجد تعمیر کر کے اس کو مسجد بنالیا گیا ہے تو اب احترام مسجد کے لحاظ سے اس کی مسجدیت باقی رکھنی چاہیے۔ جواب کی اگر نقل ہوتی تو اس کو بلفظ نقل کر دیا جاتا۔ لیکن میری طرف یہ نسبت غلط ہے کہ میں نے اس میں آئندہ کے لئے یہ حکم دیا کہ اس مکان موقوفہ مسجد تعمیر کر لینا اور متولی کا اس کو مسجد بنادینا جائز ہے۔ وہ فتویٰ جب موجود ہے تو اس کو پڑھ لیا جائے۔ بلاوجہ آپس میں اختلاف پیدا کرنا اور محض اپنی غرض کے ماتحت حکم شرع کو کھلا

طور پر استعمال کرنا شان مسلم کے خلاف ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المختصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدۃ سنہجل

مسئلہ

(۴۹۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس بیان میں کہ

ہمارے یہاں مسجد میں اس جگہ جہاں بیچ گانہ باجماعت نماز امام صاحب پڑھاتے ہیں وہاں مٹی کا تیل کی بق روشن کیجاتی ہے، یہ کیا بتی جلانا مسجد کے لئے جائز ہے یا نہیں۔ کتاب کے حوالے سے مفصل طور پر ازراہ کرم مطلع فرمائیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مٹی کے تیل میں بو ہوتی ہے، اور مسجد کو ہر بدبو کی چیز سے پاک رکھا جائے۔ ردالمحتار میں ہے۔
علة النهی عن حذب ان اكل الثوم والبصل المسجد اذى الملكة واذى المسلمين ولا يختص بمسجده عليه الصلوة والسلام بل الكل سواء لرواية مساجدنا بالجمع خلافا لمن شذوا يلحق بما نص عليه في الحديث كل ماله رائحة كريهة ما كولا او غيره۔

لہذا مسجد میں مٹی کی تیل جلانا ممنوع ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

کتبہ: المختصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدۃ سنہجل

(۴۹۲)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء اہل سنت وجماعت ذیل کے اندر کہ

زید نے عرصہ دو سال گزرے حکومت موجودہ کے جنگل سے کچھ لکڑیاں بلا اجازت ذمہ داران حکومت کے حاصل کر لیا، اور بیشتر لکڑی کا حصہ اپنے مکان کی تعمیر کے اندر صرف کر دیا، کچھ لکڑی مثلاً ایک دروازہ کی تیاری کے لئے مسجد کو دے دیا، بروقت دیئے منتظمین مسجد سے دریافت نہ کیا کہ وہ اس لکڑیوں کو لینے یا نہیں، اور نہ تو منتظمین کو پتہ چلا کہ کیسی لکڑی ہے بلکہ منتظمین حضرات نے یہ جانا کہ زید کی

ملکیت ہے اور زید خانہ خدا میں دیتا ہے۔ اور دروازہ تیار کرایا گیا۔ بعد کو پتہ چلا کہ یہ لکڑی چرا کر بلا اجازت مالک لائی گئی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر مالک لکڑی سے کہا جاوے تو زید کی عزت کو نقصان پہونچے اور سزا پاوے۔ اور ادھر مشکل ہے کہ اثاثہ سے دروازہ تیار کرایا گیا تو کیا یہ ممکن ہے کہ دروازہ کسی غریب محتاج کو دے دیا جاوے۔ اور اس سے بقیہ خرید کر مسجد کے اندر نصب کر دیا جاوے۔ یا کون ہی شکل ایسی ہے کہ وہ دروازہ مسجد کے اندر کام آسکے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجد میں پاک حلال مال لگایا جاسکتا ہے، اور ناپاک حرام خبیث مال چاہے وہ خود خبیث مال اس کا سبب خبیث ہو ایسے مال کا مسجد میں لگانا مکروہ ہے۔

ردالمحتار میں ہے: لو انفق فی ذالک ای المسجد، مالا خبیثا ومالا له سببه الخبیث والطیب فیکره لان الله تعالى لا یقبل الا الطیب فیکره تلویث بیتہ بما لا یقبلہ۔ اور ظاہر ہے کہ جب وہ لکڑی چوری کی ہے اجازت مالک کے بغیر حاصل کی گئی ہے تو وہ خود مال خبیث ہوگئی۔ اور جب اس کو کسی چیز سے بدلہ جائے گا، تو اس کا سبب پھر وہی خبیث قرار پایا جائے گا۔ لہذا اس دروازہ کو ہرگز مسجد میں نصب نہ کیا جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

کتبہ: المقتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۰۳ھ

مسئلہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین

زید نے ایک زمین چھوڑی جس کے ورثہ عبدالحمید، مجید، سعید، شبیر، کلو، قدیر، آل رسول، بابو، کلو، قدیر، آل رسول، بابو، رشید، کنیرا، اکبری، عرصہ دراز سے پاکستان چلے گئے اور وہیں پر مقیم ہیں۔ بقیہ ورثہ یہاں موجود ہیں۔ جس میں عبدالحمید، مجید، شبیر، محمد زادی، بسم اللہ، یہ یہاں موجود ہیں۔

اور اس میں حکم قانون شرعی عبدالحمید، سعید، مجید، گیارہ آنہ کے حقدار ہیں۔ تو اہل محلہ عبدالحمید، سعید، مجید، کو بجائے، گیارہ آنہ کے سات آنہ کو حصہ دینا چاہتے ہیں اور بقیہ زمین شبیر سے مسجد کو لکھا

رہے ہیں۔ تو کیا یہ جائز ہے یا نہیں۔ بغیر اجازت اور ورثہ کے لکھوار ہے ہیں، تو اہل محلہ کو کیا یہ حق حاصل ہے کہ بغیر اجازت ورثہ کے ایک ورثہ سے مسجد شریف کو لکھوا سکتے ہیں، آپکا خادم، حافظ عبدالحمید،

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

ظاہر ہے کہ خط زمین یا کوئی پیسہ بلا اجازت مالک کے ناپاک خبیث مال ہے۔ تو ایسا مال سوائے منظر کے کسی کے لئے جائز نہیں۔ چہ جائیکہ وہ ناپاک و خبیث مال مسجد جیسی پاک چیز کے لئے جائز ہو سکے۔ کہ مسجد میں تو نہایت پاک اور طیب مال صرف کیا جاتا ہے۔ ردالمحتار میں ہے۔ لو انفق مالا خبیثا ومالا سببه الخبیث والطیب فیکره لان الله تعالى لا یقبل الا الطیب فیکره تلویث بیتہ بما لا یقبلہ۔ تو جب یہ زمین بنا بر حصہ شرعی کے عبدالحمید، سعید اور غیرہ کی ملک ہے۔ تو نامسماۃ بشرین، کو اس ملک غیر کو بد کے لکھ دینے کا حق حاصل نہ اہل محلہ کو بغیر اجازت مالکان انکی مملوکہ زمین کے کسی حصہ کا لکھوانا جائز۔ نہ مسجد کے لئے ایسے ناپاک مال کا لکھنا درست۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المقتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۰۳ھ

مسئلہ

(۴۹۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ کے بارے میں کہ

چھوٹی مسجد سیتاپلڈی ناگپور کا اندرونی حصہ ۲-۱-۲ فٹ اور مسجد کا صدر دروازہ جس پر اذان دی جاتی ہے۔ اور مسجد سے ملحق اس کی چار دوکانیں جن کی آمدنی مسجد کے لئے وقف ہے۔ ان سب کو کارپوریشن ناگپور منہدم کرا کے سڑک چوڑی کرنا چاہتی ہے۔ اور اس کے بدلہ میں دوسری زمین کا وعدہ کرتی ہے۔ کیا از روئے شرع شریف مسجد کے کسی حصہ کا توسیع سڑک کے لئے منہدم کرنا اور اس کے بدلے میں دوسری زمین لینا جائز ہے۔ جواب مع حوالہ کتب جلد عنایت فرمائیں کہ نوٹس میں ۳۱ جنوری تک کی مدت ہے۔ حوالہ قرآن کریم کی آیتوں سے بھی ہو تو زیادہ مناسب ہوگا۔ فقط

السائل حاجی عبدالشیر خاں متولی چھوٹی مسجد سیتاپلڈی ناگپور

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجد کے کسی حصہ کا توسیع سڑک کے لئے منہدم ہونا بلاشبہ تخریب مسجد ہے۔ اور تخریب مسجد کی ممانعت خود وحی جلی قرآن کریم میں ہے۔
اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ومن اظلم ممن منع مسجد الله ان يذكر فيها اسمه وسعى في خرابها اولئك ما كان لهم ان يدخلوها الا خائفين ط لهم في الدنيا خزي ولهم في الآخرة عذاب عظيم۔

(سورہ بقرہ ع ۱۲۴ ج ۱)

اس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ کی مسجدوں کو روکے ان میں نام خدا لئے جانے سے اور ان کی تخریب میں کوشش کرے۔ ان کو نہیں پہونچتا تھا کہ مسجدوں میں جائیں مگر ڈرتے ہوئے ان کے لئے دنیا میں رسوائی اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے۔
تفسیر احمدی میں اس آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں:

المقصود من ذكر الآية انها تدل على ان هدم المساجد وتخریبها ممنوع۔

(تفسیرات احمدیہ مطبوعہ برقی پریس دہلی ج ۱ ص ۳)

مقصود اس آیت کے ذکر کا یہ ہے کہ آیت نے اس بات پر دلالت کی کہ مسجدوں کا گرانا اور ان کی تخریب کرنی ممنوع ہے۔

اس آیت اور اس کی تفسیر سے ثابت ہو گیا کہ مسجد کا انہدام و تخریب ممنوع و ناجائز ہے۔ اور مسجد کا انہدام و تخریب کرنے والا ظالم اور خدا سے نڈر شخص ہے اور وہ دنیا میں رسوائی کی سزا اور آخرت میں عذاب عظیم کا مستحق ہے۔ پھر مسجد کا انہدام و تخریب بھی کس حقیر و دنی چیز کے لئے عام راستہ اور سڑک کے لئے جس کو ہمارے نبی کریم ﷺ نے علامت قیامت قرار دیکر اس کی برائی و مذمت۔ اور قیامت و ممانعت کی طرف تنبیہ کی چنانچہ وحی خفی یعنی حدیث نبوی شریف میں وارد ہے جس کو طبرانی حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من اقترب الساعة ان تتخذ المساجد طرقا۔ (جامع صغیر۔ ج ۲ ص ۱۳۸)

علامات قرب قیامت سے یہ ہے کہ مسجدوں کو راستے اور سڑک بنایا جائے گا۔

دیکھو مسجد کو راستہ اور سڑک بنانے کی مذمت و ممانعت خود شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث سے بھی ثابت ہو گئی۔ تو جب قرآن و حدیث جیسے اصول سے مسجد کو راستہ اور سڑک بنانے کی ممانعت

ثابت ہو گئی تو اب کسی فقہ کی کتاب پیش کرنے کی حاجت باقی نہیں رہی مگر چونکہ سوال میں مسجد کے دروازہ اور ملحقہ دوکانوں کا ذکر بھی ہے تو شرعاً و عرفاً دروازہ و ملحقہ دوکانات احاطہ مسجد سے علیحدہ نہیں بلکہ یہ دونوں اتصال مسجد کی بنا پر شرعاً و عرفاً داخل ہیں۔

چنانچہ فتاویٰ قاضی خاں و فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

يصح الاقتداء لمن قام على الدكاكين التي تكون على باب المسجد لا نهامن فناء المسجد متصلة بالمسجد كذا في قاضی خاں۔ (عالمگیری ج ۱ ص ۵۷)

اقتداء اس شخص کی بھی صحیح ہے جو ان دوکانوں پر کھڑا ہو جو دروازہ مسجد پر ہیں کیونکہ وہ دوکانیں مسجد سے متصل ہونے کی بنا پر فناء مسجد میں ہیں۔

اس عبارت سے ثابت ہوا کہ اتصال مسجد کی بنا پر مسجد کا دروازہ اس کی ملحقہ دوکانات فناء مسجد قرار پائیں اور یہ طے شدہ قول ہے کہ مسجد کے لئے جو حکم ہے وہی حکم فناء مسجد کا ہے۔

چنانچہ اسی فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

فناء المسجد له حكم المسجد۔ (عالمگیری ج ۱ ص ۵۷)

تو جب مسجد کو راستہ و سڑک بنانا ممنوع و ناجائز ہے تو اب فناء مسجد یعنی دروازہ مسجد اور اس کی ملحقہ دوکانات کا بھی راستہ اور سڑک بنانا ممنوع و ناجائز ثابت ہوا۔ لہذا کسی متولی یا اہل محلہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مسجد کے صحن یا دروازہ یا ملحقہ دوکانات کو راستہ اور سڑک بنانے کے لئے دیں۔ اور اسکے بدلے میں کسی دوسری زمین کو لیں۔

اسی فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ان ارادوا ان يجعلوا شيئا من المسجد طريقا للمسلمين

فقد قيل ليس لهم ذلك وانه صحيح كذا في المحيط۔ (عالمگیری قیومی کا پیور ج ۲ ص ۳۴۷)

اگر قوم یہ ارادہ کرے کہ مسجد کے کسی حصہ کو مسلمانوں کے لئے راستہ بنادیں تو حکم دیا گیا کہ انہیں اس بات کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہی قول صحیح ہے اسی طرح محیط میں ہے۔

حاصل جواب یہ ہے کہ متولی یا اہل محلہ دروازہ مسجد یا اس کی ملحقہ دوکانات کو یا مسجد یا فناء مسجد کے کسی حصہ کو ہرگز ہرگز راستہ اور سڑک کی توسیع کے لئے نہ دیں۔ نہ مسجد کی اس موقوفہ زمین سے کسی

دوسری زمین کا تبادلہ کر سکیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۲۸ جمادی الاخریٰ ۱۳۷۸ھ

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ مسجد کلاں محلہ موانی شہر فتحپور عرصہ تخمیناً دو تین سو سال کی تعمیر ہے اور اسی وقت سے منبر جس پر جمعہ یا عیدین کے پیش امام صاحب کھڑے ہو کر خطبہ پڑھتے ہیں منبر محراب کے باہر جانب شمال تعمیر ہے اور اسی زمانہ سے اب تک اسی منبر پر پیش امام صاحب کھڑے ہو کر خطبہ پڑھتے چلے آئے ہیں اور اب اسی سابق منبر سے ملا کر محراب کے اندر جدید منبر اور بنا کر شامل کر دیا گیا ہے اور اب اسی جدید منبر پر کھڑے ہو کر محراب کے اندر پیش امام صاحب کھڑے ہو کر خطبہ پڑھتے ہیں مطلع فرمائیے کہ جبکہ ایک منبر سابق محراب کے باہر بنا ہوا تھا اور ہے تو دوسرا جدید منبر محراب کے اندر بنانا سنت ہے یا نہیں لہذا جو امر مسنون ہو اسی سے از روئے حدیث وفقہ آگاہ کیا جاوے۔

المرقوم ۳۰ مارچ ۱۹۵۹ء سلامت اللہ خاں ولد عبد الکریم خاں ساکن محلہ موانی شہر فتحپور

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

منبر کا باہر دہنی طرف ہونا سنت ہے۔ چنانچہ طحاوی میں ہے:

وذکر البدر العینی فی شرح البخاری ان من السنة اتخاذ المنبر عن یمین المحراب، تو سابق منبر جب محراب کے باہر جانب شمال میں تھا تو وہ سنت کے موافق تھا۔ اس کو بلا حاجت شرعی کے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ ہاں اگر اس کے چھوڑ دینے میں کوئی مقصد صحیح ہو مثلاً (۱) سابق ستون کے مقابل تھا۔ خطبہ کی اذان خارج مسجد میں کہنے میں ستون مانع ہوتا تھا اور خطیب کا صحیح طور پر مقابلہ نہیں ہوتا تھا اس لئے محراب کے اندر جدید منبر بنایا گیا ہے۔

(۲) یا اسکی سیڑھیاں اتنی جگہ گھیر رہی تھیں کہ اس سے صف کی کمی ہو رہی تھی اور اس کے جدا کرنے سے مزید ایک صف کا اضافہ ہو جائے گا اور جمعہ وعیدین میں نمازیوں کی کثرت کی بنا پر اس کے علیحدہ کرنے کی ضرورت تھی تو محراب میں منبر بنا کر ایک صف کی جگہ اور نکل آتی۔

(۳) یا منبر بہت بڑا ہے اور مسجد تنگ ہے تو ایسا منبر خود مکر وہ ہے۔

اسی طحاوی میں ہے: ویکرہ المنبر الكبير جدا اذا لم یکن المسجد متسعاً۔

تو اگر ان امور میں سے کوئی بات ہو تو اس جدید منبر کا محراب میں بنالینا صحیح ہے۔ واللہ تعالیٰ

کتبہ: المختصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسائل ذیل میں۔

زید کہتا ہے مسجد کے اندر درود شریف اور مولود شریف پڑھنا حرام و ناجائز ہے اور بکر کہتا ہے مسجد کے اندر درود شریف پڑھنا جائز و ثواب ہے۔ مسائل کیا کہتے ہیں مدلل جواب سے مشکور و ممنون فرمائیے
الساکن ادریس حسین

لفظ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجد اعمال آخرت ہی کے لئے بنائی جاتی ہے۔

چنانچہ علامہ حلبی کبیری میں فرماتے ہیں: ان المساجد بنیت لاعمال الاخرة۔

(کبیری ص ۵۶۷)

اور درود شریف اعمال آخرت میں سے ہے جس کی نہایت روشن دلیل یہ ہے کہ وہ نماز جس کی جماعت مساجد میں قائم کی جاتی ہے۔ یہ درود شریف اس نماز میں داخل ہے۔ تو اگر یہ درود شریف عمل آخرت نہ ہوتا تو نماز جیسے عمل آخرت میں ہرگز داخل نہ ہوتا۔ درود شریف کو عمل دنیا کون کہہ سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

ان الله وملتفكته يصلون على النبي يا ايها الذين امنوا صلوا عليه وسلموا تسليماً۔

بیشک اللہ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں نبی پر اے ایمان والو! ان پر درود اور خوب سلام بھیجو۔

اس آیه کریمہ سے ثابت ہو گیا کہ درود شریف وہ ہے جس کا حکم اللہ تعالیٰ کس قدر تاکید سے دیتا

ہے اور اس درود شریف کو خود اپنا اور اپنے مقربین فرشتوں کا عمل بتاتا ہے۔ تو پھر اس درود شریف کو کون عمل

دنیا کہہ سکتا ہے۔ لہذا جب درود شریف کا عمل آخرت سے ہونا خود قرآن شریف سے ثابت ہو گیا تو جو

مساجد اعمال آخرت کے لئے بنائی گئی ہیں ان میں اس درود شریف کا پڑھنا کس طرح حرام و ناجائز ہو سکتا

ہے۔ اور جو اس کو حرام کہتا ہے وہ فضیلت درود سے جاہل۔ اور اس کے محبوب خدا ہونے سے جاہل اور اس

کے حکم قرآنی ہونے سے جاہل۔ اور اس کے عمل آخرت ہونے سے جاہل۔ اور مسجد کی بنا کی غرض سے جاہل۔ اس کو جلد از جلد توبہ کرنی چاہئے۔ کہ وہ درود شریف جیسی محبوب چیز سے عداوت و دشمنی رکھتا ہے۔ اسی طرح ذکر مولود شریف یقیناً ذکر رسول ﷺ اور ذکر رسول بلاشبہ ذکر الہی ہے کہ حدیث قدسی میں ہے۔ قاضی عیاض نے شفا شریف میں ان الفاظ میں روایت کیا۔

جعلتک ذکر امن ذکرى فمن ذکرک ذکرنى۔

یعنی اللہ فرماتا ہے کہ اے رسول میں نے تمہیں اپنا ذکر بنا دیا ہے جس نے تمہارا ذکر کیا اس نے میرا ذکر کیا۔ تو جس نے ذکر مولود کو حرام و ناجائز کہا تو اس نے ذکر خدا اور رسول کو حرام و ناجائز قرار دیا۔ اور اس کو کوئی مسلمان تو کہہ نہیں سکتا۔

بخاری و مسلم وغیرہ کی احادیث میں وارد ہے کہ خود نبی کریم ﷺ حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے مسجد نبوی شریف میں منبر رکھواتے تھے اور وہ اس پر کھڑے ہو کر حضور کے فضائل کا ذکر کرتے تھے تو ذکر رسول کا مسجد میں ہونا خود فعل رسول ﷺ سے ثابت ہے۔ اور یہ ذکر رسول کو مسجد میں حرام و ناجائز کہتا ہے۔ ذکر رسول تو قرآن میں مذکور۔ احادیث میں مذکور۔ نماز میں مذکور۔ خطبہ میں مذکور۔ اذان میں مذکور۔ تو یہ مسجد میں قرآن و حدیث پڑھنے کو بھی ناجائز و حرام قرار دیگا۔ نماز و خطبہ کو بھی ناجائز و حرام ٹھہرائے گا۔ تو ذکر مولود کی مخالفت میں قرآن کی مخالفت۔ حدیث کی مخالفت۔ کس قدر دینی احکام کی مخالفت لازم آرہی ہے۔ لہذا یہ شخص جلد توبہ کرے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۵ شوال المکرم ۱۳۷۸ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۸ھ

اللہ



سجود التلاوة

مسئلہ

(۴۹۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین ان مسائل مفصلہ ذیل میں۔ مگر یہ عرض ہے کہ بحوالہ کتب فقہیہ و احادیث نبویہ جوابات مرحمت ہوں بلکہ سطر و صفحہ کا بھی حوالہ ہو تو بہتر ہے مع ترجمہ اردو کے۔ آپ کا نیاز مند ممتاز علی محافظ دفتر میونسپل سنبھلی

اول: تمام کلام مجید میں جو سجدے ۱۲ یا ۱۵ واجب ہیں۔ ان سجدے تلاوت واجب کا ماہ رمضان شریف میں حفاظ کو نماز تراویح میں فوراً ادا کرنا اولیٰ و افضل ہے یا نہیں؟
دوم: ان سجدوں کے فوراً ادا کرنے کا کچھ ثواب بھی ملتا ہے یا نہیں؟
سوم: ان سجدوں کے نہ کرنے کا کچھ عذاب بھی ملے گا یا نہیں؟
چہارم: اگر کسی امام صاحب نے برعکس اس کے جملہ سجدوں میں سے مع مقتدیوں ایک بھی سجدہ تلاوت فوراً ادا نہ کیا ہو تو ان کا بروز حساب کیا نتیجہ ہوگا؟

پنجم: ادا نیگی تمام سجدوں کی کس طرح ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جناب مولوی صاحب دریافت پر ایسا فرماتے ہیں کہ درمیان نماز تراویح آیت سجدہ ختم ہونے پر امام نیت ادا نیگی سجدہ قبل رکوع یا درمیان رکوع کر لے تو ادا نیگی سجدہ ہو جاتی ہے؟ پس ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ درمیان نماز جب کہ دو رکعت نماز تراویح کی نیت امام نے باندھ لی ہو اس درمیان میں خواہ قبل از رکوع یا درمیان رکوع نیت ادا نیگی سجدہ مکرر یعنی بحالت نیت تراویح کے امام صاحب کریں تو کچھ نقص نماز میں پیدا ہوگا یا نہیں؟ اور مقتدیوں کو اس کا علم کس طرح ہوگا؟ اور فوراً سجدہ کر لینے پر جس قدر ثواب ملنے کا مستحق ہوتا وہ اس طرح کرنے پر ثواب کا مستحق ہوگا یا نہیں؟

بعدہ مقتدیوں کو علم ادا نیگی سجدہ تلاوت نہ ہو تب بھی سجدہ تلاوت کلام مجید ادا ہو جائے گا یا نہیں؟

اسی طرح تمام کلام مجید ختم ہو جائے اور ایک بھی سجدہ فوراً ادا نہ کیا جائے بلکہ مقتدیوں کی تعداد ابھی صرف ۸ یا ۱۰ تک روزانہ ہوتی ہو، گویا مسجد میں ایک پوری جماعت بھی نہ ہو ایسی صورت میں کیا سجدے بطریق مذکورہ ادا ہو جائیں گے یا نہیں؟ اور کن مجبوریوں پر ان سجدوں کی ادائیگی بشمول رکوع و دونوں سجدوں نماز کے سجدہ تلاوت کلام مجید ادا ہو جائیگی اور کچھ ثواب بھی حاصل ہوگا یا نہیں؟۔ یا صرف بار سجدوں کا اتر جائے گا۔

ششم: اولاً طریقہ سجدہ تلاوت کلام مجید کیا ہے؟ اور ان دونوں طریقوں میں سے کس طریقہ میں زیادہ ثواب ملتا ہے؟۔

ہفتم: مقتدیوں کو یہ بھی نہ بتلایا جائے کہ امام نے نیت ادائیگی سجدہ تلاوت کلام مجید بشمول دو رکعت نماز تراویح کر لی ہے یا نہیں بلکہ امام صاحب اس قدر جلدی رکوع و سجدوں میں نماز کے خود کرتے ہوں کہ پورے طریقہ پر مقتدی ارکان و رکوع و سجدوں کے ادا بھی نہ کر چکے ہوں اور امام صاحب ارکان رکوع و سجدوں سے فراغ حاصل کر لیں۔ پھر کس طرح یہ باور کر لیا جاسکتا ہے کہ امام صاب نے نیت ادائیگی سجدہ تلاوت کلام مجید بھی کر لی تھی یا نہیں۔ البتہ امام صاحب فوراً سجدہ تلاوت کلام مجید کر لیتے تو اس کی ادائیگی کا اظہار آسانی سے ہو جاتا۔ یا امام صاحب بالغ ہوتے تب بھی مان لینے کے قابل ہوتا کہ نیت ادائیگی سجدہ کر لی ہوگی۔ پھر بھی شبہ والی بات تھی۔ اور شبہ جس ارادہ میں پیدا ہو وہ کس قدر نقص نماز میں پیدا کرتا ہے۔ الا ایسی حالت میں کس طرح مان لیا جاوے کہ حافظ صاحب نے ضرور نیت ادائیگی سجدہ تلاوت کلام مجید کر لی ہوگی۔ جن کی عمر بھی اس وقت ۱۴ سال سے کم ہو۔ پس ایسی صورتوں میں حافظ صاحب کے سر پرست والد صاحب جو ایک مشہور عالموں میں کہلائے جاتے ہوں تو یا جنہوں نے شروع رمضان شریف سے ختم کلام مجید عشاء کی نماز فرض کی پیش امامی بھی کی ہو اور ان کے ہی صاحب زادہ نے کلام مجید تراویح میں سنایا ہو۔ وہ صاحب ایسا فرماتے ہیں کہ تلاوت کلام مجید کے بحالت نیت امام قتل رکوع یا درمیان رکوع کر لینے پر سجدے واجب تلاوت کلام مجید ادا ہو جاتے ہیں اور دریافت پر حوالہ ادائیگی سجدوں کا کتاب بہشتی گو ہر حصہ یازدہم بہشتی زیور صفحہ ۸۳ متعلقہ بیان سجدہ تلاوت نظیر میں پیش کرتے ہیں۔ اور یہ کتاب مولوی اشرف علی تھانوی مقام تھانہ بھون کی تصنیف شدہ ہے اور اس میں درمختار اور المختار کا حوالہ دیا ہے۔

ہشتم: یہ فعل مولوی صاحب کا کس حد تک جائز و ناجائز ہے؟ کہ انھوں نے باوجود مولوی ہونے اور عالم ہونے کے اس قدر معلومیت پر بھی قصد اتمام کلام مجید کے فوراً سجدے ادا نہ کئے اور نہ کراے۔ بلکہ جو ثوابات فوری سجدے کرنے پر ملتے ان کو ترک کی اور کرایا گیا یا نہیں؟ اور مقتدیوں کو ایسے متبرک ماہ رمضان شریف میں جب کہ ایک سال بعد بہ تندرستی حیات مستعار نصیب ہوتا ہے اس نعمت مترقبہ ثوابات سے محروم رکھا یا نہیں؟ اور اس ترک کئے ثوابات کا ان پر کچھ بار ہوا یا نہیں کیا رعایت پسری شرع کے معاملہ میں ان کے کچھ ادائیگی یا نہیں۔

نہم: اب فرض نماز کی ادائیگی میں مولوی صاب کا یہ فعل کہ شروع الحمد شریف کرنے کے درمیان میں رحیم پر سانس کا توڑنا اور بجائے ”ایاک نعبد“ کے ”ایاک نعبد“ بلا تشدید کے پڑھنا اور ”مستقیم“ پر سانس کا توڑنا یا ”مستقیم میم“ یعنی دو میم میں ایک میم ادا کرنا اور ”غیر المغضوب“ کی بجائے ”غیر المغضوبی“ پڑھنا اور ”ولا الضالین“ کی بجائے ”ولا الضالین“ پڑھنا اور سلام پھیرتے وقت سلام میں ”اسلام و علیکم ورحمة اللہ“ پڑھنا۔ آیا صحیح ہے یا غلط؟ اگر غلط ہے تو جرم خداوندی بہ احادیث نبویہ و کتب فقہیہ کیا ہوگا؟ اور فرض کی ادائیگی ہوئی یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

اول: مصلیٰ نے جب چودہ سجدہ تلاوت سے کوئی آیت نماز میں تلاوت کی تو اس کے لئے فوراً سجدہ کرنا واجب ہے۔ چنانچہ مراقی الفلاح کے صفحہ ۷۷ میں ہے: وصفتها الوجوب علی الفور فی الصلاة۔ یعنی سجدہ تلاوت کی صفت نماز میں علی الفور واجب ہوتا ہے۔

شامی جلد اول کے صفحہ ۵۴۰ میں ہے: فان كانت صلوتیة فعلى الفور۔

یعنی اگر سجدہ تلاوت نماز میں بسبب قرأت کے واجب ہوا ہو تو اس کا حکم فوراً ادا کرنا ہے۔

دوم و سوم و چہارم: سجدہ کے فوراً ادا کرنے میں یقیناً ثواب ہوگا اور تاخیر میں گناہ۔

طحاوی صفحہ ۲۷۸ میں ہے: حتی لو اطال التلاوة تصیر قضاء ویاثم فیکره تحریماً تاخیر الصلوٰۃ عن وقت القراءة۔

درمختار میں ہے: ویاثم بتاخیرھا۔

خلاصہ مطلب ان عبارات کا یہ ہے کہ سجدہ صلوٰۃ میں تاخیر کرنا مکروہ تحریمی ہے یہاں تک کہ اگر

تلاوت کو طویل کر دیا تو وہ سجدہ قضا ہو جائے گا اور وہ شخص گنہگار ہوگا۔ لہذا اگر مصلیٰ نے آیت سجدہ کے بعد چار آیتیں اور تلاوت کیں تو فوراً منقطع ہو جائے گا۔

چنانچہ کبیری کے صفحہ ۴۷۲/۴ میں ہے: فان قرء بعدها اربع آیات انقطع للفور بلا خلاف۔ شامی جلد اول کے صفحہ ۵۴۰/۵ میں ہے: ثم تفسیر الفوری هدم طول المدة بين التلاوة والسجدة بقرأة اكثر من آيتين او ثلث۔ یعنی سجدہ تلاوت کے فوراً ادا کرنے کا یہ مطلب ہے کہ اس سجدہ اور تلاوت کے درمیان دو یا تین آیتوں سے زائد کا فاصلہ نہ ہو۔

اب ان عبارات سے واضح ہو گیا کہ سجدہ تلاوت کو فوراً ادا کیا جائے اور اگر اس آیت سجدہ کے بعد دو یا تین آیات سے زیادہ تلاوت کر لیں تو یہ سجدہ قضا ہو گیا اور اب اس سجدہ کا ادا کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ اور وہ شخص گنہگار ہوا۔ اب اگر وہ امام ہے اور اس نے قصداً ایسی حرکت کی تو اس نے نہ فقط اپنا گناہ بلکہ تمام مقتدیوں کا گناہ اپنے ذمہ لے لیا۔

پنجم و ششم: سجدہ تلاوت کی اگر رکوع یا سجدہ میں نیت کی جائے تو ادا ہو جاتا ہے لیکن اس آیت سجدہ اور اس رکوع سجدہ میں دو آیتوں سے زیادہ آیات کا فاصلہ نہ ہو۔ چنانچہ درمختار کے صفحہ ۵۴۱/۵ میں ہے: تو دی (برکوع صلوٰۃ) اذ كان الركوع (على الفور من قراءة آية) او آيتين۔ یعنی سجدہ تلاوت نماز کے رکوع میں ادا ہو جاتا ہے جب رکوع فوراً ایک یا دو آیات کے بعد کر لیا جائے۔

کبیری کے صفحہ ۴۷۲/۴ میں ہے اسی مسئلہ کو لکھ کر فرماتے ہیں: يشترط نيتها ايضا ويشترط في ذلك كله ان لا ينقطع الفور بل يكون الركوع والسجود عقيب تلاوتها او بعد آية او آيتين۔ یعنی سجدہ تلاوت کے رکوع یا سجدہ میں ادا ہونے کے لئے نیت شرط ہے اور یہ بھی شرط ہے کہ فوراً منقطع نہ ہوا ہو۔ بلکہ رکوع یا سجدہ اس آیت سجدہ کی تلاوت کے ایک یا دو آیت کے بعد کر لیا جائے۔

خلاصہ کلام کا یہ ہے کہ فقہائے کرام نے سجدہ تلاوت کے رکوع یا سجدہ میں ادا ہونے کی یہی شرط لکھی ہیں جو ان عبارات سے ظاہر ہوئیں۔ لیکن اگر آیت سجدہ کے بعد تین آیات پڑھ کر رکوع یا سجدہ میں نیت ادا کی گئی سجدہ تلاوت کی جائے گی تو وہ سجدہ تلاوت ادا نہ ہوگا اور اس سجدہ تلاوت کے لئے اب مستقل سجدہ کرنا لازم ہوگا۔

چنانچہ شامی جلد اول کے صفحہ ۵۴۱/۵ میں ہے فلو انقطع الفور لا بد لها من سجود خاص۔

یعنی اگر فوراً منقطع ہو گیا تو اس کے لئے سجدہ خاص ضروری ہے۔ بالجملة حقیقت سجدہ تلاوت کی یہی ہے کہ اس کے لئے ایک مستقل سجدہ کیا جائے۔ اگر چہ رکوع یا سجدہ میں نیت کرنے سے وہ ادا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مراقی الفلاح کے صفحہ ۱۸۱/۱ میں ہے: (وتؤدى برکوع او سجود) کائنین (فی الصلوٰۃ غیر رکوع الصلوٰۃ) (سجود ہا) والسجود افضل۔

شامی جلد اول کے صفحہ ۵۴۱/۵ میں ہے: والا صل فی ادائها السجود وهو الافضل۔ خلاصہ مطلب ان عبارات کا یہ ہے کہ سجدہ تلاوت نماز کے رکوع سجدہ میں ادا ہو جاتا ہے، اور اصل اس کی ادائیگی میں سجدہ ہی ہے اور یہی افضل ہے۔

بالجملة رکوع یا سجدہ میں نیت کرنے سے وہ ادا ہو جاتا ہے۔ اور سجدہ میں نیت کرنا رکوع سے افضل ہے۔ لیکن کتب فقہیہ پر غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لئے مستقل سجدہ کرنا اولیٰ و افضل ہے۔

ہفتم و ہشتم: جواب پنجم و ششم سے یہ تو ظاہر ہو چکا کہ رکوع یا سجدہ میں اگر سجدہ تلاوت کی نیت کی جائے تو وہ ادا ہو جاتا ہے لیکن اگر کسی مقتدی نے اپنے رکوع میں سجدہ تلاوت ادا ہونے کی نیت نہیں کی اور امام نیت کر چکا ہے تو امام کا نیت کرنا اس مقتدی کے لئے کافی نہیں ہے۔ چنانچہ طحاوی کے صفحہ ۲۸۹/۲ پر ہے: ولو لم ينوها المؤتم لم يحزه۔

یعنی اگر اس سجدہ تلاوت کی مقتدی نے نیت نہیں کی تو مقتدی کو امام کی نیت کافی نہیں ہے۔ درمختار کے صفحہ ۵۴۲/۵ پر ہے: ولو نواها فی رکوعه ولم ينوها المؤتم لم يحزه۔ یعنی اگر امام نے سجدہ تلاوت کی اپنے رکوع میں نیت کی اور مقتدی نے نیت نہیں کی تو یہ مقتدی کے لئے کافی نہیں ہے۔

فقہائے کرام اس مقتدی کے لئے یہ طریقہ تحریر فرماتے ہیں۔ طحاوی میں ہے: ويسجد اذا سلم مع الامام ويعيد القعدة۔ درمختار میں ہے: فلو لم ينو المقتدى لا ينوب على راي فيسجد بعد سلام الامام ويعيد القعدة الاخيرة۔

خلاصہ مطلب ان عبارات کا یہ ہے کہ اگر امام نے رکوع یا سجدہ میں سجدہ تلاوت کی نیت کی اور

مقتدی نے نہیں کی تو امام کا نیت کرنا مقتدی کی لئے قائم مقام نہ ہوگا اور مقتدی امام کے سلام پھیرنے کے بعد سجدہ تلاوت کرے اور اس کے بعد قعدہ کرے۔

خلاصہ ان جوابات کا یہ ہے کہ سجدہ تلاوت شروط مندرجہ فی السؤال کو مد نظر رکھتے ہوئے رکوع یا سجدہ میں ادا ہو جاتا ہے پھر اگر امام نے اپنی نیت کا مقتدیوں میں اظہار نہیں کیا ہے تو اس کا بار امام ہی کی گردن پر ہے اور مقتدیوں کو ترک سجدہ پر استغفار کرنا چاہئے۔ لیکن امام کی نیت ظاہر کرنے کے بعد پھر شبہ کو کوئی دخل نہیں۔

اب رہا امام کا نابالغ ہونا تو نابالغ کی امامت ہی مکروہ ہے۔ کتاب بہشتی زیور اغلاط کا مجموعہ ہے۔ اگرچہ اس میں یہ اور متعدد مسائل صحیح بھی نکل آئیں۔ لہذا مسلمانوں کو اس کتاب سے پرہیز کرنا بہت ضروری ہے۔

نہم: سورہ فاتحہ میں بالاتفاق سات آیات ہیں لہذا ”رحیم و مستقیم“ پر وقف کرنا صحیح ہے۔ اور ”ایاک“ کو بلا تشدید پڑھنا ہماری قرأت کے ضرور خلاف ہے لیکن مفسد صلاۃ نہیں۔ اور ”غیر المغضوب“ میں ”ضاد“ کی جگہ ”طا“ پڑھنا نماز کو فاسد کر دیتا ہے۔

چنانچہ کبیری صفحہ ۴۴۸ میں ہے:

اما اذا قراء مكان الذال المعجمة طاء معجمة او الطاء المعجمة مكان الضاد المعجمة او على القلب۔ مثال الاول ما لو قرء تلظ الاعين مكان تلذ ومما ظرء مكان ذرء۔ ومثال الثانى المغضوب مكان المغضوب۔ ومثال الثالث ظعف الحيوۃ مكان ضعف الحيوۃ۔ فتفسد صلوۃ وعليه اى على القول بالفساد اكثر الائمة۔

خلاصہ مطلب ان عبارات کا ہمارے مسئلہ کے متعلق یہ ہے کہ اگر کسی نے ”ظا“ کی ”ضاد“ یا ”ضاد“ کی جگہ ”ظا“ پڑھا۔ مثلاً ”مغضوب“ کی جگہ ”مغضوب“ تو اکثر ائمہ کے نزدیک اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔

نیز محیط برہانی میں ہے: سئل الامام الفضلی عن يقرأ الطاء المعجمة مكان الضاد المعجمة او على العكس فقال لا تجوز امامته۔

یعنی امام فضلی سے اس شخص کا حکم دریافت کیا گیا جو ”ضاد“ کی جگہ ”ظا“ یا ”ظا“ کی جگہ ”ضاد“ پڑھتا ہے۔ فرمایا: اس کی امامت ناجائز ہے۔

اور اسی طرح عالمگیری وغیرہ کتب فقہیہ میں مذکور ہے۔

آخر میں عرض کرتا ہوں کہ سائل کے سوالات کے تو یہ جوابات ہیں لیکن ان سوالات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مولانا جن کا تذکرہ سوالات میں کیا گیا ہے غیر مقلد معلوم ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ بظاہر خفیت کا جامہ پہنے ہوئے ہوں۔ اس لئے ”ضاد“ کو ”ظا“ پڑھنا۔ اور آئے دن اس قسم کے مسلمانوں میں نئے نئے فسادات پیدا کرنا انھیں غیر مقلدوں کے رات دن کے کرشمے ہیں۔ لہذا مسلمانوں کو ایسے امام کے اس ظاہری جامہ خفیت کے لباس پر دھوکہ نہ کھانا چاہئے اور ایسے امام کی اقتدا سے پرہیز کرنا لازم ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

(۴۹۸)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین مسائل مندرجہ ذیل میں
نماز کے علاوہ اگر کوئی شخص لاؤڈ اسپیکر میں آیت سجدہ تلاوت کرے تو سامعین پر سجدہ تلاوت واجب ہے یا نہیں؟

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم
لاؤڈ اسپیکر کیا عمل کرتا ہے اس کی تحقیق ضروری ہے۔ لہذا اگر اس کی وساطت سے قرع اول ہی نفل ہوتا ہوا پہونچا تو وجوب سجدہ میں شک ہی نہیں۔ اور اگر آلہ نے اعادہ کیا جیسا کہ گرامفون میں ہوتا ہے تو سجدہ واجب نہیں کما حقہ ہو حکم الصدی۔

تنویر الابصار میں ہے: لاتجب بسماعه من الصدی۔ (شامی ج ۱ ص ۵۴)
مرآۃ الفلاح میں ہے: لاتجب بسماعها من الصدی وما هو یجبک مثل صوتک فی الجبال والصحاری ونحوها۔ (طحاوی ص ۲۸۱)

طحاوی علی مرآۃ الفلاح میں ہے: فانه لا اجابة فی الصدی وانما هو محاكاة۔ (طحاوی ص ۲۸۱)

غنیۃ شرح منیہ میں ہے: ولو سمعها من الطائر والصدی لاتجب لانه محاكاة وليس بقراءة۔ (غنیۃ ص ۴۶۸) واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

(۳۲)

بَابُ الدُّعَاءِ

مسئلہ

(२११)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک امام صاحب ہر فرض نماز کے بعد دعا مانگتے ہیں مگر سنت اور نفل کے بعد دعا مانگنے کو منع کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سنت اور نفل کے بعد دعا نہیں مانگی ہے۔ کہیں اس کا ثبوت بھی نہیں ملتا۔ لہذا برائے کرم سنت اور نفل ادا کرنے کے بعد دعا مانگنے کا ثبوت احادیث و فقہ سے تحریر فرمائیں اور ساتھ ہی معیار سنیت تحریر فرمائیں کہ عوام کو معلوم ہو جائے کہ مذکور امام صاحب کے پیچھے نماز جائز ہے یا نہیں؟۔ بینوا تو مجروا۔ ۲۳ محرم الحرام ۱۳۵۵ھ

المستفتی غلام نظام الدین قادری برکاتی عفی عنہ
کھارواڑ متصل بالا پیر علیہ الرحمۃ - سورت

الجواب

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم۔

جن فرض نمازوں کے بعد سنن و نوافل ہیں ان فرائض کے بعد صرف وہ دعا مانگ کر جو حدیث شریف میں مروی ہے سنن و نوافل کو فرائض سے متصل کر دینا چاہئے۔
مراقی الفلاح میں ہے۔

كل صلاة بعدها سنة يكره القعود بعدها والدعاء بل يشتغل بالسنة كي لا يفصل بين السنة والمكتوبة. وعن عائشة ان النبي صلى الله تعالى عليه وسلم كان يقعد مقلدا ما يقول: اللهم انت السلام الخ كما تقدم فلا يزيد عليه او على قدره -

ہر نماز جس کے بعد سنت ہو تو اس کے بعد دعا اور بیٹھنا مکروہ تفریحی ہے بلکہ سنت پڑھنے میں مشغول ہو جائے تاکہ سنت اور فرض میں فصل نہ ہو۔ اور حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مقدار۔ اللّٰهُمَّ اِنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ

والبك يرجع السلام تباركت يا ذا الجلال والاكرام۔ پڑھنے کے بیٹھے تھے۔

تو اس پر یا اس مقدار پر زیادہ نہ کرے۔ لہذا اب اس حدیث اور عبارات فقہ کی بنا پر ظہر اور مغرب اور عشاء کی نمازوں میں اور ادیا طویل دعا بعد سنت و نفل ہونی چاہئے کہ سنت کا فرض سے متصل کرنا مستحق ہے۔

نور الايضاح میں ہے: القیام الی السنۃ متصلاً بالفرض مسنون۔

یعنی فرض سے سنت کی طرف متصل کھڑا ہونا مسنون ہے۔

تو سنن و نوافل سے بعد دعا کا انکار سخت جہالت ہے۔

اولاً: یہ دعا جو سنن ونوافل کے بعد کی جائے گی وہ حقیقہً فرض ہی کے بعد ہے۔

شامی میں ہے: اماما ورد من الاحادیث فی الاذکار عقیب الصلوة فلا دلالة فیہ علی

الاثنيان بها قبل السنة بل يحمل على اثنيان بها بعدها - لان السنة من لواحق الفريضة وتوابعها ومكملاتها فلم تكن احببها عنها فما يفعل بعدها يطلق عليه انه عقيب الفريضة -

مراقی الفلاح میں ہے: لایقتضی وصلہا بالفرض بل کونها عقیب السنۃ۔

خلاصہ مضمون ان عبارات کا یہ ہے کہ احادیث میں جن اذکار و ادعیہ کا بعد فرض نماز پڑھنا وارد ہوا تو ان کو قبل سنت پڑھنے پر کوئی دلالت نہیں اور ان کو فرض سے ملانے کا حکم نہیں بلکہ ان کا پڑھنا بالبعد سنت پر محمول ہے۔ اس لئے کہ سنت فرض کے توابع اور لواحق اور مکملات سے ہے تو سنت فرض سے اجنبی نہیں ہوئی۔ پس یہ ذکر و دعا سنت کے بعد کیا جائے گا اس پر یہی اطلاق کیا جائے گا کہ وہ بعد فرض ہے۔

ثانیا: دعا کو فرض کے ساتھ خاص کر دینا۔ یا کسی وقت کے ساتھ ایسا معین کر دینا کہ اس کے سوا اور کسی وقت میں منع کرے یہ خود مکروہ و ممنوع ہے۔

ثالثاً۔ نوافل کے بعد دعا کرنا مستحب ہے کہ وقت اجابت ہے۔

شامی میں ہے: اذا ابتلى المسلم بالقتل يستحب ان يصلي ركعتين يستغفر الله تعالى
بعدها۔

یعنی جب کوئی مسلمان قتل میں مبتلا ہو جائے تو اسے یہ مستحب ہے کہ دو رکعت نفل پڑھ کر اس کے بعد استغفار کرے، اگرچہ فرض کے بعد کی دعا نفل کے بعد کی دعا سے ضرور افضل ہے۔

مواہب لدنیہ میں ہے: اخرج الطبرانی من رواية جعفر بن محمد الصادق - فالدعاء

بعد المکتوبۃ افضل من الدعاء بعد النافله کفضل المکتوبۃ علی النافله۔

یعنی طبرانی نے بروایت حضرت جعفر بن محمد صادق تخریج کی کہ فرض کے بعد کی دعا نفل کے بعد کی دعا سے افضل ہے جس طرح فرض کو نفل پر فضیلت ہے۔

لہذا یہ امام سخت ناواقف ہے۔ سنت و نوافل کے بعد کی دعا کا انکار کرتا ہے اور فرض کے ساتھ دعا کو خاص کرتا ہے اور شریعت کے مسائل میں اپنی رائے کو دخل دیتا ہے۔

اب باقی رہا اس کا یہ کہنا کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سنت و نوافل کے بعد دعا نہیں مانگی ہے۔ کہیں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ یہ اس کی مذہب سے ناواقفی کی بین دلیل ہے۔

اولاً: اس جاہل کو یہ قاعدہ معلوم نہیں ہے کہ۔

الفعل يدل على الجواز وعدم الفعل لا يدل على المنع كما في المواهب اللدنيه۔
یعنی کرنا جواز کی دلیل ہے اور نہ کرنا منع کی دلیل نہیں۔ لہذا وہ عدم فعل کو منع کی دلیل کس طرح قرار دیتا ہے۔

ثانیاً: مراقی الفلاح میں ہے: کان علیہ السلام اذا سلم یمکث قدر ما یقول اللہم انت السلام الخ۔ ثم یقوم الی السنۃ۔

یعنی حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب سلام پھیرتے تو اس دعا "اللہم انت السلام" کے پڑھنے کی مقدار ٹھہرتے پھر سنت کی طرف قیام فرماتے۔ تو یہ امام صاحب اس حدیث کو بد نظر رکھتے ہوئے فرمائیں کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وہ ادعیہ و اذکار جو بمواظبت ان اوقات میں حضور سے ثابت ہیں وہ قبل سنت ثابت ہونگی یا بعد سنت۔ ہمارے نزدیک تو اس کا وہی جواب ہے جس کو علامہ شامی نے بیان کیا جس کی پوری عبارت اوپر منقول ہوئی۔

ثالثاً: اگر یہ امام صاحب مطلق نوافل کے بعد دعا کو منع کرتے ہیں تو بکثرت احادیث اس امر پر دال ہیں۔ بنظر اختصار چند احادیث پیش کی جاتی ہیں۔

بخاری شریف میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ سے مروی ہے:

کان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یعلمنا الاستخارة فی الامور کما یعلمنا السورة من القرآن ویقول اذا هم احدکم بالامر فلیرکع رکعتین من غیر الفریضة ثم یقول اللہم انی استخیرک۔ الحدیث

یعنی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہم کو تمام امور میں استخارہ کی تعلیم دیتے تھے جس طرح ہم کو قرآن کی سورۃ سکھاتے تھے۔ فرماتے جب تم کسی امر کا قصد کرو تو علاوہ فرض کے دو رکعتیں پڑھو! پھر یہ کہو۔ اللہم انی استخیرک۔

پوری دعا استخارہ ترمذی شریف میں ہے:

حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم: من كانت له حاجة الی اللہ او الی احد من بنی ادم فلیتوضأ فلیحسن الوضوء ثم یصلی رکعتین ثم یشی علی اللہ تعالیٰ ویصلی علی النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ثم یقول: لا اله الا اللہ الحلیم الکریم۔ الحدیث۔

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف یا کسی آدمی کی طرف کوئی حاجت ہو تو وہ اچھی طرح وضو کرے پھر دو رکعتیں پڑھے پھر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرے پھر حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھے۔ پھر لا اله الا اللہ الحلیم الکریم۔ پوری دعا پڑھے۔

ان احادیث میں نماز نوافل کے بعد دعا کرنے کا خود حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حکم فرمایا۔ اگر یہ امام وہابیہ کی کفری عبارات کو کفر نہیں جانتا۔ یا ضروریات دین سے کسی چیز کا انکار کرتا ہے۔ تو اس کی اقتداء درست نہیں، اس کو امام بنانا صحیح نہیں۔ بحمد اللہ منصف کے لئے یہ مختصر تحریر کافی ہے۔ مولیٰ تعالیٰ قبول حق کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب وعلمہ جل مجدہ اتم واکمل واحکم۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ (۵۰۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

نماز عشاء میں دعائے قنوت بوقت نزول حوادث عظیمہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں اور اس کا ثبوت

حدیث و فقہ سے ہے یا نہیں اور بصورت عدم جواز جو ایسا کرے وہ کس حکم کا مستحق ہے۔ بینو اتوجروا

السائل ملاذیر حسین۔ ساکن محلہ دیہ پائسرائے بلد سنجل ضلع مراد آباد

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

حنفیوں کے نزدیک علاوہ وتر کے پنجوقتہ کسی نماز میں دعائے قنوت پڑھنا جائز نہیں ہے۔ کتب فقہ میں یہ مسئلہ صاف طور پر موجود ہے۔

نور الایضاح میں ہے: لایقنت فی غیر الوتر۔

(نور الایضاح ص ۴۰)

غیر وتر میں قنوت نہ پڑھی جائے۔

غنیۃ شرح منیہ میں ہے: لایقنت فی صلوٰۃ غیر الوتر عندنا۔

(غنیۃ ص ۳۹۸)

حنفیوں کے نزدیک سوا وتر کے نماز میں قنوت نہ پڑھی جائے۔

درمختار میں ہے: لایقنت لغيره ای غیر الوتر۔ (ردالمحتار مصری ص ۲۷۱)

وتر کے علاوہ قنوت نہ پڑھی جائے۔

ہاں اگر کوئی حادثہ عظیمہ و مصیبت شدیدہ نازل ہو تو اس وقت صرف نماز فجر میں قنوت پڑھ سکتا ہے۔ اسکے علاوہ اور کسی نماز جمعہ۔ ظہر۔ عصر۔ مغرب۔ عشاء میں اس کا پڑھنا جائز نہیں۔

فقہ کی مشہور کتاب شامی میں ہے: ان قنوت النازلة عندنا مختص بصلاة الفجر دون غيرها من الصلوات الجهرية او السرية۔ (شامی ص ۴۷۱)

حنفیہ کے نزدیک قنوت نازلہ نماز فجر کے ساتھ خاص ہے اس کے علاوہ اور نمازوں جہری اور سری میں نہیں۔

کبیری شرح منیہ میں ہے:

قال الحافظ ابو جعفر الطحاوی انما لایقنت عندنا فی صلوٰۃ الفجر من غیر بلیۃ فاذا وقعت فتنة او بلیۃ فلا یاس به فعله رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم واما القنوت فی الصلوات کلها عند النوازل فلم یقل به الا الشافعی وکانہم حملوا ما روی عنہ علی الصلوٰۃ والسلام انه قنت فی الظہر والعشاء علی ما فی مسلم وانه قنت فی المغرب ایضا علی ما فی البخاری علی النسخ۔ (کبیری ص ۴۰۰)

حافظ امام ابو جعفر طحاوی نے فرمایا: حنفیہ کے نزدیک بغیر بلا کے نماز فجر میں قنوت نہ پڑھی جائے۔ اور جب کوئی فتنہ یا بلا نازل ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اسے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

نے کیا۔ لیکن وقت نوازل قنوت کا تمام نمازوں میں پڑھنا تو اسے سوا امام شافعی کے اور کسی نے نہیں کہا اور فقہانے (جو مسلم شریف میں حضور علیہ السلام سے مروی ہے کہ حضور نے نماز ظہر اور عشاء میں قنوت پڑھی اور بخاری شریف میں مروی ہے کہ حضور نے نماز مغرب میں بھی قنوت پڑھی) ان احادیث کو منسوخ ہونے پر محمول کیا۔

اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ علاوہ فجر کے جو اور نمازوں میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مروی ہے وہ منسوخ ہے بلکہ نماز فجر میں بھی عموم حکم منسوخ ہے صرف بوقت نزول حوادث اجازت ہے۔ چنانچہ ردالمحتار میں ہے:

قولہم بان القنوت فی الفجر منسوخ معناه نسخ عموم الحکم لانسخ اصلہ۔ (ردالمحتار ص ۴۷۱)

فقہاء کا یہ قول کہ فجر میں قنوت منسوخ ہے اسکے معنی یہ ہیں کہ عموم حکم منسوخ ہے اصل حکم منسوخ نہیں۔

اب جن مفتیوں نے علاوہ فجر کے اور اوقات مغرب عشاء وغیرہ میں دعائے قنوت کے جواز کا غلط فتویٰ دیا ہے، اگر یہ ان کی کم علمی اور کتب فقہ سے نا فہمی کی بنا پر ہے تو وہ مذہب حنفیہ سے ناواقفیت اور احادیث سے لاعلمی کی دلیل ہے اور حنفیوں کے لئے قول امام شافعی و امام احمد و امام سفیان ثوری کو پیش کر کے خلاف مذہب حنفیہ عمل کرنے کی تجویز ہے باوجودیکہ۔

درمختار میں تصریح موجود ہے: الحکم والفتی بالقول المرجوح خرق للاجماع۔

(ص ۵۳)

ردالمحتار میں ہے:

الثبات علی مذہب ابی حنیفۃ خیر واولی واقول لہم کما فی البحر والعجب کیف یختارون خلاف ظاہر المذہب مع انه الاتباع علی مقلد ابی حنیفۃ۔

اگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مفتی وہابی ہیں اور وہابی درپردہ غیر مقلد ہوتا ہے اور ایک معین امام کی تقلید کو شرک بتاتا ہے جیسا کہ ان کے امام اسمعیل دہلوی تنویر العینین میں تقلید شخصی کو شرک قرار دیا ہے۔ لہذا یہ حنفیوں سے علاوہ فجر کے اور اوقات میں قنوت پڑھوا کر خلاف مذہب حنفی کی ترغیب دیتے ہیں اور ہمارا مذہب ہمیں تبدیل مذہب کی اجازت نہیں دیتا اور ایک امام کے مذہب کو چھوڑ کر دوسرے امام کے مذہب

فقہ کی مشہور کتاب شامی میں ہے:

ليس للعامة ان يتحول من مذهب الى مذهب ويستوى فيه الحنفى والشافعى -
حاصل جواب یہ ہے کہ نماز عشاء میں دعائے قنوت پڑھنا ناجائز ہے اور کتب فقہ حنفی اور
احادیث کے خلاف ہے اور جو یہ فعل لاعلمی سے کرے وہ فعل ناجائز کا مرتکب ہے اور جو مذہب حنفیہ کو
جانتے ہوئے بالقصد ایسا کرے وہ مستوجب تادیب و تعزیر ہے اور وقت نزاع اس کے ایمان سلب ہونے
کا خوف ہے اور وہ مذاہب ائمہ کے ساتھ استہزاء و مذاق کرتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ (۵۰۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

اس زمانے میں جب کہ ہر جگہ مسلمانوں کو ستایا جا رہا ہے اور طرح طرح مظالم کا شکار بنایا جا رہا
ہے ایسی حالت میں صبح کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھنا جائز ہے کہ نہیں؟۔ اور اس کی ممانعت ہو تو تفصیل
سے جواب دیں۔ مولوی حسین احمد ٹانڈوی آج کل قنوت نازلہ پڑھنے کے بارے میں زوروں سے تاکید
کر رہے ہیں۔ لہذا سنیوں کو بھی لائحہ عمل بتایا جائے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

قنوت نازلہ برائے دفع مصیبت و حفاظت مسلمین و ہلاکت اعداء صرف نماز فجر میں بعد رکوع
جائز ہے مگر خلاف اولیٰ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ بعد نماز اس مقصد کے لئے دعاء کرے۔ رہا مولوی حسین احمد
ٹانڈوی کا حکم تو وہ فریب سے خالی نہیں۔ کہ ہندوستان میں تو وہ قنوت نازلہ پڑھنے کی تاکید کر کے قوم کو یہ
دکھانا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر مظالم ہو رہے ہیں۔ اور عرب میں جا کر مسلمانان عالم میں
یہ پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ مسلمانان ہند نہایت امن اور آرام میں ہیں۔ تو مسلمانو فیصلہ کرو کہ اس کی کوئی
بات سچی ہے اور کوئی جھوٹی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: الفقیر الی اللہ عز و جل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام مسئلہ ذیل میں

عرض خدمت میں یہ ہے کہ وہ ذکر عطا فرمایا جاوے جو عند اللہ وعند الرسول (جل جلالہ و صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وسلم) محسوب ترین ہو اور اس کے پڑھنے کی اجازت مع دعاء برکات۔
ایک مسئلہ اور حضور حل فرمادیں کہ کھانا کھانے کے بعد دعا مانگنا سنت ہے یا نہیں؟۔ اور اگر سنت
ہے تو کھانے کے بعد بغیر ہاتھ دھوئے مانگے یا ہاتھ دھو کر مانگے اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگے یا یونہی دل سے
دعا مانگو پڑھے؟۔

آپ کا کشف بردار محمد عبداللہ نعیمی رضوی کھیری محلہ ڈھ پور۔ ضلع وپوسٹ آفس

کھیری ٹاؤن ۴ دسمبر ۱۹۵۸ء

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

کھانے کے بعد حمد و دعا کرنا مسنون ہے فتاویٰ عالمگیری میں ہے

وسنن الطعام البسملۃ فی اولہ والحمد فی اخرہ

اب رہی یہ تفصیل کہ دعا بغیر ہاتھ دھوئے مانگے یا ہاتھ دھو کر مانگے تو فتاویٰ میں ہے

”امادعا کردن بعضی احادیث مشعر اند باینکہ بعد از غسل دست سنت باشد و بعضی مشعر اند باینکہ قبل از

غسل سنت باشد“

یعنی بعض احادیث میں تو دعا کرنا ہاتھ دھونے کے بعد آیا ہے اور بعض میں ہاتھ دھونے سے قبل
سنت ہونا مروی ہے۔ لیکن میں نے اپنے اکابر کو یہ دیکھا کہ وہ ہاتھ دھونے سے قبل دعا کرتے تھے اسی کا
میں بھی عامل ہوں۔ رہا دعا میں ہاتھ کا اٹھانا تو یہ دعا کی سنت ہے جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے۔ واللہ
تعالیٰ اعلم بالصواب۔

اعمال میں میرے نزدیک سب سے محبوب ترین درود شریف ہے کہ ترمذی کی حدیث حضرت ابی
بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ میں آپ پر بکثرت درود پڑھتا
ہوں تو کس قدر پڑھوں؟ فرمایا: تو جتنا چاہے۔ میں نے عرض کیا: چوتھائی اوقات میں؟ فرمایا: تو جتنا
چاہے اس سے زیادہ ہو تو اور بہتر ہے۔ میں عرض کیا: دو تہائی اوقات میں؟ فرمایا: جتنا چاہے اگر اس پر

زیادہ کرے تو تیرے لئے اور بہتر ہے۔ تو میں نے عرض کیا: تو علاوہ فرائض و حواج کے سب اوقات درود کے لئے مقرر کر لوں فرمایا: ”اذا يكفى همك ويكفر لك ذنبك“ تو یہ اس وقت تیرے غم کے لئے کفایت کریگا اور تیرے گناہ کے لئے کفارہ ہو جائیگا۔ اس حدیث شریف سے ثابت ہو گیا کہ درود شریف محبوب ترین اعمال سے ہے۔ ۵۔ جمادی الاخریٰ ۸/ ۱۳۷۷ھ

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۷ھ

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین و شرع متین اس مسئلہ میں کہ

اگر کوئی شخص تراویح کے اندر ہر ترویجہ پر دعاء مسنون سبحان ذی الملك والملكوت الخ پڑھنے کے بعد صلوٰۃ خمسہ کی طرح ہاتھ اٹھا کر دعائے مانگے تو از روئے قرآن و حدیث وفقہ جائز و درست ہوگا یا نہیں؟۔ کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ یہ بدعت و ناجائز ہے کس حد تک صحیح ہے اگر اس کو غلط قرار دیا جائے تو ”الدعاء مخ العبادۃ“ کے کیا مطلب ہونگے۔ اس لئے التماس ہے کہ مسئلہ مذکورہ کا جواب جواز و عدم جواز کی حیثیت سے مدلل و مشرح مع حوالہ کتب و عبارات تحریر فرمایا جاوے۔ تاکہ ہر خاص و عام کے لئے دلیل و حجت قاطعہ بن سکے والسلام

السائل عبدالرزاق امام مسجد سرائے ترین سنہ ۱۳۷۷ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

ہر نماز فرض و نفل کے بعد دعا کرنا سنت ہے اور حدیث سے ثابت ہے۔

حافظ ابو نعیم کتاب عمل الیوم واللیلۃ میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی:

قال ما يفوت النبي صلى الله تعالى عليه سلم في دبر صلوٰۃ مكتوبة ولا تطوع

الاسمعتہ يقول: اللهم اغفر لي خطاياي كلها، اللهم اهدني لصالح الاعمال والاخلاق

الخ

اس حدیث سے ثابت ہو گیا کہ جس طرح فرائض کے بعد دعا سنت ہے اسی طرح سنن و نوافل

کے بعد بھی سنت ہے اور آداب و مستحبات دعا سے ہاتھ اٹھا کر دعائے مانگنا ہے۔

چنانچہ حدیث شریف میں ہے

”ان النبي صلى الله تعالى عليه سلم كان اذا دعا فرفع يديه۔ (مشکوٰۃ شریف)

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ سنت و نوافل کے بعد بھی ہاتھ اٹھا کر دعائے مانگنا سنت ہے اور تراویح کا سنت ہونا کس پر پوشیدہ ہے تو ہر ترویجہ پر ہاتھ اٹھا کر دعائے مانگنے کا سنت ہونا انہیں احادیث سے ثابت ہو گیا۔ جو اس کو بدعت کہتا ہے وہ تاقیامت اس کا بدعت ہونا ثابت نہیں کر سکتا بلکہ اس جاہل نے محض اپنی عقل سے سنت کو بدعت قرار دیا۔ بلکہ یہ ستم کیا کہ حدیث شریف کے جائز کردہ عمل کو فقط اپنی رائے ناقص سے ناجائز ٹھہرا دیا۔ اور مسلمانوں کو غلط مسئلہ بتا کر اہل اسلام میں اختلاف و فساد پیدا کر دیا۔ لہذا مسلمان ایسے کم علم و جاہل مفتی کی بات پر ہرگز ہرگز عمل نہ کریں اور اس سے کوئی دینی مسئلہ دریافت نہ کریں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۲۵/ رمضان المبارک ۱۳۷۷ھ

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۷ھ

(۵۰۴)

مسئلہ

بسم الله الرحمن الرحيم

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین ان مسائل میں

(۱) بعد فراغ پنجگانہ نماز فرائض و سنن و نوافل امام بالجہر دعائے مانگتا ہے اور مقتدی آمین کہتے ہیں

جمعیت کے ساتھ جیسا کہ رواج گجرات میں اکثر ہے یہ دعائے مانگنا گناہ ہے یا کیسا؟۔ عند الاحناف۔

ثانیاً۔ نماز تراویح کے بعد ترویجہ کے بعد تسبیح یا دور شریف یا کلمہ شریف وغیرہ اذکار بالجہر پڑھتے

ہیں یہ جائز ہے یا ناجائز ہے؟۔

ثالثاً۔ بزرگان دین کے مزار پر پھولوں کا رکھنا شرعاً جائز ہے یا ناجائز مدلل طور سے کتاب کے

حوالے کے ساتھ اس کا جواب باصواب عنایت فرمادیں۔ بینواتو جروا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

امام فرائض و نوافل سے فارغ ہونے کے بعد باوازد دعائے مانگ سکتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی انہوں نے فرمایا:

ما يفوت النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فی دبر صلوٰۃ مكتوبة ولا تطوع الا سمعت
يقول: اللهم اغفر خطاياي كلها اللهم اهدني لصالح الاعمال والا خلاق الخ (رواه ابو
نعيم الحافظ في كتاب عمل اليوم والليلة)

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بعد نماز دعا فرماتے اور دعا بھی اتنی
آواز سے ہوتی کہ صحابہ کرام سن لیتے تھے۔ لہذا اس دعا کا بالجہر پڑھنا خود فعل نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
سے ثابت ہے۔

اب باقی رہا امام کا مقتدیوں کو شریک کر کے دعا مانگنا اس میں کوئی حرج نہیں اور مجمع عام میں
دعا کا یہی قاعدہ ہے کہ قوم کا ایک شخص دعا کے الفاظ بالجہر کہتا ہے اور لوگ آمین کہتے ہیں۔
چنانچہ مراقی الفلاح میں ہے: واذا ادعایو منون علی دعائه۔ لہذا گجرات کا یہ طریقہ
دعا نہ گناہ ہے، نہ ناجائز واللہ تعالیٰ اعلم۔

ہر ترویجہ پر تسبیح و صلوٰۃ اور ادعیہ و اذکار کا آواز پڑھنا بھی جائز ہے کہ بالجہر پڑھنے میں نشاط کا زائد
ہونا، نیند کا دفع ہونا، سامعین کو فائدہ پہنچنا، فکر و سمیع کا ایک سا ہو جانا وغیرہ فوائد ہیں، اسلئے اس کو
بعض فقہاء نے افضل تک قرار دیا۔

رد المحتار میں ہے: قال بعض اهل العلم ان الجهر افضل لانه اكثر عملا۔
تو جو بلا کسی وجہ شرعی کے اور ادعیہ و اذکار کے جہر کو ناجائز قرار دیتا ہے تو وہ تصریحات فقہاء کے
مخالف کرتا ہے۔ اجمع العللاء سلفا وخلفا علی استحباب ذکر الجهر فی الجماعة فی
المساجد وغیرہا الا ان یشوش جهر هم علی قائم او مصل او قاری الخ۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔
قبروں پر پھولوں کا رکھنا نہ فقط جائز بلکہ حسن ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔ وضع الورد
الریاحین علی القبور حسن۔ (عالمگیری مطبوعہ مجیدی کان پور ص ۱۱۰ ج ۳)

تو جب عامۃ المسلمین کی قبور پر پھولوں کا رکھنا حسن ہے تو بزرگان دین کے مزارات پر پھولوں کا
رکھنا بدرجہ اولیٰ حسن ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

(۵۰۵)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین کہ

بعد نماز فرض جماعت پنج وقتہ آواز بلند سے مرتبہ کلمہ طیب پڑھنا کیسا ہے، بعض علماء منع کرتے ہیں
اور مثال دیکر کہتے ہیں کہ عید الاضحیٰ میں تکبیر جو پڑھتے ہیں اس میں کلمہ بھی ہے اس کے پڑھنے کا روزانہ
کیوں حکم نہیں ہوا، میں نے اس پر یہ کہا کہ آپ کے کہنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح قربانی کا تین
ہم حکم ہے کہ تین یوم قربانی کرو اس کو روزانہ تمام عمر کرنے کا حکم کیوں نہیں ہوا۔ برائے کرم جواب سے
مطلع فرمائے کہ کلمہ طیبہ کا بعد نماز جماعت فرض کے آواز بلند پڑھنا درست ہے یا درست نہیں ہے؟۔ فقط
نیاز مند حافظ عبدالمجید رنگساز سنہ ۱۹۵۰ء۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۵۰ء۔

والسلام

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اذکار کے بعد جماعت فرض آواز بلند پڑھنا سنت ہے اور کلمہ طیبہ افضل ذکر ہے۔

چنانچہ مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی:

کان رسول اللہ ﷺ اذا سلم من صلوٰتہ يقول بصوتہ الا علی لا الہ الا اللہ وحده
لا شریک لہ الملک ولہ الحمد وهو علی کل شیء قدیر الحدیث۔

(مشکوٰۃ شریف ص ۸۸)

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جب اپنی نماز کا سلام پھیرتے تو بلند آواز سے یہ فرماتے تھے:

لا الہ الا اللہ وحده لا شریک لہ الخ۔

اس حدیث شریف سے ثابت ہو گیا کہ کلمہ شریف۔ لا الہ الا اللہ کا بعد نماز آواز بلند پڑھنا خود
فضول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فعل ہے بلکہ یہ زمانہ اقدس میں جماعت فرض کے ختم ہو جانے کی
علامت تھا۔

چنانچہ مسلم شریف ہی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

ان رفع الصوت بالذکر حين ينصرف الناس من المكتوبة كان علی عهد النبی
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، قال ابن عباس: كنت اعلم اذا انصرفوا بذلك اذا سمعته۔

(مسلم شریف مع نووی مجتہبی ص ۲۱۷ ج ۱)

زمانہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں جب لوگ نماز فرض سے فارغ ہوتے تو بلند آواز سے ذکر کر
ساتھ تھے، حضرت ابن عباس نے فرمایا: جب میں ذکر کی آواز سن لیتا تو جان لیتا تھا کہ لوگ نماز سے فارغ

ہو چکے۔

اس حدیث سے معلوم ہو گیا کہ صحابہ کرام فرضوں کی جماعت سے فراغت کے بعد بہ التزام باواز بلند ذکر کیا کرتے تھے، جہی تو یہ ختم جماعت کی علامت قرار پایا تھا۔ اسی بنا پر علامہ سیدی احمد طحاوی نے حاشیہ مراقی الفلاح میں یہ استدلال کیا:

ويستفاد من الحديث الأخير جواز رفع الصوت بالذكر والتكبير عقب المكتوبات بل من السلف من قال باستحبابه وحزم به ابن حزم۔

(طحاوی مصری ص ۱۸۱)

فرضوں کے بعد ذکر و تکبر کے بلند آواز سے پڑھنے کا جواز حدیث اخیر سے مستفاد ہوا بلکہ سلف میں سے بعض نے اسکا مستحب ہونا بیان کیا اور ابن حزم نے اسی پر حزم کیا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ روز روشن کی طرح ثابت ہو گیا کہ کلمہ طیبہ کا بعد جماعت فرض باواز بلند پڑھنا خود حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فعل ہے اور ان کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا فعل ہے تو یہ سنت رسول علیہ السلام بھی قرار پایا اور سنت صحابہ بھی ٹھہرا۔

اب وہابی اس کو بدعت ناجائز کہہ کر اور اسکو منع کر کے سنت کو بدعت و ناجائز کہتا ہے اور سنت کی مخالفت کرتا ہے۔ بظاہر تو اسکا دعوے یہ ہے کہ ہم سنت پر عمل کرتے ہیں، لیکن درحقیقت کلمہ طیبہ کے دشمن ہیں۔ سنت کو بدعت کہتے ہیں۔ فعل رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔

ہم مسلمانوں کا عمل یہ ہے کہ کلمہ طیبہ کا بعد جماعت فرض باواز بلند پڑھنا سنت جانتے ہیں۔ اور اسکا التزام کرنا موجب اجر و ثواب سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر کی تصریحات سے ظاہر ہو چکا۔ مولیٰ تعالیٰ ان مخالفین کو چشم بینا عطا فرمائے اور انہیں قبول حق کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: مقتسم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنجل

(۵۰۶)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسائل کے بارے میں کہ

(۱) نماز و دعا و نفل سے فارغ ہو کر آخر میں امام و مقتدی کا دعائے ثانی کرنا کیسا ہے؟

(۲) نماز و دعا سے فارغ ہو کر متوسط آواز سے کلمہ شہادت پڑھنا کیسا ہے؟

(۳) ہر نماز کے بعد یا عشاء و فجر کے بعد باداموں پر درود شریف پڑھنا جائز ہے یا ناجائز؟

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) سنن و نوافل سے فراغت کے بعد بھی دعا کرنا حدیث شریف سے ثابت ہے جس کے

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ راوی وہ فرماتے ہیں:

ما يفوت النبي صلى الله تعالى عليه وسلم في دير صلوة مكتوبة ولا تطوع الا

سمعه يقول اللهم اغفر خطاياي كلها اللهم اهدني لصالحي الاعمال والاخلاق الخ۔

(رواه ابو نعیم فی کتاب عمل الیوم وليلة)

یعنی حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے فرض نماز کے بعد اور اسی طرح نفل نماز کے بعد یہ

دعا فوت ہی نہیں ہوتی میں نے حضور کو وہ دعا اسی طرح کرتے سنا۔ اے اللہ میری سب خطاؤں کو بخش

دے۔ اے اللہ مجھے بہتر اعمال و اخلاق کی ہدایت کراؤ۔

اس حدیث سے واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جس طرح فرائض

کے بعد دعا کیا کرتے تھے۔ تو یہ دعا تو دعا اول ہوئی اسی طرح حضور نفل نمازوں کے بعد دعا کرتے تھے

تو جو نوافل فرائض کے بعد میں ہوں ان کے بعد کی دعا کیا ثانی دعا نہ ہوئی۔ پھر جب اس دعائے ثانی کا

بھی سنت ہونا ثابت ہو گیا تو کون ایسا امتی ہے جو سنن و نوافل کے بعد کی دعائے ثانی کو ترک کر دیگا۔ لہذا

ابو امام سنن و نوافل کے بعد بموافق اس حدیث کے اس قدر آواز سے دعا کرے جس کو مقتدی بھی سن

رہے ہوں تو بمطابق آداب دعا کے ان مقتدیوں کو اس کی دعا پر آمین کہنا چاہئے۔ جیسا کہ صلوٰۃ کسوف

و استسقاء کے بعد امام بلند آواز سے دعا کرتا ہے تو مقتدیوں کو آمین کہنے کا حکم ہے۔

مراقی الفلاح میں ہے: اذا دعا یومنون علی دعائه۔

(طحاوی مصری ص ۳۱۷)

یعنی جب امام دعا کرے تو مقتدی اس کی دعا پر آمین کہیں۔ لہذا سنت و نفل کے بعد امام و مقتدیوں

کا دعائے ثانی کرنا بلا شک جائز ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) نماز فرض کے بعد باواز بلند ذکر حدیث شریف سے ثابت ہے۔ حدیث شریف میں

حضرت معبد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے ان ابن عباس اخبرہ ان رفع الصوت بالذكر حين

ينصرف الناس من المكتوبة كان على عهد النبي صلى الله تعالى عليه وسلم وانه قال قال ابن عباس كنت اعلم اذا انصرفوا بذلك اذا سمعته۔

(مسلم۔ ج ۱ ص ۴۱۷)

یعنی حضرت ابن عباس نے انہیں خبر دی کہ لوگوں کا فرض سے فارغ ہونے کے وقت ذکر کا بلند آواز سے کرنا زما نہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں تھا اور حضرت ابن عباس نے فرمایا جب میں ذکر کی آواز سن لیتا تو اسی سے انکا نماز سے فارغ ہونا جان لیتا۔

اور طحاوی میں ہے: فی مسلم عن عبد الله بن الزبير كان رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم اذا فرغ من صلوته قال بصوته الا على لا اله الا الله وحده لا شريك له۔

ويستفاد من الحديث الاخير جواز رفع الصوت بالذكر والتكبير عقب المكتوبات بل من السلف من قال باستحبابه ملخصا۔ (طحاوی ص ۱۸۱)

یعنی مسلم میں حضرت عبد اللہ بن زبیر سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی نماز سے فارغ ہوتے تو بلند آواز سے لا اله الا الله وحده لا شريك له الخ فرماتے۔ علامہ طحاوی نے فرمایا اس حدیث سے فرائض کے بعد ذکر اور تکبیر کا بلند آواز سے جائز ہونا مستفاد ہوا بلکہ بعض سلف نے اسکا مستحب ہونا بیان کیا۔

ان احادیث اور عبارات فقہ سے فرض نمازوں کے بعد ذکر کلمہ شریف کا با آواز بلند کہنا نہ فقط جائز بلکہ مستحب بلکہ سنت صحابہ بلکہ سنت نبی علیہ السلام ثابت ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۵) درود شریف کا وظیفہ ہر نماز کے بعد یا عشا و فجر کے بعد۔ باداموں پر یا تسبیحوں پر نہ فقط جائز بلکہ سنت ہے۔ خود حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کے بکثرت ورد کا حکم فرمایا۔

ترمذی شریف میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی: قال: قلت: يا رسول الله! انى اكثر الصلوة عليك فكم اجعل لك من صلوتي؟ فقال: ماشئت قلت: الربع، قال: ماشئت فان زدت فهو خير لك، قلت: النصف قال: ماشئت فان زدت فهو خير لك، قلت: فالثلثين قال: ماشئت فان زدت فهو خير لك، قلت: اجعل لك صلوتي كلها قال: اذا يكنى همك و يكفر لك ذنبك رواه الترمذی۔

(مشکوٰۃ ص ۸۶)

کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں آپ پر بکثرت درود بھیجتا ہوں تو کس قدر اپنا درود آپ

کے لئے کروں؟ تو حضور نے فرمایا تو جس قدر چاہے۔ میں نے عرض کیا: چوتھائی وقت؟ فرمایا تو جتنا چاہے۔ پس اگر چوتھائی سے زیادہ کرے تو وہ تیرے لئے زیادہ بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا: آدھا وقت معین کروں؟ فرمایا تو جتنا چاہے۔ پس اگر نصف سے زیادہ کرے تو وہ تیرے لئے زیادہ بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا: کہ دو تہائی وقت معین کروں؟ تو فرمایا تو جتنا چاہے۔ پس اگر دو تہائی سے زیادہ کرے تو وہ تیرے لئے بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا: کہ وقت دعا کا کل وقت آپ کے لئے معین کروں؟ فرمایا جب کل وقت دعا درود میں گزار دیا تو یہ تیرے غم کی کفایت کرے گا۔ اور تیرے لئے گناہوں کا کفارہ ہوگا۔ اس حدیث شریف سے ثابت ہو گیا کہ بعد فرائض کے درود شریف کا بکثرت پڑھنا حصول مقاصد دینی و دنیوی اور کفارہ گناہوں کے لئے بہتر وظیفہ ہیں اور کفالت مہمات و حصول فیوضات کے لئے عمدہ ترین ذریعہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۰۷ھ

(۵۰۷)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ملک دھن میں اکثر شہر اور دیہات میں زمانہ دراز سے پنجوقتہ نمازوں میں بعد نماز نفل جو امام اور مقتدی سب مسجد میں ادا کرتے ہیں ثانی دعا امام معہ مقتدی پڑھکر کبھی درود کبھی فاتحہ معہ درود کرتے ہیں، اور جمعہ کی نفل نماز کے بعد بھی اور عیدین کی نفل نماز کے بعد بھی اس کا دستور ہے۔ بعد جمعہ اور عیدین امام سے مصافحہ کرتے ہیں اور باہم مقتدی بھی مصافحہ کرتے ہیں۔ اب ایک مفتی صاحب دیوبندی وعظ بیان کرتے ہیں، کہ یہ چاروں عمل یعنی دعائے ثانی معہ امام، درود بعد دعا، فاتحہ معہ درود بعد دعا، اور مصافحہ بعد نماز جمعہ وعیدین، یہ سب عمل خلاف سنت رسول و صحابہ ہیں، بدعت ضلالت ہیں، جہنمی ہیں۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت ان بدعتیوں کو نہ ہوگی۔ یہ سب لوگ متوحش ہیں متردد اور متفرق ہیں، کہ یہ عمل ہم ایصال ثواب برائے رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور دیگر اہل بزرگان دین کے لئے کرتے تھے، اب مفتی صاحب گناہ کے کام بتا رہے ہیں۔ آپ یہ چاروں کام بدعت حسنہ ہیں یا بدعت سیئہ ہیں، بتا کر ہماری صحیح رہنمائی فرمائیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

فرض اور نفل سے فارغ ہونے کے بعد دعا کرنا حدیث شریف سے ثابت ہے جس کو حافظ ابوعبید نے اپنی کتاب عمل الیوم واللیلۃ میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت سے تخریج کی کہ انہوں نے کہا: ما یفوت النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فی دبر صلوٰۃ مکتوبۃ ولا تطوع الا سمعته یقول اللہم اغفر خطایا ۱ کلہا اللہم اہدنی لصالح الاعمال والاخلاق الحدیث۔

میں نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نماز فرض و نفل کے بعد یہ دعا کرتے ہوئے سنا اور حضور یہ دعا ترک نہ فرماتے: اے اللہ میری سب خطاؤں کی مغفرت فرما۔ اے اللہ مجھے اچھے اعمال و اخلاق کی طرف ہدایت کر۔

اس حدیث سے ثابت ہو گیا کہ حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نہ فقط نماز فرض کے بعد بلکہ نماز نفل کے بعد بھی دعا کرتے اور دعا بھی اس قدر بلند آواز سے کرتے کہ صحابہ کرام اس کو سن لیتے، تو دعا کا کرنا جس طرح بعد فراغت نماز فعل رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت اسی طرح نوافل کے بعد بھی فعل رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ صورت مسئلہ میں جس دعا کا ذکر ہے وہ بعد نوافل ہی تو ہے۔ تو یہ دعا خلاف سنت کس طرح ہوئی اور جب حدیث میں بعد نوافل کے دعا کرنا فعل رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ثابت ہے تو اس کو بدعت کہنا کیسے روا ہو گیا، تو جو اس دعا بعد نوافل کو خلاف سنت اور بدعت کہے وہ خود بدعتی و جہنمی ہے، اور فعل رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ناواقف ہے۔ مولیٰ تعالیٰ اس کو قبول حق کی توفیق عطا فرمائے۔

اسی طرح درود شریف کا دعا کے ساتھ پڑھنا، یہ بھی کیسے ناجائز و بدعت ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں درود شریف پڑھنے کا اس طرح حکم فرماتا ہے۔

ان اللہ و ملککۃ یصلون علی النبی یا ایہا الذین امنوا اصلوا علیہ وسلموا تسلیما۔
بیشک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں اے ایمان والو تم ان پر درود بھیجو اور سلام بھیجو۔
اس آیت کریمہ میں درود شریف کے لئے کوئی خاص وقت معین نہیں کیا تو جس وقت بھی درود پڑھی جائے، وہ اسی حکم کی تعمیل ہوگی تو جو درود دعا پڑھا جائے گا، وہ اسی عموم حکم آیت کے تحت میں داخل

ہے اور حدیث شریف سے بھی جس طرح درود شریف کا نماز کے اندر پڑھنا ثابت ہے اسی طرح بعد نماز اس کا دعا کے ساتھ پڑھنا بھی ثابت ہے۔

چنانچہ ترمذی شریف، ابوداؤد اور نسائی میں حضرت فضالہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی انہوں نے کہا:

بینما رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قاعد اذ دخل رجل فصلی فقال اللہم اغفر لی و ارحمنی فقال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عجلت ایہا المصلی اذا صلیت فقعدت فاحمد اللہ بما هو اہلہ وصل علی ثم ادعہ ثم صلی رجل آخر بعد ذلك فحمد اللہ وصلی علی النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فقال لہ النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ایہا المصلی دع تجب۔ (مشکوٰۃ ص ۱۸۶)

اس درمیان کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تشریف فرما تھے اچانک ایک شخص آیا اور اس نے نماز پڑھی پھر کہا اے اللہ میری مغفرت کر اور مجھ پر رحم فرما تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا اے نمازی تو نے عجلت کی جب تو نماز پڑھ چکے تو بیٹھ اور اللہ کی حمد کر جس کا وہ اہل ہے اور مجھ پر درود پڑھ، پھر خدا سے دعا کر، راوی نے کہا پھر ایک دوسرا شخص اس کے بعد آیا اس نے اللہ کی حمد کی اور نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر درود پڑھا تو اس سے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا اے نمازی دعا طلب کر قبول کی جائے گی۔

اس حدیث سے ثابت ہو گیا کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب آداب دعا تعلیم فرمائے تو یہ ترتیب بتائی کہ پہلے حمد و ثناء ہو پھر درود شریف پڑھا جائے اس کے بعد دعا کی جائے۔ نیز یہ درود شریف قبول دعا کا ذریعہ اور حصول مقاصد کا وسیلہ ہے، جیسا کہ ترمذی کی حدیث شریف میں ہے کہ حضرت امیر المؤمنین عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

ان الدعاء موقوف بین السماء والارض لا یصعد منها شیء حتی تصلی علی نبیک۔
بیشک دعا آسمان و زمین میں روک دی جاتی ہے اس کا کوئی حصہ اوپر نہیں چڑھتا، یہاں تک کہ تم اپنے نبی پر درود پڑھو۔

تو درود شریف کا قبل دعا کیلئے زیادہ مناسب ہوا اسی بنا پر اہل اعمال درود شریف کو دعا سے پہلے بھی پڑھتے ہیں اور بعد میں بھی پڑھتے ہیں، لہذا درود شریف کا فاتحہ کے ساتھ پڑھنا جو خود دعا بھی ہے

اور حمد پر بھی مشتمل ہے۔ اسی طرح اس کا بعد دعا پڑھنا نہ خلاف سنت ہو نہ بدعت ضلالت تو جو اس کو باوجود ان روشن دلائل آیت و احادیث کے محض اپنی ناقص عقل سے خلاف سنت اور بدعت کہتا ہے وہ خود جہنمی ہونے کی تیاری کرتا ہے۔ اور اپنے آپ کو بدعتی قرار دیتا ہے، اب باقی رہا جمعہ و عیدین کے بعد کا مصافحہ اس میں کوئی مسلمان تو کوئی بحث کر نہیں سکتا، کہ حضور بنی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے: تصافحوا بھب الغل۔ (مشکوٰۃ ص ۴۰۱)

یعنی مصافحہ کرو کہ وہ حسد کو دور کرتا ہے۔

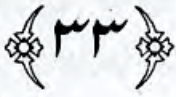
فقہ کی مشہور کتاب طحاوی علی مراقی الفلاح میں ہے۔ المصافحة سنة في سائر الاوقات۔ یعنی مصافحہ سنت تمام اوقات میں ہی سنت ہے، تو جمعہ اور عیدین کے بعد کا وقت بھی منجملہ اوقات کے ایک وقت ہی تو ہے۔ اس میں مصافحہ کس طرح مخالف سنت ہو سکتا ہے، چنانچہ ”وشاح الجید فی معانفۃ العید“ میں بحوالہ تکمیل شرح اربعین منقول ہے۔

مشروعية المصافحة مطلقا اعم من ان تكون عقيب الصلوات الخمس والجمعة والعیدین وغير ذلك لان النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لم یقیدها لوقت دون وقت۔ مطلقا مصافحہ کا جائز ہونا اس کو اعم ہے، کہ وہ پانچوں نمازوں اور جمعہ اور عیدین کے بعد ہو۔ اس لئے کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کو کسی خاص وقت کے ساتھ مقید نہیں کیا۔

ان دلائل سے ثابت ہو گیا کہ بیچ وقت نمازوں اور جمعہ و عیدین کے بعد کا مصافحہ بلا شک جائز و فعل سنت ہے اور عموم حکم حدیث شریف کے تحت میں داخل ہے، تو جو اس کے خلاف سنت اور بدعت ضلالت قرار دیتا ہے وہ مخالف سنت اور بدعتی ہے، اور وہ جائز امور کو محض اپنی رائے سے ناجائز ٹھہرا کر خود جہنمی بنتا ہے۔

بالجملہ ان چاروں امور کے جواز میں کوئی شبہ نہیں۔ انکے ناجائز و بدعت کہنے والے کے پاس عدم جواز کی کوئی صریح دلیل موجود نہیں ہے، محض اپنی ناقص عقل سے ان چار امور کو ناجائز اور بدعت کہتا ہے، مولیٰ تعالیٰ اس کو قبول حق کی توفیق عطا فرمائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المقتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۰۰ھ



باب القرآن والتفسیر

ھو القادر

مسئلہ

(۵۰۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس شخص کے بارے میں جس نے تفسیر قرآن کے نام پر بلغۃ الحيوان نامی ایک کتاب لکھی اور اس کے صفحہ ۲ پر

فاتوا بسورة من مثله

کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا

(۱) اس جگہ مفسرین یہ معنی کرتے ہیں کہ قرآن بلیغ و فصیح کلام ہے اس کی مثل کوئی ایسا بلیغ اور فصیح کلام لاؤ۔ لیکن خیال کرنا چاہئے کہ کفار کو عاجز کرنا کوئی فصاحت سے نہ تھا کیونکہ قرآن خاص واسطے کفار فصحاء و بلغاء کے نہیں آیا تھا۔ اور یہ کمال بھی نہیں ہے انتہی بلفظہ۔ تو کیا احناف اہل سنت کے مذہب میں قرآن کریم کی فصاحت کا اس طرح انکار جائز ہے؟

(۲) صفحہ ۱۵ سطر ۳ پر لکھا

وادخلو الباب سجدا

میں باب سے مراد مسجد کا دروازہ ہے جو کہ نزدیک تھا اور باقی تفسیروں کا کذب ہے انتہی بلفظہ۔ کیا مفسرین کرام کو کاذب کہنا درست ہے اور اگر نہیں تو قائل کا کیا حکم ہے؟

(۳) صفحہ ۱۵ سطر ۲۰ پر سورہ بقرہ میں

فقلنا اضربوه ببعضها

کی تفسیر میں لکھا مفسرین نے تو یہ کہا ہے کہ انہوں نے نفس کو قتل کیا تھا اور قاتل معلوم نہ ہوا تھا لہذا امر کیا کہ ایسے بقرہ کو ذبح کر کے اس قاتل کو مار تو وہ زندہ ہو جایگا اور پھر اپنے قاتل کا نام بتائیگا۔ اس وقت بعضہا کی ضمیر بقرہ کی طرف راجع ہوگی۔ لکھا اصل میں یہ بات غلط ہے چونکہ حکم ذبح اور ذبح کے درمیان چالیس برس کا فاصلہ آگیا تھا۔ تو وہ قاتل اتنی مدت کس طرح بڑا رہ سکتا ہے۔ انتہی بلفظہ

کیا یہ تفسیر درست ہے اور اگر نہیں تو اس مفسر کا کیا حکم ہے۔

(۴) صفحہ ۴۳ پر آیۃ الکرسی کی تفسیر کے بعد لکھا۔ اور طاغوت کا معنی کلما عبد من دون اللہ فهو الطاغوت معنی کے بموجب طاغوت جن اور ملائکہ اور رسولوں کو بولنا جائز ہوگا۔

پھر صفحہ ۲۳۳ پر لکھا کہ عبادت کے لائق ایک اللہ تعالیٰ ہے اور رسولوں کا کمال عذاب الہی سے نجات پالینا ہے انتہی بلفظ۔

کیا یہ مرسلین کی توہین و تنقیص نہیں ہے۔ اور کیا عام صالح امتی عذاب الہی سے نجات نہ پائیے (۵) صفحہ ۱۵ پر سورہ ہود کی تفسیر میں لکھا: کل فی کتاب مبین۔ یہ علیحدہ جملہ ہے ماقبل کے ساتھ متعلق نہیں تاکہ یہ لازم آئے کہ اولاً تمام باتیں کتاب میں لکھی ہوئی ہیں جب کہ اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ تمہارے تمام اعمال لکھ رہے ہیں فرشتے۔

پھر اس کے بعد معتزلہ کا مذہب بیان کر کے لکھا: اور اللہ کو پہلے اس سے کوئی علم نہیں کہ کیا کریں گے بلکہ اللہ کو ان کے کرنے کے بعد معلوم ہوگا۔ اور آیات قرآنیہ جیسا کہ ولیعلم الذین وغیرہ بھی اور احادیث کے الفاظ بھی اس مذہب پر منطبق ہیں انتہی بلفظ۔

کیا یہ علم باری تعالیٰ کی تنقیص و آیات قرآنیہ و احادیث نبویہ کی تکذیب اور تمام کتب عقائد کی تغلیط نہیں؟

(۶) صفحہ ۲۰۵ پر سورہ کہف میں یا جوج ماجوج کا قصہ بیان کر کے آخر میں لکھا: باقی امور یا جوج کی پوری تفصیل آگے ذکر کی جائیگی اور معلوم ہوتا ہے کہ کافر اور انگریز مراد ہیں۔ انتہی بلفظ۔

کیا یہ مراؤں کی موافقت اور یا جوج ماجوج کے متعلق وارد روایات کے خلاف نہیں ہے۔ (۷) صفحہ ۲۶ سورہ احزاب میں لکھا

ان اللہ و ملئکتہ یصلون علی النبی سے لیکر اثماً مبیناً تک اول تو مومنوں کو کو کہا گیا کہ تم آفریں آفریں کرو۔ جس طرح اللہ تعالیٰ اور ملائکہ آفریں کر رہے ہیں کہ یا رسول تو نے اپنے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی ہے یہ معنی مثنوی والا نے کئے ہیں انتہی بلفظ۔

کیا آیت مذکورہ کی یہ تفسیر درست ہے۔

(۸) صفحہ ۲۶ سورہ احزاب میں لکھا: اے مومنو! اگر نکاح کرو مومنات کے ساتھ خواہ متنبی کی عورت ہو یا نہ ہو اور قبل الدخول طلاق دو تو اس عورت پر عدت لازم نہ ہوگی جیسا کہ زینب کو طلاق قبل

الدخول دی گئی اور رسول اللہ نے اس کو بلا عدت نکاح کر لیا انتہی بلفظ۔

کیا یہ احناف اہل سنت کی کھلی ہوئی مخالفت نہیں اور حضور پر غلط الزام نہیں لگایا گیا؟

جواب طلب امر یہ ہے کہ اس مصنف کے شاگرد مولوی اور معتقدین اس کتاب کی اشاعت کرتے اور اپنی تقریر و تحریر میں ہر طرز اس کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اہل سنت و جماعت کا صحیح مذہب یہی ہے اور ہم لوگ حنفی سنی ہیں تو کیا حقیقتاً ایسے نظریات رکھنے والے لوگ حنفی سنی کہلائے جانے کے مستحق ہیں یا کچھ اور؟۔ بنو ابالدلیل تو جروا عند الجلیل والسلام خیر ختام

محمد احمد قادری ۸/۱۰ انارٹ روڈ لاسکرٹی راولپنڈی ۲۳ اپریل ۱۹۵۷ء

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

الحمد لله وكفى والصلوة على من اصطفتی وعلى آله وصحبه وعلى من اجتبیٰ اما بعد سوالات کے جوابات سے پہلے چند مقدمات پیش کیئے جاتے ہیں جن کے سمجھ لینے کے بعد جوابات کے سمجھنے میں بہت کچھ آسانی ہو جائے گی۔

مقدمہ اولیٰ: تفسیر باب تفعلیل کا مصدر ہے اس کے لغوی معنی بیان کرنے اور کھول دینے کے ہیں اور یہ فرسے مشتق ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی اتقان فی علوم القرآن میں فرماتے ہیں:

التفسير من الفسر وهو البيان والكشف " (اتقان المصنوع صفحہ ۱۸۳) تفسیر خازن میں ہے: اما التفسير فاصله في اللغة من الفسر وهو كشف ما غطي وهو البيان المعاني المعقوله فكل ما يعرف به الشئ ومعناه فهو تفسير

تولفت میں تو تفسیر کے معنی پوشیدہ معانی کا بیان کر دینا ہے تو وہ ہر شئی جس سے معنی کی معرفت حاصل ہو تو وہ لغت تفسیری کہلائیگی۔ اور شرعاً تفسیر کے معنی جامع العلوم میں ہے۔

وفی الشرع توضیح معنی کی معنی الایۃ و شانہا و قصتها و السبب الذی نزلت فیہ بلفظ بدل علیہ دلالة ظاهرة التفسير بیان مراد المتکلم۔ (جلد ۱ صفحہ ۳۳۰)

جلالین کے حاشیہ جمل میں ہے:

التفسير تعین معنی اللفظ بواسطة نقل من قرآن او سنہ او اثر او بواسطة التخریج علی القواعد الادبیة (وفیہ ایضاً) التفسير كشهادة علی الله وقطع بانه عنی بهذا اللفظ هذا

المعنى ولا يجوز الابتسوف ولذا جزم الحاكم بان تفسير الصحابي مطلقا في حكم المرفوع -

اشعة المعات میں ہے: تفسیر آنکہ جزم کند کہ مراد حق ہمیں است اس معنی جز بمثل ازائمہ اہل تفسیر کہ برسد سند آنحضرت رسالت درست نباشد۔ (اشعہ جلد ۱ صفحہ ۱۶۵)

ان عبارات کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ شریعت میں تفسیر کے یہ معنی ہیں کہ آیات کے معنی کو اور اس کی شان اور قصہ کو اور اس سبب کو جس میں وہ نازل ہوئی اسے الفاظ میں واضح کرنا جو ظاہر طور پر دلالت کریں۔ یا توسط قرآن وحدیث واثر کے یا بواسطہ تخریج بقواعد عربیہ لفظ کے معنی کو متعین کرنے اور مراد متکلم کے بیان کرنے کو تفسیر کہتے ہیں۔ تو تفسیر اللہ تعالیٰ پر شہادت کے مثل ہے اور اس پر یقین کر لینا ہے کہ اللہ نے اس لفظ کے یہی معنی مراد لئے ہیں تو تفسیر بلا توقیف کے جائز ہوئی۔ اور وہ ائمہ تفسیر کی بغیر اور سند کے درست نہیں ہو سکتی بالجملہ تفسیر کے لغوی و شرعی معنی سلف وخلف نے یہ بیان فرمائے ہیں جس میں کسی کو مجال سخن وجائے رفتن باقی نہیں ہے۔

مقدمہ ثانیہ: اتقان میں ہے:

يجوز تفسيره لمن كان جامعاً للعلوم التي يحتاج المفسر اليها وهي خمسة عشر علماً احدها اللغة الثاني النحو الثالث التصريف الرابع الاشتقاق الخامس المعاني السادس البيان السابع البديع الثامن علم القراءات التاسع اصول الفقه العاشر اسباب النزول الحادي عشر القصص الثاني عشر النسخ والمنسوخ الثالث عشر الفقه الرابع عشر الاحاديث الخامس عشر علم الموهبة فهذه العلوم التي هي لازمة للمفسر ولا يكون مفسراً الا بتحصيلها۔

(ملخصاً اتقان جلد ۲ صفحہ ۱۸۱)

اس عبارت سے ظاہر ہو گیا کہ جب تک ان پندرہ علوم لغت، نحو، صرف، اشتقاق، معانی، بیان، بدیع، علم قرأت، اصول فقہ، جامع اسباب نزول، قصص، نسخ منسوخ، فقہ، حدیث علوم موبہ کا تفسیر کرنے والا جامع نہ ہو اس کو تفسیر کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

مقدمہ ثالثہ: جو مفسر ان پندرہ علوم کا جامع بھی ہو جو مقدمہ ثانیہ میں مذکور ہوئے لیکن وہ بد مذہب مخالف سنت ہو تو شرعاً نہ وہ مفسر قرآن ہو سکتا ہے اور نہ اس کی تفسیر قابل اعتماد ہو سکتی ہے کہ شرائط مفسر سے اہم شرط عقیدہ کا صحیح ہونا ہے۔ اتقان میں ہے:

قال الامام ابو طالب الطبري في اوائل تفسيره القول في آداب المفسر اعلم ان من شرطه صحة الاعتقاد اولا ولزوم سنة الدين فان كان مغمو صا عليه في دينه لا يؤتمن على الدين فكيف على الدين ثم لا يؤتمن في الدين على الاخبار عن عالم فكيف يؤتمن في الاخبار عن اسرار الله تعالى ولا نه لا يؤمن ان كان متهما بالاحاد ان يبغى الفتنة ويغر الناس بلبه وخداعه كذاب الباطنية وغلاة الرافضة وان كان متهما بهوى لم يؤمن ان يحمله هواه كلما يوافق بدعته كذاب القدريه فان احدهم يصنف الكتاب في التفسير ومقصوده منه الايضاح الساكن ليصدهم عن اتباع السلف وطريق الهدى۔

(اتقان جلد ۲ صفحہ ۱۷۶)

اس عبارت سے ظاہر ہو گیا کہ جو شخص بد عقیدہ ہو اور دین میں مطعون ہو تو جب وہ دین ہی میں معتمد نہیں ہوتا تو عین میں کیسے معتمد ہوگا اور وہ احکام قرآنی و اسرار الہی میں کس طرح امین ہو سکتا ہے اور اس کی یہ تفسیر لوگوں کو محض دھوکہ دینے اور فتنہ میں مبتلا کرنے اور اتباع سلف سے روکنے کے لئے ہے تو اس سے فرق باطلہ مثلاً رافضی، قادیانی چکڑالوی، دیوبندی، غیر مقلد، مودودی، نیچری کے مفسرین اور ان کی تفسیروں کا حکم ظاہر ہو گیا کہ وہ اپنی بد عقیدگی و گمراہی کی بنا پر شرعاً نہ تو وہ مفسر ہو سکتے ہیں نہ ان کی تفسیریں اہل اسلام کے لئے قابل استناد و لائق اعتماد ہو سکتی ہیں۔

مقدمہ رابعہ: قرآن کریم کی صحیح تفسیر وہ ہے جو قرآن وحدیث واقوال صحابہ و تابعین سے روایت ثابت ہو۔ اور بمقتضائے قواعد ادبیہ لغت، نحو، صرف، معانی، بیان، بدیع اور اصول اسلامی کے موافق ہو۔ اور جو تفسیر اپنے ناقص اجتہاد اور اپنی خواہش اور رائے سے ہو تو وہ شرعاً تفسیر قرآن نہیں اسی کو تفسیر بالرائے بھی کہتے ہیں۔

اتقان میں ہے: قال الماتريدي التفسير القطع على ان المراد من اللفظ هذا وا لشهادة على الله انه عني باللفظ هذا فان قام دليل مقطوع به فصحيح والا فتفسير بالرائة وهو المنهي عنه۔

اسی میں ہے: لا يجوز تفسير القرآن بمجرد الرأى والاجتهاد ومن غير اصل بلکہ اس تفسیر بالرائے کی ممانعت میں احادیث مروی ہیں۔ حدیث (۱) ترمذی میں ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی کہ رسول اللہ صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: "من قال فی القرآن برأیه فلیتبوأ مقعده من النار"

(مشکوٰۃ صفحہ ۳۵)

جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کہا تو چاہئے کہ وہ اپنے بیٹھنے کی جگہ دوزخ میں بنائے۔

حدیث (۲) من فسر القرآن برأیه فلیتبوأ مقعده من النار

(رواہ فی مسند احمد از کنوز جلد ۲ صفحہ ۱۷۵)

جس نے قرآن کی اپنی رائے سے تفسیر کی تو وہ دوزخ میں اپنی جائے نشست بنائے۔

علامہ محی السنۃ علاء الدین علی خازن لباب التاویل فی معانی التنزیل میں اسی حدیث کے تحت میں فرماتے ہیں:

قال العلماء المنهی عن القول فی القرآن بالرأی انما ورد فی حق من یتناول القرآن علی مراد نفسه وما هو تابع لہو او هذا لا یخلو ما ان یکون من علم اولاً فان کان بمن علم کمن یتحتج ببعض آیات القرآن علی تصحیح بدعته وهو یعلم ان افراداً من الآیات غیر ذالک غرضہ ان یلبس علی خصمه بما یقوی حججہ علی بدعته کما یتعملہ الباطنیۃ والخوارج وغیرہم من اهل البدع فی المقاصد الفاسدة لیغروا بذلك الناس وان کان القول فی القرآن بغیر علم لکن عن جهل وذلك بان تكون الآیۃ محتملة لوجوه فیفسرها بغیر ما تحتلہ من المعانی والوجوه فہذا ان القسمان مذمومان وکلاهما داخل فی النهی والوعید الوارد فی ذالک۔

(تفسیر خازن مصری جلد ۱، ۶)

یہاں تک کہ اس تفسیر بالرائے کی ممانعت میں ترمذی و ابو داؤد میں حضرت جناب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

حدیث (۳) من قال فی القرآن برأیہ فاصاب فقد اخطأ۔ (مشکوٰۃ شریف)

جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کہا اور درست و حق بات اس نے کہی تو بلاشبہ اس نے جب بھی خطا کی۔

اتقان میں اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

من قال فی القرآن قولاً یوافق ہواہ ولم یأخذہ عن ائمة السلف و اصاب فقد اخطأ لحکمہ علی القرآن بما لا یعرف اصلہ ولا یقف علی مذاہب اهل الاثر والنفل فیہ۔

(اتقان جلد ۲ صفحہ ۸)

ان عبارات سے ظاہر ہو گیا کہ ایسی تفسیر بالرائے جو تفاسیر سلف کے خلاف ہو وہ نامقبول اور غیر مستند ہے اور جس نے ایسی تفسیر بالرائے کی وہ گمراہ بدعتی بلکہ کافر ہے۔

اتقان میں ہے: من عدل عن مذاہب الصحابة والتابعین وتفسیر ہم الی ما یخالف ذلک کان مخطیاً فی ذالک بل مبتدعاً لانہم کانوا اعلم بتفسیرہ ومعانیہ۔

(اتقان جلد ۲ صفحہ ۱۷۸)

تفسیر حضرت محی الدین بن العربی میں ہے "من فسر برأیہ فقد کفر"

ملا علی قاری کے شرح فقہ اکبر میں یہ حدیث مذکور ہے "من فسر القرآن برأیہ فقد کفر"

(شرح فقہ اکبر صفحہ ۱۵۴)

یعنی جس نے قرآن کی تفسیر بالرائے کی تو وہ کافر ہو گیا۔

تو اب تفسیر بالرائے کرنے والے کا حکم حدیث شریف سے ثابت ہو گیا کہ وہ کافر و مرتد ہے۔ ان مقدمات کے سمجھ لینے کے بعد سوالات کے جوابات خود ہی سمجھ میں آجائے چاہئیں۔ لیکن مزید اطمینان کے لئے ہر سوال کا جواب تفصیلی طور پر بھی لکھ دیا جاتا ہے۔

جواب سوال اول: قرآن کریم کی آیۃ فأتو بسورۃ من مثله کی تفسیر میں جو مفسرین سلف و خلف نے فرمایا کہ قرآن کریم اپنی فصاحت و بلاغت میں معجزہ ہے اور اس کا فصیح و بلیغ ہونا ہی ہمارے نبی کی نبوت کی روشن دلیل اور زبردست حجت ہے۔

تفسیر بیضاوی میں ہے: الحجة علی نبوة محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم هو القرآن المعجز بفصاحته التي بدت فصاحة كل منطق واقحامه من طول بمعارضة من مصافح الخطباء من العرباء مع كثرتهم وافر اطهم فی المضادة والمعارضة وتهالكهم علی المعزة والمعاراة وعرف ما یعترف به اعجازه یتقین انه من عند الله کما یدعیہ۔

اور متحد یہ حقیقت قرآن کا فصاحت و بلاغت میں بلاغت ہونا ہی ہے۔

تفسیر مدارک میں ہے: فیہ دلیلان علی اثبات النبوة صحة کون المتحدی بہ معجزاً والاخبار بانہم لن یفعلوا وهو غیب لا یعلمہ الا الله۔

تو اس آیۃ کریمہ کی تفسیر تو یہی ہے جو ان مفسرین کرام نے تحریر فرمائی۔ اور اسی پر ہمیشہ سے اہل

اسلام کا اعتقاد رہا اور آج تک ہے۔

اب باقی رہا اس نام نہاد مفسر کا ان سب کے خلاف یہ کہنا ”لیکن خیال کرنا چاہئے کہ کفار کو عاجز کرنا کوئی فصاحت سے نہ تھا الخ“ خود نص قرآنی کے خلاف ہے کہ آیت میں (مثلاً) فرمایا گیا یعنی الکی سورۃ لاؤ جو فصاحت و بلاغت میں حسن و ترتیب میں سورۃ قرآن کے مثل ہو۔ پھر اگر اس میں فصاحت و بلاغت ہی کا اعتبار نہ کیا جائے تو اس مفسر کے نزدیک ”مثلاً“ کا کلمہ ہی بیکار اور زائد قرار پاتا ہے اور کام الہی میں یہ بات ممکن نہیں۔ پھر جب بقول اس کے کفار کا عاجز کرنا فصاحت کی بنا پر نہ تھا تو اگلی آیت میں ”لن تفعلوا“ کا ہمیشہ کے لئے دعویٰ کون سے عجز کی بنا پر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دعویٰ فصاحت و بلاغت میں مثل قرآن کے عاجز ہو جانے کی بنا ہی پر تو ہے تو اس جری مفسر نے قرآن کریم کا بھی مقابلہ کیا بلکہ اللہ عز و جل کی مخالفت بھی کی۔ اور جب یہ عجز دلیل نبوت اور سبب ظہور معجزہ بھی تھا تو یہ گمراہ مفسر نہ فقط فصاحت قرآن کا منکر بلکہ دلیل نبوت اور سبب ظہور معجزہ کا بھی منکر قرار پایا۔ لہذا جمہور مفسرین کی مخالفت کا یہ نتیجہ نکل آیا کہ وہ اپنا دین بھی کھو بیٹھا۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

جواب سوال دوم: آیۃ کریمہ وادخلو الباب سجدا میں باب کے متعلق چند اقوال منقول ہیں۔ اور ایک چیز میں مفسرین کے چند اقوال خصوصاً قصص میں اکثر اختلاف روایات کی بنا پر ہوتے ہیں کی قصہ میں رائے واجتہاد کا کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ سماعت پر موقوف ہوتا ہے۔

چنانچہ اتقان میں ہے: الثالث علوم علمها الله نبيه مما اودع كتابه من المعاني الحلیة والخفیة وامره بتعلیمها وهذا ینقسم الی قسمین منه لا یجوز الکلام فیہ الا بطریق السمع وهو اسباب النزول والناسخ والمنسوخ والقرأت واللغات وقصص الامم المعاضیة واخبار ما هو کائن من الحوادث وامور الحشر والمعاد ومنه ما یؤخذ بطریق النظر والاستدلال والاستنباط والاستخراج من الالفاظ الخ۔

(اتقان جلد ۲ صفحہ ۱۸۳)

تو جو بات سماعت بالروایت سے ثابت ہے اس کو اس نام نہاد مفسر کا کذب کہنا گویا اس روایت کو کذب قرار دینا ہے اور ثابت بالروایت کی تکذیب کرنے والے کے گمراہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ لہذا یہ گمراہ مفسر حضرات مفسرین کرام کو کاذب کہہ کر خود کاذب و گمراہ قرار پایا بلکہ روایات کا منکر اور سلف و خلف کا مخالف ٹھہرا۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

جواب سوال سوم: مفسرین کرام نے فقلنا اضربوه ببعضها کی تفسیر میں جو قصہ تفصیلی تحریر فرمایا ہے وہ درست اور صحیح ہے اور اس کو روایات سے اخذ کیا گیا ہے۔ اور اجمالی قصہ تو خود قرآن میں بھی موجود ہے جس کا مطلقاً انکار کوئی مسلمان تو کر ہی نہیں سکتا۔ اور یہ نام نہاد مفسر اسکا انکار محض اپنی ناقص رائے سے کرتا ہے۔ اور یہ کہتا ہے کہ وہ قاتل چالیس برس کی مدت تک کس طرح رہ سکتا ہے تو یہ مفسر نہ فقط روایت ہی کا انکار کرتا ہے بلکہ خود منصوص فی القرآن کا بھی انکار کر رہا ہے۔ نیز جب اس کے نزدیک چالیس سال کے فاصلہ کے بعد مردہ کا زندہ ہونا قابل انکار ہے تو وہ سو برس کے پڑے رہنے کے بعد مردے کے زندہ ہو جانے پر کس طرح ایمان لائیگا۔ لہذا اس گمراہ مفسر کے نزدیک حضرت عزیر علیہ السلام اور ان کے گدھے کا سو برس کے بعد زندہ ہونا بدرجہ اولیٰ غلط ہوگا۔ اور حضرت مسیح علیہ السلام کا صد ہا برس پڑے رہنے کے بعد مردوں کا زندہ کرنا بالکل ہی غلط قرار پایگا باوجودیکہ ایسے احیاء موتی کے واقعات قرآن کریم میں موجود ہیں۔ تو یہ مفسر بلاشبہ گمراہ و بیدین ہوا کہ ثابت الروایت بلکہ منصوص فی القرآن کو وہ کس دلیلی و جرأت سے غلط کہتا ہے اور محض اپنی رائے سے ان کی تغلیط کرتا ہے العیاذ باللہ تعالیٰ

جواب سوال چہارم: مفسرین نے طاغوت کے معنی کل عبد من دون اللہ بیان کر کے شیطان و بت مراد لئے ہیں۔

تفسیر جلالین میں ہے: فمن یکفر بالطاغوت الشیطان او الاصنام
تفسیر مدارک التقریل میں ہے: فمن یکفر بالطاغوت بالشیطان او الاصنام
حضرات ملائکہ کرام و مرسلین عظام پر تو کسی طرح لفظ طاغوت کا اطلاق جائز نہیں ہو سکتا کہ آیۃ کریمہ میں یہ فرمایا گیا ہے ”فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ فقد استمسک بالعروة الوثقی یعنی تو جو شیطان کو نہ مانے اور اللہ پر ایمان لائے اس نے بڑی محکم گرہ تھامی۔

تو اس آیۃ کریمہ میں کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ میں صفت تقابل ہے اور کفر بالطاغوت ایمان باللہ پر مقدم ہے۔ اور دوسری آیت میں یہ فرمایا گیا:

یا ایہا الذین آمنوا آمنوا باللہ ورسولہ والکتاب الذی نزل علی رسولہ والکتاب الذی انزل من قبل ط ومن یکفر باللہ وملکته وکتابہ ورسولہ والیوم الآخر فقد ضل ضلالا
(سورۃ النساء ع ۲۰)

یعنی اے ایمان والو ایمان رکھو اللہ اور اس کے رسول پر اور اس کی کتاب جو اپنے ان رسولوں پر

اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جو اللہ اور اس کے فرشتوں اور کتابوں اور رسولوں اور قیامت کے ساتھ کفر کرے تو وہ دور کی گمراہی میں ضرور پڑا۔

اس آیت کریمہ سے یہ ثابت ہوا کہ ایمان بالمملکتہ والرسل ایمان باللہ ہی میں داخل ہے تو وہ کفر بالطاغوت پر مقدم قرار پایا اور اس کا مقابل ٹھہرا۔ اب ٹھنڈے دل سے فیصلہ کیجئے کہ اگر بقول اس گمراہ مفسر کے لفظ طاغوت ملائکہ اور رسولوں کو بھی شامل ہوتا تو نہ ایمان بالمملکتہ والرسل ایمان باللہ ہی میں داخل ہوتا نہ کفر بالمملکتہ والرسل کفر باللہ قرار پاتا بلکہ ایمان بالملائکہ والرسل کفر باللہ کے ساتھ جمع ہوتا اور کفر بالملائکہ والرسل ایمان باللہ کے ساتھ پایا جاتا جس کا کفر بالطاغوت ایمان باللہ کے ساتھ آیت اولیٰ میں جمع ہے بلکہ ایمان باللہ کا مقابل کفر بالملائکہ والرسل ہوتا۔ اور ایمان باللہ پر کفر بالملائکہ والرسل مقدم ہوتا۔ تو اس صورت میں کس قدر ایمانیات و عقائد اسلام و آیات قرآن سے انکار لازم آتا ہے علاوہ بریں حضرات ملائکہ کرام و مرسلین عظام کو طاغوت میں داخل کر کے ان کا شیاطین و اضماع کے ساتھ ذکر و بے ادبی و گستاخی ہے اور ملائکہ و رسل کی تنقیص شان کو مستلزم ہے اور رسولوں میں صرف اس قدر کمال مانا کہ وہ عذاب الہی سے نجات پا لیتے ہیں ان کے علوم مراتب اور فضائل خاصہ سے صاف انکار ہے۔ لہذا اس گمراہ مفسر نے مرسلین کی نہ صرف ایک توہین و تنقیص شان کی بلکہ چند توہینیں اور تنقیصیں کیں تو یہ مفسر شان ملائکہ و مرسلین کا سخت گستاخ و بے ادب ثابت ہوا۔

جواب سوال پنجم :- کتاب مبین کو تمام باتوں کا جامع نہ ماننا قرآن کریم کی تکذیب ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَا حِجَابَ فِي ظِلْمَتِ الْأَرْضِ وَلَا رُطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مَّبِينٍ یعنی کوئی دانہ نہیں زمیں کی اندھیروں میں اور نہ کوئی تر اور خشک جو ایک کتاب مبین میں لکھا ہو۔ اس آیت کریمہ سے صاف ظاہر ہے کہ ہر تر اور خشک کتاب مبین میں لکھا ہوا ہے تو اس مفسر نے اس طرح کثیر آیات کا انکار کیا۔ اور اس سے زیادہ بدتر اس کا یہ قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اعمال ان کے کرنے سے پہلے کا کوئی علم نہیں کہ لوگ کیا عمل کریں گے بلکہ اللہ کو ان کے کرنے کے بعد معلوم ہوگا۔ لہذا اس بیدین مفسر نے اپنے اس قول میں علم الہی کی صریح توہین و تنقیص کی اور کثیر آیات و احادیث سے صاف انکار کیا۔ اور کتب عقائد کی تکذیب کی تو اس مفسر کے کافر و بیدین ہونے میں کیا شبہ باقی رہا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

جواب سوال ششم :- یا جو نوجو جوج سے کافر اور انگریز مراد لینا بھی تفسیر بالرائے ہے اور ملائکہ

نفس سے بلا شک ان تمام آیات و احادیث کی تکذیب اور انکار لازم آتا ہے جن میں ان کے نام اور پھر ان کے احوال وارد ہیں اس سے اس مفسر کی دلیری و جرأت کا پتہ چلا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

جواب سوال ہفتم :- آیت کریمہ ان الله و ملائكتہ يصلون على النبي الآیہ کی جو تفسیر اس نام نہاد مفسر نے لکھی یہ بھی تفسیر بالرائے ہے میری نظر سے کسی تفسیر میں نہیں گذرا اس تفسیر کے نادرست ہونے کے لئے اس قدر بات کافی ہے کہ یہ تفسیر بالرائے معلوم ہوتی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

جواب سوال ہشتم :- سورۃ احزاب میں یہ فرمایا گیا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عَدَةٍ تَعْتَدُونَهَا

یعنی ایمان والو جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کرو پھر انہیں بے ہاتھ لگائے چھوڑ دو تو تمہارے لئے ان پر کچھ عدت نہیں جسے گنواں آیت کریمہ سے یہ معلوم ہوا کہ عورت کو اگر قبل قربت یا طلاق صحیحہ کے طلاق دی تو اس پر عدت واجب نہیں۔ لیکن اس مفسر کا کس بے ادبی سے یہ کہنا بلکہ یہ اصرار کرنا کہ زینب کو طلاق بالدخول دی گئی۔ اولاً اس نے حضرت ام المؤمنین زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا ام گرامی کس گستاخی کے ساتھ لکھا کہ تعظیم کا کوئی کلمہ اول و آخر کہیں نہیں لکھا ثانیاً یہ صریح کذب ہے کہ ان کو طلاق قبل دخول دی گئی کتب سیر میں ہے کہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت زینب سے نکاح ہجرت سے اٹھ سال قبل کیا تھا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حضرت زینب سے نکاح ہجرت کے پانچ یا چار یا تین سال بعد کیا ہے۔ تفسیر جمل میں ہے:

و كان تزوج زيد بزینب قبل الهجرة بنحو ثمان سنين

اور مواہب لدنیہ اور زرقانی میں ہے:

و كان تزوجها له صلى الله عليه وسلم في سنة خمس من الهجرة و قيل سنة اربع و قيل سنة ثلاث۔

تو اس بنا پر حضرت زینب حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس ۱۱ یا ۱۲ یا ۱۳ سال کی مدت تک رہیں۔ چنانچہ مواہب میں ہے ”فمكثت عنده مدة ثم طلقها“ یعنی حضرت زینب حضرت زید کے پاس ایک مدت تک رہیں پھر حضرت زید نے انہیں طلاق دی تو کیا اس دراز مدت تک ان میں زن و شوہر

امور ملائکہ کو اللہ تعالیٰ تقسیم کرتا ہے اور مغرب کے بعد سے رحمت الہی بندوں کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور بعض روایات میں ہے کہ رمضان شریف کی ستائیسویں تاریخ کی رات ہے دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان دونوں تاریخوں میں کونسی تاریخ ہے کہ جس میں سال بھر کا حساب ملا کر سوئپ دیا جاتا ہے۔

﴿انا انزلناه فی لیلة القدر﴾ کی تفسیر میں لیلة القدر اس لئے نام رکھا گیا کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ امور رزاق احکام کی تقدیر ملائکہ پر ظاہر کر دیتا ہے اور احادیث میں بھی اس شب کو رمضان المبارک میں آخری عشرہ میں بیان کیا ہے۔

اور پچیسویں پارے سورہ دخان میں ﴿حم الكتاب المبين انا انزلناه فی لیلة مبارکة﴾ کی تفسیر میں بھی کہا ہے کہ یہی لیلة النصف من شعبان۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ کی حدیث آگے بیان کی ہے رت باری آسمان دنیا پر نازل ہوتی ہے اور ندا کرتی ہے بندوں کو نیز قرآن کریم کے نازل کرنے کو فرمایا ہے کہ اس رات میں جملہ واحدہ آسمان دنیا پر نازل کر دیا گیا پھر ضرورت کے مطابق حضور پر اترتا رہا (لیلة المبارک اور لیلة القدر کو ایک ہی کہا گیا ہے نیز اس شب میں جو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بات مروی ہے وہ بھی تحریر کی جائے جیسا کہ بعض روایات میں ہے۔ دس بھی ہیں دو نفل بھی ہیں سو نفل بھی ہیں۔ بیوا تو جروا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

سورہ دخان کی آیہ کریمہ ﴿حم والكتاب المبين انا انزلناه فی لیلة مبارکة﴾ میں لیلة مبارکہ کی تفسیر میں مختلف اقوال وار ہیں بعض کے نزدیک اس سے مراد شب براءت ہے لیکن جمہور مفسرین کے نزدیک اس سے مراد لیلة القدر ہے۔

تفسیر مدارک میں ہے ﴿لیلة مبارکة﴾ ای لیلة القدر او لیلة النصف من شعبان (الجمہور علی الاول)

تفسیر جمل میں ہے "اختلف فی قوله تعالیٰ فی لیلة مبارکة فقال قتادة وابن زید واكثر المفسرين وهی لیلة القدر وقال عكرمة وطائفة انها لیلة البراءة وهی لیلة النصف من شعبان۔

تفسیر صاوی میں ہے:

کے تعلقات نہ رہے اور دخول یا خلوة صحیحہ کی نوبت ہی نہیں آئی۔ یہ کس قدر بعید از عقل بات کہ حقیقت یہ تھی کہ ان کے مابین ایسی نوبت آئی اور بار بار آئی۔ چنانچہ تفسیر خازن وجمل وغیرہ تحت آیہ کریمہ فلما قضی زیدمنها و طرا کے تحت میں فرماتے ہیں:

و طلقها وانقضت عدتها و ذکر قضاء الوطر يعلم ان زوجة المتبنی تحل بعد دخول بها۔

اس عبارت سے صاف ظاہر ہو گیا کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق بعد دخول دی گئی اب ملاحظہ ہو کہ یہ مفسر کیا سخت کاذب اور افترا پرداز اور بہتان طراز ثابت ہوا۔

ثالثاً: اس مفسر کا یہ قول (اور رسول صلعم نے آپ کو بلا عدت نکاح کر لیا) کیا صریح افترا اور بہتان اور کتنا جیتا جھوٹ ہے بلکہ تمام مفسرین واصحاب سیر کی تصریحات کے خلاف ہے واقعہ یہی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب سے عدت گزر جانے کے بعد عقد کیا ہے تو اس بیدین مفسر نے احکام دینیہ کی کیسی کھل کر مخالفت کی۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا ناپاک الزام اور صریح افترا اور بہتان لگایا۔ اور بموجب حدیث شریف "من کذب علی متعمداً فلیتبوء مقعده من النار" کے وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنایا۔

بالجملہ یہ گمراہ مفسر ہرگز ہرگز نہ سنی ہے نہ حنفی بلکہ مذہب اہل سنت سے خارج اور سخت گمراہ و ضال و مضل ہے۔ اور اس کی یہ تفسیر سخت گمراہ اور مخالف عقائد و احکام اسلام ہے۔ اور سلف و خلف مفسرین کے خلاف تفسیر بالرائے ہے۔ تو اس کی اشاعت کرنا اور اس کے متعلق پروپیگنڈہ کرنا یقیناً گمراہی اور بدعت کی اشاعت کرنا ہے۔ اور عقائد و احکام اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کرنا ہے۔ اہل اسلام ایسی غلط و باطل تفسیر کو ہرگز ہرگز نہ دیکھیں۔ اور اس کے مطالعہ سے انتہائی اجتناب و پرہیز کریں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۲۸ سوال المکرم ۱۳۷۷ھ

کتبہ: اکتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنجل

(۵۰۹)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں

بعض روایات میں ہے کہ رزق، عمر، موت، حیات وغیرہ شعبان کی پندرہویں شب میں

”ان انزلناه فی لیلة مبارکة“ ہی لیلة القدر هذا قول قتادة وابن زید واکثر المفسرین ثم قال بعد ادلة هذا القول (هذا ادلة ظاهرة واضحه على انها لیلة القدر وهو المعتمد“

ان تفاسیر سے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ قول معتمد جس پر جمہور مفسرین ہیں وہ یہی ہے کہ لیلة مبارکہ سے مراد لیلة القدر ہے پھر جب اس کا لیلة القدر ہونا ثابت ہو گیا تو پھر رزق، عمر، موت، حیات سال بھر کے حساب کا ملائکہ کو سونپ دینا اس شب کے لئے بھی ثابت ہو گیا۔

چنانچہ تفسیر خازن میں ہے ”قال ابن عباس یکتب من ام الكتاب فی لیلة القدر مع هو کائن فی السنة من الخیر والشر والارزاق والاجال حتی الحجاج“

نیز بعض روایات سے ان امور کا شب برأت میں سونپنا بھی ثابت ہے چنانچہ ما ثبت من انہ میں ہے ”قال عکرمۃ فی لیلة نصف من شعبان یرم امر السنة وینسخ الاحیاء ویکتب الحاج فلا یزاد فیہم احد ولا ینقص منہم احدا“

تو سلف و خلف نے ان مختلف روایات میں اس طرح تطبیق کر دی ہے کہ ان امور کے سونپنے کی ابتدا تو شب برأت سے کر دی جاتی ہے اور اس سے فراغت لیلة القدر میں حاصل ہو جاتی ہے۔

چنانچہ ما ثبت من السنة میں ہے ”اکثر اهل العلم الی ان ذالک یکون فی لیلة القدر والابتداء فیہ یکون من لیلة النصف من شعبان“

تفسیر جمل میں ہے ”وقیل یدأ فی استنساخ ذالک من اللوح المحفوظ فی لیلة البراءة ویقع الفراغ فی لیلة القدر۔“

بالجملہ ان امور کا سونپنا ان دونوں شبوں کے لئے ثابت ہو گیا اگرچہ یہ امر متحقق ہے کہ شب قدر شب برأت سے افضل ہے۔ شب برأت میں نوافل کی تعداد میں مختلف احادیث وارد ہیں بعض میں چودہ رکعات ہیں بعض میں ایک سو رکعات ہیں پھر محدثین نے خود ان روایات میں کلام کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بزیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمیل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمیل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

هل يجوز للصبيان ان تهدي ثواب قرأة القرآن للميت وان يو مروا به ام لا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

قرأة القرآن للصبي حسنة اذا لا ذنوب عليه حتى تكفر بها فيثاب على الحسنات ولا جل ذلك صرح في الفتاوى السراجية والخانية اذا فعل الصغير شيئاً من الحسنات تكون له واهداؤه للميت ثواب قرأة القرآن ايضاً حسنة له اذ هو فعل الصحابة كما اخرج الخلال في الجامع عن الشعبي قال كانت الانصار اذ مات لهم الميت يختلفوا الى قبره بقرؤن له القرآن ووقع عليه اجماع المسلمين كما نقله العلامة السيوطي في شرح الصدوران المسلمين مازالوا في كل عصر يجتمعون ويقرؤن لموتاهم من غير تكبير فكان ذلك اجماعاً بل ورد في الحديث ان هدية الاحياء الى الاموات الا ستغفار لهم ورائه البيهقي في شعب الايمان والد يلمى عن ابن عباس وروى الطبراني في الاوسط والبيهقي في السنن عن ابي هريرة قال: قال رسول الله تعالى صلى الله تعالى عليه وسلم ان الله ليرفع الدرجة للعبد الصالح في الجنة فيقول يا رب اني لى هذه فيقول يا ستغفار ولدك لك ولفظ البيهقي بدعاء ولدك لك فظهر لك ان اهداء الصبي ثواب القراءة والدعاء والاستغفار للميت حسن له وثابت من عمل الصحابة والاجماع والا حاديث ونافعة للاموات على ان في هذه لا ضرر عليه بل له منفعة عظيمة لحديث مروي في الفتاوى الخانية حسنة تكون لابويه لما روى عن انس بن مالك انه قال من جملة ما ينتفع به المرء بعد موته ان يترك ولداً علمه القرآن والعلم فيكون لوالده اجر ذاك من غير ان ينقص من اجر الولد شيء واخرج ابو محمد السمرقندي في فضائل قل هو الله احد عن علي مرفوعاً من مر على المقابر وقرأ قل هو الله احد احدى عشرة مرة ثم وهب اجره للاموات اعطى من الاجر بعد دالاموات وايضاً ان الصبي يومر باهداء ثواب القرأة للميت لانه حسنة له ويومر الصبي للحسنات كما في رد المحتار انه يومر بجميع المامورات وينهى عن جميع المنهيات

فهذا غاية التحقيق في هذه المسئلة: والله تعالى اعلم بالصواب؛ -

کتبہ: لمعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۵۱۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ
اگر زید بکر سے کہے کہ ایک قرآن شریف پڑھ کر میرے باپ کی روح کو اس کا ثواب بخش
دیجئے میں آپ کی کچھ خدمت کروں گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ زید نے بکر سے کہا کہ آپ ایک قرآن شریف پڑھ کر میرے والد کی
روح کو اس کا ثواب بخش دیجئے اور فلاں روز ان کا چہلم ہے اور فاتحہ میں بھی شریک ہو جائیے جب فاتحہ
کے بعد بکر اپنے مکان کو آنے لگا تو زید نے معافی وغیرہ مانگی جیسا کہ عام رواج ہے اور مصافحہ کرتے ہو
ئے بکر کو دس بارہ یا پانچ چھ روپیہ دیے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ زید نے بکر سے کہا میرے والد کا انتقال ہو گیا ہے ان کے لئے ایک
قرآن پڑھ کر ثواب بخش دیجئے۔ بکر نے قرآن شریف پڑھ کر مردہ کی روح کو اس کا ثواب بخش دیا۔ اس
کے بعد بکر زید کو ملتا تو پوچھا کیوں صاحب آپ نے قرآن ختم کر لیا یا ابھی نہیں؟ بکر نے کہا جی ہاں فلاں
روز ختم ہو گیا ہے تو زید نے شیرینی دی کہ اسے بچوں میں تقسیم کر دینا اور چھ روپیہ دیے کہ یہ آپ کے لئے
ہیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے ان تمام صورتوں میں بکر کو کچھ لینا جائز ہے یا ناجائز۔ بینوا تو جروا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

ان تینوں صورتوں میں اگر زید بغرض اجرت دے رہا ہے اور بکر بھی بخیاں اجرت لے رہا ہے تو
ایسی اجرت ناجائز ہے نہ میت کو اس تلاوت کا ثواب پہنچے۔
ردالمحتار میں ہے:

لا یصح الاستیجار علی القراءة واهدائها الی المیت لا نہ لم ینقل عن احد من الائمة
الا ذن فی ذلك وقد قال العلماء ان القاری اذا قرأ لا جل المال فلا ثواب له فای شیء
یهدیه الی المیت وانما یصل الی المیت العمل الصالح والا استیجار علی مجرد التلاوة لم

یقل به احد من الائمة۔ (ردالمحتار ص ۵۳۷ ج ۵)

قرأت پراجرت لینا اور اس کا ثواب میت کی طرف ہدیہ کرنا صحیح نہیں کیونکہ اس کی اجازت ائمہ
میں سے کسی سے منقول نہیں اور علماء نے فرمایا کہ جب قاری مال کیلئے پڑھے تو اسے ثواب نہیں ہوتا پھر وہ
کس چیز کا میت کیلئے ہدیہ کرتا ہے اور میت کو تو عمل صالح پہنچتا ہے اور صرف تلاوت پراجرت کو ائمہ میں
سے کوئی بھی نہیں کہتا۔

اور اگر زید بکر میں نہ اجرت طے ہوئی نہ اس پر کچھ گفتگو ہوئی لیکن وہاں کے عرف و رواج میں
دینے والا اسی نیت سے دیتا ہے اور پڑھنے والا اسی نیت سے پڑھتا ہے اور ختم قرآن کریم پر لینے دینے کا
دستور ہے تو اس کا بھی یہ حکم ہے کہ یہ ناجائز ہے۔ فقہاء کرام کا مشہور قاعدہ ہے۔ المعروف کالمشروط
(ردالمحتار ص ۵۳۶ ج ۵)

ہاں اگر پڑھنے والا بہ نیت ثواب پڑھے اور دینے والا بلا لحاظ اجرت مشروطہ ومعروفہ کے محض
صدقہ کی نیت سے دے تو اس کے جواز میں کوئی شک نہیں نہ لینے والے کیلئے کوئی قباحت نہ دینے والے
کے لئے کوئی قباحت اور میت کیلئے باعث اجر و ثواب ہے۔

درمختار میں ہے: ولا یکره الدفن لیلا ولا اجلاس القارئین عند القبر وهو المختار۔

(شامی ص ۶۳۳ ج ۱)

شب میں وفق کرنا اور قبر کے نزدیک قاریوں کا بٹھانا مکروہ نہیں۔ یہی قول مختار ہے۔
لہذا بکر کو اس آخر صورت میں لینا جائز ہے اور پہلی ہر دو صورتوں میں ناجائز ہے، واللہ تعالیٰ اعلم
بالصواب۔

کتبہ: لمعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۵۱۲)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
دفن کے بعد قبر میت پر کسی عالم یا حافظ سے تین یا چار دن یا جمعرات یا جمعہ تک قرآن شریف کا
پڑھانا جائز ہے یا نہیں؟ بعض عالم دن معین کرنا جائز نہیں سمجھتے اور بعض تین یا چار دن یا جمعرات یا جمعہ
تک تلاوت کلام پاک کرنا حرام کہتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ کسی کتاب میں نہیں ہے اس کا جواب مع

دلائل شریعہ کے تحریر فرمائیں۔

المستفتی رحیم الدین نعیمی ساکن پڑاگنہ پوسٹ جلدی ضلع چانگام۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بعد دفن قبر پر قرآن کا پڑھنا یا پڑھوانا بلا شک جائز ہے بلکہ سنت صحابہ ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطی اپنی کتاب شرح الصدور بشرح حال الموت والقبور میں اس کے لئے

باب تحریر فرماتے ہیں:-

اخرج الخلال في الجامع عن الشعبي قال كانت الانصار اذامات لهم الميت

اختلفوا الى قبره يقرؤن له القرآن - (شرح الصدور مصری ص ۱۳۰)

خلال نے اپنی جامع میں شععی سے روایت کی کہ امام شععی نے فرمایا کہ انصار میں جب کوئی

مرجاتا تو اس کی قبر کی طرف جاتے تھے اور اس کے لئے قرآن شریف پڑھتے تھے۔

فقہ کی مشہور کتاب درمختار میں ہے:

لا يكره الدفن ليلا ولا اجلاس القارئین عند القبر وهو المختار۔

(شامی مصری ص ۶۳۳ ج ۱)

نہ شب میں دفن کرنا مکروہ ہے نہ قاریوں کا قبر کے پاس بٹھانا مکروہ یہی قول مختار ہے۔ یعنی مفتی

بہ ہے۔

غنیۃ شرح منیہ میں ہے: واختلف في اجلاس القارئین ليقروا عند القبر والمختار عدم

(غنیۃ مطبوعہ لکھنؤ ص ۵۶۴)

الکراهة۔

قبر کے پاس قاریوں کے پڑھنے کیلئے بٹھانے میں اختلاف ہوا تو قول مختار اور مفتی بہ مکروہ نہ ہونا

ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

وقراءة القرآن عند القبور عند محمد رحمه الله لا يكره ومشائخنا رحمهم الله اخذوا

واقوله وهل ينتفع والمختار انه ينتفع هكذا في المضمرة - (عالمگیری ص ۸۵ ج ۱)

امام محمد علیہ الرحمہ کے نزدیک قبر کے پاس قرآن شریف پڑھنا مکروہ نہیں جانا اور ہمارے فقہاء

علیہ الرحمہ نے اسی قول کو اختیار کیا اور کہا تلاوت سے میت کو نفع پہنچتا ہے تو قول مختاریہ ہے کہ نفع پہنچتا ہے ایسا ہی مضمرات میں ہے۔

نور الایضاح متن مراقی الفلاح میں ہے:

ولا يكره الجلوس للقراءة على القبر في المختار۔ (نور الایضاح ص ۶۶)

مختار مذہب میں قبر پر قرآن پڑھنے کیلئے بٹھانا مکروہ نہیں۔

طحاوی علی مراقی الفلاح میں ہے: واخذ من ذلك جواز القراءة على القبر وقال محمد

نستحب لورود الآثار وهو المذهب المختار ملخصا۔ (طحاوی ص ۳۶۳)

حدیث سے قبر پر قرآن پڑھنے کا جواز حاصل ہوا۔ امام محمد علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ آثار وارد ہونے

کی وجہ سے مستحب ہے اور یہی مذہب مختار ہے۔

بدر المنقہ شرح الملتقى میں ہے:

اختلف في اجلاس القارئین عند القبر والمختار عدم الكراهة۔

(بدر المنقہ مصری ص ۱۸۸ ج ۱)

قبر کے پاس قرآن پڑھنے والوں کے بٹھانے میں اختلاف ہوا تو قول مختاریہ ہے کہ یہ مکروہ نہیں

فتاویٰ قاضی خاں میں ہے:

وان قراءة القرآن عند القبور ان نوى بذلك ان

يونسهم صوت القرآن فانه يقرأ فان لم يقصد ذلك فالله تعالى يسمع قراءة القرآن حيث كان

نت۔

(قاضی خاں ص ۳۷۶ ج ۴)

اگر قبر کے پاس قرآن شریف پڑھا اور نیت یہ کی کہ قرآن کی آواز سے مردہ کو انس حاصل ہوگا تو

وہ قرآن شریف پڑھے اور اگر یہ قصد نہیں تو اللہ تعالیٰ جہاں کہیں قرآن پڑھا جاتا ہے سنتا ہے۔

شرح الصدور میں ہے: "وان ختموا القرآن على القبر كان افضل۔

(شرح الصدور ص ۱۳۰)

اگر لوگ قبر پر قرآن شریف ختم کریں تو افضل ہے۔

فتاویٰ برہنہ میں ہے۔ ص ۳۶۳ ج ۱:

درکنز گفتہ کہ مستحب است تصدق بروے نفثت روزہ اگر نماز یا روزہ یا عتاق یا عبادتے دیگر کندتا

ثواب اور بھیت رسد رواست۔

کنز میں کہا ہے کہ مردہ کے لئے سات دن تک صدقہ کرنا مستحب ہے اور اگر نماز روزہ غلام آزاد کرنا یا کوئی عبادت کرے اور اس کا ثواب مردہ کو پہنچائے تو جائز ہے۔

ان عبارات سے واضح ہو گیا کہ مذہب مفتی بہ اور قول مختار کی بنا پر قبر میت پر قرآن شریف پڑھنا جائز و مستحب ہے بلکہ سنت صحابہ اور حدیث شریف سے ثابت ہے اور تلاوت کلام اللہ سے میت کو نفع پہنچتا ہے اور انس حاصل ہوتا ہے اور ایک قرآن شریف کا ختم ہونا افضل ہے اور ایک ہفتہ تک صدقات و عبادات کا ثواب پہنچانا مستحب ہے۔

یہ وہ دلائل ہیں جن کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اب باقی رہے یہ تعینات سوم ہفتہ دم بستم چہلم وغیرہ تو یہ تعینات شرعی نہیں بلکہ وقتی مصلحتوں کی بنا پر ہیں جنکے عدم جواز پر کوئی دلیل شرعی نہیں ہے۔ اس قسم کے تعینات ہرزمانہ میں ہوئے اور اب بھی موجود ہیں۔

جیسے اوقات نماز پنجگانہ کے تعینات۔ اذان کے اوقات معینہ۔ تنخواہ امام و موزن کا تعین۔ درس قرآن کا تعین۔ درس حدیث کا تعین۔ درس نظامی کا تعین۔ نصاب درجات کے تعین۔ ہر درجہ کے استاذ کا تعین۔ تنخواہ مدرسین کے تعینات۔ تعلیم مدرسہ کے لئے دن کا تعین۔ ہر کتاب کے وقت کا تعین۔ ہر مدرسہ کیلئے کتابوں کا تعین۔ ایام تعطیل کا تعین۔ دستار بندی کے لئے ماہ شعبان کا تعین۔ تعلیمی سال کے ابتدا اور انتہا کا تعین۔ وعظ کی وقت کا تعین۔ اوراد و وظائف کے تعینات۔ اعمال کے تعینات۔ عقیقہ و نکاح کیلئے تعین۔ کھانے و دعوت کا تعین۔ اور اس کے علاوہ بکثرت تعینات نہ فقط عامۃ المسلمین میں بلکہ علماء و فضلاء و مشائخ و صلحا میں جاری و ساری ہیں۔ تو کیا ان تعینات کو معترضین نے کسی معتبر و مستند کتاب میں دیکھا ہے اور کسی شرعی دلیل سے ثابت پایا ہے۔ اگر یہ تعینات ثابت ہیں فتویٰ پیش کرو۔ ورنہ ان تعینات کی وجہ سے اس سب امور خیر کو بدعت و ناجائز ٹھہراؤ۔ اور عاملان تعینات کو گمراہ و بیدین قرار دو۔ تعجب ہے کہ جو خود تعینات کے پابند ہوں انہیں کیا حق حاصل ہے کہ سب کے ایصال ثواب کے تعینات پر زبان اعتراض کھول سکیں اور لوگوں کو امور خیر کے ایصال ثواب سے روکیں۔ بالجملہ مندرجہ فی السول کے تعینات نہ شرعاً ممنوع و ناجائز نہ ان کے عدم جواز پر کوئی دلیل شرعی قائم۔ لہذا ان تعینات کی وجہ سے قبر پر تلاوت قرآن کریم ناجائز نہیں ہو سکتی۔ مولے تعالیٰ منکرین کو قبول حق کی توفیق عطا فرمائے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: الفقیر الی اللہ عز و جل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

(۵۱۳)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

عمر کہتا ہے کہ قرآن شریف ہر شئی کا بیان ہے اور اس آیت سے ثابت ہے۔ ”و کذلک نبینا لکل شئی“ اس سے حضور کا عالم الغیب ہونا ثابت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ حضور کائنات کے ذرہ ذرہ کے عالم ہیں کوئی دانہ زمین کی خشکی اور تری میں ایسا نہیں جو قرآن کریم میں بیان نہ ہو ”ولا رطب ولا یاب بس الا فی کتاب مبین“ اس آیت سے ثابت ہوا کہ حضور کے احاطہ علم سے کوئی چیز باہر نہیں۔ اور زید کہتا ہے کہ قرآن شریف ہر شئی کا بیان نہیں ہے بہت سی باتیں دنیا کی تو درکنار سب دین کی باتیں بھی نہیں ہیں۔ جیسے نماز کی رکعات اور سجدہ سہو واجب ہونے کی صورتیں، زکوٰۃ کا سونے چاندی کا نصاب، بکری کا بھینس اونٹ کی تعداد، پھر انکی مقدار زکوٰۃ، روزہ کیسے ٹوٹ جاتا ہے، احرام باندھنا وغیرہ۔ ہزاروں وہ مسائل ہیں جو احادیث میں ملتے ہیں قرآن شریف میں ان کا کہیں پتہ بھی نہیں ہے۔

آگے چل کر وہ احکام مستبطہ ائمہ مجتہدین نے نکالے ہیں۔ جیسے حضرت ابو بکر کا خلیفہ اول ہونا، اور پھر حضرت عمر کا ولی عہد ہونا، اور حضرت عثمان کا شہید ہونا، اور حضرت علی کا شہید ہونا، انبیاء کی تعداد، فرشتوں کی تعداد، اصحاب نبی کی تعداد، ستاروں کی تعداد، اور ہزاروں ایسے واقعات ہیں جن کا قرآن شریف میں سراغ نہیں ملتا۔ زید اپنے مضمون کو ان آیات سے ثابت کرتا ہے۔

”واوتیت من کل شئی“ (سورۃ نمل رکوع ۱)

بلقیس کے لئے ثابت کرتا ہے اور کہتا ہے دینی امور کا تعلق علم نبوت سے ہوتا ہے۔

(سورۃ اعراف رکوع ۱۷) ”و کتب لہ فی اللواح من کل شئی مو عظة تفصیلا لک

لشئی۔

(سورۃ انعام ع ۱۹) ثم آتینامو سی الكتاب تماما علی الذی احق لکل تفصیلا لکل

شئی و ہدی و رحمة“

ان آیات مذکورہ سے ثابت کرتا ہے کہ قرآن شریف میں ہر شئی کا بیان نہیں تو حضور بھی ہر شئی کے عالم نہیں۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان دونوں میں کون حق پر ہے۔ بغیر توبہ کے دینی تعلیم حاصل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کا جواب براہ کرم قرآن و حدیث سے اور فقہ سے ہونا چاہئے۔

بیوا تو جروا۔ المستفتی عبدالحفیظ سرائے ترین سنہ صلیع مراد آباد رمضان المبارک ۱۴۱۷ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بلا شک قرآن کریم ہر شئی کا بیان ہے اور علوم کا جامع اور غیوب پر مشتمل ہے۔

شیخ الاسلام علامہ ابراہیم باجوری شرح قصیدہ بردہ شریف میں تحریر فرماتے ہیں:

لها (ای آیات القرآن) معان کمو ج البحر فی الکثرة التي لا غاية لها (فیه ایضا

) انها لا تعد ولا تحصى وما فیها العجیبة لعدم تناهیها (فیه ایضا) حکى عن بعضهم من

انه قال لكل آية ستون الف فهم وما بقى من فهمها اكثر (وفیه ایضا) اقل ما قيل فی

العلوم التي فی القرآن من ظواهر المجموعة فيه اربعة وعشرون الف علم وثمان مائة علم

(شرح بردہ مصری ص ۵۲)

آیات قرآنی کے معانی کثرت میں سمندر کی موج کی طرح ہیں جن کی کوئی انتہا نہیں (اسی میں

ہے) بیشک آیات کے عجیب معنی انگنت اور بے شمار ہیں کیونکہ وہ غیر متناہی ہیں (اسی میں ہے) بعض

علماء سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ہر آیت کے لئے ساٹھ ہزار فہم ہیں اور جو فہم باقی ہے وہ بہت

زیادہ ہیں (اسی میں ہے) بلحاظ ظاہری معنی کے علوم قرآن میں کم سے کم یہ قول ہے کہ ان کا مجموعہ آٹھ

سو چوبیس ہزار علم ہیں۔

علامہ علی قاری شرح شفا میں فرماتے ہیں:

اشتماله (القرآن) علی اخبار الاولین وآثار الآخرين وتضمنه الامور الغیبیہ

الواقعة سابقا ولا حقا فهو معجزة -

(شرح شفا مصری ص ۵۳۳ ج ۱)

قرآن کا اولین و آخرین کی خبروں پر مشتمل ہونا اور ان امور غیبیہ پر شامل ہونا جو پہلے گزر چکے

اور آئندہ واقع ہونے والے ہیں یہی تو معجزہ ہے۔

علامہ قسطلانی مواہب لدنیہ میں فرماتے ہیں: "السادس ان وجه اعجازه هو كونه جا

معا للعلوم الكثيرة لم تتكلم العرب فيها الكلام ولا يحيط بها من علماء الامم واحد من

هم ولا يشتمل عليها كتاب بين الله فيه خبر الاولين والآخرين وحكم المتخلفين وثواب

المطيعين وعقاب العاصين"

(مواہب لدنیہ ص ۳۵۳ ج ۱)

چھٹی وجہ اعجاز قرآن کی وہ علوم کثیرہ کا جامع ہونا ہے جس میں نہ تو عرب نے تکلم کیا نہ پہلی امتوں

کے علماء سے کسی نے اس کا احاطہ کیا نہ اس پر کوئی کتاب مشتمل ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اولین و آخرین

کی خبریں اور متخلفین کے حکم اور نیکیوں کا ثواب اور بدوں کا عذاب بیان فرمایا۔

علامہ قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں اور علامہ زرقانی نے اس کی شرح میں فرمایا:

الخامس ان وجه اعجازه هو ما فيه من علم الغيب وهو شامل لما سبق مما لم

يلدرکه هو ولا اهل عصره اما يقع بعد ذلك مما لا يعلمه الا الله۔

(زرقانی مصری ص ۹۸ ج ۵)

پانچویں بات وجہ اعجاز قرآن کی یہ ہے کہ اس میں علم غیب کا بیان ہے کہ قرآن غیب کے ان امور

کو شامل ہے جو پہلے گزر چکے جنہیں نہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پایا نہ آپ کے اہل زمانہ نے اور

جو بعد کو واقع ہوں گے جنہیں اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

بخيال اختصار اس وقت صرف اسی قدر تصریحات علمائے کرام پر اکتفا کیا گیا مگر ان سے بھی یہ ظا

ہر ہو گیا کہ معانی قرآن سمندر کی موج کی طرح ہیں جن کی انتہا نہیں اور وہ معانی غیر متناہی ہیں جن کی نہ

گنتی نہ شمار اور ہر آیت کے لئے ساٹھ ہزار فہم ہیں اور علوم قرآن باعتبار معنی کے چوبیس ہزار آٹھ سو علوم

ہیں اور قرآن کریم اولین و آخرین کی خبریں دیتا ہے اور امور غیبیہ ماضیہ و مستقبلہ پر مشتمل ہے اور قرآن

جامع العلوم ہے اور یہ خود حدیث شریف سے بھی ثابت ہے جس کی دیلمی نے روایت کی کہ حضور اکرم صلی

اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: "من اراد علم الاولين والآخرين فليتدبر القرآن

(کنوز الحقائق فی احادیث خیر الخلائق ص ۱۶۴)

جو اولین و آخرین کے علم کا ارادہ کرے تو اسے چاہئے کہ وہ قرآن میں غور کرے۔ اس حدیث

شریف سے نہایت واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ قرآن کریم میں اولین و آخرین کے علوم ہیں۔ پھر یہی

مضمون کثیر آیات سے ثابت ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (۱) "ما فرطنا فی الكتاب من شئی" (سورۃ انعام ع ۴)

ہم نے اس کتاب میں کچھ اٹھا نہ رکھا۔

(۲) "وتفصیل الكتاب لا ریب فیہ من رب العالمین" (سورۃ یونس ع ۴)

اور لوح میں جو کچھ لکھا ہے سب کی تفصیل ہے اس میں کچھ شک نہیں پروردگار عالم کی طرف سے

(۳) ”ولکن تصدیق الذی بین یدیه ونفصیل کل شئی“ (سورۃ یوسف ع ۱۲)

لیکن اپنے سے اگلے کلاموں کی تصدیق ہے اور ہر چیز کا مفصل بیان ہے۔

(۴) ”ونزلنا علیک الكتاب تبیاناً لکل شئی“ (سورۃ نمل ع ۱۲)

اور ہم نے تم پر قرآن اتارا کہ ہر چیز کا روشن بیان ہے۔

(۵) ”وکل شئی فصلناہ تفصیلاً“ (سورۃ اسراء ع ۲)

اور ہم نے ہر چیز کو خوب جدا جدا ظاہر فرمادی۔

علامہ محی السنہ ناصر الشریعہ علاء الدین بغدادی تفسیر خازن میں آیت نمبر تین (۳) کے تحت

فرماتے ہیں: ”وتفصیل کل شئی“ یعنی ان هذا القرآن المنزل علیک یا محمد تفصیل کل شئی تحتاج الیہ من الحرام والحلال والحدود والاحکام والقضص والمواعظ والامثال وغیرہ ذلك مما یحتاج الیہ العباد فی امر دینہم ودنیاهم“

(تفسیر خازن مصری ص ۲۶۲ ج ۳)

اور ہر چیز کا مفصل بیان یعنی یہ قرآن جو اے اللہ کے رسول آپ پر نازل ہوا ہر اس چیز کا مفصل بیان ہے جس کی طرف آپ کو احتیاج ہے حلال و حرام۔ حدود و احکام۔ قصص اور نصیحتوں اور مثالوں سے اور ان کے علاوہ ان امور سے جن کی طرف بندے اپنے دین و دنیا کے کام میں محتاج ہیں۔

علامہ جلال الدین سیوطی تفسیر جلالین میں آیت نمبر پانچ (۵) کے تحت فرماتے ہیں:

”(وکل شئی) یحتاج الیہ (فصلناہ تفصیلاً بینہ تبییناً“

اور ہر چیز کی طرف احتیاج ہے ہم نے اس کو خوب مفصل بیان کر دیا۔

علامہ جمل اس کے حاشیہ الفتوحات الالہیہ میں فرماتے ہیں: ”یحتاج الیہ ای فی الدین والدنیا قولہ بینہ تبییناً بلا التباس فهو کقولہ ما فرطنا فی الكتاب من شئی وقولہ ونزلناہ علیک الكتاب تبیاناً لکل شئی“ (جمل مصری ص ۶۱۸ ج ۲)

یعنی دین و دنیا میں جس کی طرف احتیاج ہے ہم نے اسے بلا اشتباہ خوب بیان کر دیا تو یہ اللہ تعالیٰ کے اس کلام کی طرح ہے کہ ہم نے اس کتاب میں کچھ اٹھانہ رکھا اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مانند ہے کہ ہم نے تم پر یہ کلام اتارا کہ ہر چیز کا روشن بیان ہے۔

عارف باللہ شیخ احمد تفسیر صاوی میں آیت (۵) کے تحت فرماتے ہیں: ”(تفصیلاً مصلوہ

کد لعمالہ اشارۃ الی ان اللہ لم یتربک شئی من امور الدین والدنیا الا بینہ نظیرہ قولہ تعالیٰ ما فرطنا فی الكتاب من شئی“ (صاوی مصری ص ۲۹۱ ج ۲)

تفصیلاً مصدر اپنے عامل کی تاکید ہے اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے امور دین و دنیا سے کوئی چیز نہیں چھوڑی مگر اس کو اپنے حبیب سے بیان فرمادیا۔ یہ نظیر ہے اللہ کے اس کلام کی کہ ہم نے اس کتاب میں کچھ اٹھانہ رکھا۔

”الطبقات الکبریٰ میں ہے: کہ عارف باللہ حضرت ابراہیم دسوقی آیت نمبر (۱) کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ”لو فتح الحق تعالیٰ من قلوبکم اقوال السندد ولا طلعت علی ما فی القرآن من العجائب والحکم والمعانی والعلوم واستغنیتم عن النظر فی سواہ فان فیہ جمیع ما رقم فی صفحات الوجوب۔ قال تعالیٰ: ما فرطنا فی الكتاب شئی“

(طبقات کبریٰ مصری ص ۱۴۹ ج ۱)

اگر حق تعالیٰ تمہارے دلوں کے موانع کے قفل کھول دے تو تم قرآن کے عجائب اور حکمتوں اور معانی و علوم پر مطلع ہو جاؤ اور اس کے غیر میں نظر کرنے سے مستغنی ہو جاؤ۔ بیشک قرآن میں صفحات وجود پر جو کچھ ہے مرقوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے اس کتاب میں کچھ اٹھانہ رکھا۔ بخیاں اختصار تفصیل عبارات اور زیادہ پیش نہیں کیں کہ منصف کے لئے تو اسی قدر بہت کافی اور معاند کے لئے دفتر نا کافی۔ بالجلہ ان آیات و تفاسیر اور حدیث شریف اور تصریحات کتب سے نہایت روشن طور پر ثابت ہو گیا کہ قرآن کریم ہر شئی کا روشن بیان ہے، اور علوم کا جامع اور غیب کی خبروں پر مشتمل ہے، اور علوم اولین و آخرین کو حاوی ہے اور ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ان کے رب تبارک و تعالیٰ نے علوم قرآن تعلیم فرمائے۔

قرآن کریم میں ہے۔ ”الرحمن علم القرآن خلق الانسان علمہ البیان“

(سورۃ الرحمن ع ۱)

رحمن نے اپنے محبوب کو قرآن سکھایا انسانیت کی جان محمد کو پیدا کیا ”ماکان وما یکون کا بیان انہیں سکھایا۔

تو اب کائنات کا ذرہ ذرہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے احاطہ علمی سے باہر نہیں کہ آپ عالم قرآن کریم ہیں۔ تو قول عمر تو حدیث قرآن کے مطابق ثابت ہوا۔ اب باقی رہا قول زید اور اس کا

علامہ جمل ”الفتوحات الالہیہ“ میں اسی آیت کی تفسیر میں یہ سوال وجواب اس طرح تحریر فرماتے ہیں جس کے الفاظ تو مختلف ہیں لیکن مضمون واحد ہے۔ تو ان ہر دو تفاسیر سے ثابت ہو گیا کہ زید کا یہ استدلال نیا نہ نہیں ہے بلکہ منکرین کا پرانہ اعتراض ہے جس کا بار ہا جواب دیا جا چکا ہے۔

پھر زید کا آیت ”واوتیت من کل شئی“ سے استدلال کرنا بھی غلط ہے۔ تفسیر جلالین میں اس آیت کریمہ کے متعلق فرمایا ”واوتیت من کل شئی“ یحتاج الیہ الملوك من الآلة والعدة“ اور بلقیس کو وہ ہر شئی جس کی طرف بادشاہ آلات اور اسباب و سامان کے تاج ہوتے ہیں عطا کی۔

علامہ جمل ”الفتوحات الالہیہ“ میں اسی آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں: (من کل شئی) عام ارید بہ الخصوص كما اشار له بقوله تحتاج الملوك من الآلة والعدة“ (جمل مصری ص ۳۰۹ ج ۳)

کلمہ ”کل شئی“ کا عام ہے اور اس سے خاص مراد ہے جس کی طرف مفسر نے اشارہ کر دیا کہ وہ بادشاہوں کا آلات و اسباب کی طرف محتاج ہونا ہے۔

علامہ خازن تفسیر خازن میں اسی آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں: ”یعنی ما تحتاج الیہ الملوك من المال والعدة“ (تفسیر خازن مصری ص ۱۱۸ ج ۵)

یعنی وہ چیزیں جن کی طرف بادشاہ مال و اسباب سے محتاج ہوتے ہیں۔ ان تفاسیر سے ثابت ہو گیا کہ آیت کریمہ میں ”کل شئی“ اپنے عموم پر نہیں ہے بلکہ وہ خاص چیزیں مراد ہیں جن کی طرف بادشاہوں کو احتیاج ہوا کرتی ہے۔ اور آیت میں بلقیس کا ذکر ہے تو اس آیت سے قرآن کے ہر شئی کے بیان نہ ہونے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نفی علم پر استدلال کرنا ٹریف قرآن کریم ہے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عداوت کی دلیل ہے اور قرآن کریم اور اللہ تعالیٰ بالبراء ہے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

اسی طرح زید کا آیت ”واوتیت من کل شئی موعظۃ و تفصیلا لکل شئی“ اور آیت ”ثم اتینا موسیٰ الكتاب بما علی الذی احسن تفصیلا لکل شئی“ سے استدلال کرنا بھی غلط ہے کہ ان ہر دو آیات میں توریت شریف کا بیان ہے جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ تو ان آیات میں ”تفصیلا لکل شئی“ اپنے عموم پر نہیں ہے

استدلال یہ سراسر غلط اور باطل ہے اور وہ یہ کہ قرآن ہر شئی کا بیان نہیں ہے کہہ کر ان تمام تصریحات علماء و آیات وحدیث کی مخالفت اور انکار کرتا ہے اور قرآن کریم اور نبی رحیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سخت توہین کرتا ہے اور اپنا منکر قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہونے کا اظہار کرتا ہے۔ اب باقی رہا زید کا استدلال کہ قرآن میں نماز و زکوٰۃ وغیرہ کے مسائل اور دین کی بہت سی باتیں نہیں ہیں۔ تو آج یہ نیا اعتراض نہیں ہے۔ ہمارے علمائے کرام اس کا پہلے جواب دے چکے ہیں۔ چنانچہ ہماری پیش کردہ آیت نمبر (۴) و نزلنا علیک الکتاب تبیاناً لکل شئی“ کی تفسیر میں حضرت عارف باللہ شیخ احمد تفسیر صاوی میں اس سوال کو نقل کر کے جواب دیتے ہیں۔

ان قلت انا نجد کثیر امن احکام الشریعة لم یعلم من القرآن تفصیلا کعدد رکعة الصلوة ونصاب الزکوٰۃ وغیر ذلك فكيف يقول الله تبیاناً لکل شئی۔ اجیب بان البیان اما فی ذات الكتاب او با حالته علی السنة قال تعالیٰ وما اتکم الرسول فخذوه وما نهکم عنه فاتتهوا او با حالته علی الاجماع قال تعالیٰ ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدی ویبتع غیر سبیل المومنین الآیة او علی القیاس قال تعالیٰ فاعتبروا یا اولی الابصار والاعتبار النظر والاستدلال اللذان یحصل بهما القیاس فهذه اربعة طرق لا یخرج شئی من احکام شریعة عنها فکلها مذکورة فی القرآن فکان تبیاناً لکل شئی بهذا الاعتبار“ (تفسیر صاوی مصری ص ۲۷۲ ج ۲)

اگر تو یہ اعتراض کرے کہ ہم احکام شریعت بہت سے پاتے ہیں جن کی تفصیل قرآن سے نہیں معلوم ہوتی جیسے نماز کی رکعتوں کی تعداد اور زکوٰۃ کا نصاب اور اس کے سوا اور مسائل تو اللہ تعالیٰ نے اسے کیسے فرمایا کہ وہ ہر شئی کا بیان ہے پس اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ بیشک اس کا بیان ہونا یا تو خود قرآن ہی میں ہے۔ یا سنت پر حوالہ کرنے میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: تمہیں جو رسول دیں اس کو اور جس چیز سے منع فرمائیں باز رہو۔ یا اجماع پر حوالہ کرنے میں ہے کہ اللہ فرماتا ہے کہ ”جس نے رسول کی مخالفت کی ہدایت کے ظاہر ہونے کے بعد اور مسلمانوں کی راہ کے سوا اتباع کی آخر آیت تک“۔ یا قیاس پر کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ”پس عبرت حاصل کرو اے عقل والو: اور اعتبار سے مراد وہ نظر و استدلال ہیں جن سے قیاس حاصل ہو۔ تو یہ چار طریقے ہیں جن سے احکام شریعت کا کوئی مسئلہ خارج نہیں ہو سکتا۔ پس یہ کل قرآن ہی میں مذکور ہے تو اس اعتبار سے قرآن ہر شئی کا بیان ہو گیا۔

چنانچہ تفسیر خازن میں آیت اولیٰ کے تحت ہے۔ (و تفصیلا لكل شئی) یعنی نبیاً لکل شئی من الامر والنہی والحلال والحرم والحدود والاحکام مما یتحتاج الیہ فی امور الدین“ (خازن ص ۲۳۶ ج ۲)

یعنی ہر شئی کا بیان کرنا امر، نہی، حلال، حرام، حدود، اور احکام سے وہ جن کی طرف امور دین میں احتیاج ہوتی ہے۔

اسی تفسیر خازن میں آیت ثانیہ کے تحت ہے ”و تفصیل لکل شئی“ یعنی وفیہ بیان لکل شئی یتحتاج الیہ من شرائع الدین واحکامہ“ (خازن ۱۶۶ ج ۲)

یعنی اس میں ہر اس شئی کا بیان ہے جس کی طرف احکام دین میں محتاج ہیں۔ تفسیر جلالین میں آیت اولیٰ کے تحت ہے ”یتحتاج الیہ فی الدین“ اس پر جمل فرماتے ہیں: محتاج الیہ فی الدین ای دینہم“ (جمل مصری ص ۱۸۹ ج ۲)

جس کی طرف بنی اسرائیل کے دین میں احتیاج تھی۔

اسی طرح آیت ثانیہ کے تحت تفسیر جلالین میں ہے ”یتحتاج الیہ فی الدین“ ان تفاسیر سے ثابت ہو گیا کہ توریت شریف دین بنی اسرائیل کے احکام کی تفصیلی کتاب ہے۔ اب زید کا ان ہر دو آیات کو قرآن شریف کی ہر شئی کے بیان کے خلاف اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نفی علم پر استدلال کرنا تحریف آیات قرآنی ہے اور اللہ تعالیٰ پر افتراء ہے۔ بالجملہ ان ہر سہ آیات سے نہ قرآن کریم کے ہر شئی کے بیان کرنے کی نفی ثابت ہوئی نہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہر شئی کے عالم ہونے کا انکار ظاہر ہوا۔ تو زید کا استدلال غلط و باطل قرار پایا۔ زید کی پیش کردہ پہلی آیت میں بلیقہ کا ذکر تھا تو یہ واقعہ ہے کہ بلیقہ کو جہان کی ہر شئی نہیں دی گئی تھی۔ اور اس کی پیش کردہ چھٹی ہر دو آیات میں سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ ہے تو ہمارا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے یہ دعویٰ نہیں ہے کہ انہیں بھی کائنات کے ذرے ذرے کا علم دیا گیا ہے بلکہ ہمارا یہ دعویٰ تو حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لئے ہے کہ وہ کائنات کے ذرے ذرے کے عالم ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم توریت شریف سے افضل ہے۔ اسی بنا پر دیکھو کہ ”تفصیلا لکل شئی“ کی تفسیر توریت شریف کے لئے صرف امور دین کے ساتھ خاص کی۔ اور قرآن کریم کیلئے اس کو اپنے عموم پر برقرار رکھا کہ امور دین و دنیا ہر دو مراد لئے۔ زید کی یہ بے ایمانی ہے کہ اس نے ان آیات کی صحیح مراد چھوڑ کر اپنے دل سے غلط مراد گڑھ کر اپنے غلط عقیدہ کی تائید کرنے کی

ہاپاک سعی کی ہے، تو زید پر اس جرات کی بنا پر توبہ لازم اور بغیر توبہ کے اس سے دینی تعلیم حاصل کرنا جائز نہیں کہ وہ اس میں اپنا باطل عقیدہ سکھائے گا۔ اور قول عمر بالکل صحیح اور حق ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المختصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۵۱۴)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین کثرہم اللہ تعالیٰ مسطورہ ذیل مسائل میں کہ
(۱) ہمارے محلہ کی مسجد میں ہر سال شبینہ ہوا کرتا ہے اور اس طرح پر کہ پانچ یا چھ حفاظ تراویح میں ایک ہی شب میں پورا قرآن مجید ختم کرتے ہیں لیکن ابھی دو چار رکعتیں باقی رہ جاتی ہیں کہ صبح صادق طلوع کر آتی ہے اور نماز وتر وغیرہ صبح صادق ہی کے وقت پڑھی جاتی ہے۔ بہت سے مقتدی ایک ہی رکعت میں چند بار اٹھتے بیٹھتے رہتے ہیں۔ بعض لوگ چھوڑ کر بھاگ جاتے اور بعض دوسری میں بیٹھ کر پہلو میں کھڑے ہو کر ادا کرتے ہیں۔ کیا ایسا شبینہ جائز ہے؟

(۲) اگر نفل نماز کی جماعت سے شبینہ پڑھا جائے تو اس کا شرعاً کیا حکم ہے؟
(۳) کسی طرح کا شبینہ شرعاً جائز ہے یا نہیں اگر ہے تو اس کی کیا صورت ہے؟
(۴) بعض علمائے کرام کا قول ہے کہ تین روز سے پہلے قرآن مجید کا ختم کرنا مکروہ ہے۔ اگر صحیح ہے تو شبینہ کے جواز کی کیا صورت ہے؟ بینوا تو جروا۔

المستفتی محمد قمر الزماں سکریٹری جامع مسجد ٹیٹا گڑھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

ایک شب یا ایک دن میں ختم قرآن کریم کر لینا سلف کرام سے ثابت ہے۔ حضرت امام وکیع بن جراح ہر شب میں ایک ختم قرآن کرتے۔ رد المحتار میں ہے:

وکیع بن الجراح بن ملیح بن عدی الکوفی شیخ الاسلام واحد الائمة الاعلا
اقال یحییٰ بن اکثم کان وکیع یصوم الدھر و یختم القرآن کل لیلۃ۔

(ردالمحتار مصری ج ۱ ص ۴۲)

خود ہمارے امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ رمضان مبارک میں اکٹھ قرآن کریم ختم فرماتے۔ ایک ہر دن میں اور ایک ہر رات میں اور ایک ختم لوگوں کے ساتھ یہاں تک کہ حضرت امام نے تو صرف دو رکعتوں میں ایک ختم قرآن کریم کیا ہے۔
مراقی الفلاح میں ہے:

عن ابی حنیفہ رحمہ اللہ انہ کان یختم فی رمضان احد و ستین ختمۃ فی کل یوم ختمۃ و فی کل لیلۃ ختمۃ و فی کل التراویح ختمۃ و صلی بالقران فی الرکعتین۔
(ہامش طحاوی مصری ص ۲۴۱)

تو ایک شب میں ختم قرآن کریم کرنے کا جواز فعل سلف سے ثابت ہوا اور نوافل میں خصوصا تراویح میں قرآن کریم کا پڑھنا مسنون بھی ہے۔

کبیری میں ہے: و فی النوافل باللیل لہ ان یسرع بعد ان یقرا کما یفہم و ذلك مباح الا یری ان ابا حنیفہ رحمہ اللہ کان یختم القرآن فی لیلۃ واحدۃ۔
(کبیری ص ۴۶۳)

ردالمختار میں ہے: قراءة الختم فی صلاۃ التراویح سنة۔

(ردالمختار ج ۱ ص ۴۹۶)

لیکن نوافل میں صرف تنہا پڑھ سکتا ہے کہ نوافل کی جماعت جائز نہیں۔

ردالمختار میں ہے: النفل بجماعۃ و هو غیر جائز۔

اور تراویح کی جماعت سنت کفایہ ہے۔

نور الایضاح میں ہے: و صلا تہا بالجماعۃ سنة کفایۃ۔

تو اب ثابت ہو گیا کہ ایک شب میں ختم قرآن کریم صرف تراویح کی جماعت میں کر لینا بلاشبہ جائز ہے۔ اسی کا نام شبینہ ہے۔ اب اس میں بجائے ایک حافظ کے چند حافظوں کے ختم کر لینے میں کوئی حرج لازم نہیں آتا۔ ہاں موسم گرما کی شبیں چونکہ بہت چھوٹی ہوتی ہیں ان میں صبح صادق سے قبل اگر ختم ہو سکے تو جب صبح صادق قریب ہو جائے تو اس سے پہلے بجلت باقی رکعات تراویح کو چھوٹی چھوٹی سورتوں سے پوری کریں اور آخر میں وتر پڑھ لیں۔ صبح صادق کے طلوع ہونے کے بعد نہ تراویح پڑھ سکتے ہیں اور

نہ وتر بہ نیت ادا پڑھ سکتے ہیں۔ پھر مقتدی بھی بذوق و شوق اگر سب نہیں تو بعض کھڑے ہو کر اور بعض بیٹھ کر آخر تک شریک جماعت رہیں تو ایسا شبینہ جائز ہے۔ اور جو شبینہ نفل کی جماعت میں ہو اور اس کو صبح صادق کے طلوع ہو جانے کے بعد بھی پڑھتے رہیں اور وتر کو قضا کر دیں، اس میں نہ حفاظ میں صحت عقیدہ کا لحاظ ہو، نہ دینداری کا خیال ہو، نہ صحیح خوانی کی رعایت ہو۔ نہ اس کی تیز رفتاری سے کلمات سمجھ میں آتے ہوں، نہ فہم معنی حاصل ہوتے ہوں۔ اور مقتدیوں میں شوق ہی نہ ہو، ان پر جماعت کی شرکت بار ہو، ایک رکعت میں کبھی اٹھیں کبھی بیٹھیں، کوئی بیٹھ کر باتیں کرے، کوئی لیٹے، کچھ چائے پینے میں مشغول رہیں، کچھ مسجد کے باہر پان کھانے اور حقہ بیڑی پینے میں وقت گزارتے رہیں، اگر کسی کے دل میں آگیا تو ایک آدھ رکعت میں شامل ہو گیا۔ بعض دور ہی سے رونق دیکھ کر اپنے مکان کو بھاگ جائیں تو ایسے شبینہ کو کون جائز کہہ سکتا ہے۔

اب باقی رہا وہ قول کہ تین روز سے پہلے ختم قرآن کریم مکروہ ہے۔ تو یہ قول میری نظر سے نہیں گذرا۔ ہاں ایک دن میں ختم قرآن کریم کو بعض نے مکروہ کہا ہے۔ تو اس قول کی بناء پر اس صورت میں ہے کہ قاری اس تیز رفتاری سے پڑھے جس میں رعایت ترتیل اور فہم معنی کا لحاظ نہ ہو ورنہ ایک ہی دن میں ختم قرآن کریم کرے اور اس میں رعایت ترتیل اور فہم معنی کو ملحوظ رکھے تو وہ مکروہ نہیں جیسا کہ سلف کرام کا ایک شب میں ختم قرآن کریم کرنا شروع جواب میں منقول ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

۹ ذیقعدہ ۱۳۷۲ھ

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العمد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۲ھ

(۵۱۵)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

زید کہتا ہے کہ بجلی کا گر جتنا جو کہ بوقت بارش ہوتا ہے، تو ایک فرشتہ بادل کے کوڑا مارتا ہے اور اس کوڑے کی آواز کو گرج کہتے ہیں، آیا یہ کس حد تک درست و صحیح ہے۔ اور بجلی اور گرج کی اصل حقیقت کیا ہے۔ تفصیل وار جواب مرحمت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

بعض مفسرین نے گرج کی حقیقت بیان کی ہے جو سوال میں ہے کہ فرشتہ بادلوں کو چلانے کیلئے جب کوڑا مارتا ہے تو یہ آواز اس کوڑے کے مارنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی کو گرج کہتے ہیں۔ جیسا کہ جمل حاشیہ تفسیر جلالین تحت آیہ کریمہ ویسبح الرعد بحمدہ میں مذکور ہے۔ قیل ہو صوت الآلة التي يضرب بها السحاب ای الصوت الذي يتولد عند الضرب۔ (جمل)

ج ۱۔ ص ۱۹۵

تو اس قول کی بنا پر قول زید صحیح ثابت ہوا۔ لیکن اکثر مفسرین کا قول یہ ہے کہ رعد ایک فرشتہ ہے اور گرج اسکی تسبیح کی آواز ہے۔

تفسیر خازن اسی آیہ کریمہ کے تحت میں ہے۔ اکثر المفسرین علی ان الرعد اسم ملك الذي يسوق السحاب والصوت المسموع من تسبيحه۔ (خازن، ج ۴ ص ۹) اور حدیث شریف میں ہے کہ گرج رعد فرشتہ کے بادلوں کی ڈانٹنے کی آواز ہے۔ ترمذی شریف میں ہے۔

اقلت يهود الى رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم فقالوا اخبرنا عن الرعد ما هو قال ملك من الملائكة مؤكل بالسحاب معه مخاريق من نار يسوقه بها حيث شاء الله قالوا فما هذا الصوت الذي يستمع قال زجر السحاب حتى ينتهي حيث امرت قالوا صدقت۔ (خازن ج ۴ ص ۸)

اور بجلی ایک روشنی ہے جو بادل کے درمیان سے ظاہر ہوتی ہے۔ تفسیر خازن میں ہے۔ البرق هو لمعان يظهر من خلال السحاب۔ (خازن ج ۴ ص ۸)

اور دوسرا قول یہ ہے کہ بادلوں کے چلانے کے لئے جو کوڑا آگ کا ہے اس کوڑے کی چمک کو بجلی کہتے ہیں۔ البرق لمعان سوطه آلة من يزجره بها السحاب۔ (جمل ج ۱ ص ۲۳)

اور تیسرا قول یہ ہے کہ جب رعد فرشتہ کا غصہ شدید ہو جاتا ہے تو اس کے منہ سے آگ نکلتی ہے وہی بجلی ہے۔ تفسیر خازن میں ہے: اذا اشتد غضبه يخرج من فيه النار فهي البرق (خازن)

یہ مفسرین کے اقوال بجلی اور گرج کی حقیقت کے بیان میں ہیں، جو شارع علیہ السلام سے بروایات ثابت ہیں مسلمان کیلئے ان سے بہتر اور معتبر کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

(۵۱۶)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ سائنسداں سمجھتے ہیں کہ بادل جب گر جتے ہیں جب یہ آپس میں ٹکرا جاتے ہیں تب بادل گر جتا ہے، آیا یہ قول صحیح ہے، یا غلط؟۔ جواب تسلی بخش دے کر عند اللہ ماجور ہوں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

تفاسیر کی بعض روایات میں یہ بھی وارد ہے کہ جب فرشتہ کا بادلوں پر غصہ شدید ہوتا ہے تو اس کے منہ سے آگ یا نور اڑنے لگتا ہے تو بادل لرزتے ہیں اور گر جتے ہیں۔

حاشیہ جلالین جمل میں ہے: روى ان اذا اشتد غضبه على السحاب طارت من فيه النار فتضطرب اجرام السحاب وترتعد۔ (جمل ج ۱ ص ۲۳)

اور یہ ممکن ہے کہ بادلوں میں آپس میں ٹکرا کر بھی گرج کی آواز پیدا ہو جاتی ہو۔ سائنسداں کی بات بھی صحیح ہو سکتی ہے۔ لیکن اسی کو صرف گر جنے کا سبب متعین کر لینا یہ اسباب منقولہ عن الشرع سے صاف انکار ہے، اور تحقیق شرعی کے خلاف ہے۔ کہ گر جنے کے وہ وجوہ و اسباب بھی ہیں جو جواب سوال اول میں بہ تفصیل منقول ہوئے۔ سائنسداں کی زبردست غلطی یہ ہے کہ انکی جو ناقص سمجھ میں آیا اس پر تو جزم و یقین کر لیا اور جو شرعی تحقیقات ہیں اس پر جزم و یقین نہیں۔ مولیٰ تعالیٰ ان کو فہم صائب عطا فرمائے اور قبول حق کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

﴿ ۳۴ ﴾

باب الوصیت

(۵۱۷)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص موت سے قبل وصیت کر گیا کہ میرے انتقال کے بعد میری ملکیت کا ثلث ۱-۳ حصہ اللہ کے لئے نکالا جائے اور اسی اللہ کے لئے نکالی ہوئی رقم میں سے یا اللہ کے لئے نکلی ہوئی رقم کی یافت کر کے اتنی رقم فلاں کو دینا، مگر مرحومہ کی وصیت کے موافق اب تک ایک ثلث رقم علیحدہ نہیں نکالی گئی اسی طرح اللہ رقم کی کچھ یافت نہیں کی گئی ہے اسی طرح جس شخص کو اللہ کے لئے رقم کی مد میں سے جو رقم مرحومہ کی وصیت کے موافق دینے کی تھی انتقال ہو گیا اس واقعہ کو مد نظر رکھتے ہوئے انتقال شدہ مرحومہ کا حق مرحومہ کے ورثہ کو حاصل کرنے کا حق شرع شریف کے موافق باقی رہتا ہے یا کہ فوت ہو جاتا ہے۔

بیوا تو جروا
مستفتی سیٹھ غلام حسین حاجی ابراہیم مورخہ ۳/ اگست ۱۹۳۸ء

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم
اگر مرحومہ موصیٰ لہا یعنی جس کے لئے وصیت کی گئی ہے شرعاً قابل وصیت تھی اور شخص موصیٰ (یعنی وصیت کرنے والا) کی موت کے بعد مقرر رقم کی وصیت کو بغیر ادا کئے ہوئے فوت ہو گئی تو مرحومہ موصیٰ لہا کے وارث اس مقررہ رقم کے بعد اسی وصیت کی بنا پر حقدار ہیں۔

در مختار میں ہے:

وانما تملك بالقبول الا اذا مات موصيه ثم هو بلاقبول فهو ای المال الموصیٰ به لورثته بلاقبول استحسانا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

(۵۱۸)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین زاد اللہ برکاتہم۔

صورت مسئلہ میں ایک شخص مسمی اللہ بخش متوفی جس کے کوئی بیوی بچہ نہیں ہے اپنا حصہ زمینداری ۴ پائی ۷ اکرانت دوم جواتل واقع محال خدا بخش پکسر انوان پر گنہ و تحصیل سلون ضلع رائے بریلی ذریعہ دستاویز وقف نامہ رجسٹری شدہ بحق جامع مسجد پکسر انوان مورخہ ۲۷ فروری ۱۹۴۰ء وقف کیا اور مسمی شیخ مولوی عبد الوہاب ولد خدا بخش و عبد الحکیم و عبد الجبار و محمد علیم پسران عبد السبحان کو متولی تاحیات وہ اس کے بعد ان کے وارث جائز کو مقرر کیا مسمیان رحیم بخش و عبد الشکور پسران عبد اللہ جو چچا زاد بھائی و صاحب اولاد ہیں جن کا خورد و نوش و جملہ کار و بار دو پشت سے علیحدہ ہے رحیم بخش و عبد الشکور سے اور اللہ بخش ہمیشہ ناراض رہا اور نہیں چاہتا تھا کہ چھوڑے چنانچہ پہلے اس نے چند نمبر مزرعہ آراضی اپنے حصہ کی بیع کر ڈالا بقیہ بحق جامع مسجد وقف کیا مسمی اللہ بخش وقف کنندہ بعارضہ دق عرصے سے بیمار تھا اور دن بدن اس کی حالت خراب ہو رہی تھی یہ وقف ڈیڑھ ماہ قبل انتقال کیا اور اپنا مکان مسکونہ چھوڑ کر مسمی پسران بخش کے مکان میں اٹھایا تھا یہیں عارضہ میں اس کا انتقال ہوا اسے یہ شکایت تھی کہ رحیم بخش و عبد الشکور رات کو گلا دباتے ہیں اللہ بخش کو یہ معلوم ہوا کہ عبد الحکیم و عبد الجبار متولیان نے درخواست داخل خارج دیا ہے اور ان لوگوں نے یہ چالاکی کی ہے کہ متولی ہمیشہ یہی رہیں گے ان کے بعد ان کے وارث متولی ہوں گے لہذا مسمی سراج الدین جو رحیم بخش کا سمدھی ہے اللہ بخش کو کچھری میں لیجا کر عذر داری نسبت اخراج متولی کرائیں لیکن بجائے موقوفی متولیان درخواست منسوخی وقف نامہ لکھوا کر داخل کر دیا اللہ بخش محض اُن پڑھ تھا انتقال کے چار روز قبل اللہ بخش نے کل بستی کے اشخاص کو بلا کر جو تقریباً پچاس ساٹھ کے تھے سب کو مخاطب کر کے کہا کہ میں نے اپنی کل جائداد جامع مسجد کے نام وقف کر دی ہے سب بھائی ملکر انتظار کرو اور منشی عبد اللہ صاحب ہیڈ ٹیچر اسکول پکسر انوان اور مولوی عبد الوہاب صاحب کو متولی کیا تم لوگ ذمہ دار ہو ہم حشر میں دامن گیر ہوں گے جو اس کے خلاف ہوگا بعد انتقال اللہ بخش رحیم بخش و عبد الشکور عذر دار مقدمہ داخل خارج ہیں کہ ہم لوگ وارث و حقدار ہیں اللہ بخش نے ہماری حق تلفی کی ہے اب دریافت طلب امر یہ ہے از روئے شرع شریف یہ جائداد ملک مسجد کی ہوئی یا رحیم بخش و عبد الشکور کی وارثانہ چاہئے۔ امور ذیل قابل لحاظ ہیں۔

(۱) مسمی اللہ بخش عرصہ ڈیڑھ سال سے بعارضہ دق بیمار اس مرض میں اس کا انتقال ہوا اور حالت بیماری ہی میں یہ وقف ڈیڑھ ماہ قبل از انتقال کے۔

(۲) بعد تحریر کے وقف اس کے متولی مولوی عبد الوہاب و عبد الحکیم تھے مسمی اللہ بخش تحریر وقف

نامہ سے لیکر انتقال کے وقت تک مولوی عبد الوہاب و مولوی عبد اللہ صاحب کو متولی کہتا رہا۔
(۳) مولوی عبد الوہاب و منشی عبد اللہ کی تولیت کو سب اہل بستی پسند کرتے ہیں ناپسند نہیں کرتے
(۴) نقل مسودہ وقف نامہ بجمہت لفظ بالفظ از سال ہے بندہ نواز من بعد سلام اصلاً گزارش یہ ہے کہ بنظر بندہ نوازی جواب جلد عنایت فرمائیں کہ عدالت میں سات ۷ جون ۱۹۴۰ء کو پیشی مقرر ہے اگر قبل از پیشی جواب آجائے گم تو اس کے مطابق صلح نامہ داخل کر دیا جائے گا۔
المستفتی عبد الوہاب از پکسر انوان ڈاکخانہ پکسر انوان ضلع رائے بریلی

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اگر یہ واقعہ ہے کہ اللہ بخش نے مرض الموت میں اپنی کل جائداد جامع مسجد موضع پکسر انوان پر گنہ سلون ضلع رائے بریلی کے لئے وقف کی ہے اور اس کے صرف چچا زاد و بھائی رحیم بخش و عبد الشکور وارث موجود تھے اور انہوں نے اس وقف کو جائز نہیں رکھا تو شرعاً ایک تہائی کی قدر کا وقف درست ہے اور باقی دو تہائی کا باطل ہے۔ ان دونوں کی ملک ہے اس لئے کہ مرض الموت کا وقف وصیت کا حکم رکھتا ہے جو تہائی میں نافذ ہوگا۔

رد المحتار میں ہے: ولا شک ان الوقف فی مرض الموت وصیۃ۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۲۷۴)

اور اس بات میں شک نہیں کہ مرض الموت میں وقف کرنا وصیت ہے۔

فقہ کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہے:

لو وقف فی مرض موتہ قال الطحطاوی ہو بمنزلۃ الوصیۃ بعد الموت والصحیح انہ لا یلزمہ عند ابی حنیفہ وعندہما یلزمہ الا انہ یعتبر من الثلث والوقف فی الصحۃ من جمیع المال۔
(ہدایہ اولین ص ۶۱۸)

اگر مرض موت میں وقف کیا تو امام طحطاوی نے فرمایا کہ یہ وقف بمنزلہ وصیت کے ہے بعد موت کے اور صحیح مذہب یہ ہے کہ امام اعظم علیہ الرحمہ کے نزدیک وہ لازم نہیں اور صاحبین کے نزدیک لازم ہے لیکن وہ وقف تہائی میں معتبر ہوگا اور تندرستی کے زمانہ کا وقف پورا مال ہوتا ہے (اور قول صاحبین زیادہ معتد ہے)

لہذا ایک تہائی جائداد جامع مسجد مذکور کے لئے وقف ثابت ہوئی اور دو تہائی رحیم بخش و عبد الشکور کی بطریق ارث مملو کہ ہوئی۔ اس کی نظیریں کتب فقہ میں بکثرت موجود ہیں چنانچہ علامہ شامی بحر الرائق سے ناقل ہیں۔

والحاصل ان المريض اذا وقف على بعض ورثته ثم على اولادهم ثم على الفقراء فان جاز الوارث الاخر كان الكل وقفا واتباع الشرط والا كان الثلثان ملكا بين الورثة والثلث وقفا۔ (رد المحتار ج ۳ ص ۳۷۴)

اور حاصل یہ ہے کہ مریض نے جب اپنے بعض وارثوں پر وقف کیا پھر ان کی اولاد پر پھر فقراء پر دوسرے وارث نے اس کو جائز رکھا تو کل وقف ہو جائے گا اور شرط کی متابعت ہوگی ورنہ دو تہائی وارثوں کی ملک ہو جائے گا اور ایک تہائی وقف۔

شامی میں بحر و فتاویٰ ظہیریہ سے ناقل ہیں:

رجل وقف دارا له في مرضه على ثلث بنات له وليس له وارث غيرهن قال الثلث من الدار وقف والثلثان مطلق يصنعن بهما ماشئن قال الفقيه ابو الليث هذا اذا لم يجزن اما اذا اجزن صار الكل وقفا عليهن۔ (رد المحتار ج ۲ ص ۳۷۴)

ایک شخص نے مرض الموت میں اپنے مکان کو اپنی تین لڑکیوں پر وقف کیا اور لڑکیوں کے علاوہ اس کا کوئی اور وارث نہیں ہے تو فرمایا کہ تہائی مکان وقف ہے اور دو تہائی مطلق تو وہ لڑکیاں اس دو تہائی کا جو چاہیں کریں فقیہ ابو الليث نے فرمایا کہ یہ جب ہے کہ انہوں نے اس کو جائز رکھا ہو لیکن جب انہوں نے ناجائز رکھا تو کل مکان ان پر وقف ہو جائے گا۔

اور جب تہائی جائداد جامع مسجد مذکور کے لئے وقف ہو چکی تو اب واقف کو اس کے بالقصد باطل و منسوخ کرانے کا حق حاصل نہیں چہ جائے کہ کسی قریب سے بلا قصد واقف نامہ کی منسوخی عمل میں لائی جائے۔

در مختار میں ہے: فلا يجوز له ابطاله ولا يورث عنه وعليه الفتوى۔

(رد المحتار ج ۳ ص ۲۶۹)

واقف کو وقف کے باطل کرنے کا حق حاصل نہیں اور نہ اس میں ارث جاری ہو سکے اسی قول پر فتویٰ ہے۔

بالجملہ اللہ بخش کی تہائی جائداد جامع مسجد مذکور کے لئے وقف ہے اس پر احکام وقف جاری ہوں گے یہ تہائی حصہ یا اس کا جز رحیم بخش و عبد الشکور کو ہر گز ہر گز بذریعہ وراثت نہیں مل سکتا اور باقی دو تہائی ان دونوں وارثوں کی ملک ہے انہیں اس پر ہر طرح کا اختیار حاصل ہے۔ اور وقف نامہ کے مقرر شدہ متولیان سے جن کی خیانت اور خود غرضی ظاہر ہو جائے وہ تولیت سے معزول ہو گئے باقی اپنے حال پر متولی رہے اور واقف کو متولی کے معزول کرنے کا حق حاصل ہے اور اگر کسی اور کا نام واقف یا اہل بستی زائد کریں تو وہ متولی ہو جائے گا لیکن یہ سب متولیان شرکت سے کام کریں گے کوئی متولی تنہا اپنی رائے سے تصرف نہیں کر سکتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۸۱ھ

﴿۳۵﴾

باب صلوة الجنائز

مسئلہ

(۵۱۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے اپنے آپ کو بطور خودکشی کے مار ڈالا تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے یا نہیں؟ اور مسلم شریف کی حدیث میں جو آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایسے شخص کی نماز پڑھنے سے انکار فرمادیا تو یہ آپ کا انکار فرمانا کس بنا پر تھا؟ بینوا تو جروا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بلاشبہ ایسے شخص کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ چنانچہ درمختار میں ہے ”من قتل نفسه ولو عمدا يغسل ویصلی علیہ وبہ یفتی وان کان اعظم وزرا من قتل غیرہ“ یعنی جس شخص نے اپنے آپ کو عمداً قتل کیا تو اس کو غسل دیا جائے اور اس کی نماز پڑھی جائے اسی پر علماء نے فتویٰ دیا اگرچہ یہ دوسرے کے قتل کرنے سے زیادہ گناہ ہے۔ اور مسلم شریف کی حدیث کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کیا گیا جس نے خودکشی کی تھی تو آپ نے اس پر نماز پڑھنے سے انکار کر دیا۔
اولاً: اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ اس پر کسی نے نماز ہی نہ پڑھی ہو۔

ثانیاً: ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نماز نہ پڑھنا زجر و توبیخ کے لئے ہو، چہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مقروض پر نماز پڑھنے سے انکار فرمایا تھا۔ تو کیا صرف اتنی وجہ سے مقروض کے جنازہ کی نماز بھی نہ پڑھی جائیگی، بلکہ حقیقتاً حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے افعال بے شمار فوائد پر مبنی ہوتے تھے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

(۵۲۰)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ قبر پر اذان دینا کیسا ہے اور اگر کوئی شخص قبر پر اذان دینے کو برا سمجھے منع کرے اس کے لئے کیا حکم ہے؟

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

میت کو قبر میں اتارنے کے بعد قبر پر اذان کہنا یقیناً جائز ہے اذان سے میت کے لئے سات ناکدے ہیں جو احادیث سے ثابت ہیں۔

- (۱) میت اذان کی وجہ سے شیطان کے شر سے محفوظ رہیگا۔
- (۲) کلمہ اللہ اکبر کہنے کی وجہ سے میت عذاب نار سے مامون رہےگا۔
- (۳) میت کو کلمات اذان سے منکر نکیر کے سوالات کے جوابات یاد آ جائیں گے۔
- (۴) اذان میں ذکر اللہ ہونے کے باعث میت عذاب قبر سے نجات پائیگا۔
- (۵) اذان میں ذکر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ہونے کی وجہ سے میت پر نزول رحمت ہوگی۔

(۶) میت کو اس تنگ و تاریک گڑھے میں سخت وحشت اور گھبراہٹ ہوتی ہے اذان کی بدولت دفع وحشت ہوگی اطمینان خاطر ہوگا۔

(۷) میت قبر میں غمگین و پریشان ہوتی ہے اذان کے سبب سے غم و پریشانی دفع ہوگی اور سرور و فرحت حاصل ہوگا اسی لئے بعض علمائے کرام نے اذان علی القبر کو مستحب فرمایا چنانچہ شامی میں مستحبات اذان کی شمار میں لکھا۔ وعند انزال المیت القبر۔

یعنی میت کے قبر میں اتارنے کے وقت اذان کہنا مستحب ہے۔ اور بعض علماء نے اسے سنت فرمایا ہے۔ اب جو شخص اس کو برا کہتا ہے وہ ایک مستحب و سنت کو برا کہتا ہے اور میت کو احادیث کے ثابت شدہ منافع سے محروم رکھتا ہے اور محض اپنی ناقص فہم سے جائز کو ناجائز قرار دیتا ہے ایسے شخص کو توبہ و استغفار کرنا چاہیئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ

(۵۲۰)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ جس مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ہوتی ہو اس جگہ نماز جنازہ پڑھنا کیسا ہے؟۔ برائے مہربانی ان سوالوں کے جواب معتبر کتابوں کے حوالہ کے ساتھ اور مہر کے ساتھ اور دوسرے علمائے کے دستخط کے ساتھ روانہ فرمائیں آپ کی بہت بڑی مہربانی ہوگی۔

المستفتی دستخط میمن اللہ رکھا حاجی سلیمان چوکی جامع مسجد کے پاس بمقام راج پیرا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسجد میں نماز جنازہ پڑھنا مطلقاً مکروہ تحریمی ہے خواہ میت مسجد کے اندر ہو یا باہر خواہ نمازی مسجد میں ہوں یا باہر خود حدیث شریف میں ہے۔

من صلی علی میت فی المسجد فلا صلوة له - رواہ ابن ابی شیبہ وفی رولۃ احمد وابی داؤد وفلا شیء له وفی رولۃ ابن ماجہ فلیس له شیء - (شامی ج ۱ ص ۶۲)

یعنی جس نے میت پر مسجد میں نماز پڑھی تو اس کی نماز ہی نہیں دوسری روایت میں ہے کہ اسے کچھ اجر نہیں۔

تنویر الابصار ودر مختار میں ہے:

و کرہت تحریمًا وقیل تنزیہًا (فی مسجد جماعة ہو) ای المیت (فیہ) وحده او مع القوم (واختلف فی) (الخارجة) عن المسجد وحده او مع القوم (والمختار الکراهة) مطلقاً۔ (در مختار ج ۱ ص ۶۱۹)

شامی میں ہے: ان الحدیث مؤید للقول المختار من اطلاق الکراهة الادی هو ظاهر الروایة کما قدمناه فاعتنم هذا التحریز الفرید - (شامی ص ۶۲)

مولوی خرم علی غایۃ الاوطار ترجمہ در مختار میں لکھتے ہیں:

حدیث مذکور مؤید قول مختار کی ہے کہ نماز (جنازہ) مسجد کے اندر ہر صورت میں مکروہ ہے۔

(غایۃ الاوطار ج ۱ ص ۴۱۶)

اس حدیث اور فقہ کی عبارات سے صاف طور پر ثابت ہو گیا کہ مسجد میں نماز جنازہ مطلقاً مکروہ

تحریمی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۵۲۱)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کیا فرماتے ہیں علمائے دین شرع متین اس مسئلہ میں

(۱) کہ زید کی زوجہ کے شکم سے بچہ مردہ پیدا ہوا یعنی پیدا ہونے پر نہ تو رویا اور نہ اس میں زندگی کے کوئی آثار سانس وغیرہ نہیں پائے گئے اب زید مذکور کے اس بچہ کی نماز جنازہ پڑھی جائے یا نہیں اور اس کو قبرستان میں دفن کیا جاوے تو کس طرح یا کیا صورت اختیار کی جائے استدعاء ہے کہ اس مسئلہ کے جواب میں قرآن وحدیث کا ثبوت ضرور دیا جاوے۔ بینو تو جرو

(۲) ہمارے قصبہ کے اندر مرض ہیضہ وبائی صورت میں پھیل رہا ہے جس کے دفعیہ کے واسطے ہم لوگوں نے رات کے وقت اپنے اپنے گھروں کے اندر باواز بلند اذانیں دیں جس پر زید نے اعتراض کیا اور کہا کہ یہ بالکل ناجائز ہے۔ گھر گھر مسجد بنالی ہے ہم لوگوں نے ایک جلوس بھی مرتب کیا جس میں نعرہ نکمیر نعرہ رسالت نعرہ غوثیہ لگاتے ہوئے اور صلوة وسلام بخضر سید الانام ﷺ پڑھتے ہوئے گلی کو چوں میں گشت کیا لہذا درخواست ہے کہ مذکورہ بالا جملہ مسائل کا جواب مفصل عنایت فرمایا جائے کہ شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے اور جو شخص ان کاموں سے منع کرے اس کیلئے کیا حکم ہے بینو تو جرو

المستفتی، ڈاکٹر تحسین بریلوی ضلع بریلی

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) جو بچہ شکم مادر ہی سے مردہ پیدا ہوا ہو۔ یہاں تک کہ بعد پیدائش نہ وہ رویا نہ اس میں آثار زندگی سے کوئی اثر پایا گیا تو اس کی ہرگز نماز جنازہ نہ پڑھی جائیگی۔ ابن ماجہ، نسائی شریف، بہ روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ حدیث مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اذا استهل الصبی صلی علیہ اورث" یعنی شریف، دلہر قطنی، حاکم کی حدیثوں میں مروی ہے "اذا استهل الصبی صلی علیہ اورث واذا لم يستهل لم یصل علیہ ولا یورث" ان احادیث کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ نبی کریم

علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا: کہ جب بچہ نہ رویا تو نماز جنازہ نہ پڑھی جائے اور اس کو وارث نہ بنایا جائے تو جس نے اس حدیث کے خلاف کیا اور مردہ بچہ کی نماز جنازہ پڑھ لی تو وہ حکم حدیث شریف سے کتنا بے خبر اور جاہل قرار پایا بلکہ اس کا اپنے آپ کو اہل حدیث کہنا ہی غلط ثابت ہوا ان کو چاہئے کہ وہ بالا اعلان اپنی غلطی کی بناء پر توبہ کرے ورنہ اپنے فعل کے ثبوت میں کوئی حدیث پیش کرے باقی رہا اس کا قبرستان میں دفن کرنا تو یہ صحیح ہے کہ وہ جز مسلم ہے لہذا مسلمانوں کے قبرستان میں ہی دفن ہوگا اس کیلئے کسی دلیل کی حاجت نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) طبرانی کی حدیث شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ”اذا اذن فی قرية امنھا اللہ من عذابہ ذالک الیوم“ یعنی نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب کسی آبادی میں اذان کہی جائے تو اللہ اس آبادی کو اس دن امن میں رکھے گا۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ آبادی کو عذاب الہی سے بچانے کے لئے اذان کا کہنا بہترین ذریعہ امن ہے۔ اور وبائی امراض عذاب الہی میں داخل ہیں۔

بخاری و مسلم و ترمذی وغیرہ کی حدیث میں وارد ہے ”الطاعون بقیۃ رجز او عذاب ارسل علی طائفة من بنی اسرائیل فاذا وقع بارض وانتم بها قلا تخرجوا منها فراراً منہ“

تو وبائی امراض سے امن کے لئے روزانہ اذان کہنا خود حدیث ہی سے ثابت ہو گیا۔ تو یہ مدعیان اہل حدیث خود حدیث سے کتنے بے خبر اور جاہل نکلے کہ حدیث کے خلاف کہہ دیا۔ پھر مزید جہالت ملاحظہ ہو کہ جہاں اذان ہو وہ مسجد ہو جاتی ہے۔ ان نادانوں کو یہ بھی خبر نہیں کی اذان کا خود مسجد میں کہنا تو مکروہ ہے۔ احادیث میں ہے قرون ثلثہ میں اذان دروازہ مسجد پر ہوتی تھی اور اذان جمعہ مقام زور پر ہوتی۔ تو کیا دروازہ مسجد اور زوراً شرعاً مسجد تھے۔

نیز حدیث شریف میں ہے ”من ولدہ ولد فاذن فی اذنه الیمنی و اقام فی اذنه الیمنی لم یضرہ ام الصبیان“۔ اس حدیث سے ثابت ہوا کہ بچہ ہونے کے بعد اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی جائے تو اس کو مرض ام الصبیان کا ضرر نہ ہوگا۔ تو اذان کا دافع مرض ہونا بھی ثابت ہو اور یہ بھی ثابت ہوا کہ جس گھر میں بچہ پیدا ہوا ہے وہاں جا کر اذان و اقامت کہی جائے گی۔ تو ان جہال اہل حدیث کے نزدیک تو ہر ایسا گھر مسجد ہو جائیگا۔ پھر ان کی یہ نادانی بھی دیکھئے کہ گلی کوچوں میں جلوس کا گشت کرنا اور اس میں درود شریف کا پڑھنا نعرہ رسالت و نعرہ غوثیت کا لگانا سب نزول رحمت ہے۔

حدیث شریف میں ہے ”عند ذکر الصالحین تنزل الرحمة“ تو کون نہیں جانتا ہے کہ درود شریف اور نعرہ رسالت میں نبی الصالحین حضور علیہ السلام کا ذکر ہے اور نعرہ غوثیت میں مرجع الصالحین حضور غوث پاک کا ذکر ہے اور ان کے ذکر کو حدیث نے سبب نزول رحمت قرار دیا تو جہاں رحمت کا نزول ہوگا وہاں سے عذاب دفع ہوگا اور وبائی امراض سے حفاظت و امن حاصل ہوگا بالجملہ۔ وبائی امراض کے دفع کرنے کے لئے اذان کا گھر گھر کہنا گلی کوچوں میں ایسے جلوس کا گشت کرنا احادیث ہی سے ثابت کر دیا گیا۔ غیر مقلدین ناجائز و ممنوع ہونے پر کوئی صریح حدیث پیش نہیں کر سکتے بلکہ ان کا ان چیزوں کو ناجائز محض کہنا اپنی ناقص عقل سے ہے۔ شرم نہیں آتی کہ احادیث کی کھلی ہوئی مخالفت کرتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو اہل حدیث بھی کہتے ہیں اپنی ناقص رائے پر عمل کرتے ہیں اور براہ فریب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم حدیث پر عامل ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ ان کو ہدایت کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۱۰ صفر المظفر ۱۳۶۶ھ

کتبہ: المقتسم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ (۵۲۲)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ حاجی صاحبان حج سے فارغ ہو کر اپنے ساتھ ایک سادہ چادر جس پر قرآن کریم کی آیات نقشی ہوتی ہیں لاتے ہیں وہ چادر میت کے اوپر ڈال کر قبرستان لے جاتے ہیں۔ نماز جنازہ پڑھتے وقت اس چادر کو ہٹا دینا چاہئے کہ نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم
میت کے جنازے پر آیات کی لکھی ہوئی جو چادر ڈالی جاتی ہے اس کا بوقت نماز جنازہ ہٹا دینا ضروری نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المقتسم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۵۲۳)

حضرت اقدس مفتی اعظم صاحب قبلہ سنبھل سلام مسنون۔ مزاج گرامی۔

معروض ہو کہ مندرجہ ذیل مسائل کا جواب براہ کرم جلد ہی عنایت فرمائیں عین احسان ہوگا
(۱) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ ہوئی یا نہیں؟ ہوئی تو کس نے پڑھائی، نماز
جنازہ جو مقام مسلمانوں کی ہوا کرتی ہے ویسی ہوئی یا اور طرح سے ہوئی؟ یہ مسئلہ عرصہ سے جھگڑے کا
باعث بنا ہوا ہے شک رفع فرمائیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نماز جنازہ ہونے اور نہ ہونے میں مختلف اقوال ہیں،
ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ حضور کی نماز جنازہ نہیں ہوئی فرشتے جن انس کے گروہ آتے اور درود و سلام
عرض کرتے اور دعا کر کے واپس ہو جاتے۔ لیکن صحیح قول جس پر جمہور اہل سنت ہیں یہی ہے کہ حضور کی
نماز جنازہ جیسے آج ہوتی ہے پڑھی گئی، گروہ کے گروہ اور تنہا متفرق طور پر ہنگ آتے اور نماز جنازہ
پڑھتے۔ مگر اس پر سب علماء بلا اختلاف متفق ہیں کہ نماز جنازہ کا نہ تو کوئی امام بنا نہ جماعت ہوئی کما
حققہ علامہ الزرقانی فی شرح المواہب والعلامۃ علی قاری فی شرح البشفا والمحقق
الدهلوی فی ما ثبت من السنة و اشعة اللمعات۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنبھل

(۵۲۴)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسائل ذیل میں کہ

(۱) کیا حضور پر نور ﷺ کی نماز جنازہ پڑھی گئی یا نہ پڑھی گئی یا صرف درود و سلام ہی پڑھا گیا۔
میزان شرعی جلد اول صفحہ ۲۸۹ مسئلہ بارہویں میں ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضور پر نور ﷺ پر نماز
پڑھی ہے۔

ترجمہ ابن ماجہ کی پانچویں کتاب ابواب الجنائز صفحہ ۴۳۷ حدیث نمبر ۱۶۴۹ بروایت ابن عباس
رضی اللہ عنہما ثمالی ترمذی عربی باب ماجاء فی وفات رسول اللہ ﷺ قال: یا صاحب رسول اللہ ﷺ

قبض رسول اللہ ﷺ قال نعم فعلموا ان قد صدق قالوا یا صاحب رسول اللہ ﷺ اتصل
علی رسول اللہ ﷺ قال نعم و کیف قال یدخل قوم فیکبرون و یدعون و یصلون ثم
یخرجون ثم یدخل قوم فیکبرون و یصلون و یدعون ثم یخرجون حتی یدخلو الناس
اور متعدد حدیث مشکوٰۃ وغیرہ میں موجود ہے۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ نماز جنازہ بموجب حوالہ بالا
بغیر امامت ہوئی اور دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ حضور پر صرف درود و سلام ہی پڑھا گیا نماز نہیں ہوئی اور جو یہ
کہ حضور ﷺ کی نماز جنازہ ہوئی وہ کافر ہے اس سے سلام جائز نہیں اس کو توبہ لازم ہے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

حضور علیہ السلام کی وفات پر بالفعل کوئی امام المسلمین اور امیر متعین نہیں تھا ہر مسلمان مستقل ولی
تھا مسلمانوں نے نماز جنازہ فرداً فرداً بھی اور ایک ایک قوم نے جمع ہو کر بھی متفرق بہت سی نمازیں پڑھیں
جیسا کہ آپ حدیثوں میں دیکھ رہے ہیں۔

فیکبرون و یدعون و یصلون ثم یخرجون۔ سے نماز جنازہ ہی مراد ہے نہ محض درود و سلام
پڑھنا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) حضور نبی کریم کی نماز جنازہ کا مسئلہ مختلف مسائل سے ہے اس میں علماء سلف و خلف کے دو
قول ہیں ایک جماعت اہل حق کا یہ قول ہے کہ حضور علیہ السلام کی نماز جنازہ نہیں ہوئی بلکہ فرشتے جن
انس تنہا یا گروہ کے گروہ حاضر ہوتے اور درود و سلام پیش کرتے پھر دعا کر کے واپس ہوتے علامہ زرقانی
شرح مواہب لدنیہ میں فرماتے ہیں:

ذهب الیہ جماعة انه لم یصل علیہ الصلوٰۃ المعتادة وانما کان الناس یا تون
(زرقانی مصری جلد ۸ صفحہ ۹۴)

سیرۃ حلبی میں ہے:

ذکر انه دخل علیہ ابو بکر وعمر ومعهما نفر من المهاجرین والانصار بقدر
بایسع البیت فقال السلام علیک ایہا النبی ورحمته وبرکاته وسلم والمهاجرون والانصار

کما سلم ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہم ثم صفوا صفوا فالایوأمہم احد وکانا ابو بکر وعمر فی الصف الاول الذی حیال رسول اللہ ﷺ فقالا اللهم انا نشہد انه بلغ ما انزل الیہ ونصح لامتہ (الی اخر الدعاء) فیقول الناس آمین آمین وهذا يدل علی المراد بالصلوة علیہ ﷺ الدعاء لا الصلوة علی الجنائز المعروفة عندهم۔

(سیرۃ حلبی مصری جلد ۳ ص ۳۹۴)

لیکن اس میں وہ صحیح قول جو جمہور کا قول ہے یہی ہے کہ آپ کے جنازہ کی نماز اسی طرح ہوئی جس طرح کہ پڑھی جاتی ہے۔ تنہا تنہا شخصوں نے بھی پڑھی اور گروہ گروہ نے بھی پڑھی، لیکن اس نماز کی نہ باقاعدہ جماعت ہوئی، نہ کسی نے اس کی امامت کی۔ اور اس بات پر تو سب متفق ہیں کسی کا اختلاف نہیں کہ کسی نے حضور کے جنازہ کی نماز کی امامت ہرگز ہرگز نہیں کی۔ زرقانی میں ہے:

الصحيح الذي عليه الجمهور ان الصلوة على النبي ﷺ كانت صلاة حقيقة لا مجرد الدعاء نعم لا خلاف انه لم يؤمهم احد عليه كما مر لقول علي هو امامكم حيا وميتا فلا يقوم عليه احد الحديث رواه ابن سعد وخرج الترمذي ان الناس قالوا لابي بكر اتصل على رسول الله ﷺ قال نعم قالوا وكيف نصلي قال يدخل قوم فيكبرون ويصلون ويدعون ثم يدخل قوم فيصلون فيكبرون ويدعون فرادى۔

(ملخص زرقانی جلد ۸ صفحہ ۲۹۴)

خصائص کبریٰ میں ہے:

اخرج ابن اسحاق والبيهقي عن ابن عباس قال: لمامات رسول الله وادخل الرجال فصلوا عليه بغير امام ارسلوا حتى 'فرغوا ثم ادخل النساء فصلين عليه ثم ادخل للصبيان فصلوا عليه ثم ادخل العبيد فصلوا اعليه ارسلوا لم يؤمهم على رسول الله احد (خصائص جلد ۲ صفحہ ۲۸۶)

علامہ علی قاری شرح شفا شریف میں اقوال نماز جنازہ نقل کرنے کے بعد خلاصہ تحقیق اس طرح لکھتے ہیں۔

اقول الاظهر انهم صلوا عليه في محله وما كان يسع ذلك المحل اماما القومه كله فصلوا فرادى لادراك فضله وتكرار الصلوة عليه من خصوصيات حكمه هذا ومن زعم ان

المراد بالصلوة هنا دعاء فقد عدل عن الحقيقة من غير قرينة صارفة۔

(شرح شفا مصری جلد ۱ صفحہ ۷۵۴)

سیرۃ حلبی میں ہے:

كانت صلاتهم عليه ﷺ كصلاتهم على غيره اي بتكبيرات اربع لا مجرد الدعاء من غير تكبيرات (وفيه ايضا) والصحيح الذي عليه الجمهور انهم صلوا عليه اراد فكأن يدخل عليه فوج يصلون فرادى ثم يخرجون ثم يدخل فوج اخر فيصلون كذلك (سیرۃ حلبی جلد ۳ صفحہ ۴۰۴)

اسی سیرۃ حلبی میں ہے:

والصحيح ان هذا الدعاء كان ضمن الصلاة المعروفة التي باربع تكبيرات فقد جاء ان ابا بكر رضي الله عنه دخل عليه ﷺ فكبر اربع تكبيرات ثم دخل عمر رضي الله عنه فكبر اربعا ثم دخل عثمان رضي الله عنه فكبر اربعا ثم طلحة بن عبيد الله والزبير بن العوام رضي الله عنهما ثم تتابع الناس ارسلوا يكبرون عليه وقال ابن كثير رحمه الله وهذا الامر اي صلاتهم عليه فرادى من غير امام يؤمهم لجمع عليه

(سیرۃ حلبی جلد ۳ صفحہ ۳۹۴)

حضرت شیخ محقق عبدالحق محدث دہلوی نے ما ثبت من السنة میں فرمایا:

روى عن محمد انه صلى على النبي بغير امام في رواية فرادى لا يؤمهم احد يدخل المسلمون زمرا فيصلون عليه ويخرجون۔ (ما ثبت من السنة ص ۱۴۰)

یہی شیخ مدارج النبوة میں فرماتے ہیں:

”اما نماز گذاردن بر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بجماعت نبود وجماعتی در آمدند بروے و نماز گذاردند بجماعت و بیرون می آمدند و می گذاردند۔ بچنانکہ ترتیب صفوف است در جماعت و امامت نہ کرد بر جنازہ شریف رسول خدا ﷺ هیچ یک از میرالمومنین علی رضی اللہ عنہ منقول است کہ فرمودہ در جنازہ رسول اللہ ﷺ کس امامت نہ کرد زیرا کہ آن حضرت علیہ السلام در حیات و ممات امام شہادت و این از خواص آنحضرت علیہ السلام کہ نماز ہا متعدد کردند و تنہا تنہا گذاردند و روایت آمدہ اول کس کہ نماز گذارد بروے اہل بیت وے بود علی و عباس و بنو ہاشم پس از اہل در آمدند مہاجرین بعد از اہل انصار پس ترمی آمدند و مردم

فوج فوج و نمازی گذاردند۔

(مدارج النبوة صفحہ ۵۶۶ جلد ۲)

تو ان عبارات سے روز روشن کی طرح ثابت ہو گیا کہ بنا بر قول صحیح کے حضور نبی کریم ﷺ کی نماز جنازہ حسب دستور چار تکبیروں کے ساتھ حضرات اہل بیت کرام و صحابہ عظام مہاجرین و انصار زنان و مردان نے تنہا تنہا بھی ادا کی اور گروہ کے گروہ نے بھی پڑھی۔ لیکن اس نماز جنازہ کی نہ جماعت ہوئی نہ کسی نے اس کی امامت کی۔ بالجملہ منکرین نماز جنازہ بھی علمائے سلف اور اہل حق کی ایک جماعت ہی ہے جن کا یہ قول نہ غلط ہے نہ باطل اور ان کے مقابلہ میں قائلین نماز جنازہ جمہور سلف و خلف ہیں۔ ان کا قول بہ نسبت ان کے قول کے زیادہ صحیح اور معتمد ہے تو جو قائلین نماز جنازہ کو اپنی جہالت سے کافر کہتا ہے اس پر خود ہی توبہ لازم ہے اور وہ خود ہی اسلام کا اہل نہیں رہا۔

اب باقی رہے مجیب مدرسہ امینیہ دہلی کے اول جواب میں یہ الفاظ ”حضور علیہ السلام کی وفات پر بالفعل کوئی امام المسلمین اور امیر المؤمنین متعین نہیں تھا“ غلط اور تصریحات کتب کے خلاف ہیں۔ چنانچہ سیرۃ حلبی میں اسی بحث میں صاف طور پر لکھا ہے:

قال ابن کثیر و هذا الامر ای صلاتهم علیہ ﷺ فرادی من غیر امام یؤمهم مجمع علیہ و یقال لان المسلمین لم یکن لهم حینئذ امام لانهم لم یشرعوا فی تجهیز علیہ الصلاة والسلام الا بعد تمام البیعة لابی بکر رضی اللہ عنہ لانه لما تحقق موته ﷺ اجتمع غالب المهاجرین علی ابی بکر الحدیث۔

تو ظاہر ہو گیا کہ حضور کی نماز جنازہ سے پہلے پہلے حضرت ابو بکر کی بیعت تمام ہو چکی تھی تو بوقت نماز جنازہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے امیر و امام متعین ہو چکے تھے۔ تو اس مجیب کے قول کا بطلان اور اس کی جہالت آشکار ہو گئی۔ پھر اس مجیب نے آخر جواب میں یہ کہا ”اور جو لوگ کہتے ہیں کہ نماز نہیں ہوئی۔ اور جو یہ کہے کہ نماز جنازہ ہوئی وہ کافر ہے“ مجیب نے ان دونوں کے لئے یہ حکم دیا ”بالکل جاہل ناواقف ہیں“ تو آخر الذکر کے لئے تو یہ حکم صحیح ہے لیکن اول الذکر کے لئے یہ حکم دینا یعنی جو لوگ کہتے ہیں کہ نماز نہیں ہوئی وہ بالکل جاہل ناواقف ہیں مجیب کی کس قدر جرأت و دلیری ہے کہ ہم نے ابتدائے جواب میں عبارات سے علماء سلف و خلف کا یہ قول پیش کر دیا ہے کہ حضور علیہ السلام کی نماز جنازہ نہیں ہوئی۔ تو اس جاہل مجیب نے ان سب علماء سلف و خلف کو ناواقف اور بالکل جاہل بنا ڈالا۔ لہذا یہ اس مجیب کے خود سخت ناواقف اور بالکل جاہل ہونے کی روشن دلیل ہے۔ مولیٰ تعالیٰ اس کو قبول حق کی

توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبید محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۵۲۵)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
بعلی خدمت فیض درجت محبوب ملت حضرت مولانا مولوی رئیس المفتیین الحاج الشاہ محمد اجمل
صاحب قبلہ مفتی ہند دامت برکاتہم القدسیہ۔ بعد سلام مسنون معروض۔

کہ حضور پر نور جی قیوم ﷺ کی نماز جنازہ کس نے پڑھی اور کس نے پڑھائی؟ اگر نماز جنازہ
نہ پڑھی گئی اور نہ پڑھائی گی اور صرف درود و سلام عرض کیا گیا تین روز تک، تو ایسی حالت میں ایک پیش
امام جو اس بات کا قائل ہے کہ نماز جنازہ پڑھی گئی، اس شخص نے ایسا بیان کر کے سرور عالم ﷺ پر اتہام
لگایا یا نہیں؟ اور آپ کے خصائص کبریٰ میں تنقیص کی یا نہیں؟ اگر کی تو پھر ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا
اہل سنت والجماعت کو جائز ہے یا مکروہ اور ایسے ہی قاضی سے نکاح پڑھانا جو خود بد عقیدہ ہے جائز ہے
یا نہیں؟۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حضور نے حرمین شریفین میں جا کر ایک نجدی غیر مقلد سے اس مسئلہ پر بحث
و تمحیص بصورت مناظرہ فرمائی اور شکست فاش دی، اس مناظرہ کے دلائل بھی جو آپ نے وہاں پیش
فرمائے تھے ارقام فرمائیں نیز اور دلائل کتب شرعیہ مستندہ سے ثابت فرمائیں کہ نماز جنازہ پڑھی گئی یا نہیں
؟ فتویٰ کا جواب تفصیل سے عنایت فرمائیں کیونکہ جناب کا تفصیل سے جواب دینا مشہور ہے۔ مینو دو جروا
آپ کا خادم العلماء و المشائخ محمد ظہور الدین گاؤ قصابان ٹونک راجستھان

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

الحمد لله و کفی و الصلوة والسلام علی حبیبہ المصطفیٰ و علی آلہ و صحبہ
و حزبه و علی کل من اجتبی

اما بعد: سوال کے جواب سے پہلے فریقین کا بنیادی اختلاف جس کا ذکر سوال میں تو نہیں ہے
لیکن سوال کے ساتھ جو واقعات کا خط آیا ہے اس میں صراحتہ وہ مذکور ہے تو اس بنیادی اختلاف کا حل کر

دینا اس مسئلہ مجوشہ کے حل کے لئے ضروری ہے۔ لہذا ہم پہلے بنیادی اختلاف یعنی مسئلہ حیات النبی ﷺ پر دلائل قائم کرتے ہیں۔

دلیل اول: خود اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:

ولا تحسبن الذين قتلوا في سبيل الله امواتا ط بل احياء عند ربهم يرزقون۔

(سورہ آل عمران)

اور جو اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے گئے ہرگز انہیں مردہ نہ خیال کرنا بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں روزی پاتے ہیں۔

اس آیت کریمہ سے ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ شہدائے کرام کو موت کے بعد ہی حیات عطا فرمادیتا ہے یہاں تک کہ ان پر رزق پیش کیا جاتا ہے تو شہداء کے لئے حیات کا اثبات تو نص قرآنی سے ثابت ہو گیا۔ اور ہمارے نبی ﷺ بلاشبہ شہید ہوئے۔

چنانچہ بخاری شریف میں حضرت ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

كان النبي ﷺ يقول في مرضه الذي مات فيه يا عائشة ما ازال اجد الم الطعام الذي اكلت بخير فهذا اوان وجدت انقطاع ابهرى من ذلك السم۔

(بخاری مصطفائی جلد ۲ صفحہ ۶۳۷)

یعنی نبی کریم ﷺ اپنے اس مرض میں جس میں آپ نے وفات پائی فرماتے تھے اے عائشہ میں اس کھانے کی تکلیف جس کو میں نے خیبر میں کھایا ہمیشہ پاتا رہا پس اس وقت تو میں اس زہر سے اپنی رگ دل کے کٹ جانے کا اثر پاتا ہوں۔

علامہ سبکی شفاء السقام میں اس حدیث شریف سے اس طرح استدلال فرماتے ہیں:

ان النبي ﷺ شهيد فانه ﷺ لماسم بخير واكل من الشاة المسمومة وكان ذلك سماقاتلا من ساعته مات منه بشر بن البراء رضی اللہ عنہ وبقی النبی ﷺ وذلك معجزة في حقه صار الم السم يتعاهده الى ان مات به ﷺ في مرضه الذي مات فيه ما زالت اكلة خبير تعاوني حتى كان الا ن كان قطعت ابهرى قال العلماء فجمع الله له بذلك بين النبوة والشهادة

(شفاء السقام صفحہ ۱۲۱)

بیشک نبی ﷺ شہید ہیں، کہ جب خیبر میں حضور کرز ہر دیا گیا اور آپ نے زہر الود بکری کا کچھ گوشت کھایا اور وہ ایسا سم قاتل تھا کہ اس سے اسی وقت حضرت بشر بن البراء رضی اللہ عنہ کی موت ہوئی اور نبی ﷺ باقی رہے اور یہ آپ کے لئے معجزہ تھا کہ زہر کی تکلیف یہاں تک پہنچ رہے کہ جس مرض میں وفات پائی اسی زہر سے موت واقع ہوئی خیبر کے لقمہ کا اثر ہمیشہ عود کرتا رہا یہاں تک کہ اس وقت میری رگ دل کو کاٹ دیا۔ علماء نے فرمایا: اسی بنا پر اللہ نے حضور کیلئے نبوت اور شہادت کو جمع فرمادیا۔

علامہ قسطلانی مواہب لدنیہ میں اور علامہ زرقانی اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

واذا ثبت بشهادة قوله تعالى: ولا تحسبن الذين قتلوا في سبيل الله امواتا بل احياء عند ربهم يرزقون، حياة الشهداء ثبت للنبي ﷺ بطريق الاولى، لانه فوقهم درجات قال السيوطي: وقل نبی الا وقد جمع مع النبوة وصف الشهادة فيدخلون في عموم الآية۔

(زرقانی مصری جلد ۸ صفحہ ۳۱۲)

اللہ تعالیٰ کے اس قول (اور جو اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے گئے ہرگز انہیں مردہ نہ خیال کرنا بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں روزی پاتے ہیں) کی شہادت سے شہداء کی حیات ثابت ہوئی تو نبی ﷺ کے لئے بطریق اولیٰ ثابت ہوئی اس لئے کہ وہ ان سے درجوں بلند ہیں۔ علامہ سیوطی نے فرمایا کہ فقط نبی تو کم ہوئے ورنہ نبوت کے ساتھ وصف شہادت جمع کر دیا گیا تو وہ انبیاء آیت کے عموم میں داخل ہو جائیں گے۔

علامہ قاضی عیاض شفا شریف میں اور علامہ علی قاری اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

(وكان المسلمون) اي الصحابة والتابعون (ليرون) اي ليعتقدون (ان رسول الله ﷺ مات شهيدا) (شرح شفا مصری جلد ۱ صفحہ ۶۲۲)

صحابہ و تابعین یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ بیشک رسول اللہ ﷺ کی شہید ہو کر موت واقع ہوئی۔ ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ ہمارے نبی ﷺ شہید ہوئے۔ اور جب آپ کا شہید ہونا حدیث بخاری اور اقوال صحابہ و تابعین و علماء متقدمین و متاخرین سے ثابت ہو چکا تو آیت مذکور سے آپ کے لئے حیات ثابت ہوئی لہذا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا حیات النبی ہونا نہ فقط قرآن بلکہ احادیث سے بھی ثابت ہوا۔

بحث اول: شہداء کے جسم گلتے سڑتے نہیں ہیں۔

چنانچہ علامہ امام سبکی شفاء السقام میں فرماتے ہیں:

’ ذکر القرطبی ان اجساد الشهداء لا تبلى - (شفاء السقام صفحہ ۱۴۵)
امام قرطبی نے ذکر کیا کہ بیشک شہداء کے اجسام گلے سڑتے نہیں۔
علامہ شیخ احمد تفسیر صاوی میں تحریر فرماتے ہیں:

ولا تاكل الارض اجساد الشهداء - (صاوی مصری جلد ۱ صفحہ ۶۴)
زمین شہداء کے اجسام کو نہیں کھاتی ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ شہداء کے اجسام گلے سڑتے نہیں، زمیں ان کے جسموں کو کھاتی نہیں۔ علامہ امام سبکی نے اسی سلسلہ میں چند شہداء صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واقعات احادیث سے اسی شفاء السقام میں نقل کئے ہیں:

وقد صح عن جابر ان اباہ وعمر ابن الجموح رضی اللہ عنہم وھما ممن استشهد باحد ودفنا فی قبر واحد، حفر السیل قبر ھما فوجدا لم يتغیرا وکان احدهما قد جرح موضع یدہ فوضع علی جر حہ فدفن وھو کذلک فامیطت یدہ عن جر حہ ثم ارسلت فرجعت کما کانت وکان بین ذلک و بین احدثت واربعون سنة ولما اجرى معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ العین اللتی استتبھا بالمدينة وذلک بعد احد بنحو من خمسين سنة ونقل الموتی اصابت المسمار قدم حمزة رضی اللہ عنہ فسال منه الدم وجد عبد اللہ بن حرام کانما دفن بالامس وروی کافة اهل المدينة ان جدار قبر النبی ﷺ لما انھدم فی ایام الولید بدت لھم قدم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ وکان قتل شھیدا۔

(شفاء السقام صفحہ ۱۴۵)

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بروایت صحیح مروی ہے کہ ان کے والد اور عمر بن جموح رضی اللہ عنہم ان صحابہ سے ہیں جو احد میں شہید ہوئے اور یہ دونوں ایک ہی قبر میں دفن کئے گئے پانی کے بہاؤ نے ان کی قبر کو کھول دیا تو ان کے جسم ایسے پائے گئے جن میں کسی طرح کا تغیر نہ ہوا تھا۔ اور ان کا ایک ہاتھ زخمی ہوا تھا اور اس نے اپنا ہاتھ زخم پر رکھ لیا تھا تو ان کو اسی طرح دفن کر دیا گیا تھا اب ان کا ہاتھ ان کے زخم سے علیحدہ کیا گیا۔ پھر اس کو جب چھوڑ دیا تو ہاتھ اپنے پہلے حال کی طرف لوٹ گیا اور اس واقعہ کے اور جنگ احد کے درمیان ۳۶ سال کی مدت گزری اور جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے لئے پانی کی نہر کھدوائی جو جنگ احد کے پچاس سال کے بعد شروع ہوئی اور مردوں کو منتقل کیا اسی

میں یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قدم پر پھاوڑ الگ گیا تو اس سے خون بہنے لگا اور عبد اللہ بن حرام کو ایسا پایا گیا کہ انہیں کل ہی دفن کیا گیا ہے اور تمام اہل مدینہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے روضہ کی دیوار زمانہ ولید میں منہدم ہو گئی تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قدم ظاہر ہو گیا اور وہ شہید ہوئے تھے تو ان احادیث سے یہ ثابت ہو گیا کہ شہداء کے اجسام گلے سڑتے نہیں اور زمیں ان کے اجسام کو کھاتی نہیں۔ تو شہداء کی حیات جب ثابت ہو گئی اور ہمارے نبی ﷺ کا شہید ہونا پہلے ثابت ہو چکا۔ لہذا مسئلہ حیات النبی کا ثبوت اس سے ظاہر ہو گیا۔

بحث دوم: حضرات انبیائے کرام کے اجسام بعد وفات نہ گلے سڑتے ہیں نہ انہیں زمیں کھا سکتی ہے۔ تو ان کے لئے حیات ثابت ہے۔

علامہ سیوطی نے شیخ الشافعیہ ابو منصور بغدادی کا یہ قول نقل کیا: ”ان الانبياء لا يبلون ولا تاكل الارض منهم شيئا“ (انباء الاذکیا صفحہ ۸)

بیشک انبیاء گلے سڑتے نہیں اور نہ زمیں ان کا کچھ کھا سکے۔

امام بیہقی کتاب الاعتقاد میں فرماتے ہیں:

الانبياء بعد ما قبضوا ردت اليهم ارواحهم فھم احياء عند ربھم كالشهداء۔

(انباء الاذکیا صفحہ ۷)

انبیاء کی روحيں قبض ہو جانے کے بعد پھر اجسام کی طرف واپس کر دی جاتی ہیں تو وہ شہداء کی طرح اپنے رب کے پاس زندہ ہیں۔ نیز حیات انبیاء علیہم السلام پر بکثرت احادیث دلالت کرتی ہیں۔ ابو داؤد، نسائی، دارمی، بیہقی میں مروی ہے:

ان الله حرم علی الارض اجساد الانبياء“ (مشکوٰۃ شریف صفحہ ۱۲۰)

بیشک اللہ نے زمیں پر انبیاء کے جسموں کو حرام کر دیا ہے۔

ابن ماجہ میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

ان الله حرم علی الارض ان تاكل اجساد الانبياء فنبی اللہ حی یرزق“

(مشکوٰۃ صفحہ ۱۲۱)

اللہ نے زمین پر انبیاء کے جسموں کا کھانا حرام کر دیا ہے تو اللہ کا نبی زندہ ہے رزق دیا جاتا ہے۔

ابو یعلیٰ نے اپنی ”مسند“ میں اور ابن عدی نے ”کامل“ میں اور بیہقی نے ”کتاب حیاۃ الانبياء“

میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

الانبياء احياء في قبورهم يصلون“ (جامع صغیر جلد ۱ صفحہ ۱۰۳)

انبیاء زندہ ہیں قبروں میں اپنی نماز پڑھتے ہیں۔

ابونعیم نے حلیہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: مررت بقبرہ موسیٰ علیہ السلام وهو قائم یصلی فیہ۔

(انباء الاذکیاء للسیوطی صفحہ ۳)

میں موسیٰ علیہ السلام کی قبر پر گذر تو وہ اس میں کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہے تھے۔

ابونعیم دلائل النبوة میں حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ سے راوی:

قال لقد رأيتني (ليالي الحرة) وما في مسجد رسول الله ﷺ غيري وما ياتي وقت صلاة الا وسمعت الاذان من القبر۔ (انباء الاذکیاء صفحہ ۳)

انہوں نے فرمایا: میں نے زمانہ حرہ میں دیکھا اور مسجد نبوی میں میرے سوا اور کوئی نہ تھا کہ نماز کا جو وقت آتا تو میں قبر شریف سے اذان کی آواز سنتا۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں، ان کے جسموں کو نہ زمین کھا سکتی ہے نہ وہ گلے سڑتے ہیں۔ تو ہمارے نبی تو نہ فقط نبی بلکہ نبی الانبیاء ہیں تو ان کے حیات النبی ہونے میں کسی شبہ و شک کو راہ نہیں۔

بحث سوم: ہمارے نبی ﷺ میں نبوة وشہادت دونوں باتیں جمع ہیں۔

چنانچہ علامہ سبکی شفاء السقام میں فرماتے ہیں:

فجمع الله بذلك بين النبوة والشهادة“ (شفاء السقام صفحہ ۱۴۱)

تو حضور کے لئے اسی بنا پر اللہ نے نبوت اور شہادت کو جمع فرمادیا۔

حضرت احمد اور ابویعلیٰ اور طبرانی اور حاکم مستدرک میں بہت سی دلائل النبوة میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے راوی جس میں یہ الفاظ بھی ہیں ”ان الله اتخذہ نبیا واتخذہ شہیدا۔“

(انباء الاذکیاء صفحہ ۶)

بیشک اللہ نے حضور علیہ السلام کو نبی اور شہید بنایا۔ تو جب ہمارے نبی ﷺ کے لئے نبوت اور شہادت دونوں فضل ثابت ہوئے تو ان کی حیات بنا بر شہادت نص قرآنی سے ثابت ہو گئی۔ اور حضور اکرم

ﷺ کی حیات بنا بر نبوت احادیث کثیرہ متواتر سے ثابت۔

چنانچہ یہی علامہ سیوطی اس میں فرماتے ہیں:

فاقول حياة النبي ﷺ في قبره هو وسائر الانبياء معلومة عندنا حتما قطعيا لما قام عندنا من الادلة في ذلك وتواترت به الاخبار الدالة على ذلك۔

پس میں کہتا ہوں کہ نبی ﷺ کی قبر میں حیات اور تمام انبیاء کی ہمارے نزدیک قطعی حتمی طور پر معلوم ہے کہ اس میں دلیل قائم ہو چکیں اور اس پر دلالت کرنے والی خبریں بہ تواتر ثابت ہو چکیں۔

علامہ قسطلانی اپنی کتاب مواہب لدنیہ میں فرماتے ہیں:

ولا شك ان حياة الانبياء عليهم السلام ثابتة معلومة مستمرة ثابتة ونبينا ﷺ افضلهم واذا كان كذلك فينبغي ان تكون حياته اكمل واتم من حياة سائرهم

(شرح الزرقانی جلد ۸ صفحہ ۳۰۹)

اور بیشک بلاشبہ انبیاء علیہم السلام کی حیات مستمر اور معلوم اور ثابت ہے اور ہمارے نبی تو افضل الانبیاء ہیں۔

اور جب یہ حقیقت ہے تو حضور کی حیات ان تمام انبیاء کی حیات سے تمام تر اور کامل تر ثابت ہو گئی۔ علامہ علی قاری شرح شفا شریف میں تحریر فرماتے ہیں:

فمن المعتقد المعتمد انه ﷺ حي في قبره كسائر الانبياء في قبورهم وهم احياء عند ربهم وان لا رواحهم تعلقا بالعالم العلوي والسفلي كما كانوا في العالم الدنيوي۔

(شرح شفا جلد ۲ صفحہ ۱۲۶)

اور معتمد عقیدہ یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ اپنی قبر میں زندہ ہیں جیسا کہ تمام انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہیں تو انبیاء اپنے رب کے حضور زندہ ہیں ان کی روحوں کا تعلق عالم علوی و سفلی سے اسی طرح ہے جس طرح دنیوی حال میں تھا۔ تو حضور نبی کریم ﷺ کا حیات النبی ہونا قرآن کریم سے بھی ثابت۔ اکثر احادیث سے بھی ثابت۔ اقوال سلف و تصریحات خلف سے بھی ثابت لہذا اب حیات النبی کا منکر کوئی مسلمان تو ہو نہیں سکتا۔ ولله الحمد والمنة

بحث چہارم: حضرات انبیاء علیہم السلام کے لئے جو یہ حیات ثابت کی گئی ہے اس سے صرف حیات ارواح مراد نہیں کہ روح کو موت نہیں بلکہ وہ زندہ رہتی ہے۔

چنانچہ علامہ سبکی شفاء السقام میں فرماتے ہیں: ”والروح باقیہ لم تمت۔“

(شفاء السقام صفحہ ۱۲۲)

اور روح باقی رہتی ہے وہ مرقی نہیں۔

تو اب اس حیات سے مراد روح مع جسم کی حیات ہے اور ایسی حیات سوائے شہداء کے اور مؤمنین کے لئے ثابت نہیں۔ چنانچہ حضرت علامہ سیوطی شرح الصدور بشرح حال الموتی والقور میں فرماتے ہیں۔

الفرق بین حیاة الشهداء و غیرہم من المؤمنین الذین ارواحہم فی الجنة من وجہین احدهما ان ارواح الشهداء تخلق لها اجساد فان الشهداء بذلوا اجسادہم للقتل فی سبیل اللہ فعوضوا عنها بهذه الاجساد فی البرزخ والثانی انہم یرزقون من الجنة و غیرہم لم یثبت فی حقہ مثل ذالک۔ ملخصاً۔ (شرح الصدور صفحہ ۱۰۶/۱۰۷)

شہداء کی حیات اور ان کے سوا ان مؤمنین کی حیات میں فرق جن کی روحیں جنت میں ہیں وہ وہاں پر ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ شہداء کی روحوں کے لئے اجسام پیدا کر دیئے جاتے ہیں اس بنا پر کہ شہداء نے اللہ کے راستہ میں قتل کے لئے اپنے جسموں کو پیش کر دیا تو برزخ میں انہیں ان جسموں کے عوض پر دوسرے اجسام عطا فرمائے گئے دوسری وجہ یہ ہے کہ شہداء کو جنت میں رزق دیا جاتا ہے۔ اور غیر شہداء کے حق میں یہ خصوصیت ثابت نہیں۔ تو اگر شہداء اور مؤمنین کی حیات میں ایسا بین فرق نہ ہوتا تو قرآن کریم اور احادیث ان کی حیات کو اس خصوصیت کے ساتھ ہرگز ذکر نہ کرتیں۔ لہذا شہداء کے لئے حیات روح مع جسم کے ثابت ہوگئی جس کے ثبوت بحث اول میں کافی گذرے۔ اور یہی جمہور کا قول ہے۔

چنانچہ علامہ سبکی شفاء السقام میں فرماتے ہیں:

ان الشهداء احياء حقيقة وهو قول جمهور العلماء۔

(شفاء السقام صفحہ ۱۲۲)

بے شک شہداء حقیقتہً زندہ ہیں اور یہی جمہور علماء کا قول ہے۔

اب باقی رہی حیات انبیاء علیہم السلام تو اس حیات سے بھی روح مع جسم کی حیات مراد ہے۔

حیات انبیاء حیات شہداء سے بدرجہا کامل ترین و افضل ترین ہے۔

علامہ سبکی شفاء السقام میں فرماتے ہیں:

حياة الشهداء اكمل واعلى فهذا النوع من الحياة والرزق لا يحصل لمن ليس في رتبته اما حيلة الانبياء اعلى واكمل واتم من الجميع لانها للروح والجسد على الدوام على ما كان في الدنيا على ما تقدم من جماعة من العلماء۔

(شفاء السقام صفحہ ۱۵۴)

شہداء کی حیات اکمل اور اعلیٰ ہے اور ایسی حیات اور رزق اس کے لئے حاصل نہیں جو ان کا ہر تہہ میں لیکن انبیاء کی حیات سب سے اعلیٰ اور اکمل اور تمام تر ہے اس لئے کہ ان کے لئے جیسی کہ دنیا میں روح و جسم کے لئے حیات حاصل تھی وہ ہمیشہ تک حاصل ہے جیسا کہ جماعت علماء کا قول گذرا۔ شیخ الاسلام علامہ سمہودی وفاء الوفا میں فرماتے ہیں:

ولا شك في حياته صلى الله عليه وسلم بعد وفاته وكذا سائر الانبياء عليهم الصلاة والسلام احياء في قبورهم حياة اكمل من حياة الشهداء التي اخبر الله تعالى بها في كتابه العزيز ونبينا ﷺ سيد الشهداء۔ (وفاء الوفاء مصری جلد ۲ صفحہ ۴۰۵)

اور حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد حیات میں کوئی شک نہیں۔ اسی طرح تمام انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبور میں زندہ ہیں ان کی حیات شہداء کی اس حیات سے کامل تر ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں خبر دی ہے اور ہمارے نبی ﷺ کی وفات کے بعد حیات میں کوئی شک نہیں۔ اسی طرح تمام انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہیں ان کی حیات شہداء کی اس حیات سے کامل تر ہے جسکی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عزیز میں خبر دی ہے اور ہمارے نبی ﷺ تو شہداء کے سردار ہیں۔ اسی میں ہے۔

واما ادلة حيلة الانبياء فمقتضاها حياة الابدان كحالة الدنيا مع الاستغناء عن

الغذاء ومع قوة النفوذ في العالم۔ (وفاء الوفاء مصری جلد ۲ صفحہ ۲۰۷)

لیکن حیات انبیاء کی دلیلیں تو ان کا مقتضی یہ ہے کہ دنیا کے حال کی طرح اجسام انبیاء کو حیات حاصل ہے باوجود اس کے کہ وہ غذا سے مستغنی ہیں اور انہیں عالم میں نفوذ کی قوت حاصل ہے۔ حضرت شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی مدارج النبوة میں فرماتے ہیں:

”بدانك حياة انبياء صلوة الله وسلامه عليهم اجمعين متفق عليه است میان علماء ملت و پنج کس خلاف

بست در اں کامل تر و قوی تر از وجود حیات شہداء و مقتولین فی سبیل اللہ کہ آں معنوی اخروی است عند اللہ

حياة انبياء حیات حسی دنیاوی است“ (مدارج النبوة جلد ۲ صفحہ ۲۷۵)

حق سبحانہ حرام گردایندہ است برز میں کہ بخورد اجساد انبیاء علیہم السلام وازینا معلوم میشود کہ حیات انبیاء حیات حسی دنیاوی است نہ مجرد لقاے ارواح چنانچہ شہداء را ہم در اجوف طیورے اندازند

(صفحہ ۵۷۶)

جانو کہ انبیاء علیہم السلام کی حیات کا مسئلہ علماء ملت میں ایسا متفق علیہ ہے کہ اس میں پانچ شخص بھی مخالف نہیں۔ ان کی حیات شہداء اور مقتولین فی سبیل اللہ کی حیات سے بہت کامل اور زائد قوی ہے کہ حیات شہداء تو عند اللہ معنوی اخروی ہے اور حیات انبیاء حسی و دنیوی حیات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء علیہم السلام کے جسموں کا کھانا حرام کر دیا ہے تو اسی سے معلوم ہو گیا کہ انبیاء کی حیات حسی و دنیوی حیات ہے، نہ فقط روحوں کی ملاقات جیسا کہ ارواح شہداء پرندوں کے جوف میں داخل ہو جاتی ہیں۔

ان کثیر عبارات سے آفتاب سے زائد روشن طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ شہداء کی حیات سے بھی اعلیٰ و اقویٰ اور تمام تر د کامل تر انبیاء علیہم السلام کی حیات حسی دنیوی حقیقی حیات ہے ان کی ارواح و اجسام کو دنیا میں جیسی حیات حاصل تھی اسی طرح ان کی وفات کے بعد ان کی ارواح ان کے اجسام میں واپس کر دی جاتی ہیں۔ تو ان کے اجسام کو نہ مٹی کھاتی ہے نہ وہ گلے سڑتے ہیں۔ لہذا انبیاء کرام اپنے اجسام کے ساتھ اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور عالم میں تصرف کرتے ہیں۔ الحاصل اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ اہل سنت و جماعت کا متفقہ عقیدہ یہی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے لئے حسی دنیوی حقیقی حیات قرآن کریم اور احادیث اور اقوال سلف و خلف سے ثابت ہے۔ اس پر کافی دلائل پیش کر دیئے گئے لیکن اس مسئلہ میں وہابیہ دیوبندیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ فرقہ حیات النبی ہی کا قائل نہیں ان کے نزدیک اجسام انبیاء کو مٹی کا لیتی ہے اور وہ گلے سڑتے ہیں تو اس گمراہ فرقہ نے ہماری پیش کردہ آیت کریمہ اور احادیث اور تمام اقوال سلف و خلف کو ٹھکرا دیا اور ان کے خلاف اپنا ناپاک عقیدہ گڑھا۔ چنانچہ اس فرقہ کے پیشوا امام الوہابیہ مولوی اسماعیل دہلوی نے تقویۃ میں صاف صاف لکھ دیا اور محض اپنی دیدہ دلیری سے اس کو حدیث بنا کر اس طرح پیش کیا کہ گویا حضور کریم ﷺ نے یہ فرمایا:

”یعنی میں بھی ایک دن مر کر مٹی میں ملنے والا ہوں“

(تقویۃ الایمان مطبوعہ مرکنفاصل دہلی صفحہ ۶۹)

اس عبارت میں امام الوہابیہ نے اپنا صاف طور پر یہ عقیدہ بتا دیا کہ نبی مر کر مٹی میں مل جاتا ہے یعنی نبی کے جسم کو زمین کھا لیتی ہے اور اس کا جسم گلتا سڑتا ہے۔ تو اس میں حیات النبی کا صاف انکار نہیں ہے

تو اور کیا ہے۔

اب باقی رہا حضور نبی کریم ﷺ کی نماز جنازہ کا مسئلہ تو اہل سنت میں یہ مسئلہ خود مختلف فیہ ہے اہل سنت کی ایک جماعت علماء تو یہ فرماتی ہے کہ حضور کی نماز جنازہ نہیں ہوئی فرشتے جن۔ انس حجرہ شریف میں حاضر ہوئے اور درود و سلام پڑھ کر دعا کر کے واپس ہو جاتے۔

چنانچہ علامہ زرقاتی شرح مواہب لدنیہ میں فرماتے ہیں:

ذهب الیہ جماعة انه لم یصل علیہ الصلوۃ المعتادة وانما کان الناس یاتون لیدعون۔ (زرقاتی مصری جلد ۸ صفحہ ۹۴)

ایک جماعت اس طرف گئی کہ حضور کی نماز جنازہ معروف نہیں پڑھی گئی سوا اس بات کے کہ لوگ حاضر ہوتے اور دعا کرتے سیرۃ حلبی میں ہے:

و ذکر انه دخل علیہ ﷺ ابو بکر وعمر ومعهما نفر من المهاجرین والانصار فندبر ما یسع البیت فقالوا السلام علیک ایہا النبی ورحمة اللہ وبرکاتہ وسلم المهاجرون والانصار کما سلم ابو بکر وعمر رضی اللہ عنہم ثم صفوا صفو فلا یؤمہم احد وکان ابو بکر وعمر فی الصف الاول الذی خیال رسول اللہ فقال: اللہم انانشهد انه قد بلغ ما انزل من نصح لا متہ وجاهد فی سبیل اللہ حتی اعز اللہ دینہ وتمت کلمتہ (الی آخر الدعاء) بنقول آمین آمین وهذا يدل علی المراد بالصلوة علیہ ﷺ الدعاء لا الصلوة علی الجنائزہ لمعروفة عندهم۔ (سیرۃ حلبی مصری جلد ۳ صفحہ ۳۹۴)

اور مذکور ہے کہ حضور ﷺ کے حجرہ میں حضرت ابو بکر اور عمر اور ان کے ساتھ مہاجرین و انصار کا ایک گروہ داخل ہوا بمقدور اور گنجائش حجرہ شریف کے تو حضرت ابو بکر وعمر نے عرض کیا تم پر سلام ہواے یا رسول اللہ کی رحمت و برکتیں اور مہاجرین و انصار نے بھی انہیں کی طرح سلام پیش کیا۔ پھر انہوں نے انہیں بنالیں اور کوئی ان کا امام نہیں تھا اور ابو بکر وعمر پہلی صف میں حضور رسول اللہ ﷺ کے مقابل تھے انہوں نے یہ دعا کرنی شروع کی اے اللہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ بیشک حضور ﷺ نے تبلیغ فرمادی جو ان کی طرف نازل ہوا اور اپنی امت کو نصیحت فرمائی اور اللہ کے راستہ میں جہاد کیا یہاں تک کہ اللہ نے اپنے دین کو عزت دی اور اس کے کلمہ کو تمام کیا۔ (آخر دعائے تک) لوگوں نے آمین آمین کہی تو یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ صلاۃ سے مراد حضور کے سامنے دعا کرنا ہے نہ وہ نماز جنازہ جو لوگوں میں معروف ہے۔ لیکن

کہ فرمودہ در جنازہ رسول ﷺ بیچ کس امامت نہ کرد زیرا کہ آنحضرت علیہ السلام در حیات وممات امام شہادت وائیں از خواص آنحضرت علیہ السلام کہ نماز متعدد کردند و تنہا تنہا گذاردند و روایت آمدہ اول کہ نماز گذارد بروے اہل بیت وے بود۔ علی و عباس و بنو ہاشم پس از اں درآمد مہاجر ان بعد از اں انصار پستری درآمد مردم فوج و نمازی گذاردند۔ (مدارج النبوة کشوری جلد ۲ صفحہ ۵۶۶)

لیکن آنحضرت ﷺ کی نماز جنازہ جماعت کے ساتھ نہیں ہوئی، ایک گروہ آتا اور بے جماعت کے نماز ان پر پڑھتا اور حجرہ سے باہر آ جاتا پھر دوسرا گروہ آتا اور نماز پڑھتا رسول خدا ﷺ کے جنازہ پر کسی نے نہ امامت کی نہ جماعت کی ترتیب دی جیسا کہ صفوں کی ترتیب کا قاعدہ ہے۔ حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے جنازہ پر کسی نے اس لئے امامت نہیں کی کہ حضور اس حیات میں اور بعد وفات کے تمہارے امام ہیں اور آنحضرت ﷺ کے یہ خصوصیات سے ہے کہ آپ کی لوگوں نے بار بار نماز پڑھی اور تنہا تنہا سب نے ادا کی۔ اور ایک روایت میں آیا کہ حضور کی سب سے پہلے نماز پڑھنے والے آپ کے اہل بیت حضرت علی اور عباس اور بنی ہاشم تھے۔ ان کے بعد مہاجرین آئے۔ ان کے بعد انصار۔ اس کے بعد لوگ گروہ گروہ آتے اور نماز جنازہ پڑھتے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ بنا بر قول صحیح کے اور مسلک جمہور علماء اہل سنت کے حضور اکرم ﷺ کے جنازے پر نماز ہوئی، لیکن اس بات پر سب کا بلا اختلاف کے اتفاق و اجماع ہے کہ کسی نے اس نماز جنازہ کی امامت نہیں کی۔

الحاصل قائلین نماز جنازہ اگر ادھر جمہور علماء اہل سنت ہیں تو منکرین نماز جنازہ کا شمار بھی علمائے حق اور اہل سنت میں ہوتا ہے، یہ تو اس مسئلہ کی تحقیق تھی۔

اب باقی رہا سوال کے پیش کردہ امام کا قول تو اگر وہ امام بدعتیہ وہابی دیوبندی وغیرہ نہیں ہے بلکہ خوش عقیدہ اہل سنت و جماعت ہے اور نماز جنازہ کا قائل بنا بر قول صحیح جمہور علماء کے اتباع میں کہتا ہے تو وہ امام نہ مورد الزام ہے نہ تنقیص کنندہ رسول علیہ السلام ہے۔ لہذا اس کے پیچھے نماز پڑھنا بھی جائز ہے اور اس سے نکاح پڑھوانا بھی درست ہے۔

اور اگر وہ امام مذکور بدعتیہ وہابی، دیوبندی، مودودی وغیرہ ہے جو ان اکابر علماء دیوبند کو مسلمان جانتا ہے جن کی شائع شدہ کتابوں کی کفری عبارات پر علماء حرمین شریفین، عرب و عجم، ہندو سند وغیرہ

نے فتاویٰ تکفیریہ صادر فرمائے ہیں۔ نیز وہ امام اپنا پیشوا صاحب تقویۃ الایمان مولوی اسماعیل دہلوی کو مانتا ہے اور ان کے اتباع میں وہ حیات النبی کا ہی قائل نہیں اور یہ مانتا ہے کہ اجسام انبیاء کرام گلے سڑتے ہیں ان کو ز میں کھا لیتی ہے پھر تو اس نماز جنازہ کا قائل ہونا حضور ﷺ کے میت اور مردہ ہونے کی تائید میں ہو سکتا ہے تو پھر تو اس امام کا بدعتیہ اور مخالف اہل سنت و جماعت ہونا ظاہر ہے تو اس صورت میں یہ امام ضرور مورد الزام بنا اور اپنی وہابیت کی بنا پر یقیناً تنقیص کنندہ رسول علیہ السلام ثابت ہوا لہذا اہل سنت کو ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز و حرام ہے اور ایسے شخص سے نکاح پڑھوانا بھی ناجائز ہے۔ میں نے مدینہ طیبہ میں غیر مقلدین کے زبردست مناظر حافظ محمد پنجابی سے اسی مسئلہ حیات النبی پر مناظرہ کیا تھا۔ میں نے یہی دلائل اس کے سامنے پیش کئے تھے جو اوپر مسئلہ حیات انبیاء علیہم السلام میں مذکور ہوئے۔ بحمدہ تعالیٰ وہ مناظر ان کے جوابات سے عاجز و قاصر رہا، اس مناظرہ میں ہندوستان، پاکستان، حرمین، مصر، شام وغیرہ مقامات کے کافی علماء کرام شریک تھے، دو دن تک یہ مناظرہ ہوتا رہا، دوسرے دن اس غیر مقلد مناظر کو شکست فاش ہوئی، باطل کا منہ کالا ہوا، اور حق کا بول بالا ہوا۔ کشمیر کے وزیر مالیات جناب سرور وزیر محمد صاحب اور پاکستان کے افسر ملک عبدالرشید صاحب اس مناظرہ کے بانی تھے۔ انہوں نے فیصلہ میرے حق میں فتح و کامیابی کا دیا اور نذرانے پیش کئے۔ غیر مقلد مناظر نہات ذلت کے ساتھ مناظرہ سے بھاگا۔ پھر مدینہ طیبہ میں چند فتح کے جلسہ ہوئے، مولیٰ تعالیٰ نے وہاں وہ عزت دی جو وہم و خیال میں بھی نہیں آ سکتی۔ اس وقت میں بیمار ہو کر اٹھا ہوں، کمزور ہوں، زائد محنت نہیں کر سکتا، اس لئے یہ مسئلہ زیادہ مفصل طور پر نہ لکھ سکا۔ لیکن پھر بھی منصف کے لئے نہایت دانی و کافی ہے، مولیٰ تعالیٰ مخالف و معاند کو حق قبول کرنے کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

۲۵ رذی الحجہ ۱۳۶۶ھ

کتبہ: الفقیر الی اللہ عزوجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

(۵۲۶)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ میں کہ
جزامی کی نماز جنازہ ہے یا نہیں؟

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علیہ و آلہ و سلم

جزامی جب مسلمان ہے تو اس کی نماز جنازہ اہل اسلام پر ضروری ہے کہ حدیث شریف میں ہے: ”صلوٰۃ علی کل بروفا جر“ یعنی نماز جنازہ ہر ایک نیک و بد پر پڑھو۔ اور جزام منجملہ اور بیمار یوں کے ایک بیماری ہے تو جس طرح اور بیماروں کی نماز جنازہ فرض کفایہ ہے اسی طرح جزامی کی نماز جنازہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہجل

(۵۲۷)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ میں کہ
جزامی کو کفن دفن کیا جائے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علی رسولہ الکریم
اسی طرح جزامی کو کفن دینا اور دفن کرنا بھی ضروری ہے کہ یہ بحیثیت مسلم حقوق مسلمین کا حقدار ہے ”کما هو فی کتب الفقہ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب“

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہجل

(۵۲۸)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ میں کہ
جزامی کو شریعت وحدیث جدا کرتی ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علی رسولہ الکریم
جزامی سے عوام ضعیف اعتقاد والے اجتناب و پرہیز کر سکتے ہیں اور اہل صدق و یقین متوکلین اس سے کسی طرح کا اجتناب و پرہیز نہیں کرتے، یہاں تک کہ حدیث شریف میں ہے:
ان رسول اللہ ﷺ اخذ بید مجزوم فوضعها معه فی القصعة وقال کل ثقة باللہ

(مشکوٰۃ شریف: ص ۳۹۲)

ونو کلا علیہ۔

یعنی حضور اکرم ﷺ نے جزامی کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے ساتھ کھانے کے پیالے میں رکھ دیا اور حکم دیا کہ کھا میں تو اپنے خدا پر اعتقاد تو توکل کرتا ہوں۔

اس حدیث شریف سے ظاہر ہو گیا کہ جزامی سے جب ساتھ کھانے میں بھی پرہیز نہیں کیا گیا تو
بہرادر کس چیز میں پرہیز کیا جائے گا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہجل

(۵۲۹)

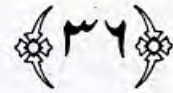
مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مندرجہ ذیل مسئلہ میں کہ
جزامی کو سلام وکلام اور اس سے ہم کلام ہونا صحیح ہے یا نہیں؟۔

الجواب

جزامی سے سلام وکلام میں پرہیز کرنے کی کسی کو اجازت نہیں کہ وہ بحیثیت مسلم تمام حقوق مسلمین کا حقدار ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۱۲ ربیع الآخر ۱۴۱۰ھ

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہجل



باب تلقین المیت وسوالات النکیرین

(۵۳۰)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بعد دفن کے میت کو تلقین کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اگر جائز ہے تو اس کا کیا طریقہ ہے؟ اس کا جواب احادیث و کتب فقہ سے تحریر فرمائیے۔

اس سوال کے جواب میں ایک مولوی صاحب یہ جواب لکھتے ہیں کہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے "و يستحب اذا دفن الميت ان يجلسوا ساعة عند القبر بعد الفراغ بقدر ما ينحدر جزور يقسم لحمها يتلون القرآن ويدعون للميت كذا في الجوهرة النيرة" یعنی میت کے دفن کرنے کے بعد مستحب ہے کہ کچھ لوگ ایک ساعت قبر کے پاس بیٹھے رہیں اندازاً اتنی دیر کہ جس میں ایک اونٹ ذبح کیا جائے اور اس کا گوشت تقسیم کر دیا جائے اور یہ لوگ قرآن پاک کی تلاوت کرتے رہیں اور میت کے لئے دعائے مغفرت وغیرہ کرتے رہیں۔ کتبہ سعید احمد اسرائیلی

دوسرے مولوی صاحب اس کے جواب میں یوں لکھتے ہیں کہ حالت نزع میں قبل غرغہ کے تلقین بالشہادتین کرنا بالاجماع مستحب ہے، اور تلقین بعد الموت کو بعض علمائے متاخرین نے جائز کہا ہے، لیکن ظاہر الروایۃ میں تلقین کرنے کو ناجائز کہا ہے۔ اور ظاہر الروایۃ کے مقابلہ میں بعض علمائے متاخرین کے قول کا بقاعدہ رسم المفسی کچھ اعتبار نہیں، وہ قول ضعیف ہے اور قول ضعیف پر عمل ناجائز۔

عالمگیری صفحہ ۱۰۰ جلد اول "واما التلقین بعد الموت فلا تلقن عندنا فی ظاہر الروایۃ کذا فی العینی شرح ہدایہ و معراج الدرایہ۔
در مختار۔ ولا یلقن بعد تلحیدہ۔

شامی۔ فوله ولا یلقن بعد تلحیدہ ذکر فی المعراج انه ظاہر الروایۃ
اور برہان الدین حلبی نے کبیری میں اس قول کو لفظ "قیل" کے ساتھ بیان کیا ہے جو ضعف پر دلالت ہے "وهو هذا واما التلقین بعد الدفن فقیل یفعل لحقیقۃ ما روینا۔ و قیل یومر بہ ولا ینہی

عنه کذا ذکر ابن الہمام

اور جمہور علماء نے حدیث تلقین کو معنی مجاز پر محمول کیا ہے۔ یعنی قریب موت کے تلقین کی جائے اور یہی مذہب جمہور ہے۔

کبیری "والذی علیہ الجمہور ان المراد من الحدیث مجازۃ کما ذکرنا" اور صاحب ہدایہ نے بھی اس حدیث کو اسی معنی پر محمول کیا ہے "ولقن الشہادتین لقولہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم: لقنوا موتاکم شہادۃ ان لا الہ الا اللہ۔ والمراد الذی قرب عن الموت۔ اور اہل متون اور اکثر شراح نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے اور قول جمہور کے مقابلہ میں اس قول کا کچھ اعتبار نہیں "لقولہ علیہ السلام: وعلیکم بالجماعۃ والعامة رواہ احمد عن معاذ بن جبل۔

(مشکوٰۃ المصابیح)

اس تلقین کا ثبوت کسی حدیث سے نہیں اور اس کا التزام بدعت سے خالی نہیں اور بدعت کے موجد کے بارے میں یہ فرمایا گیا ہے:

عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت: قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم: من احدث فی امرنا هذا ما لیس منہ فهو رد متفق علیہ " (مشکوٰۃ) واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب وعندنا ام الكتاب۔ حررہ کریم محشر غفرلہ درس اول اشروع سنجل مورخہ ۱۲ شعبان المعظم صفحہ ۱۳۴۵
اب دریافت طلب یہ امر ہے کہ یہ دونوں جواب صحیح ہیں یا نہیں؟ اگر غلط ہیں تو اس کا صحیح جواب کیا ہے؟ اس مسئلہ کا جواب مفصل طریقہ سے نہایت مدلل تحریر کیا جائے۔ بینوا تو جروا

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علی رسولہ الکریم
تلقین بعد الدفن جائز ہے، علماء اس کے فرض یا واجب یا سنت ہونے کے مدعی نہیں، ہاں اس کی اباحت کے ضرور قائل ہیں اور مدعی اباحت کو کسی دلیل کے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اظہار حق مقصود ہے اس وجہ سے چند تائیدات پیش کی جاتی ہیں۔ منصف کے لئے انشاء اللہ یہی بہت کافی ہیں۔

حدیث: حیات الموت میں طبرانی معجم کبیر و کتاب الدعاء و کتاب الاحکام و کتاب اتباع الاموات و کتاب الثانی وصایۃ العلماء عند الموت و کتاب ذکر الموت وغیرہا سے ناقل ہیں، ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

اذا مات احد من اخوانكم فسويتم التراب عليه فليقم احدكم على راس قبره ثم ليقل: يا فلان ابن فلانة! فانه يسمعه ولا يجيب ثم يقول: يا فلان بن فلانة! فانه يستوى قاعدا ثم يقول: يا فلان بن فلانة! فانه يقول: ارشدنا رحمك الله ولكن لا تشعرون فليقل: اذكر ما خرجت عليه من الدنيا شهادة ان لا اله الا الله وان محمدا عبده ورسوله وانك رضيت بالله ربا وبالا سلام ديننا وبمحمد نبيا وبالقرآن اماما فان منكر او نكير ايا خد كل واحد منهما بيد صاحبه ويقول انطلق بنا ما نقعد عند من القن حجتة الخ۔

یعنی جب تمہارا کوئی مسلمان بھائی مرے اور اس کی قبر پر مٹی برابر کر چکو تو تم میں کوئی اس کے سرہانے کھڑا ہو اور فلاں ابن فلاں کہہ کر پکارے، کہ بیشک وہ سنے گا اور جواب نہ دے گا۔ ہمیں ارشاد کر اللہ تجھ پر رحم کرے۔ مگر تمہیں اس کے جواب کی خبر نہیں ہوتی، اس وقت کہے یاد کرو وہ بات جس پر تو دنیا سے نکلا تھا۔ گواہی اس کی کہ اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں اور محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اور یہ کہ تو نے پسند کیا اللہ تعالیٰ کو پروردگار اور اسلام کو دین اور محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نبی اور قرآن کو پیشوا۔ منکر نکیر ہر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کہیں گے چلو ہم کیا بیٹھیں اس کے پاس جسے لوگ اس کی حجت سکھا چکے۔

تنبیہ: امام ابن صلاح وغیرہ محدثین اس حدیث کی نسبت فرماتے ہیں:

اعتضد بشواهد وبعمل اهل الشام قديما۔

یعنی اسے دو وجہ سے قوت ہے۔ ایک حدیثیں اس کی تائید کرنے والی۔ دوسرے زمانہ سلف سے علمائے شام اس پر عمل کرتے آئے (اس کو علامہ ابن امیر الحاج نے حلیہ میں نقل کیا) علامہ ابن حجر مکی کی شرح مشکوٰۃ میں ہے:

اعتضد بشواهد ير تقى بها الى درجة الحسن۔

یعنی یہ حدیث بوجہ شواہد کے درجہ حسن تک ترقی کر گئی۔

اثر: جو باعتبار راویوں کے اور دو کو شامل ہیں اسی میں سنن امام سعید بن منصور (جو امام مالک کے شاگرد اور امام احمد کے استاذ ہیں) سے ناقل ہیں کہ راشد بن سعد و ضمہ بن حبیب و حکم بن عمیر سے راوی ان سب نے فرمایا:

اذا سوى على الميت قبره وانصرف الناس عنه كان يستحب ان يقال للميت عند

قبره يا فلان قل لا اله الا الله ثلث مرات يا فلان قل ربى الله ودينى الاسلام ونبى محمد صلى الله تعالى عليه وسلم

یعنی جب میت پر مٹی دے کر قبر درست کر کے پھر اور لوگ واپس جائیں تو مستحب سمجھا جاتا تھا کہ مردے سے اس کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر کہا جائے اے فلاں کہ لا اله الا اللہ تین بار۔ اے فلاں کہ میرا رب اللہ ہے اور میرا دین اسلام اور میرے نبی محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔ درمختار میں ہے:

يكفى قوله يا فلان ابن فلان! اذكر ما كنت عليه وقل رضيت بالله ربا وبالا سلام دينا وبمحمد نبيا قيل يا رسول الله فان لم يعرف اسمه قال ينسب الى آدم وحواء غاية الاوطار میں اسی فرقہ وہابیہ کے پیشوا مولوی محمد احسن نانوتوی اس عبارت کا ترجمہ لکھتے ہیں: اور کافی ہے یہ کہنا تلقین کرنے والے کا اس طرح کہ تلقین کرنے والا اس طرح کہے: اے فلاں اے فلاں کے بیٹے! یاد کر ان باتوں کو جن پر تو تھا یعنی اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان کو یاد کر۔ اور جب فرشتے سوال کریں تو یوں کہنا کہ میں راضی ہوں اس سے کہ اللہ میرا رب اور اسلام میرا دین اور محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نبی ہیں۔ کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم! اگر مردے کا نام معلوم نہ ہو۔ آپ نے فرمایا کہ منسوب کیا جائے آدم اور حوا علیہما السلام کی طرف یعنی اگر مرد ہو تو یوں کہنا چاہئے اے آدم کے بیٹے اور عورت ہو تو یوں کہے اے حوا کی بیٹی۔

اسی درمختار میں جو ہرہ نیرہ سے ناقل ہیں: انه مشروع عند اهل السنة

یہی مولوی محمد احسن اس کا ترجمہ لکھتے ہیں:

تلقین مشروع ہے اہل سنت کے نزدیک۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ مردہ کو قبر میں زندہ کرتا ہے۔ چنانچہ احادیث میں وارد ہے ایسے ہی طحاوی میں ہے۔

اسی درمختار میں ہے: ان فعل لا ينهى عنه

مولانا مذکور اس کا ترجمہ لکھتے ہیں۔ اگر کوئی تلقین کرے تو منع نہ کیا جائے کیونکہ حدیث میں آیا ہے: لفتنوا موتاكم۔ یعنی تلقین کرو اپنے مردوں کو۔

تو بعض محققین نے اس حدیث میں معنی حقیقی مراد لے کر تلقین بعد موت کی جائز رکھی ہے غایۃ الاوطار میں ہے: یہی مولوی محمد احسن نانوتوی لکھتے ہیں: فتح القدیر میں بعد کلام طویل کے

کہا کہ تلقین بعد دفن سے کچھ ضرر نہیں بلکہ اس سے فائدہ ہے کہ مردوں کو ذکر سے اس ہوتا ہے چنانچہ آثار میں وارد ہے۔

نور الایضاح مطبوعہ دیوبند میں ہے: تلقینہ فی القبر مشروع۔

یعنی مردہ کو قبر میں تلقین کرنا مشروع ہے:-

بنایہ شرح ہدایہ میں ہے: کیف لا یفعل وقد روى عنه عليه الصلوة والسلام انه امر

بالتلقين بعد الدفن۔

یعنی تلقین کیونکر نہ کی جائے گی حالانکہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مروی ہوا حضور نے بعد دفن

تلقین کا حکم دیا۔

بنایہ میں ہے کہ امام شمس الائمہ حلوائی نے فرمایا: لا یومر به ولا ینہی عنه۔

یعنی نہ تلقین کا حکم دیں نہ اس سے منع کریں۔

حلیہ میں اسے نقل کر کے فرمایا: ظاہرہ انہ یناح۔

یعنی اس قول سے ظاہر اباحت ہے۔

صاحب عباب فرماتے ہیں: انی سمعت استاذی قاضی خاں یحکی عن الامام ظہیر

الدین انہ لقن بعض الائمة و اوصانی بتلقینہ فلقتہ فیجوز۔

یعنی میں نے اپنے استاذ قاضی خاں کو سنا کہ امام اجل ظہیر الدین کبیر مرغینانی سے حکایت

فرماتے تھے کہ بعض ائمہ نے تلقین فرمائی اور مجھے اپنی تلقین کرنے کی وصیت کی کہ میں نے انھیں تلقین کی

پس جواز ہوا۔ اسی کو شارح نقایہ اور صاحب حقائق نے نقل کیا۔ مضمرات میں ہے۔

نحن نعمل بهما عند الموت وعند الدفن۔

یعنی ہم دونوں تلقینوں پر عمل کرتے ہیں۔ وقت نزع بھی اور وقت دفن بھی۔ اس کو نقل

کیا عالمگیری نے۔

علامہ طحاوی حاشیہ در مختار میں ”کتاب التحنيس والمزید“ سے ناقل ہیں۔

التلقين بعد الموت فعله بعض مشائخنا۔

یعنی ہمارے بعض مشائخ نے موت کے بعد تلقین فرمائی۔

جامع الرموز میں جوہر سے منقول: سئل القاضي محمد الكرمانی عنه قال ماراه

المسلمون حسنا فهو عند الله حسن وروی فی ذالك حدیثین۔

یعنی قاضی مجد کرمانی سے دربارہ تلقین سوال ہوا۔ فرمایا: جو بات مسلمان اچھی سمجھیں خدا کے

نزدیک بھی اچھی ہے۔ اور اس بارے میں دو حدیثیں روایت کیں۔

طحاوی حاشیہ مراقی الفلاح میں علامہ حلی سے منقول ہے:

كيف لا يفعل مع انه لا ضرر فيه بل فيه نفع للميت

یعنی تلقین کیونکر نہ کی جائیگی حالانکہ اس میں کوئی نقصان نہیں بلکہ میت کے لئے فائدہ ہے۔

کشف الغطا میں ہے: بالجمله بمقتضاے مذہب اہل سنت و جماعت تلقین مناسب۔

پھر امام صفار کا ارشاد۔ سزاوار آنت کہ تلقین کردہ شود میت بر مذہب امام اعظم و ہر کہ تلقین نمی کند

و نمی گویند بآن پس او بر مذہب اعتزال است کہ گویند کہ میت جماد محض است و روح در قبر معاد نمی شود۔

یعنی مذہب اہل سنت و جماعت کے اعتبار سے تلقین مناسب ہے اور بنا بر مذہب امام اعظم

ابوحنیفہ کے لائق ہے کہ مردہ تلقین کیا جائے اور جو تلقین کو نہیں کہتا اور نہیں کرتا ہے وہ بنا بر مذہب معتزلہ ہے

کہ معتزلہ کا یہ خیال ہے کہ مردہ بالکل پتھر ہے اور قبر میں روح لوٹائی نہیں جاتی۔

امام حاکم شہید نے کافی اور امام خبازی نے خباز یہ میں امام زہد صفار سے نقل کیا۔

ان هذا (ای منع التلقين) على مذهب المعتزله لان الاحياء بعد الموت عندهم

مستحيل اما عنداهل السنة فالحديث اى لقنوا موتاكم لا اله الا الله محمول على حقيقة

لان الله تعالى يحييه على ما جاء ت به الاثار وقد روى عنه عليه الصلوة والسلام انه امره

بالتلقين بعد الدفن۔

یعنی بیشک یہ یعنی تلقین کا منع کرنا مذہب معتزلہ پر ہے۔ اس لئے کہ بعد موت کے ان کے

نزدیک زندہ ہونا محال ہے۔ لیکن مذہب اہل سنت کے نزدیک پس یہ حدیث یعنی تلقین کرو اپنے مردوں کو

لا اله الا الله کے ساتھ اپنی حقیقت پر حمل کی گئی ہے اور بیشک حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مروی

ہے کہ آپ نے تلقین کرنے کا بعد دفن کے حکم فرمایا۔ نقل کیا اس کو شامی میں معراج الدرایہ سے۔

بالآخر حوالے تو بہت سے نقل کئے جاتے۔ لیکن طوالت کے سبب سے اتنے ہی پر اکتفا کیا گیا اور

واقعی منصف کے لئے یہی کافی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہونا موقع کے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ

جن جن علمائے کرام نے اس مسئلہ کی صراحت فرمائی ہے ان کے اسمائے گرامی شمار کرائے جائیں۔

(۱) تمام علماء کے سردار تمام مخلوق کے آقا سید عالم نور مجسم فخر نبی آدم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
 (۲) حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ صحابی (۳) راشد ابن سعد تابعی (۴) ضمیرہ بن حبیب
 تابعی (۵) حکیم بن عمر تابعی (۶) امام سعید بن منصور محدث (۷) امام احمد (۸) امام نقاد الحدیث ضیائی
 مقدسی (۹) امام بن حجر عسقلانی (۱۰) امام شمس الائمہ سخاوی (۱۱) امام ابو بکر ابن العربی (۱۲) علامہ ابن حجر
 مکی (۱۳) محمد طاہر احمد آبادی صاحب مجمع بحار الانوار (۱۴) ابن مندہ (۱۵) ابراہیم حربی (۱۶) ابو بکر غلام
 الظلال (۱۷) ابن رہبرہ (۱۸) ابن شاہین (۱۹) امام ابن صلاح (۲۰) علامہ امیر الحاج (۲۱) امام
 سیوطی (۲۲) امام زاهد صفار (۲۳) امام حاکم شہید (۲۴) امام خبازی (۲۵) ابن عابدین شامی صاحب
 رد المحتار (۲۶) صاحب معراج الدرایہ (۲۷) محمد علاء الدین ہسکلی صاحب در مختار (۲۸) امام ابو بکر بن محمد
 بن علی صاحب جوہرہ نیرہ (۲۹) شمس الائمہ حلوائی (۳۰) صاحب بنایہ (۳۱) صاحب عباب (۳۲) امام
 ظہیر الدین صاحب شرح نقایہ (۳۳) محمد بن محمد صاحب حقائق (۳۴) یوسف بن عمر صاحب
 مضمرات (۳۵) علامہ حسن بن عمار شرنبلالی صاحب نور الایضاح (۳۶) علامہ طحاوی (۳۷) امام شیخ
 الاسلام علی بن ابی بکر برہان الدین فرغانی صاحب التحفیس (۳۸) قاضی مجد کرمانی صاحب جامع الرموز
 (۳۹) علامہ حلبی (۴۰) فاضل شیخ الاسلام دہلوی صاحب کشف الغطاء رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین۔
 یہ ان علمائے کرام کے اسمائے گرامی ہیں جن کے اقوال میرے پیش نظر ہیں۔ اتنی تصریحات
 کے ہوتے ہوئے اب کسی شخص کو بھی گفتگو کی گنجائش باقی نہیں رہی اور جوابات مندرجہ فی السؤال کے رد
 و ابطال کی بھی اصلاً ضرورت نہ رہی لیکن مزید بران سرسری نظر ڈال کر اول جوابات کی حقیقت سے آگاہ کر
 دیا جاتا ہے۔

اقول وبالله التوفیق: مولوی سعید احمد صاحب مجیب اول نے تو اپنے جواب میں تلقین بعد
 الدفن کا جواب ہی نہیں دیا۔ نہ معلوم مولوی صاحب ایسے ہی سوال سے غیر متعلق جواب دیا کرتے ہیں، یا
 سوال ہی کو نہ سمجھے، یا سوال تو سمجھے مگر اس کا جواب دینا دشوار سمجھا، یا ان کو اپنے مقصد کے موافق
 تصریحات نہ مل سکیں، یا ان کا اظہار غیر مناسب سمجھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جواب سے پہلو تہی اختیار کی۔ لہذا
 ان کی تحریر سے تلقین بعد دفن کا کوئی حکم ہی نہیں معلوم ہوا باوجودیکہ جس عبارت کو عالمگیری سے نقل کر کے
 لائے اس کے متصل تلقین کی بحث موجود تھی جیسا کہ ہم نے اس کو پیش کر دیا۔ الغرض مولوی صاحب کا
 فتویٰ تلقین بعد الدفن کو ناجائز و بدعت ثابت نہیں کرتا ہے۔

مجیب دوم مولوی کریم بخش صاحب کے کل فتوے کا رد ہی مختصر طریقہ سے پیش کیا جاتا ہے۔
 لہذا وہ کہتے ہیں:
 حالت نزع میں قبل غرغره کے تلقین بالشہادتین کرنا بالاجماع مستحب ہے۔
 اس عبارت میں مجیب نے جو فرمایا وہ اپنے محل پر بالکل درست ہے لیکن یہ اجماع تلقین بعد
 الدفن پر کیا اثر ڈال سکتا ہے۔ ہاں جب تلقین نہ کر کے ثبوت کا حصر لقنوا مو تاکم الحدیث کے ساتھ
 ثابت کر دیں تو کچھ ان کے مقصد کے لئے مفید بن جائے گی۔ یعنی تلقین بعد الدفن کا اس حدیث کے سوا
 کسی دوسری حدیث یا کسی قول صحابی و تابعی سے فقہاء نے جواز مستحب نہیں کیا اور حدیث مذکور کے حقیقی
 معنی لینے پر کوئی تائید کسی دوسری حدیث یا قول صحابی سے نہیں ملتی ہے۔ مجیب صاحب اس مقدمہ کے لئے
 عرق ریزی کریں اور جب یہ امر بھی ثابت نہ کر سکیں تو پھر باقی تقریر لا حاصل ٹھہرتی ہے۔ پھر کہتے ہیں۔
 اور تلقین بعد الموت کو بعض علماء متاخرین نے جائز کہا ہے۔
 افسوس کہ مجیب صاحب نے نہ اس کے لئے کوئی عبارت پیش کی نہ ان علمائے متاخرین کے
 اسمائے گرامی ظاہر کئے کہ وہ فلاں طبقہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اپنی بات کی بیج کرتے ہوئے چلے
 جا رہے ہیں۔ باوجودیکہ علمائے متاخرین ہی کیا بلکہ متقدمین میں بلکہ خود امام اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بلکہ
 تابعین اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے اقوال ہم سے سن چکے۔ کہ ۲۲ کتب فقہ سے اس کا
 جواز اور ۴۵ فقہائے عظام اس کے قائل ہیں۔ پھر اس پر مجیب کے یہ الفاظ۔
 بعض علماء متاخرین نے جائز کہا ہے۔

کہاں تک صحیح ہیں۔ دیکھو اسے کہتے ہیں دن کورات بنانا۔ پھر لکھتے ہیں:
 لیکن ظاہر الروایت میں تلقین کرنے کو ناجائز کہا ہے اور ظاہر الروایت کے مقابلہ میں بعض
 علمائے متاخرین کے قول کا بقاعدہ رسم المفتی کچھ اعتبار نہیں وہ قول ضعیف ہے اور قول ضعیف پر عمل ناجائز
 اتنا تو صحیح ہے کہ مسئلہ میں اختلاف ہے لیکن مختلف فیہ کے لئے یہ کلیہ نہیں۔ چنانچہ بعض وہ مسائل
 ہیں کہ ظاہر الروایت میں صراحۃً موجود لیکن علمائے متاخرین نے اس کا خلاف کیا اور فتویٰ ظاہر الروایت
 کے ہوتے ہوئے قول متاخرین پر دیا گیا۔ جن میں اجرت علی تعلیم القرآن تو بہت ہی زیادہ مشہور ہے
 نہ ہی تلقین بعد الدفن تو اس میں متاخرین ہی کیا بلکہ متقدمین کے اقوال بلکہ کشف الغطاء سے خود امام
 صاحب کا مذہب سن چکے۔ لہذا یہ قاعدہ اس پر کس طرح منطبق ہوا؟ علاوہ بریں ذرا پہلے اپنے عمائدین

کے کلام تو ملاحظہ کیجئے۔ چنانچہ مولوی محمد احسن نانوتوی کے اقوال ہم نے متعدد مقامات سے نقل کئے کہ انھوں نے غایۃ الاوطار میں تلقین بعد الدفن پر نہایت محققانہ تقریر کے بعد اس کو جائز رکھا اور آپ کے بڑے پیشوا مولوی رشید احمد گنگوہی نے تو آپ کی اس ساری عمارت کا قلع قمع ہی کر دیا۔

فتاویٰ رشیدیہ جلد اول کے صفحہ ۷۳ میں ہے۔

سوال: سماع موتی ثابت ہے یا نہیں؟ در صورت جواز یا عدم جواز قول راجح کیا ہے اور تلقین بعد دفن ثابت ہے یا نہیں فقط۔

الجواب: یہ مسئلہ عہد صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مختلف فیہا ہے۔ اس کا فیصلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ تلقین کرنا بعد دفن کے اس پر ہی مبنی ہے جس پر عمل کرے درست ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

مجیب صاحب نہایت ہی حیرتناک بات ہے کہ جب آپ کے ایسے سرگروہ ہی اس کا فیصلہ اور راجح قول نہ بتا سکے اور آخر انھیں کہنا ہی پڑا کہ جس پر عمل کرے درست ہے۔ تو جناب کیا ان سے علم و فضل میں زیادہ ہیں اور کیا ان کو اس قاعدہ کی خبر نہیں تھی اور کیا ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ جواز تلقین بعض متاخرین کا قول ہے۔ اور ظاہر الروایت کے مقابلہ میں بعض علماء متاخرین کے قول کا بقاعدہ رسم المفتی کچھ اعتبار نہیں وہ قول ضعیف ہے اور قول ضعیف پر عمل ناجائز۔ تو نہایت ہی تعجب ہے کہ آپ تو عمل ناجائز کہیں اور آپ کے قبلہ و کعبہ درست بتائیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ خود غرضی ایسی ہی ان کہی کہلوا دیتی ہے۔ پھر اپنے مدعی پر ثبوت پیش کرتے ہیں۔

عالمگیری صفحہ ۱۰۰ جلد اول: واما التلقین بعد الموت فلا تلقن عندنا فی ظاہر الروایۃ کذا فی العینی شرح ہدایہ و معراج الدرایہ۔

اولا: اس عبارت میں نفی اباحت کی ہونا یقینی نہیں۔ چونکہ اباحت کی اکثر کتب فقہ میں نہایت شد و مد کے ساتھ تصریح ہے۔

ثانیا: اسی عالمگیری میں اسی عبارت کے متصل مضمرات سے منقول ہے۔

ونحن نعمل بهما عند الموت وعند الدفن کذا فی المضمرات۔

یعنی ہم دونوں پر عمل کرتے ہیں موت کے وقت بھی اور دفن کے وقت بھی۔

ثالثا: آپ کی شان سے یہ بہت بعید ہے کہ جو عبارت آپ کے مدعی کے موافق ملی اس کو آپ

نے نقل کر دیا اور جو آپ کے مقصد کے خلاف بھی اس سے آپ نے چشم پوشی کر لی۔ مجیب صاحب کیا اسی کو دیانت کہتے ہیں؟ اور کیا مذہب کے مفتی کے یہی شان ہونی چاہئے اور ایک منصف آپ کے متعلق کیا رائے قائم کریگا؟ پھر اتنے ہی پراکتفا نہیں اس سے زیادہ اور دیانت ملاحظہ ہو۔

درمختار: ولا یلقن بعد تلحیدہ۔

اولا: یہ عبارت درمختار کی نہیں بلکہ تنویر الابصار کی ہے۔

ثانیا: اپنی خود مطلبی سے اس کی تفصیل کو چھوڑ دیا مسئلہ کی پوری عبارت یہ ہے۔

ولا یلقن بعد تلحیدہ وان فعل لا ینھی عنہ۔

یعنی بعد دفن کے تلقین نہ کی جائے اور اگر کی جائے تو روکا نہ جائے۔ لہذا ایک تھوڑی عقل والا بھی جان لے گا کہ ایسی قطع و برید کاٹ چھانٹ آخر کوئی مجبوری کر رہی ہے۔ اور واقعی زبان کی پاسداری اپنی بات کی بچے برابر ایسی ہی ذلیل باتوں تک پہنچا دیتی ہے۔

پھر کہتے ہیں:

شامی: فی قوله ولا یلقن بعد تلحیدہ ذکر فی المعراج انه ظاہر الروایۃ۔

اولا: عبارت شامی میں بھی اپنی ایسی ہی دیانت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ چنانچہ شامی کی کئی عبارتیں جواز تلقین میں نقل ہوئیں۔

ثانیا: ظاہر الروایت کی روایت کا چند کتابوں سے نقل کرنا جواز تلقین مذکور کو باطل نہیں کر دے گا۔

ثالثا: جب صاحب معراج نے منع تلقین کو مذہب معتزلہ اور تلقین کو مذہب اہل سنت ٹھہرا کر

حدیث ”لقنوا موتاکم“ کو حقیقت پر محمول کیا۔ اور نیز یہ روایت کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تلقین بعد الدفن کا حکم فرمایا پیش کی۔ جس کو اسی شامی نے نقل کیا تو پھر یہ معراج آپ کو کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔

رابعا: شامی میں جب ایسی تصریحات بھی موجود ہیں تو ان کو چھوڑتے ہوئے اپنے مقصد کے ہند الفاظ اٹھا لینا مجیب کی کتنی بڑی صداقت اور راست گوئی کی دلیل ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی ناحق کے درپے ہوتا ہے تو اس کو اسی طرح کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں

اور وہ ایسے ہی عبارتوں میں کتر بیونت کرنے کے لئے مضطر ہو جاتا ہے۔ پھر مجیب کی مایوسی یہاں تک

پہنچتی ہے کہ نہایت سنبھل سنبھل کر لکھتے ہیں۔

اور برہان الدین حلبی نے کبیری میں اس قول کو لفظ قیل کے ساتھ بیان کیا ہے جو ضعف پر دال

ہے ”وہو هذا واما التلقين بعد الدفن ففيل يفعل لحقيقة ما روينا وقيل يومر به ولا ينهى عنه كذا ذكره ابن الهمام۔

اولاً: یہ قاعدہ مجیب ہی کے لئے وبال جان بن جائے گا کہ جب لفظ قیل ضعف پر دال ہے تو آپ کا مزمومہ مذہب جمہوریہ بھی اسی قاعدہ سے ضعیف ہوگا۔ چنانچہ دیوبند کی مطبوعہ نور الایضاح میں ہے و تلقينه في القبر مشروع وقيل لا يلحق۔

ملاحظہ ہو کہ لفظ قیل سے جناب ہی کے مذہب کو بیان کیا گیا اور لفظ قیل ضعف پر دال تھا۔ لہذا جناب کا مذہب ضعیف انہی کی زبان سے ہو گیا۔ اب مجیب صاحب کہتے اقبالی ڈگری ہوئی یا نہیں۔

ثانیاً: جب دیگر کتب فقہ میں اس کو بغیر قیل بھی بیان کیا ہے تو کیا فقط کبیری کا لفظ قیل سے بیان کرنا اس کو ضعیف کر دے گا۔

ثالثاً: آپ ہی کے پیشوا مولوی محمد احسن نانوتوی غایۃ الاوطار میں لکھتے ہیں: فتح القدیر میں بعد کلام طویل کے کہا کہ تلقین بعد الدفن سے کچھ ضرر نہیں۔ بلکہ اس سے فائدہ ہے کہ مردوں کو ذکر سے انس ہوتا ہے چنانچہ آثار میں وارد ہے۔

تو کیا انھوں نے ابن ہمام کے کلام کو نہیں سمجھا۔ پھر مجیب لکھتے ہیں۔ اور جمہور علماء نے حدیث تلقین کو معنی مجازی پر محمول کیا ہے۔ یعنی قریب موت کے تلقین کی جائے اور یہی مذہب جمہور ہے۔

کبیری: والذی علیہ الجمهور ان المراد من الحديث مجازه كما ذكر۔ اولاً عبارت میں قطع و برید کر دینا تو جناب کا قدیمی شیوہ ہے۔ چنانچہ اسی کبیری کی پوری عبارت پیش کرتا ہوں۔

والذی علیہ الجمهور ان المراد من الحديث مجازه كما ذكرنا حتى من استحب التلقين بعد الموت لم يستدل به الا على تلقينه عند الاحتضار مع انهم قائلون بجواز الجمع بين الحقيقة والمجاز۔

یعنی وہ جس پر جمہور ہیں کہ تحقیق حدیث سے مراد معنی مجازی ہیں جیسا کہ ہم نے ذکر کیا۔ اور جس نے تلقین بعد الموت کو مستحب جانا وہ اس سے دلیل نہیں لایا مگر قبل الموت پر۔ باوجودیکہ جمع بین الحقیقۃ والمجاز کے جواز کے قائل ہیں۔

ثانیاً: جمہور کا حدیث کے معنی مجازی کو متعین کر لینا تلقین بعد الدفن کو تو باطل نہیں کرتا اس لئے کہ تلقین مذکور کو مستحب کہنے والے اس حدیث کو کب استدلال میں پیش کرتے ہیں باوجودیکہ اگر پیش کرتے تو کوئی استحالہ بھی لازم نہیں آتا۔

ثالثاً: جب تلقین قبل الموت پر جمہور کا اتفاق کرنا تلقین بعد الدفن کو ناجائز کر دیتا ہے پھر فقہاء کی (جن میں ہر طبقہ کے افراد ہیں) تلقین بعد الدفن کی اباحت پر تصریحات کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔

رابعاً: آپ کی اس پیش کردہ کبیری میں اسی عبارت کے متصل یہ تصریح ہے۔ وانما لا ينهى عن التلقين بعد الدفن لا ضرر فيه بل فيه نفع فان الميت يستانس بالذكر على ما ورد في الآثار۔

یعنی تلقین بعد الدفن سے منع نہ کیا جائے کہ اس میں کوئی نقصان نہیں بلکہ اس میں نفع ہے کہ مردہ کو ذکر سے انس ہوتا ہے چنانچہ آثار میں وارد ہے۔

تو کیا آپ کے قطع و برید کرنے سے یا مسئلہ کو چھپانے سے حق مسئلہ کا اظہار نہیں ہوگا اور پھر بعد اظہار کے ہر ذی عقل جناب کے متعلق کیا رائے قائم کرے گا۔ پھر مجیب یہی مضمون ہدایہ سے نقل کرتے ہیں۔

اور صاحب ہدایہ نے بھی اس حدیث کو اسی معنی پر محمول کیا ہے ”ولقن الشهادتين لقوله صلى الله تعالى عليه وسلم لقنوا موتاكم شهادة ان لا اله الا الله والمراد الذي قرب عن الموت“ اور اہل متون اور اکثر شراح نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے۔

صاحب ہدایہ نے جب ہدایہ میں تلقین بعد الدفن کی بحث ہی نہیں کی تو ان کا کلام آپ کے لئے کچھ مفید نہیں ہو سکتا۔ اور صرف حدیث مذکور کے معنی مجازی نقل کرنا ہمارے مسئلہ تلقین پر کچھ اثر نہیں ڈال سکتا۔ اور پھر ان کا تصریح نہ کرنا اسی امر کی بھی دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ اس کے قائل نہیں تھے۔ لہذا ان کا کلام یا دیگر اہل متون و شراح کا قول ہمارے خلاف نہیں۔ جبکہ ابھی تقریر بالا سے ظاہر ہو چکا تو اب مجیب کا یہ نتیجہ نکالنا۔

اور قول جمہور کے مقابلہ میں اس قول کا کچھ اعتبار نہیں ”لقوله عليه السلام وعليكم بالجماعه والعامه رواه احمد عن معاذ بن جبل“ (مشکوۃ المصابیح)۔ کیسی اپنی خود مطلبی کی دلیل ہے۔

اولا: اگر یہ حدیث تلقین بعد الدفن کے ثبوت میں پیش کی جائے تو اس میں کیا نقصان ہے باوجودیکہ جمع بین الحقیقۃ والجاز کا قول موجود ہے۔ جیسا کہ ابھی کبیری سے سن چکے۔

ثانیا: اسی کبیری سے معلوم ہوا کہ تلقین مذکور کے مجوزین اس حدیث کو استدلال میں ہی جب پیش نہیں کرتے تو پھر مقابلہ کیسے ہوا۔

ثالثا: جواز جمع بین الحقیقۃ والجاز کی صورت میں کیا ایک قول ایسا غیر معتبر ہو سکتا ہے کہ وہ اس حدیث کا مصداق ہو جائے۔

رابعا: جب (۴۰) فقہائے عظام اس کی اباحت کے قائل ہوں تو اس حدیث کا چسپاں کرنا معصیت ہے یا نہیں؟ پھر مجیب کی مزید بے باکی ملاحظہ ہو۔

اس تلقین کا ثبوت کسی حدیث سے نہیں۔

اولا: کبیری سے معلوم ہوا کہ مجوزین تلقین اس کا ثبوت احادیث سے پیش کرتے ہیں اور منصف کے لئے علی ما ورد فی الآثار کے الفاظ ہی بہت کافی ہیں۔

ثانیا: معراج الدراریہ میں کتنی صریح حدیث موجود ہے۔

انہ امر بالتلقین بعد الدفن۔

ونیز بنایہ ودر مختار و طبرانی و معجم کبیر سے کچھ پیش کی گئیں۔

ثالثا: جو حدیث آپ کو باوجود تنبیہ اور تلاش کے نہ ملے تو کیا اس کی مطلقاً نفی ہو سکتی ہے۔

رابعا: کیا نہ مذکور عدم کو مستلزم ہے۔ لیکن جب ہٹ دھرمی پر کمر باندھی تو پھر حق گوئی سے کیا تعلق۔ آخر میں تو مجیب نے اپنا اصلی مقصد ہی ظاہر کر دیا۔

اور اس کا التزام بدعت سے خالی نہیں اور بدعت کے موجد کے بارے میں یہ فرمایا گیا:

عن عائشة رضی اللہ عنہ قالت قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم من احدث فی امرنا هذا ما لیس منہ فهو رد متفق علیہ۔ واللہ اعلم بالصواب وعندنا ام الكتاب۔

اولا: کیا ہر مستحب کو مستحب جان کر دوا کرنا بدعت ہے؟

ثانیا: بدعت کی جامع مانع کیا تعریف ہے؟

ثالثا: ہم نے سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی احادیث سے اس کا ثبوت پیش کیا اور صحابہ اور

فقہاء کے اقوال بھی نقل کئے تو کیا نعوذ باللہ حضور بدعتی ہوئے؟ تو حدیث کا لفظ ”من“ حضور کو بھی شامل ہے؟ اور کیا یہ صحابہ اور فقہاء بھی بدعتی ٹھہریں گے؟ اگر ہیں تو جب انہوں نے یہ احداث کیا تو ان کے مقلدین اور ان کے مسائل کو صحیح جاننے والے کس حکم کے مستحق ہوں گے۔

الحاصل مجھ کو فقط یہ ظاہر کرنا منظور تھا کہ ایسے ہی نام کے علماء نے شریعت میں اپنی خود غرضی سے طرح طرح کے فرقے پیدا کر دیئے۔ عبارتوں میں قطع و برید کر کے حلال کو حرام کر دیا۔ اس مختصری تنقید میں مجیب صاحب پر تیس سوالات جو حقیقۃ اعتراضات ہیں پیش کئے گئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المقصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،

العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنجل

(۵۳۱)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین حسب ذیل مسئلہ میں

میت کو قبر میں دفن کرنے کے بعد اذان دینا جائز ہے کہ نہیں اکثر لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کیا یہ معترض وہابی تو نہیں؟

صفر حسین ہزاری باغ۔

الجواب

نحمدہ ونصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

بعض فقہاء نے تو میت کے دفن کے بعد اذان کہنے کو سنت کہا ہے اور بعض نے مستحب بتایا ہے چنانچہ رد المحتار نے مستحب اذانوں میں اس کو شمار کیا ہے ”عند انزال الميت القبر“ یعنی میت کو قبر میں اتارنے کے وقت اذان کہنا مستحب ہے تو اس کے جواز میں کیا کلام ہے وہابی اس کو محض اپنی ناقص رائے اور عقل سے ناجائز کہتا ہے اور اس کے عدم جواز کے ثبوت میں کوئی صریح دلیل پیش نہیں کر سکتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عز و جل، العبد محمد اجمال غفرلہ الاول

(۵۳۲)

مسئلہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین حسب ذیل مسئلہ میں۔ بینوا تو جروا

(۱) بہار شریعت حصہ چہارم صفحہ ۱۶۲ مسئلہ دفن کے بعد قبر کے پاس اتنی دیر تک ٹھہرنا مستحب ہے جتنی دیر میں اونٹ ذبح کر کے گوشت تقسیم کر دیا جائے کہ ان کے رہنے سے میت کو انس ہوگا اور اتنی دیر تک تلاوت قرآن اور میت کے لئے دعا و استغفار کریں اور یہ دعا کریں کہ سوال نکرین کے جواب میں ثابت قدم رہے (جوہرہ وغیرہ) کتاب الاذکار میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ صفحہ ۱۴ میں تحریر فرماتے ہیں ”و یستحب ان یقعد عندہ بعد الفراغ ساعة قدر ما ینحر جزو رو تقسم لحمها و یشغل القاعدون بتلاوة القرآن والدعاء للمیت والوعظ وحکایت اهل الجنة واحوال الصالحین“ اس میں اس میں غرض یہ ہے کہ قبرستان میں میت کو قبر میں رکھنے کے بعد جب تک قبر کی مٹی درست نہ ہو جاوے ہمراہی جنازہ کے سب لوگ ٹھہرے رہتے ہیں۔ اسی وقفہ میں اگر ذکر خیر البشر سرکارِ دو عالم ﷺ و صالحین دعاء میت عوام سے پڑھا دی جاوے اور بعد واپسی عوام کے کچھ دیر تک خاص چند آدمی ذکر قرآن پاک قبر کے پاس پڑھ دیں اور اذان و تلقین کر دیں تو مطابق سنت مستحب کے ہوگا یا نہیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اس وقفہ میں عوام سے تلاوت بعض سور قرآن و اذکار کا پڑھوانا اور لوگوں کی واپسی کے بعد خواص کا تلاوت و اذکار میں مشغول رہنا اور اذان و تلقین کرنا بلاشبہ مستحب ہے اور ان امور سے میت کو انس اور کثیر منافع حاصل ہوتے ہیں۔ والتحقیق فی فتاوانا الاجملیہ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۵۳۳)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ میت کو دفن کرنے کے بعد قبر پر اذان کہنے کا حکم ہے یا نہیں۔ کیونکہ یہاں پر بہت آدمی منع کرتے ہیں لہذا رحم فرما کر مفصل جواب عنایت ہو۔ اس پر آپ کی مہر ہونا ضروری ہے۔

المستفتی عظمیٰ خاں ونور خاں شیوالا پوسٹ ولینگروایا میانہ گجرات

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بعض فقہاء نے قبر میں میت کو اتار تے وقت اذان کہنے کو سنت قرار دیا ہے۔ علامہ ابن حجر نے اسکی سنیت میں کلام فرمایا ہے۔ رد المحتار میں ہے: ”قیل وعند انزال المیت القبور قیا ساعلی اول خروجہ للدنیا ولکن رده ابن حجر فی شرح العباب۔ (رد المحتار مصری ۲۲۹ ج ۲) علماء کرام کا یہ اختلاف تو اس اذان قبر کے سنت ہونے نہ ہونے میں تھا۔ اب باقی رہا اذان قبر کا جائز ہونا تو اس میں فقہاء کرام کا کوئی اختلاف نظر سے نہیں گزرا۔ تو بعد دفن میت قبر پر اذان کہنا یقیناً جائز قرار پایا کہ شریعت سے اسکی ممانعت کی کوئی دلیل صریح ثابت نہیں ہوئی۔ پھر جو اسکو منع کرتا ہے وہ اسکی ممانعت پر کوئی صریح دلیل شرعی قائم کرے، ورنہ شرع پر افتراء کرنے سے باز آئے۔ احادیث پر نظر کرنے کے بعد اس اذان سے میت کے لئے چند منافع مستفاد ہوتے ہیں۔

(۱) اذان کی وجہ سے شر شیطان سے پناہ حاصل ہوگی۔

(۲) تکبیر اذان کی بدولت عذاب نار سے امان پائیگا۔

(۳) اذان سے جوابات سوالات منکر تکبیر یاد آ جائیں گے۔

(۴) ذکر اذان کے باعث عذاب قبر سے نجات پائیگا۔

(۵) اذان میں ذکر رسول اللہ ﷺ کی برکت سے نزول رحمت ہوگی۔

(۶) اذان کی بدولت دفع وحشت قبر ہوگا۔

(۷) اذان کے سبب سے زوال غم اور حصول سرور و فرحت حاصل ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

۱۰ اشوال المکرم ۱۳۷۱ھ

بالصواب

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۵۳۴)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین دامت برکاتہم القدسیہ مسائل ہذا میں کہ (۱) قبر میں بوقت سوال و جواب نکیرین کے جناب آقائے دو عالم احمد مجتبیٰ شافع روز جزا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جلوہ افروز ہوتے ہیں یہ صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے تو کس ثبوت سے اور کیا آپ صرف مسلمان ہی کی قبر میں جلوہ افروز ہوتے ہیں یا سب کی قبر میں؟ قبر خواہ مرتد و مشرک رافضی قادیانی و بابی دیوبندی وغیرہ کی ہو۔ کیا حکم شرعی ہے اور کافروں کو جب مرگھٹ پر جلا دیا جاتا ہے تو ان سے بھی نکیرین

سوال وجواب ان کے مرگھٹ پر جا کر کرتے ہیں یا نہیں؟ کیا نکیرین کے سوال وجواب صرف مسلم ہی سے ہوتا ہے یا ہر شخص سے خواہ وہ کافر ہو یا مرتد۔ مشرک ہو یا رافضی، قادیانی ہو یا وہابی دیوبندی وغیرہ ہوں اور جو لوگ جلائے جاتے ہیں ان سے بھی نکیرین سوال وجواب کرتے ہیں یا نہیں؟ اور حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بوقت سوال جواب نکیرین کافروں کے مرگھٹ پر بھی جلو افروز ہوتے ہیں یا نہیں کیا حکم ہے؟۔ بینواتو جروا۔

(۲) بوقت سوال۔۔۔ ب یرین قبر میں شیطان پہنچ جاتا ہے اور صاحب قبر کو بہکاتا ہے۔ یہ صحیح ہے یا غلط؟۔ اگر صحیح ہے تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ جہاں اللہ کے محبوب کا نزول ہوتا ہے وہاں شیطان دور بھاگتا ہے۔ لہذا جب حضور علیہ الصلاۃ والسلام قبر میں جلوہ افروز ہوتے ہیں تو شیطان کا گذر کس طرح ممکن ہو جاتا ہے اور پھر آپ کی موجودگی میں وہ صاحب قبر کی بہکاتا بھی ہے یہ کس طرح ممکن ہے کیا حکم شرعی ہے؟۔ بینواتو جروا۔

المستفتی فقیر محمد عمران قادری رضوی مصطفوی غفرلہ ربہ محلہ منیر خاں پبلی بیھت شریف

۳ محرم الحرام ۱۳۳۷ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) قبر میں سوالات نکیرین میں سے 'ما کنت تقول فی هذا الرجل' کے وقت خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا تشریف لانا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔

علامہ سیوطی شرح الصدور میں حضرت شیخ الاسلام ابن حجر کا قول نقل فرماتے ہیں:

سئل هل یکنف له حتی یری النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فاجاب انه لم یرد فی حدیث و انما ادعاه بعض من لا یحتج به لغير مستند سوى قوله فی هذا الرجل ولا حجة فیہ لان الاشارة الی الحاضر فی الذهن۔ (شرح الصدور ص ۶۰۱)

سوال کیا گیا کہ میت کیلئے پردہ حجاب اٹھادیا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھ لیتا ہے تو جواب دیا کہ کسی حدیث میں تو یہ وارد نہیں ہوا۔ اس کا بعض ایسے علماء نے دعویٰ کیا ہے جن کو جہت میں نہیں لایا جاتا ہے ان کی دلیل سوائے قول فی هذا الرجل اور کچھ نہیں اور اس میں کوئی حجت نہیں اس لئے کہ اشارہ فی الذہن کی طرف ہے۔

اور شیخ محقق شاہ عبدالحق محدث دہلوی اشعة اللمعات ترجمہ مشکوٰۃ میں اس کلمہ حدیث کے تحت میں فرماتے ہیں:

واشارات بہذا اباحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یا از جہت شہرت امر وحضور اوست در اذہان ما اگر چه غائب ست یا باحضار ذات شریف وے در عیاں بایں طریق کہ در قبر مثالی از حضرت وے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم می ساخته باشند۔ (اشعة اللمعات ج ۱ ص ۱۱۵)

ہذا کا اشارہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف یا اس بات کی شہرت ہونے اور ہمارے ذہنوں میں ان کے حاضر ہونے کی بنا پر ہے اگر چہ وہ غائب ہیں یا ان کی ذات شریف کے ظاہر میں اس طریق پر حاضر کر دینے کی بنا پر ہے کہ قبر میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مثال لیکر حاضر ہوتے ہیں۔

ان عبارات سے واضح ہو گیا کہ سوالات نکیرین کے لفظ هذا کا اشارہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف یا تو ان کے حاضر فی الذہن ہونے کی جہت سے ہے یا قبر میں آپ کی مثال کے حاضر ہونے کی بنا ہے۔ تو حضور کی صورت مثالی کا کی قبر میں سوال نکیرین کے وقت جلوہ افروز ہونا بھی صحیح ثابت ہوا گیا۔

اب باقی رہا یہ امر کہ قبر میں سوالات نکیرین صرف مسلم ہی سے ہوتے ہیں یا کافروں و مرتدوں سے بھی تو علامہ سیوطی نے شرح الصدور میں حضرت ابن عبد البر کا قول نقل فرمایا ہے:

قال ابن عبد البر لا یكون السؤال الا لمومن او منافق كان منسو بالی دین الاسلام بظاہر الشہادۃ بخلاف الکافر فانه لا یسئل۔ (ص ۵۹)

ابن عبد البر نے فرمایا کہ سوال قبر یا تو مومن ہی سے ہوتا ہے یا اس منافق سے ہوتا ہے جو اپنے آپ کو کلمہ شہادت پڑھ کر دین اسلام کی طرف نسبت کرتا ہے بخلاف کافر کے کہ اس سے سوال نہ کیا جائے گا۔

علامہ ابن حجر فتاویٰ حدیثیہ میں فرماتے ہیں:

وجزم الترمذی الحکیم بان المعلن بکفره لا یسئل و وافقه ابن عبد البر و رواه بعض کبار التابعین۔ (فتاویٰ حدیثیہ مصری ص ۷)

امام حکیم ترمذی نے اس بات پر جزم کیا کہ کفر کو باعلان کرنے والے سے سوال نہ کیا جائے گا ان کا ابن عبد البر نے موافقت کی ہے اور اس کی بعض کبار تابعین نے روایت کی ہے۔

ان عبارات سے یہ ظاہر ہو گیا کہ قبر میں سوالات نکیرین یا تو مسلمانوں سے ہوتے ہیں یا مدعی اسلام منافق سے اور کافر مردے سے یہ سوالات نہیں کئے جاتے تو پھر مرگھٹ پر سوالات کرنے اور وہاں حضور کے جلوہ افروز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں جو مسلم یا منافق جلا دیا جائے یا اس کو جانور کھاجا جائے اس سے نکیرین کے سوالات ہونگے۔

فتاویٰ حدیثیہ میں ہے: و سوال المملکین یعم کل میت و لو جنینا و غیر مقبور کحریق و غریق و اکیل سبع کما جزم به جماعة من الائمة۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب (۳) یہ بھی صحیح ہے کہ بوقت سوالات نکیرین میت کو شیطان نظر آتا ہے اور صاحب قبر کو بہکانے کی سعی کرتا ہے۔

شرح الصدور میں ہے: عن سفیان الثوری قال اذا سئل الميت من ربک تراى له الشیطان فی صورة فیثیر الی نفسه انی انا ربک۔

اور یہ بھی صحیح بخاری شریف کی حدیث ہے کہ نکیرین کے سوالات میں تیسرا سوال یہ ہوتا ہے کہ ما کنت تقول فی هذا لرجل۔ تو اس حدیث میں ہذا کا مشار الیہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف ہے اور اشارہ حاضر کی طرف کیا جاتا ہے تو قبر میں میت کو مشاہدہ جمال انور کا شرف حاصل ہوا۔ اور آپ کی صورت مثالیہ کی جلوہ افروزی ثابت ہوئی۔

اب باقی رہا یہ امر کہ حضور کی جلوہ افروزی کے باوجود وہاں شیطان کا آنا اور میت کو بہکانا کس طرح ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں رحمۃ العالمین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رحمت کا ہر دو کو صدقہ ملا۔ شیطان کو تو یہ ہے کہ وہ قبر میں اس وقت آکر بہکانے کی جرأت کرتا ہے۔ اور میت پر یہ رحمت خاص ہے کہ وہ اس کے فریب سے محفوظ رہتا ہے۔ بہکتا نہیں۔ یعنی اس مشاہدہ جمال پاک نے دشمن کے فریب دینے اور بہکانے کے وقت میت کی یہ مشکل کشائی فرمائی کہ ایسے سخت مخالف کو خائب و نامراد واپس کر دیا اور اس کے لئے راہ نجات روشن فرمادی۔

چنانچہ حضرت شیخ محقق نے اشعة اللمعات میں ان کلمات حدیث کی شرح میں ایسا لطیف اشارہ فرمایا:

واشارات بہذا بابا حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یا از جہت شہرت امر و حضور اوست در اذہاں ما اگر چہ غائب ست با حضار ذات شریف وے در عیاں بایں طریق کہ در قبر مثالی از حضرت وے صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم حاضری ساختہ باشند تا بمشاہدہ جمال جاں افروزی او عقیدہ اشکالی کہ در کار افتادہ کشادہ شود و ظلمت فراق نورلقائے دلکشائے اور روشن گردد۔

لہذا یہ حضور علیہ السلام کی رحمت عامہ کا صدقہ ہے کہ شیطان کا اس وقت قبر میں گذر ہو گیا اور وہ صاحب قبر کو بہکانے کی سعی کرنے لگا ورنہ اس آقائے کریم کے صدقہ میں ان کے غلاموں کی ایسی ہیبت ہے کہ شیطان ان کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ ان کے راستہ پر بھی چل نہیں سکتا۔ چنانچہ حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق صحاح ستہ میں یہ احادیث مروی ہیں:

قال علیہ السلام ان الشیطان لیخاف منک یا عمر (وفی روایۃ) انی لا نظر الی شیطین الجن و الانس قد فروا من عمر (وفی روایۃ) یا ابن الخطاب و الذی نفسی یدہ ما لقیك شیطان سالکا فجاقطا لا سلك فجاء غیر فجک اخر جہا المشکوۃ۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

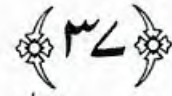
(۳) نکیرین قبر میں چھوٹے بچوں سے سوالات نہیں کرتے۔

شرح الصدور میں ہے: الانبیاء و اطفال المومنین لیس علیہم حساب ولا عذاب القبر ولا سوال منکر و نکیر۔

علامہ سیوطی بشری الکتاب میں فرماتے ہیں: قد وردت الاحادیث و نصوص العلماء باستثناء جماعة من السوال منهم الشهداء و الصدیقون و المطیعون و كذلك الاطفال فی ارجح الاقوال۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۱۵ ربیع الآخر شریف ۱۳۷۳ھ

کتبہ: مقتضی بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

اللہ اکبر



باب حرمة القبور

مسئلہ

(۵۳۵)

از حسن پور محلہ لال باغ ضلع مراد آباد جناب غلام نبی خاں صاحب رضوی کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

کتاب مستطاب ”رکن الدین“ میں حضرت مولانا شاہ رکن الدین صاحب نقشبندی مجددی الوری بحوالہ عالمگیری لکھتے ہیں۔ کہ مردوں کی ہڈیاں گلنے سڑنے پر قبر سے نکال کر اس پر مکان بھی بنا سکتے ہیں اور کھیتی بھی کر سکتے ہیں۔ اور قریب قریب اس کے موافق ”فلاح دارین“ میں بھی لکھا ہے کہ چار سال گزرنے پر نشان قبر مٹنے پر کھیتی بھی کر سکتے ہیں اور مکان بھی بنا سکتے ہیں۔ کیا ایسی صورت میں وہابیہ نجدیہ دیوبندیہ خذہم اللہ تعالیٰ کو موقع نہ ملے گا؟ جو نعوذ باللہ اولیاء کرام کو بھی مردہ جانتے ہیں اور ان کے مزارات طیبہ کی تعظیم کو شرک و کفر قرار دیتے ہیں کہ وہ مزارات طیبہ کو بھی شہید کر کے وہاں پر مکان بنادیں، یا کھیتی کرادیں۔ چنانچہ مقامات مقدسہ میں ابن سعود نجدی ملعون خزہم اللہ تعالیٰ ایسا کر چکا اور کر رہا ہے۔ برائے عنایت و کرم جواب شافی و کافی بحوالہ کتب عنایت فرمائیں۔ والسلام

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

مسلمان کی عزت جس طرح زندگی میں ہے اسی طرح بعد موت کے ہے۔

چنانچہ محقق علی الاطلاق فتح القدیر میں فرماتے ہیں۔ ”الاتفاق علی ان حرمة المسلم میتا کحرمته حیا“ پھر مسلمان کو جس چیز سے حیات میں ایذا پہنچتی ہے بعد موت بھی اس سے ایذا پہنچتی ہے۔

چنانچہ سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اذی المؤمن فی موتہ کاذاه فی حیاته۔

یعنی مسلمان مردہ کو ایذا دینا ایسا ہے جیسے زندہ کو۔

شیخ محقق دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ”اشعۃ اللمعات“ میں فرماتے ہیں:

از بیجا استفادہ میگردد کہ میت متالم میگردد بتمام آنچه متالم میگردد بداراں حی و لازم ایں است کہ متلذذ گردد و بتمام آنچه متلذذ می شود بداراں زندہ۔

لہذا سوال کا جواب تو یہیں سے معلوم ہو گیا کہ مردہ کی ہڈیوں کو قبر سے نکالنے اور وہاں کھیتی کرنے یا کوئی مکان بنانے میں کیا اس کو ایذا نہیں ہوگی؟ ضرور ہوگی۔ اور پھر اس کی اہانت بھی ہوگی اور یہ ممنوع ہے۔ جیسا کہ ان عبارتوں سے واضح ہو چکا۔ لیکن مزید براں اب میں ایک حوالہ اسی عالمگیری کا پیش کرتا ہوں جس کے متعلق سوال کیا گیا ہے:

سئل القاضي الامام شمس الائمة محمود الاوزجندی فی المقبرة اذا اندرست ولم یبق فیها اثر الموتی لا العظم ولا غیره هل یجوز زرعها واستغلالها قال لا ولها حکم المقبرة۔

یعنی قاضی امام شمس الائمة محمود اوزجندی سے ایسے مقبرہ کے بارے میں سوال ہوا کہ جب نہ قبروں کا نشان باقی رہا ہو، اور نہ ہڈی وغیرہ ہو تو کیا اس میں کھیتی اور غلہ حاصل کر سکتے ہیں؟ فرمایا: نہیں۔ اور اس کے لئے مقبرہ کا حکم ہے۔ اس عبارت میں تو مسئلہ کی خاص صورت کا ہی حکم بیان کر دیا گیا۔ اور پھر ہڈیاں نکلو کر کھیتی یا مکان بنوانا تو بڑی چیز ہے احادیث کریمہ اور کتب فقہیہ میں تو یہاں تک احتیاطیں ہم کو تعلیم کی ہیں کہ قبر پر تکیہ لگانا، جوتا پہن کر چلنا، قبرستان میں پرانے راستے کو چھوڑ کر نئے راستہ پر گزرنا، قبر پر پاؤں رکھنا، اس کے پاس سونا، قبر کی ترگھاس یا درخت کو کاٹنا، قبر پر بیٹھنا، تمام ممنوع و ناجائز ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کسی کے اعزہ اور اقربا کی قبریں ایسی جگہ ہیں کہ ان تک پہنچنے کے لئے چند مسلمانوں کی قبروں کو کودنا پڑے گا۔ تو اس شخص کو وہاں پہنچ کر فاتحہ پڑھنا مکروہ ہے۔ بلکہ وہ باہر ہی سے فاتحہ پڑھے۔ الحاصل اب اگر اس میں کھیتی کی جائے گی یا مکان بنایا جائے گا، تو اس میں چلنا پھرنا بیٹھنا لیٹنا قبور کو پاؤں سے روندنا ان پر پاخانہ پیشاب کرنا سب کچھ ہی ہوگا اور کوئی دقیقہ بے حیائی اور اموات مسلمین کی ایذا رسانی کا باقی نہ رہے گا۔ اور قاضی خاں میں تو یہاں تک مرقوم ہے۔

مقبرة قديمة بمحلة لم یبق فیها اثار المقبرة هل یباح لاهل المحلة الانتفاع بها قال

ابو النصر رحمة الله تعالى علیه لا یباح۔

یعنی کسی محلہ میں کوئی پرانا مقبرہ ہے جس میں قبروں کے نشان باقی نہیں رہے ہیں تو آیا اہل محلہ اس سے نفع حاصل کر سکتے ہیں؟ ابو النضر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فرمایا کہ مباح نہیں ہے۔ اور یہی فتاویٰ ظہیریہ و خزائنہ المفتین وغیرہ میں ہے۔ ہدایہ میں ہے:

فی غایۃ القبح ان یقبری فیہ الموتی سنة ویزرع سنة۔

یعنی یہ بہت ہی فتنج ہے کہ کسی جگہ ایک سال قبر بنالیا کریں اور ایک سال کھیتی کر لیا کریں۔

بالجملہ اگر فقہ کی عبارات اسی طرح پیش کی جائیں تو جواب میں بہت طول ہو جائے لیکن اب یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ عالمگیری کی عبارت مندرجہ فی السؤال کے متعلق سائل کے شکوک رفع کروں۔ وباللہ التوفیق۔

مسائل شرع میں ذرا سی صورت بدل جانے سے ایک ناجائز جائز، اور جائز ناجائز ہو جاتا ہے۔ مثلاً شراب کی حرمت قطعی ہے لیکن عند الضرورت کہ ایک شخص کی شدت تشنگی سے جان لیو پر آگئی ہے اور وہاں شراب کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے تو اس کے لئے شریعت بقدر ضرورت شراب حلال کر دیتی ہے۔ لہذا ضرورت شریعت میں ایک بہت بڑا عذر ہے۔ اسی لئے ایک قبر میں دوسرے مردہ کا دفن جائز رکھا اور اگر ضرورت نہ ہو تو یہ حرام ہے۔

چنانچہ تاتارخانیہ میں ہے: اذا صارت المیت ترا بافی القبر بکرہ دفن غیرہ فی قبرہ لان الحرمة باقیہ۔

کبیری میں یہ قید صراحتہ موجود ہے: الا عند الضرورة بان لم یوجد مکان سواء۔

اور یہی مضمون مولانا رکن الدین صاحب دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

ایک وقت میں بلا ضرورت ناجائز ہے اور ضرورت کے وقت جائز ہے۔

اب رہا کھیتی یا مکان بنانا اور اس کا صحیح محل یہ ہے کہ کسی کی ملک میں کوئی میت دفن کر دیا گیا تو جب وہ بالکل خاک ہو جائے مالک کو روا ہے کہ وہاں کھیتی کر لے یا گھر بنائے یا کچھ اور کرے۔

چنانچہ در مختار میں ہے: لا ینخرج منه بعد اہالة التراب الالحق آدمی کان تکنون الارض مغصوبة او اخذت بشفعة یخیر المالك بین اخراجه ومساواته بالارض کما جاز زرعه والبناء علیہ اذا بلی وصارا ترابا۔

یعنی مردہ قبر سے مٹی ہو جانے کے بعد بھی نہ نکالا جائے۔ ہاں کسی آدمی کے حق یا زمین کے

منسوب ہونے یا شفعہ کے اعتبار سے مالک کو اس کے نکالنے اور زمین کو برابر کرنے کا اختیار ہے۔ جیسا کہ اس کے لئے جب وہ مٹی ہو جائے تو کھیتی کرنے اور مکان بنانا جائز ہے۔

اب آپ کو نہایت واضح طریقہ سے معلوم ہو گیا کہ عالمگیری کا وہ حکم اس وقت میں ہے جب دوسرے کی زمین میں میت دفن کر دیا گیا۔ تو یہ حق شریعت نے اس کو مالک ہونے کے اعتبار سے دیا ہے۔ نہ اس لئے کہ مسلمانوں کی قبروں پر ہر کوئی شخص کھیتی کر سکے، یا مکان بنا سکے۔ یہ بات ابتدا میں پیش کر دی گئی۔

اب رہا اولیاء کرام کے ساتھ ایسا فعل تو یہ بھی اسی سے معلوم ہو گیا کہ جب عوام مومنین کی قبور کو مٹی ہونے سے قبل تغیر نہیں کر سکتے تو ان کے اجسام تو ویسے ہی محفوظ رہتے ہیں۔ لہذا ان کے لئے تو کوئی صورت ہی متصور نہیں۔ صد ہا کتب اور واقعات اس کے شاہد ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

(۵۳۶)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ

میت کو لکڑی کا پٹاؤ دیا جائے یا پتھر کا پٹاؤ بھی دے سکتے ہیں یا نہیں اور جس طرح اینٹ لگانے کی ممانعت بنائی جاتی ہے اسی طرح پتھر کی تو ممانعت نہیں ہے؟۔ بینوا تو جروا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

میت کیلئے پختہ اینٹ یا لکڑی کا پٹاؤ اگر محض بغرض استحکام دیا جائے تو مکروہ ہے۔

جو ہرہ نیرہ میں ہے: ویکرہ الآخر الخشب لانہما لا حکام البناء وهو لا یلیق بالمیت لان القبر موضع البلی فعلی هذا تکرہ الاحجار۔

اور اگر اس غرض سے نہیں تو عند الحاجة جو دستیاب ہو اس کا پٹاؤ کیا جاسکتا ہے پختہ اینٹ کو بعض نے اس بنا پر مکروہ کہا ہے کہ اس کو آگ پہنچ چکی ہے تو اس کا قریب میت ہونا مناسب نہیں۔

ہدایہ میں ہے: ثم بالآجر اثر النار فیکرہ تفاولا

اور پتھر میں کوئی اثر نار نہیں تو پتھر اینٹ کی طرح نہیں واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: الفقیر الی اللہ عز وجل، العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

مسئلہ

(۵۳۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
(۱) قبر پر بیٹھنا۔ چلنا، قبر کا تکیہ لگا کر بیٹھنا کیسا ہے قبر کو پیٹھ کرنا کیسا ہے؟
(۲) مزار شریف پر فاتحہ پڑھنا کس جگہ کھڑے ہو کر اور کس طرح چاہئے؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ صاحب مزار کا رخ قبلہ کو ہے فاتحہ صاحب مزار کے سینہ کے مقابل صاحب مزار کے رخ کی طرف اپنا مونہہ کر کے اور قبلہ کو پیٹھ کر کے فاتحہ پڑھنا چاہئے کیونکہ اس کا معنی صاحب مزار کا رخ قبلہ کو ہے اور اگر اس کے پیٹھ کی طرف اس کے الٹے ہاتھ کو کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھے گا یا سر ہانے یا پائیتانے صاحب مزار کے کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھے گا۔ تو اس صورت میں صاحب مزار کو فاتحہ پڑھنے والے کی طرف اپنا مونہہ کرنا ہوگا جس سے صاحب مزار کو تکلیف مونہہ پھیرنے کی ہوگی۔ اس لئے سیدھی طرف قبلہ کو پیٹھ کر کے فاتحہ پڑھے اور کسی طرف کھڑے ہو کر فاتحہ نہ پڑھے کیا شخص مذکور کا قول صحیح ہے یا نہیں؟

(۳) قبر میں طاق کھدوانا اور اس میں عہد نامہ یا شجرہ شریف اور اس شخص کا نام جس کی قبر تیار کی گئی ہے لکھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) بلا حاجت قبر پر بیٹھنا یا چلنا یا اس کا تکیہ لگانا مکروہ ہے۔

عالمگیری میں ہے: یکرہ ان یبنی علی القبر او یقعد او ینام او یوطأ علیہ۔

اور آداب زیارت سے قبر کی طرف مونہہ کرنا ہے۔

اشعۃ اللمعات میں ہے: وازجملہ آداب زیارت ست روئے بجانب قبر۔

اور خاص کر کسی بزرگ یا عالم دین کی قبر کی طرف پیٹھ کرنا بے ادبی اور فیوض سے محرومی کا باعث ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) مزار پر فاتحہ پڑھتے وقت قبر کی طرف مونہہ کر کے اور قبلہ کی جانب پشت کر کے کھڑا ہونا اور میت کے چہرہ کے مقابل کھڑا ہونا چاہئے۔

اشعۃ اللمعات میں ہے: وازجملہ آداب زیارت ست کہ روئے بجانب قبر و پشت بجانب قبلہ

مقابل روئے میت بایستند۔

باقی شخص مذکور کا قول صحیح ہے۔ چنانچہ رد المحتار جلد اول میں بحث زیارت قبور میں اس کی تصریح موجود ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) عہد نامہ کو میت کے کفن یا پیشانی پر لکھنے سے اس کی مغفرت ہو جانے کی امید کی تصریح در مختار میں ہے: کتب علی جبهة الميت او عما متہ او کفنه عہد نامہ یرجی ان یغفر اللہ للمیت۔

تو بعض اکابر نے بخوف ان کلمات کے نجاست میں ملوث ہونے یا اندیشہ اہانت کی بنا پر یہ حل تجویز فرمایا کہ قبر میں طاق کھدوا کر اس میں عہد نامہ یا شجرہ رکھ دیا جائے تو اس میں ان اندیشوں سے بھی حفاظت ہو جائے اور میت کو ان کلمات اور سند صالحین سے امداد بھی حاصل ہو جائے۔ لہذا طاق قبر میں عہد نامہ یا شجرہ رکھنے میں کونسا ممنوع شرعی لازم آتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۵۳۸)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں

قبر کے تختے گل سر کر کل یا چند دو ایک نکل گئے نیچے دھنس گئے ہوں تو نئے دوسرے تختے ڈال کر قبر کی درستی کرنا جائز ہے یا نہیں؟

المستفتی محمد عرفان پبلی بھیت۔

الجواب

قبر کے تختے اگر گل سر جائیں تو ان تختوں کو اکھاڑ کر نئے تختے ڈال کر قبر درست کرنا ممنوع ہے بلکہ اس میں جہاں نشیب ہو یا سوراخ ہو جائے تو اسکو مٹی سے بند کر دینا چاہئے۔

طحاوی میں ہے: ولا یباح نیشہ بعد الدفن اصلاً۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۱۵ صفر المظفر

کتبہ: المعصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۵۳۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں۔ سوال کا جواب مدلل و مفصل دیجئے گا؟۔

زید کے پاس انتخاب صحاح ستہ کتاب ہے جس کا ترجمہ اردو میں ہے اس کے صفحہ ۸۶ پر احکام قبر میں دو حدیثیں ہیں۔ جن کے ترجمہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے، کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مزارات کو پختہ بنوانے کو اور فقیر بنکر مزارات پر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ اولیاء عظام کے مزارات پختہ بنے ہوئے ہیں اور انکی قبروں پر لوگ مجاور بنے بیٹھے ہیں۔ زید کا کہنا ہے کہ میں نے بہت سے علماء سے اس کا مطلب دریافت کیا، مگر میری تسکین نہ ہوئی اور نہ کافی جواب ملا۔ حدیث کا ترجمہ نقل کرتا ہوں جواب سے آگاہ کیجیے گا۔

حدیث۔ وعن ابی الہیاج الاسدی قال قال علی الا بعتک علی مابعثنی علیہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ان لاتدع تمثالا الا طمستہ ولا قبر امشرفا الا سوتہ رواہ مسلم۔

ابو الہیاج نے فرمایا حضرت علی نے کہا میں تمہیں اس کام کو انجام دینے کے بھیج رہا ہوں جسے انجام دینے کے لئے سرکارِ نامدار نے مجھے بھیجا تھا وہ کام یہ ہے کہ تم کوئی تصویر بغیر مٹائے اور کوئی اونچی قبر بغیر نیچی کئے ہوئے نہ چھوڑو۔ (مسلم شریف)

حدیث۔ عن جابر قال نہی رسول اللہ ﷺ ان یخصص القبر وان ینبئ وان یقعد علیہ رواہ مسلم

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ حضور سید عالم ﷺ نے قبر کو گچ کرنے اور اس پر عمارت بنانے اور اس پر فقیر ہو کر بیٹھنے سے منع فرمایا۔

المستفتی محمد یونس رضا خاں مدرس مدرسہ تعلیم القرآن بلند پور۔ فرخ آباد

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اس کتاب کا ترجمہ کسی بد مذہب وہابی نے کیا ہے کہ اس نے ترجمہ میں تصرف کیا ہے۔

چنانچہ پہلی حدیث کے الفاظ ولا قبر امشرفا لا سوتہ کا یہ غلط ترجمہ لیا کہ تم کوئی اونچی قبر کو

نیچی کئے ہوئے نہ چھوڑو حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ تھا کہ تو کسی اونچی قبر کو بغیر برابر کئے ہوئے نہ چھوڑنا۔ تو اس نے تسویۃ کے معنی بجائے برابر کرنے کے نیچا کرنا اپنی طرف سے گڑھا ہے۔ اور اس تصرف کے لئے مجبوری یہ لاحق ہوئی کہ قبر مسلم کو زمین کی برابر کرنا خلاف سنت ہے۔ تو اس نے قبر کو برابر کرنے کے بجائے نیچا لکھ دیا۔ اور ظاہر ہے کہ جب قبر کی اونچائی کو نیچا کیا جائے گا، تو وہ پھر زمین سے بلند ہی ہوگی، اور جب وہ زمین سے کچھ بلند ہی رہی تو تسویۃ کے معنی کب متحقق ہوئے کہ وہ زمین کے برابر نہیں ہوئی، اور مقصود حدیث تصویر اور قبر کا بالکل میٹ دینا تھا، اسی اہم مقصد کیلئے انکو بھیجا تھا۔ علاوہ بریں وہابیہ کی بے ایمانی یہ ہے کہ حدیث کا زمانہ نہیں بتایا اور نہ یہ ظاہر کیا کہ وہ کس کی قبریں تھیں۔

ترمذی شریف میں اسی حدیث کے بین السطور میں ہے۔ بعثہ النبی فنی اسواق مکة ومقابرہا عام الفتح۔ یعنی حضور نبی کریم نے انہیں فتح مکہ کے سال بازاری قبروں کے لئے بھیجا تھا۔ تو اب ہر مسلمان غور کر سکتا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے وہاں مسلمانوں کی قبریں کہاں تھیں۔ تو اب ظاہر ہو گیا کہ قبور مشرکین تھیں انکو برابر کرنے اور میٹنے کیلئے انہیں بھیجا تھا۔ تو اب وہابیہ کا تصرف دیکھو کہ حدیث قبور مشرکین کے مینے کے لئے تھی ان بیدینوں نے قبور مسلمین اور مزار اولیا پر چسپاں کر دیا۔ نیز اس حدیث میں نہ قبر کو پختہ کرنے کی ممانعت ہے نہ اسکے مجاور بننے کی حرمت کا ذکر ہے۔

دوسری حدیث کا تصرف دیکھو کہ الفاظ یہ تھے۔ ان یقعد علیہ۔ جس کا یہ غلط ترجمہ کیا اور اس پر فقیر ہو کر بیٹھنے سے منع فرمایا، باوجود کہ صحیح ترجمہ یہ تھا قبر پر بیٹھنے سے منع فرمایا کہ قبر پر چڑھ کر بیٹھنے سے یقیناً قبر کی بے حرمتی ہے، اس کی ممانعت فرمائی ہے۔

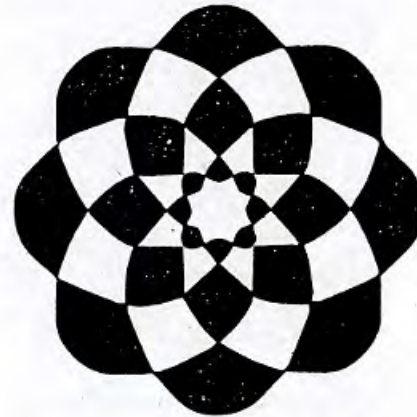
ہر شخص جانتا ہے کہ قعود کے معنی بیٹھنے کے ہیں، اس میں ”فقیر ہو کر“ کا کلمہ اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے۔ اس جاہل نے یہ کلمہ بڑھا کر مضمون حدیث ہی کو بدل دیا اور مضمون لازم ہو گیا کہ قبر پر فقیر ہو کر بیٹھنا ممنوع ہے اور فقیر ہو کر بیٹھنا ممنوع نہیں۔ حالانکہ قبر پر ہر حال میں بیٹھنا ممنوع ہے۔ اور پھر یہ بھی تو نتیجہ نکلا کہ اگر فقیر ہو کر قبر پر تو نہ بیٹھا، بلکہ اس کے قریب بیٹھا تو یہ ممنوع نہ ہوا۔ وہابیہ نے حدیث میں تصرف بھی کیا اس کا ترجمہ بھی غلط کیا لیکن مدعا پھر بھی حاصل نہ ہوا۔ لہذا ان ہر دو حدیث سے مزارات اولیا کرام کے پختہ بنوانے اور انکے مجاور بننے کی ممانعت پر استدلال کرنا غلط ثابت ہوا۔ پھر اگر ان احادیث سے یہ امور ناجائز ہوتے تو محدثین و فقہاء کرام انکو ہرگز ہرگز جائز نہ لکھتے۔ اس حدیث اول ہی کی شرح میں علامہ محمد طاہر جمع البحار میں فرماتے ہیں

قد اباح السلف ان یسنى على قبور المشائخ والعلماء المشاهير ليزورهم الناس و
یستریحون بالجلوس فيه
(مجمع البحار - ج ۲ ص ۱۸۷)
یعنی سلف نے مشائخ اور مشہور علماء کی قبروں پر تعمیر مکان کو جائز رکھا ہے تاکہ زیارت کرنے
والے آئیں اور اس میں بیٹھ کر آرام پائیں۔

در مختار میں ہے: ولا یحصص للنهی عنه ولا یطین ولا یرفع علیه بناء وقیل لا یاس به
وهو المختار۔
(شامی - ج ۱ ص ۶۲۷)

اسی طرح طحاوی میں ہے۔ ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ قول مختار کی بنا پر قبر پر گچ کرنے،
اس پر عمارت بنانے میں شرع میں کوئی حرج نہیں ہے، تو اگر یہ امور حدیث میں ممنوع ہوتے تو ہمارے
سلف ہرگز ہرگز جائز نہیں لکھتے۔ تو وہابیہ کا ان احادیث سے استدلال کرنا غلط و باطل ہے۔ اور تصریحات
مذہب کے خلاف ہے۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدة سنجل



باب الصدقات للمیت

(۵۴۰)

مسئلہ

ماقولکم یاساداة العلماء رحمکم اللہ تعالیٰ مندرجہ ذیل مسائل میں
میت کو دفن کرنے کے بعد روپیہ پیسہ لوجہ اللہ خیرات کرنا کیسا ہے؟

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

میت کے لئے لوجہ اللہ خیرات کرنے کے مستحب اور مندوب ہونے کا حکم قرآن کریم سے ثابت
ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: واذا حضر القسمة اولو القربی والیتمی والمساکین فارزقوهم منه
وقولوا لهم قولاً معروفاً۔ (سورہ نساء)

اور بانٹنے وقت اگر رشتے دار اور یتیم اور مسکین آجائیں تو اس میں سے انہیں بھی کچھ دو اور ان کو
اچھی بات کہو۔

علامہ ابوالبرکات نسفی تفسیر مدارک میں اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

واذا حضر القسمة لترك اولو القربی ممن لا یرث والیتمی والمساکین من الاجانب
فارزقوهم فاعطوهم منه مما ترک الوالدان والاقربون وهو امر ندب وهو باق لم ینسخ۔

(مدارک مصری ج ۱ ص ۱۶۲)

اور ترکہ کی تقسیم کے وقت اگر غیر وارث رشتہ دار اور اجنبی یتیم اور مسکین آجائیں تو انہیں ماں باپ
اور اقارب کے ترکہ سے کچھ دو، یہ دینا مستحب کام ہے اور یہ حکم باقی ہے جو منسوخ نہیں ہوا۔

علامہ ناصر النہ علاء الدین بغدادی تفسیر خازن میں اس آیت کریمہ کے تحت میں فرماتے ہیں:

القول الثانی ان هذا الامر ندب واستحباب لا علی سبیل الفرض والایجاب وهذا

القول هو الاصح الذی علیہ العمل الیوم۔ (خازن مصری ص ۴۰۴ ج ۱)

دوسرا قول یہ ہے کہ غیر وارث رشتہ داروں اور اجنبی یتیموں اور مسکینوں کو دینا مندوب و مستحب

ہے فرض و واجب نہیں ہے یہ قول ایسا صحیح ہے جو آج بھی معمول ہے۔

علامہ احمد جیون تفسیر احمدی میں اسی آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں:

السَّالُّ ان الله تعالى امرنا باعطاء شيء من التركة بغير الورثة فهو اما ان يكون تطيبا بقلوبهم او تصدقا عليهم فحينئذ يكون ذلك ندبا باقيا على حاله -

(احمدی مطبوعہ دہلی - ج ۱ ص ۱۳۵)

اور مال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں غیر وارثوں کے لئے ترکہ سے کچھ دینے کا حکم فرمایا پس یہ یا تو ان کے دل خوش کرنے کے لئے ہے یا ان پر صدقہ کرنا تو یہ دینا مستحب ہو اور اپنے حال پر باقی رہا۔

اس آیت کریمہ اور اس کی تفاسیر سے یہ ثابت ہو گیا کہ ترکہ سے غیر وارث رشتہ داروں اور اجنبی یتیموں مسکینوں کی تقسیم ترکہ سے پہلے کچھ صدقہ اور خیرات دینا مستحب ہے ان تفاسیر نے اس آیت کریمہ کو غیر منسوخ قرار دیا اور اسی کو صحیح قول اور معمول امت بتایا۔ تفسیر خازن نے کہا ہے کہ حضرت امام زہری اور امام نخعی حضرت مجاہد، حضرت سعید بن جبیر، حضرت عطاء، حضرت امام شعی، حضرت ابو العالیہ، حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا یہی قول ہے، اور سید المفسرین: رت عبد اللہ بن عباس اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے مروی ہے۔

آیت کریمہ کے بعد اب کسی حدیث کی ضرورت تو نہیں تھی لیکن مزید اطمینان کے لئے احادیث بھی پیش کر دوں۔

طبرانی میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ان الصدقة لتطفئ عن اهلها حر القبور۔ (شرح الصدور مصری ص ۱۲۸)

بیشک صدقہ مردوں سے قبر کی حرارت کو دور کر دیتا ہے۔

طبرانی اوسط میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے سرکار رسالت میں عرض کی: یا رسول اللہ توفیت امی ولم توص ولم تصدق فهل ينفعها ان تصدقت عنها قال نعم ولو بكراع شاة محرق۔ (شرح الصدور مصری ص ۱۲۹)

یا رسول اللہ! میری والدہ وفات پا گئیں اور انہوں نے نہ صدقہ کی، وصیت کی نہ خود صدقہ دیا اگر میں ان کی طرف سے دوں تو کیا انہیں نفع دیگا فرمایا ہاں نفع دیگا اگرچہ بکری کے جلے ہوئے پائے ہی دیں، طبرانی نے اوسط میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

ما من اهل ميت يموت منهم ميت فيصدقون بعد موته الا اهدا هاله جبرئيل على طبق من نور ثم يقف على شفيع القبر فيقول يا صاحب القبر العميق هذه هدية اهلها اهداها اليك اهلك فاقبلها فتدخل عليه فيفرج بها يستبشرو بحزن جيرانه الذين لا يهدى بهم شيء -

(شرح الصدور مصری ۱۲۹)

اہل میت سے جو اپنی میت کی جانب سے اس کے مرنے کے بعد صدقہ کریں تو جبریل امین نور کے طبق میں وہ ہدیہ لیجاتے ہیں اور کنارہ قبر پر کھڑے ہو کر فرماتے ہیں کہ اے گہرے گڑھے والے یہ ہدیہ ہے جسے تیرے اہل نے تیری طرف بھیجا ہے تو اسے قبول کر تو وہ اس پر داخل ہوتا ہے اور اس کے وہ پڑوسی جن کی طرف کوئی چیز نہیں بھیجی گئی رنجیدہ ہوتے ہیں۔

احادیث سے بھی یہ ثابت ہو گیا کہ میت کے لئے صدقات جائز ہیں اور اس کے لئے بہت نافع ہیں اور باعث فرح و سرور ہیں یہ حکم بکثرت آیات و احادیث سے ثابت ہے اور اہل سنت و جماعت کا اتفاق و اجماعی مسئلہ ہے۔ عقائد کی مشہور کتاب شرح فقہ اکبر میں ہے:

عند اهل السنة ان للانسان ان يجعل ثواب عمله صلوة او صوما او حجا او صدقة او غيره - (شرح فقہ اکبر مصری ۱۱۸)

اہل سنت کے نزدیک انسان اپنے عمل - نماز - روزہ - حج - صدقہ وغیرہ کا ثواب اپنے غیر کو پہنچا سکتا ہے۔ بحر الرائق و بدائع میں ہے:

من صام او صلى او تصدق وجعل ثوابه لغيره من الاموات والاحياء جاز ويصل ثوابها اليهم عند اهل السنة والجماعة - (شامی مصری ج ۱ ص ۶۳۱)

جس نے روزہ رکھا یا نماز پڑھی یا صدقہ دیا اور اس کا ثواب اپنے مردوں اور زندوں کو پہنچائے تو جائز ہے اور ان اعمال کا ثواب اہل سنت و الجماعت کے نزدیک انہیں پہنچتا ہے۔

علامہ حسن شرنبلالی مراقی الفلاح شرح نور الایضاح میں علامہ زیلعی سے نقل ہیں:

فلانسان ان يجعل ثواب عمله لغيره عند اهل السنة والجماعة صلوة كان او صوما او حجا او صدقة او قراءة للقرآن او الاذکار او غير ذلك من انواع البر ويصل ذلك الى الميت وينفعه - (طحاوی مصری ص ۳۶۳) -

انسان اپنے عمل کا ثواب اپنے غیر کے لئے اہل سنت و جماعت کے نزدیک پہنچا سکتا ہے اب وہ عمل نماز ہو یا روزہ حج ہو یا صدقہ قرآن کی تلاوت ہو یا اذکار یا اس کے سوا اور نیکیوں کے اقسام وہ میت کی طرف پہنچتا ہے اور اس کو نفع دیتا ہے۔

بالجملہ آیات و احادیث اور کتب عقائد وفقہ سے ثابت ہو گیا کہ میت کے لئے صدقہ و خیرات بوجہ اللہ دینا نہ فقط جائز بلکہ مستحب ہے اور یہ صحابہ اور تابعین - ائمہ و مجتہدین - فقہاء و محدثین، علامہ المسلمین اہل سنت و جماعت کا معمول ہے اور اموات کے لئے یہ بہت نافع اور باعث فرح و سرور ہے اور جو اس کا مخالف و منکر ہے وہ آیات و احادیث کا انکار کرتا ہے مذہب اہل سنت و جماعت کے اتفاقی مسئلہ کی مخالفت کرتا ہے اور اموات کے ساتھ دشمنی وعداوت کرتا ہے اور مسلمانوں کو ایک نیک کام سے روکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب۔

کتبہ: المتعظم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۸۱ھ

(۵۴۱)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ اگر صدقہ اور خیرات اس طور پر تقسیم کیا جائے کہ علماء کو زیادہ دیں اور طالب علموں کو اس سے کم اور ملازموں کو اس سے کم اور فقراء و مساکین کو اس سے کم تو اس طور کی تقسیم جائز ہے یا نہیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

اس طرح کی تقسیم میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ہر صاحب حاجت کو اس کی منزلت ملحوظ رکھتے ہوئے دینا ہے حدیث شریف میں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: انزلوا الناس منازلہم۔ (مشکوٰۃ شریف ص ۴۲۴)

لوگوں کا ان کی منزلتوں کے اعتبار سے اکرام کرو۔

جب منزلت کا لحاظ ثابت ہوا تو دینی منزلت ضرور دنیوی منزلت سے افضل ہے اور دینی منزلت میں بھی فرق مراتب ہیں صورت مسئلہ میں یہ ظاہر بات ہے کہ فقراء و مساکین سے ملانے افضل ہیں۔ اور ملائوں سے طالب علم افضل ہیں اور طلباء سے علماء افضل ہیں چنانچہ علماء کی افضلیت کے متعلق تو خاص اسی

مسئلہ تصدق میں تصریح موجود ہے۔

طحاوی میں معراج اور قہستانی سے ناقل ہیں:

التصدق علی العالم الفقیر افضل من الجاهل الفقیر۔

(طحاوی علی مراقی الفلاح مصری ص ۴۱۹)

عالم فقیر پر صدقہ کرنا جاہل فقیر پر صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔

اس عبارت سے جاہل فقراء و مساکین پر عالم کی افضلیت تو صراحتہ ثابت ہو گئی۔ اب باقی رہے طلبہ اور ملانے ان پر بھی عالم کا فضل ضمناً ثابت ہوا کہ یہ دونوں بھی بہ نسبت عالم کے جاہل کے حکم میں ہیں اب باقی رہے طلبہ تو یہ مصارف صدقات کی ساتویں قسم فی سبیل اللہ میں داخل ہیں درمختار میں فی سبیل اللہ کی تفسیر نقل کی: (وفی سبیل اللہ وهو منقطع الغزاة) وقیل الحاج وقیل طلبہ العلم۔

(شامی مصری ج ۲ ص ۶۳)

فی سبیل اللہ میں وہ لشکری محتاج ہیں کہ جہاد میں جانا چاہتا ہے اور سامان حرب پاس نہ ہو اور بعض نے کہا وہ جو حج کرنا چاہتا ہے اور خرچ نہ رکھتا ہو اور بعض نے کہا کہ طالب علم ہیں۔

ردالمحتار میں شرنبلالی سے ناقل ہیں: فالتفسیر بطالب وجیہ خصوصاً۔

(شامی مصری ج ۲ ص ۶۳)

فی سبیل اللہ کی تفسیر طالب علم کے ساتھ کرنا خصوصاً بہت وجیہ ہے۔

اور قرآن کریم نے مصارف کو بایں ترتیب بیان فرمایا ہے:

انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیہا والمؤلفۃ قلوبہم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل فریضۃ من اللہ۔ (سورہ توبہ ع ۷ ج ۱)

صدقہ تو انہیں لوگوں کے ہیں (۱) محتاج۔ (۲) اور زرے نادار۔ (۳) اور جو اسے تحصیل کر کے لائیں۔ (۴) اور جنکے دلوں کو اسلام سے الفت دی جائے۔ (۵) اور گردنیں چھڑانے میں (۶) اور قرض داروں کو۔ (۷) اور اللہ کی راہ میں۔ (۸) اور مسافر کو۔ یہ اللہ کی طرف سے فریضہ ہے۔

علامہ ابوالبرکات نفی تفسیر مدارک میں اس آیت کریمہ کے تحت میں فرماتے ہیں:

وعدل عن اللام الی فی فی الاربعۃ الاخیرہ للایذان انہم ارسخ فی استحقاق التصدق علیہم ممن سبق ذکرہ لان فی اللوعاء فیہ علی انہم احقاء بان توضع فیہم

الصدقات ویجعلوا مظنة لها وتکریر فی فی قوله فی سبیل اللہ وابن السبیل فیہ فضل وترجیح لہذان علی الرقاب والغارمیں۔ (مدارک ص ۱۰۱ ج ۲)

آخر کے چاروں مصارف میں بجائے معرف بلام کے حرف فی لایا گیا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ پہلے چاروں مصارف سے یہ اخیر کے چاروں صدقہ کے حق دار ہونے میں زیادہ راسخ ہیں کیونکہ فی ظرفیہ کے لئے ہے پس متنبہ کیا گیا کہ اخیر کے چار مصارف صدقہ دیئے جانے کے زیادہ حقدار ہیں اور انہیں اس کے لئے راجح قرار دیا جائے اور فی سبیل اللہ اور ابن سبیل میں لفظ فی دوبارہ لانے میں ان دونوں کی مکاتب اور مادیوں پر فضیلت اور ترجیح کی طرف اشارہ ہے۔

اس عبارت سے ثابت ہوا کہ آخر کے چاروں مصارف یعنی مکاتب، مادیوں، فی سبیل اللہ، مسافر، صدقہ کے لئے پہلی چاروں اقسام یعنی فقراء، مساکین، عاملین، مؤلف قلوب پر افضل اور زیادہ حق دار ہیں اور آخر کے چاروں مصارف میں فی سبیل اللہ اور مسافر کو صدقہ کے لئے مکاتب اور مادیوں پر زیادہ ترجیح اور فضیلت ہے۔

اور یہ امر ثابت ہو چکا کہ طلبا فی سبیل اللہ میں داخل ہیں تو طلباء کو فقراء و مساکین پر فضیلت حاصل ہوئی پھر طلباء کی مادیوں پر فضیلت بہت ظاہر ہے کہ طلباء کسب علم میں مشغول ہیں۔

شامی میں ہے: لا اشتغافہ من الکسب بالعلم۔

لہذا ان ملائوں سے افضل ہوئے۔ اب باقی رہے ملانے تو یہ بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہیں۔ چنانچہ علامہ شامی ہدایہ سے ناقل ہیں:

فی سبیل اللہ جمیع القرب فیدخل فیہ کل من سعی فی طاعة اللہ وسبیل الخیرات اذا کان محتاجا۔ (شامی ج ۲ ص ۶۳)

فی سبیل اللہ سے تمام نیک کام مراد ہیں تو اس میں ہر وہ شخص جو طاعت الہی اور راہ خیرات میں کوشش کرے داخل بشرطیکہ صاحب حاجت ہو۔

اسی عبارت کے اعتبار سے ملانے بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہوئے کہ وہ بھی طاعت الہی میں ساعی ہوتے ہیں۔ لہذا ان کی فضیلت بھی تقریر بالا سے فقراء و مساکین پر ثابت ہوتی۔

حاصل جواب یہ ہے کہ صدقہ میں اگر ایسا فرق کر دیا جائے کہ علما کو زیادہ دیں اور طلباء کو اس سے کم اور ملائوں کو اس سے کم اور فقراء و مساکین کو اس سے کم تو اس میں کوئی ممانعت شرعی لازم نہیں آتی۔

جیسا کہ تحقیق بالا سے ثابت ہوا جو اسے ناجائز کہے کسی دلیل سے ثابت کرے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۵۴۲)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ
تو نگر کو مردہ کا صدقہ یا خیرات لینا جائز ہے یا نہیں:-

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

صدقات واجبہ زکوٰۃ و فطرہ وغیرہ تو اغنیاء اور تو نگر کو لینا ممنوع ہے ترمذی شریف و ابوداؤد شریف دارمی شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: لا یحل الصدقۃ لغنی۔ (مشکوٰۃ شریف ص ۱۶۱)
صدقہ مالدار کے لئے حلال نہیں۔

اور مردے کے لئے صدقہ و خیرات کیا جاتا ہے ظاہر یہ ہے کہ وہ صدقہ واجبہ نہیں بلکہ صدقہ نافلہ میں داخل ہے اور صدقہ نفل تو نگر اور غنی کے لئے ممنوع نہیں اب چاہے وہ غنی ہو یا غیر عالم چنانچہ۔

جو ہرنیرہ میں ہے: ولودفع الی الغنی صدقۃ التطوع جازلہ اخذھا۔

(جو ہرنیرہ مطبوعہ مجتہبائی دہلی ص ۱۳۲)

اگر مالدار کو صدقہ نفل دیا جائے تو اسے لینا جائز بھی ہے۔

لہذا ثابت ہو گیا کہ مردے کے لئے جو صدقہ و خیرات کی جاتی ہے وہ تو نگر عالم کو لینا جائز ہے۔
واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۵۴۳)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ

مردے کی خیرات ہر شخص لے سکتا ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

جب یہ ثابت ہو چکا کہ مردے کے لئے جو صدقات کئے جاتے ہیں وہ صدقہ نافلہ ہیں اور صدقہ نافلہ فقیر و غنی ہر ایک کے لئے جائز ہے۔ البتہ اولیٰ یہ ہے کہ فقیر کو دیں اور اغنیاء اس کو نہ لیں۔

رد المحتار میں ہے: صرح فی الذخیرۃ بان فی التصدق علی الغنی نوع قرۃ دون قرۃ الفقیر۔ (رد المحتار مصری ص ۳۶۸)

ذخیرہ میں تصریح کی کہ مالدار پر صدقہ کرنا ثواب کا کام ہے مگر فقیر پر صدقہ کرنے کے ثواب سے کم۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی فتاویٰ عزیز یہ میں خاص فاتحہ کے متعلق فرماتے ہیں:

گرفاتحہ بنام بزرگی دادہ شد بس اغنیار اہم خوردن ازاں جائز است۔ از فتاویٰ عزیز یہ ص ۴۱ اگر کسی بزرگ کے نام پر فاتحہ دی گئی تو مالداروں کو بھی اس میں سے کھانا جائز ہے۔

لہذا مردے کی خیرات اور صدقات ہر ایک کے لئے جائز ہے غنی کے لئے بھی ہے مگر غنی کے لئے اولیٰ یہ ہے کہ وہ اس سے اجتناب و پرہیز کرے لیکن غنی کے دینے میں بھی ثواب ہوتا ہے۔ اگرچہ فقیر کے دینے سے کم ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۵۴۴)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ

میت کی تجہیز و تکفین کے بعد فقط اتنی رقم اور سامان ہے کہ جس سے اس کی اہلیہ اور یتیم بچوں کی گذراوقات ہو سکتی ہے اگر اس میں کم از کم بقدر حیثیت خیرات کی جائے جب بھی محتاج الی غیر ہم ہونے کا خوف ہے تو ایسی حالت میں اس کے مال متروکہ سے اس کے لئے صدقہ خیرات کریں یا کھانا کھلائیں

یہ جائز ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

سوال اول کے جواب میں آیت کریمہ اور اس کی تفاسیر سے یہ ثابت ہو چکا کہ ترکہ کی تقسیم سے پہلے غیر وارث رشتہ داروں یتیموں۔ مسکینوں کو مال میت سے کچھ بطور صدقہ اور خیرات کے دنیا مستحب ہے زمانہ صحابہ میں اس پر عمل رہا ہے۔

محدثین نے اس پر عمل کیا چنانچہ حضرت محمد بن سیرین سے مروی ہے جس کو علامہ محی السنۃ امام بغوی نے تفسیر معالم التنزیل آیت مذکورہ کے تحت میں نقل کیا: روی محمد بن سیرین ان عبیدۃ السلمانی قسم امول الیتام فامر بشاة فذبحت فصنع طعاما لاجل هذه الایۃ وقال لولا هذه

الایۃ لکان هذا من مالی۔ (حاشی خازن مصری ج ۱ ص ۴۰۴)

حضرت امام سیرین سے مروی ہے کہ حضرت عبیدہ سلمانی نے یتیموں کا مال تقسیم کرتے ہوئے ایک بکری کے ذبح کرنے کا حکم فرمایا اور فقراء کے لئے کھانا تیار ہوا بموجب اس آیت کریمہ کے اور فرمایا کہ اگر یہ آیت نہ ہوتی تو یہ میرے مال سے ہوتا۔

بالجملہ تجہیز و تکفین کے بعد اور تقسیم ترکہ سے قبل میت کے مال سے صدقات و خیرات کرنے کا استحباب آیت کریمہ سے ثابت ہوا۔ اور صحابہ کرام اور محدثین عظام کے عمل سے ثابت ہوا البتہ اس صدقہ و خیرات کی کوئی مقدار ثابت نہیں تو جتنا اس وقت مناسب حال ہو۔ اسی قدر فقراء و مساکین کو دیں یا کھانا کھلائیں۔ ہاں اگر بعض وارث نابالغ ہیں یا مال متروکہ قلیل ہو یا بعض وارث اس وقت موجود نہ ہوں اور

ان کی اجازت نہ ہو تو ان صورتوں میں ترکہ سے صدقہ و خیرات ممنوع ہے۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے آیت مذکورہ کی تفسیر میں ہے:

عن ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کان المال کثیرا یرضخ لہم وان کان قلیلا

اعتذر الیہم۔ (تفسیر احمدی مطبوعہ جدید پریس دہلی ص ۱۳)

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ اگر مال زائد ہو تو فقرا کو کچھ دیا جائے اور اگر قلیل ہو تو ان سے عذر کر دیا جائے۔

علامہ ناظر الشریعہ علی بغدادی تفسیر خازن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت نقل فرماتے ہیں:

قال ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما ان کان الورثۃ کبارا یرضخوا لہم وان کان الورثۃ صغارا اعتذر الیہم فیقول الولیٰ او الوصی انی لا املك هذا المال وانما هو للصغار

ولو كان لى منه شىء لا عطيكم وان يكبروا فسيعرفوا حقكم هذا هو القول المعروف -

(خازن مصرع اض ۴۰۴)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اگر وارث بالغ ہوں تو فقراء کو کچھ دیں اور اگر وارث نابالغ ہوں تو ان سے عذر کر دیا جائے اور ولی یا وصی یہ کہے میں اس مال کا مالک نہیں ہوں تو نابالغوں کا مال ہے اگر مجھے اس میں کچھ اختیار ہوتا تو میں تمہیں ضرور دیتا یہ بالغ ہو کر عنقریب تمہارا حق پہچان لینگے یہی وہ لفظ ہیں جن کو آیت میں قول معروف فرمایا۔

زداختار حاشیہ در مختار میں ہے:

ان كانت الورثة فقراء ولا يستغنون بما يرثون فالترك اولیٰ لمافیہ من الصدقة على القريب وقد قال عليه الصلاة والسلام افضل الصدقة على ذی الرحم الكاشح ولان فیہ رعاية حق الفقراء والقراة جميعا۔ (ردالمحتار ج ۵ ص ۴۳۱)

اگر وارث فقراء ہیں اور اپنے ترکہ کے حصوں سے مستغنی نہیں ہوں۔ فقراء کو نہ دینا بہتر ہے کہ اس میں بھی رشتہ دار پر صدقہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ افضل صدقہ ذی حاجت رشتہ دار کو دینا ہے اور اس لئے کہ رشتہ دار کو دینے میں فقر اور قرابت دونوں کے حقوق کی رعایت ہے۔

البتہ بالغ ورثہ اپنے اپنے حصہ سے یا اپنی طرف سے اپنے مال سے میت کے لئے جس قدر چاہیں صدقہ اور خیرات کر سکتے ہیں۔

شامی میں ہے: اذا جاز بعض الورثة جاز عليه بقدر حقه۔

(شامی ج ۵ ص ۴۳۰)

وذكرت فيما قبل مفصلاً واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المتخصص بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۰۵ھ

(۵۴۵)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ

بروز سوم تہلیل اور قرآن کریم کے ختم کے بعد سب شرکاء کا سوم کو اگر میت کی طرف سے بطور

خیرات لوجہ اللہ پیسے دیئے جائیں یا کچھ اور دیا جائے تو یہ فعل جائز ہے یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

بروز سوم قرآن مجید اور کلمہ شریف میت کے لئے پڑھنا باعث اجر جزیل ہے میت کے لئے قرآن مجید کا پڑھنا تو اجماع امت سے ثابت ہے کہ بلا انکار ہمیشہ سے اہل اسلام ہر زمانہ میں اموات کے لئے قرآن کریم کی تلاوت کرتے رہے۔ چنانچہ حضرت علامۃ الدہر جلال الدین سیوطی شرح الصدور میں فرماتے ہیں۔

ان المسلمین مازالوا فی کل عصر یجتمعون ویقرؤن لموتاهم من غیر نکیہ فکان ذلک اجماعاً۔ (شرح الصدور مصری ۱۳۰)

مسلمان ہمیشہ سے ہر زمانے میں بلا کسی انکار کے اپنے مردوں کے لئے جمع ہوتے اور قرآن کریم پڑھتے تو یہ اجماع ہو گیا۔

اسی طرح کلمہ شریف کا میت کے لئے پڑھنا سنت اجر جلیل اور باعث ثواب جزیل ہے۔ چنانچہ امام ابوالقاسم جیلی نے دیباچہ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی کہ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا:

اخبرنی جبریل ان لا اله الا الله انس للمسلم عند موته وفي قبره وحين يخرج من قبره۔ (شرح الصدور ص ۷۸)

مجھے جبریل امیں نے خبر دی کہ لا اله الا الله محمد رسول الله مسلمان کے لئے اس کی موت کے وقت اور اسکی قبر میں اور جس وقت وہ قبر سے اٹھے گا انس ہوگا۔

علامہ علی قاری علیہ رحمۃ الباری شرح شفاء شریف میں فرماتے ہیں:

حکى عن العارف بالله محى الدين بن عربى رحمة الله تعالى عليه انه قال بلغنى عن النبى صلى الله تعالى عليه وسلم انه من قال لا اله الا الله سبعين الف مرة غفر و كنت ذكرت هذا العدد وما عينته لاحد حتى اجتمعت فى ضيافة مع شباب مشتهر بالمكاشفة لبكى اثناء اكله فسألته عن حالة فقال ارى امى وابى يعذبان فقلت فى نفسى وهبت ثواب لتليل الجليل لميت هذا الرجل الجميل فضحك فسألته فقال ارتفع عنهما العذاب

فعرفت صحة الحديث بكشفه وصحة كشفه بثبوت الحديث واصله۔

(شرح شفاء ج ۲ ص ۳۹۹)

حضرت عارف باللہ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا مجھ تک نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی حدیث پہنچی کہ حضور نے فرمایا کہ جس نے کلمہ شریف لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ستر ہزار بار پڑھا تو اس کی مغفرت کر دی جائے گی۔ میں نے اتنی مقدار کلمہ شریف پڑھا اور کسی خاص شخص کو نہیں بخشا یہاں تک کہ میں ایک دعوت میں اس نوجوان کے ساتھ جمع ہوا جو مکاشفہ میں مشہور تھا وہ کھاتے کھاتے رونے لگا۔ میں نے اس سے اس کا حال دریافت کیا اس نے جواب دیا کہ اپنے ماں باپ کو عذاب میں دیکھ رہا ہوں تو میں نے اپنے دل ہی دل میں اس کلمہ شریف کا ثواب اس نیک جوان کے ماں باپ کو بخش دیا تو وہ نوجوان ہنسنے لگا میں نے اس سے اس کا سبب دریافت کیا اس نوجوان نے کہا کہ دونوں سے عذاب اٹھ گیا پس میں نے اس حدیث کی صحت کو اس کے کشف سے پہچانا اور اس کے کشف کی صحت کو حدیث کے ثبوت و اصل سے جانا۔

بالجملہ قرآن کریم اور کلمہ شریف میت کے لئے نہایت ہی نافع چیز ہے اسی لئے بروز سوم یہ اہل اسلام کا معمول قرار پایا۔ باقی رہا اہل اسلام میت کا قرآن و کلمہ خوان کو کچھ دینا تو اگر دینے والا بغرض اجرت دے اور لینے والا بھی بخیاں اجرت لے رہا ہے تو نہ ایسی اجرت جائز نہ میت کو اس سے ثواب پہنچے اور لینے دینے والا دونوں گنہگار۔

چنانچہ علامہ شامی عینی شرح ہدایہ سے ناقل ہیں:

ويمنع القاری للدين والاحذ والمعطى اثمان فالاحاصل ان ماشاع فى زماننا من قراءة الا جزاء بالاجر لا يجوز۔

(رد المحتار ج ۵ ص ۳۶)

قرآن خواں کو بغرض دنیا قرآن پڑھنا ممنوع ہے لینے والا اور دینے والا دونوں گنہگار ہیں حاصل کلام یہ ہے کہ ہمارے زمانہ میں جو پاروں کا اجرت پر پڑھنا رائج ہے یہ جائز نہیں۔

اسی میں حضرت شیخ الاسلام امام تقی الدین کا قول منقول ہے:

ولا يصح الاستيجار على القراءة واهدائها الى الميت لانه لم ينقل عن احد من الائمة الاذن فى ذلك وقد قال العلماء ان القارى اذا قرأ لاجل المال فلا ثواب له فای شیء بهدية الى الميت وانما يصل الى الميت العمل الصالح والاستيجار على مجرد التلاوة لم

بقول به احد من الائمة وانما تتازعوا فى الاستيجار على التعليم۔ (رد المحتار مصری ج ۵ ص ۳۷)

قرآن پڑھنے پر اجرت لینا اور اسے میت کو ہدیہ کرنا صحیح نہیں کیونکہ اس میں ائمہ سے کسی امام سے بھی اجازت منقول نہیں اور فقہاء نے فرمایا کہ جب قرآن خواں نے مال کے لئے پڑھا تو اسے ثواب نہیں ملتا پس وہ میت کی طرف کس چیز کا ہدیہ کرتا ہے اور میت کو صرف نیک عمل پہنچتا ہے اور صرف قرآن پڑھنے پر اجرت لینا اس کا ائمہ میں سے کوئی قائل نہیں اور ائمہ کا اختلاف تعلیم قرآن پر اجرت لینے کے متعلق ہے۔

یہ حکم تو اس صورت میں ہے جب ان میں اجرت طے ہو جائے اور دام ٹھرجائیں اور اگر نہ اس میں اجرت طے ہوئی اور نہ کوئی گفتگو آئی لیکن وہاں کے عرف و رواج میں دینے والا اسی نیت سے دیتا ہے اور پڑھنے والا اسی نیت سے پڑھتا ہے اور بعد ختم دینے لینے کا دستور ہے تو اس صورت کا بھی بعینہ وہی حکم ہے جو صورت اول مذکور ہوئی۔ فقہائے کرام کا مشہور قاعدہ ہے۔ المعروف كالمشروط۔

(شامی ج ۵ ص ۳۶)

اور اگر پڑھنے والا بہ نیت ثواب پڑھتا ہے اور اہل میت لوجہ اللہ بطور صدقہ دیتے ہیں تو یہ صورت جائز ہے اس میں نہ دینے والے کے لئے کوئی قباحت نہ لینے والے کو ممانعت اور میت کے لئے باعث اجر و ثواب ہے۔

علامہ ابراہیم حلبی کبیری میں فتاویٰ بزازیہ سے ناقل ہیں:

وان اتخذوا طعاما للفقراء كان حسنا۔ (کبیری مطبوعہ لکھنؤ ص ۵۶۵)

اگر اہل میت فقراء کے لئے کھانا تیار کریں تو بہتر ہے۔

بالجملہ صورت مسئلہ کا مختصر الفاظ میں یہ جواب ہے کہ شرکاء سوم کو بلا لحاظ اجرت مشروط و معروف کے بطور خیرات لوجہ اللہ کھانا کھلانا یا پیسے دینا یا کچھ اور چیز دینا جائز و درست ہے نہ اس میں اہل میت پر کچھ مواخذہ نہ شرکاء سوم پر کچھ معاقبہ نہ اس میں شان مواجرہ نہ میت کے لئے اہداء ثواب میں کچھ مضائقہ نہ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،

العب محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۵۴۶)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ

دام ٹھرا کر چند شخصوں کو قرآن خوانی کے لئے مقرر کرنا چاروں روز برابر اجرت ملے کر کے قبر پر اس طرح پڑھوانا کہ کوئی شخص رات میں پڑھے کوئی دن میں پڑھے یہ شرعاً جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

قبر پر قرآن کریم دام ٹھرا کر پڑھنا اور پڑھوانا جائز ہے جیسا کہ جواب سابق میں گذرا۔

نیز شامی میں ہے کہ علامہ خیر الدین ربلی نے حاشیہ بحر میں فرمایا ہے:

اقول المفتی بہ جواز الاخذ استحساناً علی تعلیم القرآن لا علی القراءة المجردة كما صرح به فی التاتارخانیة حیث قال لا معنی لهذه الوصیة ولصلة القاری بقراءته وهی بدعة ولم یفعلها احد من الخساء وقد ذكرنا مسألة تعلیم القرآن علی استحسان اه معنی للضرورة ولا ضرورة فی الاستیجار علی القراءة علی القبر۔ (ردالمحتار مصری ج ۵ ص ۳۶)

میں کہتا ہوں کہ مفتی بہ قول تعلیم قرآن پر اجرت لینے کا جواز استحسان ہے صرف قرآن پڑھنے پر اجرت لینا جائز نہیں جیسے کہ تاتارخانیہ میں اس کی تصریح کی فرمایا کہ قرآن پڑھنے کی وصیت اور قرآن خواں کی تلاوت پر اجرت کے کوئی معنی نہیں اس لئے کہ یہ دینا بمنزلہ اجرت کے ہیں کہ اس میں اجارہ باطل ہے اور یہ بدعت ہے اس کو خلفاء میں سے کسی نے نہیں کیا اور ہم نے جو مسئلہ تعلیم قرآن کی اجرت واستحسان کا ذکر کیا تو وہ ضرورت کے لئے ہے اور قبر پر قرآن پڑھنے کی اجرت میں کوئی ضرورت نہیں۔

ردالمحتار حاشیہ در مختار میں ہے:

انما اجازوه فی محل الضرورة كالاستیجار لتعلیم القرآن او الفقه او الاذان او الامامة خشية التعطيل لقله رغبة الناس فی الخیر ولا ضرورة فی استیجار شخص یقرء علی القبر او غیره اه رحمتهی اقول هذا هو الصواب وقد اخطاء فی مسألة جماعة ظنا منهم ان المفتی به عند المتأخرین جواز الاستیجار علی جمیع الطاعات۔ (ردالمحتار ص ۲۵۷)

نیکیوں پر اجرت کی جو فقہاء نے اجازت دی ہے وہ صرف محل ضرورت میں ہے جیسے تعلیم قرآن یا فقہ یا اذان یا امامت کی اجرت لینا یہ بخوف معطل ہونے کے ہے کہ لوگوں کو جس کی طرف رغبت کم ہے قبر یا غیر قبر کسی شخص کے پڑھنے پر اجرت لینے میں کوئی ضرورت نہیں (رحمتی)

میں کہتا ہوں کہ یہ بھی قول درست ہے اور اس مسئلہ میں ایک جماعت نے اس گمان پر خطا کی

ہے کہ متأخرین کے نزدیک مفتی بہ قول تمام نیکیوں پر اجرت لینے کا جواز ہے۔

باقی اس کی ایک یہ صورت ہو سکتی ہے کہ حفاظ کو اپنے کاموں کے لئے ملازم رکھے اور ایک وقت ان سے یہ کام بھی لے لے۔ کما لا یخفی لمن یطالع کتب الفقہ۔

بلا اجرت مشروط و معروف کے قرآن مجید کا پڑھنا جائز ہے صحابہ کرام کے عمل سے ثابت ہے۔ چنانچہ خاتم المحققین حضرت علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے شرح الصدور میں جامع خلال سے روایت نقل فرمائی ہے:

عن الشعبي قال كانت الانصار اذ مات لهم المیت اختلفوا الی قبره یقرؤن له القرآن (شرح الصدور ص ۱۳۰)

امام شعبی سے مروی ہے کہ انصار میں سے جب کوئی مرجاتا تو اس کی قبر کی طرف جاتے اور اس کے لئے قرآن کریم پڑھتے۔

علامہ حسن شرنبلالی نور الایضاح میں فرماتے ہیں: لایکره الجلوس للقراءة علی القبر فی المختار۔ (نور الایضاح ص ۶۶)

مذہب مختار میں قبر پر قرآن پڑھنے کے لئے بیٹھنا مکروہ نہیں۔

علامہ ابراہیم غنیۃ المستملی میں فرماتے ہیں:

واختلفوا فی اجلاس القارئین لیقرأوا عند القبر والمختار عدم الكراهة۔

(غنیۃ لکھنؤ ص ۵۶۲)

قبر پر قرآن پڑھنے کے لئے قرآن خواں کے بٹھانے میں فقہاء نے اختلاف کیا ہے اور مذہب مختار عدم کراہت ہے۔

علامہ محمد علاء الدین ہسکفی در مختار میں فرماتے ہیں:

لایکره الدفن لیلاً ولا اجلاس القارئین عند القبر هو المختار۔

(شامی ج ۱ ص ۶۳۳)

میت کا رات میں دفن کرنا اور اس کی قبر کے پاس قرآن پڑھنے والوں کا بٹھانا مذہب مختار میں مکروہ نہیں۔

حاصل جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کا قبر پر پڑھنا یا پڑھوانا ممنوع نہیں یہ تو ایسا ہے جو صحابہ کرام

رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا معمول ہے ہاں ممنوع اس نیک کام پر اجرت طے کرنا ہے اور دام ٹھکانا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۵۴۷)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع اس مسئلہ میں کہ
تین ماہ بغرض جلسہ میلاد شریف یوم سوم وغیرہ بغرض ایصال ثواب موتے قولاً یا فعلاً رسول اللہ
یا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے باسناد صحیحہ سے ثابت ہے یا نہیں؟ اگر ثابت ہے تو حوالہ
کتب مع صفحہ کے تحریر فرمائیے، اور اگر ثابت نہیں تو بدعت ہے یا نہیں؟ اگر بدعت ہے تو مرتکب بدعت کا
کیا حکم ہے؟ اور اگر بدعت نہیں تو بدعت کی شرعاً کیا تعریف ہے؟ مقصود سائل جواب مختصر ہے۔

بنیوا تو جروا

الجواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

وہابیہ نے میلاد شریف فاتحہ سوم عرس و گیارہویں شریف وغیرہ امور مستحبہ کے انکار میں جس قدر
کوششیں کی ہیں اتنی کسی حرام و مکروہ بلکہ کسی شعار کفریہ کے لئے بھی نہیں کیں۔ لیکن ان کی انتہائی کوششیں
ان امور کے استحباب کو نہ میٹ سکیں اور ان کو ناجائز و حرام نہ کر سکیں۔ ہمیشہ اہلسنت نے ان کی فریب
کاریوں کا پردہ فاش کیا اور ان کے لغو اور بیہودہ اعتراضات کے ایسے دندان شکن جوابات دیئے جنہیں
آج تک وہابیہ کو ایک حرف لکھنے کی جرات نہ ہو سکی۔ چنانچہ خود میری کتاب سبیل الرشاد میں اور میلاد
شریف فاتحہ سوم عرس گیارہویں شریف کے جواز و استحباب پر بکثرت دلائل اور منکرین کے کلمات
کے مسکت جوابات طبع ہو چکے ہیں اور یہ کتاب ہزاروں کی تعداد میں ہندوستان کے ہر ایک گوشہ گوشہ میں
موجود ہے مگر کسی وہابی نے آج تک اس کے جواب کی ہمت نہ کی میلاد شریف کی اصل یعنی واقعات
پیدائش کے مسائل معجزات مسلمانوں کی مجلس میں بیان کرنا خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فعل سے
ثابت ہے۔

عن واثلہ قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم: ان اللہ اصطفیٰ من ولد
ابراہیم اسمعیل واصطفیٰ من ولد اسمعیل بنو کنانہ واصطفیٰ من بنی کنانہ قریشا
واصفیٰ من قریش بنی ہاشم واصطفانی من بنی ہاشم۔

(شرح شفاء وترندی و مسلم ص ۱۹۸)

حضرت واثلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیم (علیہ السلام) سے اسمعیل (علیہ السلام) کو منتخب کیا اور اولاد اسمعیل (علیہ
السلام) سے بنی کنانہ کو منتخب کیا اور بنی کنانہ سے قریش کو منتخب کیا اور قریش سے بنی ہاشم کو منتخب کیا اور بنی
ہاشم سے مجھے منتخب فرمایا۔

وعن العباس انہ جاء الی النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فکانہ سمع شیثا فقام
النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فقال من انا فقالوا انت رسول اللہ قال انا محمد بن عبد اللہ
بن عبد المطلب ان اللہ خلق الخلق فجعلنی فی خیرہم ثم جعلہم فرقتین فجعلنی فی
خیرہم فرقة ثم جعلہم قبائل فجعلنی فی خیرہم قبيلة ثم جعلہم بیوتا فجعلنی فی خیرہم
بیتا فانا خیرہم نفسا وخیرہم بیتا۔ (رواہ الترمذی، مشکوٰۃ شریف ص ۵۱۳)

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی
خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے نسب شریف پر اعتراض سنا تھا تو حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ
وسلم نے ممبر پر قیام کیا اور فرمایا میں کون ہوں صحابہ نے عرض کیا آپ رسول اللہ ہیں۔ فرمایا میں ابن عبد اللہ
بن عبد المطلب ہوں اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی پیدائش کی اور مجھے خیر المخلوق کیا پھر ان کے دو گروہ کئے تو مجھے
ان کے بہتر فرقہ میں پیدا کیا پھر انہیں قبیلہ قبیلہ کیا تو مجھے ان کے بہتر قبیلہ میں مخلوق کیا۔ پھر اس کو خاندان
کیا تو مجھے ان کے بہتر خاندان میں کیا پس میں باعتبار ذات کے بہترین بنی آدم ہوں اور باعتبار خاندان
کے خیر البشر ہوں۔

اسی طرح سوم و فاتحہ کی اصل یعنی ایصال ثواب بھی خود حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے
قول و فعل سے ثابت ہے چنانچہ طبرانی اوسط میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی
کہ انہوں نے سرکار رسالت میں عرض کیا!

یا رسول اللہ توفیت امی ولم توص ولم تصدق فهل ینفعها ان تصدقت عنها قال

نعم ولو بکراع شاة محرق۔

(شرح الصدور مصری ص ۱۲۹)

یا رسول اللہ میری والدہ وفات پا گئیں، انہوں نے نہ صدقہ کی وصیت کی نہ خود صدقہ دیا۔ اگر میں ان کی طرف سے صدقہ دوں تو کیا انہیں نفع دیگا؟ فرمایا: ہاں نفع دیگا اگر چہ بکری کے جلے ہوئے پائے ہی ہوں۔

طبرانی نے اوسط میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے سنا۔

ما من اهل میت يموت منهم ميت فيتصدقون عنه بعد موته على احلاها له جبرئيل على طبق من نور ثم يقف على شفير القبر فيقول يا صاحب القبر العميق هذه هدية اهداها اليك اهلك فاقبلها فتدخل عليه فيفرح بها ويستبشر ويحزن جيرانه الذين لا يهدى اليه شيئا۔

(شرح الصدور مصری ص ۱۲۹)

اہل میت سے جو اپنی میت کی جانب سے اس کے مرنے کے بعد صدقہ کریں تو جبریل امین نور کے طبق میں وہ ہدیہ لے جاتے ہیں اور کنارہ قبر پر کھڑے ہو کر فرماتے ہیں اے گہرے گڑھے والے یہ ہدیہ ہے جسے تیرے اہل نے تیری طرف بھیجا ہے تو اسے قبول کر تو وہ اس پر داخل ہوتا ہے پس وہ اس کی وجہ سے خوش ہوتا ہے اور بشارت حاصل کرتا ہے اور اس کے وہ پڑوسی جن کی طرف کوئی چیز نہیں بھیجی گئی رنجیدہ ہوتے ہیں۔

اب باقی رہی میلاد شریف وسوم فاتحہ کی قیودات و تخصیصات و تعینات و اہتمامات وہ اسی طرح ہیں جس طرح مدرسہ کی اصل یعنی تعلیم حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل سے ثابت ہے اور مدرسہ کے تعینات و تخصیصات۔ قیودات و اہتمامات یعنی تعلیم کے لئے مخصوص کتابیں مقرر کرنا فلسفہ و منطق اور معانی وغیرہ کا داخل کرنا درجہ بندیاں کرنا۔ ہر درجہ کے لئے مستقل استاد مقرر کرنا۔ ہر کتاب کے لئے گھنٹے مقرر کرنا۔ جمعہ عیدین رمضان المبارک کے ایام کو تعطیل کے لئے مقرر کرنا۔ ماہ شعبان کو امتحان کے لئے مقرر کرنا۔ خاص نصاب ختم ہونے پر سند دینا۔ دستار بندی کرنا۔ اور تقسیم اسناد دستار بندی کے لئے جلسہ کی تاریخیں مقرر کرنا۔ اشتہار چھاپنا۔ بذریعہ خطوط تداعی کرنا۔ مخصوص علماء کو بلانا۔ بلائے ہوئے علماء کو کرائے دینا جلسوں کے لئے پروگرام معین کرنا۔ بہت سے ہاتھوں سے طلباء کے سروں پر دستار باندھنا۔ جلسے گاہ کو مزین کرنا۔ اس میں روشنی کرنا۔ شامیانے لگانا مدرسہ کے لئے مخصوص عمارت بنانا۔

دار الحدیث اور دارالاقامہ کے لئے علیحدہ عمارت مخصوص کرنا۔ دینی تعلیم پر مدرسین کو معین تنخواہ دینا۔ بخاری شریف کے ختم پر مٹھائی تقسیم کرنا۔ یہ ساری باتیں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل سے ثابت نہیں تو میلاد شریف اور سوم وغیرہ کے منکرین مدرسہ کی ان تخصیصات و قیودات و تعینات و اہتمامات کی بنا پر کیا مدرسہ کو بدعت گمراہی قرار دیں گے اور بانیان مدرسہ پر مرتکب بدعت اور گمراہ و بیدین ہونے کے فتویٰ صادر کریں گے اگر نہ کہیں گے تو مدرسہ کی ساری تخصیصات و تعینات و قیودات و اہتمامات کو حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قول و فعل سے باسناد صحیحہ ثابت کریں لیکن انشاء اللہ تعالیٰ وہ قیامت تک ثابت نہیں کر سکیں گے تو کس منہ سے میلاد شریف کے تعینات و تخصیصات پر اعتراضات کرتے ہیں اور عوام مسلمین کو مغالطہ و فریب دیتے ہیں اب میں وہابیہ کے لئے خود ان کے امام الطائفہ مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی کا فتویٰ پیش کرتا ہوں چنانچہ فتاویٰ رشیدیہ حصہ اول ص ۱۰ پر ہے۔

سوال پچیسواں: صوفیائے کرام کے یہاں جو اکثر اشغال اور اذکار مثل رگ کیماس کا پکڑنا کرنا اور ذکرارہ اور حلقہ پر قبور نہیں بلکہ ویسے ہی اور جس دم وغیرہ جو قرون ثلثہ سے ثابت نہیں بدعت ہے یا نہیں؟

جواب: اشغال صوفیہ بطور معالجہ کے ہیں سب کی اصل نصوص سے ثابت ہے جیسا اصل علاج ثابت ہے مگر شریعت بنفشہ حدیث صریح سے ثابت نہیں ایسا ہی سب اذکار کی اصل ثابت ہے جیسا توپ بندوق کی اصل ثابت ہے اگرچہ اس وقت نہ تھی سو یہ بدعت نہیں ہاں ان بینات کو سنت ضروری خاصہ جاننا بدعت ہے اور اس کو علماء نے بدعت لکھا ہے۔

گنگوہی صاحب نے اس جواب میں نہایت واضح الفاظ میں فرمایا کہ اشغال صوفیہ ان تخصیصات و تعینات کے ساتھ قرون ثلثہ میں نہیں تھے مگر چونکہ ان کی اصل نصوص سے ثابت ہو رہی ہے تو ان کو محض ان تخصیصات و قیودات کی بنا پر بدعت مان کر انہیں بدعت سے خارج کر کے اس قاعدہ کو اور واضح کر دیا لہذا اسی طرح میلاد شریف وسوم وغیرہ کی اصلیں چونکہ نصوص سے ثابت ہیں تو محض تخصیصات و تعینات کی بنا پر میلاد شریف وسوم وغیرہ کو باقرار گنگوہی صاحب کے بدعت نہیں کہہ سکتے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۵۴۸)

کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین نسبت مسائل کے حوالہ جات قرآن و احادیث سے جواب عنایت فرمایا جائے

بعض اضلاع میں میت کو دفن کرتے وقت قبر میں قل ھو اللہ پڑھ کر دم کر کے مٹی مردے کے سر ہانے ڈالتے ہیں اور بعد دفن اذان پڑھتے ہیں کیا شرعیہ دونوں جائز ہیں؟

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

یہ دونوں فعل جائز ہیں۔ قل ھو اللہ شریف پڑھ کر میت کے لئے ایصال ثواب کرتے ہیں اور اس پر مٹی کو گواہ بنا دیتے ہیں کوئی محدث شرعی لازم نہیں آیا لہذا اس کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی اور اذان سے میت کو چند فائدے ہوتے ہیں کہ شیطان جب قبر میں اگر مردوں کو دھوکہ دیتا ہے تو اذان کی وجہ سے اس کو شر شیطان سے پناہ حاصل ہو جاتی ہے اور نیز اذان کی وجہ سے دفع وحشت قبر سے ہو جاتی ہے و نیز اذان کی وجہ سے غم و حصول سرور فرحت حاصل ہو گئی جب احادیث سے مستفاد ہے تو اذان علی القبر کے ناجائز ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی لہذا یہ دونوں امور جائز و موجب اجر و ثواب ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ، المتوسل بالنبی المرسل العبد الارذل محمد اول بن المفتی مولینا الحاج محمد اجمل

نائب مفتی اجمل العلوم فی بلدة سنجل یکم جمادی الاخرہ ۱۳۷۷ھ

ھذا الجواب صحیح محمد اجمل غفر اللہ عز وجل سنجل

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،

العبد محمد اجمل غفر لہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدة سنجل

(۵۴۹)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں

عرض یہ ہے کہ میت کے وارث قرآن مجید کا واسطے کفارہ گناہوں کے کراتے ہیں وراور کچھ رقم نقد اور گندم وغیرہ ایک تھیلی میں ڈال کر اور ساتھ لیکر میت کے کفارہ میں دیتے ہیں اور اس کے گناہ فرض واجب وغیرہ دینے والے کو سنا تے ہیں اور وسیلہ قرآن پاک کا کر کے دیتے ہیں اور بعض لوگ صرف رقم ہدیہ کر کے دیتے ہیں۔ بعض لوگ صرف کلام پاک ہی کفارہ میں دیتے ہیں تو چند علماء اس کو ناجائز اور

بدعت کہتے ہیں اور علم فقہ کے مسائل کو نہیں مانتے اور یہ کہتے ہیں کہ علم فقہ کیا چیز ہے ہم اس کو نہیں مانتے آیا یہ علم فقہ قابل اعتبار ہے یا نہیں اس پر عمل کرنا کیسا ہے اور یہ اسقاط کا طریقہ کہاں سے شروع ہوا ہے اور اسقاط کرنے کا ثبوت قرآن حدیث سے ہے یا نہیں مفصل تحریر فرمادیں اس عبارت میں اگر کوئی غلطی ہو تو معاف فرما کر اصلاح فرمائی جائے۔

السائل عمر الدین جی لوہار پورہ ناگور مارواڑ

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

اسقاط کا یہ طریقہ بالکل ناکافی اور بے اصل ہے تو قرآن و حدیث سے کیسے ثابت ہو سکتا ہے اس کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ دین سے ناواقف اور جاہل لوگوں نے محض اپنی منفعت اور غرض حاصل کرنے کے لئے اپنے دل سے گڑھ لیا ہے دیندار آدمی کم از کم اتنا جانتا ہے کہ ہر روزے ہر وقت کی نماز کے بدلے میں ساڑھے تین سیر جو یا پونے دو سیر گندم یا آٹا یا ان کی قیمت میت کی طرف سے اگر ادا کی جائے تو صرف اس کی نمازوں کا فریضہ ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے۔ چہ جائیکہ اس کے عمر بھر کے فرائض و واجبات صرف کلام پاک کے دینے یا رقم دیدینے سے ادا ہو سکتی ہے لہذا ثابت ہو گیا کہ یہ طریقہ اسقاط بالکل جاہلانہ طریقہ ہے۔

علم فقہ شریعت کے فروعی و تفصیلی احکام و مسائل کے جاننے کا نام ہے جو قرآن و حدیث اور اجماع و قیاس چاروں دلائل شرع میں سے کسی ایک دلیل سے ثابت ہوتے ہیں۔ تو علم فقہ کا انکار کرنا اور نہ ماننا گویا قرآن و حدیث کا انکار کرنا اور نہ ماننا ہے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔ واللہ تعالیٰ اعلم

۱۴ محرم الحرام ۱۳۷۸ھ

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،

العبد محمد اجمل غفر لہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدة سنجل

(۵۵۰)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مسائل ذیل میں

(۱) قرآن پاک کی تلاوت بغیر فہم معانی موجب اجر و ثواب ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کیا کسی امام نے ائمہ حنفیہ میں سے اس کی صراحت کسی اپنی کتاب میں کی ہے؟ یا کسی فقیہ حنفی نے؟ کوئی

کتاب میں کس باب میں؟

(۲) زید نے اپنی تمام عمر میں کسی عمل خیر کا ثواب کسی میت کو نہیں بخشا اور نہ تلاوت کا، درود شریف ہمیشہ پڑھتا ہے اور میتوں کے لئے سلام اور دعائے استغفار کرتا ہے۔ تو کیا زید گنہگار ہے؟ اور بروز قیامت اس سے موسا خذہ ہوگا؟

(۳) کسی عمل خیر کا ثواب عامل کے بخشدینے سے غیر عامل کو ملتا ہے اور اور وہ غیر عامل اس ثواب کا مستحق ہو جاتا ہے؟ اس کی صراحت امام ابو حنیفہ یا امام ابو یوسف یا امام محمد یا امام زفر نے اپنی کسی کتاب میں کی ہے یا نہیں؟ اگر کی ہے تو کس کتاب میں، کونسے باب میں؟ سوال صرف ائمہ کی کتاب کا ہے، جوابات صرف ائمہ و فقہا حنفیہ کے اقوال سے دیا جائے۔ بنو اتو جرو ایوم الحساب بارک اللہ لنا ولکم فی الدنیا والآخرہ۔

المستفتی حکیم محمد ایوب بقلم خود محلہ دیپا سراے بلدہ سنجل۔ ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۶۲ھ ضلع مراد آباد

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

شریعت کے وہ مشہور مسائل جو ہر مسلم کی نوک زبان پر ہیں جنہیں گاؤں کے رہنے والے ناخواندہ لوگ بھی خوب جانتے ہیں لیکن مسائل کو باوجود ادعاء علم کے آج ان مسائل میں شک و تردد واقع ہو رہا ہے، نہیں نہیں بلکہ ان کی مخالفت اور انکا کرنے کا ان کو ہیضہ ہو گیا ہے، لطفہ یہ ہے کہ مسائل ان مسائل میں صرف مسائل ہی نہیں ہے بلکہ مدعی ہے اور اپنے دلائل رکھتا ہے مگر چونکہ اپنے استدلال کی کمزوریاں وہ خوب اچھی طرح جانتا ہے اسلئے وہ مدعی کی شکل میں نہیں آسکا اور مسائل کی صورت میں پیش ہوا۔

پھر اگر سوالات ہی کرنے تھے تو ان کے لئے سوالات ہی کا انداز اختیار کیا جاتا اور مذہب کی معتبر مستند کتابوں کی عبارت کا مطالبہ ہوتا۔ اور اس میں یہ پابندی نہ ہوتی کہ سوال صرف ائمہ کی کتاب کا ہے۔ لیکن جب مسائل نے اپنی حد سے تجاوز کر کے اپنی مناظرانہ شان کا بھی اظہار کیا تو ہمیں بھی مجبوراً اسی میدان کو اختیار کرنا پڑا۔ اور ابتدائے جوابات میں مناظرانہ شان کو پیش کرنا ضروری ہو گیا۔

لہذا اسائل پہلے تو یہ بتائے کہ علم عقائد اور علم فقہ کا ایک ہی موضوع ہے یا ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ موضوع ہے؟

اگر ایک ہی موضوع ہے تو یہ دو علم کیوں کہلاتے ہیں؟

اور وہ ایک موضوع کیا ہے؟

اور اگر ہر ایک کا موضوع علیحدہ ہے تو کیا فقہ کے مسائل کا کتب عقائد سے اور عقائد کے مسائل کا کتب فقہ سے مطالبہ جہل یا فریب نہیں؟

نیز یہ بھی بنائے کہ عقائد و فقہ کے ایک ہی ائمہ ہیں یا ہر ایک کے علیحدہ علیحدہ؟

اگر ایک ہی ہیں تو وہ کون کون ہیں اور اگر ہر ایک کے علیحدہ ہیں تو فقہ کے کس قدر ہیں اور ان کے کیا کیا اسماء ہیں؟

اور عقائد کے کتنے ہیں اور ان کے کیا کیا نام ہیں؟

اور یہ بھی ظاہر کیجئے کہ ائمہ عقائد و ائمہ فقہ کے اختلافوں کا کیا معیار ہے؟

اور بصورت اختلاف کس امام کے قول کو اختیار کیا جائے اور صواب کو خطا سے کس طرح ممتاز کیا جائے؟

اور صراحت قول امام کی کیا حد ہے؟

اور یہ بھی صاف طور پر واضح کر دیجئے کہ آپ کے سوالات فقہ کے تحت داخل ہیں یا نہیں؟

اگر آپ کہیں نہیں تو ان کے لئے ائمہ حنفیہ اور کتب فقہ حنفی سے نقول طلب کرنا آپ کا دجل و فریب یا جہل و نادانی ہوگا یا نہیں؟

اور اگر آپ کہیں کہ ہیں تو اس کو ثابت کیجئے؟

اور ائمہ حنفیہ اور کتب حنفیہ سے اپنے دعویٰ کی تائید میں عبارات پیش کیجئے۔ نیز آپ کا ایک مطالبہ تو یہ ہے کہ سوال صرف ائمہ کی کتاب کا ہو، دوسرا اس کے بعد یہ ہے کہ جوابات صرف ائمہ و فقہاء حنفیہ کے اقوال سے کیا جائے۔ ان دونوں عبارتوں کو ملا کر دریافت طلب امور یہ ہیں کہ جب سوال صرف ائمہ کی کتاب کا ہے تو جواب میں ائمہ کا قول بلا ان کی کتاب کے کیسے مطالبہ پورا کر دیگا، اور جس کتاب میں وہ قول ائمہ ہو تو کیا وہ کتاب ائمہ کی کتاب کا افادہ کریگی۔ اسی طرح جب سوال ائمہ کی کتاب کا ہے تو فقہائے حنفیہ کا قول کیا قول ائمہ ہو جائیگا اور فقہائے حنفیہ کے اقوال کی کتاب کیا ائمہ کی کتاب ہو جائیگی۔ تو اب اپنی ان عبارات کا مفہوم بیان کیجئے، پھر ثبوت کیلئے اقوال ائمہ اور فقہائے حنفیہ پر حصر کر دینا کس بنا پر ہے؟ کیا قرآن و حدیث اور اقوال مفسرین و محدثین اور اقوال سلف و خلف آپ کے نزدیک قابل

استدلال و حجت نہیں؟۔ اگر ہیں تو ان کو کس لئے ذکر نہیں کیا؟۔ اس کی معقول وجہ پیش کیجئے۔ علاوہ بریں بلا کسی آیت و حدیث کے صرف ائمہ اور فقہائے حنفیہ کے اقوال کیا آپ کے نزدیک قابل عمل اور لائق اتباع ہیں؟۔ اگر ہیں تو جو اسے شرک کہے تو آپ اسے گمراہ جانتے ہیں یا نہیں؟۔

یہ چند استفسار تو سوالات کی بنیادی ساخت پر ہیں۔ اب اپنے سوالات کے جوابات سنئے۔

جواب سوال اول

اس سوال میں بھی چند باتیں قابل استفسار ہیں

(۱) تلاوت قرآن کی جامع مانع تعریف کیا ہے؟۔

(۲) تلاوت قرآن کے ثواب کے لئے فہم معنی کا ضروری ہونا کس معتبر و مستند کتاب سے ثابت ہے؟۔

(۳) احادیث میں جو تلاوت پر ثواب کا ترتیب بیان کیا گیا ہے اس پر فہم معنی کی زیادتی کس نص سے ثابت ہے؟۔

(۴) ائمہ حنفیہ کے نزدیک مطلق کو اپنے اطلاق پر رکھا جاتا ہے یا نہیں؟۔

(۵) ایسے عوام جو معنی نہ سمجھتے ہوں کیا انہیں تلاوت قرآن کرنا عبث و بیکار ہے؟۔

(۶) ایسے عوام کو قرآن کریم کا سیکھنا سکھانا کیا حکم رکھتا ہے؟۔

(۷) قرآن کریم کے فہم معنی کیلئے کس قدر علوم سے واقف ہونا ضروری ہے؟۔

(۸) تلاوت قرآن کے ثواب مرتب ہونے کیلئے معنی کا کس حد تک حاصل ہونا ضروری ہے۔

یہ چند امور تو وہ ہیں جن کا حل کرنا بذمہ سائل ہے۔

اب رہا سوال کا اصل جواب وہ اس تفصیل سے ظاہر ہے۔

اقول: قرآن کریم کا فقط دیکھنا بھی موجب اجر و ثواب ہے۔ چنانچہ علامہ جلال الدین سیوطی

اتقان فی علوم القرآن میں فرماتے ہیں:

(مسئلہ) القراءة فی المصحف افضل من القراءة من حفظه لان النظر فيه عبادة مطلوبة

بقول النوى هكذا قال اصحابنا والسلف ايضا ولم ارفيه خلافا۔

(اتقان مصری ص ۱۰۸ ج ۱)

پھر علامہ موصوف نے اس کی تائید میں چند احادیث نقل فرمائیں:-

اخرجه الطبرانی والبيهقي في الشعب من حديث اوس الثقفي مرفوعا۔ قراءة الرجل في غير المصحف الف درجة وقراءته في المصحف تضاعف القى درجة واخرجه ابو عبيد بسند صحيح فضل قراءة القرآن نظرا على ما يقرؤه ظاهرا كفضل الفريضة على النافلة واخرج بسند حسن عن ابن مسعود موقوفا اديموا النظر في المصحف۔

اسی طرح قرآن کریم کا چھونا اور اٹھانا بھی موجب اجر و ثواب ہے۔

چنانچہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعة اللمعات میں حدیث حضرت اوس کے ان الفاظ وقرآته فی المصحف تضاعف علی ذالك الى الفی درجة۔ کے تحت میں فرماتے ہیں۔

و ثواب خواندن در مصحف زیاده کرده میشود بر ثواب خواندن از بر تاد و ہزار درجہ از جہت زیارت کر دن مصحف و مساس کردن و برداشتن آن و بہ تحقیق وارد شدہ است کہ نظر کردن در مصحف عبادت است (اشعة اللمعات ص ۱۴۱ ج ۲)

لہذا جب قرآن کریم کا صرف دیکھنا۔ چھونا۔ اٹھانا موجب اجر و ثواب ہے تو اس کی تلاوت کیونکر موجب اجر و ثواب نہ ہوگی۔

علامہ جلال الدین سیوطی اتقان فی علوم القرآن میں تلاوت قرآن کو بہ ترتیل پڑھنے کے استحباب کے بیان میں فرماتے ہیں:

ويستحب للاعجمي الذي لا يفهم معناه۔ (اتقان ص ۱۰۶ ج ۱)

اس عبارت میں صاف تصریح ہے کہ جو عجمی معنی نہ سمجھتا ہو اس کے لئے بھی قرآن بہ ترتیل پڑھنا مستحب ہے اور جب فعل مستحب ہو تو اس پر اجر و ثواب کیونکر نہیں ملے گا۔ لہذا تلاوت کے موجب اجر و ثواب ہونے کے لئے فہم معنی کی قید سائل نے کہاں سے زائد کی؟۔ خود احادیث میں فہم معنی کی قید نہیں۔ چنانچہ خاتم المحدثین علامہ شہاب الدین ابن حجر فتاویٰ حدیثیہ میں اس مسئلہ کی مبسوط بحث میں یہ احادیث نقل فرماتے ہیں۔

قال افضل العبادۃ قراءة القرآن (رواه ابن قانع) قال افضل عبادة التي تلاوة القرآن رواه البيهقي و روى السنجرى والحطیب انه عليه السلام قال اقرأوا القرآن فانکم توجرون علیہ۔ اما انی لا اقول آلم حرف ولكن الف عشر ولام عشر ومیم عشر فثلاث ثلثون (رواه الترمذی والحاکم وغيرهما) فتاویٰ حدیثیہ مصری ص ۴۲

اور علامہ جلال الدین سیوطی اتقان میں یہ احادیث نقل فرماتے ہیں:

اخرج احمد من حديث معاذ بن انس من قرأ القرآن في سبيل الله كتب مع الصديقين والشهداء والصالحين وحسن أولئك رفيقا۔

واخرج الطبرانی في الاوسط من حديث ابی هريره ما من رجل يعلم ولده القرآن الا توج يوم القيامة بتاج في الجنة۔

واخرج الشيخان من حديث عثمان خیر کم وفي رواية افضلکم من تعلم القرآن وعلمه۔

و روی الترمذی من حديث ابن مسعود من قرأ حرفا من كتاب الله فله به حسنة بعشر امثالها۔

واخرج مسلم مبن حديث ابی امامة اقرؤ القرآن فانه يا تى يوم القيامة شفيعا لاصحابه۔

واخرج من حديث انس نو رو امنالکم بالصلاة وقرأة القرآن۔
بخیال اختصار یہ دس احادیث نقل کیں۔ ان میں کہیں فہم معنی کی قید مذکور نہیں۔ تو کیا سائل محض اپنی رائے ناقص سے احادیث میں فہم معنی کی قید زائد کرتا ہے اور نصوص مطلقہ کو مقید کرتا ہے اور شریعت میں اپنی عقل سے مداخلت کرنا ہے۔

سائل حضرات محدثین کی کمال احتیاط کو ہی کو دیکھ کر سبق حاصل کرے کہ مشکوٰۃ شریف کے کتاب العلم میں یہ حدیث منقول ہے۔

من حفظ علی امتی اربعین حدیثا فی امر دینہا بعثہ فقیہا و کنت له يوم القيامة شافعا وشهيدا۔

علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعة اللمعات میں اس کے متعلق محدثین کا کلام نقل فرماتے ہیں۔

گفتند کہ مراد و مقصود رسانیدن چہل حدیث ست بایشان اگر چہ یادداشتہ باشد و معانی آن (اشعة اللمعات ص ۱۷۳ ج ۱)

اب سائل آنکھیں کھول کر دیکھے کہ محدثین تو چالیس احادیث پہونچانے والے کے اجر و ثواب

کیلئے نہ حفظ کی قید لگاتے ہیں نہ فہم معنی کی قید کا اضافہ کرتے ہیں۔ اور سائل کی یہ جرأت و دلیری اور یہ شرمناک زیادتی کہ قرآن کریم کی تلاوت کے اجر و ثواب کو فہم معنی کی قید محض اپنی رائے ناقص سے لگا کر اجر و ثواب کا دائرہ محدود کرتا ہے، اگر فی الواقع یہ سوال لاعلمی کی بنا پر ہے تو یہ جواب بہت کافی و دافی ہے اور سائل کے لئے محدثین کا یہ طرز عمل زبردست سبق ہے۔ واللہ یهدی من یشاء الی صراط مستقیم۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

جواب دوم و سوم

زید نے جو اپنی تمام عمر میں کسی عمل خیر کا ثواب کسی میت کو نہیں بخشا تو سائل یہ ظاہر کرے کہ زید کا یہ فعل کس بنا پر ہے آیا اس لئے کہ زید کا عقیدہ ہی یہ ہے کہ غیر کے عمل کا ثواب میت کو پہنچتا ہی نہیں؟ یا اس لئے کہ زید یہ خیال کرتا ہے کہ عامل اپنے عمل خیر کا ثواب دوسرے کو دینے کا اختیار نہیں رکھتا؟۔

یا اس لئے کہ زید کے زعم میں یہ ہے کہ عامل اگر اپنے عمل خیر کا ثواب دوسرے کو بخشے گا تو خود عامل اس ثواب سے محروم ہو جاتا ہے؟۔

یا اس لئے کہ زید کے وہم میں صاحب عمل اگر کسی کو اپنے عمل کا ثواب بخشے تو خود اس کے ثواب میں کمی ہو جاتی ہے اور ثواب تقسیم ہو جائے گا؟۔

یا اس لئے کہ زید اپنے گمان میں اپنے اعمال کو قابل ثواب ہی نہیں جانتا۔
بالجملہ سائل یہ بتائے کہ زید کس وجہ سے یہ فعل نہیں کرتا تا کہ جواب میں اسی پہلو پر کافی روشنی ڈالی جائے۔ پھر سائل اسی سوال میں یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ زید امتیوں کیلئے سلام اور دعائے استغفار کرتا ہے تو کیا یہ چیزیں عمل خیر ہیں یا نہیں؟۔ اگر ہیں تو میت کیلئے انہیں کس لئے کرتا ہے اور ان کی کیا بنا ہے۔

الحاصل جب زید کے عمل کا سوال ہے تو سائل کے ذمہ اس کے عمل کی بنا اور نیت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے۔ حدیث شریف میں وارد ہے۔ انما الاعمال بالنیات۔
تو جب سائل کا سوال اتنے استفسارات، وراحتلات کو شامل ہے تو سائل کو اگر واقعی جواب کی جستجو ہے تو وہ ان کے احتمالات میں سے کوئی پہلو مقرر کرے انشاء اللہ کافی و دافی تحقیقی جواب دیا جائے گا۔ علاوہ بریں خود اسی سوال دوم کا ایک پہلو سوال سوم بھی ہے تو یہ جواب دونوں کو مشتمل ہے۔ لہذا جواب سوال سوم کو

بفصیل بیان کرتے ہیں اور یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ غیر عامل کو یقیناً عامل کے مثل خیر کا ثواب پہنچتا ہے۔ یہ بات نہ فقط اقوال فقہائے عظام سے بلکہ ائمہ و صحابہ کرام سے بلکہ خیر الانام سے بلکہ خود آیات سے ثابت ہے۔ لہذا بخوف طوالت اس وقت چند دلائل پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ مولیٰ تعالیٰ سائل کو قبول حق کی توفیق دے اور اس مسئلہ کی حقانیت کو خوب واضح اور روشن کر دے۔

آیت۔ وصل علیہم ان صلواتک سکن لہم واللہ سمیع علیم۔

(سورہ توبہ ع ۱۳ ج ۱۲)

یعنی آپ ان کے حق میں دعائے خیر کریں بیشک تمہاری دعا ان کے دلوں کا چین ہے اور اللہ تعالیٰ سنتا جانتا ہے۔

تفسیر معالم و تفسیر خازن میں ہے: ای ادع لہم واستغفر لہم لان الصلاة فی اللغة الدعاء (سکن لہم) ای ان دعائک رحمة لہم۔

(خازن ص ۱۱۸ ج ۳)

تفسیر مدرک میں ہے: (وصل علیہم واعطف علیہم بالدعاء لہم وترحم ان صلواتک سکن لہم) یسکنون الیہ وتطمئن قلوبہم بان اللہ قد تاب علیم (واللہ سمیع علیم) لدعائک۔

(مدارک ص ۱۱۰ ج ۲)

تفسیر صاوی علی الجلالین میں ہے:

ورد فی الحدیث حیاتی خیر لکم ومماتی خیر لکم تعرض علی اعمالکم فی الصباح وفی المساء فان وجدت خیر احدثت اللہ وان وجدت سوء استغفرت لکم فدعاء رسول اللہ حاصل فی حیاتہ وبعد موتہ ولا عبرة بمن ضل وزاغ عن الحق وخالف فی ذالک۔

(صاوی ص ۱۴ ج ۲)

آیت۔ واستغفر لذنبک وللمو منین والمو منات۔

(سورہ محمد ع ۲۲ ج ۲۶)

یعنی اے محبوب آپ اپنے خاصوں اور عام مسلمان مرد اور عورتوں کے گناہوں کی معافی مانگو۔ تفسیر معالم و تفسیر خازن و تفسیر صاوی سب میں یہی مضمون مختلف الفاظ میں ہے۔

معنی الآیة استغفر لذنبک ای لذنوب اہل بیتک وللمو منین والمو منات یعنی من غیر اہل بیتہ و هذا اکرام اللہ عزوجل لهذه الامة حیث امر نبیہ ﷺ ان يستغفر لذنوبہم وهو

الشفیع المحاب فیہم (وفیہا ایضا) قبل الخطاب لہ والمراد بہ الامة وعلى هذا القول نوجب الآیة استغفار الانسان لجميع المؤمنین۔

(معالم و خازن ص ۱۵۱ ج ۶ و جمل ص ۱۳۸ ج ۱ صاوی ص ۷۶ ج ۴)

آیت۔ رب اغفر لی ولو الدی ولمن دخل بیتی مو منا وللمو منین وللمو منت

(سورہ نوح ع ۹۲ ج ۲۹)

یعنی اے میرے رب مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور اسے جو ایمان کے ساتھ میرے گھر میں ہے اور سب مسلمان مردوں اور سب مسلمان عورتوں کو۔

تفسیر معالم ص ۱۳۱ و تفسیر خازن ص ۱۳۱ ج ۷ و تفسیر جمل ص ۳۱۵ ج ۴ میں ہے:

هذا ادعاء عام فی کل مو من آمن باللہ وصدق الرسول وانما بدأ بنفسه لانها اولی بالتخصیص والتقدیم ثم ثنی بالمتصلین به لانهم احق بدعائه من غیرہم ثم عمم جمیع المو منین والمو منت لیكون ابلغ فی الدعاء فهو دعاء عام لكل مو من ومو منة فی سائر الامم۔

آیت۔ ربنا اغفر لی ولوالدی وللمو منین یوم یقوم الحساب۔

(سورہ ابراہیم ع ۱۳ ج ۱۳)

اے ہمارے رب مجھے بخش دے اور میرے ماں باپ کو اور سب مسلمانوں کو جس دن حساب قائم ہوگا۔

تفسیر خازن ص ۲۳۳ ج ۴ و تفسیر جمل ص ۵۳ ج ۲ و تفسیر صاوی ص ۲۳۳ ج ۲ میں ہے:

هذا دعاء للمو منین بالمغفرة واللہ تعالیٰ لا یردد دعاء خلیلہ ابراہیم ففیہ بشارة عظيمة لجميع المو منین بالمغفرة۔

آیت۔ الذین یحملون العرش ومن حوله یسبحون بحمد ربہم ویومنون بہ یستغفرون للذین امنوا ربنا وسعت کل شیء رحمة وعلمنا فاغفر للذین تابوا واتبعوا سبیلک وقہم عذاب الجہنم۔

(سورہ مومن۔ ع ۲۳ ج ۲۳)

یعنی جو فرشتے عرش اٹھاتے ہیں اور جو اس کے گرد ہیں اپنے رب کی تعریف کے ساتھ اس کی پا

کی بولتے ہیں اور اس پر ایمان لاتے اور مسلمانوں کی مغفرت مانگتے ہیں اے ہمارے رب تیری رحمت و علم میں ہر چیز کی سمائی تو انہیں بخش دے جنہوں نے توبہ کی اور تیری راہ پر چلے اور انہیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔

تفسیر خازن ص ۵۷ ج ۶ و تفسیر جمل ص ۶ ج ۴ و تفسیر صاوی ص ۴ ج ۴ میں ہے:

ای یسألون الله تعالى المغفرة لهم (وفيها ايضا) اذا دخل المو من الجنة قال اين ابى واين امى واين ولدى واين زوجتى فيقال انهم لم يعملوا عملك فيقول انى كنت اعمل لى ولهم فيقال ادخلوهم الجنة فاذا اجتمع باهله فى الجنة كان اكمل سروره ولذته۔

آیت۔ والملائكة يسبحون بحمد ربهم ويستغفرون لمن فى الارض

(سورہ شوریٰ ع ۲۵)

یعنی فرشتے اپنے رب کی تعریف کیساتھ پاکی بولتے ہیں اور زمین والوں کیلئے معافی مانگتے ہیں

تفسیر خازن ص ۲۵ ج ۵ میں ہے:

ای من المؤمنین دون الکفار لان الکافر لا يستحق ان تستغفر له الملائكة۔

تفسیر جمل ص ۵۲ ج ۴ میں ہے:

ای یشفعون لمن فى الارض من المؤمنین فالمراد بالاستغفار اشفاعه۔

آیت۔ وقل رب ارحمهما کما ربيانى صغيرا۔ (بنی اسرائیل ع ۱۵)

یعنی اور عرض کر کہ میرے رب تو ان دونوں پر رحم کر جیسا کہ ان دونوں نے مجھے چھٹپن میں پالا تفسیر خازن ص ۱۲۴ میں ہے:

ای ادع لهما ان یرحمهما یرحمته الباقية واراد به اذا كانا مسلمین۔

تفسیر مدارک ص ۲۴۰ ج ۲ میں ہے:

ولا نکتف برحمتك عليهما اللتى لا بقاء لها وادع الله تعالى یرحمهما رحمة الباقية واجعله ذلك جزاء رحمتهم عليك فى صغرك و تربيتهم لك والمراد غیره عليه

الاسلام۔

تفسیر جمل ص ۶۴ ج ۲، و تفسیر صاوی ص ۲۹۳ ج ۲ میں ہے:

ادع لهما بالرحمة ولوفى كل يوم وليلة خمس مرات۔

آیت۔ والذین جاءوا من بعدهم یقولون ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا

(سورہ حشر ع ۲۸)

بالایمان۔

یعنی اور وہ جو ان کے بعد آئے عرض کرتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں بخش دے اور ہمارے

بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے۔

تفسیر خازن ص ۵۲ ج ۴ میں ہے:

اخبر انهم یدعون لا نفسهم بالمغفرة ولاخوانهم الذین سبقوهم بالایمان۔

تفسیر روح البیان میں ہے:

وفى الآيات دليل على ان الترحم والاستغفار واجب على المؤمنین الآخرين

للسابقین منهم لاسیما لا بائهم ومعلمیهم امور الدین۔

تفسیر جمل و تفسیر صاوی میں ہے:

(قوله الذین سبقونا بالایمان) ای بالموت علیه فینبغى لكل واحد من القائلین

بهذا القول ان یقصد بمن سبقه من انتقل قبله من زمنه الى عصر النبی ﷺ فیدخل جمیع

من تقدمه من المسلمین لا خصوص المهاجرین والانصار۔

(جمل ص ۳۱۷ ج ۴ و صاوی ص ۱۶۲ ج ۴)

آیت۔ والذین امنوا واتبعتم ذریعتهم بالایمان الحقنا بهم ذریعتهم وما التناهم من

عملهم من شیء۔

(سورہ طور ع ۲۷)

یعنی اور وہ جو ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ایمان کے ساتھ پیروی کی ہم نے ان کی اولاد ان

سے ملا دی اور ان کے عمل میں انہیں کوئی کمی نہ دی۔

تفسیر مدارک میں ہے:

(الحقنا بهم ذریعتهم) ای تلحق الاولاد بایمانهم واعمالهم درجات الآباء وان

فصرت اعمال الذرية عن اعمال الآباء۔ (مدارک ص ۱۴۵ ج ۴)

تفسیر معالم ص ۲۰۸ ج ۶ و تفسیر خازن ص ۲۰۸ ج ۴ میں ہے:

الحقنا بهم ذریعتهم یعنی المؤمنین فى الجنة بدرجات ابائهم ان لم یبلغوا باعمالهم

درجات آبا ئہم تکرمة لا بائہم لتقر بذلک اعینہم (ما التباہم من عملہم من شیء) وما نقصنا الآباء من اعمالہم شیئا۔

تفسیر جمل ص ۲۴۶ ج ۴۔ تفسیر صاوی ص ۱۱۱ ج ۴ میں ہے:

والمعنی ان المو من اذا کان عملہ اکثر الحق بہ من دونہ فی العمل ابنا کان او ابا ویلحق بالذریۃ من النسب الذریۃ بالسبب وهو المحبة فان حصل مع المحبة تعلیم علم او عمل کان احق بالحق کا لتلا مذہ فانہم یلحقون باشیا خہم واشیا خ الاشیا خ یلحقون بالاشیا خ ان کانوا دونہم فی العمل والاصل فی ذلک قولہ ﷺ اذا دخل اهل الجنة الجنة سال احدهم عن ابویہ عن زوجتہ وولده فیقال انہم لم یدرکوا اما ادرکت فیقول یا رب انی عملت لی ولہم فیو مر بالحاقہم بہ۔ وقولہ لا یزاد فی عمل الاولاد ای لم نأخذ من عمل الآباء شیء نجعلہم للاولاد فیسحقون بہ هذا الاکرام بل عمل الآباء باقی لہم بتمامہ والحق الذریۃ بہم بمحض الفضل والکرم۔

آیت۔ والذین صبروا ابتغاء وجه ربهم واقاموا الصلوة وانفقوا مما رزقناهم سرا وعلا نية ويدرون بالحسنة السيئة اولئك لهم عقبی الدار جنت عدن یدخلونہا ومن صلح، من آبا ئہم وازواجہم وذریئہم۔ (سورہ رعد ع ۳ ج ۱۳)

یعنی اور وہ جنہوں نے صبر کیا اپنے رب کی رضا چاہنے کو اور نماز قائم رکھی اور ہمارے دے ہوئے سے ہماری راہ میں چھپے اور ظاہر کچھ خرچ کیا اور برائی کے بدلے بھلائی کر کے نکالتے ہیں انہیں کیلئے پچھلے گھر کا نفع ہے بسنے کے باغ جن میں وہ داخل ہو گئے اور جو لائق ہوں ان کے باپ دادا اور بیوی اور اولاد میں۔

تفسیر خازن میں ہے:

والصحيح ما قاله ابن عباس لان الله تعالى جعل ثواب المطيع سروره بما يراه في اهلہ حیث بشرہ بدخول الجنة مع هؤلاء فدل على انہم یدخلونہا کرامة للمطيع العامل الآتی بالاعمال الصالحة وولو کان دخولہم الجنة باعمالہم الصالحة لم یکن ذلک کرامة للمطيع لا فائدة فی الوعد بہ اذ کل من کان صالحا فی عملہ فهو یدخل الجنة۔

(خازن ص ۱۶ ج ۴)

تفسیر جلالین ص ۱۴۴ میں ہے:

(من صلح) امن (من آبا ئہم وازواجہم وذریائہم) وان لم یعملوا بعملہم یکنون فی درجاتہم تکرمة لہم۔

تفسیر جمل ص ۵۰۲ ج ۴، تفسیر صاوی ص ۲۳۰ ج ۴ میں ہے:

(قولہ من آبا ئہم) ای اصولہم وان علو اذ کو راوانا ثا (قولہ وازواجہم) ای اللاتبی متن فی عصمتہم (قولہ وذریائہم) ای فروعہم وان سفلوا (اقولہ وان لم یعملوا) ای الآباء والازواج والذریات (قولہ تکرمة لہم) ای لان اللہ یجعل من ثواب المطیع سرورہ بما یراہ فی اہلہ ولو کان دخولہم الجنة باعمالہم الصالحة لم تکن فی ذلک کرامة للمطيع اذ کل من کان صالحا فی عملہ فلہ الدرجات العلیة استقلا لا۔

باب ۱۷: ان دس آیات اور ان کی ۳۶ تفاسیر سے روز روشن کے طرح ثابت ہو گیا کہ غیر عامل کو عامل کے عمل خیر کا ثواب پہنچتا ہے اور بروز قیامت آباء کو اولاد کے اعمال کا ثواب اور اولاد کو آباء کے اعمال کا ثواب اور زوجات کو شوہروں کے اعمال کا ثواب دیا جائے گا اور عاملوں کے ثواب میں کچھ کمی نہ ہوگی۔ اور مسلمانوں کو اپنے لئے اور اپنے سے پہلے تمام مسلمانوں کے لئے اور خاص کر اپنے مسلمان ماں باپ کیلئے دعائے رحمت واستغفار کرنے کا حکم ہے۔ فرشتے اور حاملان عرش ایمان والوں کیلئے استغفار کرتے ہیں۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے مسلمانوں کیلئے استغفار فرمائی۔ سیدنا نوح علیہ السلام نے اپنے والدین اور مومنین اور مومنات کیلئے دعائے مغفرت کی۔ خود حضور سید عالم ﷺ کو مومن مردوں اور عورتوں کیلئے دعائے رحمت اور مغفرت کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا۔ تو اب ان قرآنی شہادتوں کے ہوتے ہوئے کیا کسی مسلمان کو کچھ تردد و شک باقی رہ سکتا ہے۔ حاشا للہ۔

اب چند احادیث بھی سنئے اور یہ وہ احادیث ہیں جن کو حضرت خاتم المحدثین علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور میں نقل فرمایا۔

حدیث (۱)۔ عن ابن عباس قال: قال رسول الله ﷺ: ما لمیت فی قبرہ الا شبہ الغریق المتغوث ينتظر دعوة من اب او ام او ولد او صديق ثقة فاذا لحقته کان احب الیہ من الدنيا وما فیہا وان الله عز وجل لیدخل علی اهل القبور من دعاء اهل الدنيا امثال الجبال وان هدیة الاحیاء الی الاموات الاستغفار لہم وصدقة علیہم (رواہ الدیلمی والبیہقی فی

(شعب الايمان)

حديث (٢) عن ابي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ اذا مات الانسان انقطع عمله الا من ثلث صدقة جارية او علم ينتفع به او ولد صالح يدعوه (رواه البخارى فى الادب ومسلم)

حديث (٣) عن ابي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: ان مما يلحق المؤمن من حسنته بعد موته علما نشره او ولدا صالحا تركه او مصحفا ورثه او مسجدا بناه او بينا لا بن السبيل بناه او نهرا اجراه او صدقة اخرجها من ماله فى صحته ليلحقه بعد موته (رواه ابن ماجه وابن حزيمة)

حديث (٤) عن ابي هريرة قال: قال رسول الله ﷺ: ان الله يرفع درجة للعبد الصالح فى الجنة فيقول يا رب انى لى هذه؟ فيقول باستغفار ولدك لك - (رواه الطبرانى فى الاوسط والبيهقى فى مسنده ولفظه بدعاء ولدك لك) اخرج البخارى فى الادب مو قوفا)

حديث (٥) عن انس عن النبي ﷺ: امتى مرحومة تدخل قبورها بذنوبها وتخرج من قبورها لا ذنوب عليها يمحص عنها باستغفار المؤمنين لها - (رواه الطبرانى فى الاوسط)

حديث (٦) عن انس ان رسول الله ﷺ قال: من دخل المقبرة فقرأ سورة يس خفف الله عنهم وكان له بعد دمن فيها حسنة - (رواه عبد العزيز صاحب الخلال بسنده)

حديث (٧) عن الحجاج ابن دينار قال: قال رسول الله ﷺ ان من البر بعد البر ان تصلى عنهما مع صلواتك وان تصوم عنهما مع صيامك وان تصدق عنهما مع صدقتك (رواه ابن ابي شيبة)

حديث (٨) عن ام المؤمنين الصديقة رضى الله تعالى عنها قالت: قال رسول الله ﷺ: من مات وعليه صيام صام عنه وليه (رواه البخارى ومسلم)

(شرح الصدور بشرح حال الموتى والقبور)

حديث (٩) عن عقبة ابن عامر ان امرأة جاءت الى رسول الله ﷺ فقالت: ارحم عن امى وقد ماتت قال ارأيت لو كان على امك دين فقضيته اليس كان مقبولا منك قالت: نلى - فامر ان تحج - (رواه الطبرانى)

حديث (١٠) عن سعد بن عباد قال: يا رسول الله ان امى ماتت فای الصدقة افضل؟ قال؟ الماء، فحفر بيرا وقال هذه لام سعد (رواه احمد والترمذى وابو داود والنسائى وابن ماجه - (شرح الصدور بشرح حال الموتى والقبور)

حديث (١١) عن عطاء وزيد بن اسلم قال: ارجاء رجل الى النبي ﷺ فقال: يا رسول الله! اعتق عن ابي وقد مات قال نعم (رواه ابن ابي شيبة)

(شرح الصدور بشرح حال الموتى والقبور)

حديث (١٢) عن عمرو بن العاص انه قال: يا رسول الله! ان العاص اوصى ان يعتق عنه مائة نسمة فاعتق هشام منها خمسين قال لا انما يتصدق ويحج ويعتق عن المسلم لو كان مسلما بلغه (رواه ابن حبان - (شرح الصدور بشرح حال الموتى والقبور)

حديث (١٣) عن ام المؤمنين الصديقة رضى الله عنها ان رجلا قال للنبي ﷺ ان امى اقلنت نفسها واظنها لو تكلمت تصدقت فهل لها اجر ان تصدقت عنها قال: نعم - (رواه البخارى)

حديث (١٤) عن ابن عباس ان سعد بن عباد توفيت امد وهو عائب عنها فقال يا رسول الله ان امى توفيت وانا غائب عنها اينفعها شىء ان تصدقت به عنها؟ قال: نعم - قال فاني اشهدك على ان حاططى المخراف صدقة عليها (رواه البخارى)

(شرح الصدور بشرح حال الموتى والقبور)

حديث (١٥) عن ابي قتادة قال: سمعت النبي ﷺ يقول: خير ما يخلف المرء بعد موته ولد صالح يدعوه وصدقة تجرى بيلغه اجرها وعلم يعمل به مبن بعده (رواه الطبرانى فى الصغير)

حديث (١٦) عن عقبة بن عامر قال: قال رسول الله ﷺ: ان الصدقة لتطقى عن اهلها حر القبور (رواه الطبرانى)

(شرح الصدور بشرح حال الموتى والقبور)

حدیث (۱۷) عن سعد بن عبادۃ قال: قلت یا رسول اللہ! توفیت امی ولم توصہ ولم تنصدق فهل ینفعها ان تصدقت؟ قال: نعم ولو یکرع شاة محرق (رواہ الطبرانی)

(شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث (۱۸) عن ابن عمر قال: قال رسول اللہ ﷺ: اذا تصدق احدکم بصدقة تطوعا فیجعلها عن ابویہ فیکون لهما اجرها ولا یتنقص من اجرہ شیئا (رواہ الطبرانی)

(شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث (۱۹) عن انس سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: ما من اهل یموت منهم میت فلیتصدق عنه بعد موته الا اهداها له جبرئیل علی طبق من نور ثم یقف علی شفیہ القبر فیقول یا صاحب القبر العمیق هذه هدیة اهداها الیک اهلك فاقبلها فتدخل علیه فیفرح بها و یستبشر و یحزن جیر انه الذین لا یهدی الیهم شیء۔ (رواہ الطبرانی فی الاوسط)

(شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

حدیث (۲۰) عن جابر قال: شهدت مع رسول اللہ ﷺ الاضحی فی المصلی فلما قضا خطبته نزل من منبرہ و اتی بکبش فذبحہ رسول اللہ ﷺ بیدیه وقال بسم اللہ اللہ اکبر هذا عنی و عن من لم یضح من امتی (رواہ ابو داؤد و الترمذی)

(شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور)

بخوف طوالت اسوقت صرف ۲۰ احادیث پیش کی گئیں جن سے آفتاب کی طرح ثابت ہو گیا کہ غیر عامل کو عامل کے عمل خیر کا ثواب پہنچتا ہے اور اس سے عامل کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوتی اور زندوں کا ہدیہ اموات کیلئے استغفار و دعاء اور تمام انواع صدقات و خیرات ہیں اور میت اپنے ماں باپ اعزاء اقارب و دوست احباب سے ان امور کا منتظر رہتا ہے۔ اور یہ تمام امور خیر اس کے لئے سبب مغفرت اور باعث رفع درجات ہوتے ہیں۔

الحاصل دوسرے کو عمل کا ثواب پہنچانا خود شارع علیہ الصلوٰۃ السلام کے نہ صرف قول سے بلکہ فعل سے بھی ثابت ہے۔ اب صحابہ کرام کے قول اور فعل بھی ملاحظہ ہوں۔

اثر (۱)۔ عن ابن مسعود قال: اربع یعطهن الرجل بعد موته ثوابها ما له اذا کان فیہ قبل ذلك مطيعا والولد الصالح يدعوله بعد موته والسنة الحسنة یسنها الرجل فیعمل بها

بعد موته والماله اذا شفعو الرجل شفعو فیہ۔ (رواہ الدارمی فی المسند)

اثر (۲)۔ عن عبد الرحمن ابن العلاء بن الخلاج عن ابیہ قال: قال لی ابی الخلاج ابو خالد یا بنی اذا انا مت فالحدنی واذا وضعتنی فی لحدی فقل بسم اللہ و علی ملة رسول اللہ ثم سن علی التراب سنا ثم اقرأ عند راسی بفاتحة البقرة وخاتمتها فانی سمعت رسول اللہ ﷺ یقول ذلك (رواہ الطبرانی فی المعجم الكبير واسناده صحیح)

اثر (۳)۔ عن الشعبي قال: كانت الانصار اذا مات لهم المیت اختلفوا الی قبره یقرؤن القرآن (رواہ ابن لال فی الجامع)

اثر (۴)۔ عن ابی امامة الباهلی قال: اقرؤا القرآن فانه یاتی یوم القيمة شفیعا لا صحابه ثم یسبح و یدعوا بالرحمة والمغفرة لنفسه وللمومنین (رواہ مسلم)

اثر (۵)۔ عن ابی جعفر ان الحسن والحسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کانا یعتقدان عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بعد موته (رواہ ابن ابی شیبہ)

اثر (۶)۔ عن القاسم بن محمد ان عائشة رضی اللہ عنہا اعتقت عن اخيها عبد الرحمن رقیقا من عباده ترجوان ینفعه بذلك بعد موته (رواہ ابن سعد)

اثر (۷)۔ عن علی رضی اللہ عنہ انه کان یضحی کبشین احدهما عن النبی ﷺ والاخر عن نفسه فقيل له فقال امرنی یعنی النبی ﷺ فلا ادعه ابدا (رواہ الترمذی)

بخیال اختصار سات آثار حضرات صحابہ کرام کے منقول ہوئے جن سے واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ غیر عامل کو عمل خیر کا ثواب پہنچتا ہے۔ اب تابعین کرام و ائمہ سلف و خلف کے بھی چند اقوال اور دیکھ لیجئے۔

(۱) عن سفیان قال: کان یقال الاموات احوج الی الدعاء من الاحیاء الی الطعام والشراب۔ (رواہ ابن ابی الدنیا)

(۲) عن بعض السلف قال رأیت اخالی فی النوم بعد موته فقلت اتصل الیک دعاء الاحیاء قال ای واللہ بتزخرف مثل النور ثم نلبسه (رواہ ابن ابی الدنیا)

(۳) عن عمر بن جریر قال: اذا دعا العبد لا خیه المیت اتاه بها الی قبره ملک فقال یا صاحب القبر الغرب هذه هدیة من اخ لك عليك شفیق (رواہ ابن ابی الدنیا)

(۴) عن ابی قلابہ قال اقبلت مبن الشام الى البصرة فنزلت الخندق فتطهرت وصليت ركعتين بالليل ثم وضعت راسی على قبر فنمت ثم انتبھت فاذا انا بصاحب القبر يشتكى ويقول لقد آذيتني منذ الليلة ثم قال انکم لا تعلمون ونحن نعلم ولا نقدر على العمل ان الركعتين اللتين ركعتهما خیر من الدنيا وما فيها ثم قال سل جزی الله اهل الدنيا خیرا فافراهم منی السلام فانه يدخل علينا من دعائهم نور مثل الجبال (رواه ابی الدنيا)

(۵) حدثنا العباس بن یعقوب بن صالح الانباری سمعت ابی يقول رای بعض الصالحین اباه فی النوم فقال له یا بنی لم قطعتم هدیتمک عنا قال یا ابت وهل تعرف الاموات هدیة الاحیاء قال یا بنی لولا الاحیاء لهلکت الاموات۔ (رواه ابن رجب)

(۶) عن مالک بن دینار قال دخلت المقبرة لیلة الجمعة فاذا بنو مشرق فیها فقلت لا اله الا الله نری ان الله عز وجل قد غفر لا هل القبور فاذا انا بها تف یهتف من البعد وهو يقول یا مالک بن دینار هذه هدیة المؤمنین الی اخوانهم من اهل المقابر قلت بالذی انطلقک الاخبرتنی ما هو قال رجل من المؤمنین قام فی هذه اللیلة فاسبغ الوضوء وصل ركعتین واقراء فیهما فاتحة الكتاب وقل یا ایها الکفرون وقل هو الله احد وقل اللهم انی قد وهبت ثوابها لاهل المقابر من المؤمنین فادخل الله علينا الضیاء والنور والفسحة والسرور فی المشرق والمغرب قال مالک: فلم ازل اقرأها فی کل جمعة فرأیت النبی ﷺ فی منامی یقول لی یا مالک قد غفر الله لك بعد دالنور الذی اهدیته الی امتی ولك ثواب ذلك ثم قال لی وبنی الله بیتا لك فی الجنة فی قصر یقال له المنیف قلت ما المنیف قال المظل علی اهل الجنة (رواه البخاری فی تاریخه)

(۷) عن بشار بن غالب قال رأیت رابعة فی النوم وکنت کثیر الدعاء لها فقالت لی یا بشار هداياک تاتینا علی اطباق من نور محمد بمنادیل الحریر قلت وکیف ذلك قالت هکذا دعاء المؤمنین الاحیاء اذا دعوا للموتی فاستجیب لهم جعل ذلك الدعاء علی اطباق النور ثم خمر بمنادیل الحریر ثم اتی الذی دعی له من الموتی فقیل هذه هدیة فلان علیک (رواه ابن ابی الدنيا)

(۸) عن سلمة بن عبید قال: قال حماد المکی خرجت لیلة الی مقابر مكة

فوضعت راسی علی قبر فنمت قرأیت اهل المقابر حلقة حلقة فقلت قامت القیامة قالوا الا ولكن رجل من اخواننا قرأ قل هو الله احد وجعل ثوابها لنا فنحن نقسمه منذ سنة (رواه القاضی ابو بکر بن عبد الباقي الانصاری فی مشیخته)

(۹) عن طائوس قال ان الموتی یفتنون فی قبورهم سبعا فکانو ایستحبون ان یطعم عنهم بتلك الايام (رواه احمد فی الذهب وابو نعیم فی الحلیة)

(۱۰) عن احمد بن حنبل قال: اذا دخلتم المقابر قاقروا بفاتحة الكتاب والمعوذتین وقل هو الله احد واجعلوا ذلك لاهل المقابر فانه یصل الیهم۔

بسبب اپنی عدم الفرستی کے اس وقت تابعین وائمہ سلف وخلف کے صرف دس اقوال پیش کئے گئے جن سے صریح طور پر ثابت ہو گیا کہ غیر عامل کو عامل کے عمل خیر کا ثواب پہنچتا ہے۔

ہذا جب یہ مسئلہ قرآن عظیم واحادیث بنی کریم اور اقوال صحابہ کرام وتصریحات ائمہ عظام سے ثابت ہو چکا تو اب اس میں کسی کو مجال دمزدن وجائے سخن باقی نہ رہی۔ لیکن دلائل شرع سے ایک دلیل اجماع امت بھی ہے تو اتمام حجت کیلئے اس کی بھی چند نقول اور پیش کردی جائیں۔

علامہ جلال الدین سیوطی شرح الصدور میں فرماتے ہیں:

(۱۱) ان المسلمین ما زالوا فی کل عصر یجمعون ویقرؤن لموتاهم من غیر نکر فکان ذلك اجماعا۔

یہی علامہ اسی میں فرماتے ہیں:

وقد نقل غیر واحد الاجماع علی ان الدعاء ینفع المیت۔ (ص ۱۲۷)

عقائد کی مشہور کتاب شرح عقائد میں ہے۔ وفی دعاء الاحیاء للاموات او صدقتهم ای

صدقة الاحیاء عنهم ای عن الاموات نفع لهم ای للاموات۔ (ص ۲۴۰)

عقائد کی مشہور کتاب شرح فقہ اکبر میں ہے:

عند اهل السنة ان للانسان ان یجعل ثواب عمله لغيره صلوة او صوما او حجا او

صدقة او غیر ہا۔ (شرح فقہ اکبر مصری ص ۱۱۸)

علامہ دمشقی ”رحمة الامۃ فی اختلاف الامۃ“ میں فرماتے ہیں:

واجمعوا علی ان الاستغفار والصدقة والحج والعقی تنفع المیت ویصل الیہ ثوابہ۔

اسی رحمة الامة میں ہے:

ومذهب اهل السنة ان للانسان ان يجعل ثواب عمله لغيره۔

مواہب لدنیہ میں شیخ شمس الدین عسقلانی کا قول نقل فرماتے ہیں:

ان وصول ثواب القراءة الى الميت من قريب او اجنبي هو الصحيح كما تنفع

الصدقة والدعاء والاستغفار بالاجماع۔ (مواہب مصری ص ۴۳۲ ج ۱)

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعة اللمعات میں فرماتے ہیں:

ومستحب است که تصدق کردہ شود از میت بعد از رفتن او از عالم تا ہفت روز و تصدق از میت نفع

میکند اور ابے خلاف میاں اہل علم وارد شدہ است در اں احادیث صحیحہ خصوصاً۔

(اشعة اللمعات ص ۱۷۷ ج ۱)

قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی تذکرة الموتی میں فرماتے ہیں:

حافظ شمس الدین ابن عبد الواحد گفتہ از قدیم در ہر شہر مسلمانان جمع می شوند و برائے اموات قرآن

(تذکرة الموتی ص ۳۶)

میخواند پس اجماع شدہ۔

حضرت علامہ اسمعیل حق تفسیر روح البیان میں شیخ تقی الدین ابوالعباس کا قول نقل فرماتے ہیں:

من اعتقد ان الانسان لا ينتفع الا بعمله فقد خرق الاجماع۔

ان عبارات سے نہایت صریح طور پر ثابت ہو گیا کہ عامل کے عمل کا ثواب غیر عامل کو پہنچنے پر

امت کا اجماع ہو چکا۔ بالجملة جب اس مسئلہ پر شریعت کے اصول۔ آیات۔ احادیث اور اجماع امت

کے کافی دلائل منقول ہوئے اور صحابہ و تابعین اور ائمہ سلف و خلف کی تصریحات پیش ہو چکیں اور آفتاب

سے زیادہ روشن طور پر یہ مسئلہ ثابت ہو چکا کہ عامل کے عمل کا ثواب غیر عامل کو پہنچتا ہے تو اس مسئلہ میں

اب کوئی مسلمان تو شک یا شبہ کر ہی نہیں سکتا۔ اب رہے مخالفین و منکرین انہیں بھی اس کی حقانیت میں تردد

و تامل کی گنجائش باقی نہیں ہے لیکن ہمیں سائل کی بیجا ضد اور ہٹ کا پورا کرنا بھی ضروری ہے اسی لئے چند

فقہاء حنفیہ کے اقوال بھی پیش کئے جاتے ہیں۔

ہدایہ ص ۱۰۷ میں ہے:

ان الانسان له ان يجعل ثواب عمله لغيره صوما او صلوة او صدقة او غيرها عند

(ہدایہ مجتہبی ص ۶۷ ج ۱۱)

اهل السنة والجماعة۔

مراقی الفلاح میں علامہ زیلعی سے ناقل ہیں:

فلانسان ان يجعل ثواب عمله لغيره عند اهل السنة والجماعة صلوة كان او

صوما او حجا او صدقة او قراءة القرآن او الاذکار او غير ذلك من انواع البر ويصل ذلك

الى الميت وينتفعه قاله الزيلعي في باب الحج عن الغير۔ (طحاوی ص ۶۳۳)

ہدایہ و بحر الرائق میں ہے:

من صام او صلى او تصدق و جعل ثوابه لغيره من الاموات والاحياء جاز ويصل

ثوابها اليهم عند اهل السنة والجماعة۔ (رد المحتار مصری ص ۶۳۱ ج ۱)

در مختار میں ہے:

الاصل ان كل سائر ما له جعل ثوابها لغيره و ان نواها عند الفعل لنفسه

(حاشیہ رد المحتار مصری ص ۲۴۲ ج ۲)

لظاهر الادلة۔

فتاویٰ سراجیہ میں ہے:

من حج عن غيره بغير امره و جعل ثوابه له يصل الثواب الى ذلك الغير۔

(حاشیہ فتاویٰ خانیہ مصطفائی ص ۱۹۵ ج ۱)

طحاوی علی مراقی الفلاح میں ہے:

فلانسان ان يجعل ثواب عمله لغيره عند اهل السنة والجماعة سواء كان

المجعول له حيا او ميتا من غير ان ينقص من اجره شيء۔ (طحاوی ص ۶۳۳)

یعنی شرح کنز الدقائق میں ہے:

ان للانسان ان يجعل ثواب عمله لغيره صلوة كان او صوما او حجا او صدقة او

قراءة القرآن او قراءة ذكر الى غير ذلك من جميع انواع البر وكل ذلك يصل الى الميت

وينتفعه عند اهل السنة والجماعة۔ (یعنی مصری ص ۱۱۱ ج ۱)

علامہ شامی تارخانیہ سے اور تارخانیہ محیط سے ناقل ہیں:

الافضل لمن يتصدق تفلان بنوی لجميع المومنین والمومنات لا نها تصل اليهم

ولا ينقص من اجره شيء۔ (رد المحتار ص ۷۳)

مسائل پنجم انصاف دیکھے کہ فقہ کی ان دس کتابوں میں کیسی صاف تصریحات موجود ہیں کہ مذہب اہل سنت میں عامل اپنے عمل کا ثواب غیر عامل کو پہنچا سکتا ہے اور غیر عامل تک وہ ثواب پہنچتا بھی ہے اور اس کے لئے نافع بھی ہوتا ہے اب چاہے وہ غیر عامل زندہ ہو یا مردہ پھر عامل کے اس ایصال ثواب سے اس کے اجر میں بھی کچھ کمی نہیں ہوتی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ غیر کو اپنے عمل کا ثواب پہنچانا اب چاہے وہ عمل نماز ہو یا روزہ۔ حج ہو یا: صدقہ تلاوت قرآن ہو یا ذکر کلمہ شریف اور صدقات میں نقد دینا ہو یا غلہ عطا کرنا۔ کھا کھانا ہو یا شیرینی تقسیم کرنا۔ چھوڑے دینا ہو یا چنے بانٹنا۔ شربت کی سبیل لگانا ہو یا پانی پلانا خلاصہ یہ ہے کہ کوئی نیک کام کوئی عمل خیر ہو کوئی نوع بر ہو اسکا ایصال ثواب کرنا ایسا بہتر اور افضل و اعلیٰ عمل ہے کہ اس کو آیات قرآنی و احادیث نبوی ثابت کرتی ہیں اور اس کے جواز پر امت کا اجماع منعقد ہو چکا۔ اور بکثرت صحابہ کرام و تابعین عظام و ائمہ علماء و سلف و خلف تمام کے اقوال و اعمال اس کے شاہد ہیں۔ اسوقت بخوف طوالت اور بوجہ قلت فرصت کے ہم نے صرف (۱۱۷) کتابوں کی عبارات پیش کیں، اور اگر جامعیت کا لحاظ کیا جائے تو صد ہا بلکہ ہزار ہا اور عبارات پیش کی جاسکتی ہیں اور ایک مبسوط رسالہ تیار ہو سکتا ہے۔

بالجملہ اس ایصال ثواب میں مخالف و منکر کو بحث کرنے کی کیا ہمت ہو سکتی ہے اور اس کے جواز بلکہ استحباب میں کیا کسی کو اعتراض و کلام کرنے کی جرأت ہو سکتی ہے۔ اس کے پاس نہ کوئی آیت ہے نہ حدیث، نہ کوئی قول ائمہ ہے نہ خلف و سلف کی تصریح۔ منکر صرف اپنے زعم باطل اور رائے ناقص اور محض کم عقلی و نا فہمی کی بنا پر غلط تاویلات کرتا ہے اور عوام کو مغالطہ اور فریب میں ڈالتا ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ مولیٰ تعالیٰ اس کو قبول حق کی توفیق عطا کرے اور اس کے قلب میں انصاف پسندی کی لہر پیدا کرے اور بیدینی کی خطرناک راہوں سے بچائے اور باطل کی حمایت و پاسداری سے محفوظ رکھے۔ واللہ یہدی من یشاء الی صراط مستقیم۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: ا. معتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرسۃ اجمال العلوم فی بلدہ سنجل

(۵۵۱)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دیں مسائل ذیل میں۔

(۱) بغرض ایصال ثواب جو روپیہ نقد یا کھانا یا شیرینی یا کپڑا دیا جائے وہ صدقہ ہے یا نہیں؟

(۲) یہ کہ اگر وہ صدقہ ہے تو اس کا استعمال کرنا یا کھانا پینا امراء یا صاحب ثروت لوگوں کو جائز ہے یا نہیں؟

(۳) یہ جانتے ہوئے کہ مذکورہ بالا اشیاء بغرض ایصال ثواب دی جا رہی ہیں کوئی امیر یا صاحب ثروت لے یا کھائے یا استعمال کرے تو وہ گناہ گار ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو یہ گناہ کبیرہ ہے یا صغیرہ؟

(۴) جو کھانا شیرینی یا کپڑا یا نقد روپیہ بغرض ایصال ثواب دیا جائے اس پر فاتحہ دینی ضروری ہے یا نہیں؟ اور اس کے مستحق امیر ہیں یا غریب؟

(۵) اگر فاتحہ دینا ضروری ہے تو فاتحہ دینے کا طریقہ مسنون کیا ہے۔

(۶) نذر و نیاز بزرگوں کی بعض برآمد کار اور بعض از راہ نزدیکی حاصل کرنے ان بزرگ سے کرتے ہیں ایسی نذر و نیاز جائز ہے یا نہیں؟ اور کھانا اسکا روا ہے یا ناروا۔ مہربانی فرما کر ہر سوال کا جواب نذر و تحریر فرما کر اور کتب معتبرہ اور فقہ کی رو سے عنایت فرمادیں۔

اجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

(۱) صدقہ کی تعریف المغرب میں ہے: الصدقة العطية التي بها يبتغى مثوبة من الله تعالى۔

جامع العلوم میں ہے: الصدقة تملیک العین بلا عوض ابتغاء لوجه الله تعالى۔ ان عبارات کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ صدقہ اس عطیہ کو کہتے ہیں جس میں بغیر عوض کے تملیک میں ہو اور لوجہ اللہ دے کر ثواب مطلوب ہو۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ایصال ثواب کہے لئے جو نقد یا کھانا یا کپڑا دیا جاتا ہے۔ تو وہ بلا عوض تملیک عین ہے اور لوجہ اللہ ایسا عطیہ ہے جس سے ثواب مطلوب ہے۔ لہذا ان چیزوں پر صدقہ کی تعریف صادق آگئی۔ بلاشبہ یہ چیزیں صدقہ ثابت ہوں گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲-۳) جب ان چیزوں کا صدقہ ہونا ثابت ہو گیا۔ اور یہ امر طے شدہ ہے کہ یہ صدقات مفروضہ یا واجبہ تو نہیں ہو سکتے۔ لہذا ان صدقات کا نافلہ ہونا قرار پایا۔ اور صدقہ نافلہ بلاشبہ اغنیاء اور مالداروں کو بھی لینا اور کھانا جائز ہے۔

چنانچہ جو ہرہ نیرہ شرح قدوری میں ہے۔ لو دفع الی الغنی صدقة التطوع جاز لہ اخذھا حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی فتاویٰ عزیز یہ میں فرماتے ہیں: اگر فاتحہ بنام

بزرگے دادہ شدہ پس اغنیاء را ہم خوردن جائز است۔ (فتاویٰ عزیزیہ ص ۴۱)

ان دونوں عبارات سے ثابت ہو گیا کہ اغنیاء کو صدقہ نافلہ کا لینا اور کھانا جائز ہے۔ اور شاہ صاحب نے تو خاص فاتحہ کے کھانے کو اغنیاء کے لئے جائز بتایا ہے۔ اور جب یہ اغنیاء کیلئے جائز ہے تو اس کے لئے گناہ کس طرح ہو سکتا ہے اور ان کے لینے یا کھانے پر اغنیاء گناہ گار کیونکر ہو سکتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۴) جس کھانے یا شیرینی کو بغرض ایصالِ ثواب دیا جائے اس پر قل فاتحہ پنج آیات کا پڑھنا ان چند امور پر مشتمل ہے:

(۱) اس میں جمع بین العبادتین ہے۔ (۲) قبولیت دعاء کی بھی امید ہے۔ (۳) مزید اجر و ثواب کا بھی موجب ہے۔ (۴) وہ شئی متبرک بھی ہو جاتی ہے۔

چنانچہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی فتاویٰ عزیزیہ میں اپنی مجلس شہادت حسین کی تفصیل ذکر کرتے ہوئے یہ بھی فرماتے ہیں:-

بعد از ان ختم قرآن مجید و پنج آیت خواندہ بر ما حضر فاتحہ نمودہ می آید۔ (فتاویٰ عزیزیہ ص ۱۱۱)

یہی شاہ صاحب اسی فتاویٰ کے ص ۷۵ پر فرماتے ہیں:

طعامیکہ ثواب آں نیاز حضرات امامین نمایند بر آں فاتحہ و قل و درود خوانند تبرک میشود خوردن او بسیار خوب است۔

اب باقی رہا یہ امر کہ اسکا مستحق کون ہے، اس کے متعلق مولوی اشرف علی تھانوی کا مطبوعہ فتویٰ موجود ہے جو فتاویٰ امدادیہ حصہ اول کے ص ۱۶۳ پر ہے۔

سوال۔ رواج اس ملک کا یہ ہے کہ ثواب رسانی مردہ کے لئے وارثین اپنی اپنی ہمت کے موافق طعام پختہ کھلاتے ہیں اور روپیہ پیسہ وغیرہ صدقہ کرتے ہیں۔ تو اب اس طعام پختہ و روپیہ وغیرہ کے مستحق کون ہیں؟ فقیر، غریب، مسکین وغیرہ غریب و غربا۔ تو اگر سود خور بے نمازی کی دعوت کھانا کیسا ہے؟

الجواب۔ یہ صدقہ نافلہ ہے ہر ایک کیلئے جائز ہے لیکن زیادہ اولیٰ مساکین کے لئے ہے۔

لہذا جب اس نمبر میں اس قدر فتوے خود مانعین کے مطبوعہ موجود ہیں جو اس میں مزید حوالوں کی حاجت نہیں واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۵) فاتحہ دینے کا طریقہ یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ آیۃ الکرسی کم از کم تین تین بار سورۃ اخلاص اول و آخر ۳-۳ بار درود پڑھا جائے اس کے بعد ہر دو ہاتھ اٹھا کر کہیں کہ الہی میرے اس پڑھنے پر اور ان چیزوں پر جو ثواب مجھے عطا ہوا اسے میری طرف سے تمام انبیاء کرام اور خاص کر سید الانبیاء علیہ السلام اور نام مشائخ و اولیائے کرام اور علماء کرام اور میرے فلاں فلاں عزیز و احباب اور سب مسلمانوں مرد و عورت جو گذرے یا ہیں یا ہوں گے سب کو پہونچا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۶) مسلمان جو بزرگون کیلئے نذر و نیاز کرتے ہیں نہ اس نذر سے انکا تقرب بہ نیت عبادت تصور ہوتا ہے۔ بلکہ یہ نذر تو حقیقۃ اللہ تعالیٰ کیلئے ہوتی ہے اور اس کا ثواب کسی بزرگ کی روح کو پہونچا تے ہیں اور جس چیز کی نذر کی ہے اس کو ان بزرگ کے خدام و متوسلین پر خرچ کرتے ہیں تو بلاشبہ ایسی نذر بہتر ہے۔ فقہ کی مشہور کتاب ردالمحتار میں ہے:

ان قال يا الله انى نذرت لك ان شفيت مريضى او رددت غائبي او قضيت حاجتى
انا اطعم الفقراء الذين بباب السيدة تفسية او الفقراء الذين بباب الشافعى او الامام ليث او
نشرى حصير المساجدهم او زيتا لوقودها او دراهم لمن يقوم لسائرها الى غير ذلك
يكون فيه تقى للفقراء والنذر لله عز وجل وذكر الشيخ انما هو محل لصرب النذر
مستحقه القائمين لرباطه او مسجده او جامع معه فيجوز بهذا الاعتبار۔

(ردالمحتار مصری جلد دوم ص ۱۳۱)

اگر یہ کہا کہ اے اللہ میں نے تیری نذر کی اگر تو میرے مریض کو تندرست کر دے۔ یا تو میری
گمشدہ چیز کو واپس کر دے۔ یا تو میری حاجت کو پورا کر دے۔ تو ان فقراء کو کھانا کھلاؤں گا جو سیدہ نفسیہ یا
امام شافعی یا امام لیث علیہ الرحمۃ کے آستانوں پر رہتے ہیں۔ یا انہی بزرگوں کی مساجد کے لئے بوریا یا ان
کی جلانے کے لئے تیل خریدوں گا۔ یا اس کو روپے دوں گا جو ان مساجد کی خدمت کرے۔ یا اس کے
اور چیزیں۔ تو اس میں نفع فقراء کے لئے ہے اور نذر اللہ تعالیٰ کیلئے ہے۔ اور ان بزرگوں کا ذکر صرف
ان کے لئے ہے کہ وہ مسجد و خانقاہوں کے مستحقین پر نذر کے خرچ کرنے کا محل ہے تو یہ نذر جائز ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فتاویٰ عزیزیہ میں فرماتے ہیں:

حقیقت اس نذر آنست کہ اهداء ثواب طعام و انفاق و بذل حال بروح میت کہ امریست مسنون
اور دئے حدیث صحیح ثابت است۔ مثل ما ورد فی الصحیحین من حال ام سعد و بیرہ۔ ایں نذر

مستلزم می شود۔ پس حاصل اس نذر آنست کہ اس نسبت مثلاً ابدائے ثواب ہذا النذرالی روح فلاں۔ و ذکر ولی برائے تعیین عمل منذورست، نہ برائے مصرف۔ و مصرف ایشان متوسلان آں ولی می باشند از اقارب و خدمہ و ہم طریقان و امثال ذلک، ہمیں ست مقصود نذر کنندگان بلاشبہ۔ و حکمہ انہ صحیح یجب الوفاء بہ لانہ قرینہ معتبرہ فی الشرع۔ (فتاویٰ عزیزیہ)

اس نذر کی حقیقت کھانے اور مال خرچ کرنا ثواب میت کی روح کو پہنچانا ہے اور یہ امر مننون ہے اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ام سعد وغیرہ کی حدیث میں وارد ہے۔ یہ نذر لازم ہو جاتی ہے تو اس نذر کا حاصل طعام وغیرہ کی ایک مقدار کا ثواب کسی بزرگ کی روح کو پہنچاتا ہے اور ولی کا ذکر عمل منذور کی تعیین کیلئے ہے نہ مصرف کیلئے۔ اور مصرف اس نذر کرنے والوں کے نزدیک اسی ولی کے اقارب خدام اور ان کے طریقے والے اور متوسلین ہیں اور بلاشبہ نذر کرنے والوں کا یہی مقصود ہے اور اس نذر کا حکم یہ ہے کہ یہ نذر صحیح ہے اس کی وفا واجب ہے۔ اس لئے کہ یہ شریعت میں قربت معتبرہ ہے۔

ان عبارات سے آفتاب کی طرح ثابت ہو گیا کہ مسلمان جو بزرگوں کیلئے نذریں اور نیازیں کر کے ان کا ایصال ثواب ان کی ارواح کو کرتے ہیں وہ بلاشبہ جائز و درست ہیں اور احادیث و فقہ سے ثابت ہیں۔ اور جب اس نذر و نیاز کا کرنا ثابت ہوا تو اس کا کھانا کیسے ناجائز و ناروا ہو سکتا ہے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبدمحمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۵۵۲)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ
بنگال میں یہ رواج ہے کہ جب کوئی شخص انتقال کر جاتا ہے تو اس کے متعلقین علماء اور مشائخ کو اور غریب لوگوں کو اور فقیروں کو میت کی طرف سے روپیہ پیسہ صدقہ کر دیتے ہیں (میت کو دفن کرنے سے پہلے یا بعد میں) لہذا اس طرح روپیہ پیسہ صدقہ کرنے کو دیوبندی شیطانوں نے حرام قرار دیا اور ایسا ہی فتویٰ دیدیا ہے اس کے متعلق شرع شریف میں کیا حکم ہے؟

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم
میت کی طرف سے روپیہ پیسہ وغیرہ صدقہ کرنا بلاشبہ جائز بلکہ مستحب ہے۔ اللہ تعالیٰ خود قرآن کریم میں فرماتا ہے:

واذا حضر القسمة او لو القربی والیتمی والمساکین فارز قوہم منه وقواولہم قولا
(سورۃ النساء ج ۴)

معرفا۔
جب بانٹتے وقت رشتہ دار اور اجنبی یتیم و مسکین آجائیں تو انہیں بھی کچھ دو اور ان کو اچھی بات کہو۔
علامہ ابوالبرکات نسفی تفسیر مدارک و حقائق التاویل میں اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہیں:

واذ حضر القسمة ای قسمة التركة (اولو القربی) ممن لا یرث (والیتمی والمساکین) من الا جانب (فارز قوہم) فاعطوہم (منہ) مما ترک الوالدان والاقربون
وهو امر ندب وهو باق لم ینسخ۔ (مدارک مصری ص ۱۲۲ ج ۱)

اور تقسیم ترکہ کے وقت غیر وارث رشتہ دار اور اجنبی یتیم و مساکن آجائیں تو انہیں ماں باپ اور اقارب کے ترکہ سے کچھ دو یہ دینا مستحب کام ہے اور حکم باقی ہے جو منسوخ نہیں ہوا۔
علامہ احمد جیون تفسیر احمدی میں اسی آیت کریمہ کے تحت میں فرماتے ہیں:

المال ان الله تعالى امرنا باعطاء شئ من التركة لغير الورثة فهو اما ان يكون
نطيبا لقلوبهم او تصدقا عليهم فحينئذ يكون ذلك ندیا باقیا علی حالہ۔

(تفسیر احمدی ص ۸۷ ج ۲)

نتیجہ بحث یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں غیر وارثوں کیلئے ترکہ کے کچھ دینے کا حکم فرمایا۔ پس یہ دینا یا تو ان کے دل خوش کر نیکے لئے ہے۔ یا ان پر صدقہ کرنے کے لئے ہے۔ تو یہ دینا مستحب ہو گیا اور اسی حال پر باقی رہا۔

حضرت حجتہ الاسلام امام ابو بکر رازی تفسیر احکام القرآن میں اس آیت کریمہ کے تحت میں اقوال مختلفہ نقل کرنے کے بعد آخر میں فرماتے ہیں:

وهذا كله يو جب ان يكون اعطاء هؤلاء الحاضرين عند القسمة استحبابا لا
(تفسیر احکام القرآن مصری ص ۸۷ ج ۲)

یہ کل بحث ثابت کرتی ہے کہ تقسیم ترکہ کی وقت ان حاضرین غیر وراثتہ داروں اور اجنبی یتیموں مسکینوں کو دینا مستحب ہو، واجب نہ ہو۔

علامہ ناصر السہل علاؤ الدین بغدادی تفسیر خازن میں وعلامہ محی السنہ حسین فراوی بغوی تفسیر معالم انتریل میں تحت آیت فرماتے ہیں:

القول الثانی ان هذا الامر ندب واستحب لا علی سبیل الفرض۔

والا یحجب وهذا القول هو الاصح الذی علیہ العمل الیوم (وفی معالم) هو اولی الاقاویل۔

دوسرا قول یہ ہے کہ غیر وراثتہ دار اور اجنبی یتیم و مسکین کو دینا مندوب و مستحب ہے، فرض و واجب نہیں۔ یہی قول ایسا صحیح تر ہے جس پر آج بھی عمل ہے اور تفسیر معالم میں ہے کہ یہی قول بہترین اقوال ہے۔

اس آیت اور اس کی تفاسیر سے ثابت ہو گیا کہ میت کیلئے کچھ صدقہ و خیرات کرنا مستحب ہے یہاں تک کہ میت کا ترکہ تقسیم کرنے سے قبل کچھ اس سے دیا جائے۔ آیت کریمہ کے بعد کسی حدیث کے پیش کرنے کی ضرورت تو نہیں تھی لیکن مزید اطمینان کیلئے چند احادیث نقل کی جاتی ہیں۔

بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

ان رجلا قال للنبی ﷺ ان امی ا قتلت نفسا و اظنها لو تكلمت تصدقت عنها قال نعم۔

(بخاری مصطفائی ص ۱۸۲ ج ۶۔ کتاب الجنائز باب موت الفجأة)

(وفی رواية) نعم تصدق عنها۔ (ص ۳۸۶ ج ۱۰)

ایک شخص نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا میری ماں اچانک انتقال ہو گئیں اور ان کے متعلق میں گمان کرتا ہوں کہ اگر وہ بات چیت کرتیں تو صدقہ کرتیں۔ یا صدقہ کی وصیت کرتیں۔ تو کیا انہیں ثواب ملے گا اگر میں انکی طرف سے صدقہ کرں؟۔ حضور نے فرمایا کہ ہاں انہیں ثواب پہونچے گا۔ تو ان کی طرف سے صدقہ کر دے۔

اسی بخاری شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

ان سعد بن عبادۃ توفیت وهو غایب عنها فقال یا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ

وسلم ان امی توفیت وانا غائب عنها۔ أینفعها شیء ان تصدقت بہ عنها؟۔ قال نعم۔ قال فانی اشهدك ان حائطی المخراف صدقة علیہا۔

(بخاری مصطفائی ص ۳۸۶ ج ۱۱) کتاب الوصایا باب الاشهاد)

سعد ابن عبادہ کی والدہ فوت ہو گئیں اور وہ غائب تھے۔ تو انہوں نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ میری والدہ فوت ہو گئیں اور میں ان کے پاس موجود نہ تھا۔ اگر میں ان کی طرف سے کچھ صدقہ کروں تو کیا وہ انہیں نفع دیگا؟۔ حضور نے فرمایا: ہاں۔ تو انہوں نے کہا: میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میرا باغ مخراف ان کے لئے صدقہ ہے۔

صحیح مسلم شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

ان رجلا اتی النبی ﷺ فقال یا رسول اللہ! ان امی ا قتلت نفسا ولم تو ص و اظنها لو تكلمت تصدقت اولها اجران تصدقت عنها قال نعم۔ (مسلم شریف مجتہبائی دہلی ص ۴۲۲ ج ۱)

یشک نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میری والدہ اچانک فوت ہو گئیں اور انہوں نے وصیت نہیں کی اور میں انہیں یہ گمان کرتا ہوں کہ اگر وہ کلام کرتیں تو صدقہ کرتیں۔ اب میں اگر ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا ان کیلئے ثواب ہے؟ حضور نے فرمایا: کہ ہاں ہے۔

طبرانی اور بیہقی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

قال رسول اللہ ﷺ اذا تصدق احدکم بصدقة تطوع فلیجعلها عن ابویہ فیکون لهما اجرها ولا ینتقص من اجرہ شیء۔

(شرح الصدور مصری ص ۱۲۹ وخطاوی علی مراقی ص ۳۶۳)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب تم میں کوئی شخص صدقہ نفل دے تو اسے اپنے ماں باپ کی طرف سے دے تو وہ صدقہ ان دونوں کیلئے باعث ثواب ہے۔ اور خود اس کے ثواب میں کچھ کمی نہوگی۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ میت کیلئے صدقات و خیرات کرنا حکم رسول ﷺ سے ثابت ہے۔ اور صدقہ کا ثواب میت کو پہونچتا ہے اور صدقہ کا میت کیلئے نافع ہونا بکثرت احادیث سے ثابت ہے۔

”کما فصلنا فی فتاونا الاجملیہ۔“

علاوہ ازیں یہ اہلسنت کا اجماعی و اتفاقی مسئلہ ہے بخوف طوالت اس وقت چند عبارات پیش کی

جاتی ہیں۔

شرح فقہ اکبر میں ہے:

عند اهل السنة ان للانسان ان يجعل ثواب عمله لغيره صلوٰۃ او صوما او حجا او صدقه او غير ها۔ (شرح فقہ اکبر مصری ص ۱۱۸)۔

اہل سنت کے نزدیک انسان اپنے عمل نماز و روزہ حج و صدقہ وغیرہ کا ثواب اپنے غیر کو پہنچا سکتا ہے۔

حضرت امام نووی شرح مسلم شریف میں فرماتے ہیں:

ان الصدقة عن المیت تنفع المیت ویصل ثوابها وهو كذلك باجماع العلماء وقد اجمعوا على وصول الدعاء وقضاء الدين بالنصوص الواردة في الجميع۔

(مسلم شریف مع شرح مجتہبائی دہلی ص ۴۲۴ ج ۱)

بیشک میت کی طرف صدقہ کرنا اس کو نفع پہنچاتا ہے۔ اور اس کا ثواب اسے ملتا ہے۔ یہ بات اسی طرح اجماع علماء سے ثابت ہے۔ اور ایسے ہی دعا اور ادائے قرض کے پہنچنے پر علماء نے اجماع کیا کہ ان سب میں نصوص وارد ہیں۔

علامہ ابن عابد بن بحر الرائق و بدائع سے ناقل ہیں:

من صام او صلی او تصدق وجعل ثوابها لغيره من الاموات والا حياء جاز ویصل ثوابها اليهم عند اهل السنة والجماعة۔ (رد المحتار مصری ص ۱۳۱ ج ۱)

جس نے روزہ رکھا یا نماز پڑھی یا صدقہ دیا اور اس کا ثواب اپنے غیر مردوں یا زندوں کو پہنچائے تو جائز ہے اور ان اعمال کا ثواب اہل سنت و جماعت کے نزدیک انہیں پہنچتا ہے۔

علامہ حسن شرنبلالی مرقی الفلاح میں قول علامہ زیلعی ناقل ہیں:

فلانسان ان يجعل ثواب عمله لغيره عند اهل السنة والجماعة صلوٰۃ کان او صوما او حجا او صدقة او قرأ القرآن او الاذکار او غير ذلك من انواع البر ویصل ذلك الى المیت۔ (طحاوی مصری ص ۳۶۳ ج ۱)

اہل سنت کے نزدیک انسان اپنے عمل کا ثواب اپنے غیر کو پہنچا سکتا ہے۔ اب وہ عمل نماز ہو یا روزہ۔ حج ہو یا صدقہ۔ یا تلاوت قرآن یا اذکار ہوں۔ یا اسکے سوا اور نیکیوں کے اقسام ہوں۔ یہ سب

میت کو پہنچتے ہیں اور نفع دیتے ہیں۔

بالجملہ یہ آیت کریمہ اور احادیث صحیحہ اور کتب عقائد وفقہ سے ثابت ہو گیا کہ میت کیلئے روپیہ پیسہ وغیرہ سے صدقہ کرنا نہ فقط جائز بلکہ مندوب و مستحب ہے اور اس کے لئے نفع مند۔ اور سبب خوبی آخرت ہے اور اس صدقہ کا ثبوت انہیں کتاب و سنت اور اجماع امت سے ظاہر ہو چکا تو یہ بات ناقابل انکار ہے۔ کہ صدقات کے مصارف فقراء و مساکین بھی ہیں۔ علماء و مشائخ بھی اگر ضرورت مند ہیں تو اس کا دینا بہ نسبت جاہل فقراء کے زیادہ بہتر ہے۔

علامہ طحاوی معراج اور قہستانی سے ناقل ہیں:

الصدقة على العالم الفقير افضل من الجاهل الفقير۔ (طحاوی مصری علی مرقی ص ۴۱۹) جاہل فقیر کو صدقہ دینے سے عالم فقیر کو صدقہ دینا زیادہ بہتر ہے۔ اور اگر وہ علماء مشائخ مالدار و غنی ہیں جب بھی جائز ہے کہ میت کیلئے جو صدقات کئے جاتے ہیں یہ صدقہ نافلہ ہیں اور صدقہ نافلہ غنی و مالدار کیلئے بھی جائز ہے۔

جو ہرہ نیرہ میں ہے:

ولو دفع الى الغنی صدقة التطوع جاز له اخذها (از جو ہر نیرہ شرح قدوری ص ۱۳۲) اور اگر مالدار کو صدقہ نفل دیا گیا تو اسے لینا جائز ہے۔

حاصل جواب یہ ہے کہ میت کی طرف سے جو روپیہ پیسہ وغیرہ بطور صدقہ غریبوں فقیروں اور علماء و مشائخ کو دیا جاتا ہے وہ بلاشبہ جائز ہے۔ دیوبندیوں نے اگر اس کے حرام ہونے کا فتویٰ دیا تو قرآن کریم اور احادیث کی مخالفت کی۔ اجماع کے خلاف فتویٰ دیا۔ کتب عقائد وفقہ کی تصریحات کے مقابل غلط حکم لکھا۔ لہذا ان کا یہ فتویٰ غلط و باطل ہے اس کو ہرگز ہرگز نہ مانا جائے۔ مولیٰ تعالیٰ انہیں ہدایت فرمائے واللہ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۵۵۳)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

زید کے انتقال کے بعد اس کے دو بچے اور ایک بیوی باقی رہے۔ تو اس طرح سے روپیہ پیسہ

صدقہ کرنا میت کیلئے جائز ہے یا نہیں؟۔ اور اسکے جواز کی کیا صورت ہے کیا اسکی بیوی اور بچے اس طریقہ سے صدقہ کر سکتے ہیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

میت کیلئے بالغ ورثہ یا غیر وارث اجنبی لوگ اپنے مال سے جس قدر چاہیں صدقہ کر سکتے ہیں۔ علامہ ابن عابدین کتاب خانیہ سے اور وہ محیط سے ناقل ہیں:

الافضل لمن يتصدق نفلا ان ينوی لجميع المومنین والمومنات لانها تصل اليهم ولا ينقص من اجره شئ وهو مذهب اهل السنة والجماعة۔

(رد المحتار مصری ص ۶۳۱ ج ۱)

جو شخص صدقہ نفل کرے تو اس کے لئے بہتر یہ ہے کہ تمام مسلمان مرد و عورتوں کی نیت سے کرے اس لئے کہ وہ انہیں پہنچتا ہے اور اس کے ثواب میں کچھ کمی نہیں ہوتی۔ یہی اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے۔

مواہب لدنیہ میں ہے

ان وصول ثواب القرآن الی المیت من قریب او اجنبی هو الصحيح کما تنفعه الصدقة والدعاء والاستغفار بالاجماع۔ (مواہب لدنیہ مصری ص ۴۳۲ ج ۱)

صحیح قول یہ ہے کہ رشتہ داروں اور اجنبی کی طرف سے میت کو تلاوت کا ثواب پہنچنا ایسا ہے جیسے میت کو صدقہ اور عائے استغفار باجماع نفع دیتے ہیں۔

یہی علامہ قسطلانی امام رافعی و امام نووی کا قول نقل فرماتے ہیں:

يستوی فی الصدقة والدعاء الوارث والاجنبی۔

(مواہب۔ ج ۱)

صدقہ اور دعا میں رشتہ دار و اجنبی دونوں برابر ہیں۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ اہلسنت و جماعت کا یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ میت کے لئے صدقات و اعمال صالحہ کا ایصال ثواب ورثہ اور اجانب سب کی طرف سے بلاشبہ جائز و درست ہے اور انہیں یہ ثواب پہنچتا ہے۔

اب باقی رہا یہ امر کہ خود میت کے ترکہ سے بھی اسے ایصال ثواب کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟۔ تو اس میں اصح قول یہ ہے کہ اگر ورثہ بالغ ہوں اور کل ورثہ موجود ہوں اور سب اس ترکہ سے صدقہ کرنے کی اجازت دیں تو بلاشک جائز ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

وفی کل موضع يحتاج الی الاجازة انما يجوز اذا كان المجیز من الاجازة نحو ما اذا اجازہ وهو بالغ عاقل صحيح۔ (فتاویٰ عالمگیری مجیدی کا پیور ص ۲۲۳)

ہر اس مقام میں جس میں اجازت کی حاجت ہو تو جائز ہے جب کہ اجازت دینے والا اجازت کا اہل ہو۔ جیسے کسی شی کی اجازت دی اور اجازت دینے والا عاقل بالغ ہے تو صحیح ہے۔

حضرت امام برہان الدین مرغینانی ہدایہ میں فرماتے ہیں:

ان الامتناع لحقهم فتجوز با جازتهم ولو اجاز بعض ورد بعض تجوز علی المجیز بقدر حصته لو لا یتہ علیہ وبطل فی حق الراد۔ (ہدایہ ص ۳۵۸ ج ۴)

پیشک منع کرنا حق ورثہ کی وجہ سے ہے تو ان کی اجازت سے جائز ہے اور اگر بعض ورثہ نے اجازت دی اور بعض نے انکار کیا تو اجازت دینے والے کے مقدار حصہ میں جائز ہے کہ وہ اپنے حصہ کا مالک ہے۔ اور انکار کرنے والے کے حق میں باطل ہے۔

اور اگر ورثہ بالغ ہیں لیکن بعض نے ترکہ سے صدقہ کرنیکی اجازت دی اور بعض نے اجازت نہیں دی تو جن بعض نے اجازت دی ان کے حصہ سے ہدیہ کرنا بھی بلاشبہ جائز ہے۔

عالمگیری میں ہے:

ولو اجاز البعض ورد البعض يجوز علی المجیز بقدر حصته وبطل فی حق غیر۔

(عالمگیری ص ۲۲۳ ج ۴)

اگر بعض ورثہ نے اجازت دی اور بعض نے انکار کیا تو اجازت دینے والے کے حصہ کی مقدار نیز جائز ہے اور دوسرے کے حق میں باطل ہے۔

علامہ ابن عابدین رد المحتار میں علامہ سائحانی سے اور علامہ مقدسی سے ناقل ہیں:

اذا اجاز بعض الورثة جاز علیہ بقدر حصته۔ (رد المحتار مصری ص ۴۳۰)

جب بعض ورثہ نے اجازت دی تو اس کے حصہ کی مقدار میں اس پر تصرف جائز ہے۔

اور اگر بعض ورثہ بالغ تو ہیں لیکن موجود نہیں بلکہ غائب ہیں۔ یا نابالغ صغیر ہیں، تو پھر ترکہ سے صدقہ کرنا جائز نہیں۔

حجۃ الاسلام امام ابو بکر رازی احکام القرآن میں فرماتے ہیں:

ان حضر بعض الورثة وفيهم غائب او صغير انه يعطى الحاضر نصيبه من الميراث ويمسك نصيب الغائب والصغير۔ (احکام القرآن جلد دوم ص ۸۶)

اگر بعض ورثہ موجود ہیں اور ورثہ میں بعض غائب یا نابالغ ہیں تو موجود ترکہ سے اپنے حصے کو دے سکتا ہے۔ اور غائب و نابالغ کے حصے کو نہ دیگا۔ عالمگیری میں ہے:

ان اتخذ طعاما للفقراء كان حسنا اذا كانت الورثة بالعين فان كان في الورثة صغير لم يتخذوا ذلك من التركة۔ (عالمگیری جلد دوم ص ۱۰۶)

اگر فقراء کے لئے کھانا پکوا یا تو حسن ہے۔ جب کے ورثہ بالغ ہوں اور اگر ورثہ نابالغ ہوں تو کھانا نہ تیار کرائیں یہ حکم جب ہے کہ ترکہ سے کھانا تیار کرایا جائے اس تفصیل کے بعد صورت مسئلہ میں ترکہ زید کے وارث اگر یہی دو بچے اور ایک بی بی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ دو بچے نابالغ ہو گئے تو ان کے حصوں سے میت کے لئے صدقہ نہیں کیا جاسکتا۔ ظاہر ہے کہ جب بالغ وارث ہوں اور وہ ترکہ میں اپنے حصہ سے یا اپنے اور مال سے میت کے لئے صدقہ کریں تو اس کو ناجائز و حرام کون کہہ سکتا ہے۔ دیوبندی اکثر غلط مسائل بتا کر عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ انہیں عقل و فہم عطا فرمائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدۃ سنجل

(۵۵۴)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ
برنگال میں محفل میلاد و تقاریر کی مجالس میں باواز بلند سرکار دو عالم نور مجسم حبیب کبریاء ﷺ پر
دور و سلام پڑھا جاتا ہے۔ اس طریقے سے باواز بلند پڑھنے کو فتویٰ حدیثیہ اور تفسیر روح البیان میں جائز
لکھا ہے۔ لیکن دیوبندی ملعونوں نے اس کو بدعت و ناجائز قرار دیا ہے۔ اس کے واسطے کیا حکم ہے؟

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علی رسولہ الکریم

حضور نبی کریم ﷺ پر درود و سلام پڑھنے کا حکم قرآن کریم میں خود اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ اور اس کو خود اپنا فعل اور فرشتوں کا فعل ظاہر فرماتا ہے۔

ان الله وملائكته يصلون على النبي يا ايها الذين امنوا صلوا عليه وسلموا تسليما۔

(سورہ احزاب ع ۷۷ ج ۲۲)

بیشک اللہ اور اس کے فرشتے اس نبی پر درود و سلام بھیجتے ہیں اے ایمان والو تم بھی ان پر درود و سلام بھیجو۔ اور خوب سلام بھیجو۔

آیت کریمہ کے تحت علامہ سلیمان جمل الفتوحات الالہیہ حاشیہ تفسیر جلالین میں فرماتے ہیں۔

هذه الآية دليل على وجوب الصلوة والسلام عليه مطلق۔ (جمل جلد سوم ص ۴۵۴)

یہ آیت مطلقاً درود و سلام کے واجب ہونے پر دلیل ہے۔

تحت آیت کریمہ علامہ عارف باللہ شیخ احمد صادری مالکی صاوی حاشیہ جلالین میں فرماتے ہیں:

اعلم ان العلماء اتفقوا على وجوب الصلاة والسلام على النبي ﷺ ثم اختلفوا في تعيين الوجوب فعند مالك تجب الصلاة والسلام في العمر مرة وعند الشافعي تجب في التشهد الاخير من كل فرض وعن غيرهما تجب في كل مجلس مرة وقيل تجب عند ذكره وقيل تجب في الاكثار منها من غير تقييد بعد دفالصلوة على النبي ﷺ امرها عظيم وفضلها جسيم وهي من افضل الطاعات واجل القربات۔ (صاوی مصری ص ۲۳۸ ج ۳)

جانو کہ علماء نے حضور نبی کریم ﷺ پر درود و سلام کے واجب ہونے پر اتفاق کیا ہے۔ پھر انہوں نے تعیین واجب میں اختلاف کیا۔ تو امام مالک کے نزدیک درود و سلام عمر میں ایک بار واجب ہے۔ اور امام شافعی کے نزدیک ہر فرض کے اخیر تشہد میں واجب ہے۔ اور ان کے سوا اور علماء کے نزدیک ہر مجلس میں ایک مرتبہ واجب ہے۔ اور بعض نے کہا کہ حضور ﷺ کے ذکر کی وقت واجب ہے۔ اور بعض نے کہا کہ بغیر قید عدد کے اس کی کثرت کرنا واجب ہے۔ پس حضور پر درود بھیجنا بڑا امر اور زبردست فضل ہے۔ اور وہ بہتر طاعتوں اور اعلیٰ قربتوں میں سے ہے۔

حجۃ الاسلام ابو بکر رازی احکام القرآن میں اس آیت کے تحت میں فرماتے ہیں:

قد تضمن الامر بالصلاة على النبي ﷺ وظاهره يقتضى الوجوب وهو فرض عندنا۔
(حکام القرآن مصری ص ۳۵۶ ج ۳)

حضور نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجنے کے امر پر مشتمل ہے۔ اسکا ظاہر وجوب کا تقاضا کرتا ہے۔ اور وہ ہمارے نزدیک فرض ہے۔

علامہ ابوالبرکات عبداللہ نسفی تفسیر مدارک التنزیل وحقائق التاویل میں فرماتے ہیں:

صلوا علیہ۔ ای قولوا اللہم صل علی محمد او صلی اللہ علی محمد۔ وسلموا تسلیما۔ ای قولوا اللہم سلم علی محمد۔ ثم ہی واجبة مرة عند الطحطاوی وکلما ذکر اسمہ عند الکرخی وهو الاحتیاط وعلیہ الجمہور۔ (ملخصا تفسیر مالک مصری ص ۲۳۹ ج ۳)
(تم نبی پر درود بھیجو) یعنی تم کہو اے اللہ تو حضور محمد ﷺ پر درود بھیج۔ یا اللہ حضرت محمد ﷺ پر درود بھیج۔ اور تم خوب سلام بھیجو۔ یعنی کہو اے اللہ تو حضرت محمد ﷺ پر سلام بھیج۔ پھر درود و سلام امام طحاوی کے نزدیک ایک مرتبہ واجب ہے۔ اور امام کرخی کے نزدیک جب حضور ﷺ کا نام ذکر کیا جائے اور احتیاط اسی میں ہے اور اسی پر جمہور میں۔

حضرت شیخ احمد ملا جیون نے تفسیر احمدی میں قول امام کرخی کو مفتی بہ کہا اور اسی پر اجماع کو نقل کیا۔
واجمعوا علی ان الاخیر هو الاحتیاط علیہ الجمہور۔ (احمدی ص ۳۳۹ ج ۲)
علماء نے اجماع کیا ہے کہ اخیر قول (یعنی قول امام کرخی) احتیاطی قول ہے اور اسی پر جمہور ہیں۔
اس آیت کریمہ اور اس کی تفاسیر سے ثابت ہو گیا کہ حضور اکرم ﷺ پر درود و سلام پڑھنا واجب ہے یہ اتفاقی اجماعی مسئلہ ہے۔ اتنی بات میں علماء مختلف نہیں۔ اور علما کا جو اختلاف منقول ہے وہ درود و سلام کے وقت اور عدد میں ہے اور ان اقوال میں امام کرخی کے قول میں بہت احتیاط ہے۔ یہی جمہور کا مسلک ہے۔ اسی پر علماء کا اتفاق ہوا۔ اور وہ یہ ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ کا نام نامی ذکر کیا جائے یا سنا جائے تو درود و سلام پڑھا جائے۔ محافل میلاد شریف و مجالس وعظ میں چونکہ بکثرت نام نامی ذکر کیا جاتا ہے اور سنا جاتا ہے تو ان میں درود و سلام کو بکثرت ہی پڑھا جائے گا۔ اور درود شریف کو ہر مجلس میں پڑھنے اور ذکر شریف پر ہر مرتبہ پڑھنے اور اس کی کثرت کرنے کا حکم احادیث میں ہے۔

بخاری و مسلم میں حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قلنا یا رسول اللہ کیف الصلوة علیکم اهل البيت فان الله قد علمنا كيف نسلم

علیک قال: قولوا اللهم صلی علی محمد وعلی آل محمد کما صلیت علی ابراہیم وعلی آل ابراہیم انک حمید مجید الحدیث۔ (مشکوٰۃ شریف ص ۸۶)

ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! اے اہل بیت نبوت! ہم تم پر درود کس طرح بھیجیں کہ اللہ نے ہمیں آپ پر سلام بھیجنے کی کیفیت تعلیم کی۔ فرمایا: تم یوں کہو اللہم صل علی محمد۔ الخ۔ اے اللہ حضرت محمد اور ان کی آل پر درود بھیج جیسا کہ تو نے حضرت ابراہیم اور ان کی آل پر درود بھیجا، بیشک تو حمد کیلئے ہے اور بزرگی والا ہے۔

صحیح مسلم شریف حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔

قال رسول الله ﷺ: من صلی علی واحدة صلی اللہ تعالیٰ علیہ عشاء۔

(مشکوٰۃ شریف ص ۸۶)

حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجے گا تو اللہ تعالیٰ اس پر دس بار رحمت بھیجے گا۔

ترمذی شریف میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ۔

قال رسول الله ﷺ: اولی الناس بی یوم القیمة اکثرهم علی صلوة۔

(مشکوٰۃ شریف ص ۸۶)

حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: روز قیامت محمد سے قریب تر لوگوں کا ان میں مجھ پر زیادہ درود پڑھنے والا ہوگا۔

ترمذی شریف میں حضرت ابن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال قلت یا رسول الله! انی اکثر الصلوة علیک فکم اجعل لک من صلواتی فقال ما شئت قلت الرابع، قال ما شئت۔ فان زدت فهو خیر لک۔ قلت النصف، قال ما شئت فان زدت فهو خیر لک، قلت ما فالثلثین، قال ما شئت فان زدت فهو خیر لک۔ قلت اجعل لک صلواتی کلها قال اذا یکفی همک ویکفر لک ذنبک۔

(مشکوٰۃ ص ۸۶)

حضرت ابن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں آپ پر بکثرت درود بھیجنا چاہتا ہوں۔ تو آپ پر درود بھیجنے کیلئے کتنا وقت مقرر کروں؟ حضور نے فرمایا جس قدر چاہے۔ میں

نے عرض کیا: چوتھائی تو فرمایا جتنا چاہے۔ اگر چوتھائی سے زائد وقت صرف کرے تو وہ تیرے لئے اور بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا: دو تہائی وقت فرمایا: جتنا چاہے اور اگر اس پر اور زیادہ کرے تو وہ تیرے لئے اور بہتر ہے۔ میں عرض کیا: کہ میں آپ پر درود بھیجے کیلئے اپنے تمام اوقات دعا صرف کر دوں۔ فرمایا: جب تو تیرے مقدر دینی و دنیوی کو کافی ہے۔ اور تیرے ظاہر و باطن گناہوں کو میٹ دیگا۔

ترمذی شریف میں حضرت مولیٰ علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال رسول الله ﷺ البخيل الذي من ذكرت عنده فلم يصل على۔

(مشکوٰۃ شریف ص ۸۷)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سخت بخیل وہ ہے جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے تو وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔

ترمذی شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال رسول الله ﷺ رغم انف رجل ذكر عنده فلم يصل على الحديث۔

(مشکوٰۃ ص ۸۶)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ذلیل و ہلاک ہو وہ شخص جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے پس وہ مجھ

پر درود نہ بھیجے۔

ابن انسی نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی:

من ذكرت عنده فلم يصل على فقد شقي۔ (جامع صغیر مصری ص ۱۵۴ ج ۲)

جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے وہ مجھ پر درود نہ بھیجے تو وہ بد بخت ہو گیا۔

طبرانی میں حضرت ابن عباس اور حضرت انس اور حضرت عبد اللہ بن حارث اور کعب ابن عجرہ

اور مالک ابن حویرث رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اور بزار نے حضرت جابر اور حضرت ابو ہریرہ اور حضرت

عمار سے روایت کی۔

ان النبى ﷺ صعد المنبر فقال آمين، ثم صعد درجة فقال آمين، ثم صعد درجة فقال آمين، فقال له معاذ عن ذلك فقال ان جبرائيل أتاني فقال يا محمد من سميت بين يديه

فلم يصل عليك فمات فدخل النار فابعده الله تعالى۔ قل آمين فقلت آمين۔ الخ۔

(شفا قاضی عیاض و شرح لعلی القاری مصری ص ۱۳۹ ج ۲)

بیشک نبی اکرم ﷺ منبر پر رونق افروز ہوئے اور فرمایا آمین۔ پھر ایک سیڑھی پر چڑھے اور فرمایا

آمین۔ اور سیڑھی پر چڑھے اور فرمایا آمین۔ تو حضرت معاذ نے آمین کہنے کا سبب دریافت کیا تو حضور نے فرمایا کہ جبرئیل نے میرے پاس آکر کہا کہ اے محمد ﷺ جس کے سامنے آپ کا نام ذکر کیا جائے اور وہ آپ پر درود نہ پڑھے پھر وہ مر جائے تو وہ جہنم میں داخل ہوگا اور اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت سے دور رکھے گا۔ آپ آمین کہیں تو میں نے آمین کہا۔

ترمذی شریف و ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ و ابو سعید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

ما حبس قوم مجلسا لم يذكروا الله تعالى فيه ولم يصلوا على نبيهم الا كان

عليهم ترة فان شاء عذبهم وان شاء غفر لهم۔

(جامع صغیر مصری ص ۱۲۲ ج ۱۔ شرح شفا ج ۱ ص ۲)

کوئی قوم کسی محفل میں بیٹھے اور اس میں ذکر الہی نہ کرے اور اپنے نبی کریم ﷺ پر درود نہ

پڑھے تو نقصان و خسارہ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہے گا تو اسے عذاب دیگا اور چاہے گا تو اس کی مغفرت کرے گا

ابوداؤد طیالسی اور ضیاء مقدسی حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی اور بیہقی میں بھی انھیں

سے روایت کی ہے:

ما اجتمع قوم ثم تفرقوا عن غير ذكر الله وصلاة على النبي ﷺ قاموا عن اتين من

جيفة۔

(جامع صغیر مصری ص ۱۱۹ ج ۲ شرح شفا مصری ص ۱۴۱ ج ۲)

ایک قوم کسی مجلس میں جمع ہوئی پھر وہ بغیر ذکر الہی اور بغیر نبی کریم ﷺ پر درود پڑھے مجلس سے

جدا ہوئی وہ گویا بہت بد بودار مردار سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ان حادیث سے ثابت ہو گیا کہ حضور نبی کریم ﷺ نے بھی درود و سلام پڑھنے کا حکم دیا۔ اور

انہیں وصول رحمت الہی کا سبب ٹھہرایا اور اپنے قرب کا وسیلہ ٹھہرایا اور ان کی کثرت کو حصول مقاصد کیلئے کا

فی بتایا۔ اور کفارہ ذنوب کیلئے بہترین ذریعہ ٹھہرایا اور بوقت ذکر صلاۃ و سلام بہ پڑھنے والے کو بخیل کہا اور

ذلیل و بد بخت فرمایا اور جسکی نظر میں درود کی قدر منزلت نہ ہو وہ رحمت حق سے بعید اور مستحق عذاب شدید

قرار پایا۔ اور جس مجلس میں ذکر الہی اور درود شریف نہ پڑھا جائے اس کو ناقص اور قابل ملامت قرار دیا

اور ان اہل مجلس کو خاسر و بد بودار مردار کے پاس سے کھڑا ہونیوالا ٹھہرایا۔

بالجملہ آیتہ کریمہ اور تفاسیر و احادیث سے یہ ثابت ہوا کہ مجالس و عطا و میلاد شریف میں جب

جس قدر نبی کریم ﷺ کا نام نامی اور ذکر پاک کیا جاتا ہے تو ان مجالس کے حقوق و آداب میں یہ ہیں کہ ان میں بکثرت درود و سلام کا ورد رکھا جائے۔ ذاکرین و سامعین سب اس میں مشغول رہیں کہ اہل مجلس بخل و ذلت اور نقصان و شقاوت کے وبال سے بچیں اور رحمت الہی قرب رسالت پناہی کی نعمت کے حقدار بنیں اور عفو معاصی و حصول مقاصد کی دولت سے سرفراز ہو جائیں۔ اسی بناء پر ذاکر و واعظ اہل مجلس کو درود و سلام کی بکثرت بار بار ترغیب دیتا ہے۔

چنانچہ الاشباہ والنظائر میں ہے:

العالم اذا قال في المجلس صلوا على النبي فانه يثاب على ذلك -

(الاشباہ والنظائر مع شرح حموی ص ۳۹)

جب عالم نے مجلس میں کہا تم نبی ﷺ پر درود بھیجو تو اسے اس حکم کرنے پر ثواب دیا جائیگا۔ الحاصل آیت کریمہ اور اس کی تفاسیر اور کثیر احادیث سے مجالس میں درود پڑھنے کی کس قدر اہمیت ثابت ہوئی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ وعظ و میلاد شریف کی محافل بھی مجالس ہی ہیں تو ان میں بھی درود و سلام پڑھنا انہیں نصوص سے ثابت ہوا۔ اور فقہ کی کتاب الاشباہ والنظائر سے تو یہ بھی ثابت ہو گیا کہ مجلس میں عالم و ذاکر درود شریف کا حکم بھی دے سکتا ہے۔ تو اب دیوبندی ناجائز و بدعت کس چیز کو قرار دیتا ہے۔ اگر اس کو ناجائز و بدعت کہتا ہے تو کیا اس کے نزدیک ناجائز و بدعت وہ ہے جس کا قرآن و حدیث نے حکم دیا ہے۔ مولیٰ تعالیٰ انہیں قبول حق کی توفیق دے۔

اور اگر یہ کہے کہ مجلس میں درود و سلام کی کثرت کو ناجائز و بدعت نہیں کہتا بلکہ اس کے بلند آواز سے پڑھنے کو بدعت و ناجائز کہتا ہوں تو اس کا یہ قول بھی غلط و باطل ہے کہ احادیث میں قرآن و اذکار کا بلند آواز سے پڑھنا مروی ہے۔

ابوداؤد شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

كانت قراءة النبي ﷺ بالليل يرفع طورا ويخفض طورا۔ (ابوداؤد شریف ص ۱۹۴ ج ۱)

حضور نبی کریم ﷺ رات میں قرأت کبھی بلند آواز سے پڑھتے۔ کبھی پست آواز سے پڑھتے یعنی نماز تہجد میں)

ترمذی شریف میں حضرت ابوقادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

ان النبي ﷺ قال لا بی بکر مررت بك وانت تقرأ وانت تخفص من صوتك فقال

انی اسمعت من ناجیت قال ارفع قليلا وقال لعمر مررت بك وانت تقرأ وانت ترفع صوتك، فقال انی اوقفك الوسنان واطرد الشيطان قال اخفض قليلا۔

(ترمذی ص ۶۹ ج ۱)

بیشک نبی ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: میں تمہارے قریب ہو کر گذرا، اور تم پست آواز سے قرأت کر رہے تھے۔ عرض کیا: میں جس سے مناجات کر رہا تھا اسی کو سن رہا تھا، فرمایا: تم کچھ بلند آواز سے پڑھو، حضور نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: میں تمہارے پاس سے گذرا اور تم بلند آواز سے قرأت کر رہے تھے، عرض کیا: میں سونے والوں کو جگا رہا تھا اور شیطان کو بھگا رہا تھا۔ فرمایا: تم کچھ پست آواز کرو۔

صحیح مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

كان رسول الله ﷺ اذا سلم من صلوته يقول بصوته الاعلى: لا اله الا الله وحده لا شريك له، له الملك وله الحمد وهو على كل شيء قدير الحديث۔ (مشکوٰۃ شریف ص ۸۸)

حضور نبی کریم ﷺ جب اپنی نماز کا سلام کرتے تھے تو بلند آواز سے یہ فرماتے تھے لا اله الا الله وحده لا شريك له الخ۔

اسی مسلم شریف میں ہے کہ حضرت عبداللہ عبد بن عباس رضی اللہ عنہ نے روایت کی۔

ان رفع الصوت بالذکر حين ينصرف الناس من المكتوبة كان على عهد النبي ﷺ قال ابن عباس كنت اعلم اذا انصرفوا بذلك اذا سمعته۔

(مسلم شریف مع نووی ص ۲۱۷)

زمانہ حضور نبی کریم ﷺ میں جب لوگ اپنی نماز فرض سے فارغ ہوتے تو بلند آواز سے ذکر کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا: جب میں ذکر کی آواز سن لیتا تو جان لیتا تھا کہ لوگ نماز سے فارغ ہو چکے (یعنی ذکر کی آواز سے جماعت فرض کا ختم ہونا معلوم ہو جاتا)

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ تنہا نماز پڑھنے والے کو بھی بلند آواز سے قرأت کرنا چاہیے خود حضور ﷺ نے بلند آواز سے قرأت پڑھی۔ اسی طرح نماز سے فراغت کے بعد حضور نبی کریم ﷺ بلند آواز سے ذکر پڑھتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ زمانہ اقدس میں جب میں بلند آواز سے ذکر سن لیتا تو سمجھ لیتا کہ لوگ جماعت سے فارغ ہو گئے۔

علامہ شیخ احمد طحاوی حاشیہ مراقی الفلاح میں اسی حدیث مسلم شریف نقل فرما کر لکھتے ہیں:

و يستفاد من الحديث الأخير جواز رفع الصوت بالذكر والتكبير عقيب المكتوبات بل من السلف من قال باستحبابه۔ (طحاوی مصری ص ۱۸۱۔)

فرضوں کے بعد ذکر و تکبیر کے بلند آواز سے پڑھنے کا جواز حدیث اخیر سے مستفاد ہوا بلکہ سلف میں سے بعض نے اس کا مستحب ہونا بیان فرمایا۔

علامہ سید احمد حموی شرح الاشباہ والنظائر میں عبد الوہاب شعرانی کی کتاب بیان ذکر الذاکر

للمذکور سے ناقل ہیں:

اجمع العلماء سلفا وخلفا على استحباب ذكر الله تعالى جماعة في المساجد وغيره من غير تكبير الا ان يشوش جهرهم بالذكر على نائم او مصل او قارى كما هو مقرر في كتب الفقه، (حموی کشوری ص ۵۶۰)

علماء سلف وخلف نے مسجد وغیر مسجد میں جمع ہو کر ذکر اللہ کے بجمہر مستحب ہونے پر بلا خلاف اجماع کیا۔ ہاں جب ان کا آواز بلند ذکر کرنا سونیا والے یا نماز پڑھنے والے یا قرات کرنے والے کیلئے خلل انداز ہو جیسا کہ کتب فقہ میں موجود ہے۔

علامہ ابن عابدین رد المحتار میں فتاویٰ بزاز یہ سے ناقل ہیں:

امارفع الصوت بالذكر فحائز كما في الاذان والخطبة والجمعة والحج۔

(رد المحتار ص ۲۶۳ ج ۵۔)

ذکر کا آواز بلند کرنا جائز ہے جیسے اذان و خطبہ و جمعہ و حج میں۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ ذکر کا بلند آواز سے کرنا نہ فقط جائز بلکہ سلف وخلف کے علماء نے بلا خلاف اس امر پر اجماع کیا ہے کہ مساجد وغیر مساجد میں ذکر کا بلند آواز سے کرنا مستحب ہے۔ ہاں اگر سونے والے یا نماز پڑھنے والے یا قرات کرنیوالے کیلئے مغل ہو تو پست آواز سے کیا جائے۔

اب باقی رہی یہ بحث کہ ذکر جہر افضل ہے یا ذکر خفی۔ تو اس کا فیصلہ شیخ الاسلام علامہ خیر الدین رملی نے اس طرح فرمایا۔

فتاویٰ خیر یہ میں ہے:

وهناك احاديث اقتضت طلب الاسرار والجمع بينهما بان ذلك تختلف با

اختلاف الاشخاص والا حوال كما جمع بين الاحاديث الطالبة للجهر بالقرأة والطالبة للاسرار بها ولا يعارض ذلك خير الذکر الخفی لانه حيث خيف الريا او تاذى المصلين او النيام والجهر ذكر بعض اهل العلم انه افضل حيث خلاصا ذكر لا نه اكثر عملا ولتعدى فائدته الى السامعين ويو قظ قلب الذاکر فيجمع همه الى الفكر ويصرف سمعه اليه ويطرد النوم ويزيد النشاط۔

(خیر یہ مصری ص ۱۸۱ ج ۲)

اور یہاں ایسی احادیث بھی ہیں جو پست آواز کا مطالبہ کرتی ہیں اور ہر دو قسم کی احادیث میں توافق یہ ہے کہ حکم شخصوں اور حالتوں کے اختلاف سے مختلف ہو جاتا ہے جس طرح کے قرات کی بلند آواز سے طلب کرنے والی اور پست آواز سے طلب کرنے والی حدیثوں میں توافق کیا جاتا ہے۔ اس کا معارضہ نہ کیا جائے۔ یا نمازیوں یا سونے والوں کو اذیت دے۔ اور جس جگہ یہ باتیں نہ ہوں تو بعض اہل علم نے فرمایا کہ وہاں بلند آواز سے ذکر کرنا افضل ہے کہ اس میں یہ کثیر اعمال ہیں کہ اس کا فائدہ سامعین تک پہنچتا ہے اور قلب ذاکر کو بیدار رکھتا ہے اور اس کی توجہ فکر کو جمع رکھتا ہے اور نیند کو دور کرتا ہے اور نشاط کو زائد کرتا ہے۔

علامہ ابن حجر مکی کے فتاویٰ حدیثیہ میں ہے:

بعضهم يختار الجهر لدفع الوسواس الرديء والكيفيات النفسانية ولا يقاط الغافلة واطهار الاعمال الكاملة۔ (حدیثیہ مصری ص ۵۶)

بعض نے بلند آواز کی وسوسوں اور نفسانی کیفیتوں کے دفع کرنے کے لئے اور غافل قلوب کے بیدار کرنے اور کامل عملوں کے ظاہر کرنے کے لئے اولیٰ قرار دیا۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ خلاصہ تحقیق یہ ہے۔ جب بلند آواز سے ذکر کرنے میں ریا کا خوف اور نمازیوں اور سونے والوں کو تشویش نہ ہو تو ذکر خفی سے ذکر جلی ہی افضل ہے کہ اس میں کثیر منافع ہیں اور اس ذکر جلی کا فائدہ تمام سامعین کو پہنچتا ہے۔ اور ذاکر کے قلب کو بیدار کرتا ہے۔ اس کی فکر کو منتشر نہیں ہونے دیتا۔ سماعت کو اپنی طرف متوجہ رکھتا ہے۔ نیند کو دور کرتا ہے۔ خوشی کو زائد کرتا ہے۔ ردی وسوسوں اور نفسانی کیفیتوں کو دفع کرتا ہے۔ غافل قلوب کو جگاتا ہے۔ کامل عملوں کو ظاہر کرتا ہے۔ لہذا ان وجوہ کی بنا پر بلند آواز سے ذکر کرنا افضل ثابت ہوا۔

اب یہ امر اور باقی رہتا ہے کہ مجمع میں بھی بلند آواز سے ذکر کیا جائے یا نہیں۔ تو حضرت شیخ الاسلام علامہ خیر الدین ربلی نے یہ فتویٰ دیا۔

فتاویٰ خیرہ میں ہے:

والذکر فی الملاء لا یكون الا عن جهر و کذا خلق الذکر و طواف الملائکة بها وما وزد فیها من الاحادیث فان ذلك انما یكون فی الجهر بالذکر۔

(خیرہ مصری ص ۱۸۱ ج ۲)

مجمع میں تو ذکر بلند آواز سے ہی ہو۔ اسی طرح ذکر کے حلقے اور ملکہ کا جو طواف احادیث میں وارد ہوا تو وہ بلند آواز ہی کے ذکر پر ہوتا ہے۔

علامہ ابن عابدین نے رد المحتار میں اور سید احمد حموی نے شرح الاشباہ میں حجة الاسلام امام غزالی کا یہ قول نقل کیا:

قد تبیه الامام الغزالی ذکر الانسان وحده و ذکر الجماعة باذان المنفرد و اذان الجماعة کما قال فکما ان اصوات المؤذنین جماعة تقطع جرم الهواء اکثر من صوت المؤذن الواحد کذا لک ذکر الجماعة علی قلب واحد اکثر تا ثیرافی رفع الحجب الکثیفۃ من ذکر شخص واحد۔ (رد المحتار مصری ص ۲۶۳ ج ۵) (حموی ص ۵۶۰)

امام غزالی نے ایک شخص کے ذکر کرنے اور جماعت کے ذکر کرنے کی تشبیہ ایک شخص کی اذان اور جماعت کی اذان سے دی۔ فرمایا جبکہ چند اذان کہنے والوں میں آوازیں ایک مؤذن کی آواز سے جرم ہوا کو زیادہ قطع کرتی ہیں۔ اسی طرح جماعت کا ذکر کرنا ایک شخص کے ذکر کرنے سے زیادہ قلب کے کثیف حجابات اٹھانے میں مؤثر ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ مجمع میں تو بلند آواز ہی سے ذکر کیا جائے۔ اور ایک شخص کے ذکر سے جماعت کا بلند آواز سے ذکر کرنا قلب کے کثیف حجابات کے رفع کے لئے زیادہ مؤثر ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ درود و سلام بھی منجملہ اذکار کے ایک ذکر ہی ہے۔ تو جب ذکر کا بلند آواز سے کرنا جائز و مستحب قرار پایا اور یہ خفی سے افضل ثابت ہوا۔ اور مجمع میں بلند آواز ہی سے ذکر کرنا تصریح سے ظاہر ہوا تو درود و سلام کا بھی بلند آواز ہی سے پڑھنا جائز و مستحب ٹھہرا۔ اور اس کا بلند آواز سے پڑھنا

افضل قرار پایا۔ اور اس کو جمع میں تو بلند ہی آواز سے پڑھا جائے۔ تو اب دیوبندی مجالس وعظ و محافل میلاد شریف میں درود و سلام کے بلند آواز سے پڑھنے کو ان تصریحات کے مقابلہ میں کس دلیل سے ناجائز و بدعت کہتا ہے۔ کیا دیوبندیوں کے نزدیک بدعت و ناجائز وہ ہے جو احادیث سے جائز ثابت ہو جس کو سلف و خلف افضل قرار دیں۔ جس کے استحباب پر فقہاء اجماع منعقد کریں۔ جس کے علماء اکثر منافع و فوائد شمار کرائیں۔ مولیٰ تعالیٰ ان کو قلب سلیم و فہم مستقیم عطا فرمائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: ۱۔ مقتسم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۰۳ھ

(۵۵۵)

مسئلہ

برگال میں رواج ہے کہ سال میں ایک مرتبہ یا کئی مرتبہ مولویوں وغیرہ کو قبرستان میں لیجا کر مردہ کے واسطے ایصال ثواب کیا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد ان کو کھانا بھی کھلایا جاتا ہے اور روپیہ پیسہ بھی صدقہ کیا جاتا ہے۔ اس طرح ایصال ثواب کرنا۔ مولویوں وغیرہ کو کھانا کھلانا اور صدقہ کرنا جائز ہے یا نہیں؟۔ دیوبندی حضرات اس کو بھی ناجائز بتلاتے ہیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علی رسولہ الکریم

قبرستان میں جانے کا حکم اور زیارت قبور کی ترغیب خود کثیر احادیث میں وارد ہے۔

صحیح مسلم شریف میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال رسول اللہ ﷺ نہیتکم عن زیارة القبور فزوروا (الحديث)۔

(مشکوٰۃ شریف ص ۱۵۴)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے تمہیں پہلے زیارت قبور سے منع کیا تھا پس اب تم زیارت قبور کیا کرو۔

سنن ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

ان رسول اللہ ﷺ قال کنت نہیتکم عن زیارة القبر فزوروا فانها ترہد فی الدنیا و تذکر الاخرہ۔ (مشکوٰۃ ص ۱۵۴)

یشک رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے تمہیں پہلے زیارت قبور سے منع کیا تھا پس اب تم

زیارت قبور کرو کہ وہ دنیا میں زندہ پیدا کرتی ہیں اور آخرت کو یاد دلاتی ہیں۔
بیہقی شریف میں حضرت ابن نعمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

قال رسول الله ﷺ من زار قبر ابويه او احدهما في كل جمعة غفر له وكتب برا۔

(مشکوٰۃ شریف - ص ۱۵۴)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو اپنے ہر دو ماں باپ یا ایک کی قبر کی زیارت کرے ہر جمعہ کو تو اس کی مغفرت کر دی جائیگی اور ماں باپ کو رضامند کرنے والا لکھا جائیگا۔

صحیح مسلم شریف میں حضرت ام المؤمنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

كان رسول الله ﷺ كلما كان ليلتها من رسول الله ﷺ يخرج من آخر البيل الى البقيع فيقول السلام عليكم دار قوم مؤمنين واتاكم ما توعدون غدا وانا انشاء الله بكم لا حقون اللهم اغفرها لاهل بقيع الغرقد
(مسلم مع نووی ص ۳۱۳ ج ۱)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جب حضور ﷺ کی میری رات ہوتی تو آخر رات میں بقیع تشریف لیجاتے تو فرماتے السلام علیکم دار قوم مؤمنین تمہیں جو وعدہ کیا گیا تھا کل کیلئے وہ مل گیا اگر اللہ چاہے گا تو ہم تمہارے ساتھ لاحق ہو نیوالے ہیں۔ اے اللہ تو اہل بقیع غرقہ کی مغفرت فرما۔

مسلم شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ایک طویل حدیث مروی ہے جس میں حضور علیہ السلام کے بقیع شریف جانے کا واقعہ ہے اور وہ ان کی مقررہ شب تھی، حضور نے اپنی جان کی وجہ یہ بیان فرمائی۔

فان جبرئيل عليه السلام اتاني حين رأيت فتاداني فاخفاه منك فاجبته فاحفنيته منك ولم يكن يدخل عليك وقد وضعت ثيابك وظننت ان قد رقدت فكرهت ان او قظك وخشيت ان تستوحشي فقال ان ربك يا مراك ان تاتي اهل البقيع فتستغفر لهم قالت قلت كيف اقول لهم يا رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم ، قال قولی السلام علیکم علی اهل الديار من المؤمنين۔ الحدیث
(مسلم - ص ۳۱۴ ج ۱)

بیشک جبرئیل علیہ السلام میرے پاس آئے جس وقت تو نے اے عائشہ دیکھا تھا تو انہوں نے تجھے پکارا۔ پس میں نے اس کو تم سے چھپایا اور اس کی اجابت کی تو اس نے اس کو تم سے پوشیدہ رکھا اور

چونکہ تو اپنے پڑے اتار چکی تھی اسلئے تمہارے پاس نہیں آئے اور میں نے خیال کیا کہ تم سو گئی ہو۔ تو میں نے تمہارا جگانا مناسب نہیں جانا اور تمہاری وحشت کا خوف کیا۔ پس جبرئیل نے کہا کہ آپ کا حکم دیتا ہے کہ آپ اہل بقیع کے نزدیک تشریف لیجائیں اور ان کیلئے مغفرت طلب کریں۔ حضرت عائشہ نے عرض کیا کہ میں اہل قبور سے کیا کہوں فرمایا: تم یہ کہو اے اہل دیار مؤمنین تم پر سلام ہو۔

جامع ترمذی شریف میں انہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

قالت فقدت رسول الله ﷺ ليلة فخرجت فاذا هو بالبقيع فقال اكنت تخافين ان يحيف الله عليك ورسوله قلت يا رسول الله ظننت انك اتيت بعض نساءك فقال ان الله تبارك وتعالى نزل ليلة النصف من شعبان الى سماء الدنيا فغفر لاكثر من عدد شعر غنم كلب۔
(ترمذی شریف مجیدی - ص ۱۰۴ ج ۱)

حضرت عائشہ نے فرمایا ایک رات میں نے رسول اللہ ﷺ کو نہ پایا تو میں نکلی تو حضور بقیع میں تشریف فرما ہیں۔ حضور نے فرمایا کیا تو یہ خوف کرتی تھی کہ اللہ کے رسول تجھ پر ظلم کریں گے؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے یہ خیال کیا کہ کسی دوسری بی بی کے پاس تشریف لے گئے۔ فرمایا بیشک اللہ تبارک وتعالیٰ شعبان کی پندرہویں شب میں پہلے آسمان کی طرف نزول فرماتا ہے تو قبیلہ کلب کی بکریوں کے بالوں کی مقدار سے زائد لوگوں کی مغفرت فرماتا ہے۔

خاتم المحدثین حضرت جلال الدین سیوطی نے شرح الصدور میں بیہقی کی روایت ذکر کی:

كان النبی ﷺ يزور شهداء احدى كل حول واذا بلغ الشعب رفع صوته فيقول سلام عليكم بما صبرتم فنعمة عقبي الدار ثم ابو بكر رضي الله عنه كل حول يفعل مثل ذلك ثم عمر بن الخطاب ثم عثمان رضي الله عنهما وكانت فاطمة بنت رسول الله ﷺ تاتيهم وتدعو وكان سعد بن ابى وقاص يسلم عليهم ثم يقبل على اصحابه فيقول الا تسلمون على قوم يردون عليكم السلام۔
(شرح الصدور - ص ۸۷)

حضور اکرم ﷺ ہر سال میں شہداء احد کی قبور کی زیارت کرتے تھے اور جب شعب میں پہنچتے تو بلند آواز سے فرماتے تمہارے اوپر سلام ہو تمہارے صبر کرنے کے عوض تو یہ پچھلا گھر کیا اچھا ہے۔ پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہر سال ایسا ہی کرتے۔ پھر حضرت فاروق اعظم پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضور علیہ السلام کی صاحبزادی حضرت فاطمہ قبور شہداء کی زیارت کرتیں اور دعاء مانگتی تھیں اور حضرت

سعد بن ابی وقاص بھی قبور شہداء پر سلام کہتے پھر اپنے ہمراہوں کی طرف متوجہ ہو کر فرماتے تم ایسی قوم پر سلام کیوں نہیں کرتے جو تمہیں سلام کا جواب دیں۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ حضور ﷺ نے قبرستان میں جائزہ کا حکم کیا اور زیارت قبور کے فوائد ذکر فرمائے کہ یہ زیارت دنیا میں زہد پیدا کرتی ہے اور آخرت کو یاد دلاتی ہے اور ہر جمعہ کو ماں باپ کی قبور پر جائزگی ترغیب دی۔ اور خود حضور علیہ السلام مدینہ کے قبرستان بقیع شریف میں تشریف لیجاتے اور اہل قبر کو سلام کرتے ان کیلئے دعاء مغفرت فرماتے۔ ہر سال شہداء احد کی زیارت قبر کیلئے تشریف لیجاتے خلفاء راشدین سالانہ احد میں تشریف لیجاتے اور صحابہ کرام بھی مزارات شہداء پر حاضر ہوتے اور دوسروں کو زیارت قبور کی ترغیب دیتے بلکہ اس زیارت قبور کی ترغیب کے لئے حضرت جبریل امین نازل ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا۔ لہذا قبرستان میں جانا حدیث قولی و فعلی دونوں سے مسنون ثابت ہو۔ لہذا اگر تنہا جائے جب سنت ہے اور دوسروں کو رغبت دیکر اپنے ساتھ لیجائے جب بھی سنت ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا فعل گزرا کہ وہ قبرستان جانے کیلئے اپنے اصحاب کو ترغیب دیتے تھے۔

اب باقی رہی یہ بات کہ قبرستان میں پہنچ کر کیا کرے تو اتنا تو ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ وہاں دعا کرنا سلام کرنا مسنون ہے۔ اب رہا ایصال ثواب کرنا تو کبھی تو ایصال ثواب قرآن کریم پڑھ کر کیا جاتا ہے اور یہ بھی حدیث شریف سے ثابت ہے۔

چنانچہ ابوالقاسم اپنے فوائد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں:

قال رسول الله ﷺ من دخل المقابر ثم قرأ فاتحه الكتاب وقل هو الله احد والهكم التكاثر ثم قال اللهم اني قد جعلت ثواب ما قرأت من كلامك لا هل المقابر من المؤمنين والمومنات كانوا اشفعاء له الى الله تعالى۔ (شرح الصدور مصری ص ۱۳۰)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص قبرستان میں داخل ہو پھر سورہ فاتحہ اور سورہ اخلاص اور سورہ تکاثر پڑھے پھر کہے اے اللہ میں نے جو تیرے کلام پاک کی قرأت کی اس کا ثواب قبرستان کے سب مسلمان مرد و عورت کو پہنچا تو اموات اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور شفیع ہوں گے۔

اس حدیث سے ثابت ہو گیا کہ خود حضور علیہ السلام نے ثواب قرأت قرآن کے ایصال کا حکم دیا۔ صحابہ کرام بھی قرآن پڑھ کر ایصال ثواب کیا کرتے تھے۔

اخرج الخلال في الجامع عن الشعبي قال كانت الانصار اذ اقامت لهم المیت اختلفوا الى قبره يقرؤن له القرآن۔

(شرح الصدور ص ۱۳۰)

خلال نے جامع میں امام شعبی سے روایت کی کہ انصار میں جب کسی شخص کا انتقال ہو جاتا تو وہ قبر کی طرف جاتے اور اس کے لئے قرآن پڑھتے تھے۔

بلکہ قرأت قرآن اموات کا ایصال ثواب کرنا اہل اسلام کا اجماعی مسئلہ ہے۔

چنانچہ شرح الصدور میں ہے:

ان المسلمين ما زالوا في كل عصر يجتمعون ويقرؤن لموتاهم من غير نكير فكان ذلك اجماعاً۔ (شرح الصدور ص ۱۳۰)

پیشک مسلمان ہر زمانہ میں جمع ہوتے رہے اور اپنے میت کیلئے بغیر کسی اختلاف کے قرأت کرتے رہے تو یہ اجماع ہو گیا۔

فتاویٰ عالمگیری میں ذخیرہ سے ناقل ہیں:

يستحب عند زيارة القبور قراءة سورة الاخلاص سبع مرات فانہ بلغنی ان من قراها سبع مرات ان كان ذلك غير مغفور له يغفر له وان كان مغفور له اغفر لهذا القاري ووهب ثوابه للمیت۔ (عالمگیری مجید کانپوری ص ۱۰۹ ج ۳)

بالجملہ قرآن کریم کی قرأت کا ایصال ثواب کرنا حضور نبی کریم ﷺ کے حکم سے بھی ثابت ہوا۔ اور صحابہ کرام کے فعل سے بھی ثابت ہوا۔ اور اجماع مسلمین سے بھی ثابت ہوا۔ اور فقہ کی کتاب سے بھی ثابت ہوا۔ لہذا اب اس کا کوئی مسلمان تو انکار کر نہیں سکتا۔

اب باقی رہا صدقات سے کھانا کھلا کر ایصال ثواب کرنا تو یہ بھی احادیث سے ثابت ہے۔

ابوداؤد و نسائی میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

قال يا رسول الله ان ام سعد ماتت فاي الصدقة افضل قال الما فحفر بيرا قال هذه لام سعد۔ (مشکوٰۃ شریف ص ۱۶۹)

حضرت سعد نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ام سعد کا انتقال ہو گیا تو کونسا صدقہ افضل ہے حضور نے فرمایا پانی۔ تو کنواں کھودا گیا فرمایا: کنواں ام سعد کیلئے ہے۔

طبرانی میں حضرت عقبہ ابن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

قال رسول الله ﷺ ان الصدقة لتطفي عن اهل القبور :

(جامع صغیر مصری ص ۶۹ صرح صدور ص ۱۲۸)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کہ بیشک صدقہ اہل قبور سے اس کی حرارت کو بجھا دیتا ہے۔

طبرانی نے اوسط میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے:

يقول رسول الله ﷺ ما من اهل ميت يموت منهم ميت فيصدقون عنه بعد موته

الا هداها له جبرئيل على طبق من نور ثم يقف على شفير القبر فيقول يا صاحب القبر

العميق هذه هدية اهداها اليك اهلك فاقبلها فتدخل عليه فيفرح بها يستبشر ويحزن جبرائيل

الذين لا يهدى لهم شئى -

(شرح الصدور ص ۱۲۹)

رسول اللہ ﷺ فرماتے: اہل بیت جن میں کوئی شخص مر جائے اور وہ اس کے مرنے کے بعد

اس کی طرف صدقہ کرے تو جبرئیل اس میت کیلئے اس صدقہ کو نور کے طبق میں لیجاتے ہیں اور کنارہ قبر پر

کھڑے ہو کر کہتے ہیں کہ عمیق قبر والے یہ وہ سب یہ ہے کہ جس کو تیرے اہل نے تیری طرف بھیجا ہے

پس میت پر داخل ہوتا ہے اور میت اس سے فرحت و سرور حاصل کرتا ہے اور اس کے وہ پڑوسی جن کو کچھ

نہیں آیا ہے وہ رنجیدہ ہوتے ہیں -

علامہ زرقاتی شرح مواہب لدنیہ میں حدیث کے جملہ افضل الصدقہ الماء کے تحت میں

فرماتے ہیں:

هذا في موضع يقل فيه الماء ويكثر العطش والافسقى الماء على الانهار القنى

لا يكون افضل من اطعام الطعام عند الحاجة -

(زرقاتی مصری ص ۴۵۰ ج ۵)

پانی کا افضل صدقہ ہونا اس مقام میں ہے جہاں پانی کی قلت ہو اور پیاس کی زیادہ خواہش ہو

ورنہ نہروں اور ذخائر پر پانی پلانا بوقت ضرورت کھانا کھلانے سے افضل نہ ہوگا۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ اموات کو ایصال ثواب صدقات سے بھی کیا جاتا ہے۔ اور

صدقات کا ثواب میت کو پہنچتا ہے۔ اور اس سے اس کو فرحت و سرور حاصل ہوتا ہے۔ اور کھانا کھانا

افضل صدقات میں سے ہے اسی بنا پر علماء کا اس پر اجماع ہوا۔

علاقہ قسطلانی مواہب میں اور علامہ زرقاتی اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

وذكر الشيخ شمس الدين ابن قطان العسقلاني ان وصول ثواب القران الى الميت

من قريب او اجنبي هو الصحيح مع النية وهو المعتمد عند متأخر الشافعية كما تنفع

الصدقة عنه والدعاء والاستغفار له بالاجماع المؤيد بصريح كثير من الاحاديث -

(زرقاتی مصری ص ۴۰۷ ج ۵)

شیخ شمس الدین ابن قطان عسقلانی نے ذکر کیا کہ رشتہ دار یا اجنبی کا سنت کیسا تھ میت کے لئے

قرآت کا ثواب پہنچانا متأخرین شافعیہ کے نزدیک صحیح و معتمد ہے جیسے کہ میت کے طرف سے صدقہ کرنا

اور اس کے لئے دعاء و استغفار کرنا اس کو نفع پہنچاتا ہے اور یہ اس اجماع سے ثابت ہے جسکی تائید کثیر

احادیث کی صراحت کرتی ہے۔

علامہ شیخ محمد مشقی رحمۃ اللہ فیہ اختلاف الائمہ میں فرماتے ہیں:

اجمعوا على ان الاستغفار والدعاء والصدقة والحج والعق تنفع الميت ويصل

اليه ثوابه -

(رحمۃ اللہ مصری ص ۱۰۲ ج ۱)

علماء نے اس پر اجماع کیا کہ استغفار اور دعاء اور صدقہ اور حج اور غلام آزاد کرنا میت کو نفع دیتا

ہے اور ان کا ثواب اسے پہنچتا ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں:

ومستحب است که تصدق کردہ شود از میت بعد از رفتن اواز عالم تا ہفت روز و تصدق از میت نفع

میکند اور ابے خلاف بیان اہل علم و وارد شدہ است در اہل احادیث صحیح خصوصاً -

(اشعۃ اللمعات کشوری)

اور مستحب ہے کہ میت کیلئے اس کے اس عالم سے جانے کے بعد سے سات روز تک صدقہ کیا

جائے اور اہل علم اس میں مختلف نہیں کہ میت کیلئے صدقہ کرنا اسے نفع دیتا ہے اس کے ثبوت میں خاص طور

پر صحیح حدیثیں وارد ہوئیں۔

امام احمد نے زہد میں اور ابو نعیم نے حلیہ میں حضرت طاووس رضی اللہ عنہ سے روایت کی:

ان الموتى يفتنون في قبورهم سبعة فكانوا يستحبون ان يطعم منهم بتلك الايام -

(صحیح بہاری ص ۹۵۱ ج ۲)

کتاب الجنائز / باب الصدقات للمیت
بیشک مردے اپنے قبروں میں سات روز تک آزمائش کئے جاتے ہیں تو لوگ ان دنوں میں مردوں کیلئے کھانا کھانا مستحب جانتے تھے۔

ان عبا رات سے ثابت ہو گیا کہ میت کیلئے ایصال ثواب صدقات سے کرنے پر اجماع ہوا۔ اہل علم میں کوئی اسکا مخالف نہیں اور کثیر احادیث صحیحہ اس کی تائید کرتی ہے اور کھانا کھانا بھی صدقات ہی میں داخل ہے بلکہ زرقانی کی عبارت سے ثابت ہوا کہ کھانا کھانا افضل صدقہ ہے۔ اس بنا پر مسلمان ہفتہ بھر تک میت کی طرف سے کھانا کھلاتے ہیں۔

الحاصل میت کیلئے ایصال ثواب جس طرح تلاوت قرآن کریم کرنا مسنون و جائز ہے اسی طرح صدقات اور کھانا کھانا کر ایصال ثواب کرنا بھی بلاشبہ جائز بلکہ مسنون ہے۔ دیوبندی اس کو ناجائز کہہ کر دین پر افترا کرتا ہے اور فعل مسنون کو ناجائز قرار دیتا ہے۔ اور محض اپنی رائے ناقص سے حلال کو حرام ٹھراتا ہے۔ مولیٰ تعالیٰ انہیں ہدایت کرے۔ واللہ تعالیٰ علم بالصواب۔

کتبہ: المقصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۰۱ھ

مسئلہ

(۵۵۶)

بنگال میں تقریر کیلئے عالموں کو دعوت دی جاتی ہے اور صاحب دعوت کے طرف سے عالموں و فاضلوں کو نذرانہ بھی پیش کیا جاتا ہے اور کھانا بھی کھلایا جاتا ہے اور یہ بھی رواج ہے کہ ختم قرآن کے بعد قاریوں کو روپیہ پیسہ صدقہ کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ سے نہ تو دینے والا اس کو اجرت سمجھتا ہے اور نہ لینے والا بلکہ اس کو صدقہ خیال کیا جاتا ہے۔ دیوبندی اس کو ناجائز اور حرام قرار دیتے ہیں اور حرام۔ ہشامی میں ختم قرآن کے بعد ۴۱ درم لینا جائز لکھا ہے اور الاشباہ والنظائر میں مطلق طاعت میں جائز قرار دیا ہے جواب مع الدلیل مرحمت فرمایا جائے۔ بینو اتوجروا۔ احقر سید الخیر نعیمی اسلام آباد۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

عالموں کو بعد تقریر نذرانہ دینا اور کھانا کھانا اسی طرح قاریوں کو ختم قرآن کریم پر روپیہ پیسہ صدقہ کرنا جب اس طرح پر ہے کہ دینے والا اس کو اجرت سمجھ کر نہ دیتا ہے اور نہ لینے والا اس کو اجرت جان کر لیتا ہے تو وہاں کے عرف و رواج میں دینے والا بہ نیت اجرت دیا کرتا ہے نہ لینے والا بخيال اجرت لیا کرتا ہے

کتاب الجنائز / باب الصدقات للمیت
بلکہ ہر دو صدقہ لیتے دیتے ہیں تو یہ بلاشبہ جائز ہے۔

بخاری شریف و مسلم شریف میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ حدیث مروی ہے
يقول كان رسول الله ﷺ يعطيني العطاء فاقول اعطه افقر اليه مني فقال رسول الله ﷺ خذوا واذا جاءك من هذا المال وانت غير مشرف ولا سائل فخذوه وما لافلا تبعه نفسك۔
(بخاری مصری ص ۱۹۸ ج ۴)

حضرت عمر فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ مجھ کو عطیہ دیتے تھے تو میں عرض کرتا کہ اس کو ایسے شخص کو دیجئے جو مجھ سے زیادہ محتاج ہو تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو لے اور تیرے پاس اس مال میں سے جو آئے اور تو اسکا جمع کر نیوالا اور سوال کرنے والا نہ ہو تو اس کو لے۔ اور جو اس طرح کا نہ ہو تو اس کے لئے اپنے دل میں خواہش نہ کر۔

مسلم شریف میں حضرت ابن ساعدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے

قال استعملني عمر بن الخطاب على الصدقة فلما فرغت عنها واديتها اليه امر لي بعالة فقلت له انما عملت لله اجرى على الله فقال خذ ما اعطيت فاني عملت على عهد رسول الله ﷺ او سلم فعملني فقلت مثل قولك فقال لي رسول الله ﷺ اذا اعطيت شيئا من غير ان تسال فكل تصدق۔ قال سالم فمن اجل ذلك كان ابن عمر لا يسال احدا شيئا ولا يرد شيئا اعطيه۔
(مسلم شریف مع نوری ص ۳۳۴ ج ۱)

حضرت ابن ساعدی نے کہا کہ حضرت عمر بن خطاب نے مجھے صدقہ وصول کرنے کیلئے عامل بنایا پس جب میں اس سے فارغ ہو گیا اور اس صدقہ کو انہیں دیدیا تو حضرت عمر نے میرے لئے اجرت عمل دینے کا حکم فرمایا، تو میں نے ان سے عرض کیا کہ میں نے تو اللہ ہی کیلئے کام کیا ہے۔ میرا اجر تو اللہ ہی پر ہے تو حضرت عمر نے فرمایا تجھے جو دیا جاتا ہے لے، میں بھی زمانہ اقدس میں یہ کام کیا کرتا تھا تو حضور نے مجھے اجرت عمل دی پس میں نے بھی تیری بات کہی تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جب تجھے کوئی چیز بغیر مال کے دی جائے پس تو کھا اور صدقہ کر۔ حضرت سالم نے کہا اسی وجہ سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی یہ بھی خرچ کی بابت سوال نہیں کیا کرتے تھے۔ اور جو چیز انہیں دی جاتی تو اسے رد نہیں کرتے تھے مسند امام احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

من اتاه الله من هذا المال شيامن غير ان يسأل فليقبله فانما هو رزقا قدر الله اليه

(جامع صغير مصری ص ۱۳۹ ج ۱)

اللہ جسے کچھ اس مال سے بغیر سوال کے دے تو وہ اس کو قبول ہی کر لے کہ وہ رزق ہے جس کو اللہ نے اسکی طرف بھیجا۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ جو مال بلا طلب اور بغیر طمع کے ملے تو اس کو لے لیا جائے۔ اور اس کو رد نہ کیا جائے کہ وہ رزق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے دیا ہے۔ اب اس کو خود بھی کھا سکتا ہے اور صدقہ بھی کر سکتا ہے۔

بالجملہ جب دینے والا اور لینے والے دونوں کا قصد عوض اجرت نہیں تو پھر اسے جواز میں کیا کلام ہے بلکہ اس صورت میں درحقیقت عالم وعظ کہہ کر اور قاری قرآن کریم پڑھکر لوگوں میں صدقہ کرتے ہیں کہ حدیث شریف میں ہے:

من الصدقة ان تعلم الرجل العلم رواه الحسن مرسلاد۔

(جامع صغير ص ۱۳۸)

صدقہ سے ہے کہ تو ایک شخص کو علم سکھائے۔

مسلم شریف میں حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے:

ان نامسا من اصحاب النبي ﷺ قالوا للنبي ﷺ يا رسول الله ذهب اهل الدثور بالا جور يصلون كما نصلي يصومون كما نصوم ويتصدقون بفضول اموالهم قال اوليس قد جعل الله لكم ما تصدقون به ان بكل تسبيح صدقة وكل تكبير صدقة وكل تحميد صدقة وكل تهليل صدقة وامر بالمعروف صدقة ونهى عن منكر صدقة (وفى رواية والكلمة الطيبة صدقة۔)

(مسلم مع نودی ص ۲۲۳ ج ۱)

حضور نبی کریم ﷺ سے بعض صحابہ کرام نے عرض کیا اے رسول اللہ ﷺ مالدار زیادہ ثوابوں کے حقدار ہوئے کہ جس طرح ہم نماز پڑھتے وہ بھی نماز پڑھتے ہیں۔ جیسے ہم روزہ رکھتے ہیں وہ بھی روزہ رکھتے ہیں۔ نیز وہ اپنے زائد مالوں سے صدقہ کرتے ہیں۔ تو حضور نے فرمایا کہ اللہ نے تمہارے لئے ایسی چیزیں نہ کیں جن سے تم بھی تصدق کرو۔ بیشک ہر تسبیح پر صدقہ ہے اور ہر تکبیر پر صدقہ ہے اور ہر حمد کرنا صدقہ ہے اور ہر بار لا الہ الا اللہ پڑھنا صدقہ ہے اور نیکی کا حکم کرنا صدقہ ہے۔ ہر گناہ سے منع

کرنا صدقہ ہے۔ پاکیزہ کلمہ صدقہ ہے۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ عالم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور تعلیم علم کیساتھ صدقہ کرتا ہے۔ اسی طرح قاری قرآن کریم پڑھکر اور تسبیح و تحمید اور کلمہ طیبہ سے صدقہ کرتا ہے۔ تو اب اس کے جواب میں از روئے مروت سامعین کو خاص کر داعی کو بھی ان پر صدقہ کرنا چاہیے کہ احسان کا بدلہ احسان ہے۔

چنانچہ حضرت شیخ الاسلام والمسلمین علامہ خیر الدین ربلی استاذ صاحب درمختار نے فتویٰ دیا۔ سوال وجواب دونوں نقل کئے جاتے ہیں:

(سئل) فی رجل علم صغير القرآن ولم يشترط له ابوہ اجرة هل يقضى له بالا جرة ام لا لعدم تسميتها (اجاب) لا يقض له بالا جرة حيث لم تقعد بشروطها ولكن مجازاة الاحسان من غير شرط مروة واللہ تعالیٰ اعلم۔ (خیر یہ مصری ص ۱۱۰ ج ۲)

ایک شخص کے متعلق سوال کیا گیا جس نے بچے کو قرآن کی تعلیم دی اور اس کے والد نے اس سے اجرت شرط نہیں کیا تو کیا اسکے لئے اجرت کا حکم دیا جائیگا۔ یا طے نہونیکی بنا پر نہیں۔ علامہ نے جواب دیا کہ ایسے عقد نہ ہونے کی بنا پر اجرت کا حکم نہ دیا جائیگا لیکن از روئے مروت بغیر شرط کے بھی احسان کا بدلہ احسان تو ہے یعنی اس کو بطور احسان دے۔

لہذا ثابت ہو گیا کہ اس مخصوص صورت میں عالم وقاری کو بطور صدقہ دینا بلاشبہ جائز ہے بلکہ بہ نسبت جاہل کے عالم کو صدقہ دینا افضل ہے۔

طحطاوی میں ہے:

التصدق على العالم الفقير افضل من الجاهل الفقير۔ (طحطاوی مصری ص ۲۱۹)

عالم فقیر پر صدقہ کرنا جاہل فقیر سے افضل ہے۔ فقہاء کرام نے یہ تصریح کی کہ صدقہ ایسے شخص کو ندے جو اس کو کسی گناہ میں صرف کرے یا فضول باتوں اور اسراف میں خرچ کرے بلکہ نیک آدمی نمازی کو دے۔

طحطاوی میں ہے:

لا ينبغي دفعها لمن علم انه ينفقها في اسرف او معيثة وقال ابو حفص الكبير انه لا يصرفها لمن لا يصلي الاحياء وان اجزأه۔ (طحطاوی ص ۲۱۹)

جس کو یہ جانتا ہے کہ یہ صدقہ کو گناہ یا اسراف میں صرف کریگا تو اسے صدقہ دینا مناسب نہیں البتہ
حفظ کبیر نے فرمایا کہ صدقہ اسے نہ دیا جائے جو نماز کا پابند نہیں کبھی پڑھ لیتا ہو اور اگر دیدیا تو ادا ہو
جائے گا۔

اور یہ بات ظاہر ہے کہ عالم وقاری اکثر بیشتر دیندار و نیک ہوتے ہیں نماز کے پابند ہوتے ہیں
کبیرہ گناہوں سے پرہیز کرتے ہیں تو ان کو صدقہ دینا بلاشبہ افضل و بہتر ہے۔ اگر دیوبندی اس کو ناجائز
و حرام کہتے ہیں تو ان کے قول کا باطل و غلط ہونا ظاہر ہے۔

اب باقی رہا مسائل کا اور الاشباہ والنظائر کی عبارت کی طرف اشارہ کرنا تو تحقیق مقام یہ ہے کہ
متاخرین کے نزدیک معلم قرآن و تعلیم فقہ و امامت و اذان و اقامت و وعظ کی اجرت لینا جائز اور یہی مفتی
بقول ہے۔

چنانچہ علامہ ابن عابدین نے رد المحتار میں ان اقوال کو جمع فرمایا اور متون کے اقوال صرف اس
لئے نقل کئے کہ فتوے کیلئے متون ہی وضع کئے گئے ہیں:

قال فی الهدایہ و بعض مشائخنا رحمہم اللہ تعالیٰ استحسنوا الاستیجار علی
تعلیم القرآن الیوم لظہور التوائی فی الامور الدینیہ ففی الامتناع تضییع حفظ القرآن
وعلیہ الفتویٰ او وقد اقتصر علی استثناء تعلیم القرآن ایضا فی متن الكنز و متن مواہب
الرحمن و کثیر من الکتب وزاد فی مختصر الوقایہ و متن الاصلاح تعلیم الفقہ وزاد فی متن
المجمع الامامہ و مثله فی متن الملتقی و ذررا لبحار وزاد بعضهم الاذان والاقامہ والوعظ
۔ (رد مختار جلد ۵ صفحہ ۳۲)

ہدایہ میں کہا کہ ہمارے بعض مشائخ نے اب تعلیم قرآن پر اجرت لینے کو اچھا جانا کہ دینی
امور میں سستی ظاہر ہے تو منع کرنے میں حفاظت قرآن کو ضائع کرنا ہے۔ اس پر فتویٰ ہے اور متن کنز اور
مواہب الرحمن اور کئی کتب میں صرف تعلیم قرآن کا استثناء کیا۔ اور مختصر وقایہ اور اصلاح میں تعلیم فقہ کو اور
زائد کیا اور متن مجمع اور ملتقی اور درر البحار میں امامت کو اور زیادہ کیا اور بعض فقہاء نے اذان و اقامت اور
وعظ کا اور اضافہ کیا۔

شیخ محقق ابن نجیم نے الاشباہ والنظائر میں فرمایا:

افتی المتقدمون بان العبادات لا تصح الاجارة علیہا کالامامۃ والاذان وتعلیم

القرن والفقہ لکن المعتمد ما افتی بہ المتأخرون من الجواز۔

(الاشباہ والنظائر مع حموی کشوری۔ ص ۵۶۔ ج ۱)

متقدمین نے فتویٰ دیا کہ ان عبارتوں میں اجرت صحیح نہیں جیسے امامت و اذان، تعلیم قرآن، تعلیم
فقہ، لیکن متأخرین نے ان کے جواز پر فتویٰ دیا اور یہ قول مفتی بہ ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ تعلیم قرآن و تعلیم فقہ و امامت و اذان و اقامت و وعظ پر اجرت
لینا جائز ہے اور یہی قول معتمد و مفتی بہ ہے۔ اب رہا قرأت و تلاوت قرآن پر اجرت لینا یہ جائز نہیں۔
حضرت علامہ خیر الدین رملی حاشیہ بحر میں فرماتے ہیں:

المفتی بہ جواز الاخذ استحسانا علی تعلیم القرآن لاعلیٰ القراءة المجردة۔

(رد المحتار مصری ص ۶۷ ج ۵)

مفتی بہ استحسانا اجرت لینے کا جواز صرف تعلیم قرآن پر ہے نہ فقط تلاوت قرآن پر۔

علامہ عینی نے شرح ہدایہ میں فرمایا:

و یمنع القاری للدنیا والآنخذ والمعطى آثمان فالحاصل ان ما شاع فی
زماننا من قراءة الاجزاء بالاجرة لا یجوز۔

(رد مختار مصری ص ۳۶ ج ۵)

حصول دنیا کے لئے پڑھنے والوں کو منع کیا جائے لینے والا اور دینے والا دونوں گنہگار ہیں
۔ حاصل یہ ہے کہ ہمارے زمانہ میں جو سپاروں کو باجرت پڑھنا شائع ہو گیا ہے یہ جائز نہیں۔

شیخ الاسلام تقی الدین نے فرمایا:

ولا یصح الاستیجار علی القراءة و اهدائها الی المیت لا نه لم ینقل عن احد من
الائمة الاذن فی ذلك وقد قال العلماء ان القاری اذا قرأ لا جل المال فلا ثواب له فای شیء
یهدیه الی المیت وانما یصل الی المیت العمل الصالح والا استیجار علی مجرد التلاوة فلم
یقل به احد من الائمة وانما تنازعوا فی الاستیجار علی التعلیم۔

(رد المحتار مصری ص ۳۷ ج ۵)

اجرت پر پڑھنا اور اس کا ثواب میت کو پہنچانا صحیح نہیں اس لئے کہ اس کی اجازت ائمہ میں سے کسی
سے منقول نہیں۔ علماء نے فرمایا کہ جب پڑھنے والا مال کیلئے پڑھتا ہے تو اس کو ثواب نہیں ملتا، پھر وہ میت

کو کس چیز کا ہدیہ کرتا ہے کہ میت کو تو صرف عمل صالح پہونچتا ہے۔ اور صرف تلاوت قرآن پر اجرت لینے کو ائمہ میں سے کسی نے حکم نہیں دیا۔ انہوں نے تو صرف تعلیم پر اجرت لینے میں اختلاف کیا ہے۔ صاحب ردالمحتار رحمتی سے ناقل ہیں:

ما اجازوہ انما اجازوہ فی محل الضرورة کا لاستیجار لتعلیم القرآن او الفقه او الاذان او الامامة خشية التعطيل لقلة رغبة الناس فی الخیر ولا ضرورة فی استیجار شخص یقرأ علی القبر او غیرہ۔ (ردالمحتار مصری ص ۴۵۷ ج ۵)

اجرت پر پڑھانا اور اس کا ثواب میت کو پہونچانا صحیح نہیں، اس لئے کہ اس کی اجازت ائمہ میں کسی سے منقول نہیں علماء نے فرمایا کہ جب پڑھنے والا مال کیلئے پڑھتا ہے تو اس کو ثواب نہیں ملتا پھر وہ میت کو کس چیز کا ہدیہ کرتا ہے کہ میت کو تو صرف عمل صالح پہونچتا ہے اور صرف تلاوت قرآن پر اجرت لینے کو ائمہ میں سے کسی نے حکم نہیں دیا انہوں نے تو صرف تعلیم پر اجرت لینے میں اختلاف کیا ہے۔ علامہ ابن عابدین ردالمحتار میں فرماتے ہیں:

والذی افتی بہ المتأخرون جوازا لاستیجار علی تعلیم القرآن لا علی تلاوته۔

(ردالمحتار مصری ص ۴۵۷ ج ۵)

متاخرین نے جو فتویٰ دیا ہے وہ تعلیم قرآن پر اجرت لینے کے جواز پر ہے نہ کہ تلاوت قرآن پر اجرت لینے کے جواز پر۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ تلاوت قرآن کریم پر اجرت لینا جس طرح متفقہ میں کے نزدیک ناجائز ہے اسی طرح متاخرین کے نزدیک بھی ناجائز ہے۔ دینے والا اور لینے والا دونوں گنہگار ہیں۔ اور نہ اجرت سے پڑھوا کر ایصال ثواب ہو سکتا ہے کہ جب پڑھنے والے نے روپیہ پیسہ لیا تو اس کو ثواب کیا ملا اور جب اسے ثواب ہی نہیں ملا تو وہ ایصال ثواب کس طرح کر سکتا ہے۔

اسی طرح جہاں کے عرف و رواج میں دینے والا بہ نیت اجرت دیتا ہے اور لینے والا بخيال اجرت پڑھتا ہے اگرچہ ان میں کچھ طے نہ ہوا ہو لیکن وہاں کے عرف میں بعد ختم اس طرح دینے کا دستور ہے تو یہ بھی ناجائز ہے۔ کہ فقہاء کا مشہور قاعدہ ہے۔ المعروف کالمشروط۔

علامہ ابن عابدین ردالمحتار میں فرماتے ہیں:

ولو لا الاجرة ما قرأ احد فی هذا الزمان بل جعلوا القرآن العظیم مکسبا و وسیلة

الی جمع الدنيا انالله وانا الیه راجعون۔ (ردالمحتار ص ۴۳۷ ج ۵)
اگر اجرت نہ ہو تو اس زمانہ میں کوئی شخص کسی کیلئے نہ پڑھے بلکہ انہوں نے قرآن کریم کو دنیا جمع کرنے کیلئے وسیلہ اور کسب پھر لیا۔ انا لله وانا الیه راجعون۔

اب باقی رہا سائل کا یہ قول کہ۔ شامی میں ختم قرآن کے بعد ۴۱ درم لینا جائز لکھا۔ غالباً سائل نے اس سے شامی کے اس عبارت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

لا يجوز الاستیجار علی الختم باقل من خمسة واربعین درهما۔

(شامی مصری ص ۴۳۷ ج ۵)

ختم قرآن پر ۴۵ درہم سے کم اجرت لینا جائز نہیں۔
لہذا یہ مسئلہ جواز اجرت تعلیم قرآن کی بنا پر ہے کہ اس سے کم مقدار عظمت قرآن کے مناسب نہیں۔ اسی لئے علامہ شامی اس عبارت کے بعد یہ تحریر فرماتے ہیں:
فخارج عما اتفق علیہ اهل المذهب قاطبة۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل مذہب نے تلاوت قرآن کریم کی اجرت کے ناجائز ہونے پر اتفاق کیا ہے تو یہ مسئلہ اس بنا پر نہیں ہے بلکہ اسی اجرت تعلیم قرآن کی بنا پر ہے۔ لہذا اس عبارت سے تلاوت قرآن کریم کی اجرت کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔

پھر سائل نے کہا: اور الاشباہ والنظائر میں مطلق طاعت میں جائز قرار دیا ہے۔ غالباً یہ اس عبارت کی طرف اشارہ ہے جو اسی کے جواب میں اشباہ سے نقل کی گئی ہے۔ اس میں اگرچہ بظاہر مطلقاً عبارات کو لیا ہے لیکن جب اس کے الف لام کو عہد کا قرار دیا جائے تو یہ انہیں خاص عبارات کیلئے ہے جن کی تصریح متاخرین سے ثابت ہے، جن کو اسی عبارت میں بہ تصریح ذکر کیا گیا کہ وہ امامت و اذان و اقامت و تعلیم قرآن و فقہ ہے ورنہ اس کا جواب ردالمحتار میں مذکور ہے۔

وقد اخطأ فی هذه المسئلة جماعة ظنا منهم ان المفتی به عند المتأخرین جواز الاستیجار علی جمیع الطاعات مع ان الذی افتی به المتأخرون انما هو التعلیم والاذان والا مامة وصرح المصنف فی المنح فی کتاب الاجارات وصاحب الهدایة وعامة الشراح واصحاب الفتاوی بتعلیل ذلك بالضرورة وخشية الضیاع كما مر ولو جاز علی کل طاعة لجاز علی الصوم والصلوة والحج مع انه باطل بالاجمع۔

اس مسئلہ میں ایک جماعت نے اس گمان سے خطا کی کہ متاخرین کے نزدیک اجرت کا جواز تمام طاعتوں کے لئے ہے باوجودیکہ متاخرین نے جو فتویٰ دیا ہے وہ صرف تعلیم اور اذان و اقامت ہی کے لئے ہے اور مصنف مخ نے کتاب الاجارات میں اور صاحب ہدایہ اور تمام شارحین اور اصحاب فتاویٰ نے اس کی علت ضرورت اور ضائع ہونیکا خوف بیان کیا جیسا کہ پہلے ذکر کر دیا۔ اور اگر اجرت ہر طاعت پر جائز ہوتی تو روزے نماز اور حج پر بھی جائز ہوتی باوجودیکہ باتفاق باطل ہے۔

یہی علامہ ابن عابدین شامی اسی رد المحتار کے کتاب الاجارات میں فرماتے ہیں:

وقد اتفقت کلماتهم جميعا في الشروح والفتاوى على التعليل بالضرورة وهي خشية ضياع القرآن كما في الهداية وقد نقلت لك ما في مشاهير متون المذهب الموضوع للفتوى فلا حاجة الى نقل ما في الشروح والفتاوى وقد اتفقت کلماتهم جميعا على التصريح باصل المذهب من عدم الجواز ثم استثنوا بعده ما علمته فهذا دليل قاطع وبرهان ساطع على ان المفتي به ليس هو جواز لاستيجار على كل طاعة بل على ما ذكره فقط مما فيه ضرورة ظاهرة تبیح الخروج عن اصل المذهب۔ (رد المحتار جلد ۵ ص ۳۶)

شرحوں اور فتاویٰ میں سب ہی اقوال اس بات پر متفق ہوئے کہ علت ضروری ہے اور وہ قرآن کے ضائع ہونے کا خوف ہے جیسا کہ ہدایہ میں ہے اور اس نے تیرے لئے مذہب کے ان مشہور متون کی عبارت نقل کیں جو فتوے کے لئے موضوع ہیں تو اب شرحوں اور فتاویٰ کی عبارات کے نقل کرنے کی حاجت نہیں اور سب کے اقوال اس تصریح پر متفق ہوئے کہ اصل مذہب عدم جواز ہے پھر متاخرین نے اس کے بعد صرف ان طاعتوں کا استثناء کیا جن کو تو نے جان لیا کہ تو یہ ہر طاعت پر اجرت جائز نہ ہونے کی مفتی بہ قول پر یقینی دلیل اور روشن برہان ہے بلکہ صرف ان طاعتوں پر ہو جن کی متاخرین نے تصریح کی جن میں یعنی ظاہر ضرورت ہے جس اصل مذہب کے خروج کو مباح کر دیا

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ مطلق عبادات اور تمام طاعات پر متاخرین نے جواز اجرت کا فتویٰ نہیں دیا ورنہ نماز۔ روزے۔ حج۔ وغیرہ میں بھی اجرت جائز ہو جاتی بلکہ متاخرین نے اذان و اقامت و امامت و تعلیم قرآن و تعلیم فقہ و وعظ پر جواز کا فتویٰ دیا۔ اور ان میں علت ضرورت اور خوف نقصان

قرآن بیان کیا۔ لہذا تلاوت قرآن پر اجرت کے جائز ہونے کیلئے متاخرین کا فتویٰ ہی نہیں کہ اس میں یہ علت ہی نہیں پائی جاتی تو اس کی اجرت کس طرح جائز ہو سکتی ہے اور یہ عبارت الاشباہ والنظائر میں موجود ہے تو یہ دلیل نہیں بن سکتی۔

خلاصہ جواب یہ ہے کہ تلاوت قرآن کریم پر اجرت لینا اور دینا بالکل ناجائز ہے اسی طرح جس مقام کے عرف میں اس پر لیا دیا جاتا ہے تو حسب دستور تلاوت پر لینا اور دینا بھی ناجائز ہے۔ ہاں جہاں نہ ایسا عرف و رواج ہو نہ دینے والا اور نہ لینے والا بہ نیت اجرت لیتے دیتے ہوں تو وہ وہاں صدقہ وصلہ ہے اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں۔ دیوبندی اگر اس کو بھی اجرت قرار دیکر ناجائز و حرام کہتا ہے تو یہ اس کی جہالت و لاعلمی ہے اور فقہ سے ناواقفی کی پوری دلیل ہے۔ مولیٰ تعالیٰ انہیں قبول حق کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ والیہ المرجع والمآب بعون الملك الوهاب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۸۷ھ

مسئلہ

(۵۵۷)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ کہ ایک شخص کوڑھ کے مرض میں مر گیا۔ اس کے گھر والوں نے چاہا کہ محلہ یا پڑوس کے کچھ لوگ جمع ہو کر میرے لڑکے کو باقاعدہ غسل دیں اور پہلے کچھ نعت حضور کی شان میں پڑھواؤں تاکہ میت کو ثواب ہو، اور پھر دفن کریں۔ بعد دفن کرنے کے باقاعدہ (سویم) فاتحہ ہو۔ اور چہلم کی فاتحہ ہو۔ لیکن اس کے مرنے کی خبر سنکر محلہ اور پڑوس کے لوگ ایک بھی نہیں گیا، اس نے بہت کوشش کی تو لوگوں نے جواب دیا کہ ہم اس میت میں نہیں جائیں گے۔ کیونکہ تمہارا لڑکا کوڑھی ہو کر مرا ہے۔ لہذا کوڑھی کو غسل و کفن و نماز جنازہ و دفن کرنا علماؤں نے منع کیا ہے۔

یہ الفاظ محلہ والوں کے صحیح ہیں؟ اس کو غسل و کفن و نماز جنازہ و دفن و سویم چہلم وغیرہ ہونا چاہئے یا نہیں اور اس کو جو کوڑھ کے مرض میں حیات ہو نماز جمعہ میں جماعت میں شامل کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اور وہ ہر نماز میں شریک ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اور اگر کوئی شریک کرنے سے انکار کرے تو انکار کرنے والے کا کیا حکم ہے؟

صاف صاف لکھئے اور اگر کوئی بات جناب کی طرف ہو تو لکھ دیجئے۔ فقط بینوا تو جروا۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جزامی سے مسلمین متوکلین اہل صدق و یقین تو کسی طرح کا پرہیز و اجتناب نہیں کیا کرتے یہاں تک کہ حدیث شریف میں ہے جو ابن ماجہ شریف میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔

”ان رسول اللہ ﷺ اخذ بید مجزوم فو صعبها معه فی القصعة وقال کل ثقة باللہ

وتو کلا علیہ“

(مشکوٰۃ شریف ص ۳۹۲)

حضور ﷺ نے جزامی کا ہاتھ پکڑ کر کھانے کے پیالے میں رکھ دیا اور حکم دیا کہ کھائیں تو اپنے خدا

پر اعتماد تو توکل رکھتا ہوں۔

اس حدیث شریف سے ظاہر ہو گیا کہ جزامی سے جب ایک ہی پیالے میں ساتھ کھانا کھانے

تک میں بھی پرہیز نہیں کیا تو پھر اور کس چیز میں پرہیز ہوگا۔ ہاں ضعیف اعتقاد والے عوام اس سے عدم

توکل کی بنا پر پرہیز کر سکتے ہیں۔ لیکن احکام شریعہ میں جزامی سے پرہیز نہیں کیا جائے گا۔ اور حقوق

مسلمین مثلاً سلام کلام کرنے میں اور مرنے کے بعد غسل و کفن میں۔ نماز جنازہ میں۔ دفن میں۔ پھر سویم

چہلم۔ فاتحہ وغیرہ ایصال ثواب میں وہ دیگر مسلمانوں کی طرح حق دار ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ جزام

بھی منجملہ اور بیماریوں کے ایک بیماری ہے تو جس طرح اور بیماریوں میں میت کا غسل، نماز جنازہ۔ دفن۔

سوم۔ فاتحہ وغیرہ کرنا اپنے اوپر حق جانتے ہیں اسی طرح مسلمانوں کو اسے بھی اپنے اوپر حق جاننا چاہئے۔

اس کی ممانعت کوئی عالم دین تو کر نہیں کر سکتا۔ لہذا یہ محلہ والے اپنی لاعلمی سے ان چیزوں کا انکار کر کے

گنہگار ہوئے اور حق کے ترک کرنے والے قرار پائے۔ اور اس میت کے گھر والوں کو اذیت و تکلیف

دینے والے ٹھہرے۔ انہیں چاہئے کہ اب علم ہونے کے بعد کم از کم اس کے ورثہ سے اپنی غلطی کی معافی

طلب کریں۔ اب باقی رہا جزامی کا جمعہ و جماعت میں شریک کرنا، یہ نمازیوں کی خوشنودی پر موقوف ہے

اس میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۰۰ھ

کتاب الزکوٰۃ

﴿۳۹﴾

باب نصاب الزکوٰۃ

مسئلہ

(۵۵۸)

کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین نسبت مسائل کے، حوالہ جات قرآن و احادیث سے جواب عنایت فرمایا جائے

زید ۱۹۵۰ء میں صاحب زکوٰۃ ہوا اور اسی سال اس نے پانچ سو روپے کی زکوٰۃ ادا کی ۱۹۵۱ء میں وقت زکوٰۃ وہی پانچ سو روپیہ اس کے پاس ہے اور سال بھر کے عرصہ میں آمدنی سے کچھ حصہ فاضل بچت نہیں ہوئی۔ کیا ۱۹۵۱ء میں پھر زید کو پھر اسی رقم پانچ سو پر زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی جس کی زکوٰۃ وہ ۱۹۵۰ء میں ادا کر چکا ہے۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

صورت مسئلہ میں بذمہ زید اس رقم پر جب سال گزر جائیگا زکوٰۃ دینا فرض ہو جائیگی چاہے اس کو تجارت میں اس رقم پر کچھ فائدہ حاصل ہو یا نہ ہو جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔

”تجب علی الفور عند تمام الحول“ (جلد ۱ صفحہ ۸۷)

یعنی سال کے گزر جانے پر زکوٰۃ فوراً ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے تو بیشک زید پر ۱۹۵۱ء میں بھی پھر اسی رقم پر زکوٰۃ کا ادا کرنا فرض ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۰۲ھ

مسئلہ

(۵۵۹)

کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین نسبت مسائل کے حوالہ جات قرآن و احادیث سے جواب عنایت فرمایا جائے۔

(۱) زیورات جن کی زکوٰۃ ایک سال ادا کر دی گئی ہے کیا ان کی زکوٰۃ ہر سال ادا کرنا لازمی ہے؟
(۲) زید کے پاس ایک ہزار روپیہ ہے جس کی زکوٰۃ اس نے ادا کی اور وہ ان میں اس رقم کا آدھا حصہ یعنی پانچ سو تجارت کے لئے کسی دوسرے شخص کو شریک تجارت کر کے دیدیا چار ماہ بعد ایام زکوٰۃ زید کے پاس پھر ایک ہزار روپیہ آگیا اب زید کو کس رقم پر زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

(۱) زیورات کی زکوٰۃ ہر سال دینا فرض ہے جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری میں:

تجب فی کل مائتی درہم خمسۃ درہم وفی کل عشرين مثقال ذهب نصف مثقال مضروباً کان اولم یکن مصوغاً او غیر مصوغ حلیاً کان للرجال او النساء تبراً کان او سبکۃ کذا فی الخلاصۃ۔ (ص ۹۱ ج ۱)

زکوٰۃ دینا واجب ہے ہر دو سو درہم میں پانچ درہم ہر بیس مثقال سونے میں آدھا مثقال ٹھپے والا ہو یا نہ ہو گھڑے ہوئے یا نہ ہو زیور ہوں واسطے مردوں کے یا واسطے عورتوں کے ہوں سلاخیں ہوں یا اینٹیں لہذا زیورات پر ہر سال گزرنے پر زکوٰۃ فرض ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم

(۲) زید کو دونوں رقموں پر زکوٰۃ دینا فرض ہے ان پانچ سو پر بھی جو زید کے پاس رکھے ہیں اور ان پانچ سو پر بھی جو تجارت میں لگے ہوئے ہیں اور ان پانچ سو پر جس قدر منافع ہوا اس منافع پر بھی لہذا زکوٰۃ اس کل رقم کی دی جائے گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۰۲ھ

مسئلہ

(۵۶۰)

کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین نسبت مسائل کے حوالہ جات قرآن و احادیث سے جواب عنایت فرمایا جائے

زید نے حج کے لئے کچھ زاد راہ جمع کر کے رکھا اور اس رقم کو کسی کام میں نہیں لیتا صرف حج کے لئے رکھی ہوئی ہے مگر حج کے لئے روانہ نہیں ہو سکا گوارادہ کرتا رفتار زمانہ روک لیتی ہے کیا ایسی رقم پر زکوٰۃ ادا کرنا چاہئے؟۔ مینواتو جروا

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

صورت مسئلہ میں اس رقم پر بھی سال کے گزر جانے پر زکوۃ واجب ہو جائیگی یہ رقم اب چاہے کسی کام کے لئے رکھی ہو، بہر کیف اس رقم پر بھی زکوۃ ادا کرنا واجب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب
کتبہ، المتوسل بالنبی المرسل العبد الارذل محمد اول بن المفتی مولانا الحاج محمد اجمل
نائب مفتی اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۷ھ جمادی الاخرہ ۱۳۷۷ھ

ہذہ الاجوبۃ کلہا صحیحۃ محمد اجمل غفر اللہ عز وجل فی بلدہ سنہ ۱۳۷۷ھ

مسئلہ

(۵۶۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
ایک شخص کے پاس صرف نوٹ ہوں جو آجکل رائج ہیں، یا صرف ریزگاری ہو، چاندی سونکا
سکہ ہو تو بقدر نصاب ہونے پر زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟۔ زید کہتا ہے کہ صرف نوٹ میں یا ریزگاری میں
زکوۃ واجب نہیں ہے۔ زید کا قول صحیح ہے یا نہیں؟۔ مفصل جواب دیا جائے۔
المستفتی۔ مولوی عبدالسلام از محلہ شرع ترین از بلدہ سنہ ۱۳۷۷ھ ضلع مراد آباد۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

شریعت میں مال کی یہ تعریف ہے کہ جسکی طرف طبیعت کا میلان ہو اور وہ حاجت کے وقت کیلئے
اٹھا رکھنے کے قابل ہو اور مصالح و منافع کیلئے اسے جمع کر کے محفوظ رکھیں اور باختیار خود اس میں تصرف
کریں اور وہ قیمت والا ہو۔

چنانچہ ردالمحتار میں ہے: المال ما یمیل الیہ الطبع و یمکن ادخارہ لوقت الحاجة۔

اسی میں تلوتح سے ناقل ہیں: المال ما ین شانہ ان یدخر للا تفتاع وقت الحاجة
والتقویم یمستلزم المالیۃ۔

اسی میں بحر سے اور وہ حادی قدسی سے ناقل ہیں: المال اسم لغیر الآدمی خلق لما
لمصالح الآدمی وامکن احرازہ والتصرف فیہ علی وجہ الاختیار۔ (ردالمحتار مصری ص ۳ ج ۴)

تونوٹ۔ پیسے۔ اکئی۔ دو ابائی۔ چونی۔ انھنی۔ جب چاندی سونکی نہ ہوں تو بھی ان سب پر مال
کی یہی تعریف صادق آرہی ہے کہ لوگوں کی طبیعت ان کی طرف میل کرتی ہے اور انھیں وقت کیلئے اٹھا
یا جاتا ہے اور انہیں مصالح و منافع کے لئے جمع کر کے محفوظ کیا جاتا ہے اور باختیار خود ان میں تصرف
کرتے ہیں اور یہ قیمت والی چیزیں ہیں۔ لہذا نوٹ۔ پیسے وغیرہ بحکم شرعی یقیناً حتماً جزاً بلاشبہ مال
قرار پائے، اس میں نہ کسی طرح کا شک و اشتباہ۔ نہ کچھ تردد و تامل کو راہ۔ اور جو اس کا منکر ہو وہ جہل و حق
کا مخزن اور عقل و فہم کا دشمن ہے۔ اور جب نوٹ پیسے وغیرہ کا مال ہونا آفتاب سے زیادہ روشن ہے تو یہ
ظاہر ہے کہ مالیت خود زکوۃ کے فرض ہونے کا سبب ہے جب نصاب کی مقدار کو پہنچ جائے۔

ردالمحتار میں ہے: السبب هو المال لانها وجبت شكر النعمة المال ولذا تضاف اليه
ويقال زكوة المال۔ (ردالمحتار مصری ص ۳ ج ۲)

تونوٹ وغیرہ ریزگاری میں زکوۃ اپنی شرطوں کے ساتھ واجب، بلکہ ان میں نیت تجارت کی بھی
حاجت نہیں کہ یہ ثمن اصطلاحی ہیں اور ثمن اصطلاحی جب تک وہ رائج ہے اس میں بلا نیت تجارت زکوۃ
واجب ہے۔

چنانچہ فتاویٰ سراجیہ میں اس کی صاف طور پر تصریح موجود ہے:

الزکوۃ فی الفلوس الرائجة کما فی دارہمنا الیوم لا تجب مالہ یکن قیمتہا مائتی
درہم من الدراہم التي تغلب النقرة فیہا علی الغش او عشرين مثقالاً من الذهب ولا یشرط
فیہا التجارة اذا كان النصاب كما ملا فیما بین طرفی الحول فنقصانہ فیما بین ذلك لا یضر
وان عاد الی شیء قلیل۔ (فتاویٰ سراجیہ کشوری ص ۲۲)

ردالمحتار میں شرنبلالیہ سے ناقل ہیں: الفلوس ان كانت اثماً نارائجاً۔ اور فلوس میں بلا نیت
تجارت بھی جب تک یہ رائج ہیں زکوۃ یقیناً واجب ہے۔ اور زید کا قول غلط ہے اور ان عبارات کے خلاف
ہے بلکہ مقاصد اسلام کے خلاف ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفر لہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۷ھ

(۵۶۲)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

زید کے پاس دس بیگہ نہری زمینیں بعوض کرایہ ہے جو سالانہ کرایہ ادا کیا جاتا ہے اگر اس میں کاشت کی جاتی ہے تو بھی کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے اگر نہ کی جائے تب بھی کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ کاشت کاری بیلوں سے کرائی جاتی ہے۔ اگر پانی دیا جائے تو پانی کا معاوضہ دیا جاتا ہے پانی نہیں لیا جائے تو بھی معاوضہ دیا جاتا ہے۔ زمین کاشت سے بیکار ہو چکی ہے پیداوار میں بہت کمی ہو گئی ہے۔ زید نے اس سال اس زمین میں مبلغ دو سو روپے کی کھاد ڈلو کر زمین تیار کروائی گئی اور اس میں کاشت کروائی گئی کاشت کاری میں تمام کام کرایا پر ہوا ہے۔ فضل خدا سے اس زمین میں پیداوار دو چند ہو گئی۔ کیا زید اس تمام خرچہ کو وضع کر کے ابتدائی پیداوار سے زکوٰۃ ادا کرے یا پیداوار دو چند کی کاشت کے خرچہ کو وضع کر کے زکوٰۃ ادا کرے؟ اس کا مفصل حالات بحوالہ کتب حدیث وفقہ سے تحریر فرمائیں فقط نور محمد۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

زمین کی زکوٰۃ سے عشر مراد ہوتا ہے تو اگر زید کی یہ زمین عشری ہے اور اس میں ایسی چیز کی کاشت ہے جس سے مقصود منافع حاصل کرنا ہے تو اگر اس کی آبپاشی چر سے یا ڈول سے یا بہ قیمت کی گئی ہے تو اس میں سے بغیر مصارف کاشت وضع کئے کل پیداوار کا بیسواں حصہ دینا واجب ہے۔ اور اگر آبپاشی ایسی نہ ہو بلکہ بارش سے یا بلا قیمت نہر اور نالے سے اس کو سیراب کیا گیا تو بغیر مصارف کاشت وضع کئے ہوئے اس کی کل پیداوار کا دسواں حصہ دینا واجب ہے، عالمگیری میں ہے: ولا تحسب اجرہ العمال ونفقة البقر وکراء الانهار واجرة الحافظ وغير ذلك فيجب اخراج الواجب من جميع ما خرجه الارض عشر او نصفاً كذا في البحر الرائق۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمیل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۵۶۳)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) کم از کم کتنے روپیہ پر قربانی، صدقہ فطر، زکوٰۃ، واجب ہے؟۔

(۲) زید نے بکر سے کہا کہ تم نے رمضان المبارک کے روزہ نہیں رکھے ہیں تم کو صدقہ فطر نہیں

دینا چاہیے۔ کیا زید کا یہ قول صحیح ہے؟۔

(۳) میاں بیوی نے روزے نہیں رکھے، کیا بیوی کو اپنے نابالغ بچوں کی طرف سے صدقہ فطر ادا کرنا ہوگا یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

سال بھر میں حوائج اصلہ و اخراجات ضروریہ سے جب کم از کم ساڑھے باون تولہ چاندی بچ جائیں، تو صاحب نصاب ہوگا۔ اس پر زکوٰۃ واجب ہے، اور صدقہ فطر قربانی بھی واجب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

زید کا قول باطل ہے، بکر جب صاحب نصاب ہے، اگرچہ اس نے روزہ رمضان نہ رکھے ہوں لیکن اس پر صدقہ فطر واجب ہے، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

شوہر جب صاحب نصاب ہو اگرچہ اس نے روزے رمضان کے نہ رکھے ہوں، تو صدقہ فطر نابالغ بچوں کا اسی پر واجب ہے، نہ ان کی ماں پر۔ واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمیل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۵۶۴)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

فطرہ ماہ رمضان کے بعد ہی واجب ہوتا ہے اور شاید اس عید کا نام اسی وجہ سے عید الفطر ہے۔ تو یہ فطرہ ماہ رمضان میں سب خورد و کلاں پر کیوں واجب ہے جب کہ اطفال نے روزے نہیں رکھے ہیں۔ اور اگر روزوں پر فطرہ نہیں ہے تو ماہ رمضان کے بعد ہی فطرہ کیوں واجب ہوتا ہے اس میں کیا حکم شریعت ہے۔

ج۔ م۔ اشرفی ۲۵ اکتوبر

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

بلاشبہ عید الفطر کا نام اسی بنا پر ہے کہ اس میں فطرہ ادا کیا جاتا ہے۔ فطرہ عید کے دن بعد صبح صادق کے واجب ہو جاتا ہے اور ان لوگوں پر واجب ہے جو صاحب نصاب ہوں ان پر اپنی طرف

سے اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے واجب ہے ہر خورد و کلاں پر واجب نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۷ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم



باب مصارف الزکوۃ

مسئلہ

(۵۶۵)

کیا فرماتے ہیں علماء دین شرع متین نسبت مسئلہ ذیل کے، حوالہ جات قرآن و احادیث سے جواب عنایت فرمایا جائے۔

زید صاحب زکوۃ ہے اور اس کا حقیقی بھائی بکر مقروض ہے، کیا زید اپنے بھائی بکر کا قرضہ اپنی زکوۃ سے ادا کر سکتا ہے؟

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

زید کا بھائی بکر جب صاحب نصاب نہ ہو تو زید اپنے بھائی بکر کو زکوۃ دے سکتا ہے بلکہ ایسی ضرورت کے وقت اس کو زکوۃ کا دینا افضل ہے، جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

والافضل فی الزکوۃ والفطر والندور الصرف اولا الی الاخوان والاخوان ثم الی اولادہم ثم الی الاعممام والعمات ثم الی اولادہم ثم الی الاخوال والخالات ثم الی اولادہم ثم الی ذوی الارحام ثم الی الحیران ثم الی اهل حرفتہ ثم الی اهل مصرہ او قریبہ۔

(جلد ۱ صفحہ ۹۷)

زکوۃ اور صدقہ فطر اور نذر کا افضل ترین مصرف بھائی پھر ذوی الارحام پھر پڑوسیوں پر پھر اپنے ہم پیشوں پر پھر اپنے اہل شہر یا اہل قریہ پر خرچ کرنا افضل اور بہتر ہے، تو زید اپنی زکوۃ اپنے بھائی کو دیدے اور وہ اپنا قرضہ اس سے ادا کر دے خود زید اس کے قرضہ کو اپنے زکاتی مال سے ادا نہ کرے کہ تملیک اسی شکل میں پائی جائیگی کہ بکر کو اس رقم کا مالک بنادے۔ اور ادائے زکوۃ کے لئے تملیک کا پایا جانا ضروری شرط ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ، المتوسل بالنبی المرسل العبد الارذل محمد اول بن المفتی مولانا الحاج محمد اجمل نائب مفتی اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۷ھ الجواب صحیح محمد اجمل غفر اللہ عزوجل فی بلدہ سنہ ۱۳۷۷ھ

مسئلہ

(۵۶۶)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ زید نے مال زکوۃ کی رقم اکٹھی بذریعہ چندہ وصول کی۔ نیت زید کی یہ ہے کہ اس رقم کو شرعی حیلہ کر کے اس سے مدرسہ یا مسجد بنائی جائے۔ چندہ مذکورہ حیلہ کے لئے کیا زید بکر کو انتخاب کر کے یہ ظاہر کر سکتا ہے کہ تم کو یہ رقم دی جاتی ہے اس رقم میں اتنا روپیہ تم اپنے اپنے صرف کے لئے لینا باقی ماندہ رقم جھکو واپس اللہ کے نام کر دینا۔ کیا زید بکر سے یہ اقرار کر سکتا ہے یا نہیں؟۔ یہ رقم اس طرح واپس لینا جائز ہے یا نہیں؟۔ اس کا مفصل احوال بکتاب حدیث وفقہ کہ تحریر فرمائیں۔ فقط۔ عثمان غنی۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

رقم زکوۃ بعد حیلہ شرعی کے مدرسہ میں صرف کی جاسکتی ہے۔ عالم گیری میں ہے: وکذلك من عليه الزکوۃ لو اراد صرفها الى بناء المسجد او القنطرة لا يجوز فان اراد الحيلة فالحيلة ان يتصدق به المتولى على الفقراء ثم الفقراء يدفعونه الى المتولى ثم المتولى يصرف الى ذلك۔

لیکن حیلہ میں یہ طے کرنا یا یہ اقرار کر لینا کہ اتنا روپیہ اپنے صرف میں کر لے اور باقی اللہ کے نام پر واپس کر دے ہرگز ہرگز نہیں چاہئے اور نہ اس طرح اس رقم کو واپس کیا جائے بلکہ علاوہ متولی کے کوئی شخص اس کو سمجھا دے اور متولی اس پر بہ نیت تملیک تصدق کرے اور وہ فقیر اس رقم کے کل یا جز کو اپنی طرف سے متولی کو مسجد یا مدرسہ کے کسی کام میں صرف کرنے کے لئے دیدے جب وہ متولی اس کو مسجد یا مدرسہ میں صرف کر سکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۵۶۷)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان شرع عظام دامت برکاتہم النور مسائل حسب ذیل کی

بابت

(۱) زکوۃ کے روپے سے دینی کتابیں خرید کر کسی مدرسہ میں دی جائیں، کہ طلبہ پڑھیں اس سے

زکوۃ ادا ہو جائے گی؟۔

(۲) زکوۃ کی رقم یکمشت ادا کی جائے یا وقتاً فوقتاً تھوڑی تھوڑی جمعہ کو دے دی جائے۔ مثلاً محرم الحرام میں زکوۃ نکالی اور ربیع الآخر یا اس سے بعد تک یا پہلے تھوڑی تھوڑی ہر جمعہ کو فقیروں کو دے دی جائے یا علاوہ جمعہ کے اور دنوں میں بھی دے دی جائے۔ زکوۃ ادا ہو جائے گی یا نہیں؟۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

(۱) زکوۃ کی رقم سے کتابیں خرید کر بطور تملیک طلبہ کو دینے سے تو زکوۃ ادا ہو جائے گی۔ اور اگر ان کو مدرسہ میں وقف کر دیا گیا تو زکوۃ ادا نہیں ہوتی کہ اس میں تملیک ہی متحقق نہیں ہوئی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) بہتر ہے کہ ساری زکوۃ کی رقم حساب کر کے اپنے مال سے جدا کر کے علیحدہ رکھ دی جائے پھر اختیار ہے کہ اس کو یکمشت ادا کر دیا جائے یا متفرق طور پر مختلف اوقات و ایام میں تھوڑی تھوڑی ادا کرتے رہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،

العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۵۶۸)

مسئلہ

کیا فرماتے علمائے کرام ان مسائل میں کہ

(۱) حیلہ شرعیہ کے ساتھ صدقہ فطر کو دینی مدارس میں صرف کر سکتے ہیں کہ نہیں۔ اور حیلہ کرنا کس حدیث سے ثابت ہے۔ لك صدقة ولنا هدية۔ سے ثابت ہوتا ہے کہ نہیں؟۔

(۲) صدقہ فطر تو عید کے دن صبح صادق کے بعد واجب ہوتا ہے، تو اگر کسی نے قبل وجوب ادا کر دیا تو ادا ہوا کہ نہیں۔ مثلاً رمضان ہی میں ادا کر دے۔ فطرہ ادا کرنا قبل نماز عید مسنون ہے۔ لیکن اگر کسی نے بعد نماز عید یا دو چار دن کے بعد ادا کیا تو صحیح ہوا کہ نہیں۔ حدیث میں جو یہ فرمایا گیا کہ جب تک فطرہ ادا نہیں کیا جاتا اسکے نماز و روزے آسمان وزمین کے درمیان معلق رہتے ہیں تو جب تک ادا نہ کیا معلق ہی رہیں گے تو اگر کسی نے مدرسہ کو دے دیا اور جب تک اس کا حیلہ نہ ہوا معلق ہی رہے گا یا ادا کرنے والے کے نماز و روزے آسمان رحلے جائیں گے؟۔

(۳) دور حاضر میں جب کہ لوگ دینی باتوں اور دینی مدارس کی امداد سے بالکل یا اکثر الگ تھلگ رہنے لگے ہیں ایسے وقت میں مدارس کا اجراء اور کوشش سے مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کر کے، زکوٰۃ اور فطرہ کو حیلہ کر کے اس کام میں صرف کرنا فقیروں اور رشتہ داروں کو دینے سے افضل ہوگا۔ کہ نہیں، جو لوگ دینی مدارس میں ایک پیسہ بھی دینا گوارہ نہیں کرتے اور فطرہ اور زکوٰۃ تو کچھ دے بھی دیتے ہیں۔ دینی مدارس میں ضرورتاً ہندی و انگریزی کی تعلیم دلانا تا کہ بچے لکھنے پڑھنے کے قابل ہو جائیں اپنی ضرورت میں کسی کے محتاج نہ رہیں۔ مسلمانوں کے بچے انگریزی اسکولوں میں نہ جائیں، اور جو وہاں خباثت ہوتی ہے۔ اس سے بچانے کی غرض ہو تو بہتر ہے کہ نہیں۔ جبکہ اسی زکوٰۃ اور فطرہ ہی کو حیلہ کر کے، مدرسین کی تنخواہ میں دیا جاتا ہو۔ ایک مدرسہ ایسا ہے جس میں صرف یا اکثر مالداروں کے بچے پڑھتے ہیں اس مدرسہ میں فطرہ اور زکوٰۃ کا روپیہ حیلہ کر کے لگایا جاسکتا ہے کہ نہیں۔

(۴) اور حیلہ قرآن و حدیث کے موافق کرنے کا طریقہ کیا ہے اور اعلان کرنا کہ فطرہ اور زکوٰۃ مدرسہ میں دو اس اعلان پر جس کی بنتی ہوئی اس نے لا کر دیا اور جس کی مرضی نہیں ہوئی اس نے نہیں دیا جس طرح آج کل تمام مدارس دیدیہ کے لئے اشہار کے ذریعہ اعلان کیا جاتا ہے۔ خطوط لکھے جاتے ہیں ان سے کہا جاتا ہے، کہ فطرہ اور زکوٰۃ سے مدارس کی امداد کرو تو یہ اعلان جائز ہے کہ نہیں۔ اب اس صورت میں جس نے لا کر مدارس کو دیا تو جائز ہوا کہ نہیں اور دینے والے کا فطرہ اور زکوٰۃ ادا ہوا کہ نہیں اور اعلان تو اسی واسطے ہوتا کہ لوگ اس طرف متوجہ ہوں۔ سوالات مذکورہ کے جوابات بڑی تفصیل سے درکار ہیں۔ حیلہ کی تعریف کیا ہے؟۔ محمد عالم اعظمی پالی مارواڑ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) بلا شک حیلہ شرعیہ کے بعد مال زکوٰۃ، صدقہ فطر کو دینی مدارس میں صرف کرنا جائز ہے۔

در مختار میں ہے۔ و قدمنا ان الحیلۃ ان يتصدق علی الفقراء ثم یامر بفعل هذه

الاشیاء ای الصرف الی کل مالا تمليك فيه كمسجد و مدرسه و قنطرة۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔ و كذلك من علیه الزکوٰۃ لو اراد صرفها الی بناء المسجد

او القنطرة لا يجوز فان اراد الحیلۃ ففی الحیلۃ ان يتصدق به المتولی علی الفقراء ثم الفقرا

ء یدفعون الی المتولی ثم المتولی یصرف الی ذالك کذا فی الذخیرہ۔

الاشیاء والنظار میں ہے۔ و الحیلۃ فی التکفین بها التصدق بها علی فقیر ثم هو یکنف فیكون الثواب لهما و کذا فی تعمیر المساجد۔

حموی شرح الاشیاء والنظار میں ہے۔ (قوله والحیلۃ فی التکفین بها ای الزکوٰۃ والمراد الذی وجب تملیکه لا داء فرض الزکوٰۃ قوله فیكون الثواب لهما له ثواب الصدقة وللفقیر ثواب التکفین و کذا لک جمیع ابواب البر التی له یتاتی التملیک فیها کعمارة المساجد و بناء القناطر والرباطات۔ (حموی کشوری)

اب باقی رہا یہ امر کہ حیلہ کا جواز کس نص سے ثابت ہے تو خود قرآن کریم میں ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے اپنے زمانہ مرض میں اپنی بیوی کے بسبب ان کے دیر میں آنے پر سو ضرر میں مارنے کی قسم کھائی تھی۔ پھر جب اچھے ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی قسم پوری کرنے کے لئے یہ حیلہ تعلیم فرمایا جس کو قرآن کریم میں نقل فرمایا:

وخذ بيدك ضغثا فاضرب به ولا تحنت۔ (سورہ ص۔ رکوع ۳)

اور فرمایا کہ اپنے ہاتھ میں جھاڑو لے کر اس سے مار دے اور قسم نہ توڑے۔

حضرت حجتہ الاسلام امام ابو بکر رازی تفسیر احکام القرآن میں تحت آیہ کریمہ فرماتے ہیں،

و فیها دلیل علی جواز الحیلۃ فی التوصل الی ما یجوز فعله و دفع المکره به عن نفسه وعن غیره لان الله تعالى امره بضربها بالضغث لیخرج به من الیمین ولا یصل الیها کثیر ضرر۔ (احکام القرآن ج ۳ ص ۲۷۳)

آیت میں حیلہ کے جائز ہونے پر دلیل ہے کہ وہ حیلہ اپنے نفس سے اور غیر کی طرف سے دفع مکرہ اور جواز فعل کی طرف ذریعہ ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب کو جھاڑو لیکر اپنی بیوی کے مارنے کا حکم فرمایا تا کہ وہ اس کے سبب قسم پوری کرے اور اس کو زیادہ ضرر نہ پڑے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔ اس آیت کریمہ سے جواز حیلہ پر اس طرح استدلال فرمایا گیا:

وهذا تعلیم المخرج لا یوب النبی علیہ و علی نبینا الصلوٰۃ والسلام عمن یمینہ

اللتی حلف لیضربن امرأته مائة عود و عامة المشائخ علی ان حکمها لیس بمنسوخ وهو

الصحيح من المذهب کذا فی الذخیرہ۔ (فتاویٰ عالمگیری، ج ۴ ص ۳۷۶)

یہ حضرت ایوب علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کو انکی اس قسم سے خلاصی کی تعلیم ہے کہ انہوں نے اپنی

بیوی کی سوکڑی مارنے کی قسم کھائی تھی۔ تو عام مشائخ کا یہی قول ہے۔ کہ آیت کا حکم منسوخ نہیں ہے۔ اور یہی صحیح حدیث ہے۔ اسی طرح ذخیرہ میں ہے۔

اس آیت کریمہ اور اس کی تفسیر سے ثابت ہو گیا کہ حیلہ جائز ہے اور اس کا جواز قرآن کریم سے ثابت ہے۔ اسی طرح اس حیلہ کا جواز حدیث شریف سے بھی ثابت ہے۔ بخاری شریف میں ہے۔

ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم استعمل رجلا علی خبیر فجاءہ بتمر جنیب فقال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اکل تمر خبیر ہکذا قال لا واللہ یا رسول اللہ۔ انالناخذنا لصاع من هذا بالصاعین، والصاعین بالثلاثة، فقال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لا تفعل۔ بع الجمع بالدرہم تم ابتع بالدرہم جنیبا۔

(بخاری، ج ۱ ص ۲۹۳)

بے شک رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک شخص کو خبیر پر عامل بنایا تو وہ دربار رسالت میں جنیب نامی کھجور لیکر حاضر ہوئے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خبیر کی ہر کھجور ایسی ہی ہوتی ہے۔ عرض کیا نہیں یا رسول اللہ۔ ہم یہ کھجور ایک صاع دو صاع دیکر لیتے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ایسا مت کرنا، اپنی کھجوروں کو درہم سے بیچنا، پھر ان درہموں سے یہ جنیب کھجور خریدنا۔

و فی مسلم و یلک اربیت اذا اردت ذلک فبع تمرک بسلعة ثم اشتر بسلعتک ای تمر شئت۔ (مسلم شریف، ج ۲ ص ۴۷)

مسلم شریف میں ہے، تیرے لئے خرابی ہو، تو نے سود لے لیا۔ جب تو ایسا ارادہ کرے تو اپنی کھجور کو سامان سے بیچنا، پھر اپنے اس سامان سے جو کھجور چاہے خرید لینا۔

تو اس حدیث شریف سے حیلہ کا جواز ثابت ہو گیا۔ لہذا حیلہ کا جواز قرآن و حدیث سے ثابت ہو گیا۔ لہذا اب کوئی مسلمان اس کے خلاف نہ کہہ سکتا ہے نہ اس کے جواب میں تامل کر سکتا ہے۔ اب رہی سائل کی پیش کردہ حدیث کے یہ الفاظ (لک صدقة ولنا هدية)۔

تو اس سے تبدیل ملک کا تبدیل حکم پر استدلال کیا ہے۔ علامہ نوادی شرح مسلم میں اس کی شرح میں فرماتے ہیں: ان الصدقة اذا قبضها المتصدق عليه زال عنها وصف الصدقة وحلت لكل احد ممن كانت الصدقة حرمت عليهم۔ (شرح مسلم، ص ۲۳۵)

بے شک صدقہ جب اس پر صدقہ لینے والے کا قبضہ ہو گیا، تو پھر اس سے صدقہ کا وصف زائل ہو جاتا ہے، اور اب وہ ہر اس شخص کے لئے حلال ہو گیا جس پر پہلے حرام تھا۔

تو اس حدیث کے کلمات سے جواز حیلہ پر استدلال نہیں کیا جاتا ہے بلکہ استدلال اس حدیث سے کیا گیا ہے، جس کو ہم نے پیش کیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

(۴) صدقہ فطر یوم عید الفطر میں صبح صادق سے واجب ہو جاتا ہے۔ تو جس نے قبل وجوب رمضان المبارک ہی میں دے دیا تو اس کا ادا کرنا درست ہو گیا۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: وان قدموها علی یوم الفطر جاز۔

اور فطرہ کا قبل نماز عید ادا کرنا مستحب ہے۔

اسی عالمگیری میں ہے۔ والمستحب للناس ان یخرجوا الفطرة بعد طلوع الفجر یوم الفطر قبل الخروج الی المصلی،

پھر جس نے بعد نماز عید یا دو چار دن کے بعد یا دو چار ماہ کے بعد ادا کیا تو وہ صدقہ فطر ادا ہی ہوگا کہ اس کے ادا کا وقت تمام عمر ہے۔

اسی عالمگیری میں ہے: و اما وقت ادائها فجميع العمر عند عامة مشائخنا رحمهم الله، اسی لئے صدقہ فطرہ بغیر ادا کئے ذمہ سے ساقط ہی نہیں ہوگا۔ اسی عالمگیری میں ہے وان اخروه عن یوم الفطر لم تسقط و کان علیہم اخراجها کذا فی الهدایة۔ اور جب اس نے کسی مدرسہ کے متولی کو دے دیا، تو اس نے تو ادا ہی کر دیا تو پھر تعلیق صوم و صلوة کی وعید اس سے متعلق نہیں ہو سکتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

(۳) فی الواقع دور حاضر میں دینی مدارس کس مہتری کے احوال میں ہیں۔ تو بغرض اعانت دین و احیاء علم۔ زکوٰۃ و صدقہ فطرہ کا بعد حیلہ شرعیہ کے دینی مدارس میں دینا اور امور میں دینے سے افضل ہونا چاہیے کہ عالمگیری میں ہے: التصدق علی الفقیر العالم افضل عن التصدق علی الجاهل الفقیر۔ اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ اعانت علم سبب افضلیت ہے۔ اب باقی رہا ہندی انگریزی، کے وہ مدارس جن میں صرف زبان کی تعلیم مقصود ہو، اور ان میں وہ کتابیں نہ پڑھائی جاتی ہوں، جن میں خلاف شرع اور مخرب اخلاق مضامین ہوں، اور انکو محض اس غرض کے حصول کے لئے جاری رکھنا ہے، کہ مسلمان بچے غلط تعلیم و خلاف شرع مضامین سے بچ جائیں تو ایسے مدارس میں زکوٰۃ و صدقہ فطر کو حیلہ کرنے کے

بعد تنخواہ مدرسین میں دینا جائز ہے۔ پھر چاہے ان مدارس میں مالداروں کے بچے تعلیم پاتے ہوں یا غریبا و فقرا کے۔ عبارات جواب نمبر ایک میں منقول ہوئیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

(۴) حیلہ کا جواب قرآن وحدیث سے جواب نمبر ایک میں پیش کر دیا گیا۔ نیز اس کا طریقہ بھی گزر چکا کہ مال زکوٰۃ و صدقہ فطری بنا پر اس فقیر کو مال کے دینے کا ثواب ملے گا۔ کہ وہ اپنا مملوکہ مال بغیر عوض کے اعانت و حمایت علم میں دیتا ہے۔ اور زکوٰۃ و فطرہ دینے والے کو ایک ثواب تو صدقہ دینے کا ملے گا، اور دوسرا ثواب اس فقیر کے اعانت علم دین میں دینے کا سبب ہونے کا۔ کہ یہ اگر اس فقر کو نہ دیتا تو وہ فقیر امداد علم دین میں کہاں سے دیتا، تو یہ اس کے دینے کا سبب بنا اور حدیث شریف میں وارد ہے: الدال علی الخیر کفاعله۔ تو اس زکوٰۃ و فطرہ دینے والے کو نہ فقط ایک ثواب، بلکہ دو گنہ ثواب ملنے کی قوی امید ہے۔

بالجملہ مال زکوٰۃ و فطرہ کا بعد حیلہ شرعی کے مدارس دینیہ میں دینا بلاشبہ جائز و درست ہے۔ بلکہ مدارس میں اخراجات طلبہ کی امداد ہے۔ جس میں زکوٰۃ و فطرہ بغیر حیلہ کے بھی جائز ہے۔ کہ یہ طلبہ مصارف زکوٰۃ و فطرہ کا بہترین مصرف ہیں۔

درمختار میں ہے: ان طالب العلم يجوز له اخذ الزکوٰۃ و لو غنيا اذا فرغ نفسه لا قاده العلم واستفادته لعجزه عن الكسب۔ پھر جب زکوٰۃ و فطرہ کی مدارس کی بعض مدت میں بغیر حیلہ کے اور بعض میں حیلہ کے بعد دینا جائز ثابت ہوا تو ان کے لئے اعلان یا اشتہار دینا اور امداد کی ترغیب اور اپیل کرنا کس طرح ناجائز ہو سکتا ہے۔ الاشباہ والنظائر میں حیلہ کی یہ تعریف لکھی ہے،۔ وہی تقلیب الفکر حتی یهتدی الی المقصود۔ یعنی حیلہ فکر کا گردش کرنا ہے یہاں تک کہ وہ مقصود تک راہ پا جائے۔ اسی بنا پر حیلہ کی دو قسم ہیں۔ تو ہر وہ حیلہ جو غیر کا حق باطل کرنے یا حق غیر میں شبہ پیدا کرنے یا باطل کو آراستہ کرنے کے لئے کیا جائے وہ ناجائز یا مکروہ تحریمی ہے۔ اور ہر وہ حیلہ جو حرام سے خلاصی کے لئے یا حلال کا ذریعہ بنانے کے لئے کیا جائے، وہ جائز و مستحسن ہے۔

اسی الاشباہ اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے: فنقول مذهب علمائنا ان کل حيلة یحتال بها الرجل لا بطل حق الغیر ولا دخال شبهة فیہ اولتمویہ باطل فہی مکروہة تحریمًا و کل حيلة یحتال بها الرجل لیتمیصل بها عن حرام اولیتو صل بها الی حلال فہی حسنة۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۵۶۹)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) ہمارے پاس دو قسم کی زمین ہے ایک ایسی ہے کہ ہم مالک ہیں جس کو ہم بیع و ہبہ سب کچھ کر سکتے ہیں صرف اس کا محصول گورنمنٹ کو دینا پڑتا ہے۔ اس میں عشر واجب ہے یا نہیں۔ دوسری زمین ایسی ہے کہ ہم کسی پارسی بنے سے سالانہ رقم دیکر جس کو پٹکا کہتے جوتے بونے کے لئے لیتے ہیں اس کو محصول خود پارسی بنیا حکومت کو ادا کرتا ہے ہم فقط سالانہ مقرر کردہ رقم بنے کو دیتے ہیں اس میں عشر واجب یا نہیں۔

(۲) ۵۰ من اناج پیدا ہوتا ہے اور ۶۰۔۷۰ من خرچ ہوتا ہے تو اس میں عشر واجب ہے یا نہیں۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) جو زمین اپنی مملوکہ ہے اور خود اپنی کاشت میں ہو اور وہ بارش کے پانی سے پرورش ہوا ہو تو بلاشبہ اس کی پیداوار میں عشر واجب ہے۔

لان النماء له مع ملکہ فکان اولیٰ بالایجاب علیہ کما صرح به الشامی۔
اور گورنمنٹ کے محصول کے ادا کرنے سے عشر شرعی ادا نہیں ہوتا۔ اور جو زمین مسلم کی مملوکہ نہیں بلکہ کافر کی ہے اور مسلمان نے اس کو بطور اجارہ لیکر کاشت کی تو وہ عشری زمین تو ہے نہیں کہ کافر کی مملوکہ تو وہ جب قابل زراعت ہے اسکے مالک پر خراج واجب ہے مسلم کا شکار پر نہ عشر واجب نہ خراج۔
ردالمحتار میں ہے: والحاصل انه یجب الخراج علی الموجرو المعیران بقیت الارض صالحۃ لزراعه۔

تو مسلم پر قسم اول کی زمین میں یقیناً عشر واجب ہے اور قسم دوم میں نہ عشر واجب نہ خراج۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) عشر پیداوار پر ہوتا ہے اس کے وجوب کے لئے نہ تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس میں مصارف

زراعت کس قدر ہوتے ہیں نہ یہ ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ خراج کتنا ہے بلکہ اس میں نہ سال گزرنے کی شرط ہے نہ اس چیز کے باقی رہنے کی شرط ہے نہ اس میں نصاب کی شرط ہے یہاں تک کہ ایک صاع میں بلکہ نصف صاع بھی پیداوار ہو تو اس میں عشر واجب ہے۔

رد المحتار میں ہے: فيجب فيما دون النصاب بشرط ان يبلغ صاعا وقيل نصفه وفي الخضر والالتى لا تبقى وهذا قول الامام وهو الصحيح۔

تو ۵۰ من اناج کی پیداوار ہو تو بہت ہے۔ لہذا اگر یہ ۵۰ من بارش سے پیدا ہوئے تو اس میں عشر یعنی ۵ من اناج واجب ہے اور اگر آب پاشی سے پیدا ہوئے تو نصف عشر یعنی اڑھائی من اناج واجب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمض بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۸ھ

مسئلہ

خدمت حضرت فیض درجت محبوب ملت حضرت مولانا مولوی رئیس المفتیین الحاج الشاہ محمد اجمل صاحب قبلہ مفتی ہند دامت برکاتہم بعد سلام مسنون

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین ان مسائل میں

(۱) اگر امام مسجد مالک نصاب نہ ہو تو اس کو فطرہ لینا جائز ہے یا نہیں؟۔

(۲) اگر امام مسجد قرضدار ہو اور وہ اگر اپنے قرض کے لئے فطرہ لے تو دینا جائز ہے یا نہیں؟۔

(۳) اگر امام مسجد قرضدار ہو اور آدمی اس کو دینا نہ چاہیں اور دوسرے شہر سے کسی امام مسجد کو بلا کر

اس کو دینا چاہیں تو یہ امام مسجد کی حق تلفی ہے یا نہیں۔ بینوا تو جروا

مرسلہ نظام الدین الرضوی الحامدی غفرلہ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) امام اگر سید یا مالک نصاب ہے تو اس کو زکوۃ اور صدقہ فطر کا لینا جائز نہیں۔ ہاں جب وہ

سادات سے نہ ہو اور مالک نصاب بھی نہ ہو تو وہ زکوۃ اور فطرہ لے سکتا ہے اگر یہ زکوۃ اور فطرہ امامت کے

عوض اور اجرت میں نہ ہو اسی بنا پر جن مقامات میں امامت کی تنخواہ نہیں ہوتی اور بجائے تنخواہ کے ان کو

سال بھر میں زکوۃ و صدقہ فطرہ دیا جاتا ہے۔ یا امامت کی تنخواہ تو مقرر ہے لیکن وہ اس قدر قلیل ہے کہ اس سے امام کی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں تو اس کمی کے پورا کرنے کے لئے وہ لوگ امام کو زکوۃ و صدقہ فطرہ دیدیا کرتے ہیں۔ یا وہاں کے عرف و رواج میں امام کو زکوۃ و صدقہ فطرہ امامت کے عوض و اجرت سمجھ کر دیا جاتا ہے۔ تو ایسے مقامات میں امام اگر چہ غیر سید ہو اور مالک نصاب نہ ہو اس کو زکوۃ و صدقہ فطرہ جائز نہیں۔

(۲) جب امام غیر سید ہو اور قرضدار ہو تو اس کے قرض ادا کرنے کے لئے صدقہ فطرہ دینا اس صورت میں تو جائز ہے جو اوپر کی تفصیل کے اعتبار سے کسی طرح امامت کی اجرت عوض میں نہ ہو اور اگر صدقہ فطرہ کا دینے والا امامت کی اجرت سمجھ کر دیتا ہے تو ہرگز جائز نہیں۔

(۳) امام مسجد کا بلحاظ عوض امامت اہل مسجد پر زکوۃ و صدقہ فطرہ میں شرعا کوئی حق نہیں۔ ہاں جب امامت کی اجرت کا کوئی شائبہ بھی نہ ہو اور دوسرے شہر کے امام سے کوئی رشتہ نہ ہو۔ یا وہ زیادہ حاجتمند اور پرہیزگار نہ ہو تو اپنے امام مسجد کے مقابلہ میں دوسرے شہر اور غیر کو دینے میں اس کی حق تلفی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۳۰ شوال المکرم ۱۳۷۸ھ

کتبہ: المعتمض بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۸ھ

مسئلہ

(۵۷۱)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ضلع کمروپ میں انجمن کمیٹی نے ایک مدرسہ بنانے کے لئے ارادہ کیا ہے لیکن مجبوری کیوجہ سے صدقہ فطر اور قربانی اور زکوۃ کے پیشہ کو جمع کیا ہے اور مدرسہ بنانے کو پوری امید ہے، لیکن ایک مولوی صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ مدرسہ بنانے سے پہلے اس میں صدقہ فطر اور قربانی اور زکوۃ کا پیسہ جمع کرنا حرام اور ناجائز ہے تو پھر اسے جمع کرنے کا شریعت میں کیا حکم ہے جائز ہے یا نہیں؟۔ دلیل کے ساتھ بیان فرمادیں۔

عریض الدین مدرسہ اسکول علی کاش کمروپ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

صدقہ فطر۔ قربانی۔ زکوۃ کا پیسہ جمع کرنا حرام و ناجائز نہیں، ہاں مدرسہ میں صرف کرنے سے

پہلے اس رقم کا حلالہ کرنا ضروری ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۷۹ھ

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبید محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کتاب الصوم

ثبوت رویت ہلال کامل سکا تو آپ کے اہل قصبہ پر تمیز کے چاند کے حساب سے جمعہ کے دن ہی نماز عید کا پڑھنا ضروری تھا اس بنا پر آپ کا جمعہ کو نماز عید پڑھنا بالکل صحیح اور موافق شرع ہے۔ اور ان احوال کے ماتحت جن لوگوں نے زبردستی بلا ثبوت شرعی کے جمعرات کو نماز عید پڑھی ان کی ہرگز ہرگز نماز عید نہیں ہوئی۔ اور بلا شک دائرہ منڈانے والا فاسق ہے شرعاً اس کی گواہی و خبر غیر معتبر و نامقبول ہے۔

طحاوی میں ہے: لا یقبل خبر الفاسق اتفاقاً و فی البحر قول الفاسق فی الدیانات الستی یمکن تلقیہا من العدول غیر مقبول کا لہلال وروایۃ الاخبار ولو تعدو کفاسقین فاکثر۔ (طحاوی مصری صفحہ ۳۸)

اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ رویت ہلال میں فاسق کا قول مقبول نہیں اگرچہ فاسق ہو یا ان سے زائد۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے بالکل حکم شرع کے موافق عمل کیا۔ اہل قصبہ کو بھی ایسا ہی کرنا تھا میں نے جو وہاں کے لئے فتویٰ لکھا اس کو بعینہ نقل کر کے روانہ کیا جاتا ہے اس فتوے میں بھی یہی حکم ہے جیسا کہ آپ کو اس کے مطالعہ سے ظاہر ہو جائیگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

۱۹ محرم الحرام ۱۳۷۶ھ

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۵۷۳)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین مندرجہ ذیل مسائل میں ہر ایک سوال کا جواب مع حوالہ وحدیث وفقہ بیان کریں۔

(۱) ڈاک سے آئے ہوئے خط کی خبر اور ریڈیو ٹیلی ویژن فون ٹیلی گراف۔ تار وغیرہ کی خبریں قابل اعتبار ہیں یا نہیں؟

(۳) عینی شہادت سے کیا معنی ہیں اور کن شرائط سے اسے قابل قبول کیا جاسکتا ہے؟

(۴) شہادت علی الشہادت کے کیا معنی ہیں اس کو جائز قرار دینے کے لئے کیا شرائط ہیں؟

(۵) خط القاضی الی القاضی کے کیا معنی ہیں اور کن شرائط سے اسے قابل اعتبار سمجھا جاسکتا ہے؟

(۶) ایک جگہ کے قاضی کا دوسری جگہ کے قاضی کے علاوہ کسی غیر کے نام دستخط ومہر والا خط دوسری جگہ کا قاضی قبول کر سکتا ہے یا نہیں؟

باب رویت الہلال

(۵۷۲)

مسئلہ

قبلہ جناب مولوی صاحب..... دام اقبالہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
گزارش احوال آنکہ ایک خط آپ کے پاس روانہ کیا گیا کچھ تھوک سے جس میں شاید ہی ہمارے متعلق باتیں لکھی ہوگی اور جہاں تک خیال ہے کہ عید کی نماز کے بابت لکھا ہوگا۔ لہذا یہ مسئلہ ہے کہ میں نے چاند نہیں دیکھا اور نہ ہمارے پاس کوئی شرعی ثبوت ملا۔ ایک دائرہ منڈھے نے لکھنؤ میں دیکھا ہوگا اس نے آکر کے کہا سب لوگوں نے اس کی بات پر یقین کر لیا تو جمعرات کے دن عید منائی۔ مجھ سے کہا گیا کہ آپ عید کی نماز پڑھا دیجئے میں نے ان کا رد کیا کہ ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں آیا اور نہ ہم نے چاند دیکھا اس لئے میں مجبور ہوں۔ اس حالت میں نماز پڑھنا چاہئے یا نہیں۔ لہذا میں آپ کے پاس خط روانہ کرتا ہوں جلد از جلد جواب سے مطلع کرے گا۔ اور اسی خط کی پشت پر جواب روانہ کر دیجئے گا اور دائرہ منڈھے کی گواہی بشریعت مانی جاتی ہے یا نہیں یہ بھی لکھئے گا تا کہ سب کو معلوم ہو جائے بس یہی قصہ ہے اور قبلہ مولوی خلیل احمد صاحب بجنوری بھی موجود تھے اس دن انہوں نے عید کی نماز جمعہ کو پڑھی تھی قریباً سو آدمی تھے جمعہ کے دن نماز پڑھنے والے تھے۔ میں نے صرف اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے نماز نہیں پڑھائی کہ کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہم سے پوچھے کہ تم نے چاند نہیں دیکھا کوئی شرعی ثبوت نہیں پہنچا تم نے نماز کیوں پڑھائی تو کیا جواب دیتے اس وجہ سے نماز نہیں پڑھائی اس پرچہ کی پشت پر فتویٰ دیجئے گا باقاعدہ مہر یا دستخط آپ کے موجود ہوں۔

از گنج ڈونڈ وارہ طرف پیش امام کچھ تھوک بتاریخ ۷ اگست ۱۳۵۶ھ

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم
جب آپ کے قصبہ میں چاند نہیں دیکھا گیا نہ باہر سے کوئی شرعی طور پر بطریق موجب کوئی

(۷) کسی کی گواہی یا خط کو قبول کرنے کا قاضی کو اختیار ہے یا نہیں؟

(۸) ایک جگہ سے دوسری جگہ کی خبر کے لئے کتنے میل کا فاصلہ ہونا ضروری ہے یا شرعاً اس کی کوئی حد ہے یا نہیں؟

(۹) قاضی کے اعلان کے خلاف عید وغیرہ تہوار منانا جائز ہے یا نہیں؟

(۱۰) اجماع کے کیا معنی ہیں۔ عوام کا اتفاق یا صرف علماء کا اتفاق۔ اور اجماع کے خلاف کرنے والوں کے لئے شرعاً کیا حکم ہے؟

(۱۱) زمانہ حال میں جب کہ اسلامی حکومت نہیں ہے قاضی بننے کے لئے کون شخص مستحق ہے؟

(۱۲) یہ آج کے نکاح خوانی موروثی قاضی جن میں اکثر تو شرعی مسائل سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ اگر یہ اپنا نائب کسی عالم دین کو بنا کر شرعی مسائل میں ان کے فیصلہ پر عمل کر کے اعلان کر سکتا ہے یا نہیں؟

(۱۳) اسی طرح وہ اپنے نائب اور قضاۃ کمیٹی بنا کر ان کے فیصلہ پر اعلان کر سکتا ہے یا نہیں؟

المستفتی، امین الدین سراج الدین سگرام پور سورت گجرات۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) رویت ہلال کے متعلق احادیث میں یہ آیا ہے، مسلم شریف میں ہے:

قال رسول الله ﷺ اذا رايتهم الهلال فصوموا واذا رايتموه فافطروا فان غم

عليكم فصوموا ثلاثين يوماً (وفى رواية) فان غم عليكم فأكملوا العدة ثلاثين يوماً (وفى

رواية) فان غم عليكم فامتموا ثلاثين (وفى رواية) فان غم عليكم الشهر فعدوا ثلاثين

(وفى رواية) فان غم عليكم فعدوا ثلاثين ثم افطروا (وفى رواية) فان غم عليكم فانها

ليست تغمى عليكم العدة رواها البيهقي فى السنن الكبرى

ان احادیث کا خلاصہ مضمون یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب تم چاند دیکھ لو تو روزے رکھو

اور جب تم اس کو دیکھو تو افطار کرو۔ تو اگر چاند تم پر پوشیدہ ہو جائے تو تیس دن تک روزہ رکھو۔

(ایک روایت میں ہے) اگر چاند تم پر پوشیدہ ہو جائے تو تیس دن کی مقدار کو کامل کرو۔

(ایک روایت میں ہے) اگر چاند تم پر پوشیدہ ہو جائے تو تیس کو تمام کرو۔

(ایک روایت میں ہے) اگر چاند تم پر پوشیدہ ہو جائے تو تیس گن لو پھر افطار کرو۔

(ایک روایت میں ہے) اگر چاند تم پر پوشیدہ ہو جائے تو بیشک تم پر مقدار تو پوشیدہ نہیں ہے۔

ان احادیث میں انتیس تاریخ میں چاند پوشیدہ ہو جانے کی صورت میں بھی حکم فرمایا کہ تیس دن کے روزے پورے کر لو۔ اور اس کا حکم مختلف الفاظ و عبارت میں فرمایا۔ لیکن کسی حدیث میں یہ نہ فرمایا کہ اگر تمہارے شہر میں انتیس تاریخ کو چاند نہیں دیکھا ہے تو اسکی تحقیقات کے لئے کسی دوسرے شہر کو جاؤ تو رویت ہلال ہی کی تحقیق کرنے کے لئے اپنے شہر سے دوسرے شہر کو سفر کر کے جانا اب تک کسی حدیث میں تو دستیاب نہیں ہوا۔ پھر قرونِ ثلاثہ کا بھی کوئی ایسا واقعہ نہیں مل سکا جس میں یہ ہوتا کہ حضرات خلفاء نے محض چاند کی تحقیق کے لئے کسی کو اپنے شہر سے دوسرے شہر کو روانہ کیا ہو۔ تو احادیث پر غور کرنے اور قرونِ ثلاثہ کے عمل کو دیکھتے بلکہ کتب فقہ پر نظر کرنے سے اس امر کا ثبوت نہیں ملتا کہ دور سلف میں فقط رویت ہلال ہی کی تحقیق کرنے کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف سفر کیا گیا ہو۔ تو محض اسی غرض کے لئے اس قدر اہتمام کرنا فقط اسی مقصد کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کرنا نہ واجب ثابت ہو انہ سنت و مستحب۔ بلکہ بہ تصریح محدثین انتیس کو رویت ہلال بطریق موجب ثابت نہ ہونے کی صورت میں تیس دن کی مقدار کا کامل کرنا واجب ہے علامہ نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں:

حاصله ان الاعتبار بالهلال فقد يكون تاماثلثين وقد يكون ناقصا تسعا وعشرين

وقد لا يرى الهلال فيجب اكمال العدد ثلاثين۔

تو جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ رویت ہلال کی تحقیق کرنے کے لئے ایک شہر سے دوسرے شہر جانا ضروری ہے تو وہ کوئی دلیل شرعی پیش کرے۔ اب باقی رہا یہ امر کہ اس تحقیق کے لئے جانے والوں کے قابل اعتبار ہونے کے لئے کتنے شرائط چاہئیں تو اس کا تفصیلی بیان یہ ہے

(۱) دوسروں یا ایک مرد اور دو عورتوں کا ہونا۔

(۲) ان کا عاقل و بالغ ہونا۔

(۳) ان کا مسلمان ہونا۔

(۴) ان کا عادل ہونا یعنی وہ کبیرہ گناہ نہ کرتے ہوں اور صغیرہ پر اصرار نہ کرتے ہوں۔

(۵) بیٹا ہونا۔

(۶) بولنے والا ہونا۔

(۷) دوسرے شہر میں بغرض شہادت علی الشہادت گئے ہوں تو شاہدان اصل کے نام ولدیت نہ باپ بلکہ دادا کے ناموں کا یاد ہونا۔

(۸) شاہدان اصل کے اعلام عقل و بلوغ اور عدالت سے خوب واقف ہونا۔

(۹) شاہدان اصل کا ان شاہدان فرع کو گواہ بنانا اور تکمیل شہادت کرنا۔

(۱۰) خود شاہدان اصل کی اس شہر میں حاضری کا دشوار ہونا۔

(۱۱) شاہدان فرع ہے ہر ایک کا یہ گواہی دینا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ فلاں بن فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں بن فلاں نے سال فلاں ماہ فلاں دن فلاں کی شام کو انتیس کا چاند دیکھا اور ہر ایک نے ہمیں اپنی اپنی گواہی پر گواہ کیا۔

(۱۲) اگر دوسرے شہر میں خط قاضی یا مفتی حاصل کرنے کے لئے جائیں تو اس شہر کے قاضی یا مفتی سے شہادت رویت ہلال کا خط لکھنا۔

(۱۳) اس خط میں وہ قاضی یا مفتی اپنا نام ولدیت، پتہ لکھے پھر مکتوب الیہ قاضی یا مفتی کے نام ولدیت۔ پتہ کر لکھ کر یہ تحریر کرے کہ میرے سامنے فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں نے فلاں سال فلاں ماہ کا چاند فلاں دن کی شام کو دیکھنے کی شہادتیں دیں میں نے شاہدین کے ترکیہ وعدالت کے بعد ثبوت رویت ہلال کا حکم دیا۔

(۱۴) اس خط کا ان شاہدان عادل کو سنانا۔

(۱۵) خط کو لفافہ میں بند کرنا۔

(۱۶) اس کو سر بمہر کرنا۔

(۱۷) اس قاضی یا مفتی کا اس خط کو مجلس قضا یا افتاء میں ان گواہوں کو سونپنا۔

(۱۸) ان گواہوں کا سر بمہر خط کو باحیاط اپنے قاضی یا مفتی شہر کے پاس لانا۔

(۱۹) اس سر بمہر خط کو مجلس قضا یا افتاء میں دینا۔

(۲۰) یہ شہادت دینا کہ آپ کہ نام فلاں بن فلاں قاضی یا مفتی فلاں شہر کا خط ہے اس نے اس خط کو ہمیں سنایا اور اس پر ہمیں گواہ بنایا اور مجلس قضا یا افتاء میں ہمارے سامنے اس کو لفافہ میں بند کیا اور سر بمہر کیا اور ہم کو سونپا۔ یہ اسی کا خط ہے۔ اسی کا مضمون ہے ہم ان امور کی گواہی دیتے ہیں۔

(۲۱) بوقت ادائے شہادت یہ کہنا کہ میں شہادت یا گواہی دیتا ہوں۔

(۲۲) ادائے شہادت کیے لئے مجلس قضا یا افتاء کا ہونا۔

(۲۳) گواہان کی عدالت کی تحقیق و ترکیہ کرنا۔ لہذا جو لوگ رویت ہلال کی تحقیق کرنے کے لئے دوسرے شہر میں جائیں تو ان کے قابل اعتبار ہونے اور ان کی شہادتوں کے معتبر ہونے کے لئے یہ شرائط ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) خط اور لفافہ جو ڈاک سے آئیں ان کی خبرنا قابل اعتبار اور غیر مقبول ہے۔ چنانچہ ہدایہ۔ الاشباہ والنظائر۔ در مختار۔ رد المحتار۔ مجمع الانہر۔ یعنی۔ فتاویٰ قاضی خاں۔ عالمگیری وغیرہ میں ہے ”الخط یشبہ الخط فلا یعمل بہ“۔ ریڈیو۔ ٹیلی فون۔ تاریکی خبریں بھی ناقابل اعتبار ہیں۔

ہدایہ میں ہے: ولو سمع من وراء الحجاب لا يجوز له ان یشہد لو فسر للقاضی لایقبلہ لان النعمة تشبہ النعمة فلم یحصل العلم۔

اور ان کے تفصیلی جواب میرے رسالہ ”اجمل المقال“ میں ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) یعنی شہادت کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ شاہد نے اسکو خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہو۔ تو وہ بوقت ادائے شہادت یہ کہہ سکے کہ میں نے اسکو خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے لہذا یعنی شہادت کے قابل قبول ہونے کے لئے یہ شرائط ضروری ہیں۔

(۱) ہر شاہد کا بوقت ادائے شہادت یہ کہنا کہ میں گواہی دیتا ہوں۔

(۲) شہادت کے لئے مجلس قضا یا افتاء کا ہونا۔

(۳) گواہوں کا دوسرا ایک مرد اور دو عورتیں ہونا۔

(۴) ان کا عاقل و بالغ ہونا۔

(۵) ان کا مسلمان ہونا۔

(۶) بیٹا ہونا۔

(۷) اپنی آنکھ سے خود دیکھنا۔

(۸) بولنے والا ہونا۔

(۹) عادل ہونا۔

(۱۰) شہادت رویت ہلال میں سال کا نام لینا۔

(۱۱) اور ماہ کا نام لینا۔

(۱۲) اور دن کا نام لینا۔

(۱۳) وقت رویت کا بتانا۔

(۱۴) مقام رویت کا نام لینا یہ سب عینی شہادت کے شرائط ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۴) شہادت علی الشہادت کے یہ معنی ہیں کہ اس نے خود تو اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا ہے۔ لیکن ان کے سامنے دودیکھنے والوں نے گواہی دی۔ اور انہوں نے ان کو اپنی شہادت پر گواہ بنایا۔ تو اصل دیکھنے والے شہدان اصل کہلاتے ہیں۔ اور ان گواہان فرع شہادت کو شہادۃ علی الشہادۃ کہتے ہیں۔ لہذا شہادۃ علی الشہادۃ کے یہ شرائط ہیں۔

(۱) گواہان فرع کو بوقت ادائے شہادت یہ کہنا کہ میں گواہی دیتا ہوں۔

(۲) شہادت کے لئے مجلس قضاء یا افتاء کا ہونا۔

(۳) ان گواہوں کا دوسرا ایک مرد اور دو عورتیں ہونا۔

(۴) ان کا مسلمان ہونا۔

(۵) ان کا عاقل و بالغ ہونا۔

(۶) عادل ہونا۔

(۷) بولنے والا ہونا۔

(۸) گواہان اصل کے نام۔ ولدیت کا یاد ہونا۔

(۹) گواہان اصل کے اسلام و عقل و بلوغ و عدالت سے واقف ہونا۔

(۱۰) گواہان اصل کا ان گواہان فرع کو گواہ بنانا۔

(۱۱) یہاں ان گواہان اصل کی حاضری کا دشوار ہونا۔

(۱۲) گواہان فرع سے ہر ایک کا اس طرح گواہی دینا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ فلاں بن فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں نے فلاں سال فلاں ماہ فلاں دن کی شام کو انتیس کا دیکھا اور ہر ایک نے مجھے اپنی اپنی گواہی پر گواہ کیا۔ تو شہادت علی الشہادۃ کے یہ شرائط ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۵) خط القاضی الی القاضی اس طرح ہوتا ہے۔ اس نے ثبوت ہلال کا حکم دیا پھر اس قاضی یا مفتی نے ایک خط لکھا جس میں اپنا نام و پتہ لکھ کر دوسرے شہر کے قاضی یا مفتی کے نام۔ ولدیت پتہ لکھ کر یہ تحریر کیا کہ میرے سامنے فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں نے فلاں سال فلاں ماہ کے چاند فلاں کی

شام کو دیکھنے کی شہادتیں دیں میں نے ان شہادتوں کو لیکر شاہدین کے تزکیہ کے بعد انتیس کے چاند کا حکم دیا۔ اس خط کو دو گواہان عدل کو سنا کر ان کے سامنے ہی لفافہ میں بند کر دیا۔ پھر لفافہ کو سر بمبر کیا۔ اور ان کو اس خط پر گواہ بنا کر دیا۔ پھر یہ گواہ اسے سر بمبر خط دیں کہ آپ کے نام یہ فلاں بن فلاں قاضی یا مفتی فلاں شہر کا خط ہے۔ اس نے ہمیں اس خط کو سنایا اور اس پر ہمیں گواہ کیا اور ہمارے سامنے اس خط کو لفافہ میں بند کیا اور سر بمبر کیا۔ یہ اسی کا خط ہے۔ اس کا مضمون اسی کا ہے ہم ان امور پر گواہی دیتے ہیں لہذا اس خط کے قابل اعتبار ہونے کے لئے یہ شرائط ہیں۔

(۱) گواہان کا دوسرا ایک مرد اور دو عورتیں ہونا۔

(۲) ان کا مسلمان ہونا۔

(۳) ان کا عاقل و بالغ ہونا۔

(۴) ان کا عادل ہونا۔

(۵) ان کا بیٹا ہونا۔

(۶) ان کا بولنے والا ہونا۔

(۷) گواہان کا مضمون خط خود سننا۔

(۸) ان کے سامنے خط کا لفافہ میں بند ہونا۔

(۹) لفافہ کا سر بمبر ہونا۔

(۱۰) ان گواہان کا خط پر گواہ ہونا۔

(۱۱) گواہوں کا اس خط کو مجلس افتاء یا قضاء میں دینا۔

(۱۲) گواہان کا باحتیاط اس خط کو دوسرے شہر کے قاضی یا مفتی کے پاس لانا۔

(۱۳) اس سر بمبر خط کو اس مفتی یا قاضی کی مجلس افتاء یا قضاء میں دینا۔

(۱۴) شہادت دینا کہ آپ کے نام یہ فلاں بن فلاں قاضی یا مفتی فلاں شہر کا خط ہے۔ اس نے ہمیں اس کو سنایا اور اس پر ہمیں گواہ کیا اور ہمارے سامنے اس کو لفافہ میں بند کیا اور لفافہ کو سر بمبر کیا۔ یہ اسی کا خط ہے۔ اور یہ اسی کا مضمون ہے۔ ہم ان امور پر گواہی دیتے ہیں۔

(۱۵) اس قاضی یا مفتی کا اس خط کو پڑھ کر گواہان کی عدالت و تزکیہ کے بعد اپنے شہر کے لئے حکم دینا۔ یہ سب شرائط خط قاضی الی القاضی کے معتبر و مقبول ہونے کے لئے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۶) شریعت نے خط القاضی الی القاضی کو معتبر رکھا ہے اور خط کسی غیر قاضی یا مفتی کے نام ہو تو جب قاضی یا مفتی مکتوب الیہ نہیں ہے۔ تو اس کو قبول بھی نہیں کر سکتا۔ درمختار میں ہے:

لو جعل الخطاب للمکتوب الیہ لیس لنائبہ ان یقبلہ۔

ردالمحتار میں ہے: قوله لنائبہ ان یقبلہ لانه قد کتب الی غیرہ ولو جعل الخطاب الی النائب وسماه باسمہ لیس للمنیب ان یقبلہ لانه لا یقبل الكتاب الا للمکتوب الیہ۔

تو جب قاضی یا مفتی اس خط کا مکتوب الیہ ہی نہیں تو وہ خط اس قاضی یا مفتی کیلئے ناقابل قبول ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۷) اگر شہادت اور خط قاضی کے تمام شرائط موجود ہوں۔ جب تو اس شہادت اور خط قاضی کا قبول کرنا اور اس پر حکم دینا ضروری ہے۔

درمختار میں ہے: حکمها (ای الشہادة) وجوب الحکم علی القاضی لموجبها بعد التزکیة۔

عالمگیری میں ہے:۔ انما یقبلہ (ای الخط) القاضی المکتوب الیہ عند وجود شرائط۔ اور ان کے جب شرائط ہی میں کمی اور خامی باقی ہو تو قاضی کو ان کے قبول کر لینے کا اختیار حاصل ہے۔

واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۸) جب ایک جگہ سے دوسری جگہ طریق موجب خبر پہنچ جائے تو اس کے معتبر و مقبول ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ خبر بطریق موجب ہو شرعاً اس کیلئے میل مقدار متعین۔ نہ کوئی حد مقرر۔ یہاں تک کہ اہل مغرب کی رویت پر اہل مشرق کو عمل کرنا واجب ہے۔

مجمع الانہر میں ہے: لو رأى اهل المغرب هلال رمضان يجب برويتهم على اهل المشرق اذا ثبت عندهم بطريق موجب۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(مجمع الانہر مصری جلد ۱ صفحہ ۱۳۸)

(۹) قاضی کے اعلان و حکم کا اتباع ضروری ہے اور اس کی مخالفت ممنوع ہے بخاری و مسلم شریف کی حدیث شریف میں ہے ”من یطع الامیر فقد اطاعنی ومن یعص الامیر فقد عصانی“ تو خلاف حکم و اعلان قاضی کے عید وغیرہ منانا ممنوع ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۱۰) شرعاً اجماع کے یہ معنی ہیں کہ مجتہدین اور علماء امت کا ایک زمانہ میں کسی حکم شرعی پر اتفاق

کر لینا۔

چنانچہ توضیح و مسلم الثبوت وغیرہ میں ہے ”الاجماع هو اتفاق المجتہدین من امة محمد ﷺ فی عصر علی حکم شرع“ اب رہے عوام تو وہ ان امور شرعیہ میں تو اجماع میں داخل ہیں جن میں رائے کی طرف احتیاج نہیں اور جن میں رائے کی طرف احتیاج ہے تو ان میں ان کا اجماع میں کوئی دخل نہیں۔

توضیح میں ہے: اماعمة الناس ففیما لا یحتاج الی الرائے کنقل القرآن وامہات الشرائع داخلون فی الاجماع کالمجتہدین وفیما یحتاج لا عبرة لهم“ اور مخالف اجماع شرعاً کافر ہے۔

توضیح میں ہے ”لیس المراد انه لو لم یوافق العوام لم ینعقد الاجماع حتی لا یکفر منکر الاجماع بل لا یمکن لاحد من الخواص والعام المخالفة حتی لو خالف احد یکفر“ مسلم الثبوت میں ہے ”انکار حکم الاجماع القطعی کفر عند اکثر الحنفیة“۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۱۱) جن مقامات میں اسلامی حکومت نہیں۔ وہاں مسلمان اپنے مذہبی امور کے لئے کسی مسلمان عاقل بالغ دیندار صاحب سمع و بصر کو قاضی بنالیں۔ بہتر یہ ہے کہ وہ صاحب فتویٰ ہو جو احکام شرع کو کتاب اللہ اور احادیث و کتب عقائد و فقہ سے خود نکال سکے تو یہ قاضی جمعہ و عید وغیرہ امور کو بھی قائم کرے۔ اور لوگوں کو دینی امور میں صحیح رہنمائی کرے۔

ردالمحتار میں ہے: فی بعض بلاد المسلمین غلب علیہم الکفار کقرطبة الا ان یجب علی المسلمین ان یتفقوا علی واحد منهم یجعلونه والیافیولی قاضیا ویكون هو الذی یقضی بینہم و کذا ینصبو اماما یصلی بہم الجمعة۔ (ردالمحتار مصری جلد ۲ صفحہ ۳۴۱)

عالمگیری میں ہے:۔ ینبغی للقاضی ان یقضی بما فی کتاب اللہ وان لم یجد فی کتاب اللہ تعالیٰ یقضی بما جاء عن رسول اللہ ﷺ ویجب ان یعلم المتواتر والمشہور وماکان من اخبار الاحاد ویجب ان یعلم مراتب الرواة وان کانت حادثة لم یرد فیہا سنة رسول اللہ علیہ الصلاۃ والسلام یقضی فیہا بما اجتمع علیہ الصحابة رضی اللہ عنہم فان کان شیء لم یات فیہ من الصحابة قول و کان فیہ اجماع التابعین قضی بہ وان لم یحی

شیء من ذالک فان کان من اهل الاجتهاد اجتہاد برایہ فیہ ثم یقضى به برایہ وان لم یکن من اهل الاجتهاد یستفتی فی ذالک فیاخذ بفتویٰ المفتی ولا یقضى بغير علم ملخصاً۔
واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

اگر ان نکاح خواں قاضیوں میں کوئی قاضی عالم دین ہو لیکن اس کا اپنے شہر پر اقتدار ہو اور اکثر اہل شہر اس کی بات مانتے ہوں تو وہ کسی مفتی دین سے فتوے حاصل کر کے اس فتوے کے موافق اعلان کر سکتا ہے عالمگیری میں ہے ”لو قلد جاهل وقضى هذا الجاهل بفتوى غیرہ یجوز“۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

ظاہر ہے کہ یہ وہ قاضی شرع تو ہے نہیں جس کا مقرر کرنا بادشاہ اسلام کا کام ہے بلکہ یہ نام کے قاضی اکثر خاندانی ہوتے ہیں اور بعض مقامات میں ایسے قاضی بھی ہیں جن کو اہل شہر نے قاضی مقرر کر لیا ہے تو ان قاضیوں کے وہ اختیارات نہیں جو قاضی شہر کے اختیارات ہوتے ہیں۔

عالمگیری میں ہے ”اذا اجتمع اهل بلدة على رجل وجعلوه قاضيا یقضى فیما بینہم لا یصیر قاضیا“ تو جب ہمارے اس وقت کے قاضی حقیقہً وہ قاضی ہی نہیں تو ان کو اپنا نائب بنانے اور قضاۃ و ہلال کمیٹیاں بنانے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ کیونکہ جب بادشاہ کا بنایا ہوا قاضی بلا اجازت بادشاہ اسلام کے خود اپنا نائب کسی کو مقرر نہیں کر سکتا۔

چنانچہ عالمگیری میں ہے:۔ السلطان اذا قال الرجل جعلتك قاضيا لیس له ان یتخلف الا اذن له فی ذالک صریحا او دلالة“ درمختار میں ہے ”ولا یتخلف قاضی نائبا الا اذا فوض الیہ صریحا او دلالة“ تو اہل شہر کا بنایا ہوا قاضی یا خاندانی قاضی خود کسی کو اپنا نائب یا خلیفہ کس طرح بنا سکتا ہے علاوہ بریں ان قضاۃ و ہلال کمیٹیوں میں کس قدر غلطیاں ہیں؟

(۱) قاضی و نائب قاضی کیلئے مسلمان صحیح العقیدہ ہونا شرط ہے عالمگیری میں ہے ”ولا تصح ولاية القاضی حتی یجتمع فی المولیٰ شرائط الشهادة من الاسلام والتکلیف والحرية السنخ“ یہاں تک کہ بیچ اور ثالث کے لئے بھی وہی شرائط ہیں جو قضاۃ کیلئے ہیں ردالمحتار میں ہے ”واما الحکم فشرطه اهلیة القضاء“ اور مرتد ہو جانے سے تو قاضی اپنے منصب قضاہی سے خود معزول ہو جاتا ہے عالمگیری میں ہے۔ ”اربع خصال اذا حصلت بالقاضی صار معزولا ذهاب البصر و ذهاب السمع و ذهاب العقل والردة“ تو مرتدین نہ مسلمانوں کے قاضی ہو سکتے ہیں نہ نائب

قاضی نہ حکم ہو سکتے ہیں نہ بیچ۔ ان کا فیصلہ و حکم مسلمانوں کے لئے صحیح نہیں ردالمحتار میں ہے ”لم یصح قضائہ علی المسلم حال کفرہ“۔ اور ان قضاۃ و ہلال کمیٹیوں میں گمراہ اہل ضلال بلکہ مرتدین بھی رکن و ممبر ہوتے ہیں تو ایسے نااہلوں کو قاضی یا نائب قاضی بنانا ان کی سب سے پہلی شرعی غلطی ہے:

(۲) فساق کو قاضی یا نائب قاضی بنانا احتیاط قضا کے خلاف ہے۔ عالمگیری میں ہے ”لا ینبغی ان یقلد الفاسق کذا فی البدائع“۔ اور ان قضاۃ و ہلال کمیٹیوں میں فاسق بھی رکن و ممبر ہوتے ہیں تو فاسقوں کا قاضی یا نائب قاضی بنانا ان کی دوسری شرعی غلطی ہے:

(۳) قاضی و نائب قاضی عالم احکام دین کو بنایا جائے فتاویٰ قاضی خاں میں ہے ”ومع اهلیة الشهادة لا بد ان یکون عالما ورعا الخ“ تو جاہلوں ناواقفوں کو قاضی یا نائب قاضی بنانا ان کی تیسری شرعی غلطی ہے:

(۴) مرتدین کی شہادت شرعاً غیر معتبر و نامقبول ہے۔ صاحب درمختار کی شرح ملققی میں ہے ”کل من کفر (ای اهل الهواء) کالمجسمه والخوارج وغلاة الروافض والقائلین بخلق القرآن لا تقبل شهادتهم“ (شرح ملققی مصری جلد ۲ صفحہ ۴۰۰)

اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ فرق مدعیان اسلام میں رافضیوں، خارجیوں، وہابیوں، قادیانیوں غیر مقلدوں وغیرہ مرتدین کی شہادت شرعاً غیر معتبر و نامقبول ہے اور یہ قضاۃ و ہلال کمیٹیاں ان مرتدین کی شہادتوں کو مقبول و معتبر قرار دیکر حکم صادر کر دیتی ہیں تو ان کی یہ چوتھی شرعی غلطی ہے۔

(۵) فاسقوں کی شہادت بھی شرعاً غیر معتبر و نامقبول ہے۔ ہدایہ میں ہے ”وتشترط العدالة لان قول الفاسق فی الدیانات غیر مقبول“۔

اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ فاسقوں کی شہادت شرعاً غیر معتبر و نامقبول ہے اور یہ قضاۃ و ہلال کمیٹیاں فاسقوں کی شہادتوں کو معتبر و مقبول ٹھہرا کر حکم صادر کر دیا کرتی ہیں تو ان کی یہ پانچویں شرعی غلطی ہے:

(۶) مستور الحال جس کے عدالت و فسق کا حکم معلوم نہ ہو اس کی شہادت بھی علاوہ ہلال رمضان کے اور چاندوں میں غیر مقبول ہے۔

صاحب درمختار شرح ملققی میں فرماتے ہیں ”وقیل فی هلال الفطر وذی الحجة وبقية الا

شهر التسعة شهادة حرين او حرا و حرتين بشرط العدالة و لفظ الشهادة

(شرح ملتبھی جلد ۲ صفحہ ۲۳۶)

ترجمہ عید الفطر اور ذی الحجہ اور بقیہ نوماہ کے چاند میں ”دو آزاد مردوں یا ایک آزاد مرد اور دو عورتوں کی شہادۃ بشرط عدالت اور لفظ اشہد کے قبول کی جائیگی اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ سوائے ہلال رمضان کے اور عید الفطر و عید الاضحیٰ وغیرہ تمام شہور کے چاندوں کے لئے گواہوں کا عادل ہونا شرط ہے۔ تو مستور الحال کے بلا تزکیہ و تحقیق احوال کے اس کی شہادت کب معتبر قرار پائی اور ان قضاۃ و ہلال کمیٹیوں کا ایسے مستور الحال کے بلا تزکیہ و تحقیق احوال کے اس کی شہادت کو معتبر قرار دیکر حکم صادر کر دینا ان کی چھٹی شرعی غلطی ہے:

(۷) ان قضاۃ و ہلال کمیٹیوں میں بوقت ادائے عینی شہادت اس کے علاوہ (۱۴) شرائط جو سوال نمبر ۳ کے جواب میں مذکور ہوئے ملحوظ نہیں رکھا جاتا تو شرعاً وہ عینی شہادت ادا ہی نہیں ہوئی اور جب وہ ادا نہیں ہوتی تو اس پر حکم کس طرح صحیح ہو جاتا ہے تو یہ ان کمیٹیوں کی ساتویں شرعی غلطی ہے:

(۸) اسی طرح ان کمیٹیوں میں سبھی دوسرے شہر سے شہادت علی الشہادۃ حاصل کی جاتی ہے تو شہادت علی الشہادۃ کے وہ (۱۴) شرائط جو سوال نمبر ۴ کے جواب میں مذکور ہوئے پورے طور پر نہیں پائے جاتے تو شرعاً وہ شہادت علی الشہادۃ ہی روا نہیں ہوتی اور جب وہ ادا نہیں ہوتی تو اس پر حکم کا صادر کرنا کب صحیح ہوا تو ان کمیٹیوں کی یہ شرعی آٹھویں غلطی ہے:

(۹) کبھی ان کمیٹیوں میں دوسرے شہر سے خط قاضی حاصل کرتے ہیں لیکن خط قاضی کے وہ (۱۵) شرائط جو سوال نمبر ۵ کے جواب میں لکھے گئے۔ وہ علی وجہ الکمال ادا نہیں کئے جاتے تو شرعاً وہ خط قاضی رویت ہلال کے لئے حجت نہیں ثابت ہوا تو ان قضاۃ و ہلال کمیٹیوں میں اس خط کو زبردستی حجت قرار دیکر اس پر حکم صادر کر دینا کس قدر غلط حکم بن جاتا ہے۔ تو ان کمیٹیوں کی یہ نویں شرعی غلطی ہے۔

(۱۰) شرعاً رکن شہادت یہ کہنا ہے کہ میں شہادت دیتا ہوں جو عربی کے لفظ اشہد کا ترجمہ اگر بوقت ادائے شہادت یہ الفاظ نہ کہے گئے تو وہ شہادت غیر مقبول ہے۔ قدوری میں ہے ”فان لم یذكر الشاهد لفظ الشهادة وقال اعلم او يتقين لم تقبل الشهادة“۔ اور ان قضاۃ و ہلال کمیٹیوں میں ان الفاظ کا کہنا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ تو جس شہادت میں یہ الفاظ ادا نہ ہوئے ہوں تو ان کمیٹیوں کا ایسی شہادت کو قابل قبول سمجھنا ان کی دسویں شرعی غلطی ہے:

(۱۱) شریعت میں حکم و فیصلہ قول و فیصلہ صحیح اور مسلک صواب پر ہوگا آرا کی کثرت و قلت کا اصل لحاظ نہیں۔ چنانچہ اگر اکثر آرا غلط بات ناحق امر پر متفق ہو جائیں اور صرف ایک رائے صحیح و حق و صواب پر ہو تو کثرت رائے پر ہرگز ہرگز حکم و فیصلہ نہ دیا جائیگا بلکہ ایسی غلط کثرت آرا کے مقابلہ میں اس شخص واحد کے قول پر حکم و فیصلہ کیا جائیگا جو راہ حق و صواب پر ہے تو ایسی کثرت آرا جو غلطی اور ناحق اور خلاف شرع بات پر ہو وہ شرعاً غیر معتبر اور نامقبول ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے ”و كذلك لا يعتبر كثرة العدد فالا واحد قد يوفق للصواب ما لا توفق له الجماعة ينبغي ان يكون هذا قول ابي حنيفة رحمه الله“۔

اور ان قضاۃ و ہلال کمیٹیوں میں حکم و فیصلہ قول صحیح و راہ صواب پر نہیں ہوتا بلکہ وہ دنیا کے غلط اصول یعنی کثرت آرا پر حکم و فیصلہ کر دیا جاتا ہے اگرچہ قلت آرا طریق صحیح و راہ صواب ہی پر ہو۔ تو ان کمیٹیوں کا ایسی غلط بنیاد پر حکم دیدینا ان کی گیارہویں شرعی غلطی ہے:

(۱۲) شرعاً فقہاء و علماء کرام اہل رائے ہیں۔ اور عوام جو فقہ سے بے خبر۔ احکام دین سے نا آشنا ہیں وہ اپنے امور میں اہل الرائے ہی نہیں ہیں۔ جیسا جواب سوال نمبر ۱۰ میں عبارات سے ثابت ہو چکا ہے۔ تو ایک عالم فقیہ کے مقابلہ میں عوام کی کثرت آراء دینی امور میں نہ حجت شرعی ہے نہ معتبر و مقبول ہے۔ تو ایسے عوام کی کثرت آراء پر حکم و فیصلہ کس قدر غلط و باطل ہوگا۔ ان قضاۃ و ہلال کمیٹیوں میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غیر عالم فقیہ عوام کی کثرت آراء پر بمقابلہ ایک عالم فقیہ کی رائے کے فیصلہ دیدیا جاتا ہے یعنی اہل رائے کے مقابلہ میں غیر اہل رائے کی کثرت پر حکم کر دیا جاتا ہے۔ تو ان کمیٹیوں کی یہ بارہویں شرعی غلطی ہے:

(۱۳) جب اہل الرائے فقہاء و علماء کرام میں اختلاف واقع ہو تو ان میں سے جس کا قول حق سے زیادہ قریب ہو تو قاضی اس صحیح قول پر حکم دے گا یہ اس صورت میں ہے جب قاضی مجتہد ہوگا اور اگر قاضی مجتہد نہیں ہے تو اس کے نزدیک ان میں جو زیادہ فقیہ اور متقی ہو اس کے قول پر حکم دے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

وان اختلفوا ايضا فيما بينهم نظر الى اقرب الاقوال عنده من الحق اذا كان من اهل الاجتهاد وان لم يكن القاضي من اهل الاجتهاد وفي هذه الصورة قد وقع الاختلاف بين اهل الفقه اخذ بقول من هو افقه واورع عنه“ (عالمگیری جلد ۳ صفحہ ۱۴۴)

اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ حق سے قریب تر قول پر یا زیادہ فقیہ مفتی کی رائے پر بصورت اختلاف حکم کیا جائے گا۔ اور کثرت آرا پر فیصلہ نہ کیا جائے گا۔ اور یہ قضا و ہلال کمیٹیاں ایسے اختلاف علما کی صورت میں نہ حق سے قریب تر قول پر حکم کرتی ہیں نہ زیادہ فقیہ مفتی کی رائے پر فیصلہ کرتی ہیں بلکہ ان کے خلاف کثرت آرا پر فیصلہ کرتی ہیں تو ان کی یہ تیرہویں شرعی غلطی ہے:

(۱۴) جب ایک شہر کے قاضی یا مفتی کا فیصلہ دوسرے شہر میں بطریق موجب نہیں پہنچا تو وہ دوسرے شہر کے لئے حجت شرعی نہیں ہے جیسے سوال نمبر ۸ کے جواب میں عبارت مجمع الانہر مذکور ہوئی اور قضا و ہلال کمیٹیاں اس فیصلہ کو اگرچہ بطریق موجب نہیں پہنچا ہو اس دوسرے شہر کیلئے بھی حجت جانتی ہیں اسی بنا پر اپنے فیصلہ کو اخبار میں طبع کر دیتی ہے تو یہ ان کمیٹیوں کی چودھویں شرعی غلطی ہے:

(۱۵) ریڈیو، تار، ٹیلی فون، وائر لیس، سے جو ہلال کمیٹی کا فیصلہ دیگر شہروں کو بھیجا جاتا ہے وہ بطریق موجب نہیں جیسا کہ جواب سوال نمبر ۲ سے ظاہر ہے۔ پھر ہلال کمیٹی کا اس فیصلہ کا نشر و اعلان کرنا ظاہر ہے کہ اسی لئے ہے کہ اور شہروں کے لوگ بھی ہلال کمیٹی کے اس فیصلہ پر عمل کریں تو ان کمیٹیوں کا دیگر مقامات کے لئے اس فیصلہ کو جو بطریق موجب نہیں پہنچا قابل عمل ٹھہرانا ان کی پندرہویں شرعی غلطی ہے۔

الحاصل جب ان قضا و ہلال کمیٹیوں میں اس قدر صریح شرعی غلطیاں موجود ہیں تو ان کا فیصلہ و حکم کس قدر غلط و باطل ہوگا۔ تو ایسے غلط فیصلہ کا قاضی یا مفتی شہر شرعاً کس طرح اعلان کر سکتا ہے۔ اور اگر غلطی سے کسی مقام کے مفتی یا قاضی نے اسی غلط فیصلہ کی بنا پر اعلان بھی کر دیا تو وہ کب قابل عمل قرار پاسکتا ہے۔ مولیٰ تعالیٰ قبول حق کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۵ صفر المظفر ۱۳۷۶ھ

کتبہ: ۱۔ معتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۶ھ

(۵۷۴)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

آج یعنی ۳۰ شعبان المعظم ۱۳۷۶ھ کو ایک شخص اپنے کام سے کچھا گیا، وہاں سے آکر اس نے کہا کہ کچھا میں سب کے روزے ہیں اور سونیری گاؤں میں بھی ایک مشرع شخص کا روزہ ہے۔ اس خبر پر یہاں گاؤں والوں نے بھی روزے رکھ لئے، کچھ دیر کے بعد اسی شخص سے پھر پوچھا، ایک دوسرے شخص

نے کہ کچھا میں چاند دیکھ کر روزہ رکھا گیا یا کسی خبر پر تو؟ اس نے کہا کہ وہاں ریڈیو سے خبر آئی تھی، دوسرے شخص نے اپنا روزہ توڑ ڈالا، وہ اس لئے کہ کچھا میں دکھائی دینے کی شہادت نہیں ہے، ریڈیو کے ذریعہ چاند کی خبر سن کر روزہ رکھا اور وہ شرع شریف میں غیر معتبر ہے۔ ایک اور دوسرے گاؤں سے بھی یہی خبر ملی کہ وہاں سب کے روزے ہیں۔ لیکن چاند دکھنے کی کوئی شہادت نہیں، اس صورت حال میں دوسرے شخص کے روزہ توڑنے سے کچھ اور لوگوں نے روزے توڑ دیئے اور کچھ نے اس لئے نہیں توڑے کہ کچھا والوں نے روزے رکھے ہیں، اس لئے ہم بھی رکھ رہے ہیں، میں یہ عرض کرنا بھول گیا کہ جن لوگوں نے یہاں روزے رکھے وہ دن کے دس گیارہ بجے کے درمیان نیت کر کے رکھے، جن میں کچھ چائے پی چکے تھے، کچھ کھانا کھا چکے تھے، اور کچھ محض پانی ہی پی چکے تھے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ جنہوں نے روزے توڑے وہ گنہگار ہوئے یا نہیں؟ اور جنہوں نے روزے نہیں توڑے خواہ نقلی ہو یا فرضی یا کیسا بھی نہیں مگر توڑنے والوں کو نہیں توڑنا چاہئے تھے۔ تو اب کیا شرع کا حکم ہے؟

۱۳ اپریل ۱۹۵۷ء از نوگواں تحصیل کچھا

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

یہ تو بالکل صحیح اور حق ہے کہ ریڈیو کی خبر شرعاً معتبر اور حجت نہیں، نہ تو اس کی بنا پر روزہ کا حکم دیا جائیگا نہ عید کی جائیگی۔

روزہ کی فرضیت رویت ہلال کے متحقق ہو جانے پر ہے پھر جب وہاں رویت ہلال ہی نہیں نہ دوسرے مقام کی شہادت شرعی گذری تو شرعاً روزہ ہی فرض نہ ہوا اب رہی خبر کی خبر چاہے وہ ریڈیو ہی کی ہو تو اس سے شرعاً نہ رویت ہلال ثابت ہو سکتا ہے نہ اس پر روزہ اور عید ہو سکتی ہے۔ لہذا جن لوگوں کو بالیقین یہ معلوم ہو گیا کہ کچھا میں نہ تو رویت ہلال ہوئی نہ کوئی شہادت باہر سے آئی۔ تو انہیں شرعاً روزہ توڑ ہی دینا تھا کہ یہ یوم شک میں تھا اور یوم شک روزہ رکھنا مکروہ ہے تو ان کا تو روزہ کا توڑنا موافق شرع ہوا۔ اور جنہوں نے اس بات کے معلوم ہو جانے کے بعد بھی روزہ نہیں توڑا انہوں نے غلطی کی اور فعل مکروہ کے مرتعب ہوئے پھر ان کا نہ تو فرض روزہ ہوا کہ شرعاً ان کے حق میں رمضان کی رویت ہلال ہی ثابت نہیں ہوئی اور نہ ان کا نفل روزہ ہوا جو باعث اجر و ثواب ہے کہ یوم شک کا روزہ رکھنا ہی مکروہ ہے۔ اور پھر جب ان میں سے کسی نے صبح چائے پی لی کسی نے کھانا کھا لیا کسی نے پانی پی لیا ہے تو اس کے بعد

شرعاً روزہ کی نیت ہی نہیں ہو سکتی ہے۔ اور یہ روزہ ہی کب قرار پایا۔ مولیٰ تعالیٰ مسلمانوں میں وہ جذبہ پیدا کر دے جس سے وہ احکام شرع سے واقف ہوں اور ان کی جہالت کو دور فرما دے اور انہیں مسائل دین سیکھنے کی توفیق دے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۷ ار رمضان المبارک ۶۱ھ ۱۳۱ھ

کتبہ: مقتضی بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمیل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمیل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(545)

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

۲۹ شعبان یومِ دو شنبہ کو بریکانیر میں مطلع ابر آلودہ ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہیں آیا لیکن نوبح دہلی اور پاکستان کے ریڈیو والوں نے چند جگہ چاند ہونا بتلایا اور دہلی کے جامع مسجد کے امام نے بھی ان شہادتوں کو منظور فرما کر یکم رمضان منگل کو قرار دیکر روزہ کا اعلان ریڈیو پر کرادیا آیا یہ ریڈیو تارٹلیفون کی شہادت قابلِ تسلیم ہے اور باوجود یعنی شہادت نہ ہونے کے ریڈیو کی تواتر کی خبروں پر عمل کر کے ۲۷ رمضان یعنی شبِ قدر ۲۷ یک شنبہ کی رات کو قرار دیدی جائے اور ریڈیو کی خبروں سے ہم پر قضا روزہ واجب ہوگی یا نہیں صاف صاف بیان فرمائیں عند اللہ ماجور ہونگے۔ بیوا تو جروا

الجواب

نحمده ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

جب بیکانیر میں ۲۹ شعبان بروز پیر مطلع ابر آلود تھا جس کی بنا پر رویت ہلال نہ ہو سکی تو دوسرے مقامات سے رویت ماہ رمضان کی جب کوئی دیندار متشرع شاہد عدل آ کر شہادت دے اگرچہ وہ شخص واحد ہی ہو تو بلاشبہ اس کی شہادت لیکر ۲۷ تاریخ اور شب قدر کی شب یکشنبہ اور یکشنبہ کے اعلان کیا جاسکتا ہے اور اسی کے ساتھ ایک روزہ کی قضا کا بھی اعلان کر دیا جائے اور جن لوگوں نے اس یوم شک تیسویں شعبان منگل کو محض ریڈیو کی خبر کی بنا پر بالیقین رمضان ہی کا روزہ رکھا ہے تو وہ مرتکب مکروہ تحریمی کے ہوئے درمختار میں ہے ”ولو جزم ان یکون عن رمضان کرہ تحریمہ“ اور سخت گناہگار بھی ہوئے کہ یوم شک میں روزہ رکھنے کی ممانعت احادیث میں وارد ہے چنانچہ بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی، بیہقی، وغیرہ کتب حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”لا تقدموا رمضان بصوم يوم او يومين الا رجل كان يصوم صوما فليصمه“ تم

رمضان کے ایک دن یا دو دن پہلے روزہ سے سبقت نہ کرو ہاں ان ایام میں نفلی روزہ کا عادی ہو تو وہ بہ نیت نفل روزہ رکھ سکتا ہے۔

ترمذی، ابوداؤد، بیہقی میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ”من صام يوم الشك فقد عصی ابا القاسم ؓ“ جس نے یوم شک کا روزہ رکھا تو بیشک اس نے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نافرمانی کی۔

بہشتی شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ”ان النبی ﷺ نہی عن صیام قبل رمضان یوم ولا اضحی والفطر وایام التشریق ثلاثة ایام بعد یوم النحر“

بیشک نبی ﷺ نے اتنے روزوں سے منع فرمایا رمضان سے ایک دن پہلا عید الاضحیٰ عید الفطر عید الاضحیٰ کے بعد تین دن ایام تشریق کے۔

اسی بھیتی شریف میں حضرت عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ان علیاً وعمر رضی اللہ عنہما کانا ینہیان عن صوم الیوم الذی شک فیہ من رمضان “ بے شک حضرت علی وعمر رضی اللہ عنہما رمضان کے یوم شک کے روزہ سے منع فرمایا کرتے تھے۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ جنہوں نے تیسویں شعبان یوم شک منگل کا روزہ رکھا وہ گنہگار بھی ہوئے کہ اس دن کا روزہ ممنوع تھا اور اگر بہ نیت رمضان رکھا ہے تو مرتکب مکروہ تحریمی بھی ہوئے تو اگرچہ ان پر روزہ کی قضا واجب نہ ہو لیکن احتیاط اور تقویٰ کا بھی مقتضی ہے کہ انہیں روزہ کی قضا کر لینی چاہئے کہ وہ روزہ مکروہ تحریمی قرار پایا ہے۔

اور رویت ہلال رمضان کا کوئی شاہد عدل متشرع دستیاب نہ ہو سکے تو پھر اہل بریکانیر کے لئے شب قدر اور ۲۷ تاریخِ دو شنبہ اور اس کی شب یہ ہے اور اگر ان تیس روزے ان کے پورے ہو جاتے ہیں تو ان پر ایک روزہ کی قضا بھی واجب نہیں ہاں اس صورت میں اگر ان کے ۲۸ روزے ہو کر چاند کی رویت ہو جائے جب بھی ان کو ایک روزہ کی قضا کرنی ہوگی۔

بلاشک ریڈیو کی خبر سے نہ شرعاً رویت ہلال ثابت ہو سکتی ہے نہ اس کے اعلان پر عید کی جاسکتی ہے نہ روزہ کی فرضیت کا حکم دیا جاسکتا ہے ریڈیو کی خبر کو طریق موجب اور حجت شرعی مان لینا وہ حقیقی بدعت ضلالہ ہے جس کی اصل قرآن و حدیث سے ثابت نہیں کی جاسکتی اور جو اس کے اعلان و خبر کو طریق موجب اور حجت شرعی مانتے ہیں وہ بدعتی اور اہل بدعت ہیں مولیٰ تعالیٰ اہل اسلام کو احکام شرع پر عمل کر

نے کی توفیق دے۔ اور اندھی تقلید سے محفوظ رکھے۔ واللہ تعالیٰ بالصواب۔ ۵ رمضان المبارک ۱۳۷۶ھ
کتبہ: المختصم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
 العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

مسئلہ

(۵۷۶)

کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسائل ذیل میں

(۱) ثبوت رویت ہلال کے لئے شرعاً طریق موجب کتنی صورتیں ہیں؟

(۲) کتاب قاضی الی القاضی میں جب تمام شرائط پائے جائیں تو وہ شرعاً طریق موجب ہے یا

نہیں؟

(۳) جس شہر میں قاضی شرع یا ایسا مفتی دین موجود ہو جس کے فتوؤں پر لوگ عمل کرتے ہوں وہ

شرعی طور پر رویت ہلال کا حکم دے اس کے حکم کی مخالفت بلا دلیل شرعی کے درست ہے یا نہیں؟

(۴) جو لوگ کسی شہر کے مفتی نہ ہوں اور ان کو مسائل شرع پر عبور بھی نہ ہو ان کو اس شہر کے مفتی

کے حکم کے مقابلہ میں اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

(۵) خبر استفاضہ کی شرعاً کتنی صورتیں ہیں خبر استفاضہ طریق موجب و حجت شرعی ہے یا نہیں؟

(۶) خبر استفاضہ شہادت شرعی سے افضل اور قوی تر ہے یا نہیں اور تو اترو یقین کا فائدہ دیتا ہے یا

نہیں؟

(۷) مفتی شہر کے شرعی حکم سے جب اس شہر میں نماز عید ہو چکی تو ان مساجد اور عید گاہ میں

دوسرے دن نماز عید پڑھنا مکروہ ہے یا نہیں اور شرع اس کی اجازت دیتی ہے یا نہیں؟

(۸) بلا دلیل شرعی کے لوگوں کو پہلے دن کی نماز اور قربانی روکنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟

(۹) حکایت اور افواہ اور اخبار اور خبر استفاضہ میں کیا فرق ہے ہر ایک کی مکمل تعریف بھی کیجئے؟

(۱۰) جو خبر استفاضہ کو خبر استفادہ لکھے وہ اصطلاح شرع سے جاہل ہے یا نہیں۔ ہر سوال کا

جواب مکمل ومدلل بحوالہ کتب دیکر حکم شرع سے مطلع فرمائیں۔

المستفتی منشی عبدالوحید ساکن محلہ دیپا سرائے سنجل ۲۹ جون ۱۹۵۸ء

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) شرعاً ثبوت رویت ہلال کے لئے طریق موجب کی چھ صورتیں ہیں۔ دو صورتیں شہادت علی

الرؤیہ کی اور دو صورتیں شہادت علی القضاء کی اور دو صورتیں استفادہ کی جنکی مکمل تفصیل مع حوالہ کتب

کے میرے رسالہ اجمل المقال میں موجود ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۲) جب کتاب القاضی الی القاضی کے تمام شرائط پائے جائیں تو وہ شرعاً ثبوت ہلال کے لئے

یقیناً طریق موجب اور بالا جماع حجت شرعیہ ہے فتاویٰ عالمگیری جلد ۳ صفحہ ۱۷۲ میں ہے ”يجب ان

يعلم ان كتاب القاضى الى القاضى صار حجة شرعا فى المعاملات ولكن جعلناه حجة

بالاجماع ولكن انما يقبله القاضى المكتوب اليه عند وجود شرائطه ملخصا“ واللہ تعالیٰ

اعلم بالصواب

(۳) غیر اسلامی شہروں میں جب قاضی شرع نہ ہو تو ہر شہر کے مسلمانوں پر ضروری ہے کہ وہ

اپنے شرعی امور خصوصاً جمعہ وعیدین کی اقامت کے لئے ایک عالم دین کو قاضی والی یا مفتی شرع مقرر کر

لیں ردالمحتار میں ہے ”واما بلاد عليها ولاية كفار فيجوز للمسلمين اقامة الجمع والعياد

ويصير القاضى قاضيا بتراضى المسلمين“ (ردالمحتار جلد ۴ صفحہ ۳۲۱) اس عبارت سے ثابت ہو گیا

کہ جس شہر میں قاضی یا مفتی شرع ہو تو جمعہ وعیدین کا قائم کرنا اس کے ذمہ پر ہے اور یہ حکم اپنی جگہ ثابت

ہو چکا کہ حکم قاضی کا ماننا لوگوں پر لازم ہے اور اس کی مخالفت حکم شرع کی مخالفت ہے فتاویٰ عالمگیری میں

ہے ”قضاء القاضى ملزم فى حق الناس كافة توضيحه ان القاضى يقضى بامر الشرع وما

يصير مضافا الى الشرع فهو منزلة النص فلا يترك ذلك بالرأى كما لا يترك النص بالاجتهاد

(فتاویٰ عالمگیری جلد ۳ صفحہ ۱۶۱)

اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ قاضی یا مفتی شہر کے حکم کی مخالفت درست نہیں اور خصوصاً ایسے

لوگ جو نہ مفتی ہوں نہ مسائل شرع پر عبور رکھتے ہوں ان کا قاضی یا مفتی شہر کے حکم کا مقابلہ کرنا گویا حکم

شرع ونص کا مقابلہ کرنا ہے۔ پھر بلا دلیل شرعی کے محض اپنی رائے خاص سے حکم قاضی یا مفتی کے خلاف کر

نااہل اسلام میں تفریق کرنا ہے اور اپنی دلیری ظاہر کرتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۴) شرعاً خبر استفاضہ کی دو صورتیں ہیں پہلی صورت یہ ہے کہ کسی دوسرے شہر سے متعدد

جماعتیں آئیں اور وہ بالاتفاق یہ بیان کریں کہ فلاں شہر میں ہمارے سامنے عام طور پر لوگوں نے بیان کیا

کہ ہم نے اپنی آنکھ سے چاند دیکھا ہے چنانچہ درمختار میں ہے ”نعم لو استفاد الخبر فى البلدة

الاخریٰ لزمهم علیٰ الصحيح من المذهب“ (ردالمحتار جلد ۲ صفحہ ۹۷) دوسری صورت یہ ہے کہ جس شہر میں قاضی یا مفتی شرع موجود ہو تو اس شہر سے متعدد جماعتیں آئیں اور وہ بالاتفاق یہ کہیں کہ فلاں شہر میں فلاں دن عید ہوگئی یا فلاں ماہ کی رویت ہلال ثابت ہو چکی۔ چنانچہ ردالمحتار میں ہے:

”فی الذخيرة قال شمس الاثمة الحلواني الصحيح من مذهب اصحابنا ان الخبر اذا استفاض وتحقق فيما بين اهل البلدة الاخریٰ يلزمهم حکم هذه البلدة اه ومثله فی الشرع بلالية عن المغنہی قلت وجه الاستدراك ان هذه الاستفاضة ليس فيها شهادة علی قضاء قاض ولا علی شهادة لكن لما كانت بمنزلة الخبر المتواتر وقد ثبت بها ان اهل تلك البلدة صاموا يوم كذا لزم العمل بها لان البلدة لا تخلو عن الحاكم شرعی عادة فلا بد من ان يكون صومهم مبنی علی حکم حاکمهم الشرعی فكانت تلك الاستفاضة بمعنی نقل الحکم المذكور وهی اقوی من الشهادة“ (وفیه ایضاً) قال الرحمتی معنی الاستفاضة ان تاتى من تلك البلدة جماعات متعددون كل منهم يخبر عن اهل تلك البلدة انهم صاموا عن روية“ (ردالمحتار جلد ۲ صفحہ ۹۷)

تو خبر استفاضہ کی یہ دو صورتیں ہیں جو ثبوت رویت ہلال کے لئے طریق موجب اور حجت شرعیہ ہیں۔ پھر یہ خبر استفاضہ شرعاً شہادت شرعی سے افضل اور قوی تر ہے اور تواتر اور یقین کا فائدہ دیتا ہے جیسا کہ عبارت مذکور سے ثابت ہو گیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۷) جب ذالحجہ کو قاضی شرع یا مفتی شہر کے حکم سے نماز عید ہو چکی تو دوسرے دن کسی کو نماز عید پڑھنے کی شرعاً اجازت نہیں۔

عالمگیری میں ہے ”والامام لو صلاها مع الجماعة وفاتت بعض الناس لا يقضيها من فاتته خرج الوقت او لم يخرج“ (عالمگیری جلد ۷ صفحہ ۷۸)

اب باقی رہا نماز عید کا ان مساجد و عید گاہ میں پڑھنا جن میں یوم اول نماز عید پڑھی جا چکی ہے تو شرعاً ان میں دوسری بار نماز عید قائم کرنا مشروع و بدعت ہے بلکہ کسی قرن میں بھی کسی مسجد میں دوبار نماز جمعہ نہیں پڑھی گئی تو جب ایک مسجد میں جمعہ کی تکرار جماعت نہیں ہوئی تو ایک مسجد میں نماز عید کی تکرار کس طرح ہو سکتی ہے کہ جمعہ و عید کے ایک ہی شرائط ہیں۔

چنانچہ ردالمحتار میں ہے ”مناسبتہ للجمعة ظاهرة وهر انهما یو دیان بجمع عظیم

ویجهر فیہما بالقراءة ویشترط لاحدهما ما یشترط لاخر“

(ردالمحتار جلد ۱ صفحہ ۵۷۹)

خاص کر جہالت و نادانی کہ دوسرے دن امام کا اسی محراب و منبر پر ہیئت اولیٰ کے ساتھ دوبارہ جماعت پڑھی جانے کی کسی طرح شرع اجازت نہیں دی جاسکتی یہاں تک کہ فقہاء کرام نے بیوقوفانہ نماز کی جماعت ایک ہی مسجد میں ہیئت اولیٰ پر قائم کرنے کو مکروہ تحریمی لکھا ہے۔

ردالمحتار میں ہے ”عن ابی یوسف انه اذا لم تکن الجماعة علی الہیئة الاولیٰ لا تکرہ وهو الصحيح وبالعدول عن المحراب تختلف الہیئة“

بالجملہ جن مساجد و عید گاہ میں پہلے دن حکم شرعی کی بنا پر نماز عید کی جماعت ادا کی جا چکی، ان میں دوسرے دن ہیئت اولیٰ پر نماز عید کی جماعت کا قائم کرنا نہ فقط مکروہ بلکہ ممنوع و بدعت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۸) ایام عید کے پہلے دن لوگوں کو بلا دلیل شرعی کے نماز و قربانی سے روکنا ظاہر ہے کہ گناہ عظیم ہے اور دینی مسائل میں خود رائی ہے اور مسلمانوں کی نمازوں کو مکروہ کرنا ہے اور انہیں فضیلت قربانی سے محروم کرنا ہے جو کسی مسلمان کے لئے کسی طرح لائق و روا نہیں۔ پھر ایسے شخص کو کسی مسلمان کو نماز و قربانی سے شرعاً روکنے کا حق کیسے حاصل ہو سکتا ہے بلکہ بلا عذر شرعی کے دوسرے دن عید اضحیٰ کی نماز پڑھنا خلاف سنت و مکروہ و اسأت ہے۔

چنانچہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے ”حتى لو اخروها الى ثلاثة ايام من غير عذر اجازت الصلوة وقد اساءوا“ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۹) حکایت کسی واقعہ کا بلا تحقیق کے بغیر لفظ ثبوت شرعی کے صرف بیان کرنا خود صدق و کذب کا محتمل ہوتا ہے اگرچہ اس کی اصل واقعی طور پر موجود ہو۔ اور انوار وہ ہے جس کی واقعی طور پر کوئی اصل نہ ہو بلکہ وہ لوگوں میں شائع و مشہور ہو جائے۔ اور خبر وہ ہے جو صدق و کذب دونوں پر مشتمل ہو اگرچہ اس کی اصل کا واقع میں وجود ہو۔ اور خبر استفاضہ متعدد جماعتوں کی وہ متواتر خبریں جن کے جھوٹ پر متفق ہو جانے کو عقل جائز نہ رکھے۔ جیسا کہ نمبر ۵، ۶ میں شامی کی عبارت میں مذکور ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۱۰) جو خبر استفاضہ کو خبر استفادہ لکھے ظاہر ہے کہ وہ اصطلاح شرع سے جاہل ہے کتب فقہ سے ناواقف ہے۔ احکام دینیہ سے لاعلم ہے تو پھر اس کا اس لاعلمی و ناواقفی کی بنا پر جو بھی حکم ہوگا وہ خلاف شرع

اور غلط ہے اور وہ حدیث "افتوا بغیر علم" کا مصداق قرار پا کر سخت گنہگار اور جری فی الدین ہوگا۔
واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۷۷ھ

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہجل

(۵۷۷)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

بتاریخ ۲۹ شعبان المعظم کو بوجہ ابر کے چاند نظر نہیں آیا بعد کو معلوم ہوا کہ پاکستان ریڈیو نے بوقت ۳۰/۸۔ میں اعلان کیا کہ چاند کراچی اور لاہور اور ڈہاکہ میں دیکھا گیا، اس کے بعد انڈیا ریڈیو نے ۱۵/۹۔ میں اعلان کیا کہ لکھنؤ کے مولانا قطب الدین صاحب فرنگی محل نے اور بڑودہ کے امام مولانا فخر الدین صاحب نے چاند ہونے کا اعلان کیا، اس پر روزہ رکھا گیا۔ آیا کہ روزہ ماہ رمضان کے روزہ میں شمار کیا گیا یا مکروہ تحریمی میں۔ علاوہ بریں اس اعلان پر مسلمانان ٹیٹی اگر ٹھہرے بکثرت روزہ رکھا تھا لیکن تین شخصوں نے اس روزہ کو حرام قرار دیکر لوگوں سے افطار کرا دیا۔ اس روزہ کی قضاء شرعاً لازم ہے یا نہیں؟ اور ان تین شخصوں کے لئے شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے والسلام۔ امیر الحق پائے گڑھ۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

۲۹ شعبان بروز دوشنبہ کو جہاں بوجہ ابر کے رویت ہلال نہیں ہوئی اور کسی شہر سے ایسی خبر موصول ہوئی جو بہ طور ہو، یا بطرق موجب ہو، یا وہاں کی شہادت گزرے تو ان پر بھی وہی حکم لازم ہے۔

شامی میں ذخیرہ سے ناقل "الصحيح من مذهب اصحابنا ان الخير اذا استفاض وتحقق فيما بين اهل البلد الاخرى يلزمهم حكم هذا البلدة"

اور مجھے تو دوشنبہ کی رویت بشہادت شرعی ثابت ہوئی تو یہ شنبہ کا روزہ ضروری ہوا۔

فيلزم اهل المشرق بروية اهل المغوب اذا ثبت عندهم روية اولئك بطريق موجب
تو جن لوگوں نے شنبہ کا روزہ رکھا لیا ان کے ذمہ پر کچھ مطالبہ نہیں۔ اور جنہوں نے نہیں رکھا یا رکھ
کرافطار کر لیا ان پر اس روزہ کی قضاء واجب۔ اور جن لوگوں نے افطار کرا دیا اگر اس بنا پر کہ دوشنبہ کی بنا
محض ریڈیو کی خبر پر ہے اور ریڈیو یا تار کی خبروں سے شرعی رویت ثابت نہیں ہوتی تو ان کا یہ فعل شرعاً حسن

ومحمود ہے، اور وہ مثاب وما جور ہوئے، اور اگر ان کا یہ فعل شہادت شرعی گزر جانے یا رویت بطرق موجب ثابت ہو جانے کے بعد عمل نہیں آیا تو ان کی یہ جرأت ودیوری قابل ملامت اور لائق مذمت ہے اور وہ لوگ سخت مجرم و گنہگار ہوئے؛ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہجل

(۵۷۸)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ ذیل میں کہ

ریڈیو، تار، خط، ٹیلیفون کو چاند دیکھنے کے لئے کیوں ناجائز قرار دیا؟ آخر دوسرے کام بھی ان کے ذریعہ دن رات ہوتے رہتے ہیں ان پر کیوں اعتبار کیا جاتا ہے۔ اس کی نفی کی کیا دلیل ہے؟ اور اگر ریڈیو وغیرہ کی خبر پر عمل کیا جائے تو کیا نقص واقع ہوتا ہے؟

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

ایک مقام کی رویت ہلال دوسرے مقام کے لئے صرف شہادت علی الرویت یا شہادت علی القضاء استفاضہ سے ثابت ہو سکتی ہے جو عند الفقہاء معتبر ومقبول اور طریق موجب ہے۔ اور ان کے علاوہ تار۔ ٹیلیفون۔ لاؤڈ سپیکر۔ ریڈیو۔ وائرلیس۔ خط۔ افواہ۔ اخباری خبریں۔ جنتریاں۔ قیاسات۔ نہ شہادت کا افادہ کریں نہ استفاضہ کا بلکہ ان سے صرف خبر و حکایت حاصل ہوتی جو شرعاً بھی غیر معتبر نا مقبول ہے اور قانوناً بھی اس سے شہادت ثابت نہیں ہوتی ہے، ورنہ کچھ ریوں میں انہیں آلات کے ذریعہ سے دوسرے شہروں سے شہادت حاصل کر لی جاتی اور بلا شاہد کے حاضر کئے ہوئے انہیں آلات پر اعتماد کر کے کسی مقدمے کی ڈگری کر دی جاتی۔ لہذا ان آلات کی خبروں کا شرعاً قانوناً کسی طرح اعتبار نہیں۔ میں نے اس بحث میں ایک مبسوط ومفصل رسالہ لکھ دیا ہے جس میں ایک ایک کی پوری پوری بحث اور اس میں بکثرت عبارات منقول ہیں اس کی طرف رجوع کیا جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہجل

مسئلہ

(۵۷۹)

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ

بذریعہ اخبار ۲۹ ذی القعدہ یوم جمعہ کو رویت ہلال کی خبر پا کر متولی جامع مسجد ٹاٹ شاہ نے قبل نماز جمعہ اعلان کیا اور تمام مسلمانوں کے مشورہ سے متفقہ طور پر طے کیا کہ مفتی صاحب فیض آباد قصبہ ٹانڈہ جا کر چاند کی تحقیق فرمائیں، چنانچہ امام صاحب تشریف لے گئے اور مفتی صاحب ٹانڈہ ضلع فیض آباد سے ملکر ۲۹ ذی القعدہ یوم جمعہ کو رویت ہلال کے متعلق تحریر حاصل کی اور چاند دیکھنے والوں سے مزید خود شہادت لی اور فیض آباد آ کر فتویٰ دے دیا کہ عید دو شنبہ کو ہے اور اعلان کر دیا اب دریافت طلب یہ ہے۔

(۱) مفتی صاحب کا بغرض تحقیق رویت ہلال جانا از روئے شریعت جائز ہے یا ممنوع؟

(۲) کیا مفتی کے ساتھ ایک شاہد کا ہونا ضروری تھا اور مفتی کے حیثیت مثل شاہد کے تھی اس لئے دوسرے شاہد کی ضرورت تھی؟

(۳) جبکہ مفتی صاحب اپنے شہر کے مفتی ہیں اور شہر میں نہ کوئی دوسرا مفتی ہے نہ عالم۔ اگر ہے تو بدعقیدہ غیر متشرع اور مفتی صاحب کو دوسرے مفتی یا قاضی کے سامنے شہادت نہیں دینی تھی۔ بلکہ ثبوت شرعی لیکر خود فتویٰ دینا تھا ایسی صورت میں بھی شاہد کی ضرورت تھی، تو مفتی اور شاہد کیا عوام کے سامنے شہادت دیکر فتویٰ حاصل کرتے؟

(۴) مفتی کے لئے کیا شرائط ہیں اور مفتی کیسے بنتا ہے؟ کیا ہر عالم صاحب سند جو مسائل فقہ سے واقفیت رکھتا ہو مفتی ہو سکتا ہے؟

(۵) کچھ لوگوں نے ایک انجمن قائم کی ہے جس کا نصب العین یہ ہے کہ کسی کو برا نہ کہو۔ اس کا نام سیرۃ النبی رکھا ہے۔ اس کا صدر ایک ایسے مولوی کو بنایا ہے جو وہابیوں دیوبندیوں کے عقائد کفریہ سے واقف ہونے کے باوجود کہتا ہے میں ان لوگوں کو کافر نہیں کہہ سکتا۔ میرے اساتذہ ان لوگوں کو مسلمان مانتے ہیں۔ میں بھی ان کی اتباع میں دیوبندی مولویوں کو مسلمان ہی کہوں گا۔ بلکہ اس مولوی کے اساتذہ اشرافی تھانوی کے انتقال پر جلسہ فاتحہ و تعزیت منعقد کیا اس کے لئے ایصال ثواب کیا اس کے دینی خدمتوں کی تعریف کی اور کہا کہ اگرچہ اب مولوی اشرافی ہم میں موجود نہیں مگر ان کی تصنیفات اب بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ صدر مذکور دیوبندیوں سے میل جول رکھتا ہے بلکہ ان کے پیچھے نماز پڑھتا ہے۔ ان سے مسائل شرعیہ دریافت کرتا ہے۔ اس انجمن کے ممبران شریعت کے پابند نہیں ہیں۔ خود

صدر انجمن باوجود مولوی ہونے کے حد شرعی سے کم داڑھی چھوٹی چھوٹی کتراتا ہے۔ نماز کا پابند نہیں ہے۔ بحکم شریعت مطہرہ انجمن مذکور میں شریک ہونا ممبر بننا اس کی امداد کرنا چندہ دینا کیسا ہے؟

المستفتی۔ سید التاج حسین عرف لدن فیض آباد

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

(۱) ہمارے ملک میں مفتی شہر قاضی شرع کی طرح ہے۔ کما حقہ فتاویٰ فتاوانا۔ تو خود مفتی شہر کا دوسرے شہر میں بغرض تحقیق رویت ہلال جانا خلاف منصب اور غیر مناسب اور ممنوع ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ان فی زماننا القاضی لایذهب بنفسه۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(۲) یہ مفتی صاحب دوسرے مقام پر پہنچ کر یا تو وہاں کے مفتی سے گفتگو کر کے محض رویت ہلال کی خبر لیکر واپس ہوں گے تو خبر سے یہاں کے لئے رویت ہلال نہیں ہوتی۔

رد المحتار میں ہے: اذا اخبر ان اهل بلدة كذا راوه لانه حکایة (فما ثبتت الرویة بطریق موجب)

اور اگر وہاں کے مفتی کی تحریر لے کر آئے تو ظاہر ہے کہ اس تحریر میں شرائط کتاب القاضی الی القاضی مفقود ہیں۔

اس تحریر سے یہاں کیلئے رویت ثابت نہ ہوگی۔ ہدایہ میں ہے:

ولا یقبل الكتاب الا بشهادة رجلین او رجل و امرتین لان الكتاب يشبه الكتاب ب فلا یثبت الا بحجة تامة وهذا لا نه ملزم فلا بد من الحجة۔

یا شاہدین سے شہادت کی تکمیل و توکیل کے بعد یہ مفتی بہ شاہد علی الشاہد قرار پائے تو پھر دوسرے شاہد کی ضرورت اور باقی رہے گی اور نصاب شہادت پورا نہیں ہوا۔

لہذا اس صورت میں بھی رویت ثابت نہیں ہوئی۔ رد المحتار میں ہے:

و شرط للفطر مع العلة و العدالة نصاب الشهادة و لفظ اشهد و هلال الاضحی و بقية الا شهر التسعة كالفطر علی المذهب۔

مختصر اتوان ہر صورت میں رویت ہلال ثابت نہ ہو سکی واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۳) جب صرف قاضی یا مفتی ہی نے خود چاند دیکھا تو یہ نہ عید گاہ نماز کیلئے جاسکتا ہے اور نہ

عالمگیری میں ہے: ولورای الامام و حدہ او القاضی و حدہ ہلال شوال لا یخرج الی المصلی و لا یامر الناس بالخروج ولا لفطر لا سرا ولا جہرا کذا فی السراج۔

تو جب خود مفتی چاند دیکھ کر بھی رویت ہلال کا حکم نہیں کر سکتا تو صورت مسئلہ میں کس طرح رویت کا حکم دے سکتا ہے۔ بلکہ مفتی صاحب کیلئے مناسب یہ تھا کہ خود تو تشریف نہ لیجاتے اور دو شاہدین عاد لین کو وہاں بھیجتے جو وہاں کے مفتی صاحب سے کتاب القاضی الی القاضی حاصل کرتے اور اس تحریر کو یہاں کے مفتی صاحب کے سامنے پیش کر کے اس پر شہادت دیتے۔ یا اصل شاہدوں سے شہادت کی تکمیل و توکیل کے بعد شاہد علی الشاہد بلکہ یہاں آکر ان مفتی صاحب کے روبرو شہادت دیتے پھر یہ مفتی صاحب رویت ہلال کا حکم دیتے۔ کما فصلناہ فی رسالتنا اجمال المقال لعلاف رویۃ الہلال۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۴) مفتی کے شرائط و آداب ردالمحتار، عالمگیری، فتاویٰ سراجیہ وغیرہا میں یہ ہیں۔ مسلمان ہونا، بالغ ہونا، عاقل ہونا، عادل ہونا، عالم ہونا، مذہب امام کا حافظ ہونا، اپنے اہل زمانہ سے واقف ہونا، اصول و قواعد امام سے واقف ہونا، اقوال فقہاء پر مطلع ہونا، بیدار مغزو ہو شیار ہونا، بردبار ہونا، خلیق ہونا، خند ہر وہ ہونا، نرم مزاج ہونا، بوقت فتویٰ سخت غضبناک یا غمگین و مسرور نہ ہونا، فتاویٰ پر اجرت نہ لینا، اگر اپنی خطا پر مطلع ہو جائے تو رجوع کر لینا، جواب میں بلا وجہ تساہل نہ کرنا، خوش لباس ہونا، راہ میں چلتے ہوئے فتویٰ نہ دینا، مستفتیان میں اغنیاء کو فقراء پر ترجیح نہ دینا، فتویٰ کی عزت کرنا، جواب کے آخر میں واللہ تعالیٰ اعلم لکھنا، اور فتویٰ کا کلام بلا سمجھے نہیں آتا، محض سند حاصل کر لینے یا مسائل سے واقفیت پیدا کر لینے سے مفتی نہیں ہو جاتا اور نہ فاسق مفتی ہو سکتا، اور نہ اس کے فتوے پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

ردمختار میں ہے: و الفاسق لا یصلح مفتیا۔

ردالمحتار میں ہے: و الحاصل انہ لا یعتمد علی فتویٰ المفتی الفاسق مطلقا۔

تو پھر مرتد و ضال بدرجہ اولیٰ نہ مفتی ہو سکتا ہے نہ اس کا فتویٰ قابل اعتماد ہو سکتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۵) اگر اس انجمن کا یہ ناپاک نصب العین ہے تو یہ نہایت گمراہ کن اور سخت کفریہ انجمن ہے اور

پھر اس پر مزید فریب یہ ہے کہ اسکا نام سیرۃ النبی رکھا ہے۔ اگر اس گمراہی و ضلالت کا نام سیرت ہے تو نہ یہ قرآن کریم کے نازل ہونے کا کوئی فائدہ باقی رہا اور نہ نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کا رآمد رہی۔ کہ قرآن کریم اسی لئے نازل ہوا ہے کہ کفر و اسلام میں فرق کرے۔ حق و باطل میں امتیاز پیدا کرے۔ حرام و حلال میں تمیز سکھائے، مسلمان و کافر کے فرق کو بتائے، نیک و بد کی معرفت کرائے، نبی کریم ﷺ کی بعثت شریفہ اسی کی تکمیل کیلئے ہے۔ حضور کی سیرت و خلق بالکل قرآن کریم کے موافق ہے۔

قرآن کریم فرماتا ہے: ما کان اللہ لیدر المؤمنین علی ما انتم علیہ حتی یمیز الخبیث من الطیب۔ (سورہ آل عمران ۷-۱۸ع)

اللہ مسلمانوں کو اس حال پر چھوڑنے کا نہیں جس پر تم ہو جب تک جدا نہ کر دے گندے خبیث کو طیب سحرے سے۔

یہ آیت منافقین کے بارے میں نازل ہوئی۔ تو آیت میں منافق کو خبیث فرمایا جو بظاہر کلمہ گو تھے اور نماز پڑھتے تھے اور جہاد کرتے تھے اور مومن کو طیب پاک فرمایا اور مومن و گمراہ میں امتیاز کرنا خلق الہی ثابت ہوا۔

اور حدیث شریف میں ہے: تخلقوا باخلاق اللہ۔ اور حضور نبی کریم ﷺ جو کہ خلق الہی پر پیدا کئے گئے ہیں، چنانچہ حضور نے گمراہوں کو اتنا ممتاز فرمایا۔

حدیث میں ہے: الخوارج کلاب اہل النار۔

دوسری حدیث میں ہے: اترعون عن ذکر الفاجر ان تدکروہ متی یعرفہ الناس فاذکروہ یعرفہ الناس۔

یعنی کیا فاجر کو برا کہنے سے پرہیز کرتے ہو۔ لوگ اسے کب پہچان گئے، فاجر کی برائی کا ذکر کرو۔ تو یہ سیرت النبی ہے کہ فاسق و فاجر کو برا کہا جائے اور یہ انجمن والے فاسق کا تو ذکر کیا گمراہ مرتد کو برا کہنے سے پرہیز کرتے ہیں تو یہ سیرۃ النبی ﷺ کے کتنے شدید دشمن اور مخالف ٹھہرے۔ پھر لوگوں کو محض فریب دینے کیلئے اس انجمن کا نام سیرۃ النبی رکھتے ہیں، اور یہ اس انجمن میں مکروکید اور دجل و فریب ہونا بھی چاہئے کہ جب اس کا صدور وہ ہے جو عقائد کفریہ کو ایمان جانتا ہے۔ مرتدین کو مسلمان کہتا ہے۔ گمراہ کن کتابوں کے مشعل ہدایت بتاتا ہے۔ بیدینیوں سے میل جول رکھتا ہے، ان کے پیچھے نماز پڑھتا ہے۔ انہیں عالم دین اعتقاد کرتا ہے۔ تو یہ ضرور پکا وہابی دیوبندی ہے۔ اور مولوی اپنے آپ کو کہلواتا ہے

اور اس نے یہ مسئلہ نہ دیکھا کہ الرضا بالکفر کفر۔

لہذا اہل سنت و جماعت کا اس انجمن میں شریک ہونا، اس کا ممبر بننا، اسمیں چندہ دینا، اس کی کسی طرح کی امداد کرنا بلا شک اعانت علی المعصیت ہے اور حرام و ممنوع ہے کہ حدیث شریف میں ہے: ایسا کم و ایسا ہم لا یضلو نکم و لا یفتنوا نکم۔ اور دوسری حدیث میں ہے: لا تجالسوہم۔ یعنی تم ایسے گمراہوں سے بچو۔ انہیں اپنے آپ سے بچاؤ کہ کہیں تمہیں گمراہ نہ کر دیں اور فتنہ میں نہ ڈال دیں، انکے ساتھ نہ بیٹھو۔ یہ تمام احادیث سیوطی کی جامع صغیر میں ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ ۷/ جمادی الآخر ۱۳۷۲ھ

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۵۸۰)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں
عید الفطر کے چاند کی خبر ریڈیو سے جائز ہے یا نہیں بدلیل بیان فرمائیں؟۔

الجواب

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

عید الفطر کے لئے اتیس کا چاند رویت یا شہادت شرعی کی صورت یا استفادہ کی صورت یعنی کل چھ طریق سے ثابت ہوتا ہے ان طریق کے علاوہ بیس طریق اور ہیں۔ حکایت۔ خبر۔ اخبار۔ جنتری۔ خط۔ تار۔ ریڈیو۔ ٹیلیفون۔ وائرلیس۔ لاؤڈ اسپیکر۔ ٹیلی ویژن۔ و قیاس وغیرہ سے ہرگز رویت ہلال ثابت نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کی پوری تفصیل مع دلائل و حوالجات کے میرے مطبوعہ رسالہ ”اجمل المقال لعارف رویت ہلال“ میں ہے جس کو تفصیلی بیان دیکھنا ہو وہ اس رسالہ کا مطالعہ کر کے دلائل پر مطلع ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۵۸۱)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین مسائل ذیل میں کہ

ہمارے شہر میں شعبان المعظم کی ۲۹ تاریخ کو آسمان ابر آلود ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہیں آیا۔ لیکن دہلی۔ پٹنہ۔ الہ آباد۔ حیدر آباد۔ وغیرہ کے ریڈیو اسٹیشنوں سے وہاں سے چاند دیکھائی دینے کی خبر نشر کی گئی جسے یہاں بذریعہ ریڈیو سنا گیا۔ ہمارے صوبہ اڑیسہ اور کلکتہ وغیرہ سے کوئی خبر رویت ہلال پر نہیں ملی۔

(۱) ایسی حالت میں اسی رات کو تراویح پڑھنا اور اسکی صبح کو روزہ رکھنا کیسا ہے۔

(۲) یہ روزہ شعبان کی نفل روزے کی نیت سے رکھا گیا تو کیسا ہے؟۔

(۳) اور رمضان المبارک کی نیت سے روزہ رکھنا کیسا ہے؟۔

(۴) صورت مذکورہ بالا میں رمضان المبارک کی نیت سے روزہ رکھنے والا کیسا ہے؟۔

(۵) اور نفل کی نیت سے روزہ رکھنے والا کیسا ہے؟۔

(۶) کچھ لوگوں نے ۲۹ شعبان کو ریڈیو کی خبر تسلیم کر کے اسی رات میں تراویح پڑھنا اور دن کو

روزہ رکھنا یہ درست ہے یا نہیں؟ ایسے لوگوں کو کیا کہا جائے۔

(۷) کچھ لوگ اعلان کرتے ہیں کہ چاند نظر نہیں آیا۔ اور نہ چاند کی شہادت ہی ہوئی۔ صرف

ریڈیو کی خبر پر شریعت مطہرہ نے عمل کرنے کو منع فرمایا ہے۔ اس لئے دوسرے روز تراویح پڑھا اور صبح

روزہ رکھا یہ درست ہے یا نہیں؟۔

(۸) ایک شہر کا یہ دستور عرصہ سے تھا۔ کہ جب کسی وجہ سے چاند نہیں دکھائی دیا لوگ تاریخ ریڈیو

کی خبر سے رمضان شریف کی تراویح اور عید کی نماز ادا کیا کرتے تھے۔ اور اس دور میں جس قدر علمائے کرام

ام بھی تشریف لائے کسی نے اس کو نہیں روکا۔ اور نہ کسی نے اسکے خلاف کوئی آواز اٹھائی۔ اب ایک

جماعت ہے کہ چاند خود اپنی آنکھوں سے دیکھے بغیر یا عین شہادت بغیر رمضان یا عید نہیں مناتی۔ لہذا اس

جماعت کا یہ فعل درست ہے؟۔ یا جو لوگ ریڈیو وغیرہ کی خبر پر رمضان یا عید مناتے ہیں یہ درست ہے؟۔

اسی وجہ سے ایک مرتبہ ہندوستان کے اکثر شہروں میں ایک روز عید منائی گئی۔ اور اس شہر میں دوسرے

روز منائی گئی۔ یعنی پورے تیس روزے کے بعد نماز عید ادا کی گئی، اس سے بعض لوگوں میں ایک ہیجان برپا

ہے۔ کہ چاند ہم نہ دیکھیں تو کیا۔ قریب قریب سارے ہندوستان میں ایک دن عید منائی جا رہی ہے لیکن

ریڈیو کی بات نہ تسلیم کرنے پر ہم لوگ دوسرے دن عید منائیں یہ کہاں تک درست ہے۔

لہذا جب اکثر شہروں میں عید منائی جا رہی ہے اور ہمیں ریڈیو سے صحیح خبر مل رہی ہے تو ہم کو بھی ریڈیو کی خبر صحیح تسلیم کر کے سب بھائیوں کے ساتھ ایک ہی تاریخ میں عید کی خوشی منانا چاہیے یا نہیں؟
اور ایسے لوگ جو ریڈیو کی خبر کو تسلیم کرتے ہیں اور دوسروں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ بھی اس خبر کو مان لیں ایسے لوگوں کے لئے شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟

(۹) جو لوگ صرف چاند کی رویت یا عین شہادت کے بغیر رمضان یا عید نہیں مناتے ایسے لوگوں کے لئے شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟۔ جواب بحوالہ کتب و نقل عبارت مرحمت فرمائیں فقط والسلام۔

محمد عبد المنان میاں جی کلک موکا۔ ۶ مئی ۵۵ء

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) جب وہاں ۲۹ شعبان کو نہ خود چاند دیکھا گیا نہ بطریقہ موجب کوئی شرعی شہادت دستیاب ہوئی تو انہیں شعبان کے ۳۰ دن پورے کرنے تھے۔ حدیث شریف میں ہے 'فان غم علیکم فاقدروا له ثلثین'۔

نہ ۳۰ شعبان کو روزہ رکھا جاتا ہے نہ اسکی شب میں نماز تراویح پڑھی جائے۔ اور ریڈیو کی خبر کی بنا یہ دونوں کام کرنے غلط اور خلاف شرع ہوئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۲) ایسے یوم شک ۳۰ شعبان کو بہ نیت نفل روزہ رکھنا عوام کو مکروہ ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۳) جب شرعاً رویت ہلال ہی ثابت نہیں ہو سکی تو رمضان کی نیت سے روزہ رکھنا مکروہ و ممنوع ہے واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۴-۵) صورت مذکورہ میں بہ نیت فرض رمضان اور بہ نیت نفل روزہ رکھنے والا خطا کا راہور مرتکب مکروہ تحریمی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۶) محض ریڈیو کی خبر پر تراویح و روزہ رکھنا نادرست اور ایسے لوگ دین سے بے خبر ہیں واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۷) جن لوگوں نے ریڈیو کی خبر کو معتبر نہیں جانا اور ۳۰ شعبان کو نہ روزہ رکھا نہ اسکی شب میں تراویح پڑھی تو انکا یہ فعل درست ہوا شرع کے موافق ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۸) جو لوگ ریڈیو، تار، ٹیلیفون، خط وغیرہ کی خبروں پر رمضان وعید کر لیا کرتے ہیں وہ خلاف شرع کیا کرتے ہیں، اور وہ جو رویت ہلال یا اسکی شرعی شہادت بطریقہ موجب پر رمضان وعید کا حکم دیتے ہیں وہ شریعت کے موافق کرتے ہیں، شہری رواج اگر خلاف شرع جاری ہو جائے وہ ہرگز ماننے کے قابل نہیں، اور جو لوگ ریڈیو کی خبر پر خود بھی عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی مجبور کرتے ہیں وہ خلاف شرع کرنے پر بہت جری و دلیر ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ ان کی حالت زار پر رحم فرمائے ان کی بات ہرگز ہرگز نہ مانی جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۹) ایسے لوگ شریعت مطہرہ کے ماننے والے احکام خداوندی کا اتباع کرنے والے ہیں، اس دور میں یہ بہت قابل قدر اور لائق پیروی ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: مقتسم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۵۸۲)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین در بارہ اس مسئلہ کے کہ ہماری مسجد میں ایک پیش امام صاحب مبلغ ۲۰ روپیہ ماہوار ہیں اور فصل پران کے لئے غلہ بھی کر دیا جاتا ہے جو وہ بخوبی اپنے گھر کی گذر کر لیتے ہیں، ہمارے یہاں قصبہ میں اور ارد گرد بہت سی جگہ نماز عید الاضحیٰ جمعرات کو ہوئی، اور ہم سب قصبہ والوں نے نماز عید الاضحیٰ جمعرات کو پڑھی لیکن صرف ہمارے محلے کے پیش امام صاحب اور چند لوگوں نے جو بہت کم تعداد میں تھے، نماز عید الاضحیٰ بروز جمعہ کو پڑھنے کو کہا، لیکن ہم نے اکثریت زیادہ ہونے اور دوسرے بڑے شہروں میں نماز عید الاضحیٰ جمعرات کو ہونے کے باعث نماز عید الاضحیٰ دوسرے پیش امام صاحب کو بلا کر جمعرات کو پڑھی اور قربانیاں بھی کیں، جب ہم نے پیش امام صاحب سے نماز عید الاضحیٰ پڑھانے کو کہا تھا تو انہوں نے جواب دیا کہ نماز عید الاضحیٰ جمعہ کی ہے جمعرات کی نہیں ہے، اس لئے جمعرات کو نماز عید الاضحیٰ پڑھانا جائز نہیں۔ اور انہوں نے چند محلہ کے آدمیوں کی نماز عید الاضحیٰ جمعہ کو پڑھائی، لہذا ایسی صورت میں ان پیش امام صاحب کے پیچھے نماز پڑھنا درست ہے یا نہیں،۔ جواب سے مطلع کیجئے۔

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

امام مسجد مذکور نے اگر نماز عید الاضحیٰ بروز جمعرات پڑھنے سے اس بنا پر انکار کیا کہ خود قصبہ میں تو انتیس کو رویت ہلال نہ ہوئی ہو اور باہر سے بھی کوئی خبر بطریق موجب شرعی نہ ملی ہو تو عام طور پر اس وقت جو ذرائع خبر ہیں جیسے کسی شہر کی رویت ہلال کی خبر بطور افواہ کے ہو، یا شہرت کے ہو۔ یا اخبار سے وہ خبر ہو۔ یا بذریعہ خط، اور لفافہ کے ہو۔ یا ٹیلی گرام سے ہو، یا ٹیلی فون سے ہو، یا ریڈیو سے ہو، یا وائرلیس سے ہو۔ یا لاؤڈ سپیکر سے ہو یا ٹیلی ویژن سے ہو یا جنتریوں یا قیاسات یا اختراعات کی بنا پر ہو تو یہ تمام ذرائع شرعاً معتبر نہیں تو اس بنا پر امام کا جمعرات کے دن نماز عید الاضحیٰ پڑھانے سے انکار کرنا او اسکو ناجائز کہنا بالکل صحیح اور موافق شرع کے ہے۔ اور اگر قصبہ میں انتیس کو رویت ہلال ہو گئی تھی۔ چاند کے دیکھنے والے دو شاہدان عدل گواہی دیں۔ یا خود شاہدین نہ ہوں تو دو شاہد علی الشاہد گواہی دیں۔ یا وقت حکم قاضی کے دو گواہان شرعی گواہی دیں۔ یا حفظ قاضی مع شرائط و گواہان کے آئے۔ یا بطور استفاضہ یعنی کسی شہر سے متعدد جماعتیں آئیں اور بالاتفاق یک زبان یہ کہیں کہ فلاں شہر میں فلاں دن رویت ہلال ہوئی ہے۔ عام طور پر لوگوں کا بیان ہے کہ ہم نے ابھی آنکھ سے چاند دیکھا ہے۔ تو یہ پانچ صورتوں میں جن سے دوسرے شہر کی رویت ثابت ہو جاتی ہے۔ تو اگر قصبہ میں ان پانچ صورتوں میں سے کوئی صورت متحقق ہو گئی تھی شرعاً رویت ہلال کا ثبوت پایا گیا تھا اس کے باوجود امام مذکور کا جمعرات کو نماز عید الاضحیٰ پڑھانے سے انکار کرنا غلط تھا اگرچہ نماز عید الاضحیٰ الحجبہ کو بھی پڑھی جاسکتی ہے مگر اکو پڑھنا افضل ہے۔ بہر صورت یہ امام جمعہ کے دن نماز عید الاضحیٰ پڑھکر کسی ایسے جرم شرعی کا مرتکب نہیں ہوا جس کی بنا پر اس کے پیچھے نماز پڑھنا درست نہیں ہو جائے۔ لہذا اس امام کے پیچھے نماز ہرگز ترک نہ کی جائے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: المقسم بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ

(۵۸۳)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ
دہلی میں دہلی کے علماء و رؤسا کی خواہش پر ایک رویت ہلال کمیٹی تقریباً پچاس سال قبل اس لئے
بنی تھی کہ وہ متفقہ طور پر ماہ صیام اور عیدین کے چاند کے متعلق فیصلے کرے چنانچہ یہ کمیٹی ہمیشہ ہر طبقہ کے
مشاہیر علماء کرام کی شرکت و اتفاق کے ساتھ فیصلہ کرتی رہی۔ اس سال بد قسمتی سے چند علماء نے علیحدہ
ایک نئی کمیٹی بنائی اور ٹیلیفون کی خبر پر چاند ہونے کا فیصلہ کر دیا جس کو قدیم کمیٹی کے صدر اور دیگر علماء نے

نہیں مانا اور عدم رویت کا حکم دیدیا۔ اس پر جدید کمیٹی والوں نے نہایت درجہ مخالفت کی جس سے
مسلمانوں میں سخت اختلاف واقع ہو گیا۔ جدید کمیٹی والوں کا اصرار ہے کہ اب ریڈیو اور ٹیلیفون کی
خبر پر اثبات رویت ہلال ہوا کرے گا اب سوال یہ ہے کہ کیا ان آلات کی خبریں معتبر ہو گئیں۔ آج سے
تقریباً تیس پینتیس سال قبل ایک رسالہ مسمی التلغراف شائع ہوا تھا اس میں بڑے بڑے علماء (جن میں
مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب بھی شامل ہیں) نے تار اور خطوط کے غیر معتبر ہونے پر فتویٰ دیا ہے اور مفتی
صاحب ہمیشہ آخر عمر تک قدیم کمیٹی سے وابستہ رہے۔ اور دنیاوی عدالت والے بھی ان آلات (ریڈیو
ٹیلیفون تار) کو غیر معتبر مانتے ہیں اور شہادت کے لئے شاہد کی حاضری ضروری جانتے ہیں تو کیا شرعی
شہادت کا معیار دنیاوی شہادت کے معیار سے کم ہے۔ اگرچہ خبریں معتبر ہیں تو اس کو دلائل سے ثابت کیا
جائے اور اگر غیر معتبر ہیں تو بتلایا جائے کہ اس صورت میں مسلمانوں کا کیا فرض ہے۔ نئی کمیٹی کے کہنے پر
چلیں یا بدستور قدیم پرانے علماء کے فتوے پر عمل کریں۔ بینوا تو جرو۔

محمد معین۔ ۲۱۵۶ ریڈسٹون پلاننگ روڈ گران دہلی

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

شریعت نے اثبات رویت ہلال کے لئے صرف چھ طرق موجب معتبر قرار دیئے ہیں۔

پہلا: شہادت علی الرویۃ۔

دوسرا: شہادت علی الشہادۃ۔

تیسرا: شہادت علی القضا۔

چوتھا: شہادت علی خط القاضی۔ تو یہ چاروں صورتیں تو شہادت کے تحت میں داخل ہیں۔ تو ان
میں رکن شہادت۔ محل شہادت۔ شرائط شہادت۔ شرائط شاہدان کا لحاظ عموماً ضروری ہے اور خصوصاً ادائے
شہادت کے لئے مجلس قضا میں شاہدان کا قاضی کے سامنے حاضر ہونا اور شہادت علی الشہادت کی تکمیل
و تکمیل کا ہونا اور شہادت علی القضاء میں شاہدان کا مجلس قضا میں بوقت قضا موجود ہونا۔ اور شہادت علی
خط القاضی میں قاضی کا تب کا مجلس قضا میں شاہدین کو خط سونپنا۔ اور پہلے انہیں خط پڑھ کر سنانا۔ پھر ان
کے سامنے اس خط کو لفافہ میں رکھ کر سر بمہر کرنا اور مکتوب الیہ قاضی کا اس خط کو مجلس قضا میں سر بمہر دیکھ کر
لینا اور شاہدان کا اس طرح شہادت ادا کرنا کہ یہ فلاں بن فلاں قاضی کا خط آپ کے نام ہے ہم نے اس کو

سنا ہمیں اس پر گواہ کیا ہمارے سامنے اس کو لفافہ میں بند کیا اور سر بمہر کیا۔ اس کا یہ مضمون ہے، ہم اس کی گواہی دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ آلات تار۔ ٹیلیفون۔ لاؤڈ اسپیکر۔ ریڈیو۔ وائرلیس۔ ٹیلیویژن ان چاروں طرق موجب کی اہلیت نہیں رکھتے کہ ان میں نہ تحمل شہادت کی صلاحیت، نہ شرائط شہدین کی قابلیت۔ تو ان چاروں طرق موجب میں ان آلات کی نااہلیت ایسی نمایاں ہے جس کو نہ فقط تعلیم یافتہ شخص بلکہ ناخواندہ بھی تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہے۔

پانچواں: طریق موجب یہ ہے کہ کسی شہر سے جماعت کثیرہ پے درپے آئے اور وہ سب باتفاق بیان کریں کہ فلاں شہر میں ہمارے سامنے عام طور پر لوگ بیان کرتے تھے کہ ہم نے چاند دیکھا ہے۔

چھٹا: طریق موجب یہ ہے کہ جس شہر میں قاضی یا مفتی شرع ہو جس کے حکم یا فتوے پر احکام روزہ عیدین نافذ ہوتے ہیں تو اس شہر کی متعدد جماعتیں آئیں اور وہ باتفاق یک زبان یہ کہیں کہ فلاں شہر میں فلاں ماہ کے فلاں دن رویت ہوئی ہے اسی بنا پر فلاں دن پہلا روزہ تھا یا فلاں دن عید کی گئی تو یہ دونوں از قسم شہادت نہیں بلکہ از قسم اخبار ہیں اور خبر بھی وہ ہے جو حد تو اتر تک پہنچ گئی ہے کہ اس شہر سے چند جماعتیں آئیں اور انہوں نے باتفاق یہ بیان کیا کہ وہاں رویت ہوئی تو یہ دونوں خبریں خبر استفاضہ کہلاتی ہے جو خبر متواتر کے حکم میں ہے اور یقین کا فائدہ کرتی ہے اور شہادت سے قوی تر ہے اور ظاہر ہے کہ ان آلات سے جس شہر سے جو خبر آتی ہو۔ وہ واحد کے حکم میں ہے اور خبر بھی ایسی جس کے صدق کا ظن غالب تک حاصل نہیں ہوتا کہ تار ٹیلیفون ریڈیو میں کوئی شرعی طور پر ذمہ داری کا اہتمام نہیں۔ آئے دن ان میں خلاف واقعہ اور جھوٹی خبریں آتی رہتی ہیں پھر اگر مثلاً ریڈیو سے چند مقامات کے اسٹیشنوں کی خبر متفق ہو جائے تو وہ ظن غالب اور تو اتر کا افادہ نہیں کرتی۔

اولا: ریڈیو میں اس قدر خامیاں ہیں کہ وہ اس کی نشر کے شرعا غیر معتبر ہونے کے لئے بہت کافی ہیں۔

ثانیا: ریڈیو سے اگرچہ کسی جماعت علماء کا فیصلہ ہو جب اس کو ایک شخص نشر کرے تو وہ ایک مقام کی خبر واحد ہی تو ہوگی۔

ثالثا: جب اختلاف مطالع کا قول لیا جائے تو چند مقامات کی خبروں کا اتفاق دوسرے مقامات کے لئے کیسے تو اتر کا افادہ کریگا۔

رابعاً: دو چار مقامات کا اتفاق حد تو اتر تک کب پہنچتا ہے تو چند مقامات کی خبر کا اتفاق خبر استفاضہ نہیں جو خبر متواتر کے حکم میں ہو جائے۔

بالجملہ جب ان آلات سے نہ چاروں طرق شہادت متحقق ہو سکے نہ ہر دو طرق خبر استفاضہ قرار پاسکے تو اثبات رویت ہلال کے لئے جو شرعا چھ طرق موجب تھے وہ ان آلات سے حاصل نہ ہو سکے۔ ہاں ان آلات سے اتنی خبر معلوم ہو جاتی ہے کہ فلاں شہر میں چاند دیکھا ہے تو یہ صرف ایک خبر اور حکایت ہے اور شرعا ایسی خبر و حکایت دوسرے شہر میں رویت ہلال ثابت کرنے کے لئے معتبر نہیں۔

ردالمحتار اور طحاوی میں ہے: اذا اخبر ان اهل بلد كذا راوه لانه حكاية۔

تو جب ایک مسلمان عاقل بالغ عادل کی ایسی خبر و حکایت دوسرے شہر کے لئے رویت ہلال ثابت نہیں کرتی تو ان نو ایجاد آلات کی مجہول در مجہول خبر دوسرے شہر کے لئے رویت ہلال کس طرح ثابت کر سکتی ہے۔

الحاصل یہ آلات کسی دلیل شرعی سے ثابت نہ ہو سکے اور جب یہ خود دلیل شرعی نہ ہوئے تو ان سے خلاف اصل دوسرا مہینہ شرعا ثابت نہیں ہو سکتا۔

ہدایہ میں ہے: ان الاصل بقاء الشهر فلا ينقل عنه الابدليل۔

کون نہیں جانتا ہے کہ جب انیسویں کو رویت ہلال نہیں ہوئی تو تیسویں تاریخ کو ماہ زواں کا موجود ہونا اصل و قطعی ہے تو جب تک اس کے خلاف دوسرے مہینہ کا ثابت کرنا خلاف اصل بلا دلیل کے ہوا۔ تو ماہ رواں کا باقی ہونا قطعی قرار پایا۔

ہاں ایک بات اور باقی رہی کہ بعض اپنی کم علمی کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ ان آلات سے نہ شہادت کا اثبات ہوتا ہے نہ خبر کو دلیل بنایا جاتا ہے بلکہ ان آلات سے شہادت کا اعلان کیا جاتا ہے۔ تو اس فریب کا ازالہ یوں ہے۔

اولاً: ریڈیو میں جس شہادت کا اعلان کیا جاتا ہے وہ شہادت خود قابل اطمینان اور لائق اعتماد ہو ہی تو محل کلام ہے کہ ہر عالم رکن محل شرائط شہادت پر پورے طور پر واقف نہیں ہوتا۔ اور اگر اس سے بھی قطع نظر کیجئے تو بوقت ادائے شہادت کے الفاظ شہادت کو ملحوظ نہیں رکھا۔ شرائط شہاد کا لحاظ نہیں کرتا کہ ان کی بدعقیدگی اور فسق و بدعملی کا تزکیہ کرتا۔ اور ایک عام بلایہ ہے کہ ہلال رمضان کے علاوہ اور مہینوں میں دستور الحال کی شہادت پر رویت ہلال کا حکم دیدیتا ہے۔ تو جس شہادت میں اتنی غلطیاں خامیاں بکثرت

ہوتی ہوں تو شہادت شرعاً کس طرح معتبر ہو سکتی ہے۔ پھر جب وہ شہادت اور اس کا حکم شرعاً غیر معتبر تو اس کا ریڈیو پر اعلان کیسے معتبر اور قابل اطمینان ہو سکتا ہے۔

ثانیاً: اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ علماء نے چاند کی باقاعدہ شہادت لیکر چاند ہونے کا حکم کر دیا اور ایک مسلم معتقد متعین ہو کر اس فیصلہ و حکم کی خبر ریڈیو پر نشر کرتا ہے تو یہ اسی طرح ہوا کہ قاضی نے چاند کی باقاعدہ شہادت لیکر چاند ہونے کا حکم دیا اور ایک معتقد مسلمان کو قاصد بنا کر دوسرے شہر میں بھیجا اور اس قاصد نے دوسرے شہر میں قاضی کے حکم کی خبر دی تو اس قاصد کی خبر شرعاً معتبر نہیں نہ اس خبر سے دوسرے شہر میں رویت ہلال ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ فتح القدیر میں ہے: الفرق بین رسول القاضی و بین کتابہ حیث یقبل رسولہ فلان غایۃ رسولہ ان تکون نفسہ و قدمنا انہ نوی لو ذکر ما فی کتابہ لذلك القاضی بنفسہ لایقبل و کان القیاس فی کتابہ كذلك الا انہ اجیز باجماع التابعین علی خلاف القیاس فاقتصر علیہ۔ (فتح القدیر کشوری ج ۳ ص ۲۶۶)

تو جب دوسرے شہر میں قاصد قاضی کی خبر شرعاً معتبر نہیں اور اس سے رویت ہلال ثابت نہیں ہوتی تو اس حکم علماء کی ریڈیو پر نشر کرنے والے قاصد کی خبر کس طرح شرعاً معتبر ہو گئی اور اس خبر سے دوسرے مقامات کے لئے رویت ہلال کی کیسے تائید ہو گئی۔

ثالثاً: عبارت فتح القدیر سے ثابت ہو گیا کہ قاضی کا اپنے حدود حکومت کے باہر کسی دوسرے مقامات پر جا کر یہ کہنا کہ میں نے فلاں ماہ کی شہادت لیکر ثبوت ہلال کا حکم دیا۔ اس دوسرے مقامات کے لئے معتبر اور مقبول نہیں تو ان علماء کے حکم کا ریڈیو پر کسی مسلم معتقد شخص کے واسطے سے نشر کرنا یا خود مفتی کا ریڈیو پر آکر کہنا دوسرے مقامات پر رویت ہلال ثابت کرنے کے لئے کس دلیل شرعی سے معتبر و مقبول ہے۔

رابعاً: اسی عبارت سے ظاہر ہو گیا کہ جب ایک علاقہ کے قاضی کے اعلان و خبر رویت ہلال پر اس کے ماتحت علاقوں و مقاموں کے سوا کسی دوسرے علاقہ کے قاضی کے حدود میں عمل کرنا ضروری نہیں تو ایک مقام کے مفتی کے اعلان و خبر حکم رویت ہلال پر کسی دوسرے مقام کے مفتی کے حدود میں عمل کرنا وہ بھی نہ دس بیس شہر بلکہ تمام ہندوستان کے شہروں و قصبوں بلکہ تمام پاکستان کے شہروں و قصبوں میں کس دلیل سے ضروری قرار دیا۔

خامساً: مکہ مکرمہ میں چاند کی باقاعدہ شہادت لیکر چاند ہونے کا حکم کیا جاتا ہے اور حکومت نجد کے ذریعہ سے معتقد طور پر ریڈیو پر اس حکم کو نشر کیا جاتا ہے تو مکہ مکرمہ کے ریڈیو کا نشر کیا ہوا اعلان کیوں قابل عمل نہیں۔ ہندوستان و پاکستان میں اس اعلان پر عید اضحیٰ کیوں نہیں ہوتی۔ حالانکہ بقول مفتی بہ اختلاف مطالع غیر معتبر ہے۔

سادساً: ریڈیو کی آواز کی معرفت کو مقید قرار دینا شریعت کی مخالفت ہے اکثر کتب فقہ میں یہ تصریح موجود ہے النعمۃ تشبہ النعمۃ تو کسی کی آواز کی معرفت تعین شخص کے لئے دلیل شرعی نہیں۔ سابعاً: جن شرائط نے ریڈیو کی خبر کو معتبر قرار دیا اگر وہی شرائط تار کے لئے ضروری قرار دیدیئے جائیں تو تار کی خبر رویت ہلال کے لئے کیوں معتبر نہیں۔

ثامناً: قرون ثلاثہ میں ایک مقام کی رویت کے صرف اعلان اور خبر پر کسی دور کے مقامات پر اگر عمل کیا گیا ہو تو معتبر و مستند کتاب سے ثابت کیا جائے۔

تاسعاً: جو شرائط کتاب القاضی الی القاضی کے ہیں ظاہر ہے کہ ریڈیو کی خبر میں وہ شرائط موجود نہیں ہے تو ریڈیو کی خبر کس بنا پر خلاف قیاس معتبر ہے۔

عاشراً: صرف ایک مقام کے ریڈیو سے رویت ہلال کا اعلان ہو اور اکثر اسٹیشنوں سے یہ اعلان ہو کہ یہاں باوجود مطلع صاف ہونے کے رویت ہلال نہیں ہوئی تو اگر ایک مقام کے رویت کے اعلان کو غیر معتبر قرار دیا جاتا ہے تو کیوں جب وہاں علماء باقاعدہ شہادت لیکر حکم رویت کا کرتے ہیں اور معتقد مسلمان نے ریڈیو پر جا کر اس حکم کو نشر کیا ہے بعدہ اگر اس ایک کو معتبر قرار دیا جاتا ہے تو اکثر اسٹیشنوں کا اعلان کس بنا پر نامعتبر ہوگا۔

حاصل بحث یہ ہے کہ ان آلات کے اعلان اور خبر سے رویت ہلال کا ثابت کرنا احکام شرع کے خلاف ہے اور محض اپنی ناقص رائے پر عمل کرنا ہے اور اپنی عقل سے شرع میں دخل دینا ہے اور بحکم حدیث من احدث فی امرنا هذا مالینس منه فہورد۔

کے بدعت اور محدث فی الدین ہے تو اسکے ماننے والے اہل بدعت قرار پائے تو اہل اسلام ان کے قول پر ہرگز ہرگز عمل نہ کریں بلکہ ہر اس کمیٹی کے کہنے پر نہ چلیں جو ان آلات کی خبر پر رویت ہلال ثابت کرے یا جو شرائط شہادت کو مد نظر نہ رکھے یا جو شرائط شاہدین خصوصاً ان کے اعتقاد و عملی احوال کا بغیر نزکیہ کئے ہوئے رویت ہلال کا حکم دیدے۔ یا جو بدعتیہ و بدعمل گواہان کو شہادت کا اہل سمجھ کر اور معتبر

قرار دیکر رویت ہلال ثابت کر دے لہذا ہر ایسی کمیٹی کو فیصلہ کرنا شرعاً نادرست و حرام ہے جس کو اس اجمالی فتوے کی تفصیل اور ہر چیز پر عبارات دیکھنے کا شوق ہو وہ ہمارے رسالہ ”اجمل المقال لعارف رویۃ الهلال“ کا مطالعہ کرے خصوصاً طبع دوم کا جس میں ضروری ابحاث اور تحقیقات جدیدہ پیش کی گئیں ہیں۔ اور ہلال کمیٹیوں کی شرعی حیثیت اور ان کی شرمناک غلطیاں دکھائی گئیں ہیں اور یہ طبع اول سے تقریباً ڈیوڑھا ہو گیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۵/ ذیقعدہ ۱۳۷۸

کتبہ: ۱۔ معتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنہ ۱۳۷۸

رسالہ اجمل المقال لعارف رویۃ الهلال

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله الذي جعل للقمر بروجاً و منازل - والصلاة والسلام على من رجع الشمس على اشارته عاجلاً - و شق القمر باصبعه اذا صار كاملاً - و على اله و صحبه الذين هم بدور لمن يكون لدينه مستكملاً و على الائمة و الفقهاء الذين هم نجوم لمن يكون في الحوادث سائلاً - و على كل من كان الى الدين مائلاً -

اما بعد۔ آج اگر مسلمان اپنے دین کو جانتے۔ مذہب کو مانتے۔ عقائد سے واقف ہوتے مسائل سے آگاہ ہوتے۔ دینی تعلیم کا ذوق رکھتے۔ اعمال کا شوق رکھتے مدارس اسلامیہ کو عروج پر پہنچاتے۔ علمائے حق کی خدمت میں بکثرت آتے جاتے۔ تو ان میں نہ کوئی نیا مذہب ایجاد ہوتا نہ کوئی سلف و خلف کی مخالفت کی جرأت کرتا۔ نہ کوئی مغربی تعلیم کے اثر سے اس قدر دلیر ہو جاتا کہ مسائل دین میں محض اپنی رائے ناقص سے دخل دینے لگتا۔ اور جائز کو ناجائز اور حرام کو حلال ٹھہرا لیتا۔ اس وقت یہ جو کچھ مذہب سے آزادی اور دین سے بیزاری پھیلتی چلی جا رہی ہے اور ہر جگہ فرقہ بندی اور اختلافات کا سیلاب امنڈتا جا رہا ہے۔ یہ سب دین سے ناواقفی اور مذہب سے بے رغبتی کا ثمرہ ہے۔ یہ ایک بلائے عام ہے کہ احکام دین کو نہ خود جاننے ہیں۔ نہ جاننے والوں سے دریافت کرتے ہیں۔ جو اپنے خیال خام اور زعم ناقص میں آجاتا ہے۔ اسی کو حکم شریعت اور مسئلہ دین قرار دیدیتے ہیں۔ یہی ایک رویت ہلال کا مسئلہ ہے۔ اس میں ہر شخص آزاد ہے۔ ہر ایک کی نئی ایجاد ہے۔ خصوصاً عید کے چاند میں ہر کس و ناکس اپنے آپ کو مفتی دین اور قاضی شرع سمجھتا ہے۔ اور ہر نامقبول اور نااہل کی خبر پر ثبوت ہلال کا قطعی طور پر حکم دیدیتا ہے۔ باوجودیکہ عوام کا تو ذکر ہی کیا بعض خواص کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ وہ نہ شہادت کی صحیح تعریف جانیں۔ نہ نخل واد کے فرق پہنچانیں۔ نہ انہیں شہادت کے رکن کا علم۔ نہ انہیں نفس شہادت کے شرائط پر اطلاع۔ نہ مشہود بہ کے شرائط کا پتہ۔ نہ انہیں یہ معلوم کہ کن کن شاہدوں کی شہادت معتبر ہے۔ اور کن کن گواہوں کی گواہی نامعتبر ہے۔ نہ انہیں یہ امتیاز حاصل ہے کہ احکام شرع کی بنیاد یقیناً پر ہے۔ یا ظنیات پر ہے۔ حتیٰ کہ ان کی لاعلمی ہی نہیں بلکہ ان کی دلیری اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ رویت ہلال کے متعلق ادھر تو عوام نے

کچھ ایسے من گڑھت قواعد اور قیاسات بنائے ہیں جن کی دین میں کوئی اصل نہیں۔ ادھر مغربی ایجادات کے متوالوں نے تار۔ ٹیلی فون۔ لاؤڈ اسپیکر ریڈیو، وائرلیس، ٹیلی ویژن وغیرہ کی خبروں کو رویت ہلال کے لئے مان لیا ہے۔ جن کی خبر شرعاً غیر مقبول و نامعتبر ہے۔

بلکہ تعجب ہے کہ چند نام کے مولویوں نے فساق فجار کی نہ صرف شہادتوں بلکہ ان کی حکایات و خبروں پر عید کا حکم دیدینا شروع کر دیا ہے۔ یہ ان کی انتہائی جہالت اور لاعلمی ہے اور ان کا فاسق کی شہادت کو معتبر جاننا اور اس پر حکم دیدینا سراسر باطل اور بالکل غلط حکم ہے۔

میرے چند اہل علم احباب کا اصرار تھا کہ اس مسئلہ میں کوئی جامع اور مفصل اور نہایت مدلل رسالہ لکھ دیا جائے۔ لیکن میں اپنی عدیم الفرستی کا عذر کرتا رہا۔ اب ریاست جو دھپور سے مولوی اشفاق حسین صاحب سلمہ نے چند سوالات بغرض جوابات بھیجے اور بہت زیادہ اصرار کیا کہ ان سوالات کے جوابات میں ایک مبسوط اور جامع رسالہ لکھ دیا جائے تاکہ اس کو طبع کر دیا جائے۔ اور اس کا فائدہ عام ہو۔

لہذا میں نے باوجود اپنی عدیم الفرستی کے چند ضروری امور اس رسالہ میں جمع کر دیئے ہیں۔ اور ان کے سوالات کے جوابات ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس مسئلہ سے متعلق اور جتنے ضروری امور تھے ان سب کو جمع کر دیا ہے۔ تاکہ اس موضوع میں کسی مزید سوال کی ضرورت ہی پیش نہ آئے اسی بنا پر اس رسالہ کا تاریخی نام ”اجمل المقال لعارف رویۃ الہلال“ رکھ دیا ہے۔

اس مسئلہ میں میرے مرشد شریعت و طریقت۔ مجدد دین و ملت۔ امام اہل سنت۔ اعلیٰ حضرت مولانا مولوی مفتی الحاج الشاہ احمد رضا خان صاحب قدس سرہ کے دور سالے میری نظر سے گزرے ایک کا نام ”ازکی الالہلال بابطال ما احدث الناس امر الہلال“ نصف جز کا اور دوسرا

”طرق اثبات ہلال“ جز کا ہے۔ ان میں اس مسئلہ کی نہایت کافی اور بہت نفیس تحقیق ہے لیکن ان میں ان جدید آلات کا حکم اور شرائط شہادت اور اوصاف شاہدین وغیرہ چند ضروری بحثوں کا بیان نہیں تھا۔ اگرچہ اہل علم و فہم کے لئے ان میں سب کچھ مذکور تھا اور حقیقت یہ ہے کہ یہ رسالے جن سوالات کے جواب میں ہیں ان میں ان چیزوں کا ذکر ہی نہ تھا۔ اور ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ کہ اس زمانہ میں ان میں کے اکثر وجود ہی میں نہیں آئے تھے۔

لہذا ضرورت لاحق ہوئی کہ ان جدید آلات کے بھی مکمل و مفصل احکام لکھ دیئے جائیں۔ اس رسالے میں میں نے اپنے مرشد برحق کے ہر دور سالوں کے اقتباسات بھی درج کئے ہیں۔ اور عربی

عبارات کو مع قید صفحہ و مطبع کے اس لئے لکھا ہے کہ جو صاحب اصل عبارات کا مطالعہ کرنا چاہیں۔ وہ باسانی دیکھ سکیں۔ اور عوام کے لئے ان عبارات کا اردو میں سامنے ترجمہ کر دیا۔ تاکہ یہ لوگ بھی کلام فقہا پر مطلع ہو جائیں۔ مسئلہ کے اظہار سے پہلے چند مقدمات پیش کئے گئے تاکہ ان کے مطالعہ کے بعد یہ مسئلہ کماحقہ سمجھ میں آجائے۔ اور ان کے محفوظ کر لینے کے بعد پھر کوئی ذی فہم اس قسم کی غلطیوں میں مبتلا نہ ہو سکے وباللہ التوفیق۔

خادم المسلمین محمد اجل غفرلہ سنی حنفی قادری سنبھلی

سوالات

حضرت فقیہ معظم، وحید الزماں، مفتی ہند، جناب مولانا مولوی الحاج الشاہ محمد اجل صاحب دام ظلہ العالی۔۔۔۔۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی۔ عرض خدمت والا میں یہ ہے کہ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام و مفتیان عظام صورت ذیل میں کہ

دور حاضر کی نو ایجادات میں ریڈیو، ٹیلیویژن، ٹیلیفون، لاؤڈ اسپیکر، وائرلیس وغیرہ ایسی ایجادات ہوئی ہیں جن کے ذریعہ اعلان کرنے میں ایک قسم کی سہولت پیدا ہو گئی ہے جس سے اعلان و خبر دینے میں پہلے کافی وقت صرف ہوتا تھا، اب چند منٹ بلکہ سکند میں وہ کام ہو جاتا ہے، آج جو کچھ بھی ان ایجادات سے دنیوی بلکہ بعض موقع پر دینی اعلان ہوتا ہے اس کو صحیح جانتے ہوئے اس پر عمل کرتے ہیں اور حکومت کا تو سارا نظام ہی اسی پر ہے۔ اس لئے امور ذیل دریافت طلب ہیں۔

امر اول۔ حاکم شرع بعد شہادت رویت ہلال کے ریڈیو۔ ٹیلیویژن وغیرہ سے عید وغیرہ کے لئے اعلان کرائے تو کیا اس اعلان پر عمل کرتے ہوئے عید وغیرہ کر سکتے ہیں یا نہیں۔

امر دوم۔ حاکم شرع بعد شہادت رویت ہلال کے اپنے نائب کو بذریعہ ٹیلیفون یا وائرلیس کے حکم دے کہ میں نے رویت ہلال کی شہادت لے لی ہے تم اعلان کر دو کہ کل مثلاً عید وغیرہ ہوگی۔ تو کیا نائب ایسے موقع پر اس کام کے لئے ایسے آلہ کے ذریعہ سے اپنے حاکم اعلیٰ کے حکم پر عمل کر سکتا ہے یا نہیں۔ جب کہ وہ اس کی آواز کو بھی پہچانتا ہو اور اس اعلان پر عید مناسکتے ہیں یا نہیں۔

امر سوم۔ کیا ہر شہر کے لئے علیحدہ علیحدہ شہادت کی ضرورت ہے یا ایک جگہ کی شہادت سے چند جگہ عید مناسکتے ہیں جبکہ اعلان ہر جگہ شرعی قوانین کے تحت میں ہو۔

امر چہارم۔ نماز و خطبہ وغیرہ میں برائے رسانیدن صوت تکبیر امام کے قریب لاؤڈ اسپیکر

لگا سکتے ہیں یا نہیں۔ جب کہ اس سے صرف آواز کا مقتدیوں تک پہنچانا منظور ہو جیسا کہ مجالس خیر میں کرتے ہیں۔

امر پنجم۔ ٹیلی ویژن ایک ایسا نو ایجاد آلہ ہے جس کے اندر متکلم کا پورا نقشہ یہاں تک کہ اس کی پوری نقل و حرکت ایسی معلوم ہوتی ہے جیسا کہ وہ یہاں پر ہی کلام کر رہا ہے۔ درس و تدریس وغیرہ کا کام بھی اس سے لیا جاتا ہے۔ لہذا اگر ٹیلیویژن سے شہادت ہلال وغیرہ یا اعلان عید وغیرہ شرعی قوانین کے تحت میں کرایا جائے تو اس اعلان یا شہادت پر عمل کرتے ہوئے عید مناسکتے ہیں یا نہیں۔ جب کہ شاہد کے اندر شرعی نقطہ نظر سے کوئی نقص نہ ہو۔ اگر اس صورت میں بھی شہادت یا اعلان قابل قبول نہ ہو تو پھر شہادت کی شرعی نقطہ نظر سے کیا تعریف ہے؟

امر ششم۔ آیا ایجادات مذکورہ کے ذریعہ جو بھی اعلان ہو وہ شرعاً قابل قبول ہے یا نہیں اور بعض میں ہے تو تخصیص کی کیا وجہ ہے؟

نوٹ:- ٹیلیگرام کے اندر تو یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس میں ہاں، کا، نا اور نا، کا، ہاں ہو جاتا ہے۔ مگر آلات مذکورہ میں تو اس قسم کا شک و شبہ ہی نہیں اس میں تو متکلم جو کچھ بھی کہے گا وہی صاف آواز آئے گی۔ بلکہ اس کو دوسرے طریقے سے یوں سمجھا جائے کہ دور تک آواز پہنچانے اور پھیلانے کے آلے ہیں۔ اور صوت جو ایک معین جگہ پر تھی اس کو بہت سی جگہ پر پھیلا دیا یعنی متکلم جس وقت اپنی آواز کو نکالتا ہے تو اس کی آواز کو بذریعہ مشین کے ہوا کی لہر میں پہنچایا جاتا ہے جو لہر کہ ایک سکند میں دنیا کے تین چکر لگاتی ہے۔ لہذا جب شرعی قوانین کے تحت میں ریڈیو، ٹیلیویژن وغیرہ سے اعلان کرایا جائے تو ایسے اعلان وغیرہ کو کیوں نہ معتبر مان لیا جائے۔ نیز بسا اوقات اعلان کرنے میں۔ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال کرتے ہیں اور پھر اس کو ہر طرح سے صحیح جان کر عمل کرتے ہیں تو اس طرح حاکم شرع اپنے انتظام سے ریڈیو وغیرہ سے اعلان کرائے تو اس کو بھی معتبر جان کر عمل کرنا چاہئے۔ اس میں اور اس میں تخصیص کیوں کی جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ لاؤڈ اسپیکر میں ایک معین جگہ تک آواز جاتی ہے۔ اور اس میں ایک وقت میں بہت سی جگہ پہنچ جاتی ہے۔ جواب مع دلائل کے مرحمت فرمایا جائے۔ بینواتو جروالی یوم القیامۃ۔

المستفتی عبدالمصطفیٰ محمد اشفاق حسین نعیمی اجملی مراد آبادی

۱۹ اگست ۱۹۵۰ء

مدرس مدرسہ اسلامیہ حنفیہ محلہ خیرادیاں جو دھپور

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

جوابات سے قبل چند مقدمات پیش کئے جاتے ہیں جن سے جوابات کا سمجھنا آسان ہو جائے۔ مقدمہ اولیٰ۔ احکام شریعت کے ثبوت کے لئے تین حجیتیں ہیں۔ علامہ خیر الدین رملی کے فتاویٰ خیرہ میں ہے۔

حجج الشرع الشریف ثلاث البینة والاقرار والنکول۔ خیرہ مصری ج ۱ ص ۲۰۴ شرع شریف کی حجیتیں تین ہیں بینہ اور اقرار اور نکول (یعنی مدعی علیہ کا قاضی کے حلف لینے کے بعد انکار یا سکوت کرنا)۔

علامہ محقق شیخ ابن نجیم الاشباہ والنظائر میں فرماتے ہیں: القاضی لا یقضی الا بالحنة وهی البینة او الاقرار والنکول۔ (الاشباہ مع جموی کشوری ص ۳۰۱)

قاضی حجت ہی پر حکم دے۔ اور حجت بینہ اور اقرار اور نکول ہے۔

فقیہ النفس حضرت امام قاضی خاں کے فتاویٰ قاضی خاں میں ہے:

ان القاضی انما یقضی بالحجة والحجة هی البینة او الاقرار واما الصک لا یصلح حجة لان الخط یشبه الخط۔ (فتاویٰ قاضی خاں مصطفائی ص ۳۳۷)

بیشک قاضی تو حجت ہی پر حکم دیگا اور حجت بینہ اور اقرار ہے لیکن چک تو وہ حجت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی کہ خط خط کے مشابہ ہو جاتا ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ قاضی کے لئے احکام شرع طے کرنے کے لئے تین حجیتیں ہیں۔ ایک اقرار۔ دوسری نکول۔ تیسری بینہ۔

اقرار۔ یعنی کسی دوسرے کا حق اپنے ذمہ پر ثابت کر لینا۔ لہذا جب مقرر عاقل بالغ ہو اور بلا جبر و اکراہ کے اقرار کرتا ہو تو جس چیز کا مقرر نے اقرار کیا ہے قاضی اسی پر حکم دیگا اور وہ مقرر پر لازم ہو جائے گی۔

نکول۔ یعنی مجلس قضا میں مدعی علیہ کا بلا کسی وجہ کے قاضی کے تین مرتبہ حلف پیش کرنے پر حلف سے انکار کرنا یا سکوت کرنا۔ تو قاضی مدعی علیہ کے اس انکار یا سکوت پر حکم کر دیگا اور اس کے خلاف مدعی

کے حق میں فیصلہ کر دیگا۔

بینہ۔ یعنی شہادت اور گواہوں سے دعوے کو ثابت کرنا حقوق عباد میں ان تینوں کی ترتیب یہ ہے کہ ہدایہ میں ہے۔

إذا صحت الدعوى سأل القاضي المدعى عليه عنها لينكشف وجه الحكم فان اعترف قاضي عليه بها لان الاقرار موجب بنفسه فيامره بالخروج عنه وان انكر سأل المدعى البينة وان احضرها قاضي بها وان عجز عن ذلك وطلب يمين خصمه استحلفه عليها واذانكل المدعى عليه عن اليمين قاضي عليه بالنكول والزمه ما ادعى عليه ملخصا۔ ہدایہ مطبوعہ رشیدیہ ج ۳ ص ۱۸۶ و ۱۸۷

جب دعویٰ صحیح ہو جائے تو قاضی اس کے متعلق مدعی علیہ سے سوال کرے تاکہ حکم کی وجہ ظاہر ہو جائے پھر اگر وہ اعتراف کرے تو قاضی اس دعویٰ کی اس پر ڈگری کر دے کہ اقرار خود حکم کا سبب ہے تو قاضی اسے اس سے خارج ہونے کا حکم کرے اور اگر مدعی علیہ انکار کرے تو قاضی مدعی سے بینہ طلب کرے اگر وہ بینہ پیش کر دیے تو اس پر حکم دیدے اور اگر مدعی بینہ سے عاجز ہو تو مدعی علیہ سے اس پر قسم پیش کرے اور جب مدعی علیہ قسم سے انکار کرے تو قاضی اس انکار پر حکم دے اور جو دعویٰ ہو اس کو لازم کر دے۔

تو قاضی انہیں تین حجّتوں کی بناء پر حکم کیا کرتا ہے۔ ہاں حقوق اللہ میں زیادہ بینہ پر حکم ہوتا ہے۔ تینوں میں فرق یہ ہے کہ اقرار و نکول قاصرہ ہیں کہ اقرار مقرر کے لئے اور نکول منکر کے لئے تو حجت ہے لیکن یہ دونوں اوروں کے لئے نہ موجب نہ ملزم۔ علامہ برہان الدین مرغینانی اقرار کے متعلق فرماتے ہیں۔

ہدایہ میں ہے: وهو "الاقرار" حجة قاصرة لقصور ولاية المقر عن غيره فيقتصر عليه

(ہدایہ مطبوعہ رشیدیہ ج ۳ ص ۲۱۵)

اقرار حجت قاصرہ ہے کہ مقرر کی اپنے غیر پر قاصر ولایت ہے تو اقرار کا حکم صرف مقرر ہی کے حق میں ہے۔ علامہ ابن عابدین نکول کے متعلق ردالمحتار میں فرماتے ہیں:

النكول اقرار وهو حجة قاصرة بخلاف البينة۔ (ردالمحتار ج ۴ ص ۴۴۲)

نکول بھی اقرار ہے اور حجت قاصرہ ہے بخلاف بینہ کے "کہ وہ حجت تامہ ہے"۔

تو اقرار و نکول ہر دو کا حجت قاصرہ ہونا ثابت ہوا۔ پھر نکول بھی حقیقۃً اقرار ہی ہے۔

ہدایہ میں ہے: النكول اقرار لانه يدل على كونه كاذبا في الانكار فكان اقرار او بدلا عنه۔ (ہدایہ مطبوعہ رشیدیہ ج ۳ ص ۱۸۸)

نکول اس لئے اقرار ہے کہ وہ انکار میں اس کے کاذب ہونے پر دلالت کرتا ہے تو نکول یا تو اقرار ہو یا اس کا بدل۔

اسی بناء پر امام فقیہ النفس نے شرع کی حجّتیں دو قرار دی ہیں۔ کہ نکول بھی اقرار ہی ہے۔ لہذا حجت کاملہ ان تینوں حجّتوں میں صرف بینہ ہے۔ تو احکام شرع اکثر و بیشتر اسی بینہ سے ثابت کئے جاتے ہیں۔ اور قاضی بھی زیادہ فیصلے اسی بینہ پر صادر کرتا ہے۔ بالجملة احکام شریعت کے ثابت ہونے کی صرف یہی تین حجّتیں ہیں۔ اب ان کے سوا کسی اور چیز کو محض اپنی رائے سے حجت قرار دینا غلط اور باطل ہے۔ اور دین میں تصرف کرنا ہے۔

مقدمہ ثانیہ۔ مقدمہ اولیٰ میں یہ چیز ثابت ہو چکی کہ اکثر احکام شرع کی بناء اسی بینہ اور شہادت پر ہے۔ تو شہادت کے رکن و شرائط کا سمجھنا بھی نہایت ضروری ہوا۔ لہذا رکن شہادت لفظ اشہد ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: اماركنها فلفظ اشهد بمعنى الخبر دون القسم۔

(عالمگیری مجیدی کا پور ج ۳ ص ۲۰۲)

شہادت کا رکن لفظ اشہد ہے یعنی میں شہادت دیتا ہوں جو خبر کے معنی میں ہے نہ کہ قسم کے معنی میں۔ حضرت امام اجل ابو الحسن قدوری مختصر قدوری میں فرماتے ہیں: فان لم يذكر الشاهد لفظ الشهادة وقال اعلم او اتيقن لم تقبل شهادته۔ (قدوری مجیدی ص ۲۷۷)

اگر گواہ نے شہادت کا لفظ ذکر نہیں کیا اور یہ کہا کہ میں جانتا ہوں یا یقین کرتا ہوں تو اس کی شہادت مقبول نہیں۔

محل شہادت۔ یعنی شہادت کا محل اور مکان قاضی کی مجلس ہے۔

علامہ ابن عابدین ردالمحتار میں فرماتے ہیں: قوله شرائط مكانها واحداى مجلس القضاء۔ (ردالمحتار مصری ج ۴ ص ۳۸۵)

شہادت کے مکان کی شرط صرف ایک مجلس قضا ہے۔

لہذا قاضی کی مجلس شہادت کے ادا کرنے کے لئے شرط ہے۔ اسی طرح مفتی شہر کی مجلس افتا

شہادت ادا کرنے کے لئے شرط ہے۔

تخل شہادت۔ یعنی گواہ بننے کے لئے تین شرطیں ہیں۔ (۱) عاقل ہونا۔ (۲) بینا ہونا، (۳) جس چیز کی گواہی دیجائے گی اس کا معائنہ کرنا۔

در مختار میں ہے: شرائط التحمل ثلثة العقل الكامل وقت التحمل والبصر ومعاينة المشهود به۔ (رد المحتار مصری ج ۴ ص ۳۸۵)

تخل شہادت کی تین شرطیں ہیں۔ بوقت تخل عقل کامل ہونا۔ بینا ہونا۔ جس کی گواہی دی جائے اس کا معائنہ کرنا۔

شرائط شہادت۔ یعنی نفس شہادت کے لئے تین شرائط ہیں۔ (۱) دعویٰ کا ہونا۔ (۲) اور جن چیزوں پر مرد بھی مطلع ہوتے ہیں ان میں دو مرد یا ایک مرد و دو عورتوں کے عدد کا ملحوظ رکھنا۔ (۳) ہر دو گواہوں کا بیان میں متفق ہونا۔

عالمگیری میں اور رد المحتار میں ہے: منها ما يرجع الى نفس الشهادة وهي الدعوى والعدد في الشهادة فيما يطلع عليه الرجال واتفاق الشاهدين ملخصا۔

(عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۲۰۲ وکذا فی الشامی)

شرائط شہادت سے جو نفس شہادت کی طرف راجع ہوں۔ وہ دعویٰ کا ہونا۔ جس پر مرد مطلع ہو سکیں۔ شہادت میں عدد کا ملحوظ ہونا۔ ہر دو گواہوں کا متفق ہونا۔

شرائط مشہود بہ۔ یعنی جس کے ساتھ شہادت دی جائے گی۔ اس کی سات شرطیں ہیں۔

رد مختار میں ہے: الاسلام ان كان المشهود عليه مسلما والذكورة في الشهادة في الحدد والقصاص وتقدم الدعوى فيما كان من حقوق العباد وموافقتها للدعوى وقيام الرائحة في الشهادة على شرب الخمر ولم يكن سكران لالبعد مسافة والاصالة في الشهادة في الحدود والقصاص وتعذر حضور الاصل في الشهادة على الشهادة كذا في البحر۔

(رد المحتار مصری ج ۴ ص ۳۸۵)

جس کے خلاف شہادت ہو اگر وہ مسلمان ہے تو اس کا مسلمان ہونا حدود و قصاص کی شہادت میں مرد ہونا حقوق عباد میں جس کی شہادت دینا چاہتا ہے اس سے پہلے دعویٰ ہو جانا شہادت کا دعویٰ کے موافق ہونا شراب پینے کی شہادت میں جب وہ بیہوش نہ ہوا اور دور کی مسافت نہ ہو تو بوکا موجود

ہونا۔ حدود و قصاص کی شہادت علی الشہادۃ میں گواہان اصل کا شہادت دینا۔ شہادت علی الشہادت میں گواہان اصل کی حاضری کا دشوار ہونا۔

شرائط شاہدین۔ یعنی ادائے شہادت میں گواہوں کے لئے دس شرائط ہیں۔

رد مختار میں ہے: فہی الحرية والبصر والنطق والعدالة لكن هي شرط وجوب القبول على القاضي لا شرط جوازه وان لا يكون محدودا في قذف وان لا يجز الشاهد الى نفسه مغنما ولا يدفع عن نفسه مغرما فلا تقبل شهادة الفرع لاصله وعكسه واحد الزوجين للآخر وان لا يكون خصما فلا تقبل شهادة الوصي لليتيم والوكيل لموكله وان يكون عالما بالمشهود به وقت الاداء ذاكره۔ (رد المحتار مصری ج ۴ ص ۳۸۵)

شرائط شاہدین یہ ہیں۔ آزاد ہونا۔ بینا ہونا۔ بولنے والا ہونا۔ عادل ہونا۔ لیکن یہ شرائط وجوب قبول علی القاضی کے ہیں۔ نہ کہ جواز کے شرائط۔ اور اس کا تہمت کی حد مارا ہوا نہ ہونا۔ اور گواہ میں اپنے لئے کوئی نفع یا اپنے اوپر سے دفع ضرر مقصود نہ ہونا۔ تو فرع کی شہادت اصل کے لئے اور اصل کی فرع کے لئے اور زن و شوہر میں ایک کی دوسرے کے لئے مقبول نہیں۔ اور گواہ کا فریق مقدمہ نہ ہونا۔ پھر وصی کی شہادت یتیم کے لئے اور وکیل کی موکل کے لئے مقبول نہیں اور جس چیز کی شہادت دیتا ہو بوقت ادا اس کو جاننا اور اس کا یاد ہونا۔

حکم شہادت۔ قاضی کے لئے گواہوں کی عدالت ثابت ہونے اور تزکیہ ہو جانے کے بعد اس کے موافق حکم کرنا واجب ہے۔

در مختار میں ہے: حکمها وجوب الحكم على القاضي بموجبها بعد التزكية۔

(رد المحتار مصری ج ۴ ص ۳۸۵)

شہادت کا حکم یہ ہے کہ قاضی پر تزکیہ کے بعد اس شہادت کے موافق حکم کا واجب ہونا۔ ادائے شہادت۔ حقوق اللہ میں بلا طلب مدعی کے بھی گواہی دینا واجب ہے۔

در مختار میں ہے: ويجب الاداء بلا طلب الشهادة في حقوق الله تعالى۔

(رد المحتار مصری ج ۴ ص ۳۸۶)

حقوق اللہ میں بلا طلب مدعی کے گواہی دینا واجب ہے۔

اب باقی رہے شہادت کے اقسام ان کی تفصیل کتب فقہ میں ہے لیکن گواہوں کا عادل ہونا تمام

اقسام میں شرط ہے۔

یعنی شرح کنز الدقائق میں ہے: شرط للكل ايضا (العدالة) لانها هي المعينة للصدق قال الله تعالى واشهد واذوى عدل منكم وقال الله تعالى ممن ترضون من الشهداء والعدل هو المرضي وهي شرط لزوم العمل بالشهادة۔ (یعنی مصری ج ۲ ص ۷۸)

تمام اقسام شہادت کے لئے عدالت شرط ہے کہ یہی صداقت کے لئے معین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم میں سے دو صاحب عدل گواہی دیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: گواہوں میں سے ہوں کہ جو تمہارے پسندیدہ ہوں۔ اور عدالت ہی وصف پسندیدہ ہے تو یہی عدالت شہادت پر لزوم عمل کے لئے شرط ہے۔

اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ شہادت کے لئے عدالت کا شرط ہونا قرآن کریم کی آیات سے ثابت ہے۔ اب فرمان خداوندی کے ہوتے ہوئے کسی اور دلیل کی حاجت ہی نہیں باقی رہتی۔ اور عدالت سے مراد فقہائے کرام کی یہ ہے۔

رد المحتار میں ہے: قال في الذخيرة واحسن ما قيل في تفسير العدالة ان يكون محتباً للكبائر ولا يكون مصراً على الصغائر ويكون صلاحه اكثر من فساده وصوابه اكثر من خطئه۔ (رد المحتار مصری ج ۲ ص ۳۸۷)

ذخیرہ میں کہا اور عدالت کی تفسیر میں بہترین قول یہ ہے کہ عادل کبیرہ گناہ ہوں سے پرہیز کرنے والا ہو اور صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرتا ہو اور اس کی صلاح فساد سے زائد ہو اور اس کا صواب خطا سے اکثر ہو۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: واحسن ما قيل في تفسير العدل ما نقل عن ابي يوسف رحمه الله ان العدل في الشهادة ان يكون محتباً عن الكبائر ولا يكون مصراً على الصغائر ويكون صلاحه اكثر من فساده وصوابه اكثر من خطئه كذا في النهاية۔

(عالمگیری مجیدی ص ۲۰۲)

اور عدل کی تفسیر میں عمدہ ترین وہ قول ہے جو حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منقول ہے کہ شہادت میں عادل ہونا یہ ہے۔ کہ وہ کبیرہ گناہوں سے محتب ہو اور صغیرہ گناہوں پر مصر نہ ہو۔ اور اس کی صلاح اس کے فساد سے زیادہ ہو اور اس کا صواب اس کی خطا سے اکثر ہو اسی طرح نہایت یہ ہے۔

لہذا اب شہادت میں گواہ کے عادل ہونے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرتا ہو اور صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرتا ہو۔ اس کا صلاح و صواب اس کے فساد و خطا سے زائد ہو۔ الحاصل جب شہادت کا مکان اور اس کا رکن اور اس کے تمام چوبیس شرائط پائے جائیں تو وہ شہادت حجت ہوتی ہے اور اس پر حکم مرتب ہوتا ہے۔

مقدمہ ثالثہ۔ ہلال سے مہینہ کی ابتدائی تاریخوں کا چاند مراد ہوتا ہے۔ اور اکثر اہل لغت کے نزدیک ابتدائی دور اتوں کے چاند کو ہلال کہتے ہیں۔

چنانچہ تفسیر احکام القرآن میں ہے: قال الزجاج الاكثر يسمنه هلالا لابن ليلتين۔

(تفسیر احکام القرآن مصری ج ۱ ص ۲۹۹)

زجاج نے کہا کہ اکثر اہل عرب دور اتوں کے چاند کا نام ہلال رکھتے ہیں۔ رویت ہلال یعنی نیا چاند دیکھنے کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے مہینہ کی طول مدت کے لئے ابتدائے حد مقرر فرمایا۔

چنانچہ مسلم شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے۔

ان رسول الله ﷺ امده للروية فهو لليلة رايتموه (وفى رواية) ان الله قد امده لرويته فان اغمى عليكم فاكملوا العدة۔ (مسلم شریف مع نووی مطبوعہ مجتہبائی دہلی ج ۱ ص ۳۳۸)

بیشک رسول اکرم ﷺ نے رویت کو مہینہ کی مدت قرار دیا تو وہ ہلال اسی رات کا ہے جس میں تم نے اسے دیکھا (اور ایک روایت میں یہ ہے) کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے چاند دیکھنے کو مدت ماہ کی درازی کی حد ٹھہرایا تو اگر تم پر مہینہ پوشیدہ ہو جائے تو عدت یعنی تیس دن پورے کرو۔

لہذا چاند کا دیکھنا بھی احکام شرع سے ایک حکم قرار پایا۔ بلکہ یہ تو وہ اہم حکم ہے۔ جس کا حکم قرآن کریم میں ہے:

يسئلونك عن الاهلة ط قل هي مواقيت للناس والحج۔ (سورہ بقرہ ع ۲۳ ج ۲)

تم سے نئے چاند کو پوچھتے ہیں۔ تم فرما دو وہ وقت کی علامتیں ہیں لوگوں اور حج کے لئے۔

حضرت حمزہ الاسلام امام ابو بکر رازی تفسیر احکام القرآن میں آیہ کریمہ کے تحت فرماتے ہیں:

اعلق الحكم فيه بروية الاهلة ولما كانت هذه عبادة تلزم الكافة۔

(احکام القرآن مصری ج ۱ ص ۲۳۶)

اس میں حکم رویت ہلال پر معلق کیا اور جب رویت ہلال عبادت ثابت ہوئی تو یہ سب کے لئے لازم ہوئی۔

نیز اسی احکام القرآن میں ہے: والناس مامورون لطلب الهلال۔

(احکام القرآن مصری ج ۱ ص ۲۳۷)

لوگ ہلال کے طلب کرنے کے لئے مامور ہیں۔

بخاری شریف و مسلم شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے۔

قال رسول الله ﷺ لا تصوموا حتى تروا الهلال ولا تفطروا حتى تروه فان غم

(مشکوٰۃ شریف مجیدی ص ۱۷۴)

علیکم فاقدروا له۔

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا تم روزہ مت رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو۔ اور افطار مت کرو یہاں

تک کہ چاند دیکھ لو پھر اگر مہینہ تم پر پوشیدہ ہو جائے تو اس کا اندازہ کرو یعنی تیس دن شمار کر لو۔

اس آیت و تفسیر اور حدیث شریف سے رویت ہلال کا حکم شرع اور عبادت ہونا ثابت ہوا تو اس

کے اثبات کے لئے وہی چیز حجت قرار پائے گی۔ جس کو شریعت نے حجت ٹھہرایا۔ لہذا رویت ہلال کا

اثبات حجت بینہ سے ہوگا۔ اور جب اس کا اثبات بینہ سے قرار پایا تو شہادت کا رکن اور چوبیس شرائط کا

لحاظ اس رویت ہلال کے ثبوت میں ضروری ہوگا۔

اب رہی خبر و حکایت وغیرہ وہ شرعی حجت نہیں جن سے رویت ہلال کا اثبات نہیں ہو سکتا۔ ہاں جو

خبر حد استفاضہ تک پہنچ جائے تو پھر وہ خبر متواتر کے حکم میں ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ رویت ہلال کا اثبات شہادت شرعی سے ہوگا۔ یا استفاضہ سے۔ خبر و افواہ

سے نہیں ہو سکتا۔

مقدمہ رابعہ۔ رویت ہلال رمضان کے اثبات کے لئے نہ شہادت کی حاجت نہ استفاضہ کی

ضرورت نہ اس میں مجلس قضا شرط نہ حکم حاکم شرط۔ نہ اس کے لئے دو مرد یا ایک مرد و دو عورتوں کا شہادت

دینا ضروری نہ یہ کہنا ضروری کہ میں گواہی دیتا ہوں۔ بلکہ جب مطلع برابر یا غبار ہو تو ایک مسلمان عاقل

بالغ عادل ہو۔ یا مستور مرد ہو یا عورت۔ آزاد ہو یا غلام۔ اس کا یہ کہہ دینا کافی ہے۔ میں نے اپنی آنکھ

سے اس رمضان کا چاند فلاں دن دیکھا۔

علامہ علاء الدین ہسکفی در مختار میں فرماتے ہیں۔

وقبل بلاد عوی وبلا لفظ اشہد وبلا حکم ومجلس قضاء لانه خبر لا شہادۃ۔

للصوم مع علة كغيم وغبار خبر عدل او مستور لافاسق ولو كان العدل قنا او انثى او

محدود قذف تاب۔ ملخصاً۔ (رد المحتار مصری ج ۲ ص ۹۳)

اور بغیر دعویٰ کے اور بلا لفظ اشہد کے اور بلا حکم اور مجلس قضا کے بحالت ابر و غبار روزہ کے لئے ایک

عادل یا مستور کی خبر قبول کر لی جائے گی۔ اگرچہ وہ عادل غلام ہو یا عورت ہو۔ یا تہمت کی حد لگا ہوا تو بہ کر چکا

ہو۔ اس لئے کہ یہ خبر ہے نہ کہ شہادت ہے۔ ہاں وہ خبر دینے والا فاسق نہ ہو۔

بلکہ ہلال رمضان میں مطلع صاف ہونے کی صورت میں اگر بیرون شہر یا شہر کے کسی بلند مقام

سے چاند دیکھنا بیان کیا جاتا ہے۔ تو ایک عادل یا مستور ہی کا قول معتبر ہے۔ اور اگر بیرون شہر یا بلند مقام

کی رویت نہیں بتائی جاتی۔ اور لوگ چاند دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں۔ تو دو عادل یا مستور کا قول کافی

ہے۔ ورنہ ایسی جماعت عظیمہ ہونی چاہئے۔ جو اپنی آنکھ سے چاند دیکھنے کی خبر دیں اور جن کے بیان پر

غلبہ ظن حاصل ہو جائے۔ اور عقل اتنے لوگوں کا غلطی پر متفق ہونا محال جانے۔

در مختار میں ہے:

وقبل بلا علة جمع عظیم يقع العلم الشرعی وهو غلبة الظن بخبرهم وهو مفوض

الی راء الامام من غیر تقدیر بعدد علی المذهب وعن الامام انه یکتفی بشاهد واختاره فی

البحر وصحح فی الاقضية الا کتفاء بواحدان جاء من خارج البلد او کان علی مکان مرتفع

واختاره ظہیر الدین۔ (رد المحتار مصری ج ۲ ص ۹۵)

اور بلا ابر و غبار کے ایسی بڑی جماعت کی شہادت قبول کی جائے گی۔ جس کی خبر سے علم شرعی اور

ظن غالب واقع ہو۔ اور مذہب صحیح پر بغیر مقدار کسی عدد کے جماعت کا تعین امام کی رائے پر موقوف ہے۔

اور حضرت امام اعظم سے مروی ہے کہ دو گواہ کافی ہیں۔ اور بحر میں اسی کو مختار ٹھہرایا۔ اور اقصیٰ میں تصحیح کی

ایک بھی کافی ہے۔ اگر بیرون شہر سے آئے۔ یا کسی بلند مقام کو بتائے اسی کو ظہیر الدین نے مختار قرار دیا۔

بخلاف اور تمام چاندوں کے لئے کہ اگر مطلع پر ابر و غبار ہے تو ان کے لئے مجلس قضا بھی شرط ہے

اور حکم حاکم بھی۔ اور نصاب شہادت دو مرد یا ایک مرد و دو عورتوں کا ہونا بھی شرط ہے۔ اور ان کا عادل و آزاد

ہونا بھی اور یہ بھی شرط ہے کہ وہ گواہ وقت شہادت یہ کہیں میں گواہی دیتا ہوں۔ اور مطلع صاف ہے تو جب

تک اس قدر لوگ شہادت نہ دیں۔ جن کے لئے عقل محال جانے کہ اتنے لوگ جھوٹ پر جمع نہیں

ہو سکتے۔

درمختار میں ہے:

و شرط للفطر مع العلة والعدالة نصاب الشهادة ولفظ اشهد ولو كانوا ببلدة لاحاكم فيها صاموا بقول ثقة وافطروا باخبار عدلين مع العلة للضرورة وقبل بلاعلة جمع عظيم يقع العلم الشرعي وهو غلبة الظن بخبرهم وهلال الاضحى وبقية الاشهر التسعة كالفطر على المذهب المختصرا۔
(ملخصاً از رد المحتار مصری ص ۹۴، ۹۵، ۹۸)

اور ہلال فطر کے لئے بحالت ابرو غبار مع عدالت کے شہادت کا نصاب اور یہ کہنا کہ میں گواہی دیتا ہوں شرط ہے۔ اور اگر کسی ایسے شہر میں ہوں جس میں کوئی حاکم نہ ہو تو ثقہ کے قول پر روزہ رکھیں۔ اور بحالت ابرو غبار ضرورتاً دو عادل کے خبر دینے پر افطار کر لیں۔ اور بغیر ابرو غبار کے ایسی بڑی جماعت کی شہادت قبول کر لی جائے گی جن کی خبر سے علم شرعی اور ظن غالب حاصل ہو جائے اور ہلال اضحیٰ اور باقی نو ماہ کا ہلال مذہب صحیح پر مثل ہلالی فطر کے ہے۔

بالجملہ رمضان المبارک کے علاوہ عید الفطر و عید اضحیٰ وغیرہ ہر ماہ کی رویت ہلال کا اثبات شہادت کے ان تمام شرائط کے ساتھ ہوگا۔ جن کا مفصل ذکر مقدمہ ثانیہ میں مذکور ہوا۔

مقدمہ خامسہ۔ شرعاً مہینہ ۲۹ انتیس دن کا بھی ہوتا ہے۔ اور تیس ۳۰ دن کا بھی ہوتا ہے چنانچہ حدیث شریف میں ہے جس کو بخاری و مسلم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انما امة امیة لانکتب ولانحسب الشهر هكذا وهكذا یعنی مرة تسعاً وعشرين ومرة ثلثین۔
(بخاری شریف مصطفائی ج ۱ ص ۲۵۶)

ہم یعنی عرب امی گروہ ہیں کہ ہم حساب و کتاب نہیں جانتے ہیں مہینہ ایسے اور ایسے یعنی کبھی ماہ انتیس دن کا ہوتا ہے کبھی تیس دن کا ہوتا ہے۔

تو اگر انتیس کو چاند کی رویت شہادت یا استفاضہ سے ثبوت کو پہنچ جائے تو مہینہ انتیس کا ہوگا اور اگر ان میں سے کسی چیز سے ثبوت نہ ہو سکے تو مہینہ یقیناً تیس کا ہوگا۔

مسلم شریف میں حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ حضور نے فرمایا۔

فان اغمی علیکم فاقدروا له ثلثین۔ (مسلم شریف مجتبیٰ ج ۱ ص ۳۴۷)

اگر ماہ تم پر اب کی وجہ سے پوشیدہ ہو جائے تو مہینہ تیس دن شمار کر لو۔

علامہ نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں:

حاصلہ ان الاعتبار بالهلال فقد يكون تاما ثلثین وقد يكون ناقصا تسعا وعشرين وقد لا يرى الهلال فيجب اكمال العدد ثلاثین۔ (مسلم شریف مجتبیٰ مع نووی ج ۲ ص ۳۴۷)
حاصل اس کا یہ ہے کہ اعتبار ہلال پر ہے تو کبھی رویت ہلال پورے تیس دن میں ہوتی ہے اور کبھی کم میں انتیس دن میں ہو جاتی ہے اور کبھی ہلال کی رویت ہی نہیں ہوتی تو پھر تیس کے عدد کا مکمل کرنا واجب ہے۔

لہذا یہ نتیجہ حاصل ہوا کہ اگر انتیس کو رویت ہلال کسی شرعی طریق سے ثابت ہو جائے جب تو مہینہ انتیس کا قرار پائے گا ورنہ تیس دن کا پورا کرنا واجب ہے تو تیسویں دن مطلع کے صاف ہونے یا اس پر ابرو غبار ہونے کا کوئی فرق نہیں ہے۔ کہ قمری مہینہ تیس دن سے زائد کا ہو نہیں سکتا۔ ہاں اس میں ایک ایسی صورت نکل سکتی ہے کہ رمضان شریف کا چاند ایک شخص کی شہادت پر مان لیا گیا تھا۔ اب اس کے حطب سے تیس دن پورے ہو جائیں۔ اور تیسویں دن مطلع بالکل صاف ہو اور ہلال عید کسی کو نظر نہیں آتا تو اگلے دن روزہ رکھا جائے گا۔ اور اس پہلی گواہی کو غلط قرار دیا جائے گا۔ اور روزے اکتیس ہو جائیں گے۔

صاحب درمختار شرح ملتقی میں فرماتے ہیں: ولو صاموا ثلثین يوماً ولم يروه ای هلال الفطر حل الفطر ان صاموا بشهادة اثنين عدلين وان كان الصوم بشهادة واحد لا يحل (ای لهم الفطر)۔
(در الملتقی شرح ملتقی مصری ج ۱ ص ۲۳۷)

اگر لوگوں نے تیس دن روزے رکھ لئے اور عید کا چاند انہیں نہ دکھا تو فطر جب حلال ہے کہ انہوں نے دو عادلوں کی گواہی پر روزے رکھے ہوں، اور ایک کی گواہی پر روزہ شروع کیا ہو تو فطر حلال نہیں۔

اب باقی رہا انتیسویں تاریخ کو چاند دیکھنا تو شعبان و رمضان اور ذیقعدہ کی انتیسویں کو واجب ہے۔ لیکن اس سے مراد واجب کفایہ ہے۔

چنانچہ مجمع الانہر شرح ملتقی الامحرم میں فرماتے ہیں:

ويجب على الناس وجوب كفاية التماس الهلال في التاسع والعشرين من شعبان ومن رمضان وكذا ذوالقعدة لان الشهر قد يكون تسعا وعشرين وكذا يجب على الحاكم

ان یامر الناس ولا اعتبار باختلاف المطالع حتی قالوا لورای اهل المغرب هلال رمضان یجب برویتهم علی اهل المشرق اذا ثبت عندهم بطریق موجب۔

(مجمع الانهر مصری ج ۱ ص ۲۳۸)

اور لوگوں پر شعبان و رمضان اور اسی طرح ذیقعدہ کی انیسویں کو چاند دیکھنا واجب کفایہ ہے۔ اس لئے کہ مہینہ کبھی انتیس دن کا بھی ہوتا ہے اور حاکم پر بھی یہ واجب ہے کہ لوگوں کو چاند دیکھنے کا حکم دے۔ اور جب کسی جگہ رویت ثابت ہو جائے تو سب جگہ کے لوگوں کے لئے لازم ہے۔ کہ اختلاف مطالع معتبر نہیں یہاں تک کہ فقہائے کرام نے فرمایا کہ اگر اہل مغرب نے رمضان کا چاند دیکھا تو ان کی رویت پر اہل مشرق کا عمل واجب ہے جب انہیں بطریق موجب ثابت ہو جائے۔

اس عبارت سے یہ ثابت ہو گیا کہ انتیس کو چاند دیکھا جائے۔ اور جب کسی ایک جگہ رویت ثابت ہو جائے تو وہ تمام شہروں اور مواضع کے لئے کافی ہے۔ لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ انہیں رویت ہلال کا ثبوت بطریق موجب پہنچ جائے۔ ورنہ انہیں تیس دن کا پورا کرنا ضروری ہے۔ بحمد اللہ تعالیٰ مقدمات تو ختم ہو گئے۔

اب اس بات کا سمجھنا ضروری ہے کہ فقہا طریق موجب کسے کہتے ہیں اور طریق موجب کن کن صورتوں میں پایا جاتا ہے اور اخبار و حکایات سے طریق موجب کا حصول ہو جاتا ہے۔ یا نہیں۔ علامہ طحاوی حاشیہ مراقی الفلاح میں فرماتے ہیں:

قوله (لزم سائر الناس) فی سائر اقطار الدنيا اذا ثبت عندهم الروية بطریق موجب كان يتحمل اثنان الشهادة او يشهدا علی حکم القاضی او يستفیض الخبر بخلاف ما اذا اخبر ان اهل بلدة كذا رأوه لانه حكاية۔ (طحاوی مصری ۳۸۲)

تمام لوگوں کو تمام اقطار دنیا میں لازم ہے جب ان کے پاس رویت کا ثبوت بطریق موجب پہنچ جائے جیسے دو شخص شہادت کے حامل بنیں۔ یا دو شخص حکم قاضی پر گواہی دیں یا خبر مستفیض ہو بخلاف اس صورت کے جب کہ یہ خبر سنائی کہ فلاں شہر کے لوگوں نے چاند دیکھا ہے کہ یہ حکایت ہے۔

علامہ عبد الرحمن شیخ زادہ مجمع الانهر میں فرماتے ہیں:

اذا ثبت عندهم بطریق موجب کما لو شهدوا عند قاض لم ير اهل بلدة علی ان قاضی بلد کذا شهد عنده شاهدان بروية الهلال فی ليلة كذا وقضى القاضی بشهادتهما

جاز لهذا القاضی ان يقضى بشهادتهما لان قضاء القاضی حجة وقد شهدا به قال الحلواني الصحيح من مذهب اصحابنا ان الخبر اذا استفاض فی بلدة اخرى وتحقق يلزمهم حکم تلك البلدة۔ (مجمع الانهر مصری ج ۱ ص ۲۳۹)

جب ان کے پاس ثبوت رویت بطریق موجب پہنچے جیسے اس قاضی کے پاس جس کے شہر میں چاند نہ دیکھا یہ شہادت گذری کہ فلاں شہر کے قاضی کے پاس دو گواہوں نے فلاں شب میں رویت ہلال کی شہادت دی اور اس قاضی نے ان کی شہادت پر حکم نافذ کیا تو اس قاضی کو بھی ان کی شہادت پر حکم دیدینا جائز ہے اس لئے کہ قاضی کا حکم حجت ہے اور انہوں نے اس کی گواہی دی اور امام حلوانی نے فرمایا کہ ہمارے فقہا کا صحیح مذہب یہ ہے کہ خبر جب دوسرے شہر میں مستفیض ہو جائے اور ثابت ہو جائے تو اس شہر کا حکم ان پر بھی لازم ہو جاتا ہے۔

رد المحتار حاشیہ در مختار میں ہے:

قوله بطریق موجب كان يتحمل اثنان الشهادة او يشهدا علی حکم القاضی او يستفیض الخبر بخلافها اذا اخبر ان اهل بلدة كذا رأوه لانه حكاية۔

(رد المحتار مصری ج ۲ ص ۹۹)

بطریق موجب جیسے دو شخص شہادت کے حامل بنیں۔ یا قاضی کے حکم پر گواہی دیں۔ یا خبر بطور استفاضہ پہنچے۔ بخلاف اس کے جب کہ خبر سنائی کہ فلاں شہر کے لوگوں نے چاند دیکھا ہے کیونکہ یہ حکایت ہے۔

ان عبارات سے رویت ہلال کے ثبوت کے تین طریقے معلوم ہوئے جن کو فقہاء نے طریق موجب قرار دیا ہے ایک شہادت علی الرویہ۔ دوسرے شہادت علی القضاء۔ تیسرے استفاضہ۔ اب ہر ایک کا مفصل ذکر کیا جاتا ہے۔

شہادت علی الرویہ

شہادت علی الرویہ کی دو صورتیں ہیں۔

پہلی یہ ہے کہ صرف رمضان مبارک کے چاند کے لئے ایک مسلمان عاقل بالغ عادل یا مستور کا یہ کہدینا کافی ہے کہ میں نے اپنی آنکھ سے اس رمضان کا چاند فلاں دن دیکھا۔ اور عید الفطر و عید اضحیٰ اور باقی نو ماہ کے چاند کے لئے دو مسلمان عاقل بالغ عادل مردوں یا ایک مرد و عورتوں کا قاضی کی مجلس یا مفتی

شہر کی مجلس میں یہ کہہ دینا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ ہم نے اس سال کے فلاں ماہ کا چاند فلاں دن کی شام کو دیکھا۔

علامہ ابوالبرکات نسفی کنز الدقائق میں فرماتے ہیں:

وقيل بعله خبر عدل ولو قنا او انشى لرمضان وحرين او حرو حرتين للفطر و
الافجمع عظيم لها والاضحى كالفطر۔ (کنز الدقائق مجتہبی ص ۶۱)

اور ہلال رمضان کے لئے ایک عادل کی خبر اگرچہ وہ غلام یا عورت ہو اور ہلال فطر کے لئے دو آزاد مردوں یا ایک مرد و دو عورتوں کی گواہی بحالت ابرو غبار قبول کی جائے ورنہ ہر دو کے لئے بڑی جماعت درکار اور ہلال اصحی کا حکم مثل ہلال فطر کے ہے۔

علامہ حلبي ملتقى الابحر میں فرماتے ہیں:

وقبل في هلال رمضان خبر عدل ولو عبدا او انشى او محدودا في قذف تاب
ولا يشترط لفظ الشهادة وفي هلال الفطر وذی الحجة شهادة حرين او حرو حرتين بشرط
العدالة ولفظ الشهادة۔ (مجمع الانهر ج ۱ ص ۲۳۵)

اور ہلال رمضان میں ایک عادل کی خبر مقبول ہے اگرچہ وہ غلام یا عورت یا تہمت میں حد لگا ہوا ہو
اور توبہ کر چکا ہو اور اس میں لفظ شہادت بھی شرط نہیں۔ اور ہلال فطر و ذی الحجہ میں دو آزاد مردوں یا ایک مرد
و دو عورتوں کی شہادت بشرط عدالت اور لفظ شہادت کے مقبول ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ان دو شخصوں نے خود تو چاند نہیں دیکھا ہے لیکن ان کے سامنے چاند کے
دیکھنے والے دو شخصوں نے گواہی دی اور انہیں اپنی گواہی پر گواہ کیا۔ لہذا یہ دونوں گواہان فرع اگر اس
طرح گواہی دیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں بن فلاں نے ماہ
فلاں اور سال فلاں اور دن فلاں کی شام کو انتیس کا چاند دیکھا اور ہر ایک نے ہمیں اپنی اپنی گواہی پر گواہ
کیا۔ تو حقیقتہً ان گواہان فرع نے گواہان اصل کی گواہی کی گواہی دی۔ نہ کہ خود رویت ہلال کی گواہی دی
لیکن اس سے بھی ثبوت ہلال بطریق موجب ثابت ہوتا ہے۔

تنویر الابصار و در مختار میں ہے:

الشهادة على الشهادة هي مقبولة وان كثرت استحسانا في كل حق على الصحيح
الا في حد وقود بشرط تعذر حضور الاصل بموت او مرض او سفر واكتفى الثاني

واستحسنه غير واحد وفي القهستانی والسراجية وعليه الفتوى واقره المصنف او كون
المرأة مخدرة لا تخالط الرجال وان خرجت لحاجة و حمام عند الشهادة عند القاضي قيد
للکل وبشرط شهادة عدد نصاب ولو رجلا وامرأتين عن کل اصل ولو امرأة لا تغاير فرعى
هذا وذلك وكيفيتها ان يقول الاصل مخاطبا للفرع ولو ابنه اشهد على شهادتي اني اشهد
بكذا ويقول الفرع اشهدان فلانا اشهدني على شهادته بكذا وقال لي اشهد على شهادتي
بذلك مختصرا۔ (رد المحتار مصری ج ۴ ص ۴۰۹)

صحیح مذہب میں استحسانا ہر حق میں شہادت علی الشہادة اگرچہ طبقات فروع میں بکثرت ہو جائے
مقبول ہے۔ لیکن حدود قضا میں مقبول نہیں۔ اور شرط یہ ہے کہ گواہان اصل کا موت یا بیماری یا سفر کی وجہ
سے حاضر ہو جانا معتذر ہو جائے۔ اور امام ابو یوسف نے ان کی غیر حاضری کے لئے اتنی بات کافی قرار
دی کہ انہیں اپنے اہل میں رات کو پہنچنا معتذر ہو۔ اسی قول کو فقہاء نے اچھا جانا اور قہستانی اور سراجیہ میں
ہے کہ اسی قول پر فتویٰ ہے اور مصنف نے بھی اسی کو قرار دکھایا اصل کے حضور کو تعذریوں ہے کہ ایسی پردہ
نشین عورت ہے۔ جو مردوں سے مخالطت نہیں کرتی ہو اگرچہ حاجت و حمام کے لئے نکلتی ہو یہ تعذر قاضی
کے سامنے بوقت ادائے شہادت ہو یہ قید سب اعذار کے لئے ہے۔ بشرط نصاب شہادت کے اگرچہ ایک
مرد اور دو عورتیں ہوں۔ ہر اصل کی شہادت سے اگر وہ عورت ہو نہ غیر ہونا اس اصل و فرع کا اور اس کی
فروع کا اور شہادت علی الشہادة کا طریقہ یہ ہے کہ اصل فرع سے مخاطب ہو کر کہے اگرچہ وہ اس کا بیٹا ہو کہ
تو میری اس شہادت پر شاہد ہو کہ میں ایسی شہادت دیتا ہوں۔ اور فرع کہے کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ
فلان شخص نے مجھ کو اپنی اس شہادت پر شاہد بنایا اور اس نے مجھ سے کہا کہ تو میری اس شہادت پر شاہد
ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

وينبغي ان يذكر الفرع اسم الشاهد الاصل واسم ابیه وجده حتى لو ترك ذلك
فالقاضي لا يقبل شهادتهما كذا في الذخيرة۔ (عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۲۳۴)

اور لائق ہے کہ فرع اصل گواہ کا نام اور اس کے باپ دادا کا نام ذکر کرے یہاں تک کہ اگر اس
نے یہ ذکر نہ کیا تو قاضی ان ہر دو شاہدوں کی شہادت قبول نہ کرے۔

شہادت علی القضا

شہادت علی القضا کی بھی دو صورتیں ہیں۔

پہلی صورت یہ ہے کہ کسی اسلامی شہر میں قاضی شرع کے سامنے رویت ہلال کی گواہیاں گذریں اور قاضی نے رویت ہلال کا حکم دیا اور دارالقضا میں قاضی کے حکم کے وقت دو عادل موجود تھے۔ انہوں نے دوسرے شہر میں قاضی کے سامنے اگر قاضی نہ ہو تو مفتی شہر کے سامنے حاضر ہو کر کہا کہ ہم گواہی دیتے ہیں ہمارے سامنے فلاں شہر کے فلاں حاکم کے سامنے فلاں دن کی شام کو فلاں چاند کے دیکھنے کی شہادتیں دیں۔ اور اس حاکم نے ان گواہیوں کی بنا پر ثبوت ہلال کا حکم دیا۔ تو اس شہر کے قاضی یا مفتی ان شہادتوں کی بنا پر اپنے اس شہر میں بھی ثبوت ہلال کا حکم کر سکتا ہے۔

مجمع الانہر میں ہے:

قالوا لو رأى اهل المغرب هلال رمضان يجب برويتهم على اهل المشرق اذا ثبت عندهم بطريق موجب كمالو شهدوا عند قاض لم يراهم بلده على ان قاضى بلد كذا شهد عنده شاهدان بروية الهلال فى ليلة كذا وقضى القاضى بشهادتهما جاز لهذا القاضى ان يقضى بشهادتهما لان قضاء القاضى حجة وقد شهدا به۔

(مجمع الانہر مصری ج ۱ ص ۲۳۹)

فقہانے فرمایا اگر اہل مغرب نے رمضان کا چاند دیکھا تو ان کی رویت پر اہل مشرق کو عمل واجب ہے جب کہ انہیں بطریق موجب ثابت ہو جائے جس طرح اس قاضی کے پاس جس کے شہر میں چاند نہیں دیکھا یہ شہادت گذری کہ فلاں شہر کے قاضی کے پاس دو گواہوں نے فلاں شب میں رویت ہلال کی شہادت دی اور اس قاضی نے ان کی شہادت پر حکم نافذ کیا تو اس قاضی کو بھی ان کی شہادت پر حکم دیدینا جائز ہے اس لئے کہ قاضی کا حکم حجت ہے اور انہوں نے اسکی گواہی دی۔

لہذا یہ شہادت حقیقہ شہادت علی القضا ہوئی اس سے بھی ثبوت ہلال بطریق موجب ثابت ہوتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی اسلامی شہر کے قاضی شرع کے سامنے رویت ہلال کی شہادتیں گذریں اور اس نے ثبوت ہلال کا حکم دیا پھر اس قاضی نے اپنا نام و پتہ لکھ کر دوسرے شہر کے قاضی کے نام و پتہ کو لکھا اور یہ خط تحریر کیا کہ میرے سامنے فلاں بن فلاں اور فلاں بن فلاں نے فلاں دن فلاں شام

کو فلاں ماہ کے چاند دیکھنے کی شہادتیں گذریں جن کی بنا پر میں نے ثبوت ہلال کا حکم دیا۔ اور یہ خط دو عادلوں کو سنا کر خط کو لفافہ میں بند کرے اور ان کے سامنے ہی سر بمہر کر دے اور انہیں اس خط پر گواہ بنا کر ان سے کہے کہ میرا یہ خط فلاں شہر کے قاضی کے نام ہے وہ ہر دو عادل اس سر بمہر خط کو باحتیاط اس قاضی کے پاس لائیں اور اسے مجلس قضا میں سر بمہر ہی دیں اور یہ شہادت ادا کریں کہ آپ کے نام فلاں قاضی کا خط ہے اس نے ہمیں اس خط کو سنایا اور اس پر ہمیں گواہ کیا۔ اور ہمارے سامنے اس کو لفافہ میں بند کیا اور سر بمہر کیا یہ خط اسی کا ہے اور اس کا یہ مضمون ہے ہم اس کی گواہی دیتے ہیں۔ درمختار میں ہے:

القاضى يكتب الى القاضى بحكمه وان لم يحكم كتب الشهادة ليحكم المكتوب اليه بها على رايه وقرأ الكتاب عليهم بمافيه وختم عندهم وسلم اليهم بعد كتابة عنوانه وهو ان يكتب فيه اسمه واسم المكتوب اليه وشهرتهما واكتفى الثانى بان يشهدهم انه كتابة وعليه الفتوى مختصرا۔ (رد المحتار مصری ج ۲ ص ۳۶۶)

قاضی دوسرے قاضی کی طرف اپنا حکم لکھے اور اگر حکم نہیں دیا تھا تو شہادت لکھے تاکہ مکتوب الیہ قاضی اس گواہی پر اپنی رائے سے حکم کرے۔ اور کاتب قاضی ان گواہوں کے سامنے وہ مکتوب پڑھے یا انہیں اس کے مضمون سے مطلع کرے اور اپنی مہر لگائے اور اس پر سرنامہ یعنی اپنا نام اور مکتوم الیہ کا نام اور مشہور خطابات لکھنے کے بعد گواہوں کو سپرد کرے۔ اور امام ابو یوسف نے اس قدر کافی قرار دیا کہ وہ قاضی گواہوں کو اس پر شاہد بنائے کہ وہ اسی کا مکتوب ہے اور اس پر فتویٰ ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

يحب ان يعلم ان كتاب القاضى الى القاضى صار حجة شرعا فى المعاملات لكن انما يقبله القاضى المكتوب اليه عند وجود شرائطه ومن جملة الشرائط البينة۔

(فتاویٰ عالمگیری مجیدی کا پیور ج ۳ ص ۱۷۲)

یہ جاننا واجب ہے کہ قاضی کا مکتوب دوسرے قاضی کی طرف معاملات میں شرعا حجت ہے لیکن مکتوب الیہ قاضی اس کو جب قبول کرے جب کہ اس کے تمام شرائط پائے جائیں اور اس کے مجملہ شرائط کے بینہ ہے۔

لہذا یہ شہادت حقیقہ شہادت برخط قاضی ہے تو اس سے بھی ثبوت ہلال بطریق موجب ثابت

استفاضہ

استفاضہ کی بھی دو صورتیں ہیں۔

ایک صورت یہ ہے کہ کسی شہر سے جماعت کثیرہ آئے اور وہ لوگ سب باتفاق بیان کریں کہ فلاں شہر میں ہمارے سامنے عام طور پر لوگ بیان کرتے تھے کہ ہم نے اپنی آنکھ سے چاند دیکھا ہے۔ مجمع الانہر شرح ملتقى الابحر میں ہے:

قال الحلواني الصحيح من مذهب اصحابنا ان الخبر اذا استفاض في بلدة اخرى وتحقق يلزمهم حكم تلك البلدة۔ (مجمع الانہر مصری ج ۱ ص ۲۳۹)

حلوانی نے فرمایا ہمارے اصحاب کا صحیح مذہب یہ ہے کہ خبر جب دوسرے شہر میں حد استفاضہ تک پہنچ جائے اور تحقق ہو جائے تو ان اہل شہر پر بھی اس شہر کا حکم لازم ہے۔

درمختار میں ہے: نعم لو استفاض الخبر في البلدة الاخرى لزمهم على الصحيح من المذهب مجتبیٰ وغیرہ۔ (ردالمحتار مصری ج ۲ ص ۹۷)

ہاں اگر دوسرے شہر میں خبر مستفیض ہو جائے تو بنا بر صحیح مذہب کے ان اہل شہر پر بھی حکم لازم ہے۔ یہی مجتبیٰ وغیرہ میں ہے۔

یہی استفاضہ ہے کہ اس میں نہ خود اپنی رویت کی شہادت ہے۔ نہ شہادۃ علی الشہادۃ ہے۔ نہ شہادت علی قضاء القاضی ہے۔ نہ شہادت علی کتاب القاضی ہے۔ بلکہ اس میں جماعتوں کا تواتر جماعت کے تواتر سے رویت ہلال کا ناقل ہے تو رویت فی نفسہا حجت شرعیہ ہے۔ اور تواتر قائم مقام شہادت کے۔ بلکہ یہ شہادت سے قوی تر ہے تو رویت ہلال اس سے بہ یقین ثابت ہوگئی۔ لہذا خبر استفاضہ سے بھی رویت ہلال بطریق موجب ثابت ہو سکتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جس اسلامی شہر میں قاضی شرع ہو اور وہ خود عالم ہو یا کسی معتمد عالم دین کے فتویٰ کا ملازم ہو یا جہاں ایسا قاضی نہ ہو تو ایسا محقق مفتی دین ہو جس کے فتوے ہی پر احکام روزہ وعیدین نافذ ہوتے ہوں تو اس شہر سے متعدد جماعتیں آئیں اور وہ باتفاق ایک زبان یہ کہیں کہ فلاں شہر میں فلاں دن فلاں ماہ کی رویت ہوئی اور اسی کی بنا پر فلاں دن پہلا روزہ ہو یا فلاں دن عید کی گئی۔

ردالمحتار میں ہے:

فی الذخيرة قال الشمس الاثمة الحلواني الصحيح من مذهب اصحابنا ان الخبر اذا استفاض وتحقق فيما بين اهل البلدة الاخرى يلزمهم حكم هذه البلدة اه ومثله في الشرنبلالية عن المغنى قلت ووجه الاستدراك ان هذه الاستفاضة ليس فيها شهادة على قضاء قاض ولا على شهادة لكن لما كانت بمنزلة الخبر المتواتر وقد ثبت بها ان اهل تلك البلدة صاموا يوم كذا لزم العمل بها لان البلدة لا تخلو عن حاكم شرعي عادة فلا بد من ان يكون صومهم مبنيا على حكم حاكمهم الشرعي فكانت تلك الاستفاضة بمعنى نقل الحكم المذكور وهي اقوى من الشهادة (وفيه ايضا) قال الرحمتي معنى الاستفاضة ان تاتي من تلك البلدة جماعات متعددون كل منهم يخبر عن اهل تلك البلدة انهم صاموا عن روية۔ (ردالمحتار مصری ج ۲ ص ۹۷)

ذخیرہ میں ہے کہ شمس الاثمة حلوانی نے فرمایا کہ ہمارے اصحاب کا صحیح مذہب یہ ہے کہ خبر جب مستفیض ہو جائے اور تحقق ہو جائے کسی دوسرے اہل شہر میں تو ان پر اس شہر کا حکم لازم ہے اور یہی حکم شرنبلالی میں مغنی سے منقول ہے۔ میں نے کہا کہ استدراک کی وجہ یہ ہے کہ اس استفاضہ میں نہ تو قضا کے قاضی پر ثبوت ہے نہ شہادت علی الشہادت ہے۔ لیکن جب استفاضہ بمنزلہ خبر متواتر کے ہے تو اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ اس شہر کے لوگوں نے فلاں دن روزہ رکھا تو اس سے اس لئے عمل لازم ہوا کہ شہر حاکم شرع کے حکم پر مبنی ہوگا تو یہ استفاضہ حکم مذکور کے نقل کی مانند ہو گیا اور وہ شہادت سے زیادہ قوی ہے۔

رحمتی نے استفاضہ کے معنی یہ بیان کئے کہ اس شہر سے چند جماعتیں آئیں اور ان میں سے ہر ایک اس شہر والوں کی یہ خبر دے کہ ان لوگوں نے چاند دیکھ کر روزے رکھے۔

اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ خبر استفاضہ خبر متواتر کے حکم میں ہے جو یقین کا افادہ کرتی ہے کہ اس سے قضائے قاضی کا ثبوت تواتر ثابت ہوتا ہے جو حجت شرعیہ ہے۔ لہذا استفاضہ سے بھی ثبوت ہلال بطریق موجب ثابت ہوتا ہے۔

بالجملہ طریق موجب کی یہ چھ صورتیں ہیں جن سے انتیس (۲۹) کا چاند دوسرے شہر کی رویت سے ثابت کیا جاسکتا ہے ان کے علاوہ جو طریقے عوام میں رائج ہیں یا سوالات جن پر مشتمل ہے ان کا تفصیلی بیان یہ ہے۔

شہادت فاسق

فاسق وہ شخص ہے جو کبیرہ گناہ کرتا ہو یا صغیرہ گناہ پر اصرار کرتا ہو۔

علامہ ابن عابدین ردالمحتار میں بحر سے ناقل ہیں:

الفاسق من فعل كبيرة او اصر على صغيرة۔ (ردالمحتار مصری ج ۴ ص ۳۹۹)

فاسق وہ ہے جو کبیرہ گناہ کرے یا صغیرہ گناہ پر اصرار کرے۔

تو اگر وہ فاسق کہیں سے آکر انتیس کے رویت ہلال کی شہادت دیں کہ فلاں شہر میں فلاں وفلاں شخصوں نے چاند دیکھا اور انہوں نے ہمیں شاہد بنایا۔ یا ہمارے سامنے دارالقضا میں شہادتیں گزریں اور قاضی شہر نے اس پر حکم دیا۔ یا خود یہ شہادتیں دیں کہ ہم نے فلاں دن انتیس کا چاند دیکھا ہے تو ان کی یہ سب شہادتیں غیر معتبر ہیں۔

ہدایہ میں ہے: وتشتترط العدالة لان قول الفاسق في الديانات غير مقبول۔

(ہدایہ اولین مطبوعہ یوسفی لکھنؤ ص ۱۹۷)

شہادت کے لئے عدالت شرط ہے کیونکہ فاسق کا قول دیانات میں مقبول نہیں۔

علامہ طحاوی حاشیہ مراقی الفلاح میں فرماتے ہیں:

وفي الدراية لا يقبل خبر الفاسق اتفاقا وفي البحر قول الفاسق في الديانات التي يمكن تلقيها من العدول غير مقبول كالهلال ورواية الاخبار ولو تعدد كفاسقين فاكثر۔

(طحاوی مصری ۳۸۰)

درایہ میں ہے کہ فاسق کی خبر بالاتفاق مقبول نہیں۔ اور بحر الرائق میں ہے کہ فاسق کا قول ان دیانتوں میں جو عادلوں سے بھی معلوم ہو سکیں مقبول نہیں جیسے رویت ہلال اور روایت اخبار اگرچہ متعدد ہو جائیں جیسے دو فاسق ہوں بلکہ زیادہ۔

لہذا جب فاسق کی شہادت غیر مقبول ہے تو یہ طریق موجب میں داخل نہیں تو اس کی شہادت سے رویت ہلال ثابت نہیں ہو سکتا۔

شہادت مستور

مستور وہ شخص ہے جو مجہول الحال ہو کہ اس کی عدالت و فسق کا اظہار نہ ہوتا ہو۔

مراقی الفلاح میں ہے: هو مجهول الحال لم يظهر له فسق ولا عدالة۔

(طحاوی ص ۳۸۰)

مستور وہ مجہول الحال ہے جس کی عدالت و فسق ظاہر نہ ہو۔

تو مستور کی شہادت صرف رمضان مبارک کے چاند میں جب مطلع پر ابر و غبار ہو شرعاً معتبر ہے۔

درمختار میں ہے: قيل للصوم مع علة كغيم وغبار خبر عدل او مستور على ماصححه

البزازی علی خلاف ظاهر الرواية لا فاسق اتفاقا۔ (ردالمحتار مصری ج ۲ ص ۹۳)

ابر و غبار کے ساتھ روزہ کے لئے ایک عادل یا مستور کی خبر قبول کر لی جائے گی۔ بزازی نے ظاہر الروایت کے خلاف اس کی تصحیح کی فاسق کی خبر بالاتفاق مقبول نہیں۔

اور رمضان مبارک کے سوا اور باقی چاندوں میں مستور کی شہادت نامقبول و غیر معتبر ہے۔

درمختار و ردالمختار میں ہے: قوله وهلال الاضحى وبقية الاشهر التسعة كالفطر

فلا يقبل فيها الا شهادة رجلين او رجل وامرأتين عدول احرار غير محدودين كما في سائر

الاحكام۔ (ردالمحتار ج ۲ ص ۹۸)

اضحیٰ اور بقیہ نو ماہ کا ہلال ہلال فطر کی طرح ہے کہ ان میں دو مرد یا ایک مرد و دو عورتوں عادلوں آزاد

غیر محدودوں کی شہادت ہی مقبول ہوگی۔ جیسا کہ تمام احکام میں ہے۔

صاحب درمختار شرح ملتقی میں فرماتے ہیں: وقبل في هلال الفطر وذی الحجة وبقية

الاشهر التسعة شهادة حرين وحر وحرتين بشرط العدالة ولفظ الشهادة۔

(درالملتقی مصری ج ۱ ص ۲۳۶)

عید الفطر اور ذی الحجہ اور بقیہ نو ماہ کے چاند میں دو آزاد مردوں یا ایک آزاد مرد و دو عورتوں کی

شہادت بشرط عدالت اور لفظ شہادت کے قبول کی جائے گی۔

ان عبارات سے رمضان کے عید الفطر و عید اضحیٰ وغیرہ تمام چاندوں کے لئے شاہدین کا عادل

ہونا شرط ثابت ہوا تو ان میں مستور کی شہادت غیر معتبر قرار پائی اور طریق موجب نہیں شہری لہذا اس کی

شہادت سے عیدین وغیرہ کی رویت ہلال ثابت نہیں ہو سکتی۔

شہادت کافر و مرتد

مرتد وہ شخص ہے جو دین اسلام سے پھر جائے اور ایمان لانے کے بعد کوئی کلمہ کفر زبان پر جاری

کرے۔ درمختار میں ہے:

المرتد لغة الراجع مطلقا و شرعا الراجع عن دين الاسلام و ركنها اجراء كلمة الكفر على اللسان بعد الايمان۔
(رد المحتار ج ۳ ص ۲۹۱)

لغت میں مرتد کے معنی مطلق رجوع کرنے والے کے ہیں اور شرع میں دین اسلام سے رجوع کرنے والے کے ہیں اور اس کا رکن ایمان کے بعد زبان پر کفری کلمہ جاری کرنا ہے۔

اور کافر و مرتد کی شہادت نامقبول و غیر معتبر ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

لا تقبل شهادة الكافر على المسلم و اما شهادة المرتد و المرتدة فقد اختلف المشائخ فيها فقال بعضهم تقبل على الكفار وقال بعضهم تقبل على مرتد مثله و الاصح انها لا تقبل على كل حال هكذا في المحيط مختصراً۔

(عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۲۳۱)

مسلمان پر کافر کی شہادت مقبول نہیں۔ لیکن مرتد مرد یا عورت کی شہادت اس میں مشائخ نے اختلاف کیا۔ بعض نے کہا کہ کافر کی گواہی کفار پر مقبول ہے۔ اور بعض نے فرمایا اپنے جیسے مرتد پر مقبول ہے اور صحیح مذہب یہ ہے کہ وہ کسی حال میں مقبول نہیں اسی طرح محیط میں ہے۔

اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ کافر و مرتد کی شہادت غیر مقبول ہے۔ تو اب مدعیان اسلام میں جو فرقے حد کفر تک پہنچ گئے اور علماء حرمین شریفین و شام و ہند نے جن کے ارتداد پر فتوے دیدیئے ان کی شہادت بھی کسی طرح مقبول نہیں ہو سکتی جیسے غالی، رافضی، قادیانی، چکڑالوی وغیرہ۔

چنانچہ صاحب درمختار ملتقی میں فرماتے ہیں۔

كل من كفر منهم (ای من اهل الاهواء) كالمجسمة و الخوارج و غلاة الروافض و القائلين بخلق القرآن و لا تقبل شهادتهم۔ درالمنتهی مصری ج ۲ ص ۲۰۰

اہل اہواء سے جو کافر ہو گیا جیسے فرقہ مجسمہ اور خارجی اور غالی رافضی۔ اور خلق قرآن کے قائل، ان کی شہادت مقبول نہیں۔

لہذا کافر و مرتد کی شہادت جب طریق موجب سے نہیں تو ان کی شہادت سے بھی رویت ہلال

ثابت نہیں ہو سکتا۔

شہادت نساء

فقط ایک عورت عادلہ کی شہادت رمضان مبارک کے چاند میں ابرو غبار کی حالت میں معتبر ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

ان كان بالسما علة فشهادة الواحد على هلال رمضان مقبولة اذا كان عدلا مسلما عاقلا بالغاً حراً كان او عبداً ذكر ا كان او انثى۔

(عالمگیری مجیدی ج ۱ ص ۱۰۱)

اگر آسمان پر ابرو غبار ہو تو رمضان کے چاند میں ایک کی شہادت مقبول ہے جب وہ مسلمان عاقل بالغ عادل ہو آزاد ہو غلام مرد ہو یا عورت۔

لیکن ہلال رمضان کے علاوہ اور چاندوں میں بلا مرد کے صرف عورتوں کی شہادت نامقبول و غیر معتبر ہے۔ ہدایہ میں ہے: ولا تقبل شهادة الاربع منهن و حدھن۔ (ہدایہ ج ۳ ص ۱۳۹)

صرف چار عورتوں کی گواہی مقبول نہیں۔

درمختار میں ہے: ولا تقبل شهادة اربع بلا رجل۔ (رد المحتار ج ۳ ص ۳۸۷)

بغیر مرد کے چار عورتوں کی شہادت مقبول نہیں۔

لہذا صرف ایک عورت کی شہادت سے ہلال رمضان تو ثابت ہو سکتا ہے اور عیدین کا اور باقی مہینوں کا چند صرف عورتوں کی شہادت سے ثابت نہیں ہو سکتا بلکہ اگر دو عورتیں ہوں تو ان کے ساتھ ایک مرد کا ہونا ضروری ہے۔

شہادت علی الشہادت

شاہدین فرع کو اگر شاہدین اصل نے اپنی گواہی پر گواہ نہیں بنایا ہے تو شاہدین فرع کی شہادت بھی غیر معتبر ہے۔ اگر چہ انہوں نے ان کی شہادت کو اپنے کان ہی سے سنا ہو۔

درمختار میں ہے: (قوله و كفيتهما ان يقول الاصل مخاطبه للفرع ولو ابنه بحر اشهد على شهادتي اني اشهد بكذا) قيد بقوله اشهد لانه بدونه لا يسعه ان يشهد على شهادته وان سمعها منه لانه كالنائب عنه فلا بد من التحميل والتوكيل۔

شہادت علی الشہادۃ کا طریقہ یہ ہے کہ گواہان اصل گواہان فرع کو مخاطب بنا کر یہ کہیں اگرچہ وہ اس کا بیٹا ہو کہ تو میری شہادت پر شاہد بن کہ میں ایسی شہادت دیتا ہوں۔ تو شاہدین کی قید اس لئے ہے کہ بغیر اس کے شاہد فرع شاہد اصل کی شہادت پر شہادت نہیں دے سکتا اگرچہ اس نے اس شہادت کو اس سے سنا ہو کیونکہ یہ اس کے نائب کی طرح ہے تو تکمیل و توکیل ضروری ہے۔

بلکہ شاہدین فرع کو ادا شہادت کے وقت شاہدین اصل کی شہادت کے ذکر کے ساتھ تکمیل کا ذکر ضروری ہے۔ عالمگیری میں ہے:

يقول شاهد الفرع عند الاداء اشهد ان فلانا قال لي اشهد على شهادتي بذلك لانه لابد من شهادته وذكره شهادة الاصل وذكره التحميل۔ (عالمگیری ج ۳ ص ۲۳۲)

شاہد فرع ادا شہادت کے وقت کہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ مجھ سے فلاں نے کہا کہ میری شہادت پر تو گواہ ہو اس لئے کہ اس کی شہادت اور اس کا شہادت کا ذکر کرنا اور تکمیل کا ذکر ضروری ہے۔

لہذا قاضی یا مفتی کے سامنے شاہدین فرع نے شاہدین اصل کی رویت ہلال کی شہادت کا صرف سننا بیان کیا اور یہ ذکر نہیں کیا کہ شاہدین اصل نے ہمیں اپنی شہادت پر گواہ بنایا اور ہم سے یہ کہا کہ تم میری گواہی پر گواہ ہو جاؤ تو ان شاہدین فرع کی نہ یہ شہادت معتبر نہ یہ طریق موجب میں داخل۔ لہذا ایسی شہادت علی الشہادت سے رویت ہلال ثابت نہیں ہو سکتی۔

شہادت علی القضا

کسی شہر سے دو شخصوں نے آکر قاضی یا مفتی کے سامنے یہ کہا کہ فلاں شہر میں قاضی کے روبرو رویت ہلال کی گواہیاں گذریں اور اس قاضی نے ان کی شہادت پر رویت ہلال کا حکم دیا لیکن ہم اس وقت مجلس قضا میں موجود نہ تھے تو ان کی یہ شہادت بھی غیر معتبر اور نامقبول ہے۔

درمختار میں ہے: نعم الشهادة بقضاء القاضي صحيحة وان لم يشهدهما القاضي عليه وقيدہ ابو يوسف بمجلس القضاء وهو الاحوط ذكره في الخلاصة۔

(ردالمحتار مصری ج ۳ ص ۳۹۰)

ہاں حکم قاضی کی شہادت صحیح ہے اگرچہ قاضی نے ان گواہان کو اس پر شاہد نہ بنایا ہو حضرت امام ابو یوسف نے ان گواہوں کے مجلس قضا میں موجود ہونے کی قید لگائی۔ یہی مفتی بہ قول ہے۔ اس کو خلاصہ میں

لہذا اگر ان شاہدوں نے رویت ہلال کی اس شہر کے قاضی یا مفتی کے سامنے ایسی شہادت علی القضا گذاری اور خود اپنا مجلس قضا میں نہ ہونا بھی بیان کیا تو ان شاہدوں کی یہ شہادت غیر معتبر ہے نہ یہ طریق موجب نہ ایسی شہادت علی القضا سے رویت ہلال ثابت ہو سکتی ہے۔

شہادت علی کتاب القاضی

اگر یہاں کے قاضی کی مجلس میں ایک اسلامی شہر کے قاضی کا خط لیکر دو شاہد آئے اور انہوں نے یہ کہا کہ ہمیں یہ خط فلاں شہر کے فلاں بن فلاں قاضی نے ہمارے مکان پر سپرد کیا۔ یا اپنی مجلس قضا میں نہیں سونپا۔ یا اس پر ہمارے سامنے مہر نہیں لگائی۔ یا اس کو ہمیں پڑھ کر نہیں سنایا۔ یا اس قاضی نے بلا شہود کے یہ خط ڈاک وغیرہ کے ذریعہ روانہ کیا۔ یا ان شاہدوں کا عادل ہونا اس قاضی کو ظاہر نہ ہو سکا۔ تو نہ وہ خط قاضی معتبر نہ ان شاہدوں کی شہادت مقبول۔

ردالمختار میں ہے: لاشهادة بلا علم المشهود به (فيه ايضا) في الذخيرة وانما قال عندهم لانه لابد ان يشهدوا عنده ان الختم بحضرته (فيه ايضا) قوله سلم الكتاب اليهم اي في مجلس يصح حكمه فيه فلو سلم في غير ذلك المجلس لم يصح (فيه ايضا) ان شهدوا انه كتاب فلان القاضي سلمه اليها في مجلس حكمه وقرأه علينا وختمه ففتحه القاضي وقرأه اذا ثبتت عدالتهم بان كان يعرفهم بها او وجد في الكتاب عدالتهم او سأل من يعرفهم من الثقات فزكوا واما قبل ظهور عدالتهم فلا يحكم به۔

(ردالمحتار ج ۳ ص ۳۶۶)

بغیر مشہود بہ کے جانے ہوئے شہادت کا دینا صحیح نہیں۔ ذخیرہ میں ہے کہ یہ بات ضروری ہے کہ وہ گواہان قاضی کے سامنے یہ گواہی دیں کہ مہران کی موجودگی میں لگائی گئی۔ اور قاضی ان گواہوں کو وہ خط ایسی مجلس میں سونپے جس میں حکم دینا صحیح ہو تو اگر اس نے غیر مجلس قضا میں سونپا تو صحیح نہیں۔ اور اگر گواہان نے شہادت دی کہ یہ خط فلاں قاضی کا ہے۔ اس نے ہمیں اپنی مجلس قضا میں اس کو سونپا۔ اور اس کو ہمیں پڑھ کر سنایا اور اس پر مہر لگائی تو یہ قاضی اس کو کھولے اور پڑھے جب ان گواہان کی عدالت ثابت ہو جائے بایں طور کہ یا تو ان کی عدالت کو خود جانتا ہو یا خط میں ان کی عدالت موجود ہو۔ یا جاننے والے ثقہ سے ان کو دریافت کرے تو وہ ان کا تزکیہ بیان کرے لیکن ان کی عدالت کے ظاہر ہونے سے پہلے پس اس خط پر

حکم نہ دے۔

ہدایہ اخیرین میں ہے: ولا یقبل الكتاب الا بشهادة رجلین او رجل وامرأتین لان الكتاب يشبه الكتاب فلا یثبت الا بحجة تامة وهذا لانه ملزم فلا بد من الحجة۔

(ہدایہ اخیرین مطبوعہ رشیدیہ ج ۳ ص ۱۲۲)

خط دومرد یا ایک مرد و عورتوں ہی کی شہادت پر قبول کیا جائے گا کیونکہ خط خط کے مشابہ ہوتا ہے۔ تو بغیر پہلے نام کے ثابت نہیں ہو سکتا۔ اور یہ اس لئے کہ وہ خط لازم کرنے والا ہے تو حجت ضروری ہے۔

لہذا قاضی کے ایسے خط اور شاہدوں کی شہادت سے بھی رویت ہلال ثابت نہیں ہو سکتی کہ یہ طریق موجب نہیں۔

حکایت

کسی شہر سے چند لوگ آئے اور انہوں نے یہ کہا کہ فلاں شہر میں تو انتیس (۲۹) کاچاند فلاں ماہ کا فلاں دن دو شخصوں نے دیکھا ہے اور ہم نے یہ بھی سنا ہے۔ کہ قاضی شہر یا مفتی شہر نے لوگوں کو روزہ رکھنے کا حکم بھی دیا ہے۔ انہوں نے نہ خود چاند دیکھا نہ دیکھنے والوں نے ان کے سامنے گواہی دی۔ تو ان کی یہ خبر صرف حکایت ہوئی جو طریق موجب نہیں تو ایسی حکایت سے رویت ہلال ثابت نہیں ہوتی۔

ردالمحتار میں ہے: لو شهدوا برویة غیرہم وان قاضی تلك المصر امر الناس بصوم رمضان لانه حکایة لفعل القاضی ایضا ولیس حجة۔ (ردالمحتار مصری ج ۲ ص ۹۷)

اگر گواہان نے دوسرے لوگوں کی رویت کی گواہی دی۔ اور اس شہر کے قاضی نے لوگوں کو رمضان کے روزے کا حکم دیا تو یہ حجت نہیں اس لئے کہ یہ فعل قاضی کی حکایت ہے۔

مجمع الانہر میں ہے: لو شهد ان اهل بلدة كذا رأوا الهلال قبلکم بیوم وهذا یوم الثلثین فلم ير الهلال فی تلك الليلة والسماء مصحیة فلا یباح الفطر غدا ولا یترك التراویح لان هذه الجماعة لم يشهدوا بالرویة ولا علی شهادة غیرہم وانما حکم روية غیرہم۔

(مجمع الانہر مصری ج ۱ ص ۲۳۹ عالمگیری مجیدی ج ۱ ص ۱۰۲)

اگر گواہان نے شہادت دی کہ فلاں شہر والوں نے تم سے ایک دن پہلے چاند دیکھا اور وہ دو شنبہ کا دن ہے اور اس رات میں چاند نہیں دیکھا گیا کہ آسمان ابر و غبار آلود ہے تو کل کو روزہ نہ رکھنا مباح نہیں

اور تراویح ترک نہ کریں اس لئے کہ ان گواہوں نے نہ خود اپنی رویت کی شہادت دی نہ اپنے غیر کی شہادت کی بلکہ انہوں نے دوسروں کی حکایت کی۔

افواہ

شہر میں یہ خبر اڑی کہ انتیس کاچاند ہو گیا لیکن جس سے دریافت کیا جاتا ہے تو وہ یہی کہتا ہے کہ میں نے سنا ہے لوگوں میں ذکر ہو رہا ہے اور دیکھنے والے کا پتہ نہیں چلتا نہ وہاں کوئی ایسا قاضی یا مفتی ہے جس کے پاس شہادت گذاریں۔ یا مفتی تو ہے لیکن عوام ایسے نا اہل و خود سر ہیں جو اس کی طرف رجوع نہیں کرتے بلکہ یہ عوام جب چاہتے ہیں عید ٹہرا لیتے ہیں اور محض افواہ کی بنا پر ہی نقارہ بجانے لگتے ہیں یا بندوقین اور پٹاخے چھوڑنے شروع کر دیتے ہیں تو ایسی افواہ سے اور ایسے نقارہ بجانے یا بندوقین چھوڑنے سے رویت ہلال ثابت نہیں ہوتی۔

علامہ ابن عابدین شامی میں فرماتے ہیں:

مجرد الشیوع من غیر علم بمن اشاعہ کما قد تشیع اخبار یتحدث بها سائر اهل البلدة ولا یعلم من اشاعها کما ورد ان فی آخر الزمان یجلس الشیطان بین الجماعة فیتکلم بالکلمة فیتحدثون بها ویقولون لاندري من قالها فمثل هذا لا ینبغی فضلا عن ان یثبت به حکم۔ (ردالمحتار مصری ج ۲ ص ۹۷)

اشاعت کرنے والے کے بغیر جانے ہوئے کسی بات کا محض مشہور ہو جانا جیسے بعض خبریں ایسی شائع ہو جاتی ہیں جس کو تمام اہل شہر بیان کرتے ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ انہیں کس نے شائع کیا جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا کہ آخر زمانہ میں شیطان لوگوں میں بیٹھے گا اور ایک بات کہے گا تو لوگ اس کو بیان کریں گے اور کہیں گے کہ ہم نہیں جانتے کہ اس کو کس نے کہا۔ تو ایسی خبر سننے کے لائق نہیں چہ جائیکہ اس سے کوئی حکم ثابت ہو۔

اور اگر ایسی افواہ کو سنکر کچھ لوگ دوسرے کسی شہر میں پہونچکر خبر دیں کہ فلاں شہر میں یہ شہرت تھی کہ انتیس کاچاند ہو گیا تو یہ ہرگز ہرگز استفاضہ نہیں کہلایا جاسکتا کہ ایسی افواہ اور بازاری خبر سے رویت ہلال ثابت نہیں ہو سکتی نہ یہ استفاضہ کہلایا جاسکتا ہے۔

ردالمحتار میں ہے:

ان اهل تلك البلدة رأوا الهلال وصاموا لانها لاتنفید الیقین فلذا لم تقبل الا اذا كانت

على التحکم او على شهادة غيرهم لتكون شهادة معتبرة والا فهى مجرد اخبار بخلاف الاستفاضة فانها تفيد اليقين فلاينا فى ماقبله۔

(رد المحتار مصری ج ۲ ص ۹۷)

اس اہل شہر نے چاند دیکھ کر روزہ رکھا تو یہ خبر یقین کا فائدہ نہ دیتی تو اس بنا پر قبول نہیں کی جائے گی۔ ہاں جب وہ شہادت حکم یا غیر کی شہادت پر ہو تو معتبر شہادت ہوگی ورنہ وہ فقط خبر ہے بخلاف استفاضہ کے کہ وہ تو یقین کا فائدہ کرتا ہے تو ماقبل کا منافی نہ ہوا۔

طحطاوی علی مراقی الفلاح میں ہے

قوله لزم سائر الناس فى سائر اقطار الدنيا اذا ثبتت عندهم الروية بطريق موجب كان يتحمل اثنان الشهادة او يشهدا على حكم القاضى او يستفيض الخبر بخلاف ما اذا اخبر ان اهل بلدة كذا راوه لانه حكاية۔

(طحطاوی مصری ص ۳۸۲)

تمام لوگوں کو تمام اقطار دنیا میں لازم ہے جب ان کے پاس رویت کا ثبوت بطریق موجب پہنچ جائے جیسے دو شخص شہادت کے حامل بنیں یا دو شخص حکم قاضی پر شہادت دیں، یا خبر مستفیض ہو بخلاف جبکہ یہ خبر سنائی کہ فلاں شہر کے لوگوں نے چاند دیکھا ہے کہ یہ حکایت ہے۔

لہذا نہ ایسی افواہ طریق موجب نہ اس سے رویت ہلال ثابت ہو سکے۔

اخباری خبر

اخبار میں کسی ماہ کی انتیس کے اعتبار سے تاریخیں لکھ دینا یا صاف طور پر یہی لکھنا کہ ہمارے شہر میں یا فلاں شہر میں فلاں ماہ کا چاند انتیس کا ہوا۔ تو اخباروں کی بے اعتباری اور گپوں سے قطع نظر بھی کر لی جائے۔ اور اس کو مطابق واقع کے صحیح بھی فرض کر لیا جائے تو اس کو زائد سے زائد خبر کا مرتبہ حاصل ہوا۔ جس کا غیر معتبر ہونا اوپر کی عبارات سے ثابت ہو چکا۔

رد المحتار میں ہے: فانهم لم يشهدوا بالروية ولا على شهادة غيرهم وانما حكاية روية غيرهم (وفيه ايضا) اذا اخبر ان اهل بلدة كذا راوه لانه حكاية۔

(رد المحتار مصری ج ۲ ص ۹۶ وج ۲ ص ۹۹)

کہ گواہوں نے نہ تو خود اپنی رویت کی شہادت دی نہ غیر کی شہادت پر گواہی دی بلکہ انہوں نے اپنے غیر کی رویت کی حکایت کی۔ اور جب یہ خبر دی کہ فلاں شہر والوں نے چاند دیکھا تو یہ حکایت ہے۔

لہذا اخبار کی خبر نہ طریق موجب نہ اس سے رویت ہلال ثابت ہو سکے۔

خطوط ولفافے

اگر کسی شہر سے خط آیا اور اس میں انتیس کے رویت ہلال کی خبر ہو چاہے کاتب کی طرز عبارت کی شناخت کرتا ہو اور اس کے رسم الخط کو پہچانتا ہو۔ لیکن فقہاء کرام نے امور شرعیہ میں خط کا اعتبار نہیں کیا۔ ہدایہ میں ہے: الخط يشبه الخط فلم يحصل العلم۔

(ہدایہ مطبوعہ رشیدیہ ج ۳ ص ۴۲)

خط خط کے مشابہ ہوتا ہے تو اس سے یقین حاصل نہیں ہوتا۔

الاشباه والنظائر میں ہے: لا يعتمد على الخط ولا يعمل به۔

(الاشباه والنظائر مع شرح حموی کشوری ص ۳۰۵)

خط پر نہ اعتماد کیا جائے نہ اس پر عمل کیا جائے۔

رد المحتار میں ہے: لا يعمل بالخط۔ (رد المحتار مصری ج ۲ ص ۳۶۷)

خط پر عمل نہ کیا جائے۔

مجمع الانہر شرح ملتقى الأبحر میں ہے: الخط يشبه الخط۔ (مجمع الانہر مصری ج ۲ ص ۱۹۲)

خط خط کے مشابہ ہوتا ہے۔

رد المحتار میں ہے: لا يقضى القاضي بذلك عند المنازعة لان الخط ما يزور ويفتعل۔

(رد المحتار مصری ج ۲ ص ۳۶۷)

قاضی بوقت منازعت خط پر فیصلہ نہ کرے اس لئے کہ خط ان میں سے ہے جو بنایا جاسکتا ہے اور

گڑھا جاسکتا ہے۔ یعنی شرح کنز میں ہے: ان الخط يشبه الخط فلا يلزم حجة لانه يحتمل

التزوير۔ (یعنی مصری ج ۲ ص ۸۰)

خط خط کے مشابہ ہو جاتا ہے تو حجت ملزم نہیں ہوا کیونکہ وہ تزویر کا احتمال رکھتا ہے۔

فتاویٰ قاضی خاں میں ہے: القاضى انما يقضى بالحجة والحجة هي البينة او الاقرار

اما صلک لا يصلح حجة لان الخط يشبه الخط۔

(قاضی خاں مصطفائی ج ۲ ص ۳۲۷)

قاضی تو حجت پر حکم دے اور حجت وہ بینہ یا اقرار ہے لیکن چک وہ حجت ہونے کے لائق نہیں اس

لئے کہ خط خط کے مشابہ ہوتا ہے۔

فتاویٰ خیرہ میں ہے: والخط لا یعمد علیہ ولا یعمل بہ۔ (خیرہ مصری ج ۲ ص ۱۹)

اور خط پر نہ اعتماد کیا جائے نہ اس پر عمل کیا جائے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: الكتاب قد یفتعل ویزور والخط یشبہ الخط والخاتم یشبہ

الخاتم۔ (فتاویٰ عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۱۷۲)

خط کبھی بنا لیا جاتا ہے اور گڑھ لیا جاتا ہے۔ اور خط خط کے مشابہ ہو جاتا ہے۔ اور مہر مہر کے مشابہ

ہو جاتی ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ خط نہ قابل اعتبار نہ لائق عمل نہ اس پر حکم دینا جائز اس لئے کہ خط خط کے مشابہ ہو جاتا ہے اور بن سکتا ہے اور ایک خط کا رسم دوسرے سے ملایا جاسکتا ہے۔ لہذا جس چیز میں مشابہ بن جائے اور تزویر کی قابلیت ہو اس پر شرعی احکام کی بنا کس طرح رکھی جاسکتی ہے۔ ابھی شہادت علی کتاب القاضی میں ہدایہ سے عبارت منقول ہوئی کہ حاکم کا خطی خط جو اس نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہو اور اس پر حکومت کی مہر بھی لگی ہوئی ہو تو وہ بلاد و گواہوں کی شہادت کے مقبول نہیں۔ لہذا یہ ڈاک کے ذریعہ سے آئے ہوئے خطوط و لفافے کس طرح قابل اعتبار اور لائق عمل ہو سکتے ہیں تو ان خطوط و لفافوں سے ہرگز ہرگز رویت ہلال ثابت نہیں ہو سکتی۔

ٹیلی گرام تار

جب خط کا غیر معتبر ہونا اور ناقابل عمل ہونا ثابت ہو چکا تو تار کا تو یہ حال زار ہے۔

(۱) تار دینے کے لئے معزز لوگ خود تار گھر نہیں جاتے ہیں بلکہ تار دینے کے لئے کسی شخص کو

بھیج دیتے ہیں تو پہلا واسطہ تو یہ شخص ہوا۔

(۲) تار کے لئے فارم کی حاجت ہوتی ہے۔ اس میں مضمون انگریزی میں لکھا جاتا ہے تو اگر اس

کو انگریزی نہیں آتی ہے تو کسی انگریزی داں کی ضرورت ہے تو یہ انگریزی کا لکھنے والا دوسرا واسطہ ہوا۔

(۳) اس فارم کو تار بابو کو دیا تو یہ تار بابو تیسرا واسطہ ہوا۔

(۴) تار بابو نے تار کے کھٹکوں سے جن کے اطوار مختلفہ کو انہوں نے اپنی اصطلاح میں علامت

حروف قرار دے رکھا ہے اس سے اشاروں اشاروں میں عبارت بنائی اور وہ جدا ہو گیا۔

(۵) یہاں کے تار بابو نے ان کھٹکوں پر غور کر کے اپنی فہم کے موافق اسکی عبارت بنا کر ایک پرچہ پر انگریزی میں لکھ دیا تو یہ چوتھا واسطہ ہوا۔

(۶) پھر وہ کاغذ کا پرچہ کسی ہرکارہ کو دیا گیا وہ اس کو پہنچا کر چلتا بنایا پانچواں واسطہ ہوا۔

(۷) پھر اگر یہ شخص انگریزی داں نہیں ہے تو ایک مترجم کی حاجت پیش آئی تو یہ چھٹا واسطہ ہوا۔

(۸) پھر ترجمہ کے لئے اکثر بڑے لوگ مترجم کے پاس کسی شخص کو بھیج دیتے ہیں تو یہ شخص

ساتواں واسطہ ہوا۔

تو جس کے مضمون پر مطلع ہونے کے لئے اس قدر واسطے ہوں جن کی عدالت تک کا علم نہ ہو بلکہ بعض کا تو نام تک معلوم نہیں ہوتا اور اگر اس سے بھی قطع نظر کر لیجئے تو ان میں بعض کے مسلمان ہونے کا بھی پتہ نہیں ہوتا کہ تار بابو اور ہرکارے کا فریب بھی ہوتے ہیں۔ غرض یہ سلسلہ سند کیا عجیب ہے کہ اس میں مجہول بھی ہیں نامقبول بھی ہیں نااہل بھی ہیں پھر اس کو بھی جانے دیدتے تار میں بھیجنے والے کا جو نام لکھا ہے اس کا کیا ثبوت ہے کہ واقعی اس کا بھیجا ہوا ہے۔ پھر اگر اس سے بھی قطع نظر کیجائے تو خود تار کے دینے والوں اور لینے والوں اور پڑھنے والوں سے اکثر غلطیاں ہوتی ہی رہتی ہیں جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تو آخر اس تار کی کوئی بات قابل اعتبار اور لائق اعتماد ہے اور اگر فرض کر لیجئے کہ تار بالکل صحیح طور پر پہنچ گیا تو یہ تار زائد سے زائد خبر کا افادہ کرے گا نہ کہ شہادت و استفاضہ کا اور خبر کا غیر معتبر ہونا اوپر کی کثیر عبارات سے ثابت ہو چکا۔ لہذا تار کے ایسے احوال کو مد نظر رکھتے ہوئے اس پر احکام شرع کی بنا کس طرح ممکن ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تار نہ ملزم ہے نہ طریق موجب تو اس سے رویت ہلال کس طرح ثابت ہو سکتی ہے۔

ٹیلی فون

ٹیلی فون میں اگرچہ تار کی سی قباحتیں جہالتیں اور مجہول و سناٹ تو نہیں لیکن اس پر بولنے والا مجہول ہے اگرچہ وہ اپنا نام و ولدیت اور پتہ بھی بتا دے کہ اس کا شرعی طور پر کوئی ثبوت نہیں کہ واقعی یہ وہی شخص معروف ہے پھر اگر یہ کہا جائے کہ اس کی آواز سے اس کی صحیح معرفت ہو جاتی۔ تو شریعت مطہرہ نے اس چیز کو معتبر نہیں قرار دیا۔

ہدایہ میں ہے: ولو سمع من وراء الحجاب لا يجوز له ان يشهد ولو فسر القاضی

لا یقبلہ لان النعمۃ تشبہ النعمۃ فلم یحصل العلم۔ (ہدایہ مطبوعہ رشیدیہ ج ۳ ص ۱۳۲)
اگر پردہ سے کوئی آواز سنی تو اس کی شہادت دینا جائز نہیں اگرچہ قاضی سے ظاہر کر دے تو وہ اس لئے قبول نہ کرے کہ نغمہ نغمہ کی مشابہ ہو جاتا ہے تو اس سے یقین نہیں حاصل ہوتا۔
تو جب نغمہ نغمہ کے مشابہ ہو جاتا ہے تو اس میں تزویر کی گنجائش خود اس کی بے اعتباری کے لئے نہایت کافی دلیل ہے ملاحظہ ہو کہ فقہائے کرام تو یہ تصریح فرماتے ہیں۔ جس کو۔
فتاویٰ عالمگیری میں نقل کیا:

یجب ان یعلم ان کتاب القاضی الی القاضی صار حجة شرعا فی المعاملات علی خلاف القیاس لان الكتاب قد یفتعل ویزور والخط یشبہ الخط والخاتم یشبہ الخاتم ولكن انما یقبلہ القاضی المکتوب الیہ عند وجود شرائط ومن جملة الشرائط البینة حتی ان القاضی المکتوب الیہ لا یقبل کتاب القاضی مالم یثبت بالبینة انه کتاب القاضی۔ (عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۱۷۲)

یہ جاننا واجب ہے کہ قاضی کا خط دوسرے قاضی کی طرف معاملات میں خلاف قیاس حجت شرعی ہے کہ خط بنایا اور گزرا جاسکتا ہے اور خط خط کے مشابہ ہو جاتا ہے اور مہر مہر کے مشابہ ہو جاتی ہے لیکن ہم نے اس کو اجماع سے حجت قرار دیا۔ مگر اس کو مکتوب الیہ قاضی اس کے تمام شرائط کے پائے جانے پر قبول کرے اور منجملہ شرائط کے بینہ ہے یہاں تک کہ قاضی مکتوب الیہ خط قاضی کو اس وقت تک قبول نہ کرے جب تک بینہ سے یہ نہ ثابت ہو جائے کہ وہ خط قاضی ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ قاضی کا وہ خط جس کو اس نے خود لکھا اور اس پر اپنے دستخط کر کے حکومت کی مہر لگادی ہو وہ تزویر کے احتمال کی بنا پر مقبول نہ ہوا لیکن اس پر اعتبار کرنے کے لئے باوجود اجماع کے بھی شہادت کو لازم قرار دیا۔ اور ثبوت بینہ کی بنا پر حجت مانا تو تو یہ ٹیلی فون جس کا بولنے والا مجہول پھر نہ اس کا قول نامہ قاضی کی برابر حیثیت رکھے نہ اس کے ساتھ کوئی شہادت موجود نہ بولنے والے کے صدق ہی پر کوئی دلیل لہذا اس کی بات شرعاً کس بنا پر مقبول و معتبر ہو۔ پھر اگر ان سب امور سے بھی قطع نظر کر لی جائے تو ٹیلی فون پر جو بات کہی گئی وہ کس طرح شہادت و استفاضہ تو ہو نہیں سکتی، بلکہ خبر ہے اور خبر کا غیر مقبول و نامعتبر ہونا پہلے بدلائل ثابت کر دیا گیا۔ بالجملة اس ٹیلی فون سے کسی طرح رویت ہلال ثابت نہیں ہو سکتی۔

ریڈیو

ریڈیو بھی ٹیلی فون کی طرح ہے اس میں ریڈیو اسٹیشن سے بولنے والا شخص مجہول ہی ہے اگر وہ اس میں اپنا نام و پتہ بھی بیان کر دے تو اس کا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ واقعی یہ تمہارا وہی جانا پہچانا ہوا شخص ہے بلکہ یہ ٹیلی فون سے بھی کمتر ہے کہ ٹیلی فون میں تو مزید معلومات کرنے کا اختیار بھی حاصل تھا اور ریڈیو میں یہ اختیار بھی نہیں اب باقی رہا نغمہ کا امتیاز تو شریعت نے اس کا اعتبار نہیں کیا۔
فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

ولو سمع من وراء الحجاب لایسعه ان یشہد لاحتمال ان یکون خبرہ اذ النعمۃ تشبہ النعمۃ۔ (عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۲۰۳)

اگر پردہ میں سے آواز سنی تو اسے شہادت دینے کا حق حاصل نہیں کہ احتمال ہے کہ وہ کسی دوسرے کی آواز ہو کیونکہ نغمہ نغمہ سے مشابہ ہوتا ہے۔

تو جب نغمہ نغمہ کے مشابہ ہو سکتا ہے تو نغمہ کا اپنی ذات میں قابل تزویر ہونا ہی اس کی بے اعتمادی کو نہایت کافی ہے تو اب شرعی طور پر کوئی ثبوت نہیں کہ یہ آواز فلاں معروف شخص کی ہے۔ فقہاء کا کلام ابھی گذرا کہ قاضی کا مہر دستخطی خط اسی احتمال تزویر کی بنا پر بلا شہادت کے غیر معتبر تو نغمہ کے احتمال تزویر کی بنا پر ریڈیو کی خبر کس طرح معتبر و مقبول ہو سکتی ہے۔ پھر بالفرض اگر ریڈیو پر بولنے والا شخص متعین بھی ہو جائے تو اس کی عدالت پر کوئی دلیل قائم ہے اور اس کو بھی جانے دیجئے تو ایک شخص کی خبر ہے اور خبر کا غیر معتبر ہونا ثابت کر دیا گیا لہذا ریڈیو سے رویت ہلال کا شرعی حکم جس کے لئے طریق موجب کا ہونا ضروری کس طرح ثابت ہو سکتا ہے۔

اب رہا بعض مفتیوں کا ریڈیو کا اثبات رویت ہلال میں توپ اور روشنی اور ڈھنڈورہ پر قیاس کرنا اور اس میں کچھ شرائط و قیود کا لگا دینا اور اس کی صرف آواز کو ثبوت رویت ہلال کے لئے کافی قرار دینا اور اس کے اعلان پر مسلمانوں کو عمل کرنے کی رغبت دینا یہ میری نظر میں صحیح نہیں ہے۔

اولا۔ ریڈیو حقیقہ خبر رسانی کا آلہ ہے۔ جس طرح ٹیلی فون خبر رسانی کا ایک آلہ تھا۔ کسی مفتی اہلسنت اور کسی مفتی دیوبند و سہارنپور وغیرہ نے اس کی شہادت کو معتبر قرار دیا نہ اس کی خبر کو معتبر ٹھہرایا۔ نہ اس کو توپ اور روشنی اور ڈھنڈورہ پر قیاس کیا۔ نہ اس کی خبر کو ثبوت رویت ہلال میں کافی مانا۔ نہ کسی آواز پر مسلمانوں کو عمل کرنے کا حکم دیا۔ باوجودیکہ جو شرائط و قیود آج ریڈیو کے لئے تحریر کئے جا رہے ہیں یا

آئندہ کئے جائیں گے وہ ٹیلیفون کے لئے بھی کئے جاسکتے ہیں۔ تو اگر یہی شرائط و قیود ریڈیو کی خبر کو معتبر بنادیتے ہیں۔ تو ٹیلیفون کی خبر کو بھی معتبر بنادیں گے تو جب ریڈیو کی خبر کو ثبوت رویت ہلال میں قابل اعتبار قرار دیا تو ٹیلیفون کی خبر کو بھی رویت ہلال میں معتبر ماننا پڑیگا۔ اور اپنے پہلے سارے فتاوے کو غلط کہنا پڑے گا۔

ثانیاً۔ ٹیلیفون کی خبر ریڈیو کی خبر سے زیادہ معتبر و معتمد ہونی چاہئے کہ ٹیلیفون کی خبر کو دوبارہ بارہ در یافت کیا جاسکتا ہے۔ اس کے ہر اشتباہ کو دور کیا جاسکتا ہے۔ خبر دینے والے کا نام و پتہ معلوم ہو سکتا ہے۔ اس کی پوری طور پر معرفت کجا سکتی ہے۔ اور ریڈیو کی خبر کا دوبارہ دریافت کرنا نہایت مشکل اس کے اشتباہ کا دور ہونا بہت دشوار اور اس نشر کرنے والے کا نہ نام و پتہ معلوم ہو سکتا ہے نہ اس کی مکاحقہ معرفت کجا سکے۔ علاوہ بریں ریڈیو کے اسٹیشن چند ہیں اس کی خبر صرف انہیں چند مقاموں سے نشر کیا جاسکتا ہے اور ٹیلیفون کے لئے نہ کسی اسٹیشن کی قید نہ کسی شہر کی پابندی۔ تو ٹیلیفون سے رویت ہلال کی خبر قصبات بلکہ بعض بڑے دیہات سے بھی دیجا سکتی ہے۔ لہذا یہ خصوصیت اعتماد و اعتبار ٹیلیفون ہی کو دیا جاتا نہ کہ ریڈیو کو جو بہ نسبت اس کے چند ناقابل اعتبار امور پر مشتمل ہے۔ مگر حیرت یہ ہے کہ فتویٰ برعکس ہے۔

ثالثاً۔ ریڈیو پر رویت ہلال کی خبر نشر کرنے والا ہندوستان بھر کے لئے اگر صرف ایک ہی عالم مقرر کیا جائے تو وہ سب اہل ہند کا معتمد نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان میں مذہبی اختلاف ہے اور یہ عالم آخر کسی ایک فرقہ کا ہوگا تو دوسرے اس کو کس طرح معتمد مان سکتے ہیں لہذا سارے ہندوستان کے لئے ایسا عالم جو معتمد مقتدا ہو متبع احکام و مرجع انام ہو مقرر نہیں کیا جاسکتا۔

رابعاً۔ اگر ہر عالم کو شہادت گذرنے کے بعد ریڈیو پر خبر شہادت نشر کرنے کا حق دیا جاتا ہے تو یہ بہت کثیر غلطیوں کا سبب ہوگا بطور نمونہ ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے کہ سنبھل میں ایک سال رمضان شریف میں تیسویں شب میں بعد عشاء صبح کو عید کا اعلان سنایا جب وہ معلن میرے مکان کے سامنے اعلان کرتے ہوئے آئے میں نے دریافت کیا کہ آپ کا اعلان کس بنا پر ہو رہا ہے یہاں تو رویت ہلال نہیں ہوئی تو کیا کوئی شہادت گذری ہے انہوں نے کہا کہ فلاں مشہور مولوی صاحب کے پاس باقاعدہ شہادتیں گذری ہیں اور انہوں نے ہمیں اعلان کرنے کے لئے مقرر کیا ہے میں نے فوراً ایک عالم صاحب کو ان مولوی صاحب کے پاس بھیجا اور دریافت کیا کہ کن کن شاہدوں نے شہادت دی ہے انہوں نے ان

کے نام اور پتے بتائے میں نے ان شاہدوں کو بلایا تو وہ ہر دو معلن فاسق تھے۔ میں نے یہ صریح غلطی دیکھکر ان مولوی صاحب کے پاس یہ اطلاع بھیجی کہ آپ نے معلن فاسقوں کی شہادت کا اعتبار کر کے کس لئے اعلان عید کا حکم دیا انہوں نے بے تکلف جواب دیا کہ شاہد ان عدول کا لحاظ پہلے زمانہ میں تھا۔ اب فسق و فجور کا زمانہ ہے جب عادل نہیں ملتا تو فاسق کی شہادت ہی کو معتبر مانا جائے گا۔ تو جب ریڈیو پر خبر شہادت نشر کرنے کے لئے ہر نام نہاد عالم کو حق دیدیا گیا تو اسی طرح کی بہت سی غلطیاں ہوں گی۔ اور دین کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اور ان غلطیوں کا کون ذمہ دار ہوگا۔ نیز وہ عالم پھر کسی فرقہ خاص کا ہوگا۔ اس کی خبر پر دوسرے فرقے کس طرح عمل کریں گے۔ تو جب ہر عالم کے متعلق ناقابل اعتبار اور غیر معتمد ہونے کے احتمالات موجود ہیں تو اس ریڈیو پر کسی عالم کے نشر کرنے کا کیا فائدہ ہے۔

خامساً۔ اس کی کوئی ذمہ داری ہے کہ ریڈیو پر نشر کرنے والا عالم محقق و معتمد متبع احکام ہی ہوگا جب رات دن یہ دیکھا جا رہا ہے کہ ریڈیو کے محکمہ میں ہر قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں اور اکثر وہ ہیں جو مذہب سے ناواقف ہیں تو یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ نشر کرنے والا وہی محقق عالم ہے اور اگر انہیں نہ تسلیم کیا جائے تو ہمارے پاس اس وقت اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ یہی عالم دین ہیں۔

سادساً۔ جب ایک شہر کے قاضی پر دوسرے شہر کے قاضی کی قضا کا ماننا ضروری نہیں تو ایک عالم کی خبر شہادت پر تمام شہروں کے مسلمانوں کو عمل کرنا کس دلیل سے ضروری ہے۔

سابعاً۔ ریڈیو پر انتہائی احتیاط یہ کجا سکتی ہے کہ اس پر خود وہ عالم معتمد خبر شہادت کو نشر کرے تو اس شہر اور اس کے مضافات کے سوا اور شہروں کے لئے اسی عالم کا ریڈیو پر نشر کرنا کیونکر قابل قبول ہوگا کہ فتح القدیر میں ہے کہ ایک شہر کا قاضی کسی دوسرے شہر میں خود ہی جا کر یہ زبانی بیان دے کہ میرے سامنے دو گواہیاں گذریں تو اس کا خود زبانی بیان مقبول معتبر نہیں جس کی عبارت ٹیلیویژن کے ذکر میں منقول ہے۔

ثامناً۔ ریڈیو کی شہادت کے لئے جو شرائط مقرر کئے گئے ہیں ان کی پابندی کی کیا ذمہ داری ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ ابتدا میں تو ان شرائط کا کچھ لحاظ کر لیا جائے گا پھر بے احتیاطیاں ہوتے ہوتے یہ شرائط ختم ہو جائیں گے جیسا کہ پہلے مفتیان دیوبند نے تار کو توپ پر قیاس کر کے اس میں کچھ شرائط کی تنقید کی تھی اور تار کو ثبوت ہلال کے لئے معتبر مان لیا تھا لیکن ان شرائط کا لحاظ نہ کیا گیا تو پھر انہیں اپنے فتوے سے رجوع کرنا پڑا اور تار کو غیر معتبر قرار دینا پڑا یہی نتیجہ اس ریڈیو کا ہوگا کہ ان مفتیوں کو اپنے فتوے سے رجوع کرنا پڑیگا اور ریڈیو کی شہادت کو غیر معتبر کہنا پڑے گا۔

تاسعا۔ کچھ یوں میں جب تارٹیلیفون ریڈیو وغیرہ کل خبر شہادت دوسرے شہروں سے معتبر نہیں مانی جاتی اور اس پر اعتماد کر کے کسی مقدمہ کی ڈگری نہیں کیجاتی تو دینیات میں اس کی ایسی کیا حاجت پیش آئی ہے کہ اس کو معتبر ہی مانا جائے۔

عاشرا۔ جب حدیث شریف میں ہمارے لئے صاف طور پر فرما دیا گیا ہے۔

فان غم علیکم فاکملوا العدة ثلثین۔

تو جب آتیس کو رویت ہلال بطریق موجب ثابت نہ ہوگی تو ہم مہینہ کے تیس دن کامل کر لیں گے اب ان آلات جدید سے متاثر ہو کر ہم اپنے لئے محض اپنی رائے سے کیوں فرائض کی ذمہ داری کو خطرہ میں ڈالیں۔ تو یہ مفتیان خوش فہم ان امور پر کافی غور کر لیں پھر اپنے لئے کوئی راہ تجویز کریں۔

وائریس

وائریس میں اگر ہوا کی لہروں پر حروف بنا کر عبارت بنا دیجاتی ہے تو یہ تار سے مشابہت رکھتا ہے اور اگر اس میں بے تکلف کلام کیا جاتا ہے تو یہ ٹیلی فون سے مشابہت رکھتا ہے بہر صورت اس کا خبر دینے والا بھی مجہول شخص ہوا اگرچہ وہ اپنا نام و پتہ پورا بتا دے کہ اسکے تعین پر کوئی ثبوت شرعی نہیں اور اس کی عدالت پر کوئی دلیل شرعی قائم نہیں اسی طرح آواز کا پہچاننا یہ بھی کوئی حجت نہیں کہ نغمہ نغمہ کے مشابہ ہو جاتا ہے۔ پھر اس وائریس سے جو اطلاع دیجائے گی وہ خبر ہوگی اور خبر نا قابل اعتبار ہونا ثابت ہو چکا فقہاء کرام تو یہ تصریح فرماتے ہیں کہ دوسرے شہر سے خبر شہادت دینا صرف اس قاضی شرع کیساتھ خاص ہے جس کو سلطان اسلام نے مقدمات کے فیصلہ کے لئے مقرر کیا ہو یہاں تک کہ حکم کا خط معتبر و مقبول نہیں۔

درمختار میں ہے: القاضی یکتب الی القاضی وهو نقل الشهادة حقيقة ولا يقبل من

حکم بل من قاضی مولی من قبل الامام مختصراً۔ ملخصاً۔

(ردالمحتار مصری ج ۳ ص ۳۶۵ و ۳۷۰)

قاضی قاضی کی طرف خط لکھے کہ یہ حقیقت شہادت کا نقل کرنا ہے اور حکم کا خط قبول نہ کیا جائے گا بلکہ اس قاضی کا جو امام کی طرف سے مقرر کیا ہوا ہو۔

فتح القدیر میں ہے: هذا النقل بمنزلة القضاء ولهذا لا يصلح الا من القاضی۔

(فتح القدیر مصری ج ۵ ص ۲۸۴)

خط کا بھیجنا گویا قضا کا نقل کرنا ہے اسی لئے قاضی ہی اس کے لائق ہے۔

تو اب رویت ہلال کی خبر شہادت دینے کا اگر حق حاصل ہے تو صرف قاضی کو ہے۔ پھر ہر کس و ناکس کا تارٹیلیفون۔ ریڈیو، وائریس سے رویت ہلال کی خبر شہادت دینے کا کیا حق حاصل ہے۔ بالجملة اس وائریس سے بھی رویت ہلال ثابت نہیں ہو سکتی کہ یہ طریق موجب نہیں۔

لاؤڈ اسپیکر

لاؤڈ اسپیکر پر بولنے والا بھی اگر سامنے نہ ہو تو مجہول شخص ہے اس کے تعین کے لئے ثبوت شرعی درکار ہے۔ اب رہی آواز کی معرفت تو اس کا حکم اوپر گذرا کہ نغمہ نغمہ کے مشابہ ہوتا ہے لہذا اس کا قابل تزویر ہونا خود اسکے غیر معتبر ہونے کے لئے کافی ہے۔ بالجملة اس سے بھی دوسرے شہر میں رویت ہلال ثابت نہیں ہو سکتی۔

ہاں اگر لائوڈ اسپیکر سے قاضی شرع یا مفتی شہر انتیس کی شام کو رویت ہلال کے شرعی ثبوت کے بعد اپنے اہل شہر کے لئے یا حوالی شہر کے دیہات کی واسطے اعلان کرتا ہے تو لائوڈ اسپیکر کے اعلان سے رویت ہلال کی اشاعت کی جاسکتی ہے جیسے سرکاری طور پر توپ یا ڈھنڈورے یا منادی سے اعلان کیا جاتا ہے جو اہل شہر اور دیہات کے لئے قابل اعتبار اور لائق عمل ہوتا ہے۔

ردالمختار میں فرمایا:

قلت والظاهر انه يلزم اهل القرى الصوم بسماع المدافع اوروية القناديل من المصر لانه علامة ظاهرة تفيد غلبة الظن وغلبة الظن حجة موجبة للعمل كما مر جوابه واحتمال كون ذلك لغير رمضان بعيد اذ لا يفعل مثل ذلك عادة في ليلة الشك الا ثبوت رمضان۔

(ردالمختار ج ۲ ص ۹۴)

میں کہتا ہوں کہ ظاہر یہ ہے کہ شہر کی روشنی دیکھ کر یا توپوں کی آواز سن کر گاؤں پر روزہ لازم ہو اس لئے کہ یہ وہ ظاہر علامت ہے جو غلبہ ظن کا فائدہ کرتی ہے۔ اور غلبہ ظن عمل کے لئے حجت موجبہ ہے جیسا کہ فقہاء نے اس کی تصریح کی۔ اور اس کا غیر رمضان کے لئے ہونا بعید احتمال ہے کہ ایسی عادت شک کی شب ہی میں ثبوت رمضان کے لئے جاری ہے۔

تو اس صورت میں لائوڈ اسپیکر سے رویت ہلال ثابت نہیں کیجا رہی ہے۔ بلکہ صرف اپنے اہل

شہر و دیہات کو رویت ہلال کے ثبوت گزر جانے پر حکم حاکم کا اعلان کیا جا رہا ہے۔

ٹیلیویژن

ٹیلیویژن یہ وہ جدید آلہ ہے جو غالباً ابھی تک ہندوستان کی سرزمین میں نہیں آیا ہے۔ اخبار وغیرہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بولنے والے کی تصویر بھی سامنے موجود ہو جاتی ہے۔ مگر مغربی تعلیم کے فدائیوں نے صرف اتنا سرگوشور مچانا شروع کر دیا ہے کہ وائرلیس۔ ریڈیو ٹیلیفون وغیرہ میں بولنے والا مجہول قرار دیا گیا تھا اس میں تو اب تصویر سامنے آ جاتی ہے تو کیا اشتباہ باقی رہتا ہے۔ اب اس کی خبر کس بنا پر غیر معتبر و نامقبول ہوگی۔ اس سے رویت ہلال کیوں نہ ثابت ہوگی لہذا ان نادانوں سے کہو کہ ہماری شریعت بحمدہ تعالیٰ نہایت مکمل ہے ہمیں نہ فقط ان جدید آلات بلکہ جو ابھی آئندہ تاقیامت ایجا ہونے والے ہیں ان کے اگر صراحتہ نہیں تو تلویحاً یا تفریعاً یا تاصیلاً احکام موجود ہیں۔ مولیٰ تعالیٰ عقل و فہم عطا فرمائے اقول یہ کہنا کہ وہ خبر دینے والا اس کے ذریعہ سے مجہول نہیں ہوتا یہ غلط اور باطل دعویٰ ہے۔ یہ ہم نے تسلیم کر لیا کہ بولنے والے کی تصویر سامنے موجود ہوگئی تو محض تصویر کا سامنے آ جانا اس کی عدالت ثابت ہونے کے لئے کافی دلیل ہے۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اس میں تو صرف تصویر ہی سامنے آئی ہے اور قاضی کے سامنے تو بوقت شہادت بذاتہ صاحب تصویر ایک نہیں بلکہ دو مرد موجود ہوتے ہیں جو مستور یعنی مجہول الحال ہوں تو ان کی شہادت غیر مقبول و نامعتبر ہے۔ جیسا کہ مستور کے بیان میں مذکور ہوا۔ بلکہ قاضی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اگر گواہوں کی عدالت کو وہ نہیں جانتا ہے تو ان گواہوں کی شہادت گزر جانے پر ان کے حال عدالت کی تحقیق ہو جانے کے بعد حکم دے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: لا بد ان یسأل القاضی عن الشہود فی السر والعلانیۃ۔

(عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۲۳۶)

قاضی کا گواہوں کے متعلق پوشیدگی اور علانیہ طور پر سوال کرنا ضروری ہے۔

اسی عالمگیری میں ہے: ثم القاضی ان شاء یجمع بین تزکیۃ العلانیۃ و بین تزکیۃ السر

وان شاء اکتفی بتزکیۃ السر و فی زماننا ترکوا تزکیۃ العلانیۃ و اکتفوا بتزکیۃ السر۔

(عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۲۳۷)

پھر قاضی اگر چاہے تو تزکیہ علانیہ اور تزکیہ پوشیدہ دونوں کو جمع کرے اور اگر چاہے تو پوشیدہ تزکیہ

ہی پر اکتفا کرے اور ہمارے زمانہ میں تو تزکیہ علانیہ کو ترک کریں اور پوشیدہ تزکیہ پر اکتفا کریں۔

تو جب شاہدوں کا قاضی کے سامنے صرف موجود ہو جانا بلا تحقیق عدالت کے شہادت کے معتبر ہونے کے لئے کافی نہیں۔ تو ٹیلیویژن میں اس کی صرف تصویر کا سامنے آ جانا ہی کیا ذی صورت کا عادل ہونا ثابت کر دیگا۔ ہرگز نہیں۔ فقہاء کرام تو یہ تصریح فرماتے ہیں۔ جس کو فتاویٰ عالمگیری نے فتاویٰ قاضی خان اور محیط سے نقل کیا:

رجل غریب شہد عند القاضی فان القاضی یقول له من معارفك فان سماهم وهم یصلحون للمسألة منهم سأل منهم فی السر فان عدلوا سأل عنهم فی العلانیۃ فان عدلوا قبل تعدیلهم اذا كان القاضی یرید ان یجمع بین تزکیۃ السر والعلانیۃ وان یصلحوا توقف فیہ و سأل عن المعدل الذی فی بلدته ان كان فی ولایۃ هذا القاضی وان لم یکن کتب الی قاضی ولایتہ یعترف عن حالہ۔ (عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۲۳۷)

ایک مسافر شخص ہے جس نے قاضی کے پاس شہادت دی تو قاضی اس سے کہے تیرے پیچانے والے کون ہیں اگر وہ ان کے نام بتائے اور وہ سوال کے قابل ہوں تو ان سے پوشیدگی میں سوال کرے تو اگر وہ ان کی تعدیل کریں تو قاضی ان سے علانیہ طور پر سوال کرے اگر وہ اس کی تعدیل کریں تو ان کی تعدیل قبول کر لیجائے جب قاضی پوشیدہ تزکیہ اور علانیہ تزکیہ کے جمع کرنے کا ارادہ رکھے۔ اور اگر وہ اس قابل نہ ہوں تو قاضی اس میں توقف کرے اور اس کے شہر کے تعدیل کرنے والے سے سوال کرے اگر وہ اس قاضی کی ولایت میں ہو اور اگر اس کی ولایت میں نہ ہو تو اس ولایت کے قاضی کی طرف لکھے اور اس کے حال کی معرفت حاصل کرے۔

لہذا جب مسافر کو خود قاضی کے سامنے موجود ہو کر شہادت دینا اس کی عدالت کے لئے کفایت نہیں کرتا بلکہ اس کے جاننے والے اگر اس قاضی کی حدود میں ہیں تو ان سے اس کی عدالت کی تحقیق کرے ورنہ اس کی ولایت کے قاضی سے یہ قاضی اس کی عدالت کی تحقیق کرے بعد ثبوت عدالت کے اس کی شہادت پر حکم صادر کرے تو ٹیلیویژن میں محض تصویر کا آ جانا اس کی نہ عدالت ثابت کرتا ہے نہ اسکے مجہول ہونے کو باطل کرتا ہے۔ پھر اگر کوئی یہ کہے کہ ٹیلیویژن پر جو شخص بول رہا ہے وہ عادل ہے اس کی عدالت کو ہم خوب جانتے ہیں قاضی شہر کو بھی اس کی عدالت کا علم ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تم اس کو خوب جانتے پہچانتے تھے اور قاضی بھی جانتا تھا۔ لیکن آج وہ ٹیلیویژن پر بول رہا

ہے اس وقت اس کا کیا حال ہے آیا وہ اپنے پہلے ہی حال پر باقی ہے یا نہیں۔ اگر وہ اپنی پہلی ہی حالت عدالت پر باقی ہے تو اس کی شہادت معتبر اور اس کے مزکی بن سکتے ہیں۔ اور اگر وہ اپنی پہلی حالت عدالت پر باقی نہیں رہا یا چھ ماہ یا اس سے زائد کی مدت گزر چکی ہے تو پھر اس کی عدالت کی تحقیق جدید کی جائے گی۔

عالمگیری میں ہے: لو ثبت عدالة الشهود عند القاضي وقضى بشهادتهم ثم شهدوا عند القاضي في حادثة اخرى اذا كان العهد قريب لا يشتغل بتعديلهم وان كان بعيدا يشتغل به واختلفوا في الحد الفاصل بينهما والصحيح فيه قولان احدهما انه مقدر بسة اشهر والثاني انه مفوض الى رأى القاضي كذا في محيط السرخسى۔

(عالمگیری مجیدی ج ۳ ص ۲۳۸)

اگر قاضی کے نزدیک گواہوں کی عدالت ثابت ہے تو ان کی شہادت پر حکم دے۔ پھر اسی قاضی کے سامنے انہوں نے کسی دوسرے واقعہ میں شہادت دی اور زمانہ قریب کا ہو تو ان کی تعدیل میں مشغول نہ ہو اور اگر زمانہ بعید کا گذر ہو تو مشغول ہو اور فقہاء نے حد فاصل میں اختلاف کیا ہے اس میں صحیح یہ قول ہے کہ وہ ایک تو یہ ہے کہ وہ چھ ماہ کی مقدار ہے دوسرا قول یہ ہے کہ وہ قاضی کی رائے پر موقوف ہے اسی طرح محیط سرخسی میں ہے۔

تو اگر اسکی عدالت کی معرفت بھی ہو اب عرصہ بعید وہ اپنی اسی عدالت پر باقی ہے اس پر کوئی دلیل شرعی قائم ہے پھر یہ گفتگو تو اس بنا پر ہو سکتی ہے جب ٹیلیویژن کے قول کو شہادت فرض کیا جائے اور حقیقت یہ کہ اسکا قول شہادت نہیں ہے بلکہ خبر ہے اور جب خبر ہے تو وہ حجت شرعی نہیں کہ فقہاء کرام تو یہ تصریح فرماتے ہیں۔

فتح القدیر میں ہے: الفرق بين رسول القاضي وبين كتابه حيث يقبل كتابه ولا يقبل رسوله فلان غاية رسوله ان يكون كنفه وقد مناه لودكر مافى كتابه لذلك القاضي بنفسه لا يقبل وكان القياس فى كتابه كذلك الا انه اجيز باجماع التابعين على خلاف القياس فاقصر عليه۔ فتح القدیر مصری ج ۵ ص ۲۸۱

قاضی کے قاصد اور اس کے خط میں یہ فرق ہے کہ اس کا خط تو قبول کیا جائے گا۔ اور اس کا قاصد اس لئے قبول نہیں کیا جاتا کہ اس کی غایت یہ ہے کہ وہ مثل قاضی کے ہوگا اور ہم نے پہلے ذکر کیا کہ یہی

قاضی خود اس مضمون کو جو اس کے خط میں ہے زبانی بیان کرے تو قبول نہ کیا جائے اور قیاس اس کے خط میں بھی ایسا ہی تھا لیکن خلاف قیاس اجماع تابعین کی وجہ سے اس میں اجازت دیدی گئی تو یہ اجازت خط ہی کے ساتھ خاص رہے گی۔

جب قاضی اگر اپنا قاصد بھیجے بلکہ بذات خود ہی آکر بیان دے کہ میرے سامنے گواہیاں گذریں تو وہ مقبول نہیں تو تار۔ ٹیلیفون، ریڈیو۔ وائرلیس۔ لاؤڈ اسپیکر ٹیلیویژن کی خبریں کیا قابل ذکر اور ان سے رویت ہلال کس طرح ثابت ہو سکتی ہے۔

جنتریاں

جنتریوں کا یہ لکھنا کہ فلاں مہینہ انتیس کا ہوگا اور اس کی پہلی تاریخ فلاں دن ہے۔ ہمارے ائمہ کرام فرماتے ہیں کہ اہل توقیت اور مجتہدین کا یہ لکھنا شرعاً قابل اعتبار نہیں نہ اس پر عمل جائز۔

در مختار میں ہے: لا عبرة بقول الموقتين ولو عدولا على المذهب۔

(رد المحتار مصری ج ۲ ص ۹۴)

مذہب صحیح کی بنا پر اہل توقیت کے قول کا اعتبار نہیں اگرچہ وہ عادل ہوں۔

رد المحتار میں معراج سے ناقل ہیں: لا يعتبر قولهم بالاجماع ولا يجوز للمنحجمين ان

(رد المحتار مصری ج ۲ ص ۹۴)

يعمل بحساب نفسه۔

اہل توقیت کا قول بالاتفاق معتبر نہیں نہ اسکے لئے حساب پر عمل جائز ہے۔

اسی رد المحتار میں ہے: لا يلتفت الى قول المنحجمين۔ (رد المحتار مصری ج ۲ ص ۹۸)

منجموں کے قول کی طرف التفات نہ کیا جائے۔

مجمع الانہر شرح ملتقى الابحر میں ہے: مقال اهل التنجيم غير معتبر۔

(مجمع الانہر مصری ج ۱ ص ۲۳۷)

اہل تنجیم نے جو کہا وہ غیر معتبر ہے۔

در المنقش شرح ملتقى میں ہے: قول اهل التنجيم غير معتبر فمن قال به فقد خالف

(در المنقش مصری ج ۱ ص ۲۳۸)

الشرع۔

اہل تنجیم کا قول غیر معتبر ہے اور جو اس کو معتبر جانے وہ شریعت کی مخالفت کرتا ہے۔

مراقی الفلاح میں نظم ابن وہبا سے ناقل ہیں: قول اهل التنجيم ليس

اہل توقیت کا قول واجب کرنے والا نہیں ہے۔

اسی مراقی الفلاح میں ہے: اتفق اصحاب ابی حنیفہ الا نادر و الشافعی انہ لا اعتماد علی قول المنجمین فی هذا۔

(طحاوی مصری ص ۳۸۱)

بعض کے سوا اصحاب امام ابو حنیفہ اور امام شافعی نے اس پر اتفاق کیا کہ اہل تنجیم کے قول پر اعتماد نہیں۔ طحاوی میں ہے: (قوله ليس بموجب) شرعا فطرا ولا صوما۔

(طحاوی مصری ص ۳۸۱)

قول اہل توقیت کا روزے اور فطر کسی کو شرعا واجب کرنے والا نہیں۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: وهل يرجع الى قول اهل الخبرة العدول ممن يعرف علم النجوم الصحيح انه لا يقبل كذا في السراج۔ (عالمگیری میں ہے مجیدی ج ۱ ص ۱۰۱)

عادل اہل خبر جو علم نجوم کے ماہر ہیں کیا ان کے قول کی طرف رجوع کیا جائے صحیح ہے کہ ان کا قول قبول نہ کیا جائے جیسا کہ سراج میں ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ اہل توقیت اور اصحاب نجوم اگر مسلمان عاقل ثقہ بھی ہوں تو باتفاق فقہاء ان کا قول رویت ہلال میں معتبر نہیں ان کی بات قابل التفات نہیں۔ ان کا بیان خلاف شرع ہے۔ ان کا لکھنا طریق موجب نہیں ان کے قول پر عمل کرنا جائز نہیں۔ لہذا جب ان کا قول غیر معتبر اور ناقابل عمل ہے تو ہندوانی جنتریاں جو اکثر کفار کی ہیں اور مصرانی پنہات کی بنا پر تیار کی جاتی ہیں ان کا غیر معتبر ہونا کتنے درجے بدتر ہوگی۔ تو ان سے رویت ہلال کس طرح ثابت ہو سکتی ہے۔ بلکہ مسلمان کا اس بارے میں انکا پیش کرنا ہی سراسر غلط و باطل ہے۔

قیاسات

عوام میں یہ باتیں بہت عام ہیں کہ جب چاند اٹھا تیسویں کو نظر نہ آیا تو چاند انتیس کا ہوگا۔ اور جب چاند اٹھا تیس کو نظر آیا تو چاند تیسویں کو دکھے گا۔ یا آج چاند پٹھکر نکلا تو آج پندرہویں تاریخ ہے۔ یا چاند بڑا دیکھا یا دیر تک رہا تو نہایت جزم سے کہہ دیا یہ چاند کل کا ہے تو ان قیاسات کا کچھ اعتبار نہیں ان پر نہ شرعاً حکم کرنا صحیح نہ عمل کرنا جائز۔

حدیث شریف میں وارد ہے جس کو طبرانی میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی کہ

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: من اقتراب الساعة انتفاخ الالهة۔ (جامع صغیر مصری ج ۲ ص ۱۳۸)

علامات قرب قیامت سے چاندوں کا بڑا ہونا ہے۔

اسی طبرانی نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔

من اقتراب الساعة ان يرى الهلال قبلا فيقال ليلتين۔

(جامع صغیر مصری للسيوطی ج ۲ ص ۱۳۸)

علامات قیامت سے ہے کہ چاند بے تکلف نظر آئے گا تو کہا جائے گا کہ یہ دو رات کا ہے۔

مسلم شریف میں حضرت ابوالخثری تابعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی:

قال خرجنا للعمرة فلما نزلنا ببطن نخلة رأينا الهلال فقال بعض القوم هو ابن ثلث

وقال بعض القوم هو ابن ليلتين فلقينا ابن عباس فقلنا انا رأينا الهلال فقال بعض القوم هو

ابن ثلث وقال بعض القوم هو ابن ليلتين فقال اى ليلة رايتموه قلنا ليلة كذا وكذا فقال ابن

عباس قال رسول الله ﷺ ان الله تعالى قد امدد لرويته فان اغمى عليكم فاكملوا العدة۔

(مشکوٰۃ شریف ص ۱۷۵)

انہوں نے کہا ہم عمرہ کو چلے جب بطن نخلہ میں اترے ہم نے چاند کو دیکھا کوئی بولا تین رات کا

ہے۔ قوم میں سے بعض نے کہا کہ یہ دو رات کا ہے ہم حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے ملے تو ہم

نے عرض کیا کہ ہم نے چاند دیکھا۔ کوئی کہتا ہے کہ تین شب کا ہے کسی نے کہا دو شب کا ہے فرمایا تم نے

اس کو کس رات دیکھا ہم نے کہا فلاں رات کو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کہا کہ رسول اللہ

ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے چاند دیکھنے کو مدت ماہ کی حد ٹھہرایا تو اگر تم پر مہینہ پوشیدہ ہو جائے تو

عدت یعنی تیس دن پورے کرو۔

ان احادیث سے ثابت ہو گیا کہ چاند کا بڑا ہونا اور بے تکلف نظر آ جانا علامات قیامت سے ہے

اور لوگوں کا اس کو بڑا دیکھ کر یہ نہنا کہ یہ دو رات کا ہے یا تین رات کا ہے کوئی قابل اعتبار چیز نہیں ہے۔

ثبوت ہلال کا مدار رویت ہلال پر ہے اگر وہ انیسویں کو نظر آیا تو انتیس کا ہے۔ اور تیسویں کو دیکھا تو تیس کا

ہے۔ لہذا یہ عوام کی قیاسات شرعاً قابل التفات نہیں۔ مذہب ایسے قرآن کی کچھ وقعت نہیں رکھتا ہے۔ ان پر

عمل کرنا ناواقفی اور جہالت ہے۔

اختراعات

عوام میں ایک یہ قاعدہ مشہور ہے کہ رجب کی چوتھی تاریخ جو دن ہے اسی دن رمضان کی پہلی تاریخ ہوتی ہے یا جس دن عید الفطر ہوتی ہے اسی دن محرم کی دسویں تاریخ ہوگی۔ یا تین مہینے پہلے درپے انتیس کے ہوئے ہیں یہ مہینہ ضرورتیں کا ہوگا یا چار مہینے برابر تیس کے ہوئے ہیں یہ مہینہ ضرورتیں کا ہوگا۔ تو ان باتوں کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔ یہ وہ منگواہت قاعدے ہیں جن پر کوئی دلیل شرعی نہیں میرے آقائے نعمت۔ امام اہلسنت مجدد دین و ملت اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے وجیز امام کردری سے یہ عبارت نقل فرمائی۔

وما نقل عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان یوم اول الصوم یوم النحر لیس بتشریع کلی بل اخبار عن اتفافی فی هذه السنة و کذا ما هو الرابع من رجب لا یلزم ان یکون غرة رمضان بل قد یتفق۔

اور جو حضرت مولا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ پہلے روزہ کا دن یوم نحر ہوگا تو یہ قاعدہ شرعی کلی نہیں بلکہ ایک خبر ہے جو اتفاقاً اس سال میں واقع ہوئی اسی طرح رجب کی چوتھی کا دن پہلی رمضان ہونا ضروری نہیں بلکہ کبھی اتفاقاً ایسا ہو جاتا ہے۔

لہذا یہ اگر قواعد شرع سے ہوتے تو شریعت میں اس کی تصریح ہوتی اور اگر قواعد توقیت و تنجیم سے ہوتے تو اہل توقیت اس کو لکھتے۔ لہذا جب کسی نے ان کو نہیں لکھا تو معلوم ہوا کہ یہ قواعد مخترعہ ہیں جن کو عوام نے محض اس بنا پر گڑھ لیا ہے کہ کسی سال ایسا اتفاق ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ امام کردری نے تصریح فرمائی کہ یہ اتفاقی خبریں ہیں لہذا اثبوت ہلال پر انکا کچھ اثر نہیں۔

سوالات کے جوابات ان مباحث ہی سے حل ہو گئے۔ ضرورت تو نہیں کہ نمبر وار جواب دیا جائے لیکن مزید وضاحت کے لئے ہر سوال کا جواب مختصر الفاظ میں دیا جاتا ہے۔ عبارت وثبوت اوپر منقول ہوئے۔

جواب سوال اول: اگر ان سے حاکم صرف اپنے شہر یا حوالی شہر کے دیہات کے لئے شہادت شرعی گذر جانے کے بعد فقط اپنے حکم کا اعلان کرتا ہے تو اس میں کچھ حرج نہیں۔ جیسے منادی توپ وغیرہ سے حکام اعلان کرایا کرتے ہیں تو اس اعلان پر عمل کرتے ہوئے عید کر سکتے ہیں اب رہے دوسرے شہر ان کے لئے نہ اعلان کافی نہ اس پر عمل کرتے ہوئے عید کی جاسکتی ہے اس کے لئے رویت ہلال کا ثبوت بطریق موجب نہیں پایا گیا۔

جواب سوال دوم: نائب اگر دوسرے کسی شہر میں ہے تو ان آلات سے خبر سن کر اپنے حاکم اعلیٰ کے حکم پر نہ عمل کر سکتا ہے نہ عید مناسکتا ہے۔ اب رہا آواز کا پہچانا اس کو شریعت نے معتبر نہیں مانا کہ نغمہ نغمہ کے مشابہ ہو سکتا ہے جو قابل تزویر ہو وہ کب لائق اعتماد ہو سکتا ہے

جواب سوال سوم: کسی شہر کی شہادت جب اور کسی دوسرے شہر میں بطریق موجب پہونچ جائے تو وہاں کے لوگ ضرور عید کریں اور شرعی قوانین وہی ہیں جو بطریق موجب ہو۔ رویت ہلال میں یہی مدار حکم ہے۔

جواب سوال چہارم: نماز و خطبہ میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال مکروہ ہے اس میں میرا مفصل فتویٰ ۱۹۴۰ء کا موجود ہے اور نماز خطبہ کو مجالس وعظ پر قیاس نہیں کر سکتے۔ اس میں بحث بھی ہے۔

جواب سوال پنجم: ٹیلیویژن سے دوسرے شہروں میں رویت ہلال ثابت نہیں ہو سکتی تو اس کی خبر پر عید بھی نہیں کر سکتے بولنے والے کی تصویر سامنے آ جانا اس کے ثبوت عدالت کے لئے کافی نہیں۔ ٹیلیویژن سے شہادت ثابت نہیں ہو سکتی جو مقدمہ ثانیہ سے ظاہر ہے۔

جواب سوال ششم: احکام شرع کا ان آلات سے اثبات کرنا غیر معتبر و نامقبول ہے۔ شرعاً تو ان سے شہادت ثابت ہی نہیں ہو سکتی۔ قانوناً بھی ان سے شہادت حاصل نہیں ہوتی ورنہ کچھریوں میں ان آلات کے ذریعہ سے دوسرے شہروں کی شہادت حاصل کر لی جاتی اور اسی پر اعتماد کر کے کسی مقدمہ میں ڈگری کر دی جاتی تو ان سائنس کے مقلدوں اور مغربی تعلیم کے والد ادوں نے پہلے مسائل شرع میں ان کا استعمال کیوں شروع کر دیا ہے مولیٰ تعالیٰ ان کو قبول حق کی توفیق عطا فرمائے اور اپنا سچا متبع دین بنادے۔

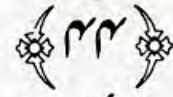
واخر دعویٰنا ان الحمد للہ رب العلمین وصلى الله تعالى على خير خلقه سيدنا ومولانا محمد و آله واصحابه اجمعين۔

کتبہ

المعتصم بذیل سید کل نبی ومرسل

الفقیر الی اللہ عزوجل العبد محمد اجمل غفرلہ الاول

المفتی فی بلدة سنہل ۲۵ محرم الحرام ۱۳۷۰ھ



باب مسائل الصوم

(۵۸۴)

مسئلہ

کیا فرماتے ہیں علماء دین مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

ایک امام صاحب ایک موضع میں خطیب تھے اور موضع کے کچھ بچے تعلیم بھی حاصل کرتے تھے لڑکے بھی تھے اور لڑکیاں بھی تھیں جن کو تعلیم اردو و قرآن شریف حافظہ دیا کرتے تھے ایک عرصہ دراز تک سلسلہ تعلیم و امامت جاری رہا انہیں بچوں میں ایک چھوٹی لڑکی جس کی عمر تقریباً نو سال کی تھی چند کتابیں اردو کی اور کلام پاک کی تعلیم حاصل کی اس کے بعد اسی لڑکی نے اپنے شوق میں حافظہ شروع کر دیا جو کہ تین پارے حافظہ کر چکی ہے۔ اور اس کے علاوہ اور سورتیں بھی سورہ یس و طہ وغیرہ بھی یاد کیں، اس کے بعد اس کی موت نے جلدی کی اور قضاء الہی سے دار فانی کو سدھار گئی اور اس کے مرنے کے بعد جو کیفیتیں ظاہر ہوئیں امام صاحب مذکور نے اس قصہ کو بنام حاجرہ میں شائع کیا جو کہ پیش نظر ہے برائے کرم قصہ حاجرہ کو بنظر عمیق ملاحظہ فرما کر جواب سے سرفراز فرمائے گا کہ ایسا قصہ حاجرہ عند الشرع جائز ہے اور عقل میں آتا ہے یا نہیں؟ تاکہ قسم قسم کے فتنہ نہ بڑھیں جو کہ بڑھ رہے ہیں اور بڑھ گئے ہیں، کوئی کہتا ہے جھوٹ ہے یہ ہونا امر محال ہے، کوئی کہتا ہے سچ ہے ایسا ہو سکتا ہے، اولیاء کے لئے کوئی مشکل نہیں، کوئی کہتا ہے کہ ولی نہیں تھی کیونکہ اگر وہ ولی ہوتی تو روزہ کے متعلق یہ نہ کہتی کہ روزہ ٹوٹ گیا جو کہ امام صاحب نے اس شعر میں بتائے ہیں کہ روزہ ٹوٹ گیا جب کہ منہ بھر کے تھے ہوئی تھی، بہر حال کچھ بھی ہے بنظر تعمق ملاحظہ فرما کر جواب سے جلد از جلد سرفراز فرمائیں عین نوازش ہوگی۔ بینوا تو جروا۔

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

اس قصہ میں منہ بھرتے سے روزہ ٹوٹ جانے کا حکم تو غلط ہے باقی اس میں اور کوئی بات ایسی نہیں ہے جو شرعاً قابل اعتراض ہو۔ اور اس صالحہ لڑکی کا ولی ہونا بھی کوئی حیرت انگیز بات نہیں کہ بعض بچے مادر زاد ولی ہوتے ہیں اور بعد موت کے قبر سے طہ اور یسین شریف کی آواز کا آنا اور خوشبو کا محسوس

ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے کہ قبر سے بعض صحابہ کرام نے سورہ ملک کی آواز سنی ہے کہ مشکوٰۃ شریف میں اس مضمون کی حدیث وارد ہے۔ لیکن ان امام صاحب کو اس واقعہ سے اس قدر متاثر نہ ہونا چاہئے نہ وہاں کے لوگوں کو اس پر کسی طرح کا اختلاف کرنا چاہئے اہل اسلام کا عقیدہ ہی یہ ہے کہ کرامات اولیاء حق یعنی اولیاء کرام کی کرامتیں حق ہیں اور معجزہ و کرامت وہی ہے جو عقل میں نہ آوے۔ بالجملہ یہ کوئی ایسا واقعہ نہیں تھا جس میں مسلمان فتنہ میں پڑیں یا کسی طرح کا اختلاف کریں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

۲۹ جمادی الاخریٰ ۱۳۷۶ھ

کتبہ: لمعتصم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عزوجل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنجل

(۵۸۵)

مسئلہ

قبلہ حضرت مولانا محمد اجمل صاحب دامت برکاتہم العالیہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
بعد بصد آداب غلامانہ بجالا کر عرض ہے کہ جب ذیل مسائل کا جواب ارسال فرمایا جائے
روزے کی حالت میں انجکشن لگوانا جائز ہے یا نہیں؟۔ دیوبندیوں نے اپنے نقشہ افطار میں جائز
لکھا ہے اسناد عا ہے کہ مدلل جواب تحریر فرمایا جاوے۔

آپ کا کشف بردار محمد عبداللہ رضوی کھیری محلہ ڈیہ پور ۱۶ رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ

الجواب

نحمدہ ونصلیٰ ونسلم علیٰ رسولہ الکریم

حقیقت تو یہ ہے کہ دیوبندی قوم عقیدۃ تو غیر مقلد ہیں۔ پھر جب وہ باطنی طور پر غیر مقلد ہیں تو ان میں نہ فقہت حاصل ہونی چاہئے۔ نہ وہ کتب فقہ کے ماہر ہونے چاہیں۔ لیکن وہ جب مدعی حقیقت ہیں تو انہیں بظاہر متقدم بنا پڑتا ہے۔ اور بجبوری کتب فقہ سے تعلق رکھنا پڑتا ہے۔ تو اب انہیں جن مسائل میں فقہ کی تصریحات اور جزئیات مل جاتے ہیں تو ان میں تو ان سے زیادہ صریح غلطیاں نہیں ہوتیں۔ اور جب ان کو فہموں کو نئے واقعات اور نادر حوادث سے واسطہ پڑتا ہے تو ان میں یہ ضرور غلطیاں کرتے ہیں۔ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ جیسے رویت ہلال میں ریڈیو کی خبر کا اعتبار۔ نماز میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال وغیرہ انہیں میں روزہ میں انجکشن کا مسئلہ بھی ہے۔ چنانچہ انہوں نے انجکشن سے روزے کے فاسد ہونے کا حکم نہیں دیا۔ اس میں ان سے دو اصولی غلطیاں ہو گئیں۔

پہلی غلطی تو یہ ہے کہ دوا انجکشن سے دماغ یا جوف تک نہیں پہنچتی۔

چنانچہ فتاویٰ دیوبند میں ہے:

انجکشن کے ذریعہ دوا جوف عروق میں پہنچائی جاتی ہے اور خون کے ساتھ شرائین میں اس کا سریان ہوتا ہے۔ جوف دماغ یا جوف بطن میں دوا نہیں پہنچتی۔

اولاً: جب رگوں کا سلسلہ و تعلق دماغ اور جوف سے ہے تو عقل باور نہیں کرتی کہ بذریعہ انجکشن جب دوا رگوں کے اندر پہنچادی گئی تو کیا خون کی حرکت اور اس کا سیلان اسکو دماغ یا جوف تک پہنچانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ پھر انجکشن کی حرکت قسریہ اس کو معین ثابت نہ ہوگی۔

ثانیاً: بیہوش کرنے کے لئے انجکشن کیا جاتا ہے تو اگر وہ دوا دماغ تک نہیں پہنچتی تو دماغ کو کس چیز نے ماؤف کیا۔

ثالثاً: درد معدہ یا درد دلخ و غیرہ کے لئے انجکشن کیا گیا تو اگر دوا جوف تک نہیں پہنچتی تو اس درد کو کس چیز نے دفع کیا۔

رابعاً: غذا کا انجکشن بھی ہوتا ہے تو دوا جوف تک اگر نہیں پہنچتی تو غذائیت کس چیز سے حاصل ہوئی۔

خامساً: پیاس کے دفع کرنے کے لئے بھی انجکشن ہوتا ہے تو وہ دوا جوف تک نہیں پہنچتی تو پیاس کیسے دفع ہوئی اور سیراب کس چیز نے کر دیا۔

بالجملہ یہ وہ امور ہیں جن کا انکار مشاہدات و تجربات کا انکار ہے۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر اور اطباء تو اس کا اقرار کرتے ہیں کہ انجکشن کی دوا جوف و دماغ تک پہنچ جاتی ہے۔ اور اکابر مفتیان دیوبند کا اس سے انکار کرنا کیسی بیزار عقل چیز ہے۔

دوسری غلطی یہ ہے کسی چیز کا دماغ یا جوف تک پہنچنا مطلقاً روزے کو فاسد نہیں کرتا بلکہ اس کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ چیز منافذ اصلیہ کے ذریعہ سے پہنچے۔

چنانچہ فتاویٰ دیوبند میں ہے:

افساد صوم کے لئے مفطر کا جوف دماغ یا جوف بطن میں بذریعہ منفذ اصلی پہنچنا ضروری ہے۔

(فتاویٰ دیوبند ج ۲ ص ۷۴)

اولاً: کتب فقہ میں روزے کے فاسد کرنے کے لئے کسی چیز کا دماغ یا جوف تک پہنچ جانا کافی

سمجھا گیا ہے۔

مفساد ماذکر متناوشرحا وهو ان مادخل فی الجوف ان غاب فیہ فسد وهو المراد بالاستقرار وان لم یغلب بل بقی طرف منه فی الخارج او کان متصلاً بشی خارج لایفسد لعدم استقراره۔ (شامی مصری ج ۲ ص ۱۰۴)

درمختار میں بدائع سے ناقل: ان الاستقرار الداخل فی الجوف شرط للفساد۔

(شامی ج ۲ ص ۱۰۴)

ردالمحتار میں خزائن الاكمل سے منقول ہے: ان العلة من الجانبین الوصول الی الجوف وعدمه۔ (ردالمحتار ج ۲ ص ۱۰۴)

اسی ردالمحتار ص ۱۰۵ میں ہے: قلت ولم یقیدوا الاحتقان والاستعاط والاقطاب بالوصول الی الجوف لظهوره فیہا والا فلا بد منه حتی لو بقی السعوط فی الانف ولم یصل الی الراس لا یفطرو یمکن ان یکون الدواء راجعاً الی الكل۔

علامہ شامی نہر سے ناقل ہیں: والذی ذکر المحققون ان معنی الفطر وصول مافیه صلاح البدن الی الجوف اعم من کونه غذاء او دواء۔ (ج ۲ ص ۱۱۱)

ہدایہ میں ہے: من احتقن او اسقط او اقطر فی اذنه افطر لقوله ﷺ الفطر مداخل ولو جود معنی الفطر وهو وصول مافیه صلاح البدن الی الجوف۔ (ہدایہ ج ۱ ص ۴۰۰)

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ روزے کے فاسد ہو جانے کے لئے کسی مفطر چیز کا دماغ یا جوف تک پہنچ جانا ضروری ہے۔

ثانیاً: اگر مفطر چیز کے دماغ یا جوف تک پہنچنے کے لئے منافذ اصلیہ کے ذریعہ سے پہنچنا ضروری اور شرط ہوتا تو متون و شروح اپنی عبارات میں اس شرط کا ذکر کرتے تو جب متون و شروح بلکہ فتاویٰ اس کو شرط قرار نہیں دیا تو چودھویں صدی میں ان اکابر دیوبند کا اس کو شرط اور ضروری قرار دینا کیا قابل التفات۔

ثالثاً: یہ امر تو ضروری ہے کہ منافذ اصلیہ کے ذریعہ سے جو چیز دماغ یا جوف تک پہنچے وہ بالاتفاق روزہ کو فاسد کر دیگی۔

چنانچہ ردالمحتار میں ہے اور خود فتاویٰ دیوبند میں خلاصۃ الفتاویٰ سے منقول ہے:

ماوصل الى الجوف والراس والبطن من الاذن والانف والدبر فهو مفطر بالاجماع۔

لیکن مفتی دیوبند کا عبارت کا یہ مفہوم مخالف نکالنا (کہ جو چیز دماغ یا جوف تک بذریعہ منافذ اصلیہ کے نہ پہنچے وہ روزہ کو فاسد نہیں کرتی) کوئی حجت اور دلیل نہیں کہ عند الحنفیہ مفہوم مخالف معتبر نہیں ہے۔

رابعاً: ہدایہ میں ہے: لو داوی - نائفۃ او امة بدواء فوصل الى جوفه او دماغه افطر عند ابی حنفیۃ والذی یصل هو الرطب - (ہدایہ ص ۲۰۰)

پیٹ کا ایسا زخم جو جوف تک ہو اس کو جائفہ کہتے ہیں اور سر کا ایسا زخم جو دماغ تک ہو اس کو آمہ کہتے ہیں۔

اگر ان میں تردید استعمال کی جو جوف و دماغ تک پہنچے گی تو روزہ فاسد ہو گیا اور مفتی دیوبند کے نزدیک اس صورت میں روزہ فاسد نہیں ہونا چاہئے کہ ان کی شرط نہیں پائی گئی یعنی یہ دوا جوف و دماغ تک منافذ اصلیہ کے ذریعہ سے نہیں پہنچی۔ تو کہیے مفتی صاحب آپ کا حکم صحیح ہے۔ یا ہدایہ جیسی معتبر و مستند کتاب کا۔ اور پھر ان کا قول مانا جائے یا حضرت امام اعظم علیہ الرحمہ کا۔

الحاصل ان دیوبندیوں مفتیوں کی یہ دو بنیادی غلطیاں ہیں جن پر کافی سوالات وارد کر دیئے گئے ہیں۔ تو جب ان کے فتوے کا غلط ہونا اور ماہرین انجکشن کے تجربوں کے خلاف ہونا ثابت ہو چکا تو اب مسئلہ خود ہی منقطع ہو گیا لہذا اب مختصر طور پر حکم شرع ظاہر کر دیا جاتا ہے۔ وباللہ التوفیق۔

انجکشن رقیق اور تردید کا کیا جاتا ہے اور ظن غالب یہ ہے کہ تر اور رقیق دوا بذریعہ رگوں کے خود خون کی حرکت اور اس کے سیلان سے اور مزید انجکشن کی حرکت قسریہ کی مدد سے دماغ یا جوف تک پہنچ جاتی ہے۔ مسلمان ڈاکٹروں سے تحقیق کی تو انہوں نے بھی یہی کہا کہ انجکشن سے دوا دماغ یا جوف تک پہنچ جاتی ہے۔

ردالمحتار میں ظاہر الروایہ سے منقول ہے:

وقع فی ظاہر الروایۃ من تقييد الافساد بالدواء الرطب مبنی علی العادة من انه یصلی والا فالمعتبر حقيقة الوصول حتی لو علم وصول الیابس افسد (وفیه ایضاً) فان كان

مما یصل عادة حکم بالفساد لانه متیقن۔

اور یہ امور ناقابل انکار ہیں۔ (۱) انجکشن فعل قصدی و ارادی ہے (۲) اور دوا میں اصلاح بدن کا فائدہ موجود ہے۔ (۳) وہ جوف میں پہنچ کر رہ جاتی ہے اس کو خارج سے پھر کوئی تعلق نہیں رہتا۔ اور روزے کے فساد کا کامدار انہیں امور پر موقوف تھا۔

چنانچہ ردالمحتار میں ہے: وحاصله ان الا فساد منوط بما اذا كان بفعله او فيه صلاح بدنه ويشترط ايضاً استقراره داخل الجوف۔

لہذا جب یہ امور اس انجکشن میں متحقق ہو گئے تو اس انجکشن سے روزہ فاسد ہو جائے گا۔ اور اس کی قضا لازم ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ ۲۷/رمضان المبارک ۱۳۷۸ھ

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمل العلوم فی بلدہ سنبھل

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ



باب ارکان الحج

مسئلہ

(۵۸۶)

(۱) کیا قانونی مجبوری سے حج فرض کے لئے فوٹو کھنچوا کر دینا جائز ہے؟
 (۲) جب فرض و حرام کا تعارض ہو تو شریعت مطہرہ کا کیا حکم ہے؟
 (۳) جب عوام و خواص یعنی محدث اعظم صاحب و دیگر علماء کرام بھی فوٹو لے کر حج کو جا رہے ہیں اور ”لا تجتمع امتی علی الضلالة“ صحیح ہے تو اس کو اجماع امت سمجھ کر جواز فوٹو کا حکم دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

(۴) یہ خیال کر کے کہ حجر اسود چوم کر یا وقوف عرفات سے یا طواف بیت اللہ شریف کر کے سب گناہ معاف ہو جائیں گے فوٹو کھنچوانے میں کیا مضائقہ ہے؟
 (۵) فعل حرام کا ارتکاب فسق ہے اور یہ فسق مستور بھی نہیں ہے ایسی حالت میں جو حج سے فارغ ہو کر آئے وہ اس فسق کی وجہ سے احترام و تعظیم کے لائق نہیں مگر لوگ ان کو مکرم و معظم ہی سمجھتے ہیں۔ یہ سمجھنا کیسا ہے؟

(۶) رہن دخلی حرام ہے یعنی شی مرہونہ سے انتفاع ناجائز ہے۔ اگر کسی نے مکان اس شرط پر خرید لیا کہ اگر تم سال ڈیڑھ سال میں خریدنا چاہو گے تو میں اسی قیمت میں تمہارے ہاتھ پر بیع کر دوں گا اسی طرح وہ اتنی مدت خود رہا کر ایہ پر اٹھایا تو یہ رقم اس کے لئے حلال ہوئی یا نہیں؟

(۷) نماز مغرب کے وقت تین شخص ٹخنوں سے نیچے پانچے پہنے ہوئے مسجد میں آئے ان سے کہا گیا کہ یہ شکل شرعاً ممنوع ہے، تو ایک نے نیفہ ٹوم لیا، دوسرے نے پانچے الٹ لئے، تیسرے نے اسی حالت میں نماز پڑھی۔ ان تینوں کی نماز کا کیا حکم ہے؟

(۸) عند الناس تو صاحب کرامات اولیاء کا مرتبہ علماء حق سے افضل ہے مگر عند اللہ والرسول علماء و اولیاء میں سے کون افضل ہے میرا گمان عوام کے خلاف ہے؟

کتاب الحج

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) اب سفر حج کیلئے فوٹو کا کھینچنا ضروری ہو گیا ہے۔ جب یہ قانون زیر غور ہی تھا اس وقت بھی ہم نے اور دیگر مقامات سے علماء کرام نے اس کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور حکومت سے مطالبہ کیا تھا۔ حکومت نے اس کا جواب ہم کو یہ دیا کہ حکومت کو مجبوراً پاسپورٹ کے ساتھ فوٹو کو لازم کرنا پڑا ہے۔ تو فوٹو کا پاسپورٹ کے ساتھ ہونا بہر حال ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اب ہمیں ادھر تو یہ ملحوظ رکھنا ہے کہ فوٹو تصویر ہے اور اس کا کھینچنا تصویر کا کھینچنا ہے جو گناہ ہے۔ اور ادھر یہ مد نظر رکھنا ہے کہ حج فرض ہے جو بلا ادا کئے ادا نہیں ہو سکتا اور سال دو سال میں غیر مسلم حکومت سے یہ امید بھی نہیں ہے کہ حجاج سے یہ فوٹو کی قید اٹھائی جائے گی۔ اب وہ شخص جس کو حج فرض ادا کرنا ہے اور تمام شرائط حج مجتمع ہیں اور شرعی موانع سے کوئی مانع موجود نہیں ہے تو کیا اس کے لئے صرف فوٹو کا کھینچنا شرعاً عذر و مانع قرار دیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ اور بصورت عذر و مانع ہونے کے تاخیر حج کے گناہ بلکہ ترک فریضہ حج کے عذاب کا سزا وار ہوگا یا نہیں۔ لہذا ہم جواب سے اپنے چند مقدمات پیش کرتے ہیں۔

مقدمہ اول:- ماں باپ کی اطاعت سے حج فرض ادا کرنا اولے ہے۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے: فی المنقطع حج الفرض اولے من طاعة الوالدین وطاعتہما

(عالمگیری قیومی ص ۱۱۳ ج ۱)

اولے من حج النفل

ارشاد الساری حاشیہ المسک المکسوط میں ہے:- "وفی المضمورات الاتبان بحج الفرض

(ارشاد مصری ص ۳)

اولے من طاعة الوالدین

اسی طرح جب عورت کے ساتھ محرم ہو تو اسے حج فرض کے لئے بغیر اجازت شوہر کے جانا جائز

ہے۔ فتاویٰ قاضی خاں میں ہے:- "وعند وجود المحرم كان علیہا ان تخرج حجة الاسلام

وان لم ياذن زوجها في النافلة لا تخرج بغير اذن الزوج"

(فتاویٰ قاضی خاں مصطفائی ص ۱۳۵ ج ۱)

در مختار میں ہے:- "ولیس لزوجه مانعها عن حجة الاسلام"

ردالمحتار میں ہے:- "ای اذا كان معها محرم والا فله منعها كما يمنعها عن غیر

ان عبارات سے یہ ثابت ہو گیا کہ حج فرض کی اس قدر اہمیت ہے کہ اس کے مقابلہ میں اطاعت والدین اور اذن شوہر کا بھی لحاظ نہ رکھا گیا۔

مقدمہ ثانیہ: پانی کی قلت۔ گرم ہوا کا چلنا۔ موت۔ قتل۔ چوری۔ بیماری کے محض خطرات حج کے لئے عذر مانع نہیں۔ ردالمحتار میں ہے:- "ان ما يحصل من الموت بقلة الماء وهيجان السموم اكثر مما يحصل بالقتل باضعاف كثيرة فلو كان عذرا لزم ان لا يجب الحج الاعلى القريب من مكة في اوقات خاصة مع ان الله تعالى اوجبه على اهل الآفاق من كل فج عميق مع العلم بان سفره لا يخلو عما يكون في غيره من الاسفار من موت وقتل وسرقة

(ردالمحتار مصری ص ۱۳۹ ج ۲)

اس عبارت سے ظاہر ہو گیا کہ سفر قلت آب، باد سموم، موت، قتل، چوری کے خطرات سے خالی نہیں ہوتا ہے تو یہ چیزیں حج کے لئے عذر و مانع نہیں جب تک کہ یہ حد یقین یا ظن غالب کی حد تک نہ پہنچ جائیں۔

مقدمہ ثالثہ: اگر مال حرام سے حج فرض ادا کر رہا ہے تو اگرچہ اس کا حج درجہ قبولیت تک نہ پہنچے اور ثواب کا مستحق نہ بنے لیکن وہ تارک حج کا عذاب نہ دیا جائے گا۔

ردالمحتار میں ہے:- "ويجتهد في تحصيل نفقة حلال فانه لا يقبل بالنفقة الحرام كما

ورد في الحديث مع انه يسقط الفريضة معها ولا تنافي بين سقوطه وعدم قبوله فلا يثاب

لعدم القبول ولا يعاقب عقاب تارك الحج اي لان عدم الترك يبتني على الصحة وهي

الاتيان بالشرائط والاركان والقبول المترتب عليه الثواب يبتني على اشياء كحل المال

والاخلاص كمالو صلى مراتبا او صام و اغتاب فان الفعل صحيح لكنه بلا ثواب

(ردالمحتار مصری ص ۱۴۲ ج ۲)

اس عبارت سے ثابت ہو گیا کہ مال حرام سے حج کرنے میں فرض ادا ہو جاتا ہے اور فریضہ

سر سے ساقط ہو جاتا ہے کہ جب اس نے حج کے شرائط و ارکان ادا کیے تو حج صحیح ہو گیا اور وہ ترک حج

کے ثواب سے بچ جائے گا۔ اب باقی رہا حج کا ثواب تو وہ حج کے مقبول ہونے پر مرتب ہے اور قبولیت حج

مال حلال اور اخلاص پر موقوف ہے۔ جیسے کہ کسی نے ریا کے لئے نماز پڑھی یا روزہ رکھا اور اس میں غیبت

کی تو وہ نماز و روزہ تو ادا ہو گیا مگر وہ ثواب کا حقدار نہ بنا۔ بالجملہ فریضہ کی صحت تو اسکے شرائط و ارکان کے ادا کرنے پر ہو جاتی ہے۔ اور خارجی امور کا اثر خود فعل پر نہیں پڑتا بلکہ ثواب پر ہے۔

مقدمہ اربعہ :- سفر حج میں اگر ظلم ظالم یا دفع شر یا حصول امن کے لئے رشوت دینی پڑے۔ یا جنگی ٹیکس بھریا جاتا ہو اور یہ محض اسقاط فرض یا دفع مضرت مال کے لئے بضروت دینے کے لئے مضطر ہو تو اس عازم حج پر کوئی محذور شرعی لازم نہیں آتا بلکہ گناہ لینے والے پر ہے اور یہ امور مذکورہ حج کے لئے عذر نہیں اور نہ منافی امن ہیں۔

در مختار میں ہے :- ”وہل مایو خذ فی الطريق من المکس والحقارة عذر قولان والمعتمد لا کما فی القنیة والمجتبی“

علامہ علی قاری المسلك المتقسط میں تحریر فرماتے ہیں :- ”قال غیر الوبری یجب الحج وان اعلم یوخذ منه المکس قال صاحب القنیة والمجتبی وعلیه الاعتماد و فی المنهاج وعلیه الفتوی وقال ابن الهمام حاصله ان الاثم فی مثله علی الآخر لاعلی الموطی فلا یتربک الفرض لمعصیة عاص“

(ارشاد الساری مصری ص ۳۶)

رد المحتار میں ہے :- ”واعترضه ابن کمال با شافی شرحه علی الهدایة بان ما ذکر فی القضاء لیس علی اطلاقه بل فیما اذا کان المعطى مضطراً بان لزمه الاعطاء ضرورة عن نفسه وماله ، اما اذا کان بالالتزام منه فبالاعطاء ایضاً یا ثم وما نحن فیہ من هذا القبیل ۔ اه و اقره فی النهر واجاب السید ابو السعود بانه هنا مضطر لا سقاط الفرض عن نفسه قلت ویؤیده ما یأتی عن القنیة والمجتبی فان المکس والخفارة رشوة ونقل ح عن البحران الرشوة فی مثل هذا جائز ولم اره قیه۔

(رد المحتار مصری ج ۲ ص ۱۲۹)

ابن کمال پاشا نے اپنی شرح ہدایہ میں اس پر اعتراض کیا کہ قضا میں مذکور ہوا اس کا حکم مطلق نہیں بلکہ اس صورت میں ہے کہ جب دینے والا مجبور ہو کہ اپنے نفس و مال کی ضرورت کی بنا پر اس کو دینا لازم ہو لیکن جب اس نے خود ہی اپنے اوپر لازم قرار دے دیا تو دینے پر گنہگار ہوگا۔ اور ہم جس پر گفتگو کر رہے ہیں وہ اسی قبیل سے ہے اسی کو نہر میں برقرار رکھا۔ اور سید ابو السعود نے جواب دیا کہ بلا شک حاجی یہاں پر اپنے نفس پر سے فریضہ حج کے ساقط کرنے کے لئے مجبور ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اسی کی تائید کرتا ہے۔ جو قنیہ اور مجتبیٰ میں لکھا ہے۔ کہ بیشک محصول اور ٹیکس رشوت ہے اور بحر الرائق سے منقول ہے کہ

بیشک اس جیسی جگہ میں رشوت جائز ہے۔

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ ظلم ظالم، دفع شر، حصول امن، جنگی ٹیکس، کوئی عازم حج فرض محض اپنے اوپر سے فریضہ حج کے ادا کرنے یا اپنے مال سے دفع مضرت کرنے کے لئے بلحاظ ضرورت مجبورا رشوت دے تو ایسی رشوت جائز ہے۔ اس کا گناہ صرف لینے والے پر ہوگا۔ اس دینے والے پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ اور یہ چیزیں نہ حج فرض کے لئے عذر و مانع ہیں نہ اس کے لئے منافی امن ہیں۔ لہذا ان چیزوں کی بنا پر حج فرض کو نہ چھوڑا جائے گا بلکہ جب اس کے لئے اور تمام شرائط حج پائے جائیں تو اسے حج فرض کے لئے جانا واجب ہے۔

مقدمہ خامہ :- جس شخص کے لئے موانع حج مرتفع ہوں اور شرائط حج مجتمع ہوں تو اس کو اسی سال حج کرنا فرض ہے۔ وہ اگر دوسرے سال تک تاخیر کرے گا تو گنہگار ہوگا۔ اور اگر چند سال تک حج کے لئے تاخیر کرتا رہا تو فاسق ہے اور اس کی گواہی مردود ہے۔ در مختار میں ہے :-

(فرض فی العمر مرة علی الفور) فی العام الاول عند الثانی واصح الروایتین عن الامام ومالك واحمد فیفسق وترد شهادته بتاخيره ای سنیناً لان تاخيره صغيرة وبارتکابه مرة لا یفسق لا بالاصرار۔ (رد المحتار ص ۱۳۲ ج ۲)

اور حج ایک بار فوراً پہلے سال ہی میں فرض ہے۔ امام ابو یوسف کے نزدیک اور امام مالک و امام احمد و امام اعظم کی اصح روایت میں تو چند سال تاخیر سے وہ فاسق ہو جائے گا اور اس کی گواہی مردود کر دی جائے گی۔ کیونکہ تاخیر حج صغیرہ گناہ ہے اور صغیرہ کے ایک بار کرنے سے فسق نہیں ہوتا۔ ہاں وہ اس تاخیر کے اصرار سے ضرور فاسق ہو جائے گا۔ در الملتقی شرح الملتقی میں ہے :-

(فرض فی العمر مرة علی الفور) عند الثانی لان الموت فی السنة غیر نادر و هو اصح الروایتین عن الامام ومالك واحمد کما فی عامة الكتب المعتررات کالخانية والاسرار و فی القنیة انه المختار فیفسق وترد شهادته بالتاخير عن العام الاول بلا عذر۔

(در الملتقی مصری ج ۱ ص ۲۵۹)

(حج) ایک مرتبہ عمر میں فوراً فرض کیا گیا امام ابو یوسف کے نزدیک کہ سال میں موت کا وجود

غیر نادر ہے اور یہ امام اعظم اور مالک اور احمد کی اصح روایت میں ہے جیسا کہ عام معتبر کتب مثل فتاویٰ قاضی خان اور اسرار میں ہے اور قنیہ میں ہے کہ یہی مختار قول ہے تو بلا عذر پہلے سال کی تاخیر سے فاسق ہو جائے گا۔ اور وہ مردود الشہادت ہو جائے گا۔

لباب المناسک اور اس کی شرح المسلك المتقسط فی المسلك المتوسط میں ہے:

(و اذا وجدت الشروط) ای شروط وجوب الحج و ادائه و جب (فالوجوب علی الفور) ای محمول علیہ فی القول الاصح عندنا و هو اختیار ابی یوسف و اصح الروایتین عن ابی حنیفہ کما نص علیہ قاضی خان و صاحب الکافی و بہ قال مالک فی المشہور و احمد فی الاظهر و المازنی من الشافعیہ (فیقدمہ خائف العزوبۃ) ای من العنت (علی التزوج) لحق تعلق وجوب الحج و سبقہ (ویاثم المومنین عن سنة الامکان) ای اول سنی الامکان و هذا طریق امام الہدی ابی منصور الماتریدی فی کل امر مطلق عن الوقت فانه یحمل علی الفور۔

اور جب حج کے وجوب اور ادا کی شرطیں پائی گئیں اور وہ واجب ہو گیا تو اس کا وجوب ہمارے نزدیک صحیح ترین قول کی بنا پر علی الفور ہے۔ یہی امام ابو یوسف کا مختار قول ہے۔ اور امام اعظم کی اصح روایت ہے جیسا کہ اس پر قاضی خان اور صاحب کافی نے نص بیان کی اور یہی مشہور روایت میں امام مالک نے اور اظہر روایت میں امام احمد نے اور شافعیہ میں سے مازنی نے فرمایا۔ تو حج کو غیر شادی شدہ شخص جو زنا سے خائف ہے نکاح پر مقدم کرے کہ حج کا وجوب اور سبقت کا حق اس سے متعلق ہو چکا۔ اور قادر ہو جانے کے سالوں میں سے پہلے سال ہی سے تاخیر کرنے والا گنہگار ہو جائے گا۔ یہ امام ہدی امام ابو منصور ماتریدی کا طریقہ ہر اس امر میں ہے جو وقت سے مطلق ہو کہ وہ علی الفور ہی پر محمول ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ فرضیت حج کی اس قدر اہمیت ہے کہ اس کے مانع نہ ہوں اور تمام شرائط جمع ہوں تو اس کے مقابل طاعت والدین اور اذن شوہر کی بھی پروا نہ کی جائے گی اور قلت آب، بادسوم، موت، قتل، چوری، بیماری کے خطرات بھی حج کے موانع نہیں ٹھریں گے یہاں تک کہ مال حرام سے حج فرض ادا ہو جاتا ہے اور فریضہ ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے۔ اور وہ ترک حج کے عذاب سے بچ جاتا ہے اگرچہ ایسا حج مقبول نہیں ہوتا، اور وہ ثواب کا مستحق نہیں بنتا لیکن باوجود اس کے مال حرام حج کے لئے عذر نہیں قرار پاتا۔ بلکہ حج فرض کی ضرورت کا اتنا لحاظ ہے کہ اس کے سفر میں ظلم ظالم و دفع شر و حصول امن کے

لئے رشوت دینے کی اجازت ہے۔ اور جنگی اور ٹیکس ادا کرنے پر کوئی مواخذہ شرعی نہیں ہے تو رشوت بھی حج کیلئے نہ عذر نہ مانع نہ منافی امن ہے۔ بالجملہ ان سب امور کو نہ تو حج فرض کے لئے عذر و مانع قرار دیا۔ نہ ان کی وجہ سے حج کو جانا گناہ و ناجائز ٹھہرایا۔ نہ ان کی بنا پر فریضہ حج کا التوا کیا۔ تو فوٹو کا کھینچنا بھی اگرچہ گناہ ہے مگر اس کو بلا کسی دلیل کے حج فرض کا عذر و مانع کس طرح قرار دیا جائے۔ اور محض اس فوٹو کی بنا پر حج فرض کے لئے جانا کس ثبوت سے گناہ و ناجائز ٹھہرایا جائے۔ اور صرف اس کی وجہ سے کس نص سے تاخیر حج کے گناہ و فسق بلکہ ترک حج کے عذاب کو اٹھا دیا جائے اور اس شخص کو فاسق و مردود شہادت ہونے سے بچالیا جائے۔

خلاصہ جواب یہ ہے کہ فوٹو کا کھینچنا عازم حج فرض کے لئے محض اسقاط حج فرض کی ضرورت کے لئے مجبور ہے۔ جیسا کہ مقدمہ ثالثہ میں ثابت ہو چکا ہے کہ مال حرام سے حج فرض ادا ہو جاتا ہے۔ اور فریضہ ذمہ سے ساقط ہو جاتا ہے۔ اور ترک حج کے عذاب سے بچ جاتا ہے۔ اور محض اسقاط فرض کی ضرورت کی بنا پر مجبور اسے حج ادا کرنے کی اجازت دی اور یہ بات بیان کی کہ یہ ایک خارجی چیز ہے اس کا اثر خود فعل حج پر نہیں پڑتا بلکہ ثواب پر اثر پڑیگا۔ تو مال حرام حج کیلئے عذر و مانع نہ بنایا باوجود کہ یہ ارکان حج کے اسباب میں اثر انداز ہے کہ اسی سے منی، مزدلفہ، عرفات، طواف زیارت کے لئے جارہے ہیں۔ خود ارکان حج ادا کرنے والے کا خورد و نوش، طہارت، لباس، قربانی وغیرہ کثیر امور اسی مال حرام سے ہو رہے ہیں۔ تو اسی طرح فوٹو کے ہونے کے باوجود حج فرض ادا ہو جانا چاہیے۔ اور فریضہ ذمہ سے ساقط ہو جانا چاہئے۔ تو یہ فوٹو رکھنے والا شخص بھی ترک حج کے عذاب سے بچ جانا چاہئے۔ اور محض اسقاط فرض کی ضرورت کی بنا پر مجبور فوٹو کے ساتھ حج فرض کی اجازت دی جائے تو فوٹو بھی تو ایک خارجی ہی چیز ہے۔ اس کا اثر کسی رکن حج پر نہیں پڑتا۔ بلکہ اس کو تو چھپا کر صندوق میں رکھ دیا جائے گا۔ نہ اس کو منی، مزدلفہ، عرفات، صفا و مروہ، مسجد حرام میں لے جانے کی حاجت نہ کسی فعل کے ادا کرنے کے وقت اس کے دکھانے کی ضرورت تو فوٹو کو فرض حج کے لئے کس طرح عذر و مانع قرار دیا جاسکتا ہے۔

مقدمہ رابعہ میں ثابت کیا گیا کہ رشوت جس کی حرمت منصوص ہے اس کی محض اسقاط فرض کی ضرورت کو مد نظر رکھ کر اجازت دی گئی اور اس کی حرمت کو حج فرض کیلئے عذر و مانع قرار نہیں دیا گیا اسی طرح فوٹو کو بھی محض اسقاط فرض کی ضرورت کی بنا پر جائز قرار دیا جائے اور اس کی حرمت کو حج فرض کے لئے عذر و مانع نہ ٹھہرایا جائے۔ پھر رشوت کی مجبوری تو کبھی اتفاقاً پیش آ جاتی ہے۔ اسی طرح مال حرام کے

صرف کرنے میں تو کوئی شخص خاص ہی مبتلا ہو جاتا ہے۔ لیکن فوٹو کی ایسی قانونی مجبوری ہے جس کے اٹھ جانے کی اب کوئی امید باقی نہیں رہی ہے۔ پھر اس میں ایسا ابتلاء عام و عموم بلوی ہے جس سے کسی شخص کا اس سے مستثنیٰ ہو جانا نہایت مشکل امر ہے۔ تو ان مجبوریوں، ضرورتوں کو کتب فقہ کی نظروں کی بنا پر حج فرض کے ادا کرنے کے لئے فوٹو کی اجازت دی جاتی ہے۔ اور قول فقہائے کرام ”الضرورات تبیح المحظورات“ (ضرورتیں ممنوعات کو مباح کر دیتی ہیں) پر عمل ہو جاتا ہے۔ اور اس قانون کے اٹھ جانے یا اس سے مستثنیٰ ہو جانے کی موہومی امیدوں پر التوائے حج یا تاخیر حج بلکہ ترک حج کے گناہ و فسق سے اہل اسلام کو بچالیا جائے گا۔ یہ حکم فرض حج کیلئے ہے۔ باقی رہا حج نفل اس کے لئے فوٹو کی اجازت نہیں دی جاتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۲) جہاں فرض و حرام میں ایسا تعارض و تقابل ہو کہ اس حرام کے ارتکاب سے ترک فرض لازم آئے جیسے حج فرض ہے اور ترک حج حرام ہے تو اس تعارض و تقابل میں فرض ہی کو ادا کیا جائیگا۔ تو اس سے حرام خود ہی ترک ہو جائیگا اور جہاں فرض و حرام میں ایسا تعارض و تقابل نہ ہو جیسے کسی شخص پر حج فرض ہے لیکن اس فریضہ کی ادائیگی میں رشوت دینی پڑتی ہے اور رشوت حرام ہے۔ تو اس صورت میں حج فرض کو ادا کیا جائیگا اور رشوت محض اسقاط فرض کی ضرورت کا لحاظ کرتے ہوئے دی جائیگی بلکہ اس کو بخوف ترک فرض اختیار کیا جائیگا تو حقیقہ اس میں تقابل حرام کا حرام سے ہو سکتا ہے صورت مسئلہ میں حج کیلئے فوٹو کچھوانا بھی حرام۔ اور اس کی بنا پر ترک حج کا ہو جانا بھی حرام ہے تو بمقتضائے حدیث کہ ”جب تو دو بلاؤں میں مبتلا ہو فاختر اھو نہما تو آسان بلا کو اختیار کر“ تو اس میں ترک فرض کی بلا تو اہم تر ہے۔ اور فوٹو محض اسقاط فرض بلکہ ترک فرض کے عذاب سے بچنے کے لئے اختیار کیا گیا۔ تو اس کی حرمت اسکے مقابلہ میں ضرور کمتر و ايسر ہوئی تو اس کو اختیار کر کے ترک فریضہ حج کی حرمت سے اجتناب ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۳) ہمارے خواص علمائے کرام نے مجھ سے گفتگو کے بعد اور بعض نے میرے اس فتوے کے دیکھ لینے کے بعد حج کا عزم کیا ہے۔ حج فرض میں جواز فوٹو کیلئے یہ میرا فتویٰ ہی بہت کافی ہے اس کے لئے زبردستی اجماع کو دلیل بنانے کی حاجت نہیں۔ پھر جب حضرت مفتی اعظم صاحب قبلہ کو ابھی تک اس میں کلام ہے تو اجماع ہوا بھی نہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

(۴) جب فوٹو کا جواز محض اسقاط فرض کی ضرورت۔ اور خوف ترک فرض کی بنا پر ہے تو حدیث

شریف میں ہے ”الاعمال بالنیات“ لہذا اس نیت خاص کی بنا پر جب عازم حج مقامات پر دعا کریگا تو اس گناہ کے معاف ہو جانے کی بھی امید ہے۔ ”ان الله لا يغفر ان يشرك به ويغفر ما دون ذلك لمن يشاء“۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

(۵) جب بوقت ضرورت شرعی کے کسی فعل حرام کو مجبوراً کیا جا رہا ہے تو اس کا مرتکب فاسق ہی قرار نہیں پایا تو اس بنا پر لوگوں کا اس کو مکرم و معظم سمجھنا غلط قرار نہیں پاتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۶) بلاشبہ شئی مرہونہ سے مرہن کو انتفاع ناجائز ہے۔ رد المحتار میں ہے:

لا يحله ان ينتفع بشئ منه بوجه من الوجوه وان اذن له الراهن لانه اذن له في الربا لانه يستوفي دينه كاملاً فتبقى له المنفعة فضلاً فيكون ربا۔ (رد المحتار جلد ۵ صفحہ ۳۲۰)

باقی رہا مکان کا اس شرط پر خریدنا کہ وہ اس کو ان ڈیڑھ سال تک اسی قیمت پر بائع کو بیع کر دیگا۔ اس کو نوٹ۔ بیع الوفاء کہتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ بیع نہیں ہے بلکہ رہن ہی ہے اور اس کا حکم رہن کا حکم ہے۔

رد المحتار میں جواہر الفتاویٰ سے ناقل ہیں:

ان يقول بعث منك على ان تبيعه منى متى جئت بالثمن فهذا البيع باطل وهو رهن وحكمه - حكم الرهن وهو الصحيح“

فتاویٰ سے ناقل ہیں ”والذى عليه الاكثر انه رهن لا يفتقر عن الرهن فى حكم من الاحكام“۔

اسی میں جامع الفصولین سے ناقل ہیں

’البيع الذى تعارفه اهل زماننا احتيا لا للربا وبسموه بيع الوفاء هو رهن فى الحقيقة“

(رد المحتار جلد ۲ صفحہ ۲۷)

اب جب اس کار رہن ہونا ثابت ہو گیا تو مشتری کو اس سے نہ انتفاع جائز ہے نہ اس کے کرایہ کی رقم حلال ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

کتبہ: المقتسم بذیل سید کل نبی و مرسل، الفقیر الی اللہ عز و جل،
العبد محمد اجمال غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمال العلوم فی بلدہ سنہ ۱۴۰۰ھ

مسئلہ

(582)

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

حجاج کے لئے فوٹو کی پابندی! امن طریق کے منافی ہے یا نہیں؟۔ بر تقدیر ثانی سوال یہ ہے کہ امن طریق صرف جان و مال کی حفاظت کا نام ہے یا دین کا امان بھی اس میں داخل ہے؟۔

ظاہر ہے کہ جس راہ میں کسی معصیت پر مجبور کیا جاتا ہو اس راہ کو پر امن نہیں کہا جاسکتا اگر امن طریق میں امن دین بھی داخل ہے یعنی عدم ارتکاب حرام شرط ہے تو فوٹو حرام ہے اس کی پابندی امن طریق کے منافی ہونی چاہئے۔ اور اگر امن طریق کے لئے عدم ارتکاب حرام شرط نہیں بلکہ ارتکاب حرام کے باوجود بھی حج کرنا ضروری ہے تو سوال یہ ہے کہ عورت کو عدت میں اور بغیر محرم کے حج کرنے سے کیوں روکا گیا ہے۔ نیز فوٹو کی طرح دوسرے محرمات شرعیہ (مثلاً زنا، لواطت شرب خمر وغیرہ) بھی اگر حجاج کے لئے لازم قرار دیدئے جائیں تو کیا ان محرمات شرعیہ کی پابندی کے باوجود بھی حج کرنا ضروری ہوگا یا نہیں اگر نہیں تو وجہ فرق کیا ہے۔ بینو اتو جروا

المستفتی، خریدار سی

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

ردالمحتار میں بحر سے ناقل ہیں :

ويجتهد في تحصيل نفقة حلال فانه لا يقبل بالنفقة الحرام كما ورد في الحديث مع انه يسقط الفرض عنه معها ولا تنافي بين سقوطه وعدم قبوله فلا يثاب لعدم القبول ولا يعاقب عقاب تارك الحج.

(رد المحتار مصرى جلد ٢ صفحہ ١٢٢)

علامہ علی قاری المسک المتقسط میں تحریر فرماتے ہیں:

يجب الحج وان علم انه يؤخذ منه المكس قال صاحب القنيه والمجتبى وعليه
الاعتماد وفي المنهاج وعليه الفتوى وقال ابن الهمام ما حاصله ان الاثم في مثله على
الاخذ لا على المعطى فلا يترك الفرض لمعصية عاص- (ارشاد السارى مصرى صفحه ٣٤)

ردالمحتار میں ہے:

فان المكس والخفارة رشوة ونقل عن البحران الرشوة في مثل هذا جائزة.

ان عبارات سے ثابت ہو گیا کہ جس طرح مال حرام اور رشوت سے حج فرض ذمہ پر سے ساقط ہو

جاتا ہے اور ترک حج کے عذاب اور گناہ سے بچ جاتا ہے اسی طرح فوٹو کی بھی محض اسقاط فرض حج کی بنیاد پر اجازت دی جائے اور اس کی حرمت کو حج فرض کے لئے عذر اور مانع قرار نہ دیا جائے۔ باوجودیکہ مال حرام ارکان حج کے اسباب میں اثر انداز ہے کہ اسی سے منی، مزدلفہ، عرفات، طواف زیارت کا سفر کیا جائیگا۔ بلکہ اس مبارک سفر میں خود عازم حج کے خوردنوش۔ طہارت۔ لباس۔ قربانی وغیرہ امور میں یہی مال حرام صرف ہوگا۔ پھر مال میں کوئی خاص شخص مبتلا ہوگا۔ اسی طرح رشوت کی مجبوری بھی ایک اتفاقی چیز ہے۔ لیکن فوٹو تو ایک ایسی خارجی چیز ہے جس کا اثر ارکان حج بلکہ اسباب ارکان پر نہیں پڑتا۔ کہ اس کو صندوق میں چھپا کر رکھا جاسکتا ہے نہ اسے منی، مزدلفہ، عرفات، صفا، مروۃ، مسجد حرام میں لے جانے کی کوئی حاجت نہ کسی رکن حج کرنے کے وقت اس کے دکھانے یا پاس ہونے کی کوئی ضرورت۔ علاوہ بریں اس فوٹو کی ایسی قانونی مجبوری ہے جس کے ہندوستان میں اٹھ جانے کی اب کوئی امید باقی نہیں رہی۔ پھر اس میں ایسا ابتلائے عام و عموم بلوی ہے جس سے کسی شخص کا مستثنیٰ ہونا دشوار ہے۔ تو ان مجبوریوں ضرورتوں، کتب فقہ کی نظیروں، کی بنا پر صرف حج فرض ادا کرنے کے لئے فوٹو کی اجازت دی جاتی ہے اور قول فقہاء ”الضرورات تبیح المحظورات“ پر عمل کیا جاتا ہے، اور اس قانون کے اٹھ جانے یا اس سے مستثنیٰ ہو جانے کی موہومی امیدوں پر التوائے حج یا تاخیر حج بلکہ ترک حج کے گناہ عظیم اور فسق سے اہل اسلام کو بچایا جاتا ہے۔

اس مسئلہ میں ایک مبسوط اور مدلل فتویٰ ہے جو فتاویٰ اجملیہ میں درج ہے لہذا فوٹو کی پابندی میرے نزدیک امن طریق کے منافی نہیں جیسے بہ تصریح فقہاء کرام مال حرام اور رشوت امن طریق کے منافی نہیں۔ پھر اگر فوٹو کی معصیت سے بچایا جاتا ہے تو تاخیر حج بلکہ ترک حج کی معصیت لازم آئی جاتی ہے۔ تو معصیت میں مبتلا ہونا بہر صورت لازم آتا ہے۔ دیکھئے رشوت او مال حرام سے حج کرنے میں کیا ارتکاب حرام لازم نہیں آتا ہے لیکن ان امور محرّمہ کی ضرورۃ اسقاط فریضہ حج کی وجہ سے فقہاء کرام نے اجازت دی اسی طرح فوٹو کا حکم سمجھئے۔ اب باقی رہا زنا لواطت شرب خمر وغیرہ ان امور محرّمہ کا یہاں پیش کر دینا تو ان کے لئے نہ تو کوئی شرعی مجبوری ہے نہ کوئی قانونی پابندی۔ نہ عموم بلوی کا وجود ہے تو ان میں سے کسی بات کی اجازت کتب فقہ سے کیسے مستفاد ہو سکتی ہے تو ان محرمات کا فوٹو پر کیسے قیاس کیا جاسکتا ہے تو فوٹو اور ان محرمات میں یہ کھلی ہوئی وجہ فرق موجود ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

مسئله

(588)

جناب مفتی صاحب دامت برکاتہم جناب کی خدمت میں ایک لفافہ دیا جاتا ہے اس میں دو تین فتویٰ طلب کرتے ہیں آپ برائے مہربانی انکا بہت جلدی جواب عنایت فرمائیں۔

(۱) کیا لکھتے ہیں علماء دین شرع متین ایک شخص صاحب استطاعت ہے اس کی بیوی اور اس کا لڑکا حج پڑھنے بھیجنے کے لئے تیار ہے لیکن وہ تیار نہیں ہوتا، اس لئے اس کو چھوڑ کر اس کی بیوی اور لڑکا حج پڑھنے جاسکتا ہے یا نہیں؟۔

(۲) ایک شخص والدہ کو لیکر ایک دفعہ حج پڑھا آیا ہے اور اب پھر ارادہ ہے تو اس کی والدہ کو چھوڑ کر جاسکتا ہے یا نہیں؟۔

(۳) ایک شخص کی والدہ ثانی ہے اور اپنے شوہر کے ساتھ الگ رہتی ہے اور رقم بھی الگ ہے تو کیا وہ اپنے والد کے ساتھ اپنی ثانی والدہ کو چھوڑ کر حج پڑھنے جاسکتا ہے یا نہیں؟۔

اس کا جواب جلدی عنایت فرمائیں کیونکہ فارم آنے والے ہیں یہاں سے پندرہ بیس آدمی حج کو جانے کے لئے تیار ہو رہے ہیں آپ بھی ان کے حق میں دعا فرمائیں والسلام

پیش امام صاحب واسکی پالٹی کا بہت بہت سلام معلوم ہو

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) جب ان ماں اور بیٹے کے ذموں پر حج فرض ہے تو ان دونوں پر بغیر اس کی اجازت کے بھی حج کے لئے جانا فرض ہے، پھر اگر امسال اس کے نہ جانے کی وجہ سے حج کے لئے نہیں جائینگے تو تاخیر حج کے مرتکب ہونگے۔

(۲) والدہ کی اجازت سے دوسری مرتبہ بغیر ان کو ساتھ لئے ہوئے حج کو یقیناً جاسکتا ہے۔

(۳) اس صورت میں بلاشبہ یہ اپنے والد کے ساتھ حج کے لئے جاسکتا ہے واللہ تعالیٰ اعلم

بالصواب۔

متعلقہ ادائے فریضہ حج و زیارت پر حکومت حجاز کا جابرانہ ٹیکس

الجواب

الحمد لله الذى جعل الكعبة مثابة للناس وامنا - ومنح لهم من مقام ابراهيم
مصلى - وجعل الحرام امنا - وبعث فيهم رسولا كريما - يتلو عليهم اياته ويزكيهم
ويطهرهم تطهيرا - فصلوات الله تعالى وسلامه عليه وعلى آله واصحابه دائما ابدا -

(۱) هذه الضررية بدعة شنيعة قبيحة حرم للأخذ وحكم بغير ما انزل الله تعالى - قال النبي صلى الله تعالى عليه وسلم لا يدخل الجنة صاحب مكس يعنى الذى يعشر الناس (رواه احمد وابو داؤد والدارمى) والمراد اخذ المزيد من العشر قهرا فهو ظلم -

وعن عائذ بن عمرو قال: سمعت رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم يقول: ان شر الرعاء الحطمة (رواه مسلم) والحطمة المظلمة - وروى البيهقي عن حرة الرقاشي عن عمه قال قال رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم الا لا تظلموا الا لا يحل مال امرى الا بطيب نفس منه واخذ مال المسلم قهر ايسمى نهبه (كذا في مجمع بحار الانوار) وهى ممنوعة محرمة وردت فى ذمها احاديث كثيرة - هذا اذا كان الاخذ مرمة -

قال رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم : يا ترى على الناس زمان لا يبالي المرء ما اخذ منه أمن الحلال ام من الحرام - ومنع الحاج من الدخول فى البلد الحرام وصدهم عن الحج لهذا الطمع الفاسد قهر وظلم ومخالفة لكتاب الله تعالى حيث قال ومن اظلم ممن منع مساجد الله ان يذكر فيه اسمه وسعى فى خرابها الآية وصدا المومنين ومنعه من الحج والدخول فى المسجد الحرام سنة مشركية مكة كانوا منعوا رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم واصحابه عن ان يصلوا فيه فى ابتداء الاسلام ومنعواهم من حجه والصلوة فيه عام الحديدية واذا منعوا من يعمره بذكر الله تعالى وصلوته فيه فقد سعوا فى خرابه (ما فى تفسير لباب التاويل) فمن يقتفى آثارهم يكون معهم ولا فرق بينه وبين من يبعث الجند على ابواب المساجد يوم الجمعة لمنع المصلين من الصلوة . يراداء ضريبة

بحيلة حراسة المسجد واصلاحه بل هذا اشرمنه - وحاشا ان يوجد مثل ذلك في زمن اسلاف الصالحين غير انه كان عمل المشركين - قال الله تعالى ان الذين كفروا ويصدون عن سبيل الله والمسجد الحرام الذي جعلناه للناس سواء العاكف فيه والباد ومن يرد فيه بالحاد بظلم نذقه من عذاب اليم -

عن حبيب بن مظعم ان النبي صلى الله تعالى عليه وسلم قال: يا بني عبد مناف! لا تمنعوا احد اطاف بهذا البيت وصلى اية ساعة شاء من ليل ونهار اخرجته الترمذی و ابو داؤد والنسائی ()

(۲) لا يجوز فانه داخل تحت حكم ومن اظلم الآية في مدارك التنزيل هو حكم عام لجنس مساجد الله وان ما نعهما من ذكر الله مفرط في الظلم - فاین الجواز؟ وهذا المكوس الغالية اقبح واشد على الناس واضرلهم من غارات قطاع الطرايق -

(۳) لا يجوز لان الرزوة حرام -

(۴) لا يجوز اصلا لان الناس كلهم عباد الله تعالى ومنع الطائفين عن الطواف واخراجهم عن المطاف ظلم وسعى في تخريب المسجد والا خلل في عبادات الخلق لتعظيم الامير امر شديد شنيع -

(۵) لا يجوز لانه سبب تعطيل السعى وموجب زوال خشوع اهل السعى وخصوصهم ويجدون منه ضيفا وفي قلوبهم تشو يشا والله سبحانه وتعالى اعلم -

كتبه العبد المعتصم بحبله المتين محمد نعيم الدين شرفه الله بمزيد العلم واليقين آمين - الاجابة كلها صحيحة محمد عمر -

احمد محمود داو محمد ا - واسلم على اكرم العالم سرمد - اما بعد فان الحكومة النجندية تدعى انها تحكم بما انزل الله في آياته الكريمة وبما وردت فيها الاحاديث الشريفة - ولا تامر بالامور البدعية - وتجري الاحكام الشرعية - وتحفظ اموال

المسلمين - وتحرس على الحجاج الزائرين لكن هذا ادعاء باطل مع كذب زائل - بل حكا مها حتى السلطان - يحكمون بغير ما انزل في القرآن يخالفون الاحاديث الصحيحة - ويفعلون الامور المحدثه - ويدعون البدع الشنيعة ويحرفون السنن السنية - وياخذون

اموال المسلمين قهرا - وينتهبون على الحجاج جبرا - ويقررون الضريبة على العبادات - ويحلون الرشوة على اموال الخيرات - ويصدون المسلمين عن اداء الفريضة ويمنعون الزائرين عن المقامات المتبركة - فما افتي العلامة صدر الافاضل - فخر الاماثل - سلطان المحدثين - امام المفسرين واستاذ العلماء وسند الفضلاء الحافظ الحاج المولى محمد نعيم الدين المرادبادي ناظم الجمهورية الاسلامية - وموسس الجامعة النعیمیة متع الله المسلمين بطول بقائه فهو حق وصحيح وصواب - ومدلل بالاحاديث والكتاب - فلا ريب ان ضرب الضريبة بدعة سيئة ومخالف للسنة السنية - وظلم وحرام - وصد اهل الاسلام عن الحج والدخول في البلد الحرام - وهذا الفعل لم يثبت من القرون الثلاثة وائمة المجتهدين - ولا من الفقهاء والصالحين - ولم ياخذ احد من السلاطين - فهی ظلم واتباع عمل المشركين والله سبحانه وتعالى اعلم بالصواب -

كتبه: المعتصم بذيل سيد كل نبی ومرسل، الفقير الى الله عز وجل،
العبد محمد اجمل غفر له الاول، ناظم المدرسة اجمل العلوم في بلدة سنهجل

(۵۸۹)

مسئله

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ

(۱) ایک آدمی مالدار غریب کو اپنے ساتھ حج کو لے جا رہا ہے توج کا ثواب لیجانے والے کو ملے گا یا کہ جانے والے کو؟ -

(۲) ایک شخص مرحوم کے بدلے ایک آدمی کو حج کو لیجا رہا ہے ایسا بوڑھا جو حج کو جانے کی طاقت نہیں رکھتا تو وہ دوسرے آدمی کو حج کو بھیج رہا ہے تو ان دونوں شخص جانے والوں کو حج کا ثواب ملے گا یا نہیں؟ - براہ کرم جواب سے مطلع فرمائیں یعنی ماہنامہ سنی میں شائع کرانے کی زحمت فرمائیں خریدار نمبر ۳۳۷۲۶ جونہ بازار بھوساؤل، مشرقی فاؤنڈیشن سید سردار علی خلیفہ پیر جیلانی میاں قادری

الجواب

نحمدہ ونصلی ونسلم علی رسولہ الکریم

(۱) جو مالدار کسی غریب کو حج کو اپنے ساتھ لے جائے تو اس حج کا ثواب اس غریب کو تو اپنے رکان حج ادا کرنے کی بنا پر ہوگا اس مالدار کو اس کے لیجانے اور اس کے تمام اخراجات اٹھانے کی بنا پر ہوگا۔

لہذا ان میں ثواب سے کوئی بھی محروم نہیں ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم،

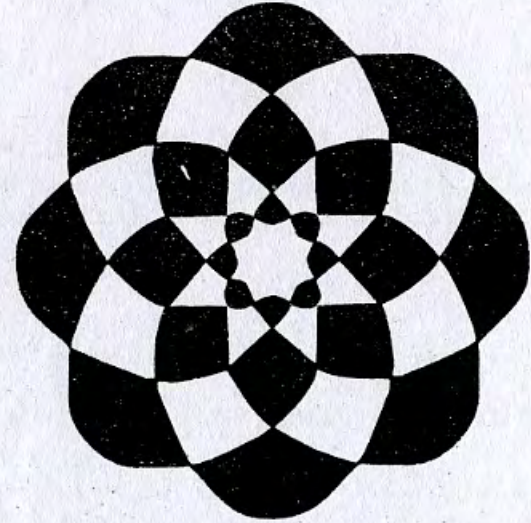
(۲) حج بدل میں فریضہ حج تو اس کا ادا ہوگا جس کی طرف سے روپیہ دیا گیا اور جس کی نیت سے

ارکان حج ادا کئے گئے ہیں اور ثواب اس جانے والے کو بھی ملے گا۔ درمختار رد المحتار میں ہے: ویقع الحج

المفروض عن الأمر علی الظاہر ولا ینخلو المأمور من الثواب۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ: المعتمد بذیل سید کل نبی ومرسل، الفقیر الی اللہ عز وجل،

العبد محمد اجمیل غفرلہ الاول، ناظم المدرستہ اجمیل العلوم فی بلدہ سنبھل



خواتین کے لیے

بارہ تقریریں

مرتبہ: نسیم فاطمہ نگران: محمد منشا تاش قصوری

نقشہ الواعظین

ترجمہ: ایضاً الواعظین

مصنف: حضرت ابوبکر بن محمد بن علی بدر القریشی
مترجم: مولانا محمد منشا تاش قصوری مدظلہ

سیرت محمدیہ

تصنیف: ترجمہ: مواہب لدنیہ
شیخ المورخین حضرت امام احمد محمد من ابی بکر الخطیب القسطلانی الشافعی
ترتیب و تدوین: مکرم جناب محمد عبدالستار طاہر مسعودی زید مجتہدہ
2 جلد مکمل RS: 500

قصص الانبیاء علیہم السلام

شیخ الاسلام الامام الحافظ عماد الدین محمد بن اسماعیل (المعروف)

امام ابن کثیر

مترجم: ابو ثوبان سید اسد اللہ اسد

الاربعین للحرالی

مصحح: محمد علی

خطبات غزالی

مؤلف:

حجت الاسلام حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

مترجم: ڈاکٹر سید عامر گیلانی

تذکرۃ الواعظین
المعروف

خطبات الناصحین

مصنف: مولانا محمد جعفر قریشی خفی
ترتیب و تدوین: محمد عبدالستار طاہر مسعودی

کتاب الروح

علامہ حافظ ابن قیم

مترجم

مولانا محمد شریف نوری نقشبندی

جامع الاحادیث

مجدد اعظم امام احمد رضا مدظلہ العالی

• مقدم، ترتیب و تخریج: مولانا محمد شریف

مولانا محمد حنیف خاں رضوی بریلوی

عقدہ دہائیہ دکن پورہ رضویہ بریلی شریعت

6 جلدیں - RS: 1500

زینت المجالس
نزهة المجالس

امام عبدالرحمن بن عبد السلام (المعروف الثاني) (۹۰۰ھ)

علاء محمد منشا تاش قصوری الخفی
مدظلہ العالی مدظلہ العالی رضویہ بریلی ۱۹۹۲

۲ جلدیں مکمل

نزهة الواعظین

ترجمہ

درة الناصحین

حضرت العلامة اشرف عثمان بن حسن احمد الشاکر الخوبی (البرقی ۱۲۳۳ھ)

مولانا علامہ محبوب احمد چشتی (۱۲۳۳ھ)

2 جلدیں

علماء خطباء واعظین مقررین کے لیے بے مثال تحفہ

پورے سال کے خطبات جمعہ سے بے نیاز کروینے والی کتاب

مصنف
جانشین امام خطابت
حضرت صاحبزادہ

فیصل آباد
پیر محمد مقبول احمد سرور
(سندری والے)

اسرار خطابت

اسرار خطابت جلد اول خطبات 13
فضائل اہلبیت از قرآن کریم - فضائل اہلبیت از حدیث پاک - فلسفہ شہادت و خطبات - قافلہ کی واپسی
شان ولایت - فوز عظیم - اعلیٰ حضرت - حیات اولیاء - ثبوت میلاد - میلاد شریف - ولادت رسول - خلیفۃ اللہ الاعظم

اسرار خطابت جلد دوم خطبات
اچھی نسبت - سرکار غوث اعظم - وسیلہ - برکات تبرکات - صراط مستقیم - توحید کی دلیل ناطق
سراپا معجزہ - شان صحابہ - حضرت بلال - اولیت صدیق اکبر - خلیل الہی - محسن رسول

اسرار خطابت جلد سوم خطبات 12
تفسیر آیت اسری - فلسفہ معراج النبی - مسجد اقصیٰ تک - مسجد اقصیٰ سے آگے - محدث اعظم پاکستان - شب برات کی برکات
حضرت امام اعظم - فضائل ماہ رمضان - ماہ صیام کی برکات - فضائل مخدومہ کوئین - غزوہ بدر - مولائے کائنات

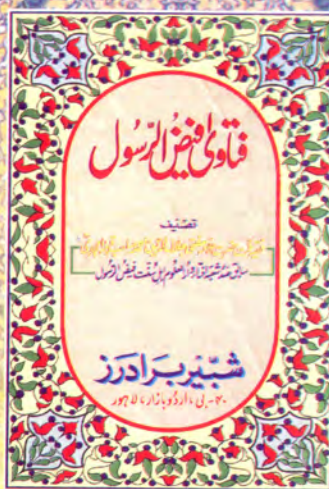
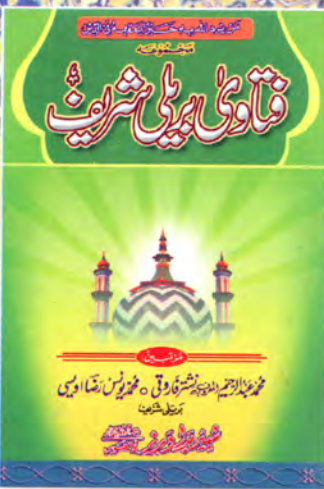
اسرار خطابت جلد چہارم خطبات 13
عظمت بلد الحبیب - فلاح کا راستہ - بے مثال بشر - عظمت مصطفیٰ - حسن بے مثال - حاضر و ناظر رسول
حدیث جبرائیل - دیگر عالمین - عظمت والدین - بنی صدیق - ذبح عظیم - حضرت عثمان غنی - حضرت فاروق اعظم

اسرار خطابت جلد پنجم خطبات 12
مورت اہلبیت - محبت رسول - حیات النبی - فضائل درود شریف - روضۃ من ریاض الجنہ - حق چاریار
ذائقہ الموت - نور مبین - صدیق اکبر سراپا حسنت - ایصال ثواب - سیدہ عائشہ صدیقہ - لیلة القدر

اسرار خطابت جلد ششم
مخدومہ کائنات حضرت سیدہ فاطمہ الزہراء سلام اللہ علیہا کی سوانح طیبہ جس سے علماء محققین اور واعظین و مقررین
بیک وقت مستفید ہو سکتے ہیں فصاحت و بلاغت اور مستند حوالہ جات سے مزین خوبصورت تحفہ

اسرار خطابت جلد ہفتم
حضرت مولائے کائنات سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی سوانح طیبہ
علماء و خطباء کے لیے یکساں مفید لا جواب کتاب

شیر برادرز ۴۰ - اردو بازار - زبیدہ سنٹر لاہور



اردو بازار لاہور
042-7246006

شبیر برادرز

